انسان اور شیطان

محمد فراز

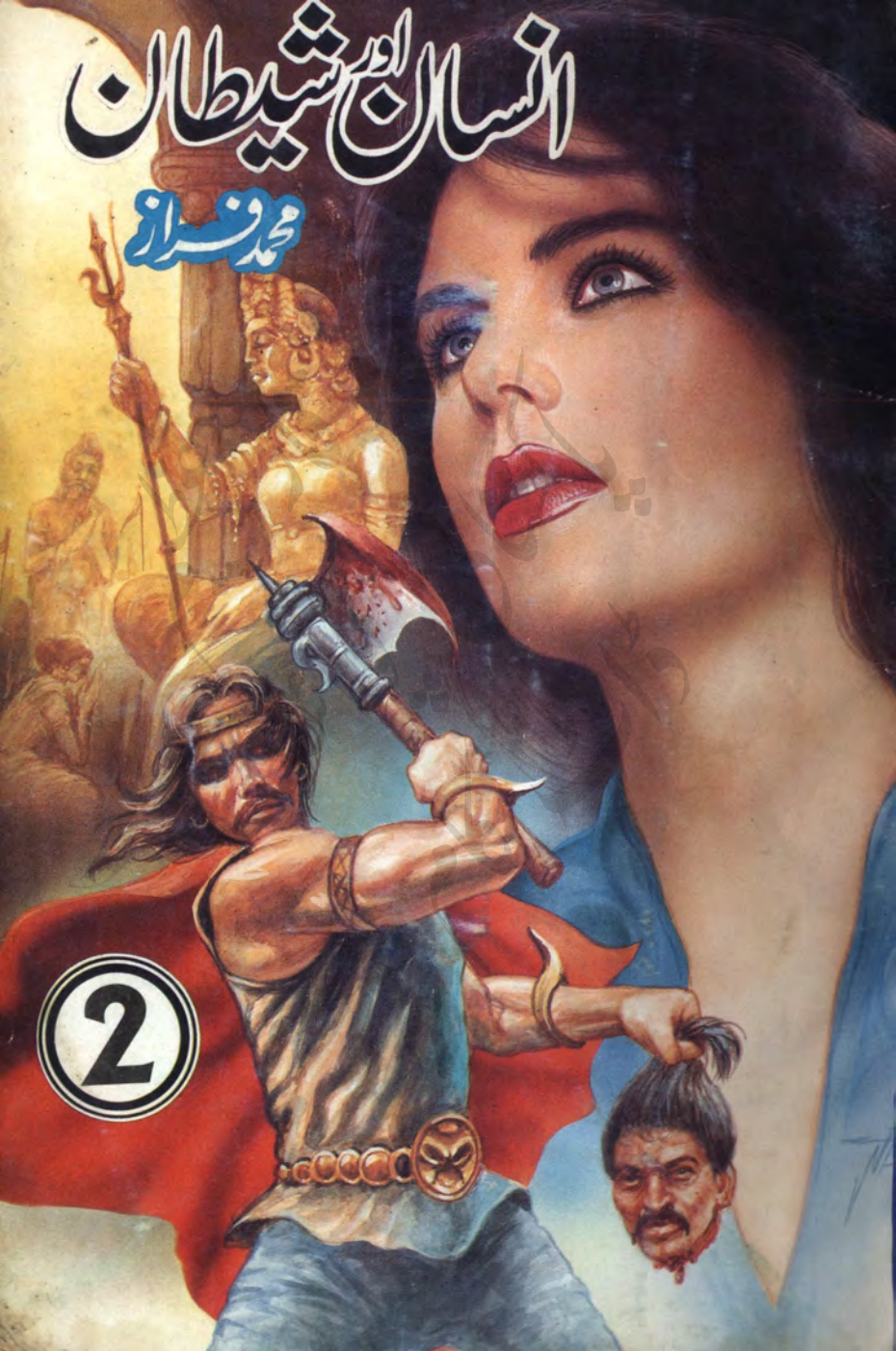

2

تمام ساہوکار پالتو جانوروں کی طرح رینگتے ہوئے چیتو کے نزدیک آکر بیٹھ گئے تب چیتو نے بڑی نرمی سے انھیں سمجھاتے ہوئے کہا۔ "دیکھو ہم اپنے ساتھ اتنا بڑا لشکر لے کر یہاں آئے ہیں۔ ان کی گزر اوقات کے لیے ہمیں پیسہ چاہیئے۔ یہ سب ہم کیوں کر رہے ہیں یہ تمھاری سمجھ میں نہیں آئے گا؟ اور تم لوگوں کو سمجھانے کی ضرورت بھی نہیں ہے کیونکہ چیتو جو کچھ بھی کرتا ہے وہ سوچ سمجھ کر کرتا ہے۔ اسے کسی کی دلیل سننے کی عادت نہیں ہے تمھارا یہ شہر بہت دولت مند شہر ہے اور مجھے یہاں سے میرے اندازے کے مطابق ہی رقم ملنی چاہیئے۔ میرا

خیال ہے باغیوں کے ظلم وستم سے تم لوگ بے خبر نہیں ہوگے؟" چیتو نے اپنا آخری جملہ بڑے سخت لہجے میں کہا تھا اس لہجے میں جو دھمکی پوشیدہ تھی اس کے اثر سے ساہوکاروں کی رہی سہی ہمت بھی ٹوٹ گئی۔ تب ہی امیر نے موٹے ساہوکار کو کہنی مار کر اُسے اشارے میں سمجھایا کہ اگر تم لوگ چپ سادھے بیٹھے رہو گے تو چیتو تم لوگوں کو کچا کھا جائے گا۔

اس کا اشارہ پاتے ہی موٹے ساہوکار نے ہمت کر کے پہلے تو کھنکار کر اپنا گلا صاف کیا پھر ادب سے بولا۔ "حضور ہمیں تو آپ کے آنے کی خبر پہلے ہی سے ہو چکی تھی اسی لیے ہم نے حضور کی خدمت میں اپنی حیثیت کے مطابق تیاری کر ڈالی۔ اور حضور کے خادم امیر علی کے مشورے پر ہم نے بہت قلیل وقت میں ایک فہرست بھی تیار کر لی ہے۔" اتنا کہہ کر اس موٹے ساہوکار نے فہرست کا ایک لمبا سا کاغذ چیتو کے آگے رکھ دیا۔ چیتو نے ہاتھ بڑھا کر اس کاغذ کو اٹھا لیا۔ لیکن کاغذ پر لکھی ہوئی تحریر کو دیکھتے ہی چونک کر بولا۔ "یہ کیا؟ تم لوگوں کو اسی زبان میں فہرست لکھنی تھی جو میں بھی پڑھ سکوں۔"

"حضور ہمارے منشی نے فارسی زبان میں یہ فہرست لکھی ہے۔" ساہوکار بولا۔

"کہاں ہے تمھارا منشی؟" چیتو نے اِدھر اُدھر دیکھ کر آواز لگائی لیکن کمرے میں سوائے ان لوگوں کے اور کوئی موجود نہیں تھا۔ اچانک اس کا چہرہ غصّے سے سُرخ ہو گیا۔ پھر وہ بولا۔ "تم لوگ بالکل ہی بے وقوف ہو۔ تم لوگ وقت پر کوئی کام کر ہی نہیں سکتے۔ اب اگر منشی کو ڈھونڈنے نکلو گے تو آدھی رات گزر جائے گی۔ پھر ہم کھا پی کر آرام کس وقت کریں گے؟" یہ سُن کر امیر نے بگڑی ہوئی بات کو سنبھالنے کی کوشش کی اور ساہوکار کی بجائے خود ہی بول پڑا۔ "سردار اس ناچیز بندے کو تھوڑی بہت فارسی آتی ہے اگر اجازت ہو تو یہ فہرست میں پڑھ کر سُنا دوں؟"

"ارے تو پھر بولتے کیوں نہیں؟" چیتو نے کہا اور کاغذ امیر کے ہاتھ میں دے کر تکیئے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور آگے بولا۔ "اب جلدی سے پڑھ ڈالو دیکھوں تو سہی ان بے وقوفوں نے لکھا کیا ہے؟"

کاغذ لے کر امیر اٹھ کھڑا ہوا۔ ابتدا میں چیتو کی آمد پر گاؤں والوں نے اپنی خوشی کا اظہار کیا تھا اور چیتو کی بے حد تعریف کی گئی تھی۔ جب امیر یہ پڑھ کر سنانے لگا تو اچانک چیتو نے اکتاہٹ کا اظہار کیا اور ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "نہیں نہیں امیر مجھے یہ بکواس نہیں سننا ہے۔ مجھے تو اصل بات معلوم کرنے کی جلدی ہے۔ مجھے بہت زور کی بھوک لگ رہی ہے۔" یہ سُن کر موٹے ساہوکار نے جلدی سے کہا۔ "حضور آپ کے لیے کھانا تیار ہے۔"

"چپ۔" چیتو نے اسے ڈانٹا اس کا چہرہ غصّے سے سُرخ ہو رہا تھا۔

"خبردار بیچ میں مت بولو جو پوچھا جائے صرف اسی کا جواب دو۔" بنتی بات کو بگڑتے دیکھ کر امیر کو ان لوگوں پر رحم آجاتا تھا۔ لیکن کبھی کبھی اُسے ان لوگوں پر غصّہ بھی آتا تھا کہ اپنی حماقت سے وہ لوگ کام کو بگاڑ رہے ہیں۔ اس نے چیتو کی توجہ ہٹانے کے لیے ایک بار پھر اس فہرست کو پڑھنا شروع کر دیا۔ "حضور اس میں سب سے پہلے پچاس ہزار کی رقم آپ کے لیے درج ہے۔"

"بس صرف پچاس ہزار؟" چیتو نے اپنی خوشی کو دبانے کی کوشش کی اور مُنہ بگاڑ کر بولا۔ "صرف اتنی سی رقم سے کیا ہوگا؟"

"نہیں حضور آگے اور بھی کچھ لکھا ہے۔" امیر فہرست پر نظریں جما کر بولا۔ "لکھا ہے پچاس ہزار تو نقد ہیں جب کہ پندرہ ہزار کے زیورات ہیں جو حضور کے زنانخانے کے لیے ہیں۔"

"پھر؟" چیتو دلچسپی لیتے ہوئے بولا۔

"تین عدد قیمتی شالیں۔ ریشمی اور کم خواب کے کپڑوں کے تھان۔ جن کی قیمت پندرہ ہزار ہے۔" امیر ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا۔

"ہوں۔" کہہ کر چیتو ہونٹوں ہی ہونٹوں میں مسکرانے لگا پھر حساب لگاتے ہوئے آگے بولا۔ "پچاس ہزار اور پندرہ ہزار اور پھر پندرہ ہزار یہ تو کُل اسی ہزار ہوئے۔"

یہ سُن کر امیر کو لگا کہ اگر اُس نے چیتو کو سوچنے کے لیے موقع دے دیا تو سارا کھیل بگڑ جائے گا اس لیے وہ ایک پل کی تاخیر کے بغیر آگے پڑھنے لگا۔ "اس کے علاوہ لشکر

میں جتنے بھی سردار ہیں ان سب کے لیے دس دس ہزار نقد ہیں۔"

اپنے لیے دس دس ہزار کی رقم کا سُن کر غفور خان، راجن اور تیسرے سردار کے چہرے چمکنے لگے امیر نے ترچھی نظروں سے ان سب کو ایک بار دیکھا پھر آگے پڑھتے ہوئے بولا۔ "اس نقدی کے علاوہ پانچ ہزار کے زیورات اور پانچ ہزار کے کپڑے۔ اس طرح بیس بیس ہزار پورے ہو گئے۔"

"ٹھیک ہے۔" چیتو نے پہلی بار اطمینان کا اظہار کیا۔ "اب آگے دیکھو ابھی فہرست ختم تو نہیں ہوئی نا؟"

"نہیں سردار۔ ابھی تو لشکر کے جوان باقی ہیں۔" امیر دھیرے سے ہنس کر بولا۔ "اس میں لکھا ہے کہ لشکر کے ہر عہدیدار کے لیے ایک ایک ہزار کی رقم رکھی گئی ہے جن کی تعداد ہمارے خیال سے تیس ہے۔"

"تیس..." چیتو نے چونک کر کہا۔ "یہ حساب غلط ہے۔"

امیر نے حیرت سے چیتو کی طرف دیکھا تو چیتو نے آنکھ مار کر اسے کچھ اشارہ کیا۔ اس کے اشارے سے امیر سمجھ گیا کہ چیتو اس رقم میں کچھ اضافہ کرانا چاہتا ہے۔

"غفور خان ہمارے لشکر میں تو کم سے کم پچاس عہدیدار ہیں نا؟" چیتو نے غفور خان سے پوچھا۔

"جی ہاں جناب آپ کا حساب بالکل ٹھیک ہے۔" غفور خان نے جواب دیا۔

"تو امیر علی۔ تم اس فہرست کو درست کر لو۔" چیتو نے امیر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "پچاس عہدیداروں کے لیے ہزار ہزار کی رقم لکھ لو۔"

تمام ساہوکار امیر کی طرف دیکھنے لگے لیکن امیر اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ کھُل کر ان کا بچاؤ کرتا۔ اس نے چیتو کی ہدایت کے مطابق فہرست کو درست کیا اور پھر آگے پڑھنے لگا۔ "لشکر کے ہر جوان کو چالیس روپے نقد جن کا اندازہ چار ہزار لگایا گیا ہے۔"

"چار ہزار؟" چیتو نے پھر پلٹ کر غفور خان کی طرف دیکھا۔ "غفور خان ہمارا لشکر تو پورے پانچ ہزار کا ہے۔"

"جی ہاں جناب۔" غفور خان بولا۔ "چڑھائی پر روانہ ہوتے وقت میں نے اچھی طرح گن لیا تھا پورے پانچ ہزار ہی تھے۔"

یہ سُن کر امیر کو ایک جھٹکا لگا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ چیتو کا لشکر روانہ ہونے کے بعد دو حصّوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ تقریباً ہزار ڈیڑھ ہزار کا دستہ تو بھیکو کی سرداری میں دوسرے راستے سے گیا تھا پھر بھی چیتو پورے پانچ ہزار پر ہی اڑا ہوا کیوں ہے؟

"حضور کی بات ٹھکرانا ہمارے بس میں نہیں ہے۔" امیر کو خاموش دیکھ کر موٹے ساہوکار نے چیتو کی بات مان لی اور امیر سے مخاطب ہو کر بولا۔ "میر صاحب آپ فہرست کو درست کر لیں۔"

"اور کُل ملا کر کتنی رقم ہوئی ہے وہ بھی دیکھ لو۔" چیتو نے کہا۔

امیر تھوڑی دیر تک حساب کرتا رہا پھر سر اٹھا کر بولا۔ "کل ملا کر تین لاکھ پچاسی ہزار کی رقم بنتی ہے۔"

یہ رقم چیتو کے اندازے سے کسی طرح بھی کم نہیں تھی۔ وہ دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا لیکن اچانک وہ اس طرح بول اٹھا جیسے اسے یکایک ہی کوئی بات یاد آگئی ہو۔

"لیکن ہمارے گھوڑوں کے لیے تو کوئی بات نہیں۔"

"گھوڑوں کے لیے؟" موٹا ساہوکار الجھن میں پڑ گیا لیکن پھر وہ ہمت کر کے بولا۔ "حضور لشکر کے ہر آدمی اور اس کے گھوڑے کے کھانے پینے کا انتظام تو ہم نے کر رکھا ہے۔"

"یہ تو مہمان نوازی کہلائے گی۔" چیتو اپنے کندھے اچکا کر جلدی سے بولا۔ "اس طویل سفر میں گھوڑوں کی نالیں گھِس گئی ہیں۔ ان کی نالوں کو بدلنا پڑے گا۔" اتنا کہہ وہ امیر سے بولا۔ "امیر تم اس مد میں پندرہ ہزار روپے لکھ لو اس طرح پورے چار لاکھ کی رقم بن جائے گی۔"

یہ حکم سُن کر کسی نے بھی ایک لفظ نہیں کہا۔ ان سب لوگوں کو تو اسی بات کی خوشی تھی کہ خون خرابے کے بغیر یہ معاملہ طے ہو گیا تھا۔ چیتو نے ساری رقم الگ الگ تھیلوں میں رکھ دینے کے لیے کہا پھر بولا۔ "اب ہم سب کے کھانے پینے کا بندوبست کرو۔"

ساہوکار یہ سُن کر اس طرح کمرے سے نکلے جیسے کمان میں سے تیر نکلے ہوں۔ چلتے چلتے موٹے ساہوکار کا جی چاہا کہ وہ چیتو سے کہے کہ حضور آپ کے لیے ہم نے

بہترین کھانا تیار کیا ہے لیکن اس کی ہمت نہیں ہوئی۔ اسے لگا کہ کہیں بھوکا چیتو اسے پھر نہ ڈانٹ دے۔ غفور خان، راجن اور تیسرا سردار بھی چیتو کے ساتھ باہر نکلنے لگے۔ امیر نے بھی ان کے ساتھ باہر جانے کے لیے قدم بڑھائے ہی تھے کہ چیتو کی آواز اُبھری۔ "امیر علی تم یہیں ٹھہر جاؤ۔ تم میرے ساتھ اسی جگہ کھاؤ گے۔"

امیر کے قدم یکایک ہی تھم گئے۔ اس نے دیکھا کہ چیتو واپس جا کر پھر سے اپنی جگہ پر بیٹھ رہا تھا۔ چیتو نے امیر کو باہر جانے سے روک دیا ہے۔ اس کا غفور خان کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ وہ بڑی حیرت سے کبھی چیتو اور کبھی امیر کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا تو خیال تھا کہ امیر کی بچھائی ہوئی بازی وہ آخری وقت میں اُلٹ کر رکھ دے گا اور چیتو امراوتی کو لوٹنے کے لیے تیار ہو جائے گا۔ لیکن اب اس کا یہ خیال غلط ثابت ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اس پر چیتو نے امیر کو اپنے ساتھ کھانے کے لیے کہہ کر اس کے زخموں پر اور بھی نمک چھڑک دیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں سلگتا ہوا اور دانت پیستا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔

۞

"کھانا تو لذیز بنایا ہے ان لوگوں نے۔" کھاتے کھاتے چیتو نے کہا۔ "امیر علی تم جانتے ہو میں۔ نے تمھیں اپنے ساتھ کھانے پر کیوں بٹھایا ہے؟"

"نہیں جناب۔ لیکن میں تو اسے اپنی خوش نصیبی ہی سمجھتا ہوں۔"

"میں تم سے بہت خوش ہوں امیر۔" چیتو نے محبت بھری نظر اس پر ڈالی۔ "تم نے جس طرح ہراول دستے کی قیادت کی ہے اس کی میں قدر کرتا ہوں اور اب میں یہ اعزاز ہمیشہ کے لیے تمھارے سپرد کرنا چاہتا ہوں۔"

"یہ تو حضور کی مہربانی ہے۔" امیر نے اپنے دل کی دھڑکن پر قابو پانے کی کوشش کی اور اپنی خوشی کو دباتے ہوئے آگے بولا۔ "یہ تو ابھی ابتدا ہی ہے یہ ناچیز اپنے فرض کی ادائیگی میں ہمیشہ آگے ہی رہے گا۔"

"مگر مجھے تو حیرت اس بات کی ہے کہ تم نے ان لوگوں کو سمجھا کس طرح لیا؟" چیتو اب کھل کر بات کرنے لگا۔ "مجھے پچیس ہزار تو ملے ہی ہیں اس کے علاوہ دوسرے لوگوں کے حصے میں سے بھی مجھے رقم ملے گی اس طرح یہ رقم ایک لاکھ تک تو پہنچ ہی جائے گی۔ ویسے سچی بات تو یہ ہے کہ اگر ہم لوٹ مار کرتے تو اس کی آدھی رقم بھی ہمارے ہاتھ نہ لگتی۔"

"لوٹ مار نہ ہو اسی لیے تو مجھے درمیان میں رہنا پڑا تھا مہاراج۔" اب امیر نے بھی کھل کر جواب دینا شروع کر دیا تھا۔ "میرا دل تو آخری وقت تک دھڑک رہا تھا۔"

چیتو امیر کے چہرے کو تک رہا تھا جیسے جیسے وہ امیر کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا ویسے ویسے امیر میں اس کی دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔ لیکن اس کی وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ مگر امیر پر اس کا اعتماد بڑھتا جا رہا تھا۔

"میں اس بات کو سمجھ رہا ہوں امیر کہ لوٹ مار سے تمھیں کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔" چیتو کی یہ بات سن کر امیر نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن چیتو نے اسے موقع نہیں دیا۔ "میں تو غفور خان کی عادت سے اچھی طرح واقف ہوں لوٹ مار اور ظلم کیے بغیر اسے اگر کچھ مل جاتا ہے تو اُسے اس سے تسلی نہیں ہوتی۔"

اب امیر کو لگا کہ اپنے دل کی بات ظاہر کر دینے کا یہ اچھا موقع اس کے ہاتھ لگ گیا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے جلدی سے کہا۔ "ہاں جناب آپ کی مجھ پر بہت زیادہ مہربانی ہونے کی وجہ سے غفور خان ....."

"اس کی تم فکر ہی مت کرو امیر۔" چیتو درمیان میں ہی بول پڑا۔ "میں اس سے خوب واقف ہوں وہ ہمیشہ اپنا ہی فائدہ دیکھتا ہے رحم دلی کے جذبات اس کے دل میں ہیں ہی نہیں۔ یہ ساری باتیں میں سمجھتا ہوں لیکن اس کے باوجود وہ میرے سامنے آنکھ اٹھانے کی ہمت بھی نہیں کر سکتا۔"

"لیکن میرے سامنے تو اس کی آنکھیں اٹھنے لگی ہیں جناب!"

چیتو نے اس کی بات سنی لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ امیر تھوڑی دیر تک اسے دیکھتا رہا لیکن چیتو سر جھکائے کھانے میں مشغول ہو چکا تھا۔

۞

روپے کی تھیلیاں ہاتھ میں آتے ہی لشکر کا ہر شخص خوش

ہو گیا ایک تو ان کی شاندار مہمان نوازی کی گئی تھی اور دوسری یہ کہ انھیں ان کے اندازے سے کہیں زیادہ رقم بغیر کسی خون خرابے کے مل گئی تھی۔ ان کے لیے اس قسم کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ امیر علی نے عقل مندی سے کام لیتے ہوئے یہ سارا بندوبست کر لیا تھا۔ یہ بات سارے لشکر میں پھیل چکی تھی اب وہ سب کے سب امیر کی عزت کرنے لگے تھے۔ امراوتی کے عوام اور ساہوکار بھی امیر کی قدر دان ہو گئے تھے۔ انھوں نے تنہائی میں امیر کو اپنے دل کی بات بتاتے ہوئے کہا۔ "میر صاحب سچی بات تو یہ ہے کہ ہمیں یہ سودا مہنگا نہیں پڑا۔ کیونکہ چیتو کا نام سن کر ہم نے پانچ لاکھ روپے تو رکھ ہی چھوڑے تھے لیکن یہ تو بہت ہی اچھا ہوا کہ آپ نے حکمت اور ہمت سے کام لیا اگر آپ نے ہمیں راہ نہ سجھائی ہوتی تو ہم بے وقوف بن جاتے۔" اتنا کہہ کر اس ساہوکار نے روپے سے بھری ہوئی ایک تھیلی اس کی طرف بڑھا دی اور آگے بولا۔ "ہماری خوشی کی خاطر آپ یہ پانچ سو روپے قبول کر لیں۔"

امیر نے محسوس کیا کہ زبردستی سے حاصل کیے ہوئے پانچ لاکھ سے یہ پانچ سو روپے بہت اچھے ہیں جو خوشی سے اُسے دیئے جا رہے ہیں اس نے تھیلی اپنے ہاتھ میں لے لی اور دھیرے دھیرے اُسے اچھالنے لگا۔ تھوڑی دیر تک وہ ان کی جھنکار سنتا رہا پھر اچانک اس نے وہ تھیلی ساہوکار کو واپس کر دی اور بولا۔ "نہیں میں یہ رقم نہیں لے سکتا۔ احسان کا بدلہ لے کر میں اسے مٹا دینا نہیں چاہتا۔ تم لوگ مجھے محبت سے یاد کرتے رہو یہی میرے لیے بہت ہے۔"

یہ سن کر موٹے ساہوکار کی آنکھیں بھیگ گئیں اور وہ جذباتی لہجے میں بولا۔ "سچ کہوں۔" اس نے اِدھر اُدھر دیکھ کر محتاط لہجہ اختیار کیا۔ "آپ ان لوگوں سے بالکل ہی مختلف ہیں۔ آپ لٹیرے تو لگتے نہیں ہیں۔"

یہ بات امیر کے دل میں چبھنے لگی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ انھیں کیسے بتائے کہ وہ اصل میں کون ہے؟ وہ ان سے کیسے کہے کہ وہ تو ٹھگ سے لٹیرا بنا ہے؟

"آپ چپ کیوں ہو گئے میر صاحب؟"

"میں تم لوگوں سے ایک چیز مانگنا چاہتا ہوں اگر تم لوگوں کو اعتراض نہ ہو تو میرے دس ہزار کے بجائے تم لوگ مجھے اتنا سونا دے دو تاکہ سنبھالنے میں دشواری نہ ہو۔" امیر نے کہا۔

"ارے یہ بھی بھلا کوئی کہنے کی بات ہے۔ آپ حکم دیں۔ میں ابھی اس کا انتظام کیے دیتا ہوں۔" موٹا ساہوکار ہنستے ہنستے بولا تو امیر نے دل ہی دل میں سوچا کہ وہ اگر ان سادہ دل لوگوں کے لیے کچھ اور بھی کر سکے تو کتنا اچھا ہو۔

۞

امراوتی کی مہمان نوازی کا لطف اٹھانے کے بعد چیتو نے اپنے لشکر کو کوچ کا حکم دے دیا۔ امراوتی کے لوگ امراوتی کے بڑے چوک پر اس طرح اُمنڈ آئے تھے جیسے خود ان کا لشکر جنگ کے میدان سے لوٹ رہا ہو۔ انھیں اس بات کا غم نہیں تھا کہ یہ لشکر ان کے گاؤں سے پانچ لاکھ جتنی خطیر رقم لے کر جا رہا ہے۔ یہ بات چیتو کے لیے بڑی حیرت انگیز تھی۔ وہ امیر سے بولا۔ "امیر تم نے تو واقعی ان لوگوں پر جادو کر دیا ہے۔ ہمارا پکڑا ہی شاندار ستھان ہو گیا ہے۔ اگر آئندہ بھی ہر جگہ لوگ ہمیں اسی طرح دھن دولت دے دیا کریں تو ہمارا کام نہایت آسان ہو جائے۔"

"حضور گستاخی معاف ہو تو ایک بات کہنے کو جی چاہتا ہے۔" امیر نے مودب لہجے میں کہا۔

"بے دھڑک کہہ ڈالو امیر۔" چیتو نے خوش دلی سے اجازت دے دی۔

"ہمارے ساتھ جن لوگوں نے اتنا اچھا سلوک کیا ہے۔ ان لوگوں کو ہمیں کچھ نہ کچھ تو دینا ہی چاہیئے۔"

"لیکن ہم یہاں دینے نہیں بلکہ لینے آئے تھے امیر۔" چیتو کے لہجے میں ذرا سختی آ گئی تھی لیکن امیر کے چہرے پر کوئی گھبراہٹ نہیں تھی۔ وہ بڑے اطمینان سے بولا۔ "لیکن میں نے تو اپنی رائے کا اظہار کیا تھا دینا نہ دینا آپ کی مرضی کی بات ہے۔"

"لیکن انھیں دینا کیا ہے یہ تو بتاؤ؟"

"ایک وعدہ۔" امیر نے چیتو کی طرف دیکھے بغیر کہہ دیا۔ "اگر آپ کو امراوتی کا دل ہمیشہ کے لیے جیت لینا ہے تو آپ کو ان لوگوں کے دل سے لٹیروں کے خوف کو دور کرنا ہو گا۔"

چیتو اس کی بات سمجھ گیا اور سمجھ کر مسکرانے لگا۔ اس نے صرف چند ہی لمحوں تک سوچا پھر اونچی آواز میں بولا۔ "لوگو

میری بات سُنو۔" اس کی کڑک دار آواز سُن کر ہزاروں آنکھیں اس کی طرف اٹھ گئیں اور لشکر کا ہر آدمی بھی حیرت سے چیتو کو دیکھنے لگا تھا۔ غفور خان تو اپنا گھوڑا دوڑاتا ہوا امیر اور چیتو کے قریب آگیا تھا۔

"جس طرح آپ لوگوں نے ہماری عزت کی اور جتنی شاندار مہمان نوازی کی اس سے میں بہت خوش ہوا ہوں اس لیے جاتے جاتے میں آپ سے ایک وعدہ کرنا چاہتا ہوں۔" ہر شخص اپنی پلکیں جھپکانا بھول چکا تھا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ چیتو ان سے کس قسم کا وعدہ کرنا چاہتا ہے؟

"آج کے بعد تمھیں لٹیروں سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب جب کبھی بھی ہم امراوتی آئیں گے تو ایک مہمان کی حیثیت سے آئیں گے اور ہماری طرف سے کسی پر بھی کوئی زیادتی نہیں ہوگی اس کا میں آپ لوگوں سے وعدہ کرتا ہوں۔" چیتو نے اُونچی آواز میں کہا تو ہزاروں لوگوں کے اس جمِ غفیر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ سا ہو کار ہاتھ جوڑ جوڑ کر چیتو کا شکریہ ادا کرنے لگے تھے لیکن امیر نے انھیں سمجھایا کہ اس طرح نہیں بلکہ نعرے لگا کر اپنی خوشی اظہار کرو۔

"چیتو مہاراج کی جے ہو۔" کے فلک شگاف نعروں سے آس پاس کا ماحول گونج اٹھا۔ نعروں کی اس آواز سے چیتو کا سینہ فخر سے پھُول گیا۔ اور اس نے اشارے سے امیر کو اپنے قریب بلا لیا اور اسی طرح اُونچی آواز میں کہا۔ "امیر میں نے تمھاری بات مان لی اب تو تم خوش ہو نا؟" اتنا کہہ کر اس نے امیر کو شاباشی دی۔ یہ دیکھ کر غفور کی آنکھوں میں ایک عجیب سی سرخی دوڑنے لگی اور چیتو نے اس کی جانب توجہ دیے بغیر اپنے لشکر کو آگے بڑھنے کا حکم دے دیا۔

امیر ایک گاؤں کے بعد دوسرے گاؤں سے گزرتا جا رہا تھا۔ وہ لُوٹ مار اور ظلم و تشدد کو ہر جگہ ٹالتا جا رہا تھا جس گاؤں سے اسے جو کچھ مل جاتا اُسی سے اپنے ساتھیوں کو خوش کر کے وہ اپنے دستے کو کوچ کرا دیتا تھا۔ لیکن کرنجاہ گاؤں میں تو بات ہی کچھ اور ہوگئی۔ ہوا یہ کہ گاؤں کے صدر دروازے پر پہرا دینے والے سپاہیوں نے انھیں اندر جانے سے روک دیا اور امیر کے ماتھے پر بَل پڑ گئے اس نے اپنے ساتھیوں کو حکم دے دیا۔ "زور زبردستی اندر گھُس جاؤ۔" اس حکم کے سنتے ہی تمام باغی لٹیرے جوش میں آکر نعرے لگانے لگے۔ امیر کا خیال تھا کہ دیوار پھلانگنے کے بعد گاؤں کے سپاہی ان کے سامنے کھڑے نہیں رہ سکیں گے۔ لیکن اس کا یہ خیال غلط ثابت ہوا اس کے ساتھی جیسے ہی دیوار پر چڑھ کر اندر کودے کہ ان پر اندر سے حملہ کر دیا گیا۔

"ہم سے ٹکرانے کا ارادہ ترک کر دو۔" امیر نے چیخ کر کہا۔ "ہمارے پیچھے ابھی پانچ ہزار کا لشکر آرہا ہے۔ تمھارے گاؤں کا ایک بچہ بھی زندہ نہیں رہے گا۔"

لیکن جب اس دھمکی کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا تو اس کے ساتھیوں نے اپنی کھوئی ہوئی ہمت اکٹھی کر لی۔ وہ دیوار سے نیچے کودتے اور گاؤں کے سپاہیوں کو موقع دیئے بغیر اپنی تلوار چلانے لگتے۔ اس طرح تھوڑی ہی دیر میں وہاں سناٹا پھیل گیا اور صدر دروازہ کھُل گیا اور امیر کا لشکر اندر داخل ہو گیا۔ اس وقت اندر کوئی بچہ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ باغیوں میں سے دس زخمی ہوئے تھے جبکہ بیس پچیس سپاہی بری طرح گھائل ہوئے تھے۔ گاؤں کے لوگ اپنے اپنے گھروں کے دروازے اور کھڑکیاں بند کر کے گھر کے کونوں میں دُبک گئے تھے۔

یہ دیکھ کر امیر کو لگا کہ اب وہ ان جوش میں آئے ہوئے لٹیروں کو روک نہیں سکے گا۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے ایک جگہ کھڑے ہو کر بہت زور سے چلا کر گاؤں والوں کو مخاطب کیا۔ "تم لوگ اگر اسی طرح گھروں میں بند ہو گئے تو ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاؤ گے۔ تم لوگوں کی بہو بیٹیوں کی عزت خاک میں مل جائے گی۔ بہتر یہی ہے کہ تم باہر آجاؤ اپنی غلطی کی معافی مانگو اور تباہی و بربادی سے بچ جاؤ۔"

لیکن سامنے آنے کی ہمت کون کرتا؟ یوں لگ رہا تھا کہ پورے گاؤں میں کوئی زندہ آدمی ہی موجود نہیں ہے۔ امیر گاؤں والوں کی یہ حالت دیکھ کر سوچنے لگا کہ اب صحیح معنوں میں اس کی کسوٹی ہونے والی ہے۔

"ہمیں ذرا صبر سے کام لینا چاہیئے۔" تھوڑی دیر بعد

اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "سردار کو آنے دو پھر ہم دیکھ لیں گے کہ یہ کب تک سامنے نہیں آتے۔" اس کا خیال تھا کہ چیتو کے آنے سے قبل ہی گھنٹے دو گھنٹے کے اندر ہی یہ لوگ ہتھیار ڈال دیں گے لیکن اس کا یہ اندازہ بھی غلط نکلا اور پھر جو نہیں ہونا چاہیئے تھا وہ ہو کر رہا۔

چیتو اپنے لشکر کے ساتھ آپہنچا پھر اس سے پہلے کہ وہ چیتو کو سمجھاتا غفور خان نے موقعے سے فائدہ اٹھا لیا۔ وہ غصے سے بولا۔ "اپنے ساتھیوں پر ہتھیار اٹھانے والوں کو میں بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کر دوں گا۔ باغیوں کے لہُو کی ایک بوند کے بدلے میں یہاں خون کی ندیاں بہا دوں گا۔" اس کے چہرے پر وحشیانہ جنون ناچنے لگا تھا اور لشکر کے تمام لوگ بڑی بے چینی سے چیتو کا حکم سننے کے منتظر تھے۔ لُوٹ مار اور زور زبردستی کے لیے ان کی ہتھیلیاں کھُجلانے لگی تھیں یکایک چیتو نے انھیں اجازت دیتے ہوئے کہا۔ "جاؤ اور تم لوگوں کے جو جی میں آئے کرو۔" اس کا حکم سُننا تھا کہ لشکر میں ایک بھگدڑ سی مچ گئی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے آگ کے شعلوں سے گاؤں کا اندھیرا تھرتھرانے لگا۔ بچوں کی چیخیں اور عورتوں کے شور و غل سے آسمان گونجنے لگا۔ مارو ختم کر دو۔ لُوٹ لو، کی آوازوں سے ماحول پر ایک سنسناہٹ سی طاری ہو چکی تھی۔

امیر اور اس کے ساتھیوں کو پہلی بار ان لٹیروں کے ظلم کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا موقع ملا تھا وہ سب اس طرح اپنے خیمے میں گھُس گئے جیسے یہ ظلم ان سے دیکھا نہ جا رہا ہو۔ امیر کا دل بار بار اس سے کہہ رہا تھا۔ "امیر بھاگ جاؤ۔ تم کس لیے ان کے ساتھ آئے ہو؟ ان لٹیروں کا ساتھ چھوڑ دو۔ تم چیتو سے کہہ دو کہ انگریزوں سے لڑائی کرنے کے بدلے ان غریب لوگوں پر ظلم کرنے میں کون سی بہادری ہے؟"

موتی رام، پیر خان اور افلاطون وغیرہ سب کے سب بڑی اُداس نظروں سے امیر کو تک رہے تھے۔ کافی دیر تک ان میں سے کوئی بھی کچھ بول نہیں سکا۔ لیکن تب ہی اچانک ایک چیخ اس کی سماعت سے ٹکرائی اور امیر نے ایک جھٹکے سے پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا ایک نوعمر لڑکی کو کوئی لٹیرا زبردستی گھسیٹ کر لے جا رہا تھا اور وہ لڑکی اس کی گرفت سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی وہ چیخ رہی تھی لیکن وہ لٹیرا اس کی بے بسی پر قہقہے لگاتا ہوا اسے گھسیٹ رہا تھا۔

یکایک امیر دانت پیستا ہوا اپنی جگہ سے اٹھا اور افلاطون نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے روکنے کی کوشش کی۔ لیکن امیر ایک جھٹکے سے باہر نکل گیا۔ لیکن باہر کا منظر دیکھتے ہی اس کا سارا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ اس کے سامنے غفور خان کھڑا ہنس رہا تھا۔

"میاں ذرا دیکھو تو سہی میں کیسی خوبصورت چڑیا پکڑ کر لایا ہوں۔" غفور خان کی بات سُن کر امیر کی آنکھوں میں نفرت کے سائے اُمڈ آئے وہ لڑکی بڑی حسرت سے ان کی طرف تاک کر عاجزی سے کہنے لگی۔ "مجھے چھڑا لو۔ اس شیطان کے پنجے سے مجھے بچا لو۔"

"ہا... ہا... ہا۔" غفور خان نے قہقہہ اُچھالا۔ "پیاری اس شیطان کے بازوؤں میں کتنی طاقت ہے اس کا تمھیں اندازہ نہیں ہے۔ ہاں جاؤ میری رانی زندگی بھر عیش کرو گی۔" غفور خان لڑکی کو امیر کے نزدیک گھسیٹ لایا اور پھر امیر سے بولا۔ "تم حیران حیران سے کیوں کھڑے ہو امیر؟ ہم لٹیروں کا تو کام ہی یہی ہے۔ یہ تو..."

"لیکن سردار اس کی عزت لوٹنے سے کیا فائدہ ہوگا۔ ہمیں تو اس کا گھر لوٹنے سے زیادہ دولت مل جائے گی۔" امیر نے لڑکی کو بچانے کی کوشش کی لیکن غفور خان اس کی بات سُن کر ہنس دیا اور بولا۔ "ارے تم تو ابھی تک بچے ہو۔ میں اس کے گھر میں داخل ہوا ہی تھا کہ اس کی ماں میرے آڑے آگئی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے سالی کی زندگی پوری ہو گئی ہو، میں نے اپنی تلوار اس کے پیٹ میں بھونک دی اور اسے اٹھا لایا۔ ہا... ہا... ہا..."

لڑکی اس کے مضبوط پنجے کی گرفت سے چھوٹنے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی یہ دیکھ کر غفور خان نے بڑے زور سے اس کی کلائی مروڑ دی اور چیخ کر بولا۔ "بے وقوف لڑکی تُو چاہے جتنی بھی طاقت لگا لے۔ لیکن میں تجھے اس طرح نہیں چھوڑوں گا۔"

غفور خان کے مُنہ سے یہ الفاظ نکلے ہی تھے کہ امیر کا ہاتھ اپنی تلوار کے قبضے پر رینگ گیا۔ غفور خان اس کی

جانب اپنی پیٹھ کر کے لڑکی کے چہرے پر جھک رہا تھا امیر کے لیے اس پر وار کرنے کا یہ بہترین موقع تھا۔ لیکن تلوار ابھی نیام سے آدھی باہر نکلی تھی کہ اس کا ہاتھ خود بخود رُک گیا اسے عظیمہ کی یاد آگئی تھی۔ پھر اچانک اسے لگا کہ غفور خان پر تلوار اٹھانے کے بعد وہ یہاں سے زندہ واپس نہیں جا سکے گا۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے تلوار کو پھر سے نیام میں ڈال لیا اس کا سارا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ سارا غصہ پگھل گیا اور وہ کسی پتھر کی مورتی کی طرح ساکت کھڑا رہ گیا۔ غفور خان اس کی نظروں کے سامنے اس لڑکی کو گھسیٹتا ہوا لے گیا۔ لڑکی چیختی رہی۔ امیر نے دیکھا اس کے پاؤں سے خون بہہ رہا تھا۔ مگر وہ چپ تھا اور اس کی آنکھیں آنسو بہا رہی تھیں۔

پھر تھوڑی دیر بعد پیپل کے درخت کے پیچھے سے اُس مظلوم لڑکی کی چیخ اُبھری جیسے وہ چپ چاپ سنتا رہا اچانک اُسے یاد آیا کہ بالکل ایسی ہی چیخ ہاتھی کی سونڈ میں جکڑی ہوئی گُل نے بھی ماری تھی۔ گُل کی یاد آتے ہی امیر کے دانت ایک دوسرے پر مضبوطی سے جم گئے۔ "گُل کی چیخ بھی تو بالکل ایسی ہی چیخ تھی۔" وہ دل ہی دل میں اس چیخ کو یاد کرتے ہوئے بولا۔ پھر اس کے جبڑے تنگ ہوتے چلے گئے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اندر ہی اندر کوئی فیصلہ کر رہا ہو۔ یکایک وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ "غفور خان اگر تمھاری موت میرے ہاتھ سے نہ ہوئی تو میرا نام امیر علی نہیں۔"

مگر پیپل کے درخت کے پیچھے سے آتی ہوئیں چیخیں تھم چکی تھیں۔ ایک وحشی درندے کے سامنے ایک بے بس مظلوم لڑکی چیختے چیختے دم توڑ چکی تھی۔

یہ رات امیر نے بڑی بے چینی میں گزاری تھی۔ باہر تیز ہوا چل رہی تھی جو اس کے خیمے سے ٹکرا ٹکرا کر اس کے دل کی آگ کو اور بھی بھڑکا رہی تھی۔ لٹیروں کے اس ظلم میں اپنے آپ کو شامل نہ کر کے امیر اور اس کے خاص ساتھی اپنے خیمے میں سو گئے تھے لیکن امیر کی آنکھیں تو بند ہی نہیں ہو رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں بار بار اس لڑکی کی تصویر گھوم جاتی تھی۔ اس مظلوم لڑکی نے کئی بار اسے مدد کے لیے پکارا تھا اور یہی افسوس اسے کچوکے لگا رہا تھا کہ وہ اس کی کوئی مدد نہیں کر سکا تھا۔ ساری رات وہ عورتوں، بچوں اور مردوں کی چیخیں سنتا رہا اور اسی سے وہ اندازہ لگا لیتا کہ لٹیروں کی لُوٹ مار ابھی جاری ہے۔ آگ کے شعلے اب کم ہو گئے تھے لیکن یہ آگ ابھی پوری طرح تھمی نہیں تھی۔

آخر یہ کیسی بربادی ہے؟ امیر سوچتا رہا۔ دس ہزار کی کمائی تو ہو چکی ہے اب وہ کیوں نہ ان لٹیروں کا ساتھ چھوڑ دے؟ آخر اُسے اس ظلم میں حصے دار بننے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اُس کے اپنے ساتھی تو کسی ہچکچاہٹ کے بغیر اس کے ساتھ واپس چلنے کے لیے تیار ہو جائیں گے کیونکہ یہ وحشیانہ ظلم تو ان سے بھی برداشت نہیں ہو رہا ہے۔ مگر یہاں سے بھاگ نکلنا بھی تو آسان نہیں ہے۔ سارے دیش میں یہ خبر پھیل چکی ہے کہ چیتو اپنے سفر پر روانہ ہو چکا ہے اور وہ اگر اپنے دس بارہ ساتھیوں کے ہمراہ یہاں سے فرار ہو بھی جاتا ہے تو بھی راستے میں کوئی نہ کوئی انھیں لٹیروں کی حیثیت سے پہچان سکتا ہے۔ اس طرح لٹیروں کے ریوڑ میں وہ گرفتار بھی ہو سکتے ہیں یا پھر چیتو کے ظلم کا بدلہ اس گاؤں کے لوگ اس سے ہی لے لیں گے اور یہ بھی ممکن ہے کہ خود چیتو ہی انھیں زندہ نہ چھوڑے۔ نہیں نہیں اُسے ایسا کوئی خطرہ نہیں مول لینا چاہیئے۔ لٹیروں کے اس وحشیانہ ظلم میں غفور خان کا ہاتھ ہی سب سے زیادہ ہے اور اگر اُسے غفور خان کو ختم کرنا ہے تو اُسے چیتو کے ساتھ ہی رہنا ہوگا۔ اور کشت و خون کا یہ تماشا اُسے چپ چاپ دیکھتے رہنا ہوگا اور اس کا عادی بن جانا پڑے گا۔

امیر سوچتا رہا اور رات گزرتی رہی۔ پھر یکایک یوں لگنے لگا کہ جیسے آسمان بھی زمین کی اس تپش کو برداشت کر سکا ہو۔ کیونکہ تھوڑی ہی دیر بعد بارش برسنے لگی تھی۔ کم سے کم اس بارش نے تو امیر کو راحت بخشی تھی۔ لیکن اس کی آنکھیں اب دھیرے دھیرے بند ہونے لگی تھیں۔

صبح کے وقت گاؤں کی تباہی کے مناظر دیکھ کر امیر کا دل خون کے آنسو رونے لگا شاید ہی کوئی مکان ہوگا جو آگ سے محفوظ رہا ہو۔ بہت سی لاشیں تو راستوں میں بکھری پڑی تھیں۔ گھر گرہستی کے سامان گلیوں میں

بکھرے ہوئے تھے زخمی ہونے والوں کی کراہیں اور عزت سے محروم کر دی جانے والی عورتوں کی سسکیوں سے فضا سوگوار تھی۔ بدنصیب خاندانوں کی چیخ و پکار تو پتھروں کو بھی پگھلا رہی تھی۔ لیکن ظالم لٹیروں پہ اس کا کوئی اثر امیر کو دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ انسان اس حد تک بھی ظلم کر سکتا ہے؟ اس خیال نے امیر کو ڈگمگا دیا تھا۔ وہ اپنے غم کے بوجھ کو ہلکا کرنے کے لیے اپنے دستے کو لے کر صبح ہی وہ چیتو سے اجازت لینے اس کے پاس گیا تو چیتو نے اس سے پوچھا "کیوں امیر رات کی لُوٹ مار میں تمھارے ہاتھ کتنا مال آیا؟"

"گستاخی معاف ہو حضور کیونکہ مجھ سے یہ ظلم دیکھا نہیں جا رہا تھا۔" امیر کے چہرے کی اُداسی اور آواز کی لرزش کو محسوس کرتے ہوئے چیتو یہ سمجھ گیا کہ امیر کے دل کو اس لُوٹ مار سے ضرور صدمہ پہنچا ہے۔ اسی لیے وہ امیر کو سمجھاتے ہوئے بولا۔ "دیکھو امیر ہر آدمی برابر نہیں ہوتا۔ امراؤ کے لوگوں نے تو سمجھ داری سے کام لیا تھا۔ لیکن اس گاؤں کے لوگوں نے تو ہمارے لشکر سے مقابلہ کرنے کی ٹھان لی تھی۔ ہمارے جتنے ساتھی زخمی ہوئے تھے ان کا حساب سارے گاؤں والوں کو ہی چکانا پڑ گیا۔ اگر ہم ایسا نہ کرتے تو آگے جا کر ہمارے لیے مشکلات پیدا ہو سکتی تھیں۔"

"جیسی آپ کی مرضی حضور۔" کہہ کر امیر نے جھک کر اُسے سلام کیا اور واپس مڑ گیا۔ پھر تھوڑی ہی دیر بعد اس کا ہراول دستہ وہاں سے کوچ کر چکا تھا۔ منگرال کے علاقے کو پار کرنے کے بعد جب اس کا دستہ کچھ اور آگے بڑھا تو امیر کو ایک چشمہ دکھائی دیا۔ پانی کے اس چشمے کو دیکھ کر امیر نے اپنا گھوڑا روک دیا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں ٹھگ بننے کے بعد اس نے اپنا سب سے پہلا شکار کیا تھا۔ اسے اُس ساہوکار کی یاد آگئی جسے اپنے رومال سے اُس نے ختم کیا تھا۔ اس رات کی یاد آتے ہی وہ سارا منظر اس کی آنکھوں میں گھوم گیا۔ پہلی بار جب اس نے اپنے رومال کا استعمال کیا تھا تو کیسا عجیب سا جوش اُس کے اندر سرایت کر گیا تھا؟ اس کے باپ نے بھی اس کی کارکردگی پر اسے شاباشی دی تھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ اُس وقت بھی خوش نہیں تھا اور وہ یہ محسوس ہی نہیں کر رہا تھا کہ اس نے سچ مچ کوئی کارنامہ انجام دیا ہے۔

پانی کے بہتے ہوئے چشمے میں پیر ڈالے وہ کھڑا کھڑا سوچ رہا تھا کہ اچانک پیر خان نے اُس کے پیچھے آ کر کہا۔ "امیر میاں تم نے اپنا پہلا شکار اسی جگہ پر کیا تھا نہیں یاد ہے نا؟"

"ہاں پیر خان ہم لوگ آخری لمحے تک اپنے شکار کو اندھیرے میں رکھ کر صرف دو چار پلوں میں ہی اس کا گلا گھونٹ دیتے تھے جبکہ یہ باغی لٹیرے تو لوگوں کو تڑپا تڑپا اور سسکا سسکا کر مارتے ہیں۔" امیر ایک گہرا سانس لے کر بولا تو پیر خان اس کے خیالات سُن کر چونک پڑا۔ اُسے موتی رام کے کہے ہوئے الفاظ یاد آ گئے بہت پہلے موتی رام نے کہا تھا۔ "پیر خان تم یہ بات مانو یا نہ مانو لیکن امیر کے اندر ضرور کسی روح کا بسیرا ہے کیونکہ یہ سب لوگوں سے بالکل ہی مختلف دکھائی دیتا ہے اور جو کوئی بھی اس کے ساتھ رہے گا وہ فائدے میں ہی رہے گا۔"

"وہ جو سامنے پہاڑی دکھائی دے رہی ہے وہیں ہم لوگوں نے لاشیں دفن کی تھیں کیوں پیر خان؟" امیر اس طرح بولا جیسے وہ پیر خان کو ماضی کی یادوں میں واپس لانا چاہتا ہو۔ "رات کے اندھیرے میں وہ جگہ ہمیں بہت محفوظ لگ رہی تھی۔ لیکن اس وقت دیکھو تو اُسی جگہ کے قریب سے راستہ نکلا ہوا ہے اور آنے جانے والوں کی نظروں سے وہ جگہ کسی طور بھی محفوظ نہیں ہے۔"

"لیکن اب کس بات کی فکر ہے؟" پیر خان نے اس طرح جیسے وہ امیر کی بات کا مطلب نہ سمجھا ہو۔ "اس بات کو تو اب ایک عرصہ بیت گیا۔"

"ہاں۔ لیکن اب آئندہ ایسی بھول نہیں ہونی چاہیئے۔" امیر نے انتہائی سنجیدہ لہجے میں دھیرے سے کہا لیکن پیر خان تو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُسے گھورنے لگا تھا۔ "آئندہ" امیر کے مُنہ سے نکلا ہوا یہی ایک لفظ ایسا تھا جو بار بار پیر خان کے دل پر ہتھوڑے کی طرح لگ رہا تھا۔ یکایک اُس کی آنکھیں چمک اٹھیں اور وہ اس خیال سے خوش ہو گیا کہ کیا واقعی امیر دوبارہ ٹھگ بننے کے لیے تیار ہو چکا ہے؟ وہ موتی رام کو یہ خوش خبری سُنانے کے لیے بے چین ہو گیا۔

اور امیر سے کچھ پوچھے بغیر وہ دوڑتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

باسم پور جیسے چھوٹے سے گاؤں کے غریب دیہاتیوں نے پھل اور مٹھائیوں سے امیر اور اس کے ساتھیوں کی مہمان نوازی کی پھر وہاں سے امیر کا دستہ گوداوری ندی کے کنارے کنارے چلتا ہوا امراوتی جیسے ایک بڑے شہر نیندر کی جانب بڑھنے لگا۔ نیندر میں بھی امیر نے امراوتی والی ترکیب آزمائی اور وہاں کے لوگوں سے چیتو کے لیے ڈیڑھ لاکھ روپے منظور کروا لیے۔ اس سودے کے بدلے میں خفیہ طور پر امیر کو تین ہزار روپے اور تھوڑے سے زیورات ملے تھے۔ اس طرح نیندر تو ان باغیوں کے ظالمانہ سلوک سے بچ گیا تھا لیکن غفور خان نے اس کے قریبی گاؤں ویران کو بالکل ہی تباہ و برباد کر دیا۔ جیسے جیسے امیر چیتو کو اس ظلم و بربریت کے راستے سے ہٹا کر رحم دلی اور انسانیت کے راستے پر لانے کی کوشش کرتا جاتا تھا ویسے ویسے غفور خان کے غیض و غضب میں اضافہ ہوتا جاتا تھا اور وہ ظلم کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔

نیندر کے قریب گوداوری ندی کا پانی بہت گہرا تھا۔ اس ندی کو پار کرنے کا کوئی انتظام نہیں ہو سکا تھا۔ اسی لیے امیر کا دستہ ندی کے کنارے کنارے جنوب کی جانب بڑھ رہا تھا۔ لیکن گنگا دھر گھاٹ پر انھیں کئی بڑی بڑی کشتیاں مل گئیں جن پر سامان رکھنے کے بعد وہ سب کے سب دوسرے کنارے تک پہنچ گئے۔ انھیں شہر کے اندر داخل ہونے سے روکنے کے لیے تین چار سو لوگوں نے ان کا سامنا تو کیا تھا لیکن باغیوں کے ایک بہت بڑے لشکر کے سامنے ان کی حیثیت ہی کیا تھی؟ غفور خان کو اپنا غصہ اتارنے کا ایک اور موقع مل گیا اس نے بڑی بے رحمی سے پورے شہر کو لوٹا اور جو جی میں آیا کر گزرا۔ امیر کے دل میں غفور خان سے نفرت پل پل بڑھتی جا رہی تھی۔

گنگا دھر سے باغیوں کا یہ لشکر شمال کی طرف بڑھ گیا۔ بڈر، بھوگتی اور پھر حسن آباد جیسے دولت مند شہر کو انھوں نے خوب کھل کر لوٹا اور بے دھڑک آگے بڑھتے چلے گئے۔

"امیر یہاں سے چند میل کے فاصلے پر کلیانی شہر آباد ہے جسے لوٹنے کے لیے تمھیں جانا ہے۔" چیتو نے جان بوجھ کر اُسے یہ ذمہ داری سونپی ہے۔ یہ بات امیر سمجھ چکا تھا۔ اسی لیے اس نے تھوڑی دیر تک سوچا پھر چیتو سے بولا "کیا اس شہر کو مجھے اپنی مرضی سے لوٹنا ہے یا پھر...؟"

چیتو تیز نظروں سے اُسے گھورتا رہا۔ اس طرح کی باتیں سننے کی اُسے عادت نہیں تھی۔ امیر کو لگا کہ اب چیتو یقیناً اس پر برس پڑے گا لیکن اُس کا یہ انداز غلط ثابت ہوا کیونکہ چیتو کا چہرہ یکایک ہی پُرسکون ہو گیا اور وہ بڑے ملائم لہجے میں بولا "دیکھو امیر میں تمھیں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ لٹیروں کے لشکر کے ساتھ باہر نکلنے کے بعد حالات کے مطابق کام کرنا پڑتا ہے۔ میں جب کسی کام کی ذمے داری تمھیں سونپتا ہوں تو یہ پھر تمھارا کام ہے کہ اسے کس طرح پورا کیا جائے؟"

"نوازش ہے آپ کی۔" کہہ کر امیر ادب سے جھکا۔ پھر تھوڑی دیر بعد وہ تین سو باغیوں کے دستے کو لے کر کلیانی پر حملہ کرنے کے لیے روانہ گیا۔

"بھاگو۔ بھاگو۔ لٹیرے آ رہے ہیں۔" سارے راستے امیر گھبرائے ہوئے لوگوں کی آوازیں سنتا رہا۔ پھر جب وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ کلیانی پہنچا تو اُسے وہ کچھ دیکھنے کو ملا جس کے متعلق اُس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ سارا شہر سنسان پڑا تھا۔ گلیوں میں کوئی کتا بھی نظر نہیں آ رہا تھا تمام گھروں کی کھڑکیاں بند تھیں اور دروازوں پر باہر سے تالے لگے ہوئے تھے۔ "کمال ہے ہمارے آتے ہی تمام لوگ ہجرت کر گئے۔" امیر الجھن میں پڑ گیا۔

"نہیں میر صاحب مجھے یوں لگتا ہے کہ شہر کے باہر جو قلعہ ہے اسی میں وہ سب لوگ بند ہو گئے ہیں۔" ایک راجپوت سردار نے امیر کی توجہ اس جانب مبذول کرائی۔

"تو پھر چلو پہلے ہم انھیں باہر نکالنے کی کوشش کریں۔" امیر کی یہ بات سن کر ان سب لوگوں کو بڑی حیرت ہوئی کہ شہر کو لوٹنے کا اتنا بہترین موقع ہوتے ہوئے آخر امیر انھیں کیوں ہوشیار کرنا چاہتا ہے؟ لیکن انھیں امیر کا حکم تو ماننا ہی تھا اس لیے انھوں نے پورے قلعے کو اپنے

گھیرے میں لے لیا۔ "کہاں ہو بے وقوفو باہر نکل آؤ؟ ہم تمھیں کچھ نہیں کہیں گے۔ لیکن اگر تم لوگ اسی طرح بند ہو کر بیٹھے رہے تو ہم قلعہ توڑ کر تم لوگوں کو ختم کر دیں گے۔" امیر نے چیخ کر شہریوں کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن اندر سے کوئی جواب نہیں ملا۔ چند لمحوں تک تو امیر نے ان کے جواب کا انتظار کیا پھر ہونٹوں ہی ہونٹوں میں بڑبڑایا "یہ لوگ بہت ہی بزدل ہیں۔ میں انھیں ان لٹیروں کے ظلم سے بچانا چاہتا ہوں اور وہ ہیں کہ مجھے اپنا چہرہ بھی نہیں دکھانا چاہتے۔" اچانک اسے خیال آیا کہ کیوں نہ قلعے کو توڑ کر اندر داخل ہوا جائے؟ مگر پھر فوراً ہی اس نے اپنے خیال کو اپنے دل میں ہی دبا دیا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر ان لٹیروں کو کھلی چھوٹ مل گئی تو اس کا نتیجہ بُرا ہی نکلے گا۔ شاید چیتو نے اسے آزمانے کے لیے ہی یہ کام سونپا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی ذرا سی لرزش اس کے دشمنوں کو زبان کھولنے کا موقع فراہم کر دے۔

"ٹھیک ہے یہ لوگ بھلے ہی قلعے میں بند ہو کر بیٹھے رہیں۔" امیر نے ساری باتیں سوچ لینے کے بعد اپنے نائب سرداروں سے کہا "ہم ان کے گھروں کو لوٹ کر آگے بڑھ جائیں گے۔" امیر نے یہ بات اپنی پوری قوت سے چیخ کر کہی تھی تاکہ قلعے کے اندر کے لوگ اس کی بات سن کر کوئی جواب دیں۔ آخری وقت تک اس نے اُمید کا دامن نہیں چھوڑا تھا مگر اس بار بھی اندر سے کوئی جواب نہیں ملا۔ شاید قلعے میں بند لوگوں کو اپنی جان اور عزت ہی بچانی تھی جب ہی تو انھیں اپنے گھر اور دولت کی کوئی پروا نہیں تھی۔

تھوڑی دیر بعد لٹیروں نے بڑے آرام سے کلیانی شہر کو لوٹنا شروع کر دیا ان کے سامنے کسی قسم کی مزاحمت نہیں ہوئی اسی لیے نہ کوئی رکاوٹ پیش آئی اور نہ ہی کسی پر کوئی ظلم زبردستی ہوئی۔ امیر نے اپنے ساتھیوں کو پہلے ہی سے تاکید کر دی تھی کہ وہ کسی ایک گھر کو بھی آگ نہ لگائیں اپنے کام کی چیز اٹھالیں مگر بے کار چیزوں کو برباد نہ کریں۔

اس طرح کلیانی کو لوٹنے کے بعد امیر اپنے دستے کے ساتھ شمال کی جانب کوچ کر گیا۔ وہیں کرشنا ندی کے کنارے چیتو نے اپنا پڑاؤ ڈال رکھا تھا۔ چیتو کی چالاکی کا راز اب امیر کی سمجھ میں آتا جا رہا تھا۔ اپنے ساتھیوں پر اس کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی اور ہر کوئی اس سے خوف کھاتا تھا لیکن اس کے باوجود چیتو کی ہمیشہ یہی کوشش ہوتی کہ کسی کے ساتھ ناانصافی نہ ہو۔ امیر نے اس عرصے میں یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ غفور خان کا رویہ اور اس کے ظلم و ستم چیتو کو پسند نہیں ہیں۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود وہ اُسے یہ سب کرنے کی اجازت بھی دے دیتا تھا اور خود اُسے اس بات کی اجازت دیتا تھا کہ وہ جس طرح چاہے گاؤں کے سیٹھوں سے روپیا نکلوا لے۔ امیر چیتو کی اسی دہری چال کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک طرف تو غفور خان کو ظلم و ستم روا رکھنے کی اجازت اور دوسری جانب اسے اپنی مرضی سے کام نکالنے کی ترغیب۔ یہ چیتو کی کوئی چال ہے یا چالاکی؟

اپنے تمام ساتھیوں کا دل خوش کرنے کے لیے اس نے آس پاس کے شہروں سے ناچنے گانے والی طوائفوں کو بلوانے کی اجازت دے دی تھی۔ کھانے پینے کی چیزوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ دھن دولت بھی بے شمار تھی۔ اس لیے عیش کرنے میں کوئی بھی پیچھے رہنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن چیتو نے ان سب کو تاکید کر دی تھی کہ ناچ گانے والی رقاصاؤں سے کسی قسم کی دست درازی نہ کی جائے۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو اس بات سے بھی منع کر دیا تھا کہ انھیں فالتو پیسے نہ دیئے جائیں۔

پڑاؤ دن بہ دن طویل ہوتا گیا اور یہ طوالت چیتو کے لیے نقصان دہ ثابت ہوئی۔ کیونکہ آس پاس کے شہروں اور گاؤں والوں کو ان کی آمد کی اطلاع ہوتی چلی گئی اور ان کے پاس کافی وقت تھا کہ وہ لوگ اپنی دھن دولت لے کر کسی دوسری جگہ منتقل ہو جائیں۔ پھر چیتو نے جب پڑاؤ اٹھا کر اپنے لشکر کو کوچ کرنے کا حکم دیا تو نتیجہ وہی نکلا جس کی اُسے توقع نہیں تھی یعنی کسی جگہ بھی لوٹ مار سے اسے خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوا۔ باسی، بیرنگ، تلجی پور، بھیر اور فیلان پور تک اُس نے اپنے گھوڑے دوڑائے پھر اجنتا گھاٹ پر سے گزرتا ہوا اس کا لشکر بارن پور تک آ گیا۔ اس نے نظام ریاست کے تقریباً تمام ہی چھوٹے چھوٹے گاؤں اور بڑے بڑے

شہروں کو لوٹا اور انگریز سپاہیوں سے مڈبھیڑ کے بغیر وہ ہاتھی، اونٹ اور گھوڑوں پر لوٹ کا مال لاد کر واپس آگیا۔ اس لوٹ میں سونے چاندی اور زیورات کے علاوہ قیمتی کپڑوں کی اتنی زیادہ تعداد تھی کہ نمیواڑ شہر کے تمام بیوپاری مل کر بھی ان سب چیزوں کی قیمت ادا نہیں کر سکتے تھے۔ اس سامان کو فروخت کرنے کے لیے اسے اندور اور اُجن شہر کے بیوپاریوں کو بھی بلانا پڑا تھا۔

امیر کو اب عظیمہ کی یاد ستانے لگی تھی۔ لٹیروں کے ساتھ اپنی اس پہلی چڑھائی میں اتنی رقم اس کے ہاتھ آگئی تھی کہ وہ اپنا خرچ برسوں تک چلا سکتا تھا۔ اس کمائی سے اس کا اعتماد اور زیادہ پختہ ہو گیا تھا۔ اس میں اب اتنی ہمت آچکی تھی کہ دوسری بار چیتو کے ساتھ کسی چڑھائی میں شریک ہونے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ قدرت نے اب اسے ایک موقع فراہم کر دیا تھا کہ وہ عظیمہ اور افلاطون کے ساتھ اپنی بقیہ زندگی سُکھ چین سے بسر کر سکے۔ لیکن غفور خان کا کیا کیا جائے؟ اس نے تو اُسے اپنے ہاتھوں سے ختم کرنے کی قسم کھائی تھی۔ یہ حساب تو ابھی باقی تھا کیونکہ واپسی کے دوران میں اسے غفور خان کو ختم کرنے کا ایک بھی موقع نہیں ملا تھا۔ تو کیا صرف اسی کام کے لیے وہ دوبارہ چیتو کے لشکر میں شامل ہو جائے گا؟

تمام لٹیرے اپنے اپنے حصے کی رقم لے کر اپنے اپنے گھر جانے کی تیاریوں میں لگے ہوئے تھے۔ انھیں رخصت کرنے کے لیے چیتو اپنا دربار سجائے بیٹھا تھا لشکر کے سارے سردار اور عہدیدار وہاں جمع ہو چکے تھے۔ ایک کے بعد ایک ایک آدمی آکر اس کے آگے جھکتا اور اس سے گھر جانے کی اجازت مانگتا۔ پھر جب امیر کی باری آئی تو وہ دھیمی چال سے آگے بڑھا۔ چیتو کے ہاتھ میں امیر کے لیے عطر کا پھاہا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس نے پان کی ایک گلوری بھی تھام رکھی تھی۔ امیر نے اس کے ہاتھ سے پان لینے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ مگر یہ کیا؟ چیتو اس کے سامنے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ اس نے پان کی گلوری اس کی طرف نہیں بڑھائی تھی۔ امیر گھبرا گیا اس نے چیتو کے چہرے کے تاثرات کو پڑھنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ کوئی اندازہ نہیں لگا سکا کہ چیتو کا ارادہ کیا ہے؟ یکایک آنکھ کے اشارے سے چیتو نے اسے ایک جانب کھڑے رہنے کے لیے کہا۔ اس وقت غفور خان ہونٹوں ہی ہونٹوں میں مسکراتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ امیر اپنی گھبراہٹ کو دبانے کی کوشش کرتا ہوا ایک جانب کھڑا ہو گیا اور اب وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ کہیں اس کے خلاف کوئی چال تو نہیں چلی جا رہی ہے؟ کہیں اس کے ساتھ دھوکہ تو نہیں ہو رہا ہے؟ امیر کے روئیں روئیں میں تھرتھراہٹ سی دوڑنے لگی تھی۔

سوچتے سوچتے امیر کے سر میں درد سا ہونے لگا کہ آخر چیتو کرنا کیا چاہتا ہے؟ اس نے سب لوگوں کو گھر جانے کی اجازت دے دی تھی۔ لیکن اُسے ہی کیوں روک رکھا ہے؟ چیتو نے اُسے عطر کا پھاہا اور پان کی گلوری نہیں دی تھی یہ دیکھ کر غفور خان کیوں مسکرا رہا تھا؟ یوں لگتا ہے کہ شاید غفور خان نے ہی اس کے خلاف چیتو کے کان بھرے ہوں گے؟

شام ہوتے ہی دربار سے عہدیدار اور سردار ایک ایک کر کے رخصت ہوتے چلے گئے۔ ان سب کے چلے جانے کے بعد امیر نے سوچا کہ شاید اب چیتو کا ارادہ اس پر ظاہر ہو جائے گا۔ لیکن اس کے بجائے بات اور زیادہ اُلجھ گئی۔ چیتو نے اشارہ کر کے اسے اپنے قریب بُلایا۔ جس جگہ چیتو بیٹھا تھا وہاں بالکل قریب آکر امیر احتراماً ذرا سا جھکا تو چیتو نے فوراً ہی اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اتنی دھیمی آواز میں کہا کوئی دوسرا اس کی بات نہ سُن سکے۔ اس نے کہا تھا "رات کو ایک دو بجے مجھ سے ملنے کے لیے گھر پر آجانا مجھے تم سے کوئی بات کرنا ہے۔" بس اس سے زیادہ اس نے کچھ بھی نہیں کہا اور دربار برخواست کر کے اُٹھ گیا۔

رات کے ایک دو بجے۔ تنہائی... اور خاص بات۔ چیتو کے یہ الفاظ بڑی دیر سے امیر کے سر پر ہتھوڑے برسا رہے تھے۔ لیکن پھر بھی چیتو کا مقصد اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ چیتو نے یہ بات چونکہ بہت ہی محتاط لہجے میں کہی تھی اسی لیے تو اسے شک ہو رہا تھا کہ اگر کوئی کام کی بات ہی ہوتی تو چیتو اُسے رات کے وقت اکیلے میں ہی کیوں بُلاتا؟ غفور خان سے چھُپ کر اس کے کان میں یہ بات کیوں کہتا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ چیتو اُسے اپنے راستے سے

ہٹا دینا چاہتا ہو؟ اس نے تو گھر جانے کی پوری تیاری کر لی تھی۔ عظیمہ سے ملنے کی خواہش شدید سے شدید تر ہو چکی تھی۔ لیکن عین وقت پر چیتو نے اسے الجھن میں ڈال دیا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ سوچنے لگتا تھا کہ چیتو سے ملے بغیر وہ صبح کو جانے کے بجائے کیوں نہ اسی وقت اپنے ساتھیوں کو جگا کر رات کے اندھیرے میں یہاں سے بھاگ جائے؟ لیکن یہ اتنا آسان بھی نہیں تھا۔ چیتو اس کی راہ دیکھ رہا ہو گا۔ اگر وہ دو بجے تک اس کے پاس نہیں گیا تو یقیناً چیتو اُسے بُلانے کے لیے اپنے آدمی اس کی چھاؤنی پر بھیجے گا اور اگر چھاؤنی میں اُسے اپنے ساتھیوں کے ساتھ موجود نہیں پایا تو چیتو سخت غصے میں آجائے گا۔ وہ حکم عدولی تو کسی صورت میں برداشت نہیں کرے گا اور فوراً ہی اپنے آدمیوں کو اس کے تعاقب میں روانہ کر دے گا اور اس طرح بہت دُور جانے سے قبل ہی وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ دھر لیا جائے گا اور پھر غفور خان کو بھی اس کے خلاف زہر اگلنے کا موقع مل جائے گا۔ اس طرح اس کے ساتھ ساتھ اس کے ساتھیوں کی جانیں بھی خطرے میں پڑ جائیں گی۔

ان سب باتوں پر غور کرنے کے بعد امیر نے راتوں رات چھاؤنی سے بھاگ نکلنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس نے سوچا کہ اُسے پامردی سے حالات کا مقابلہ کرنا چاہیئے اور اگر چیتو نے زبردستی اسے روکنے کی کوشش کی تو اُسے کوئی ترکیب ڈھونڈ کر چھٹکارا پانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اُسے ایک بار چیتو سے مل ہی لینا چاہیئے تاکہ جھوٹ اور سچ کا اسے پتا چل جائے۔ اس طرح اُسے چیتو کا اصلی روپ بھی دیکھنے کا موقع مل جائے گا۔ ابھی وہ اس فیصلے پر پہنچا ہی تھا کہ گشت کرتے ہوئے چوکیدار نے آدھی رات کا گھنٹہ بجایا اس گھنٹے کی آواز سُن کر امیر کو یوں لگا جیسے قدرت بھی اس کے اس فیصلے کی حمایت کر رہی ہے۔ اس خیال کے آتے ہی وہ ہمت کر کے اٹھا اور اپنے ساتھیوں کو گہری نیند میں سوتا چھوڑ کر اپنے خیمے سے باہر نکل گیا۔

چیتو کی حویلی کے دروازے پر کھڑے ہوئے چوکیدار نے نہایت احترام سے اس کے لیے دروازہ کھول دیا تھا اور امیر اسی سے سمجھ گیا کہ چوکیدار کو اس کے آنے کی اطلاع دی جا چکی ہے۔ صحن میں سے گزر کر امیر نے حویلی کے برآمدے میں قدم رکھا تو اسے چیتو کے محافظ سامنے ہی کھڑے دکھائی دیئے۔ ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر مسکراتے ہوئے اس کا استقبال کیا "آئیے میر صاحب۔ مہاراج نے آپ کو بیٹھک خانے میں لے جانے کے لیے کہا ہے۔"

امیر اس کے پیچھے پیچھے بیٹھک خانے کی طرف چل پڑا۔ یہ کمرہ بہت بڑا تھا۔ چھت کے بیچو بیچ ایک خوبصورت جھومر لٹک رہا تھا جس میں سے روشنی چھن چھن کر باہر نکل رہی تھی۔ کمرے کے بالکل سامنے والی دیوار کے قریب چیتو ایک میز کے پیچھے بیٹھا ایک کاغذ پر کچھ لکھ رہا تھا۔ پہلے تو امیر نے ادب سے اسے سلام کیا پھر پیچھے مُڑ کر دیکھنے لگا مگر کمرے میں کوئی اور داخل نہیں ہوا تھا۔

"آؤ امیر بیٹھ جاؤ۔" یکایک چیتو نے سر اٹھا کر کہا اور اپنے قریب ہی ایک دیوان پر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ امیر نے کچھ گھبراہٹ سی محسوس کی مگر پھر وہ سنبھل کر اُس دیوان پر بیٹھ گیا۔ چیتو اس وقت بالکل ہی مختلف لباس میں تھا۔ زرہ بکتر اور جنگی لباس کے بغیر چیتو اس وقت امیر کو بے حد عجیب عجیب سا لگ رہا تھا۔ ململ کے باریک کرتے میں سے اس کا مضبوط جسم اور اس پر لگے ہوئے دو چار زخموں کے لمبے لمبے نشانات صاف نظر آ رہے تھے۔

"تمھیں بڑی حیرت ہو رہی ہے نا؟" چیتو اپنے دیوان پر آرام سے بیٹھتے ہوئے بولا "ملاقات کا یہ وقت تمھیں عجیب سا لگ رہا ہو گا کیوں؟"

"ہاں لیکن یہاں آنے کے بعد مجھے ایک اور بات سے بھی حیرت ہوئی تھی۔" امیر نے جواب میں کہا۔

"وہ کیا؟"

"آپ اس ناچیز کو تُو کہنے کے بجائے 'تمھیں' کہہ کر مخاطب کر رہے ہیں۔"

"ہا۔ ہا۔ ہا۔" چیتو اس طرح ہنس پڑا جیسے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے کسی بچے سے دل بہلا رہا ہو "بات دراصل یہ ہے امیر علی کہ گھر اور دربار دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ یہاں تم میرے تابعدار نہیں بلکہ میرے دوست ہو اوّل تو

میں کسی کو اپنے گھر نہیں بلاتا اور اگر کسی کو بلاتا ہوں تو اس کو مہمان اور دوست سمجھتا ہوں۔"

"اسے میں آپ کی ذرہ نوازی سمجھتا ہوں حضور۔" امیر دھیرے سے بولا۔

"نہیں امیر علی اس جگہ درباریوں کے سے انداز میں گفتگو کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں ہم کھلے دل سے باتیں کریں گے۔"

"لیکن یہ تو عادت کی مجبوری ہے۔" امیر نے کھل کر جواب دے دیا۔ "میرا خیال ہے کہ اگر میں نے گھر میں آپ کو حضور کہنا چھوڑ دیا تو کہیں دربار میں بھی مجھ سے یہ گستاخی نہ ہو جائے۔"

"میں تمھارے متعلق اکثر سوچ میں پڑ جاتا ہوں۔" چیتو سنجیدگی سے بولا تو امیر سنبھل کر بیٹھ گیا اچانک اُسے یوں لگا تھا کہ چیتو کوئی چالاکی کرنا چاہتا ہے اسی لیے وہ بات نکلوانے کی غرض سے بہت دھیمی آواز میں بولا۔ "میرے بارے میں سوچنے جیسی کوئی بات ہے ہی نہیں جناب۔"

"ضرور ہے۔ اتنی کم عمری میں یہ ہنر تم نے کیسے سیکھ لیا؟" چیتو نے اچانک کہا تو امیر تھرتھرا کر رہ گیا۔ اسے لگا کہ چیتو نے یقیناً اس کا بھید جان لیا ہے۔ لیکن پھر بھی اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھ ہی لیا۔ "کون سا ہنر جناب؟"

"تمھارے خیالات۔ تمھارا اخلاق اور تمھاری عقل۔ تمھاری شخصیت اور تمھاری بہادری۔" اتنا کہہ کر تھوڑی دیر تک چیتو سوچتا رہا پھر آگے بولا۔ "کسی ایک آدمی میں یہ ساری خوبیاں بہت کم ہی دیکھنے میں آتی ہیں۔ ہر بہادر آدمی عقل مند نہیں ہوتا اور اگر یہ دونوں باتیں کسی میں ہوتی بھی ہیں تو اس میں رحمدلی نہیں ہوتی۔"

"حضور آپ تو مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔" امیر نظریں جھکا کر بولا۔ اسے اب بھی یہ یقین نہیں آ رہا تھا کہ چیتو نے محض اُس کی تعریف کرنے کے لیے اتنی رات گئے اسے اپنے گھر بلایا ہے۔ اسی لیے وہ حقیقت جاننے کے لیے اپنی بے چینی کو دبانے کی کوشش کے باوجود نہ دبا سکا۔ "لیکن آپ تو تنہائی میں مجھ سے کوئی خاص بات کہنا چاہتے تھے؟"

"ہاں۔" چیتو یکایک ہی گمبھیر ہو گیا اور تب امیر کو لگا کہ اس نے جلد بازی کا مظاہرہ کر کے اچھا نہیں کیا ہے کیونکہ چیتو کے چہرے پر دھیرے دھیرے عجیب سے تاثرات اُبھرتے جا رہے تھے اب وہ تھوڑی دیر پہلے کا ہنس مکھ چیتو نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کا یہ روپ دیکھ کر امیر کو اپنا سانس لینے میں بھی دشواری پیش آنے لگی تھی۔

"ہم جو چڑھائی کر کے واپس آئے ہیں اس چڑھائی کا مقصد کیا تھا یہ تم جانتے ہو امیر؟" چیتو نے بہت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"نہیں حضور میں نہیں جانتا۔" امیر نے دھیرے دھیرے سانس چھوڑ کر کہنا شروع کیا۔ "اس کے بارے میں میں نے بہت سوچا ہے اور آخر میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ آپ شہروں اور گاؤں پہ اس قسم کی چڑھائیاں کر کے بے اندازہ دولت حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اپنے سپاہیوں کی غریبی دور کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ انگریزوں کو بھی پریشان کرنا چاہتے ہیں۔"

امیر کی یہ باتیں سُن کر چیتو مسکرا دیا اور بولا۔ "تمھارا اندازہ آدھا درست ہے۔ لیکن ہم لوگوں نے صرف نظام کے علاقوں کو ہی کیوں لوٹا ہے؟ یہ سوال تمھارے ذہن میں اُبھرا تو ہو گا؟"

"نہیں میں نے اس طرف توجہ ہی نہیں دی۔" امیر نے جواب دیا۔

"تو سنو۔ اب میں تمھیں اپنے ارادوں سے واقف کر دینا چاہتا ہوں۔ تاکہ تم کسی غلط فہمی کے بغیر دوسری چڑھائی میں میرا بھرپور ساتھ دے سکو۔"

اب امیر کو چیتو کا مطلب سمجھ میں آ گیا کہ وہ دوسری چڑھائی کے لیے اُسے تیار کرنا چاہتا ہے اس کے سوا تنہائی کی ملاقات کا اور کوئی مقصد نہیں تھا۔ مگر امیر کا یہ اندازہ غلط ثابت ہوا۔ چیتو نے گمبھیر لہجے میں کہنا شروع کیا تو امیر اس کی آواز کے اتار چڑھاؤ میں کھوتا چلا گیا۔ چیتو کہہ رہا تھا "ٹیپو سلطان جیسا بہادر آج اس دنیا میں موجود نہیں ہے اس کی زندگی کا مقصد کیا تھا یہ تو شاید تم جانتے ہی ہو گے؟ اس کا ارادہ تھا کہ مرہٹوں سے مل کر وہ انگریزوں

کو اس سرزمین سے باہر نکال دے۔ لیکن اس کا یہ ارمان ادھورا ہی رہا۔ انگریز بروقت ہوشیار ہو گئے اور انھوں نے ٹیپو کی طاقت کو توڑ دیا اور وہ چالاکی اور ہوشیاری سے چھوٹے بڑے راجاؤں کو آپس میں لڑاتے رہے تاکہ وہ سب کبھی مل جُل کر انگریز سرکار کے خلاف اپنا سر نہ اٹھا سکیں۔"

امیر بڑی توجہ سے سُن رہا تھا اور چیتو کی آواز بدستور گمبھیر تھی۔

"تمھیں معلوم ہی ہو گا کہ راجا ہولکر کی طاقت اب پہلے جیسی نہیں ہے اور سندھیا انگریزوں کی قدم بوسی کرنے لگا ہے۔ اس نے تو رہی سہی عزت بھی خاک میں ملا کر رکھ دی۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود بھی امیر یہ مراٹھا لوگ اپنا سر اٹھانا چاہتے ہیں۔" چیتو کا یہ جملہ سُن کر خود امیر کا جھکا ہوا سر بھی اٹھ گیا۔

"ہاں۔ مجھے تم سے یہی بات کہنا تھی۔" چیتو اس کی طرف دیکھ کر آگے بولا۔ "انگریزوں سے مقابلے کی تیاریاں شروع ہو چکی ہیں۔ ناگپور اور پونا کے راجا تو مل کر انگریزوں کو ہٹانے کا تہیہ کر چکے ہیں۔"

مگر امیر یہ بات ابھی تک سمجھ نہیں سکا تھا کہ ان تمام باتوں سے باغیوں کی لوٹ مار کا کیا تعلق ہے؟ لیکن چیتو فوراً ہی اس طرح بول پڑا جیسے وہ امیر کے دل کی بات سمجھ گیا ہو۔ "نواب سکندر جاہ انگریزوں کا غلام بن چکا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے اس نے اپنی حکومت انگریزوں کے حوالے کر دی ہے۔ وہ انگریزوں کے لشکر کے آنے جانے کے لیے ہمیشہ اپنے دروازے کھلے رکھتا ہے۔ نظام کا لشکر تقریباً تہہ و بالا ہو چکا ہے اور وہاں کے کاروبار سے انگریز ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں اس لیے مراٹھا ساہوکاروں کو نظام کی یہ کمزوری کھٹک رہی ہے۔" چیتو اب انتہائی جذباتی لہجے میں بول رہا تھا اور اس کا جوش اس کے چہرے کی سُرخی میں مسلسل اضافہ کرتا جا رہا تھا۔ "اب تمھاری سمجھ میں یہ بات آ چکی ہو گی کہ ہم نے نظام کے ہی علاقوں پر کیوں چڑھائی کی؟ ہم اس کی رعایا کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ انگریزوں کا لشکر بھی تم لوگوں کی حفاظت نہیں کر سکتا۔ ہماری اس لوٹ مار کا مقصد صرف ان میں بدامنی اور انتشار پھیلانا ہے۔" جوش جوش میں بولتے بولتے چیتو سانس لینے کے لیے ایک پل کو رکا۔ لیکن امیر تو اس کا یہ نیا رُوپ دیکھ کر دنگ رہ گیا تھا۔ آدھی رات کے سناٹے میں وہ اس کے سانسوں کے اتار چڑھاؤ کی آوازوں کو بھی صاف سُن رہا تھا۔ چند لمحوں بعد چیتو نے پھر خاموشی کو توڑتے ہوئے آگے کہنا شروع کیا۔ "اس وقت میں نے جان بوجھ کر اپنی چڑھائی روک دی ہے۔ تاکہ انگریزوں کو اندھیرے میں رکھا جا سکے اور مراٹھوں کو تیاری کا بھی موقع مل جائے۔ اس وقت تک تو ہم نے نظام کی آدھی ریاست کو ہی لُوٹا ہے۔ بقیہ آدھی ریاست کو ہم اپنی دوسری چڑھائی میں تلاش بنا دیں گے۔ آج سے صرف دو ماہ بعد۔"

"دو ماہ بعد؟" امیر چونک پڑا۔

"ہاں امیر۔ میرا یہ منصوبہ بے حد خفیہ ہے۔ تمھارے علاوہ اس کا علم صرف آٹھ دس آدمیوں کو ہی ہے۔" چیتو نے سنجیدگی سے کہا اور پھر آگے بولا۔ "انگریز اب یہ سمجھیں گے کہ چیتو اب دسہرے کے بعد دوسری چڑھائی کے ارادے سے نکلے گا اور تب دیکھ لیا جائے گا۔ اس لیے وہ چین کی نیند سوتے رہیں گے لیکن چیتو تو انھیں ہمیشہ کے لیے سلا دینا چاہتا ہے۔ میں انگریزوں کو سبق سکھانا چاہتا ہوں۔ امیر باغی چیتو ایک لٹیرا ہی نہیں ہے اور نہ ہی وہ ظالم لٹیروں کا صرف سردار ہے بلکہ وہ اپنے وطن کا ایک جانباز سپاہی ہے۔" اس کی بات سُن کر امیر سوچنے لگا کہ چیتو جیسے بہادر شخص کے ہمراہ وہ خود کتنا آگے بڑھ سکے گا؟ انگریزوں سے تو خود اسے بھی نفرت ہے۔

"امیر ہماری نظر صرف نظام کی ریاستوں پر ہی نہیں ہے۔ بلکہ ہمیں تو انگریزوں کی محکوم حکومتوں اور راجاؤں کو بھی برباد کر دینا ہے۔ اس بار تو ہم کرشنا ندی کے قریب سے ہی لُوٹ آئے ہیں لیکن دوسری چڑھائی میں تو ہمیں ندی کو پار کر کے انگریزوں کے علاقوں کو ہی لُوٹنا ہے۔ ان کی طاقت کو توڑنے کے لیے یہ بہت ضروری ہے۔ لٹی ہوئی رعایا سرکار کو محصول ادا نہیں کرے گی۔ آمدنی کم ہوتی جائے گی تو انگریزوں کی طاقت خود بخود ٹوٹ جائے گی۔ بس پھر موقع ملتے ہی مراٹھا ہتھیار اٹھا لیں گے۔"

امیر ابھی یہ بات ہضم بھی نہ کر سکا تھا کہ چیتو نے چند

لمحوں کے توقف کے بعد آگے کہا۔ "جب ایسا وقت آئے گا تو ہم مراٹھوں کے ساتھ ہو جائیں گے۔ انگریزوں سے جیتی ہوئی ریاستوں میں سے ان لوگوں نے مجھے بھی کچھ ریاستیں دینے کا وعدہ کیا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اس کام میں مجھے تم جیسے آدمی کا ساتھ بھی مل جائے۔" چیتو نے اپنی بات ختم کی مگر امیر تو اس کا چہرہ ہی تک رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا جواب دے؟ چیتو اب اُسے پہلے سے زیادہ عظیم۔ پہلے سے زیادہ نڈر اور پہلے سے زیادہ بہادر لگنے لگا تھا پھر اس سے پہلے کہ چیتو اس سے اس کا جواب طلب کرتا وہ خود ہی بول اٹھا۔ "حضور یہ بندہ ناچیز تو اسے اپنی خوش نصیبی سمجھے گا۔"

"شاباش امیر۔ مجھے تم سے ایسی ہی اُمید تھی۔"

"لیکن انگریزوں کا لشکر ہمارا راستہ تو ضرور روکے گا اس وقت کیا ہو گا؟" امیر نے یہ بات پوچھ تو لی مگر پھر فوراً ہی اسے لگا کہ یہ بات اُسے چیتو سے نہیں پوچھنی چاہیئے تھی اسی لیے وہ اپنی غلطی کو سدھارتے ہوئے بولا۔ "میرا مطلب تھا کہ آپ نے انگریزوں کی طاقت کا غلط اندازہ تو نہیں لگایا ہو گا؟ کیا وہ لوگ ہمارا راستہ نہیں روک سکیں گے؟"

"نہیں۔ نہیں امیر یہ نہیں ہو سکتا۔" چیتو بڑے اعتماد سے کہنے لگا۔ "ہم انھیں قدم قدم پر دھوکہ دیں گے۔ اپنا راستہ بدل بدل کر ہم انھیں چکراتے رہیں گے۔ تم جانتے ہو دوسری چڑھائی میں ہمارا لشکر کتنا بڑا ہو گا؟"

"کتنا؟" امیر نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"دس ہزار۔" چیتو بڑے فخر سے بولا۔ "جو لوگ پہلی چڑھائی میں ہمارے ساتھ تھے وہ دوسری چڑھائی کے لیے اور بھی لوگوں کو ساتھ لے آئیں گے اور تمھاری سرداری میں میں ایک ہزار کا دستہ رکھنا چاہتا ہوں۔"

"آپ فکر نہ کریں میں آپ کے ساتھ ہوں۔" امیر کا جواب سُن کر چیتو اسے گھور گھور کر دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر تک تو وہ خاموش رہا پھر اس نے دھیرے سے کہا۔ "مگر میں تو یہی سمجھ رہا تھا کہ اس چڑھائی کے بعد تم دوبارہ کسی چڑھائی کے لیے تیار نہیں ہو گے۔"

امیر چونک پڑا۔ آخر چیتو نے یہ کیسے سمجھ لیا؟ لیکن چیتو سے پوچھنے کی بجائے اس نے چیتو کو ہی بولنے دیا۔ "میں یہ جانتا ہوں امیر کہ غفور خان سے کبھی کبھی تمھاری آنکھیں ٹکرا جاتی ہیں۔ لیکن صرف اسی وجہ سے تم میرا ساتھ چھوڑ دو یہ تو کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے۔"

"لیکن اب چڑھائی کا مقصد سمجھ لینے کے بعد میرے خیالات بدل گئے ہیں حضور۔" امیر نے دھیرے سے جواب دیا۔ تو چیتو کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ "شاباش امیر۔ اپنی اندرونی دشمنی کو بھلائے بغیر ہم اپنا مقصد حاصل نہیں کر سکتے۔ غفور خان کو چھیڑے بغیر تم اپنا کام کرتے رہو۔ بس مجھے تم سے اتنا ہی کہنا ہے۔"

"میں بھی اتنی سی بات سے سمجھ گیا ہوں۔" امیر نے مسکرا کر کہا اور اپنی جگہ سے اٹھنے لگا لیکن چیتو نے اس سے پہلے ہی اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کا بازو تھام لیا اور اسے اپنے سینے سے لگا کر بولا۔ "تمھاری سمجھ داری سے میں بہت خوش ہوا ہوں امیر۔ اب تم جالان جانے کی تیاری کرو۔ لیکن یہ یاد رکھنا کہ تمھیں ایک مہینے بعد نمواڑ واپس آ جانا ہے۔"

"حضور میں نے اب اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔" امیر چیتو سے الگ ہو کر بولا۔

"کیسا ارادہ؟" چیتو نے چونک کر پوچھا۔

"جالان جانے کا۔" امیر نے چیتو کو چونکا دیا۔ "میں اگر اتنی دولت لے کر گھر جاؤں گا تو بیوی مجھے جلدی آنے نہیں دے گی۔"

"تو کیا اس کے لیے تم گھر نہیں جاؤ گے؟"

"ہاں حضور آپ سے کیا ہوا وعدہ ہی پورا ہو جائے یہی میرے لیے بہت ہے۔" امیر احترام سے جھک کر بولا۔ "میں اس کے بعد ہی جالان جاؤں گا۔"

"لیکن گھر میں تمھاری بیوی تمھاری منتظر ہو گی۔"

"اس کے لیے میں نے سوچ لیا ہے۔" امیر نے اپنا ارادہ کہہ سنایا۔ "میرے ساتھی اپنی اپنی کمائی لے کر اپنے اپنے گھروں کو جانے والے ہیں۔ ان میں جالان گاؤں کا میرا ایک دوست بھی ہے۔ وہ میرا حصہ اپنے ساتھ لیتا جائے گا اور بیوی کو میری خوش خبری بھی دے دیگا۔

اس طرح جالان کے راجا کو اس کے گھوڑے اور نذرانے مل جائیں گے پھر میرے جانے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔"

چیتو اس کی بات سُن کر سوچ میں پڑ گیا امیر کا یہ فیصلہ اس کے حق میں ہونے کے باوجود وہ یہ سوچ رہا تھا کہ امیر کا فیصلہ کچھ اتوکھا ضرور ہے اسی لیے وہ پوچھ بیٹھا۔ "سچ سچ بتانا امیر کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ تمھیں اپنی بیوی سے محبت نہیں ہے؟"

"نہیں حضور آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔" امیر نے جلدی سے کہا۔ "چار مہینے بعد اپنی بیوی سے ملوں اور چار دن بعد ہی اسے چھوڑ کر واپس چلا آؤں؟ میں اتنا بھی پتھر دل نہیں ہوں۔ بیوی کا پیار تو میرے پیروں کی زنجیر بن جائے گا۔"

چیتو ہمدردانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ فرض کی خاطر امیر اپنے گھر کی بھی پروا نہیں کرتا۔ اس بات سے اسے خوشی ہوئی تھی اور اس کے دل میں امیر کا احترام اور بھی بڑھ گیا۔ یکایک وہ بڑی محبت سے بولا۔ "تو پھر امیر تمھیں میرے ساتھ میری حویلی میں رہنا پڑے گا۔"

امیر نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ وہ نظریں جھکائے کمرے سے باہر جانے لگا تو چیتو کی آواز ایک بار پھر اُس کی سماعت سے ٹکرائی۔ "اور دیکھو۔ تمھارے ساتھی آرام سے سفر کر کے اپنے گھر پہنچ جائیں اس کے لیے تم اپنے لشکر کے گھوڑے اور اونٹ انھیں دے سکتے ہو۔ انھیں سمجھا دینا کہ وہ واپسی پر زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنے ساتھ لیکر آ جائیں۔"

"اچھی بات ہے۔" کہہ کر امیر چیتو کی حویلی سے باہر نکل گیا۔

۞

عظیمہ سے ملنے کی خواہش پر اس نے خود ہی ٹھنڈا پانی انڈیل دیا تھا۔ اس بات کا اسے افسوس تو بہت ہوا لیکن فیصلہ کرنے کے بعد اس پر قائم رہنے کے علاوہ اس کے پاس کوئی اور علاج بھی تو نہیں تھا۔ ایک تو چیتو کی بات سُن کر خود وہ بھی جوش میں آ گیا تھا۔ انگریزوں کے خلاف لڑنے اور مراٹھوں کے ساتھ مل کر بنائی ہوئی چال اگر کامیاب ہو گئی تو وہ کہیں سے کہیں پہنچ جائے گا۔ زندگی میں ایسا موقع بار بار نہیں ملتا۔ اس کے علاوہ ایک دوسرا خیال بھی اس کے ذہن میں تھا وہ یہ کہ غفور خان کو ختم کرنے کے لیے اسے دوسری چڑھائی میں شریک تو ہونا ہی تھا۔ اسی لیے جب اس نے یہ سُنا کہ دو مہینے بعد چیتو دوسری چڑھائی پر روانہ ہو گا تو اس نے جالان جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ اس نے افلاطون سے بھی دوسری چڑھائی کی بات چھپانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ کیا معلوم اگر بازی اُلٹ جائے تو اس کے ساتھ افلاطون کی زندگی بھی خطرے میں پڑ سکتی تھی اور اگر خدانخواستہ ان دونوں کو ہی کچھ ہو گیا تو عظیمہ اس دنیا میں اکیلی رہ جائے گی۔ بے سہارا وہ اپنی زندگی کیسے گزارے گی؟

کافی دیر تک ان تمام باتوں پر غور کرنے کے بعد امیر نے جب اپنے ساتھیوں کو جگایا تو اس وقت صبح کا اُجالا آہستہ آہستہ پھیلنے لگا تھا۔

"اُٹھ جاؤ مجھے تم لوگوں سے ایک ضروری بات کہنی ہے۔" اس کی آواز سنتے ہی اس کے تمام ساتھی آنکھیں ملتے ہوئے اُٹھ کر اس کے گرد بیٹھ گئے۔ لیکن افلاطون نے بُرا سا مُنہ بنا کر کہا۔ "کیا رات کوئی خواب دیکھ لیا تھا؟ کیوں اتنی جلدی مجھے جگا دیا تم نے؟"

"خواب نہیں دیکھا تھا میں نے۔" امیر نے دھیرے سے مسکرا کر کہا۔ "لیکن خواب جیسی ہی کوئی بات ہو گئی ہے۔"

"اچھا۔" سب لوگوں کی آنکھوں سے نیند غائب ہو گئی۔ "کیا ہو گیا؟"

امیر نے چیتو کے ساتھ آدھی رات کو ہونے والی اپنی مختصر گفتگو انھیں سُنا دی۔ دو مہینے بعد پھر چڑھائی پر جانا ہے۔ یہ سُن کر وہ سب کے سب خوش ہو گئے۔ ایک سال کے اندر اندر دولت مند بن جانے کی امید سے ان کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ لیکن موتی رام اور پیر خان کسی سوچ میں ڈوب گئے تھے۔

"امیر کیا واقعی تم نے دوسری چڑھائی میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے؟"

"ہاں اگر تم لوگ میرا ساتھ دو تو۔" امیر نے موتی رام کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہمارا ساتھ تو ہمیشہ کا ساتھ ہے۔" موتی رام جوشیلے لہجے میں بولا۔ "مگر کیا غفور خان ہمیں ٹکنے دے گا؟"

"اس کے لیے میں نے سوچ لیا ہے۔" امیر اپنا ارادہ ان پر ظاہر کرنے کی بجائے آگے بولا۔ "چیتو کا پورا اعتماد حاصل کرنے کے لیے میں جالان نہیں جاؤں گا۔"

"ہوں۔" افلاطون نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں افلاطون تمھیں میرا مال سامان لے کر جالان جانا ہے۔ عظیمہ کو جیسے تیسے منا لینا۔ اس سے کہنا کہ زندگی کا جو خواب تم نے دیکھا تھا۔ اس کی تعبیر اب ہمارے ہاتھ میں ہے۔ تمھارا شوہر ایک بڑا سپہ سالار بن کر گھر واپس آئے گا۔ چار چھ مہینے بعد ..."

"تو کیا میں قاصد بن کر جالان جاؤں گا؟" افلاطون ناراض لہجے میں بولا تو امیر نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور اسے الگ لے جا کر سمجھانے لگا۔ کافی دیر تک ان میں دھیرے دھیرے باتیں ہوتی رہیں پھر جب افلاطون کو پتا چلا کہ دوسری چڑھائی سے امیر اسے الگ رکھنا چاہتا ہے تو وہ اور زیادہ بھنا کر بولا۔ "تم خود بڑے سپہ سالار بننا چاہتے ہو اور مجھے گھر میں بیٹھے رہنے کے لیے کہہ رہے ہو؟"

"افلاطون ذرا سوچو تو سہی۔" امیر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "اتنی ساری دولت گھر میں موجود رہے گی اور عظیمہ اکیلی ہو یہ خطرہ تمھاری سمجھ میں کیوں نہیں آتا؟ تم ذرا اس کی تنہائی کا خیال تو کرو کیا وہ گھٹ گھٹ کر مر نہیں جائے گی؟"

عظیمہ کا خیال آتے ہی افلاطون کی آنکھیں جھک گئیں۔

"اچھی بات ہے۔" کہتے ہی اس کی بھیگی آنکھیں اور بھر آئیں لیکن اس نے جلدی سے اپنا منہ پھیر لیا۔ امیر سمجھ گیا کہ اس سے جدا ہونے کے غم کو وہ برداشت کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس نے بھی کھنکار کر اپنا گلا صاف کر لیا اور اپنے ساتھیوں کو رخصت کرنے کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔

جب چڑھتے ہوئے سورج کی روشنی چاروں طرف پھیلنے لگی تو امیر اس وقت اپنے ساتھیوں سے جدا ہو رہا تھا۔ وہ تھوڑی دور تک اپنے ساتھیوں کو رخصت کرنے آیا تھا۔ عظیمہ سے کہنے کے لیے ایک ایک بات کو اس نے کئی کئی بار افلاطون سے کہی تھی پھر پیر خان اور موتی رام کے پاس جا کر ان کے کانوں میں کہا۔ "واپس آؤ تو اپنے ساتھ آٹھ دس آدمیوں کو بھی لیتے آنا کیونکہ دوسری چڑھائی میں غفور خان کی زندگی اپنے انجام کو پہنچ جائے گی ضرورت پڑی تو میں اپنے رومال کو استعمال کرنے سے بھی دریغ نہیں کروں گا۔" امیر کے چہرے کی جھلک دیکھ کر موتی رام اور پیر خان کی آنکھوں میں چمک سی لہرانے لگی۔ اس وقت امیر واقعی ٹھگوں کے سردار کی طرح جنونی دکھائی دے رہا تھا۔

دو ماہ کی مدت چٹکی میں گزر گئی۔ چیتو کو اس بات کی پوری امید تھی کہ دس ہزار کا لشکر تیار ہو جائے گا نئے آنے والے لوگوں کو لشکر میں بھرتی کرنے کے لیے اس نے امیر کو بھی اپنے ساتھ رکھا تھا۔ اس دوران امیر نے یہ چالاکی کی تھی کہ اس نے غفور خان کے ساتھ اپنا رویہ بہتر رکھا تھا۔ وہ ہنس ہنس کر اس سے باتیں کرتا تھا تاکہ کسی دن موقع پا کر غفور خان کا کام تمام کر دے اور چیتو کو اس پر کوئی شک نہ ہو۔ غفور خان بھی اب امیر کو اپنا دوست سمجھنے لگا تھا۔ اس کا سلوک بھی امیر کے ساتھ اب اچھا تھا۔ وہ اکثر امیر سے کہتا۔ "میاں لٹیرا بننا اور اپنی شرافت کو برقرار رکھنا یہ دونوں باتیں ایک ساتھ نہیں چل سکتیں۔ تم میرے ساتھ رہو گے تو اپنی زندگی کو اس نئے رخ میں ڈھال کر ایک کامیاب لٹیرے بن جاؤ گے۔"

امیر کو اس کی یہ بات بری تو لگتی تھی لیکن وہ ہنس کر ٹال جایا کرتا تھا اور جواب میں کہتا۔ "غفور میاں ابھی تو میں نیا نیا ہوں۔ اپنے دل کو پتھر بنانے میں مجھے ابھی دیر لگے گی۔ دراصل نہتے لوگوں پر ہتھیار اٹھانے کے لیے میرا دل تیار ہی نہیں ہوتا۔"

تب ... "ہا... ہا... ہا..." کر کے غفور خان ہنس پڑتا اور کہتا۔ "ہمارا کام تو لوٹنا ہے دوست جو مرضی میں آئے لوٹ لو سوچنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟" پھر وہ اپنا ہاتھ امیر

کو دکھاتے ہوئے کہتا۔ "اس ہاتھ میں قدرت نے اتنی طاقت کیوں دی ہے؟"

امیر چپ چاپ اس کی صورت دیکھتا رہتا۔ اس کی آنکھوں میں وحشیانہ چمک دیکھ کر اس کے تن بدن میں آگ سی لگ جاتی تھی۔ اس وقت غفور خان اسے انسان کی بجائے شیطان لگنے لگتا تھا اور وہ سوچنے لگتا کہ ایسے ظالم شخص سے غداری کرنا کوئی گناہ نہیں ہے۔ اس خیال کے آتے ہی وہ غفور خان کے انجام کے لیے بے چین ہو جاتا۔ شاید اسی لیے وہ دوسری چڑھائی پر چیتو کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔

دربار میں موجود چھوٹے بڑے سرداروں کو چیتو ان کا کام سمجھا رہا تھا۔ "اس بار ہمیں ایسے شہروں اور ایسے گاؤں پر حملہ کرنا ہے جس سے تم سب لوگوں کو کافی دولت مل سکے۔ نیموا ڈ سے نکل کر ہم لوگ ناگپور شہر میں داخل ہوں گے۔ وہاں ہمارے لیے راستہ صاف ہے۔ وہاں سے ہم لوگ شمال کی جانب آگے بڑھیں گے اور گڈوان کے جنگل سے گزر کر ہم لوگ مچھلی پدم پر ہلہ بول دیں گے۔ پھر کرشنا ندی پار کر کے ہمیں فرنول تک تباہی پھیلانا ہے۔" چیتو کی یہ ہدایت سن کر تمام سرداروں نے انتہائی پرجوش لہجے میں "چیتو مہاراج کی جے ہو" کا نعرہ لگایا تھوڑی دیر بعد جب پھر دربار میں خاموشی چھا گئی تو غفور خان نے تمام سرداروں کی جانب سے درخواست کرتے ہوئے کہا۔ "مہاراج ہم سب چڑھائی پر روانہ ہونے کے لیے بے قرار ہیں اب صرف آپ کے حکم کی ہی دیر ہے۔"

"بس تو پھر آگے بڑھو۔ ہر سردار اپنے اپنے دستے کی کمان سنبھال لے۔" چیتو نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "کل شام تک ہمیں نرمدا ندی پار کر کے دوسرے کنارے پر پڑاؤ ڈال دینا ہے۔"

اس کے بعد ہر سردار جھک جھک کر چیتو کو سلام کرتا ہوا جوشیلے انداز میں باہر نکلتا چلا گیا۔ کوچ کا حکم سنتے ہی لشکر میں ایک ہلچل سی مچ گئی تھی لوٹ مار کے لیے وہ سب بری طرح بے چین ہو رہے تھے اور پہلی بار چڑھائی پر جانے والوں کے دلوں میں تو نئی دنیا دیکھنے اور کچھ دکھانے کے ارمان مچل رہے تھے۔

پیر خان اور موتی رام اپنے ساتھ بارہ ٹھگوں کو لے کر آئے تھے۔ اس میں سے تین چار ٹھگ امیر کے لیے بالکل اجنبی تھے۔ لیکن موتی رام جیسے تجربہ کار ٹھگ کی ضمانت تھی اس لیے امیر نے انھیں لشکر میں بھرتی کر لیا تھا۔ کوچ کرنے سے قبل ہی امیر نے ان سب لوگوں سے کہہ رکھا تھا۔ "دیکھو سفر کے دوران میں تم لوگ کسی جگہ بھی مجھ سے الگ مت ہونا اور ہمارے درمیان میں جو بات ہو وہ کسی قیمت پر ہم میں سے باہر نہ جانے پائے۔"

"میں ایسے آدمیوں کو لے کر آیا ہوں امیر جو تم پر اپنی جان بھی دے سکتے ہیں۔" موتی رام نے امیر کو تسلی دی۔

"اس چڑھائی میں ہمارا اصل مقصد کیا ہے یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔"

امیر اس کی بات سن کر دھیرے سے مسکرا دیا پھر اچھل کر اپنے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ پھر اپنے ایک ہزار کے دستے پر ایک نظر ڈالی اور نیام سے تلوار نکال کر بہت زور سے چلایا۔ "آگے بڑھو۔"

حکم سنتے ہی گھوڑوں کی لگامیں کھنچ گئیں اور پھر نیموا ڈ کی دھرتی ان گھوڑوں کی ٹاپوں سے گونجنے لگی تھوڑی ہی دیر بعد امیر کا لشکر گرد و غبار اڑاتا ہوا نیموا ڈ کی سرحد پار کر گیا۔

نرمدا ندی کا پانی اتر چکا تھا اس لیے ان لوگوں نے آسانی سے ندی کو پار کر لیا تھا۔ تھوڑی دیر وہاں پڑاؤ ڈالنے کے بعد دس ہزار باغی لٹیروں کا لشکر گڈوان کے جنگل میں داخل ہو گیا۔ اس گھنے پہاڑی جنگل میں شاید ہی آج سے پہلے کسی آدمی نے قدم رکھا ہو۔ اس خطرناک جنگل میں اس قدر اندھیرا تھا کہ تنہا چلنے والے کا خوف کے مارے دم ہی نکل جائے۔ چاروں طرف سے جنگلی درندوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ لیکن چیتو کا لشکر آگے بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ پانی کا ذخیرہ ان کے پاس ختم ہوتا جا رہا تھا لیکن اس کے باوجود وہ بھوک پیاس کی پروا کیے بغیر چیتو کے اشارے پر آگے ہی آگے بڑھتے گئے۔ جب وہ جنگل سے باہر نکلے تو انھیں

ایک میدانی علاقہ دکھائی دیا۔ دُور دُور تک اس ہموار میدانی علاقے کو دیکھ کر ان کے سُوکھے ہوئے ہونٹوں پر مسکراہٹ ناچنے لگی۔ اب ان کے گھوڑوں کی رفتار بہت تیز ہو گئی تھی۔ ٹُوٹ مار کی پیاس تھی کہ پانی کی پیاس سے بھی شدید ہوتی جا رہی تھی۔ جو گاؤں بھی ان کے راستے میں آتا گیا اُسے ٹُوٹ کر وہ آگے بڑھتے رہے۔ اپنے مقابلے پر آنے والوں کو وہ کسی ہچکچاہٹ کے بغیر کُچل ڈالتے اور اپنا راستہ صاف کرتے ہوئے گزر جاتے اس طرح روزانہ دس بارہ گاؤں کو لوٹ کر وہ لوگ گنتُور تک پہنچ گئے۔

لیکن گنتُور میں انگریزوں کا خزانہ لُوٹنے کی حسرت پوری نہیں ہوئی۔ باغیوں کو شہر میں داخل ہونے سے کسی نے بھی نہیں روکا لیکن اس کے باوجود ان باغیوں میں سے ایک بھی شخص اس عمارت تک نہیں پہنچ سکا جس میں انگریزوں نے اپنا خزانہ چھُپا رکھا تھا۔ تعداد کے لحاظ سے چیتُو کا لشکر گرچہ بہت بڑا تھا لیکن انگریزوں کے بندُوقوں نے ان کا سارا جوش و خروش ٹھنڈا کر دیا تھا۔ انگریزوں کی بزدلی پر امیر کو پہلے تو ہنسی آئی تھی لیکن اب یہ انگریز اُسے بہت ہی چالاک اور شاطر دکھائی دینے لگے تھے انگریزوں کا پورا لشکر خزانے کی حفاظت کر رہا تھا اور انھوں نے چاروں طرف سے ان کے لشکر پر بندُوقیں تان رکھی تھیں۔

چیتُو کے پاس دھماکہ کرنے والی چند بندُوقیں تھیں۔ اس نے اسے آزمانے کا فیصلہ کیا۔ لیکن اس کے تین چار دھماکوں کے جواب میں تو سامنے سے سینکڑوں دھماکے ہو گئے۔ چیتُو کو ان دھماکوں سے ہی اندازہ ہو گیا کہ انگریز اپنے خزانے کی حفاظت کے لیے پوری طرح چوکس ہیں۔ چیتُو نے اپنے سرداروں سے مشورہ کیا۔ مگر امیر مقابلہ کرنے کے لیے تیار نظر آ رہا تھا اس کا کہنا تھا کہ ہم میں سے سو دو سو کی جانیں جائیں گی لیکن پورے شہر پر ہمارا قبضہ ہو جائے گا۔

"تمھارا کیا خیال ہے غفور خان؟" چیتُو نے جب غفور خان کی رائے پوچھی تو وہ اپنی داڑھی کھُجلانے لگا۔ دراصل غفور خان بہت ہی بزدل سردار تھا۔ وہ بندُوق سے ہمیشہ ہی خوف کھاتا تھا لیکن اپنے خوف کو چھُپاتے ہوئے وہ ہمیشہ یہی کہتا رہتا تھا "بندُوق تو بزدلوں کا ہتھیار ہے"

"میرا خیال ہے یہ لوگ کوئی گہری چال چل رہے ہیں۔" تھوڑی دیر بعد غفور خان نے زبان کھولی "ہمیں خزانے کے لالچ میں مبتلا کر کے یہ لوگ وقت گزارنا چاہتے ہیں۔ ممکن ہے انھوں نے اپنی مدد کے لیے کہیں سے مزید کمک منگوائی ہو اور شاید ان کا یہی ارادہ ہو کہ جب تک نہیں جاتی ہمیں اسی جگہ روک کے رکھا جائے۔"

غفور خان کی بات سُن کر چیتُو سوچ میں پڑ گیا۔ غفور خان کی بات قابلِ غور تھی۔ خزانے کے لالچ میں چُپ چاپ بیٹھے رہنا اسے خطرے سے خالی نظر نہیں آیا۔ امیر کے بہت سمجھانے کے باوجود بھی جب چیتُو انگریزوں پر حملہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہوا تو اسے پہلی بار چیتُو کی نیت پر کچھ شک سا ہونے لگا۔ کیونکہ چیتُو نے اب خزانہ حاصل کرنے کا ارادہ بھی چھوڑ دیا تھا۔ امیر اپنی جگہ حیران تھا کہ جو شخص انگریزوں کے ہاتھ سے ملک چھین لینے کی باتیں کرتا ہے وہ ایک چھوٹے سے شہر پر قبضہ کرنے سے کیوں گھبرا رہا ہے؟ امیر ایک عجیب سی کشمکش میں مبتلا تھا اور پھر مجبوراً اسے اپنے لشکر کو کرشنا ندی کی جانب کوچ کرنے کا حکم دینا پڑا۔

جب ان کے لشکر نے کرشنا ندی کو پار کیا تو انھیں یہ اطلاع ملی کہ گنتُور کے انگریزوں کا لشکر ان کا تعاقب کر رہا ہے۔ چیتُو اب انگریزوں سے کھُلم کھُلا مقابلہ کرنے سے کترا رہا تھا۔ جب اسے گنتُور کا خزانہ حاصل کرنے میں کامیابی نہیں ہوئی تو اس کی نظریں گڈوُ اگاؤں کے خزانے پر جمنے لگی تھیں لیکن وہاں بھی انگریز لشکر اس کا راستہ روکے تیار بیٹھا تھا۔ اس صورتِ حال سے چیتُو تلملا اٹھا۔ اپنے نائب سرداروں اور اپنے ساتھیوں پر جس چیتُو کو بھروسا تھا انھیں ہی وہ شک و شبہے کی نظروں سے دیکھ رہا تھا اس صورتِ حال سے خود امیر بھی پریشان تھا۔ چیتُو کے پانچ سرداروں میں وہ نیا سردار تھا اسی لیے اسے لگا کہ بقیہ چاروں سردار اسی کی جانب انگلی اٹھائیں گے۔ اس طرح اس پر انگریزوں کی مخبری کرنے کا الزام عائد کر دیا جائے گا۔ وہ دل ہی دل میں ڈر رہا تھا لیکن اس کے باوجود ہمت کر کے اس نے اپنا گلا صاف کیا اور چیتُو سے بولا "حضور گستاخی

معاف ہو۔" وہ بے حد احتیاط سے بول رہا تھا "کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ انگریز اپنے خزانے کی حفاظت کے لیے ہمیشہ ہی اپنا لشکر پہرے پر رکھتے ہوں؟"

"نہیں اس کے بارے میں نے پہلے سے معلومات حاصل کر لی تھیں۔" چیتُو نے امیر کے اندازے کو ایک ہی جھٹکے میں توڑ دیا "ہم لوگ چونکہ جنگل کے راستے سے آئے تھے اس لیے دن کے اجالے میں یہاں پہنچ گئے ہیں۔ لیکن ہماری مخبری کرنے والے کو تو ایک لمبا راستہ کاٹ کر یہاں تک آنا پڑا ہے اور پھر بھی بات ہم سے پہلے یہاں تک کیسے پہنچ گئی؟"

چیتُو کی یہ دلیل وزن دار تھی۔ جسے سن کر امیر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ آج سے ڈھائی ماہ قبل آدھی رات کو چیتُو نے یہ ساری راز کی باتیں اُسے بتائی تھیں اور اسی لیے وہ اپنے گھر بھی نہیں گیا تھا۔ اور اب کہیں چیتُو نے اس کا دوسرا مقصد تو نہیں نکال لیا؟ کہیں چیتُو کو اس پر یہ شبہ تو نہیں ہو گیا کہ اس نے اپنے کسی آدمی کے ذریعہ انگریزوں تک یہ اطلاع پہنچا دی ہے؟

چیتُو کی طویل خاموشی امیر کے لیے اُلجھن اور پریشانی کا باعث بنتی جا رہی تھی وہ جانتا تھا کہ وہ بے قصُور ہے لیکن اگر شک کا ایک ذرّہ بھی چیتُو کے من میں اٹک گیا تو وہ یقیناً قصُوروار ٹھہرا دیا جائے گا۔ خود غفور خان بھی ایسا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دے گا۔ اب تو ہر قیمت پر چیتُو کے دل سے اس قسم کے شکوک کو باہر نکالنا ہی پڑے گا۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے تیزی سے دماغ دوڑایا اور پھر بولا "حضور مجھے یقین ہے کہ ہمارے سرداروں میں سے کوئی بھی ایسی حرکت نہیں کر سکتا۔" یہ سُن کر چیتُو چونکے بغیر نہ رہ سکا وہ سوچ رہا تھا کہ امیر صفائی پیش کرنے کے لیے اس قدر بے چین کیوں ہو رہا ہے؟

"امیر مجھے اپنے ساتھیوں پر پُورا بھروسا ہے۔" اس کا لہجہ قدرے سخت ہو گیا تھا "لیکن تمھیں ان پر اتنا یقین کیونکر ہو گیا؟ کیا تم ان لوگوں کو مجھ سے زیادہ جانتے ہو؟"

امیر کو سٹپٹاتے دیکھ کر غفور خان کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ لیکن اس کے ہونٹوں کی یہ مسکراہٹ زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی کیونکہ امیر کہہ رہا تھا "حضور بات یہ نہیں ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ جو آدمی چڑھائی کی مخبری کرے گا وہ آدمی اس لڑائی میں شامل نہیں ہو گا اور اگر وہ شامل ہو بھی جاتا ہے تو بھی وہ سرداری تو قبول کر ہی نہیں سکتا۔"

"ہوں۔" چیتُو کی آنکھوں میں ایک چمک سی لہرا گئی۔ شاید وہ سوچ رہا تھا کہ یہ بات اس کے دماغ میں کیوں نہیں آئی؟ امیر تو شبہے سے بالاتر تھا کیونکہ گنتُور کا خزانہ لوٹنے کے لیے وہی سب سے زیادہ بے چین تھا۔ نہیں۔ نہیں... اس نے ذہن سے سارے خدشات کو جھٹکنے کی کوشش کی۔ انگریزوں کو کسی نے بھی خبر نہیں دی ہے۔ یہ محض اتفاق ہی ہو سکتا ہے کہ انگریزوں کا لشکر ان کے سامنے آ گیا ہے۔

"امیر میں تو تمھاری ہوشیاری کا امتحان لینا چاہتا تھا۔" اچانک چیتُو نے ہوشیاری سے بات بدلنے کی کوشش کی اور آگے بولا "مجھے تو تم سمیت اپنے تمام سرداروں پر پُورا بھروسا ہے۔" اتنا کہنے کے بعد اس نے اپنے لشکر کو تین حصوں میں تقسیم کر کے آگے بڑھنے کا ارادہ ظاہر کرتے ہوئے کہا "ہمیں انگریزوں کو دھوکے میں رکھنا ہو گا۔ ہمارا ایک لشکر مشرق کی جانب دوسرا مغرب کی طرف اور تیسرا درمیانی راستے سے کوچ کرے گا۔ اور امیر تمھیں میرے اور غفور خان کے لشکر کے درمیان ہی رہنا ہے۔"

"جو حکم ہو حضور۔" امیر نے سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکتے ہوئے کہا۔ اسے اس بات کی خوشی تھی کہ سفر میں وہ غفور خان سے الگ نہیں رہے گا جبکہ غفور خان اپنی جگہ یہ سمجھ رہا تھا کہ چیتُو سردار کو چونکہ امیر پر شک ہو گیا ہے اسی لیے اس نے اسے اپنے ساتھ رکھا ہے۔

ہ

امیر اور غفور خان اب تقریباً ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ہی رہتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ رات بھی ایک ہی خیمے میں بسر کرتے تھے۔ ایک ناپسندیدہ شخص کی اس صحبت نے امیر کے اندر کے سوئے ہوئے ٹھگ کو اور زیادہ جھنجھوڑنا شروع کر دیا تھا۔ اس کا دل بار بار اسے اُکساتا

کو قدرت نے اچانک ہی تمھیں یہ موقع فراہم کیا ہے اس سے جلد سے جلد فائدہ اٹھالو۔ جیسے جیسے امیر کے دل میں غفور خان کی نفرت بڑھتی جاتی تھی ویسے ویسے امیر کے رُوکھے پھیکے سلوک میں نرمی آتی جاتی تھی۔ اُوپر اُوپر سے وہ غفور خان کی پہلے سے زیادہ عزت کرنے لگا تھا اس کی تعریفیں کرتا اور اس کی زبان سے اس کے مظالم کی داستانیں سُن سُن کر مسکرانے لگتا۔ وہ غفور خان کے دل میں یہ بات توخاص کر کے بٹھا دینا چاہتا تھا کہ اس کی صحبت میں رہ کر وہ بہت کچھ سیکھ رہا ہے اور اسے امید ہے کہ ایک دن وہ بھی اس جیسا ہو جائے گا۔

اس عرصے میں ایک واقعہ ہو گیا۔ وہ لوگ ایک شہر کو لُوٹ رہے تھے اس لُوٹ مار میں امیر غفور خان سے الگ تھلگ رہنا چاہتا تھا کہ کوئی ناراضگی نہ پیدا ہو جائے۔ وہ اپنے چودہ ساتھیوں کے ساتھ جس گھر میں داخل ہوتا تو ان گھر والوں سے پہلے ہی کہہ دیتا۔ "ہم لوگ صرف تمھارا مال ہی لوٹنے آئے ہیں ہم لوگ کسی کی جان یا کسی کی عزت سے کھیلنے نہیں آئے ہیں۔ دکھاوے کے لیے ہم تھوڑی بہت تباہی ضرور کریں گے تاکہ ہمارے دوسرے ساتھیوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ یہ گھر لُوٹا جا چکا ہے۔"

"بچاؤ... بچاؤ..." چیخ سُن کر اچانک امیر نے گھوڑے کی لگام کھینچ لی۔ گلی کے ایک مکان سے ایک عورت کی چیخیں اور کسی مرد کے قہقہوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ امیر نے اپنے گھوڑے روک کر اس گھر کی جانب ایک نگاہ ڈالی۔ پورے شہر میں ہی ظلم و ستم کا یہ کھیل کھیلا جا رہا تھا اور وہ تنہا کس گھر میں جا کر کس کو بچا سکتا تھا؟ وہ اپنے دل کو سمجھا کر آگے بڑھنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک اس کی سماعت سے ایک بھاری گرجدار آواز ٹکرائی۔ "بتاؤ کہاں چھپا رکھی ہے دولت؟"

امیر کے کان کھڑے ہو گئے کیونکہ غفور خان کی آواز کو وہ پہچان چکا تھا۔ یکایک اس نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے اور گھوڑے کی پیٹھ سے نیچے اتر آیا پھر اپنے ساتھیوں سے بولا۔ "پیر خان۔ موتی رام میرے ساتھ ذرا اندر چلو۔"

گھر میں داخل ہوتے ہی امیر کے پاؤں دروازے پر ہی جم کر رہ گئے دروازے کی چوکھٹ پر ہی تین لاشیں تڑپ رہی تھیں۔ دو مرد اور ایک بوڑھی عورت خون میں لت پت اپنی آخری سانسیں لے رہے تھے ان کے جسموں پر تلوار کے گہرے گہرے زخم دکھائی دے رہے تھے جس میں سے گرم گرم سُرخ خون اُبل رہا تھا۔

ایک کونے میں غفور خان کے تین ساتھی تین نوجوان عورتوں کو اپنے بس میں کرنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ ان تینوں میں سے جو سب سے چھوٹی لڑکی تھی اسے ہاتھوں میں اچھال کر ایک لٹیرا تنگ کر رہا تھا جبکہ دوسری نوجوان عورت ایک بدصورت لٹیرے کی گرفت سے نکل جانے کی جدوجہد کر رہی تھی۔ تیسری عورت کے کپڑے ایک لٹیرے نے اپنے خنجر سے چیر ڈالے تھے اور اپنا جسم چھپانے کے لیے وہ اِدھر سے اُدھر سمٹ رہی تھی۔ امیر اور اس کے ساتھیوں کو دیکھ کر ان تینوں لٹیروں نے ان عورتوں کو دوسرے کمرے میں دھکیل دیا اور خود بھی اندر چلے گئے تاکہ امیر کے ساتھیوں میں سے کوئی ان کا حصہ دار نہ بن جائے... اچانک امیر نے غفور خان کی طرف نظر اٹھائی۔ وہ ایک بوڑھے آدمی پر ظلم ڈھا رہا تھا۔ اس نے گھوڑے کی لگام سے اس بوڑھے کے گلے میں پھندہ ڈال رکھا تھا اور جب پھندے کے جھٹکے سے بوڑھا مُنہ کھول کر آہ بھرتا تو غفور خان کے دوسرے دو ساتھیوں میں سے ایک اس کے کھُلے ہوئے مُنہ میں گرم گرم راکھ ڈال دیتا اور دوسرا پیچھے سے اس کی پیٹھ پر تلوار کا دستہ مارتا۔ بوڑھا کھانس کھانس کر بے دم ہوا جا رہا تھا۔ اور غفور خان پھندے کے ایک سرے کو تھام کر زور زور سے اس کے کان میں کہہ رہا تھا۔ "جلدی بتاؤ سارا مال کہاں چھپا رکھا ہے؟" تین لاشیں اور تین مظلوم عورتوں کی عزت پر ہونے والے حملے اور ایک بے بس بوڑھے کی چیخ و پکار نے امیر کے ضمیر کو جھنجھوڑ دیا۔ اب اس کے لیے اپنے غصے پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔ یکایک اس نے دانت پیس کر اپنی تلوار نیام سے باہر نکال لی لیکن ٹھیک اسی وقت موتی رام نے اس کی کلائی پکڑ لی اور دھیرے سے اس کے کان میں بولا۔ "نہیں امیر میاں۔ اس طرح تلوار اٹھاؤ گے تو ہم سب کا انجام

بُرا ہو گا ذرا سمجھ داری سے کام لو۔ یہ جلد بازی ہمیں مصیبت میں پھنسا سکتی ہے۔"

یہ سُن کر امیر کا ہاتھ ڈھیلا پڑ گیا۔ اس نے زبردستی اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کی پھر غفور خان کی توجہ اپنی جانب مبذول کراتے ہوئے بولا۔ "خان صاحب میں آپ کی مدد کے لیے آ گیا ہوں۔"

"مدد؟" غفور خان نے پُرغرور لہجے میں پوچھا۔ "مجھے تمھاری مدد کی کیا ضرورت ہو گی؟"

"بات دراصل یہ ہے کہ ہم ایک دولت مند جوہری کا گھر لُوٹنے گئے ہم نے کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔" امیر نے جان بوجھ کر اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔ اصل میں اس نے ایک ایسا مکان دیکھا تھا جس کے اندر کوئی رہتا نہیں تھا۔ اس نے اس بوڑھے کو غفور خان کے شکنجے سے بچانے کے لیے ہی یہ بات کہہ دی تھی۔

"میاں اس جوہری کو تو میں پھر دیکھ لوں گا پہلے مجھے اس بوڑھے کی زبان کھلوا لینے دو۔" اُس بوڑھے کی پیٹھ پر ایک گھونسہ مار کر غفور خان نے کہا۔ "جب ہم اس گھر میں داخل ہو رہے تھے تو اس احمق کے نوجوان بیٹے نے ہتھیار اٹھا کر ہمارا راستہ روکنے کی کوشش کی تھی لیکن سمندر کے جوش کو کون روک سکا ہے؟ تلوار کے دو چار زخم کھا کر ہی وہ دروازے پر گر پڑا پھر اس کے دوسرے بیٹے نے ہتھیار اٹھایا لیکن اس کی بوڑھی ماں درمیان میں آ کر گڑگڑانے لگی کہ پہلے مجھے مار دو میرے اس بیٹے کی جان مت لو۔ اور میں نے اس کی خواہش پوری کر دی۔ یعنی پہلے بوڑھی ماں کو ختم کیا پھر اس کے دوسرے بیٹے کو اور اس بوڑھے کو اس لیے زندہ رکھا ہوا ہے کہ وہ ہمیں بتا دے کہ ساری دولت کہاں چھپائی گئی ہے؟" اتنا کہہ کر غفور خان نے اس بوڑھے کی پیٹھ پر ایک اور گھونسہ جڑ دیا۔ امیر کو اس بوڑھے پر رحم آ رہا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ غفور خان جیسے ظالم آدمی کے ہاتھ میں یہ بے چارہ بوڑھا کیسے پھنس گیا؟

"خان صاحب اس کے پاس شاید کچھ ہو گا ہی نہیں۔" یہ کہہ کر وہ اپنے جُملے کو درست کرتے ہوئے آگے بولا۔ "آپ نے تو اس کے مُنہ پر کپڑا باندھ رکھا ہے یہ کس طرح بولے گا؟"

"اچھا..." غفور نے اس طرح سر ہلایا جیسے امیر کی بات اس کے دل کو لگ گئی ہو۔ اس نے فوراً ہی اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ بوڑھے کے مُنہ پر بندھا ہوا کپڑا کھول دیا جائے۔ جب اس کے ساتھی بوڑھے کے مُنہ سے کپڑا کھولنے لگے تو وہ پھر بولا۔ "اب دیکھتے ہیں یہ بولتا ہے یا نہیں؟ ویسے لاتوں کے بھُوت باتوں سے نہیں مانتے۔"

امیر نے کچھ اطمینان سا محسوس کیا بوڑھا اب سکون سے سانس لے رہا تھا۔ اس کے کھُلے ہوئے جسم سے پسینا چھوٹ رہا تھا اور چہرے پر بے بسی کی لکیریں بکھری ہوئی تھیں۔

"اس کے لیے پانی لاؤ۔" غفور خان نے اپنے ساتھی کو حکم دیا تو امیر کو لگا کہ شاید اب اس بوڑھے کی جان بچ جائے۔ لیکن اس کا اندازہ غلط ثابت ہونے لگا۔ غفور خان نے پانی کا پیالہ بوڑھے کے ہونٹوں کے قریب لا کر کہا۔ "بوڑھے پانی پی لو۔" اس کے دونوں جانب غفور خان کے دو ساتھی کھڑے ہوئے تھے جنھوں نے بوڑھے کو دونوں طرف سے پکڑ رکھا تھا۔ بوڑھے نے دھیرے دھیرے نظریں اٹھا کر غفور خان کی جانب دیکھا۔ پھر سر ہلا کر اس نے پانی پینے سے انکار کر دیا۔ اور بھرّائی ہوئی آواز میں بولا۔ "تمھارے ہاتھ کا پانی پی کر میں خود کو گناہ گار نہیں بناؤں گا۔ اس سے تو یہی بہتر ہے کہ میں موت کو پسند کر لوں۔"

اس کی بات سُن کر غفور خان کو ایک شدید جھٹکا لگا اور تلملا کر چیخا۔ "بے وقوف بوڑھے... میں تمھاری زبان کھینچ لوں گا، بول پانی پیتا ہے یا نہیں؟"

"میں اور تمھارے ہاتھ سے پانی پیوں؟ جس نے میری آنکھوں کے سامنے میرے دو جوان بیٹوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہو۔ جو میری بوڑھی بیوی پر بھی ہاتھ اٹھانے سے نہ ہچکچایا ہو، جس نے میری جوان بیٹی کی عزت لٹنے کا تماشا اپنی آنکھوں سے دیکھنا پسند کیا ہو۔ میں ایسے شیطان کے ہاتھوں سے پانی پینے کی بجائے اپنے بیٹوں کا خون پینا زیادہ پسند کروں گا۔" بوڑھے کا یہ جواب سن کر امیر بھی دنگ رہ گیا۔

"بڈھے!" غفور خان گرج کر بولا "تمھاری یہ مجال! ٹھیک ہے اب تم اپنے مردہ بیٹوں کا خون ہی پیو۔" اتنا کہہ کر اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو مسلتے ہوئے اپنے ایک ساتھی کو مخاطب کیا "اس پیالے میں اس کے بیٹے کا خون بھر لاؤ۔"

یہ سُن کر امیر سر سے پاؤں تک کانپ گیا غفور خان کی یہ حیوانیت اس سے برداشت نہیں ہو رہی تھی اس لیے وہ عاجزی سے بولا "نہیں خان اس حد تک اس بوڑھے پر ظلم نہ کریں۔"

غفور خان نے پلٹ کر امیر کی طرف چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا اور پھر بولا "میاں میرے بیچ میں پڑ کر تم ہماری دوستی کو دشمنی میں بدلنا چاہتے ہو؟ میں تو تڑپا تڑپا کر اس بڈھے کو بولنے پر مجبور کرنے والا ہوں۔"

امیر کا دم گھٹنے لگا اور اس کی آنکھوں میں سرخ لکیریں سی اُبھرنے لگیں۔ اس کا جی تو چاہا کہ وہ غفور خان سے کہہ دے کہ ہمارے درمیان کبھی دوستی تھی ہی نہیں۔ تم تو پہلے سے ہی میرے دشمن تھے اور رہو گے۔ لیکن یہ بات وہ غفور خان سے نہ کہہ سکا۔ کیونکہ ٹھیک اسی وقت صمد خان بوڑھے کے نوجوان بیٹے کا لہو پیالے میں بھر کر لے آیا۔ غفور خان کا چہیتا ساتھی صمد خان فرش پر بہتے ہوئے خون کو پیالے میں بھر لانے کو اپنی بہادری سمجھ رہا تھا۔ وہ قریب آ کر اپنی کرخت دار آواز میں بولا "بوڑھے یہ گنگا جل پی لو۔ پھر چھپائی ہوئی دولت کا پتا بتانے کو تمھارا دل خود بخود چاہنے لگے گا۔"

"شاباش صمد خان۔ تم موقعے پر اچھی عقل کا مظاہرہ کرتے ہو۔" کہہ کر غفور خان نے اس کے ہاتھ سے بھرا ہوا پیالہ لے لیا۔ بوڑھے کی آنکھوں میں بے بسی کے گہرے سائے لہرا رہے تھے۔ پیالے میں اپنے بیٹے کا خون دیکھ کر اس بوڑھے براہمن کے پاؤں کانپنے لگے۔ پھر یکایک وہ گر کر فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

"کیوں اب ڈھیلے کیوں پڑ گئے؟" غفور خان اس پر جھک کر بولا "مگر میں تمھاری خواہش ضرور پوری کروں گا۔" غفور خان پیالہ لے کر اس پر اور زیادہ جھک گیا۔ مگر بوڑھا اپنی گردن جھکا کر اپنا منہ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اچانک غفور خان کے دوسرے ساتھی نے اس کی کمر پر ایک زوردار لات ماری تو وہ بلبلا کر اٹھ بیٹھا۔ صمد خان نے فوراً ہی اس کا سر اپنے دونوں گھٹنوں میں دبوچ لیا اور اس کے بال پکڑ کر اس کا چہرہ اُوپر اُٹھا دیا لیکن بوڑھے نے اپنے جبڑوں کو مضبوطی سے بھینچ رکھا تھا۔ جب کسی طرح بھی اس بوڑھے نے اپنا مُنہ نہیں کھولا تو غفور خان بہت ہی غضبناک لہجے میں بولا "اس کا مُنہ تلوار سے چیر دو اور پھر اسے یہ خون پلاؤ۔"

غفور خان کے اس ظلم پر غصہ تو بہت آیا۔ لیکن امیر غفور خان کو اس حرکت سے بعض رکھنے کے لیے آگے نہیں بڑھ سکا اور نہ ہی وہاں سے ہٹ کر باہر جا سکا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ایک انسان کی حیوانیت کا تماشا دیکھتا رہا۔

صمد خان نے اپنی تلوار نیام سے باہر نکال لی۔ مگر وہ بوڑھا بھی کافی ہمت والا تھا۔ اپنے چہرے پر ننگی تلوار کو ناچتے دیکھ کر بھی اس نے اپنے ہونٹ نہیں کھولے۔ لیکن جب صمد خان نے اس کے دونوں ہونٹوں کے درمیان تلوار کی دھار رکھ دی تو اس کا مُنہ پھٹ گیا اور غفور خان اس کے کھلے ہوئے مُنہ میں اس کے بیٹے کا لہو انڈیلنے لگا۔ بوڑھے نے اپنی سانس روکنے کی کوشش کی تاکہ اس کے بیٹے کا لہو اس کے حلق سے نیچے نہ اترنے پائے۔ اس کوشش میں تھوڑا سا لہو اس کی گردن پر بھی بہنے لگا تھا یہ دیکھ کر صمد خان نے اپنی تلوار اور زور سے اس کے مُنہ پر دبا دی۔ بوڑھے کی ہمت اب جواب دے چکی تھی اس لیے مجبوراً اسے اپنے بیٹے کا لہو اپنے حلق سے نیچے اتارنا پڑا۔ یہ منظر اتنا ہی بھیانک تھا کہ دیکھنے والا بھی بے ہوش ہو جائے مگر پھر بھی وہ بوڑھا ابھی تک بے ہوش نہیں ہوا تھا۔ اب امیر کو اس کی ضد پر بھی غصہ آ رہا تھا کہ اتنے ظلم برداشت کرنے کی اسے ضرورت ہی کیا ہے؟ کم بخت آنکھیں موند کر بے ہوش ہو جانے کا ڈھونگ کیوں نہیں کرتا؟

پیالے کا تمام لہو بوڑھے کے مُنہ میں انڈیل دیا گیا۔ اس لہو میں خود اس کا لہو بھی شامل تھا کیونکہ تلوار کی کاٹ سے اس کے مُنہ سے بھی خون نکل رہا تھا۔ بوڑھا اب بالکل ہی ٹوٹ کر گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔

"اب بتاؤ نہیں تو تم پر اس سے بھی زیادہ ستم ڈھاؤں گا۔" غفور خان نے اس کے بال پکڑ کر اسے جھنجھوڑ دیا۔ لیکن

بوڑھے نے اپنی زبان نہیں کھولی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے غفور خان کی بات اس نے سنی ہی نہ ہو اور جیسے وہ اپنی قوتِ سماعت اور قوتِ گویائی کھو چکا ہو۔ وہ پتھر کے بُت کی طرح بے حس و حرکت بیٹھا تھا۔ مگر غفور خان اپنی یہ ہار برداشت نہیں کر سکا۔

"اب اسے اس سے بھی زیادہ سخت سزا دو۔" وہ پلٹ کر صمد خان سے بولا "اس کے ہاتھوں کی انگلیاں جلا دو پھر دیکھو یہ کہاں تک برداشت کر سکتا ہے۔"

اپنے سردار کا حکم سنتے ہی صمد خان دروازے کی جانب لپکا جہاں تین لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ اس نے ان لاشوں کے کپڑوں میں سے چیتھڑے پھاڑے اور انھیں تیل میں ڈبونے لگا۔ پھر ان تیل سے بھیگے ہوئے چیتھڑوں کو وہ بوڑھے کی انگلیوں میں لپیٹنے لگا۔ اسی وقت صمد خان کا دوسرا ساتھی ایک جلتی ہوئی مشعل بھی لے آیا۔ موتی رام امیر اور بیر خان چپ چاپ یہ لرزہ خیز منظر دیکھ رہے تھے۔ جیسے جیسے غفور خان کی حیوانیت بڑھتی جاتی تھی ویسے ویسے غفور خان کو ختم کر دینے کا ارادہ ان کے دل میں مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جا رہا تھا۔

"اب سلگا دو اس کی انگلیاں۔" غفور خان نے حکم دیا تو صمد خان اور اس کے ساتھی نے بوڑھے کو اٹھا کر کھڑا کر دیا اور مضبوطی سے اس کے ہاتھوں کو پکڑ کر سامنے کر دیا۔ غفور خان مشعل لے کر اس بوڑھے کی ایک ایک انگلی کو اس طرح جلانے لگا جیسے وہ کوئی موم بتی جلا رہا ہو۔ پھر دل کو چیر دینے والی چیخوں سے گھر گونجنے لگا اور ان چیخوں میں غفور خان کے قہقہے بھی شامل ہو گئے۔ بوڑھا اپنا ہاتھ ہٹانے کے لیے اپنا زور آزماتا لیکن اسے کامیابی نہ ہوتی۔ تیل سے بھیگے ہوئے چیتھڑے اس کی انگلیوں پر سلگنے لگے تھے۔

امیر کی آنکھیں سُرخ ہو چکی تھیں لیکن اس کے باوجود وہ چپ تھا۔ اور آخر کار وہ بوڑھا اس طرح ڈھیلا ہو کر بے ہوش ہو گیا جیسے یہ ظلم اس کی برداشت سے باہر ہو۔ اس کے ہوش ہوتے ہی غفور خان چیخ کر بولا "اب اس کی بہو بیٹیوں کو یہاں لے آؤ مجھے دیکھنا ہے وہ اپنی زبان کھولتی ہیں یا نہیں؟"

لیکن اس کی یہ خواہش پوری نہیں ہوئی کیونکہ ٹھیک اسی وقت دوسرے کمرے کا بند دروازہ کھول کر غفور خان کا ایک ساتھی باہر نکلا۔ اس کے پیچھے (۲) کے دو ساتھی اور بھی تھے۔ ان میں سے ایک نے بڑی مشکل سے غفور خان کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا "لیکن سردار ان تینوں کو تو ہم نے ختم کر دیا ہے۔"

غفور خان نے بپھرے ہوئے شیر کی طرح خونخوار نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔ تھوڑی دیر کو تو یوں لگا کہ جیسے اس کی تلوار ایک لمحے میں ہی ان تینوں کا کام تمام کر دے گی۔ لیکن شاید امیر کی موجودگی میں ایسا قدم اٹھانا غفور خان نے مناسب نہیں سمجھا وہ اب پھر بے ہوش پڑے ہوئے بوڑھے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یکایک پھر پلٹ کر وہ دہاڑا "اس پر پانی چھڑک کر اسے ہوش میں لے آؤ۔"

بوڑھے کو ہوش میں آنے میں جوں جوں دیر لگتی جا رہی تھی۔ توں توں غفور خان کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ پھر جب بوڑھے نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھولیں تو غفور خان اپنی پوری طاقت سے چیخ کر بولا "بڈھے کیا تم اب بھی گونگے بن کر رہو گے؟"

لیکن بوڑھے نے اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا اس نے بہ مشکل اپنی پلکیں اٹھائیں پھر اپنی گردن دوسری جانب موڑی۔ یہ دیکھ کر غفور خان نے اپنی تلوار نکالی اور پلک جھپکتے ہی اس نے آنکھیں بند کر کے بوڑھے کے جسم پر تلوار کے وار کرنے شروع کر دیئے۔ وہ بوڑھے کے جسم پر تلوار اٹھا اٹھا کر مارتا گیا اور بوڑھے کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے ہوتے گئے۔ بوڑھے کے جسم کو کئی ٹکڑوں میں تبدیل کرنے کے بعد جب غفور خان نے پلٹ کر دیکھا تو امیر اور اس کے ساتھی وہاں موجود نہیں تھے۔

"اب ہمیں غفور خان کو ٹھکانے لگانے کی ترکیب سوچ لینی چاہیئے۔" امیر بہت ہی گمبھیر لہجے میں اپنے ساتھیوں سے کہہ رہا تھا "آج اس کی حیوانیت کا تماشا دیکھ لینے کے بعد میرا دل پکار پکار کر مجھ سے کہہ رہا ہے کہ اتنے ظالم آدمی کو زندہ چھوڑ دینا بہت بڑا گناہ ہے۔"

"تو پھر ثواب کا یہ کام ہمیں کب کرنا ہے امیر میاں؟"

موتی رام نے پہل کرتے ہوئے کہا۔" اس بوڑھے پر اس نے جو مظالم ڈھائے ہیں وہ تو شیطان کو بھی شرما دینے والے ہیں۔"

"بے شک غفور خان کو اب ہمیں پہلی ہی فرصت میں ختم کر دینا ہے اس میں اب تاخیر کی بالکل ہی گنجائش نہیں ہے۔" پیر خان نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔" مگر اس کی غیر حاضری سارے لشکر میں سنسنی سی پھیلا دے گی۔"

"ہمیں بڑی احتیاط سے کام کرنا ہوگا۔ میں نے سب کچھ سوچ رکھا ہے۔" اتنا کہہ کر امیر چند لمحوں کے لیے ٹھہر گیا پھر اس نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے اپنے چودہ ساتھیوں پر اچٹتی ہوئی نظر ڈالی پھر آگے بولا۔" لیکن اگر ہم میں سے کسی نے غداری کی تو چیتو ہم پندرہ آدمیوں کی کھال کھینچ لے گا یہ بات تم یاد رکھنا۔" امیر کے ان الفاظ نے دو تین ٹھگوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ امیر کی بات سن کر اس کا ایک ساتھی ہدایت خان تو نظریں جھکائے اپنی داڑھی کھجانے لگا اور رام دین نے ایک گہرا سانس لے کر امیر کی طرف دیکھا جبکہ نذر علی تو اپنی انگلی سے زمین کریدنے لگا تھا۔

"امیر میاں ہم میں سے کوئی بھی غداری نہیں کرے گا۔ اس طرف سے تو تم مطمئن رہو۔" موتی رام نے بات آگے بڑھائی۔ "اب تم نے کیا سوچ رکھا ہے یہ مجھے بتا دو۔"

موتی رام کی بات سننے کے باوجود امیر کچھ دیر تک خاموش ہی رہا۔ خطرے کا جوا کھیلنے سے قبل وہ اپنے آپ کو تول لینا چاہتا تھا۔ غفور خان کو ختم کر دینا تو اس قدر مشکل نہ تھا اسے تو صرف یہی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ غفور خان کے قتل کے راز کو اس کا ایک ایک ساتھی ہضم کر سکے گا یا نہیں؟

"امیر میاں کلہاڑی ہاتھ میں لے کر بھوانی دیوی کی قسم کھانے والا کوئی بھی ٹھگ کبھی غداری کا مرتکب نہیں ہوتا۔" پیر خان اس طرح بولا جیسے وہ امیر کی اندرونی کشمکش کو بھانپ گیا ہو اس نے امیر کو تسلی دیتے ہوئے آگے کہا۔ "اس کام کو جلد سے جلد نپٹا دینے کے لیے ہم سب ہی بے تاب ہیں۔"

"تو پھر سنو۔" امیر کی آواز سنتے ہی سب کی آنکھیں اس پر مرکوز ہو گئیں ہر کوئی اپنی سانس روکے سن رہا تھا۔ "غفور خان نے آج جو کچھ بھی کیا ہے اس کے لیے میں اس کی تعریف کروں گا اور اگلے سفر کے دوران میں اس کے ساتھ ساتھ رہوں گا۔ پھر جس منزل پر دو تین دنوں تک کا لمبا پڑاؤ ڈالا جائے گا وہاں اپنے خیمے تمام لشکر کے خیموں سے ذرا فاصلے پر ڈالنے ہوں گے کیونکہ غفور خان شراب کی محفل جمانے ہمارے خیمے میں آئے گا اور تب..."

"وہ موت کا مہمان بن جائے گا۔" موتی رام نے امیر کا ادھورا جملہ مکمل کر دیا۔

"لیکن اس بات کا کسی کو علم نہیں ہونا چاہیے کہ وہ ہمارے خیمے میں آیا تھا۔" پیر خان نے انگلی اٹھا کر سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں اب اسی ایک بات پر ہماری کامیابی و ناکامیابی کا دار مدار ہے خیر یہ سب تم لوگ مجھ پر چھوڑ دو۔" امیر جان بوجھ کر ساری باتیں بتانا نہیں چاہتا تھا نہ جانے کیوں اسے اپنے ساتھیوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ شاید یہ ہی وجہ تھی کہ وہ اپنی پوری تسلی کے بغیر اپنا پورا منصوبہ کھولنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے گفتگو کو یہیں سمیٹ لینے کی کوشش کی اور بولا۔" بس ہمیں اب ایک سچے ٹھگ کی طرح بالکل ہی انجان بن جانا ہے۔ جیسے کوئی بات ہم میں ہوئی ہی نہیں۔"

موتی رام اور پیر خان یہ سمجھ چکے تھے کہ امیر نے بات پر پردہ ڈال دینے کی کوشش کی ہے لیکن اس کے باوجود وہ دونوں ہی خاموش رہے۔

چیتو کا لشکر ایک ایک شہر ایک ایک گاؤں کو اپنے گھوڑوں کی ٹاپوں تلے روندتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ اس بار امیر اپنے ساتھیوں سے الگ ہو کر غفور خان کے ساتھ ٹوٹلہ میں شریک رہنے لگا تھا۔ جس آدمی سے اسے شدید نفرت تھی جس کے ظلم و ستم نے اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا اسی آدمی کی صحبت میں اپنا رہنا اس کے لیے خاصا تکلیف دہ ہو رہا تھا لیکن اس کے باوجود مسکرا مسکرا کر ان تکلیف دہ لمحات کو گزار رہا تھا۔ اور غفور خان تو اس کی موجودگی میں لوگوں پر اور بھی زیادہ ظالمانہ سلوک کرنے لگا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے اپنے مظالم کا نظارہ دکھا کر وہ امیر کو چونکا دینا چاہتا ہو۔ اور مجبوراً امیر کو اس کی تعریف بھی

کرنا پڑتی تھی۔

غفور خان کو ہلاک کر دینے کی دھن میں وہ اس بات کو تقریباً فراموش کر بیٹھا تھا کہ جس ٹھگ کو اس نے اپنے اندر سلا رکھا ہے وہ ٹھگ ایک بار پھر اس کے اندر بیدار ہونے لگا ہے۔

"خان صاحب روزانہ کے اس خون خرابے میں کبھی کبھی دل بہلانے کا موقع مل جاتا ہے تو بہت ہی مزہ آتا ہے۔" امیر اپنے منصوبے پر عمل کرتے ہوئے بولا۔" گنتور میں انگریزوں کو لوٹنے کے بعد انگریزی شراب ملی تھی یہ بات تو آپ کو یاد ہے نا؟"

"ہاں۔" غفور خان کی آنکھوں میں چمک سی لہرا گئی۔

"امیر کیا تم مجھے عمدہ شراب کی یاد دلا کر بے چین کر دینا چاہتے ہو؟" اتنا کہہ کر غفور خان نے ایک گہرا سانس لیا۔

"نہیں خان صاحب میرا ارادہ آپ کو بے چین کرنے کا نہیں ہے۔" امیر مدھم اور میٹھی آواز میں بولا۔" یہ بندہ تو آپ کی خدمت کرنا چاہتا ہے۔"

"خدمت...؟" غفور خان نے چونک کر اپنا گھوڑا روک لیا اور امیر کو گھور گھور کر دیکھنے لگا پھر بولا۔" امیر تم تو بہت پہنچے ہوئے لگتے ہو۔"

ایک لمحے کے لیے امیر تھرتھرا گیا مگر پھر اس نے فوراً ہی خود کو سنبھالا اور مسکرا کر بولا۔" خان صاحب آپ اس ناچیز کی تعریف کر رہے ہیں یا آزمائش؟" اتنا کہہ کر وہ غفور خان کے جواب کا انتظار کیے بغیر آگے بول گیا۔" گنتور کی لوٹ مار کے دوران میں نے انگریزی شراب کی تین بوتلیں اپنے سامان میں چھپا کر رکھ لی تھیں۔"

"ماشاء اللہ۔" غفور خان خوش ہو کر بولا۔" تمہارے پاس اتنی مزیدار شراب ہے یہ بات اتنے دنوں تک تم نے مجھے بتائی کیوں نہیں؟" غفور خان اپنے سوکھے ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔" میری پیاس اب بڑھنے لگی ہے۔"

"میں بھی کسی ایسے ہی موقعے کا منتظر ہوں جہاں اطمینان سے بیٹھ کر ہم اس خوبصورت چیز کا لطف اٹھا سکیں۔" اتنا کہہ کر امیر نے اس کی بے قراری کو اور بڑھانے کی کوشش کی۔" ویسے میں نے ابھی تک اپنا سامان کھول کر یہ نہیں دیکھا ہے کہ شراب کی بوتلیں محفوظ ہیں یا نہیں۔"

"خدا خیر کرے ایسی عمدہ چیز سلامت ہی ہوگی۔" غفور خان اب پانی پانی ہوا جا رہا۔" محفل جمانے کے لیے کسی موقعے کا انتظار نہیں کیا جاتا امیر جہاں بیٹھ گئے محفل جم گئی۔"

"یہ بات نہیں ہے خان صاحب۔ ہمارے پاس صرف تین ہی تو بوتلیں ہیں اگر ہم نے بڑی محفل جمائی تو پھر ہمیں پینے کے بجائے شراب صرف چکھنے کو ہی ملے گی۔ بہتر تو یہ ہے کہ یہ بات کسی کو معلوم ہی نہیں ہونی چاہیے۔ میں کسی اطمینان بخش پڑاؤ کی راہ دیکھ رہا ہوں۔"

"اطمینان بخش۔" غفور خان کی آواز میں بے قراری تھی۔" تب تو تم نے بڑے موقعے پر یہ بات کہی ہے۔ اگلے پڑاؤ پر ہم دو دن ٹھہریں گے اور وہیں ہم اس انگریزی شراب کے ساتھ اطمینان سے انصاف کر سکیں گے۔"

"ٹھیک ہے جیسی آپ کی مرضی۔" امیر نے جان بوجھ کر یہ گفتگو ختم کر دی۔ وہ اس سلسلے میں کسی جلد بازی کا اظہار کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے ایسی ہی ترکیب سے کام لیا تھا کہ غفور خان خود ہی کھنچ کر اس کے جال میں آ جاتا۔

"پیر خان تم نے سارا بندوبست تو کر لیا ہے نا؟"

"ہاں امیر میاں شراب کی دو بوتلوں میں میں نے افیون ملا دی ہے۔ حالانکہ اس کا مزہ کچھ بدل گیا ہے لیکن ایک بوتل پینے کے بعد غفور خان کو کچھ ہوش ہی نہیں رہے گا۔"

"اور غوث خان کو مزیدار پلاؤ پکانے کے لیے کہا ہے یا نہیں؟" امیر ہر تیاری سے باخبر ہو جانا چاہتا تھا۔" میں نے غفور خان کو دعوت دیتے وقت کہا تھا کہ ہمارا غوث خان بہت لذت دار پلاؤ پکاتا ہے۔ انگریزی شراب کے ساتھ اس پلاؤ کا ذائقہ اور بھی بڑھ جائے گا۔"

"یہ سارا کام ہو جائے گا لیکن غفور خان کی دولت کو حاصل کرنے کے لیے کیا کرنا ہوگا۔" پیر خان کی آنکھوں میں لالچ کی چمک لہرانے لگی۔" اس نے لوٹ کی ساری دولت اپنے گھوڑے کی زین میں چھپا رکھی ہے۔ اس دولت کو ہم ہاتھ سے کیوں جانے دیں؟"

یہ سن کر امیر نے مسکرا کر اس کی جانب دیکھا۔" پیر خان

کیا تمھیں معلوم ہے کہ غفور خان ایک پل کے لیے بھی اپنے گھوڑے کو اپنی نگاہوں سے اوجھل ہونے نہیں دیتا۔ اس معاملے میں وہ اپنے چوکیدار پر بھی بھروسا نہیں کرتا۔"

"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ وہ گھوڑے کو ساتھ لائے بغیر ہمارے خیمے میں نہیں آئے گا۔" پیر خان نے کہا۔

"لیکن اس میں ایک مشکل آسکتی ہے۔ دوسرے لٹیروں نے اگر اسے گھوڑے پر اس طرف آتے دیکھ لیا تو انھیں کچھ شک ہو جائے گا۔" موتی رام نے جواب دیا۔

"دیکھو پیر خان غفور خان کے یہاں آنے کی خبر کسی کو بھی نہیں ہوگی۔ وہ خود ہی نہیں چاہتا کہ اس کے آنے کی خبر عام ہو۔" امیر بولا۔

"وہ کیوں؟"

"غفور خان شراب کا اس قدر شوقین ہے کہ وہ نہیں چاہتا کہ اس میں کوئی حصہ دار بن جائے۔" امیر بہت دھیمے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ "اور اسے یہ بھی معلوم ہے کہ پینے کے بعد وہ اپنے آپ میں نہیں رہتا اسی لیے وہ اس موقعے پر دوسروں کی موجودگی پسند نہیں کرے گا بلکہ اس نے تو مجھ سے بھی کہا تھا کہ اپنے ایک دو ساتھیوں کے سوا کسی کو بھی مت بلانا میں مدہوش ہو کر اس انگریزی شراب کا لطف اٹھانا چاہتا ہوں۔ پھر چاہے دنیا جہنم میں جائے۔"

"امیر میاں تم واقعی اس کی کمزوری کو سمجھ گئے ہو۔" پیر خان خوش ہو کر بولا۔ "کافی عرصے کے بعد ایک مضبوط شکار پر ہاتھ آزمانے کا موقع ملے گا۔"

"یہ کام مجھے انجام دینا ہے پیر خان۔" امیر نے پرجوش لہجے میں کہا۔ "میں رومال سے اس کا گلا دباؤں گا تب ہی مجھے چین آئے گا۔"

پیر خان اس کی بات سن کر اور خوش ہو گیا۔ اس کے ساتھی بھی یہی چاہتے تھے کہ لٹیروں کے گروہ سے نکلنے کے بعد امیر بھر سے ٹھگوں کا سردار بن جائے۔ غفور خان کو ختم کرنے میں بے چینی کی سب سے بڑی وجہ یہ بھی تھی۔

"پھر بھی امیر میاں ہمیں محفل میں گانے بجانے کا انتظام تو کرنا ہی پڑے گا تاکہ اس کے شور و غل میں غفور خان کی چیخیں دب جائیں۔"

"تو کیا غفور خان چیخ سکے گا؟" امیر نے پُراعتماد لہجے میں پوچھا۔ اور پھر خود ہی آگے بولا۔ "شراب کے نشے میں چور ہو کر وہ مکار ایک پاگل کتے کی طرح ہمارے بس میں آجائے گا۔ ہمیں گانے بجانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے نہیں تو دوسرے لوگ گانے بجانے کی آوازیں سن کر ہمارے خیموں کی جانب آجائیں گے۔"

امیر کی یہ دلیل پیر خان کے گلے سے نیچے اتر گئی پھر وہ دل ہی دل میں غفور خان کی زندگی کی گھڑیاں شمار کرنے لگا۔

سورج غروب ہوتے ہی غفور خان کی پیاس بڑھنے لگی۔ اس نے اپنے سائیس کو ایک دو بار امیر کی چھاؤنی پر بھیجا تاکہ وہ پوچھ آئے کہ اگر تیاری ہو چکی ہو تو وہ آجائے لیکن امیر تھوڑی دیر اور ہے، کہہ کر وقت گزارتا رہا۔ دراصل وہ چاہتا تھا کہ اندھیرا اور گہرا ہو جائے اور لٹیرے نیند کی آغوش میں پہنچ جائیں تب ہی وہ غفور خان کو اپنے خیمے میں بلوائے گا۔ وہ اس وقت تک راہ دیکھنا چاہتا تھا جب تک شراب کی پیاس غفور خان کو بہت زیادہ بے چین نہیں کر دیتی۔

آخر غفور خان کا سائیس امیر کا پیغام لے ہی آیا۔

"حضور آپ کو امیر میاں نے بلوایا ہے۔"

یہ پیغام سن کر غفور خان اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے سائیس کو پہلے ہی سمجھا رکھا تھا کہ وہ اس کے گھوڑے کو لے کر امیر کی چھاؤنی پر پہنچ جائے اگر کوئی پوچھے تو کوئی جواب مت دینا۔ پھر امیر علی کے گھوڑے کے ساتھ اس کو باندھ کر تم بھی وہیں سو جانا۔ صبح کو ہم واپس آئیں گے اپنے خیمے کے چوکیدار کو بھی تاکید کرتے ہوئے اس نے کہا تھا "میرے سر میں درد ہے اس لیے میں سو رہا ہوں کا شور و غل نہ ہونے پائے اور خیال رکھنا میرے آرام میں کوئی خلل نہ ڈالے۔" پھر تھوڑی ہی دیر بعد وہ خیمے کے پچھلے دروازے سے نکل کر امیر کے خیمے میں پہنچ چکا تھا۔

"خوش آمدید خان صاحب تشریف لائیے۔ دیر ہونے کی وجہ سے میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔" امیر

خندہ پیشانی سے اس کا استقبال کرتے ہوئے کہا۔ "ساری تیاری مکمل ہے۔"

"تیاری؟" غفور خان نے خیمے میں اچٹتی سی نظر ڈالی پھر اس کی نگاہیں دری پر رکھی ہوئی انگریزی شراب کی بوتلوں پر جم گئیں۔ اس کی آنکھیں اب چمکنے لگی تھیں۔

"خدا کی قسم امیر تم واقعی داد کے مستحق ہو یہ بوتلیں اس بات کی گواہ ہیں کہ تم نے میرے لیے ایک انتہائی حسین چیز چھپا رکھی ہے۔" اتنا کہہ وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا شراب کی بوتلوں کے قریب پہنچ گیا پھر وہیں بیٹھ کر وہ بوتل پر ہاتھ پھیرنے لگا اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ تھی اور وہ للچائی ہوئی نظروں سے امیر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ "میں انگریزوں کی پسند کی تعریف ضرور کروں گا۔ سالے ہلکی چیزوں کو تو کبھی ہاتھ بھی نہیں لگاتے۔"

امیر کو لگا کہ جب شراب کو دیکھ کر ہی اس آدمی کی حالت بگڑنے لگی ہے تو شراب پی لینے کے بعد اس کی کیا حالت ہوگی؟ اب اسے خود کو محتاط رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی اس نے پیر خان سے کہا۔ "پیر خان دیکھو جا کر غوث خان نے پلاؤ تیار کر لیا ہے تو خان صاحب کے لیے لے آؤ۔"

"ارے پلاؤ کی ایسی تیسی۔" کہہ کر غفور خان نے ایک بوتل پر ہاتھ رکھ دیا اور آگے بولا۔ "اس ایک بوتل میں دنیا بھر کی لذتیں پوشیدہ ہیں امیر میاں۔" اس نے امیر کے ہاتھ سے پیالہ جھپٹ لیا اور پھر اس میں شراب انڈیلنے لگا۔ "یا خدا کیا اس کا رنگ ہے اور کیا خوشبو ہے؟" اتنا کہنے کے بعد اس نے ایک ہی سانس میں شراب کا پہلا پیالہ ختم کر دیا۔

"واہ بہت ہی اعلیٰ شراب ہے امیر۔" وہ اپنے ہونٹ صاف کرتا ہوا بولا۔

"اس کی قدر تو کوئی آپ جیسا قدر شناس ہی کر سکتا ہے۔" امیر نے اپنی چال چلنی شروع کر دی۔ "خان صاحب آپ نے اپنے گھوڑے کو تیار تو رکھا ہے نا؟ صبح کے وقت نشے کی حالت میں پیدل واپس جانا ٹھیک نہیں ہوگا۔"

"ارے ہاں امیر میرا سائیس گھوڑا لے آیا ہے یا نہیں یہ ذرا معلوم تو کر لو اور اپنے آدمی سے کہہ دو اس کے آگے گھاس ڈال دے۔" اتنا کہہ کر غفور خان پھر پینے لگا۔ لیکن آدھی بوتل کے ختم ہوتے ہی وہ اس طرح بولا جیسے اچانک ہی اسے کچھ یاد آگیا ہو۔ "ارے امیر میاں تم نے تو تین بوتلوں کا ذکر کیا تھا نا؟"

"آپ گھبرائیں مت۔۔ تینوں بوتلیں آپ کی خدمت میں حاضر ہیں۔" امیر بڑی چالاکی سے بولا۔ "آپ جی بھر کر پئیں۔"

"اور تم نہیں پیو گے؟"

امیر اس سوال کے لیے تیار ہی تھا اس نے دوسری بوتل لانے کے لیے کہا اور پھر غفور خان سے بولا۔ "میں تیسری بوتل میں آپ کا ساتھ دوں گا۔" پھر دانت پر دانت جما کر دھیمی آواز میں بولا۔ "آپ کا ساتھ اس تیز رفتاری سے دینے کی مجھ میں ہمت نہیں ہے۔"

"میں اتنا ضرور کہوں گا کہ میرے ساتھ رہ کر تمھارے حوصلے ضرور بڑھ جائیں گے۔" غفور خان ہنستے ہوئے بولا اور امیر نے اندر ہی اندر اپنے دانت پیسے اور شراب کی دوسری بوتل اس کے آگے رکھ دی اور بولا۔ "لیجیے اب آپ کو اور زیادہ مزہ آئے گا۔"

لیکن دوسری بوتل میں سے دو تین گھونٹ پیتے ہی غفور خان کے چہرے کی رنگت بدل گئی اور وہ منہ بنا کر بولا۔ "اس کا مزہ کچھ بدلا ہوا سا کیوں لگتا ہے؟"

یہ سن کر دور کھڑا ہوا پیر خان تو تھر تھرا گیا مگر امیر نے جواب دینے میں ذرا بھی تاخیر نہیں کی۔ "جناب یہ پہلی والی شراب سے مختلف ہے۔ آپ اس پر لگا ہوا نشان دیکھ لیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا۔"

افیون کی ملاوٹ والی شراب غفور خان کے دماغ پر اثر کرتی جا رہی تھی وہ چندھیائی ہوئی آنکھوں سے بوتل پر لگے ہوئے لیبل کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "ہاں واقعی یہ تو دوسرا ہی مال لگتا ہے۔"

ٹھیک اسی وقت پیر خان پلاؤ کی پلیٹ لے کر آگیا۔ امیر نے پلیٹ اس کے ہاتھ سے لے کر غفور خان کے سامنے رکھ دی اور بولا۔ "اس کے ساتھ پلاؤ کا ذائقہ اس کے لطف کو دوبالا کر دے گا۔"

تھوڑا سا پلاؤ کھانے کے بعد غفور خان نے شراب کی اس دوسری بوتل کو اپنے حلق میں انڈیل لیا پھر اسے ہچکیاں آنے

لگیں اور وہ اُنھیں ہچکیوں کے درمیان بولا۔" امیر میاں... اس کی خاطر تو میں انگریزوں کی غلامی کرنے کے لیے بھی تیار ہوں۔۔لاؤ کہاں ہے تیسری بوتل؟"

"یہ رہی۔" امیر نے تیسری بوتل بھی سامنے رکھ دی۔

"خان صاحب میں نے سُنا ہے کہ انگریز لوگ شراب پیتے وقت موسیقی بھی ضرور سنتے ہیں۔ ہمارا ساتھی موتی رام بھی خوب گاتا بجاتا ہے۔"

"یار امیر تم موتی رام کی بات کرتے ہو؟" غفور خان کی ہچکیاں اب اور بھی بڑھ گئی تھیں۔" اس وقت تو مجھے موتی بائی کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔"

امیر نے موتی رام کو بلانے کے لیے پیر خان کو اشارہ کیا۔ دراصل اب وہ غفور خان کو ٹھکانے لگانے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ پھر جب تیسری بوتل کا ڈھکن کھُلا تو موتی رام اپنا ستار لے کر خیمے میں داخل ہو چکا تھا۔

"واہ یہ ساز تو مجھے بہت پسند ہے۔" غفور خان موتی رام کے ستار کو دیکھ کر چہکا پھر شراب کا ایک دو گھونٹ بھرنے کے بعد اس نے ستار اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ نشے میں چور ہونے کے باوجود بھی اس کی انگلیاں ستار کے تاروں پر کسی ماہر فن کی طرح پھسل رہی تھیں۔ یہ دیکھ کر امیر دنگ رہ گیا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ غفور خان جیسا سخت گیر آدمی اتنا نازک اور ملائم ساز بھی بجا سکتا ہے؟ اس نے غفور خان کو داد دیتے ہوئے کہا۔" آپ تو واقعی سنگیت کے استاد لگتے ہیں۔" اتنا کہہ کر امیر ایک لمحے کے لیے رکا پھر آگے بولا۔" مگر موتی رام بھی بہت اچھا ستار بجاتا ہے۔"

"اچھا..." غفور خان نے بوتل ہاتھ میں لے کر ستار موتی رام کو دے دیا اور کہا۔" اب ایک آدھ غزل ہو جانی چاہیئے کوئی ایسی چیز جس سے طبیعت پھڑک اٹھے۔"

"غزل تو مجھے نہیں آتی لیکن میں اپنے گاؤں کا خاص گیت آپ کو ضرور سناؤں گا۔" موتی رام نے جواب دیا۔

"نہیں موتی رام جانے دو گیت کو۔" غفور خاں ہاتھ اٹھا کر بولا۔" میں تم لوگوں کو ایک غزل سناتا ہوں۔" یہ کہتے ہی وہ ہاتھ کو جنبش دیتا ہوا شروع ہو گیا۔ موتی رام، امیر اور پیر خان، واہ۔ واہ، کر کے مسلسل اسے داد دیتے رہے

لیکن اب غفور خان کے دماغ پر شراب اور افیون کا دہرا نشہ چھاتا جا رہا تھا۔ اسے پھر سے ہچکیاں آنی شروع ہو چکی تھیں۔ غزل کے بول ٹوٹنے لگے تو امیر سمجھ گیا کہ قتل کی گھڑی نزدیک آ چکی ہے۔

"خان صاحب انگریز لوگوں کی ایک اور خاصیت آپ کو معلوم ہے؟"

"کیا؟" غفور خان نے نشیلی آنکھوں سے امیر کی طرف دیکھا۔

"وہ لوگ کھڑے کھڑے پیتے ہیں ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے ہو کر باتیں کرتے جاتے ہیں۔" امیر نے کہا۔

"ہاں یہ تو میں نے بھی سُنا ہے۔" غفور خان نے کھڑے ہونے کی کوشش کی لیکن اسے تکلیف ہوئی تب موتی رام نے اسے سہارا دیا اور غفور خان اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔" ہاں تو امیر انگریز لوگ سُنا ہے نعرے بھی لگاتے تھے۔"

"ہاں ہپ۔ ہپ ہُرے جیسے نعرے لگاتے تھے۔" امیر بولا۔

"اس ہپ ہپ ہُرے کا کیا مطلب کیا ہوتا ہے؟" غفور خان نے پوچھا۔

"خان صاحب ہم لوگ تو بسم اللہ کہہ کر کھاتے پیتے ہیں شاید وہ بھی ایسا ہی کچھ کہتے ہوں گے۔"

"اچھا۔" کہہ کر غفور خان نے تیسری بوتل میں بچی ہوئی شراب بھی اپنے حلق میں انڈیل لی اب وہ نشے میں بالکل چور ہو چکا تھا۔ یکایک وہ لڑکھڑائی ہوئی آواز میں بولا۔" موتی رام۔ تم ستار بجاؤ میں ناچوں گا۔"

یہ سُن کر امیر نے موتی خان کو اشارہ کیا تو موتی رام نے ساز چھیڑ دیا اور غفور خان بے ڈھنگے پن سے اٹھ کر ناچنے لگا کبھی کبھی وہ ڈگمگا کر گرتا بھی تھا اور کھسیانی ہنسی ہنس کر کہتا۔" امیر میاں پیتا تو میں ہوں لیکن نشہ تم لوگوں کو چڑھ رہا ہے یہ تم لوگ میرے چاروں طرف گھوم کیوں رہے ہو؟"

نشہ اس کی رگ رگ میں سرایت کر چکا تھا۔ اس کا بدن لگا تھا اور خود اپنا بوجھ بھی اٹھانا اس کے لیے دوبھر ہو رہا تھا اچانک وہ لڑکھڑا کر زمین پر گر پڑا ہلکا سا دھماکہ ہوا موتی رام نے ستار ایک طرف رکھ دیا اور اٹھ کر غفور خان کی طرف لپکا ٹھیک اُسی وقت امیر نے اپنی کمر سے اپنا قاتل رومال کھینچ لیا

تھا۔ غفور خان سجدے کے بل زمین پر پڑا تھا۔ اس کی پیشانی زمین پر لگی ہوئی تھی اور دونوں جبڑے سختی سے بند تھے۔

"اس کی گردن اونچی کرو پیر خان میں بالکل تیار ہوں۔" امیر نے رومال کے دونوں سروں کو مضبوطی سے پکڑ کر بے قراری سے کہا تو پیر خان نے غفور کی گردن سیدھی کرنے کی کوشش کی لیکن اس کی اکڑی ہوئی گردن دیکھ کر وہ بول پڑا۔" نہیں امیر میاں۔۔ یہ تو شاید اپنی زندگی کی آخری سانس لے رہا ہے۔ ہمیں اپنے قانون کے مطابق اسے چھوڑ دینا چاہیئے۔"

"پیر خان۔" امیر غضبناک لہجے میں چیخا۔" یہ اپنی موت مرنے والا نہیں ہے۔ تمھیں نشے کی وجہ سے اس کی یہ حالت لگتی ہے تم جلدی سے اس کی گردن سیدھی کرو۔"

امیر کا چہرہ غصّے سے سرخ ہو رہا تھا اور اس کے ہاتھوں کی نسیں پھڑپھڑانے لگی تھیں۔ پیر خان نے ایک زوردار جھٹکا دے کر غفور خان کی گردن سیدھی کر دی تو امیر نے جلدی سے رومال کا پھندہ اس کی گردن میں ڈال دیا۔

"آہ.. ہوں۔" غفور خان کے حلق سے اتنی ہی آواز نکلی اور امیر کا رومال اس کی گردن پر تنگ ہوتا گیا۔ غفور خان کا جسم مزاحمت کے قابل نہیں تھا۔ اس کا دم گھُٹنے لگا تو وہ زمین پر لڑھک گیا تب موتی رام اس کے دونوں پاؤں کو مضبوطی سے دبا کر بیٹھ گیا تاکہ وہ کوئی حرکت کیے بنا ٹھنڈا ہو جائے اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد ظالم غفور خان کا دم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نکل گیا۔ چیتو کا ایک طاقتور سردار جب ٹھنڈا پڑ گیا تو امیر نے اس کی گردن میں پھنسا ہوا رومال کھینچ نکالا پھر وہ تینوں تھوڑی دیر تک ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔

"اب ہمیں اس کے سائیس کو ختم کر دینا چاہیئے۔" امیر اپنے چہرے کا پسینا پونچھتا ہوا بولا۔" جاؤ تم دونوں مل کر یہ کام بھی انجام دے دو۔"

"ٹھیک ہے۔" کہہ کر پیر خان نے اپنا رومال ہاتھ میں لے لیا اور موتی رام کے پیچھے باہر نکل گیا۔

سوئے ہوئے سائیس کے قریب آ کر موتی رام نے اس کے پیر پر ٹھوکر ماری تو وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ آنکھ کھول کر کچھ دیکھتا کہ پیر خان کے رومال نے اس کی گردن کو جکڑ لیا پھر چند ہی لمحوں میں وہ بھی اپنے سردار غفور خان کی طرح ٹھنڈا ہو گیا۔ اس کے ختم ہوتے ہی موتی رام اور پیر خان نے غفور خان کے گھوڑے کی زین کو اٹھایا اور اپنے خیمے میں واپس آ گئے۔ وہاں آ کر انھوں نے دیکھا کہ ان کے چھ ٹھگ ساتھی غفور خان کی لاش کو دفنانے کے لیے باہر لے جا رہے تھے۔

"اب غفور خان کے گھوڑے کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟" امیر نے پیر خان کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔" وہ اپنے مالک کی غیر حاضری کو جلد ہی محسوس کر لے گا۔"

"اس کے بارے میں بھی میں نے سوچ رکھا ہے۔" پیر خان امیر کو سمجھاتے ہوئے بولا۔" یہاں سے نزدیک ایک اونچی پہاڑی ہے ہم اس گھوڑے کو وہاں لے جائیں گے اور تلوار کے ایک ہی وار سے اس کی گردن اڑا کر اس کی لاش کو کھائی میں پھینک دیں گے۔ وہ کھائی اتنی گہری ہے کہ اس کی لاش کسی کو نظر بھی نہیں آئے گی۔"

یہ سن کر امیر سوچ میں پڑ گیا اس کے چہرے سے یوں لگ رہا تھا جیسے اتنے شاندار گھوڑے کے ساتھ اتنا ظالمانہ سلوک وہ کرنا نہ چاہتا ہو۔ لیکن پیر خان اور موتی رام اس کی اجازت لیے بغیر وہاں سے جا چکے تھے۔

۞

دوسرے دن غفور خان کی غیر حاضری نے لٹیروں کے لشکر میں سراسیمگی سی پھیلا دی تھی۔ سب لوگ اِدھر اُدھر دو چار کی ٹولیوں میں جمع ہو کر تشویش کا اظہار کر رہے تھے کسی کا خیال تھا کہ اُس پر خدا کا قہر نازل ہوا ہے اور کوئی کہتا تھا کہ اس ظالم شخص کو شیطان اٹھا لے گیا ہو گا۔ غفور خان کی موجودگی میں جو لوگ آنکھ اٹھانے کی بھی ہمت نہیں کرتے تھے وہی لوگ اب اس کی غیر حاضری میں اس کی بُرائیاں کر رہے تھے۔

"بھلا اسے کون اٹھا کر لے جائے گا؟ وہ خود ہی لشکر کو چھوڑ کر بھاگ گیا ہو گا، لُوٹ کے مال میں سے شاید وہ چیتو کو اس کا حصّہ نہ دینا چاہتا ہو اسی لیے رات کے اندھیرے میں بھاگ گیا ہو گا۔"

امیر اور اس کے ساتھیوں نے جس جگہ غفور خاں کی لاش دفنائی تھی اسی جگہ دری بچھا کر وہ لوگ دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے بیٹھ چکے تھے۔ ٹھیک اسی وقت چیتو کے ایک محافظ نے آکر امیر کو اس کا پیغام دیتے ہوئے کہا "جناب چیتو مہاراج نے آپ کو یاد کیا ہے۔"

یہ سُن کر وہ سب لوگ چونک پڑے اور امیر کا ہاتھ نوالہ سمیت اٹھا رہ گیا "اچھی بات ہے۔ میں ابھی آرہا ہوں" کہہ کر امیر نے روٹی کا نوالہ پلیٹ میں رکھ دیا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

●

امیر تو چیتو کے بلاوے کی صبح سے راہ دیکھ رہا تھا۔ اسے توقع تھی کہ غفور خان کی گمشدگی کی خبر سنتے ہی چیتو اسے ضرور بلوا بھیجے گا اسی لیے اسے گھبرانے اور پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ جلد سے جلد یہ کام بھی پورا ہو جائے۔ لیکن اس کے باوجود چیتو کے خیمے کی طرف بڑھتے وقت اس کے پاؤں من من بھاری ہو رہے تھے۔ اس نے اور اس کے ساتھیوں نے یہ سارا کام بڑی ہوشیاری سے انجام دیا تھا مگر پھر بھی وہ ڈر رہا تھا کہ کہیں کوئی جھول رہ گئی تو چالاک چیتو اس کی اصلیت تک ضرور پہنچ جائے گا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے دونوں باعتماد ساتھیوں بیر خان اور موتی رام کو لٹیروں کی چھاؤنی میں چکر لگانے کے لیے صبح ہی سے بھیج دیا تھا۔ غفور خان کی غیر حاضری کی خبر پھیلتے ہی لشکر میں ہلچل سی مچ گئی تھی۔ سب لوگوں کو اس کی اچانک گمشدگی پر سخت حیرت ہو رہی تھی۔ وہ لوگ طرح طرح کے اندازے لگا رہے تھے۔ لیکن دراصل غفور خان کی گمشدگی پر نہ تو کسی نے افسوس کا اظہار کیا اور نہ ہی کوئی اس کے لیے پریشان تھا۔ اُدھر امیر کو یقین تھا کہ چیتو اتنے بڑے واقعے پر اتنی جلدی پردہ نہیں ڈالے گا۔ وہ ضرور یہ جاننے کی کوشش کرے گا کہ اس کا ایک باعتماد سردار اس کا ساتھ چھوڑ کر بھاگ کیوں گیا؟ کیا چیتو اس بات پر یقین کرے گا کہ غفور خان خود ہی کہیں بھاگ گیا ہے؟ ممکن ہے اس نے اپنے ساتھیوں کو اس کی تلاش میں بھیجا بھی ہو۔ یا پھر کسی نے رات کے وقت غفور خان کو امیر کی چھاؤنی میں جاتے دیکھ لیا ہو اور چیتو تک یہ بات پہنچ گئی ہو۔ امیر یہی سب باتیں سوچتا ہوا بہت سنبھل کر چیتو کے خیمے میں داخل ہوا۔

"آؤ امیر علی" چیتو کی آواز ہر قسم کے جذبات سے عاری تھی مگر اس کے چہرے پر غصے کی ہلکی سی جھلک دکھائی دے رہی تھی اس نے جب اشارے سے اپنے محافظ کو باہر جانے کے لیے کہا تو امیر کا دل بُری طرح دھڑکنے لگا۔

"بیٹھ جاؤ" چیتو اسے گھورتے ہوئے بولا "میں نے تمھیں ایک بے حد اہم بات کے لیے بُلایا ہے لوگ کہتے ہیں مگر مجھے یقین نہیں ہے۔"

"شاید آپ غفور خان کے بارے میں کہہ رہے ہیں" امیر نے انجان بنے رہنے کی بجائے خود ہی کہا "جب آپ کا پیغام آیا تب ہی میں سمجھ گیا تھا اور آپ کی طرح مجھے بھی اس بات پر یقین نہیں آتا" امیر نے ہمت کر کے یہ بات کہہ تو دی تھی لیکن اندر ہی اندر اسے یہ خوف بھی تھا کہ کہیں چیتو اس کی چالاکی کو سمجھ نہ جائے۔

"اور لوگوں کی بہ نسبت میں غفور خان کو اچھی طرح جانتا ہوں" چیتو نے انتہائی ٹھنڈے لہجے میں کہا "وہ اس کی مونچھ کے بال بھی نہیں چھوٹے تھے تب سے ہی میرے ساتھ تھا اور آج وہ اس طرح اچانک غائب ہو جائے یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"تو کیا آپ کو کسی پر شک ہے؟" امیر نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"شک؟" چیتو نے تیز اور دھار دار نظروں سے اس کی طرف دیکھا پھر اپنا مُنہ پھیر کر بولا "مجھے اس پر شک کرنا ہوتا تو سب سے پہلے تو یہ شک تم پر ہی جاتا ہے۔"

"اوں" امیر بُری طرح چونک پڑا پہلے تو اس کا چہرہ پھیکا پڑ گیا لیکن اس نے فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھال لیا اور اب وہ چُپ چاپ چیتو کو دیکھ رہا تھا۔

"مجھے معلوم تھا کہ میری یہ بات سُن کر تم ضرور بوکھلا جاؤ گے" چیتو عجیب انداز سے مسکرایا "چونکہ غفور خان سے تمھاری بنتی نہیں تھی اس لیے یہ شک ہونا لازمی ہے لیکن یہ کہ میں تمھیں اس

پہنچانا نہیں چاہتا۔"

"اوہ..." امیر ایک گہرا سانس لے کر بولا "دراصل میں تو سمجھا تھا کہ کسی نے حضور کے کان بھر دیئے ہیں چونکہ آپ کی مجھ پر بڑی مہربانیاں ہیں اس کا بھی یہ ردعمل ہو سکتا ہے۔"

"نہیں نہیں امیر میں نے تمھیں اس لیے بلایا ہی نہیں ہے" امیر کو تسلی دینے کے لیے چیتو بول پڑا "دراصل ابھی تک تو میں نے غفور کی گمشدگی پر سنجیدگی سے سوچا ہی نہیں ہے۔"

یہ سُن کر امیر نے دل ہی دل میں اطمینان سا محسوس کیا مگر اس نے اس کا اظہار ہونے نہیں دیا "مگر حضور آپ کو اس سلسلے میں جلدی معلومات کرنی چاہیئے تاکہ لشکر میں کسی طرح کی بے چینی نہ پھیلنے پائے۔"

"کیسی بے چینی؟" چیتو نے ذرا چونک کر پوچھا۔

"کچھ لوگ تو یہ کہتے پھر رہے ہیں کہ غفور خان کو شیطان اٹھا کر لے گیا ہے" امیر نے دھیرے سے کہا "بھلا اس بکواس کا بھی کوئی مطلب ہے؟ یا تو وہ بھاگ گیا ہے یا تو..."

"یا تو کیا؟" چیتو نے امیر کو رکتے دیکھ کر پوچھا تو امیر کو بہ مشکل تھوک گلے سے نیچے اتار کر کہنا پڑا "یہی کہ کسی نے دشمنی کی وجہ سے..."

"نہیں نہیں امیر" چیتو جلدی سے ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "غفور خان تو تنہا دس بیس آدمیوں پر بھی بھاری ہے مجھے تو تمھارا اندازہ بھی بکواس لگتا ہے" چیتو نے ذرا ناگوار لہجے میں یہ بات کہی تھی لیکن امیر کو اس کا یہ لہجہ بُرا نہیں لگا تھا۔ اس نے تو بڑی چالاکی سے ایک شبہے کی جانب انگلی اٹھائی تھی اور اس کی یہ ترکیب کچھ کچھ کامیاب بھی ہوتی نظر آرہی تھی۔

"اس سلسلے میں میں اُس کے قریبی ساتھیوں سے پوچھ گچھ کرنا چاہتا ہوں اور ان کی باتیں سننے کے بعد میں نے مل جُل کر تمھیں فیصلہ کرنے کے لیے بھی بلایا ہے" اتنا کہہ کر چیتو نے تالی بجا کر محافظ کو اندر بلایا اور اس سے پوچھا "غفور خان کے خاص خدمت گار کا کیا نام ہے؟"

"حضور اس کا نام اسماعیل خان ہے" محافظ نے جواب دیا۔

"جاؤ اُسے فوراً حاضر کرو۔"

اسماعیل کے آنے تک امیر اور چیتو کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ غفور خان کا خدمت گار گھبراتا جھجکتا ہوا چیتو کے سامنے جھک کر کھڑا ہو گیا۔

"میں جو کچھ پوچھوں اس کا سچ سچ جواب دینا" چیتو کی کڑک دار آواز جب اس کی سماعت سے ٹکرائی تو وہ کانپ گیا اور رونی آواز میں بولا "جناب عالی یہ غلام اگر ایک لفظ بھی جھوٹ بولے تو آپ کی تلوار اور میری گردن۔"

"تو بتاؤ غفور خان کو کل رات تم نے کب دیکھا تھا؟"

"کھانے کے وقت" اسماعیل کانپتی آواز میں بولا "میں انھیں کھانے کے لیے پوچھنے گیا تھا تو انھوں نے یہ کہہ کر مجھے لوٹا دیا کہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ آرام کرنا چاہتے ہیں اور انھیں بار بار تنگ نہ کیا جائے۔"

"اس کے بعد؟" چیتو نے پوچھا۔

"گستاخی معاف جناب عالی" اسماعیل نظریں جھکا کر بولا۔ "دراصل میں بہت تھکا ہوا تھا اس لیے کھانا کھاتے ہی سو گیا۔ پھر مجھے صبح ہی معلوم ہوا کہ خان صاحب اپنے خیمے میں موجود نہیں ہیں۔"

"ٹھیک ہے اب تم جاؤ" چیتو نے ہاتھ ہلا کر اسے جانے کی اجازت دے دی۔

"لیکن تمھارے بعد جس نے غفور کو دیکھا ہے اسے یہاں بھیج دو۔"

"جو حکم ہو جناب عالی" اسماعیل جھک کر بولا پھر وہ بڑی تیزی سے باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد غفور خان کا ایک اور خدمت گار اندر داخل ہوا۔ اس نے آکر چیتو کو بتایا "جب میں انھیں حقہ دینے گیا تھا تو انھوں نے مجھے دوبارہ اندر آنے کے لیے منع کر دیا تھا۔ پھر جب میں خیمے کے باہر بیٹھا اونگھ رہا تھا تو اچانک مجھے لگا کہ خان صاحب خیمے کے پچھلے دروازے سے باہر جا رہے ہیں۔"

یہ سُن کر چیتو سنبھل کر بیٹھ گیا اور امیر اندر ہی اندر کانپنے لگا۔ قادر نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "میں نے اٹھ کر دیکھا تو اندھیرے میں وہ آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ میں بھاگ کر ان کے قریب گیا تاکہ کوئی کام ہو تو مجھے بتا دیں مگر وہ تو مجھے دیکھ کر غصے سے بولے "کمینے بدمعاش تم لوگ دو گھڑی کے لیے بھی مجھے اکیلا نہیں چھوڑتے" ان کا غصہ دیکھ کر میں پسینے پسینے ہو گیا مجھے ڈر لگا کہ کہیں وہ مجھے مار ہی نہ

ڈالیں اس لیے میں چپ چاپ واپس چلا آیا۔"

"اسے تم نے کس طرف جاتے دیکھا تھا؟" چیتو نے سوال کیا تو امیر نے اپنے تن بدن میں ایک عجیب سا کھنچاؤ محسوس کیا۔ اس کی آنکھیں قادر کے ہونٹوں پر جمی ہوئی تھیں اور وہ سانس روکے قادر کے جواب کا منتظر تھا۔

"جناب ان کے غصے سے میں اس قدر ڈر گیا تھا کہ ایک بار بھی پیچھے مڑ کر دیکھنے کی ہمت نہیں کر سکا۔" قادر کا جواب سن کر چیتو کے چہرے پر الجھن کے آثار نظر آنے لگے تھے لیکن امیر نے دل ہی دل میں اطمینان کا سانس لیا تھا۔ مگر دوسرے ہی پل چیتو کے دوسرے سوال نے اسے پھر کپکپا دیا۔ وہ قادر سے پوچھ رہا تھا۔ "اس کا گھوڑا کہاں ہے؟"

"جناب گھوڑا اور سائیس بھی بے پتا ہیں۔" قادر نے کہا۔

"دوسرے گھوڑوں کا سائیس کہاں ہے؟ جاؤ اسے جلدی سے بھیجو۔"

چیتو کا تجسس بڑھتا جا رہا تھا اور امیر کو اپنے دل کی دھڑکن رکتی محسوس ہو رہی تھی۔ غفور خان کے دستے کے دوسرے سائیس نے آتے ہی ایک اور بات چھیڑی اس نے کہا۔ "جنابِ عالی۔۔ خان صاحب روزانہ شام کو اپنے گھوڑے کی زین اتار کر اپنے خیمے میں لے جاتے تھے لیکن کل کافی رات ہونے کے باوجود انھوں نے گھوڑے کی پیٹھ پر سے زین نہیں اتاری تھی۔ یہ دیکھ کر میں نے ان کے سائیس سے اس کی وجہ پوچھی تو وہ یہ کہہ کر ٹال گیا کہ بڑے سرداروں کی باتوں میں سر کھپانے کی ہمیں کیا ضرورت ہے؟ اس کا جواب سن کر میں چپ ہو گیا پھر جب اندھیرا گہرا ہو گیا تو میں نے اسے گھونٹے سے گھوڑے کی رسی کو کھولتے ہوئے دیکھا۔ لیکن میں اس سے کچھ پوچھ نہیں سکا۔"

"گھوڑا لے کر وہ کس طرف گیا تھا؟" چیتو نے پوچھا۔

چیتو کے اس سوال پر امیر کو اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہوا اس نے گھور گھور کر سائیس کی جانب دیکھا ٹھیک اسی لمحے سائیس نے بھی ترچھی نظر سے امیر کی طرف دیکھا۔ اس کی اس خاموش نظر نے امیر کو تھرتھرا کر رکھ دیا۔

"جواب دو۔۔ سوچ کیا رہے ہو؟" چیتو نے غضبناک لہجے میں سائیس سے کہا۔ "اگر تم نے کوئی بات چھپائی تو یاد رکھنا میں تمھاری کھال کھینچ لوں گا۔"

"نہیں جناب۔" سائیس خوفزدہ اور سہمی ہوئی آواز میں بولا۔ "میں تو کوئی ایسی بات نہیں جانتا جسے چھپانے کی کوشش کروں مجھے تو اس وقت یہی لگا تھا کہ خان صاحب کا سائیس ان کے گھوڑے کو جنگل کی طرف لے جا رہا ہے۔"

"جنگل کی طرف؟" چیتو نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اسی لمحے امیر کو لگا کہ اسے بھی کچھ بولنا چاہیے نہیں تو سارا شک اس پر ہی جائے گا۔ یہی سوچ کر وہ جلدی سے بولا۔ "حضور مجھے نہیں لگتا کہ یہ شخص جھوٹ بول رہا ہے۔ میرا تو خیال ہے غفور خان نے اپنے سائیس کو پہلے سے ہدایت دے کر تمام بندوبست کر رکھا ہو گا۔"

"ہوں۔" چیتو سوچ میں پڑ گیا چند لمحوں بعد اس نے اس سائیس کو جانے کا اشارہ کیا لیکن اس کے جانے کے بعد بھی وہ کافی دیر تک خاموش رہا۔ اس کی یہ طویل خاموشی امیر کو یہ سوچنے پر مجبور کر رہی تھی کہ اس سائیس کی باتوں سے چیتو کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش تو نہیں کر رہا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ اس پر ہی شک کرنے لگا ہو؟

لیکن امیر کا یہ خیال غلط نکلا کیونکہ تھوڑی ہی دیر بعد چیتو کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ "امیر مجھے اب یقین ہو چکا ہے کہ غفور خان لشکر چھوڑ کر بھاگ گیا ہے۔ اس کے دونوں خدمت گاروں اور لشکر کے اس سائیس کے بیانات میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اب یہ تو صاف ظاہر ہو گیا کہ وہ لوٹ کا سارا مال اپنے گھوڑے کی زین میں چھپا کر رکھتا تھا۔ جبھی تو وہ اس زین کو ہر وقت اپنی نظروں کے سامنے رکھتا تھا شاید اس کی نیت بدل چکی تھی اور وہ مجھے اس مال میں سے حصہ دینا نہیں چاہتا تھا۔ اسی لیے وہ راتوں رات یہاں سے بھاگ گیا۔" چیتو اس طرح بڑبڑا رہا تھا جیسے وہ اپنے آپ سے ہی باتیں کر رہا ہو۔ "شروع شروع میں میں نے اسے تین ہزار باغیوں کی سرداری سونپی تھی۔ میں نے جان بوجھ کر اس کی غلط حرکتوں کی جانب سے اپنی آنکھیں پھیر رکھی تھیں۔ اور آخر کار وہ مجھے دھوکہ دے ہی گیا۔" چیتو کی آواز میں غصے کی بجائے افسوس کی جھلک زیادہ نمایاں تھی۔ اس کی باتیں سن کر امیر بہ مشکل اپنی خوشی کو روکے ہوا تھا۔

"مگر تم کوئی رائے کیوں نہیں دیتے؟" اچانک چیتو نے امیر کو چونکا دیا۔ "مجھے تو لگتا ہے کہ تمھیں غفور خان کے بھاگ جانے پر ابھی تک یقین نہیں آیا ہے۔"

"نہیں نہیں جناب۔" امیر نظریں جھکا کر بول پڑا۔ "میرا تو خیال تھا کہ آپ ناراض ہو کر اس کا تعاقب کرنے کا حکم دیں گے لیکن آپ کو افسوس کرتا دیکھ کر میں سوچ میں پڑ گیا تھا۔"

"امیر جسے بھاگ ہی جانا ہے اس کا پیچھا کر کے فائدہ بھی کیا ہے۔" چیتو دھیمی ہنسی ہنس کر بولا۔ "یہ ٹھیک ہے کہ غفور خان کی نیت بدل گئی ہو لیکن اس نے مجھے کوئی بڑا دھوکہ نہیں دیا ہے۔ وہ ظالم ضرور تھا لیکن بے اعتبار اور دھوکے باز ہرگز نہیں لگتا تھا۔"

"میں تو اسے آپ کی عظمت سمجھتا ہوں۔" امیر نے اس موضوع پر پردہ ڈالنے کی غرض سے کہا اور جانے کی اجازت چاہی۔ چیتو بھی اس کے ساتھ ہی اپنی جگہ سے اٹھا پھر جب امیر جانے لگا تو چیتو نے اسے روکتے ہوئے کہا۔ "غفور خان کے جانے پر مجھے افسوس تو ہوا ہی ہے لیکن ایک اطمینان بھی ہوا ہے امیر۔"

کیسا اطمینان؟" امیر نے پوچھا۔

"یہی کہ اب تم مجھے چھوڑ کر جانے کے بارے میں کبھی بھی نہیں سوچو گے۔" چیتو اپنے دل کی گہرائیوں سے یہ بات کہہ رہا تھا۔ "غفور خان کے خیالات سے تم متفق نہیں تھے۔ اس سے میں بے خبر نہیں تھا۔"

امیر تھوڑی دیر تک تو چپ چاپ رہا پھر دھیرے سے مسکرا کر بولا۔ "یوں چلے جانے کا خیال تو میں نے اسی وقت ترک کر دیا تھا جب آپ نے انگریزوں کو شکست دینے کا ارادہ ظاہر کیا تھا اور اب تو میں اس جنگ میں پوری طرح آپ کے ساتھ مل چکا ہوں۔" امیر کی آواز میں سچائی کی جو جھلک نمایاں تھی وہ چیتو کے دل پر اثر کر گئی اور وہ محبت بھری نظروں سے امیر کی طرف دیکھتا رہا۔۔ تھوڑی دیر بعد امیر چیتو کے خیمے سے باہر نکل آیا مگر اس وقت وہ سوچ رہا تھا کہ کاش غفور خان اس کے ہاتھوں قتل نہ ہو کر سچ مچ ہی بھاگ گیا ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔

امیر کو چیتو کے پاس سے واپس آنے میں جب کافی دیر ہونے لگی تو اس کے ساتھی فکرمند نظر آنے لگے۔ ہر کوئی ایک دوسرے پوچھ رہا تھا کہ ہم میں سے کسی نے کہیں غفور خان کے بارے میں کوئی ایسی ویسی بات تو کسی سے نہیں کہہ دی؟ لیکن نہیں انھیں ایک دوسرے پر پورا بھروسا تھا وہ جانتے تھے کہ ان میں سے کوئی بھی ایسی حرکت نہیں کر سکتا۔ انھیں امیر کی ہوشیاری اور چالاکی پر پورا بھروسا تھا۔ انھیں یقین تھا کہ امیر چیتو کے ذہن میں اٹھے ہوئے شکوک کا خاتمہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

"وہ دیکھو امیر آ رہا ہے۔" اچانک موتی رام نے سب کی توجہ مبذول کرائی۔

"ہاں۔۔ گھوڑے کی رعب دار چال بتا رہی ہے کہ یہ امیر ہی ہے۔" پیر خان خوشی سے بول اٹھا۔ "خدا ایسے فرشتوں کی ہمیشہ حفاظت کرتا ہے۔"

"واقعی غفور خان لشکر کو چھوڑ کر فرار ہو گیا ہے۔" قریب آ کر گھوڑے سے اترتے ہوئے امیر اس طرح بولا جیسے وہ انھیں مبارک باد دے رہا ہو۔ "چیتو سردار کو بھی اس کا یقین ہو چکا ہے۔"

"اسے یقین ہے یا تمھیں دلانا پڑا؟" موتی رام آنکھ دبا کر بولا۔ "ہم تو انتظار میں پریشان ہو رہے تھے۔"

لیکن پھر بھی امیر انجان بن کر کہہ رہا تھا۔ "جو حقیقت تھی وہ سامنے آ ہی گئی۔"

"کیا مطلب؟" پیر خان نے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ غفور خان کے خدمت گاروں اور سائیس نے اپنے مالک کی ایک ایک حرکت کے بارے میں چیتو سردار کو بتا دیا ہے اور اس کے بھاگ نکلنے کا سارا ثبوت فراہم ہو چکا ہے اور چیتو نے افسوس کے ساتھ اس حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے۔"

"لیکن اس بات پر تمھیں اس قدر افسوس کیوں ہو رہا ہے؟" موتی رام اس کی بات سن کر کہے بغیر نہ رہ سکا۔ "ایسا لگ رہا ہے کہ غفور خان تمھارا گہرا دوست ہو۔"

امیر نے اس کی بات کو ہنس کر ٹال دیا اس نے چیتو کے ساتھ ہونے والی گفتگو انھیں تفصیل سے سنا دی لیکن

جب اس نے یہ بتایا کہ اس نے چیتو سے یہ وعدہ بھی کر لیا ہے کہ وہ ہمیشہ اس کا ساتھ دے گا تو موتی رام اور پیر خان اس بات سے الجھن میں پڑ گئے۔ انھیں خاموش دیکھ کر امیر نے سوالیہ نظروں سے پیر خان کی طرف دیکھا مگر پیر خان کی بجائے موتی رام نے ہنس کر کہا۔ "بات دراصل یہ ہے کہ کل رات کے واقعے کے بعد ہمیں ڈر لگنے لگا تھا۔"

"کس بات کا ڈر؟"

"ہمیں لگا کہ اگر بھوانی دیوی ہم سے ناراض ہوئی ہوگی تو غفور خان والے واقعے کا علم چیتو کو خود بخود ہو جائے گا۔ پھر جب تمھارے واپس آنے میں دیر لگی تو ہمارا شک یقین میں بدل گیا۔"

"ارے نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" امیر نے انھیں تسلی دی اور اپنے خیمے کی جانب بڑھ گیا۔

**

چیتو کے لشکر کا سفر جاری تھا۔ وہ شہروں اور گاؤں کو لوٹتا ہوا مسلسل آگے بڑھ رہا تھا۔ کبھی کبھی اسے یہ بھی اطلاع مل جاتی تھی کہ دو چار لٹیرے لشکر سے بھاگ نکلے ہیں۔ دس ہزار کے لشکر میں سے اگر سو دو سو کم ہو جائیں تو بھی چیتو کو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ ایسے سفر میں اکثر ایسا ہوتا رہتا تھا۔ جس کسی کو بھی اپنا گاؤں نزدیک نظر آنے لگتا تو اسے بیوی بچوں کی یاد ستانے لگ جاتی پھر وہ موقع دیکھ کر راستہ بدل جاتا۔ ویسے غفور خان نے انھیں ڈرانے کے لیے ہی یہ بات پھیلا رکھی تھی کہ وہ بھاگنے والوں کا پیچھا کر کے انھیں دوبارہ پکڑ لاتے ہیں حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔

امیر اور اس کے ساتھی ان لٹیروں کو ختم کرنے کا کوئی بھی موقع اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ جہاں جہاں بھی پڑاؤ ڈالا گیا وہاں وہاں دو چار لٹیروں کو انھوں نے رومال کے ذریعہ موت کی گہری نیند سلا دیا۔ امیر کی ہچکچاہٹ دھیرے دھیرے کم ہوتی جا رہی تھی اور غصہ بڑھتا جاتا تھا۔ اب لشکر کا ہر آدمی اسے غفور خان جیسا ظالم شخص نظر آنے لگا تھا۔ انگریزوں کو شکست دینے کی چیتو کی خواہش بھی اسے ایک ڈھونگ لگنے لگی تھی۔ اس نے دل ہی دل میں یہ فیصلہ بھی کر رکھا تھا کہ نیموا ڈ پہنچنے کے بعد وہ چیتو کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سلام کر کے رخصت ہو جائے گا۔ اور وہ دن اب قریب آتا جا رہا تھا۔

لیکن ناگپور کے پڑاؤ میں جو نہیں ہونا چاہیے تھا وہ واقع ہو گیا۔

"امیر میاں غضب ہو گیا۔" پیر خان ہانپتے ہانپتے اس کے خیمے میں داخل ہو گیا موتی رام بھی اس کے پیچھے تھا دونوں کے چہرے اترے ہوئے تھے۔ پیر خان سانس لینے کے لیے رکا۔ لیکن امیر کو اس کی خاموشی برداشت نہیں ہو رہی تھی "کیا بات ہے پیر خان؟"

پیر خان اور موتی رام خوفزدہ نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے تو امیر چیخ پڑا "تم لوگوں کو بھوانی دیوی کی قسم ہے اگر تم لوگوں نے مجھ سے کوئی بات چھپائی تو۔۔"

"لگتا ہے ہمارا ایک آدمی ہم سے دغا کر رہا ہے۔" پیر خان اب بھی ہانپ رہا تھا۔ "لگتا ہے چیتو کو ہماری اصلیت کا پتا چل چکا ہے۔"

"ہوں۔" امیر کا رواں رواں کانپ گیا۔ "وہ بدمعاش کون ہے؟" جواب دینے میں ذرا دیر لگی تو امیر نے دانت پیس کر پیر خان کا کندھا ہلایا اور بولا "اب خدا کے لیے جلدی بتا بھی دو۔"

"ہدایت خان۔" پیر خان کانپتی آواز میں بہ مشکل بولا اور ہدایت خان کا نام سنتے ہی امیر نے آگ اگلتی آنکھوں سے پلٹ کر موتی رام کی جانب دیکھا۔ "میں نے تو پہلے ہی پوچھا تھا کہ اس پر تم لوگوں کو بھروسا تو ہے نا؟"

موتی رام مجرم کی طرح سر جھکائے کھڑا تھا۔ اسے خاموش دیکھ کر امیر کو لگا کہ اس معاملے میں موتی رام کو کچھ کہنا فضول ہے۔ ایسے نازک وقت میں موتی رام کا دل توڑ کر بھی کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ایک سردار کی حیثیت سے اس کا فرض ہے کہ ہر مصیبت کا سامنا کرے اور اس میں سے اپنے ساتھ اپنے ساتھیوں کو بھی نکال لے جائے۔

"پیر خان کیا تمھیں یقین ہو چکا ہے کہ چیتو کو ہماری اصلیت کا علم ہو گیا ہے؟" تھوڑی دیر بعد امیر نے پیر خان سے پوچھا۔

"اب یقین کرنے کا وقت ہمارے پاس نہیں ہے امیر میاں۔" پیر خان اب بے جھجک ہو کر کہہ رہا تھا "ہم دونوں کو ابھی ابھی ہدایت خان پر شک ہوا تھا ہم نے اس کی حرکتوں پر نظر رکھنے کی کوشش کی تو پتا چلا کہ وہ چیتو کے خیمے کے اطراف میں چکر لگانے لگا ہے۔ اور اس وقت بھی وہ چیتو کے خیمے میں ہی گیا ہے۔"

"ہوں۔" امیر کانپ گیا۔ "تب تو ہمیں فوراً ہی بھاگ جانا چاہیے تم سب لوگوں کے گھوڑے تیار ہیں؟"

"گھوڑے تو ہر وقت ہی تیار رہتے ہیں۔ تم کہو اتنی ہی دیر ہے۔" پیر خان نے کہا۔ "اندھیرے میں بہ آسانی ہم لوگ بھاگ سکتے ہیں۔"

اور امیر سوچنے لگا کہ حقیقت کو جانے بغیر اس طرح بھاگ جانا تو ایسا ہی ہوگا جیسے کنارے لگتی ہوئی ناؤ کو اپنے ہاتھوں سے ڈبو دیا جائے اسے یقین تھا کہ چیتو ہدایت خان کی بات ماننے والا نہیں ہے اور پھر ہدایت خان سے اس کی غداری کا بدلہ لیے بغیر اس کا چلا جانا بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ کچھ بھی ہو وہ سچ اور جھوٹ کا یقین کر لینا چاہتا تھا۔ اسی لیے وہ ہر پہلو پر غور کر لینے کے بعد بولا "پیر خان تم لوگ پوری طرح تیار رہو۔ یہاں سے جانے سے قبل میں چیتو کے خیمے میں ہونے والی بات چیت سن کر اپنا اطمینان کر لینا چاہتا ہوں۔"

"نہیں امیر میاں۔" موتی رام پہلی بار جوش میں بول گیا۔ "ہمیں چونکہ بروقت یہ بات معلوم ہو گئی اس لیے ہمیں موقعے کا فائدہ اٹھا کر یہاں سے کوچ کر دینا چاہیے۔"

لیکن امیر نے اپنا ارادہ نہیں بدلا۔ اس نے یہ بھی نہیں سوچا کہ حقیقت جاننے کی اسے کتنی بھاری قیمت چکانی پڑے گی۔ غصے اور پریشانی کے ملے جلے تاثرات اس کے چہرے پر نمایاں نظر آ رہے تھے اچانک وہ اپنے فیصلے کا اظہار کرتے ہوئے بولا "اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر میں چیتو کے خیمے تک پہنچ جانا چاہتا ہوں۔ مگر مجھے ایک آدمی کی ضرورت پڑے گی۔"

"میں تیار ہوں۔" پیر خان نے ہمت دکھائی۔ "تم اگر اکیلے جانے کی ضد کرو گے تب بھی میں تمھیں جانے نہیں دوں گا چلو جلدی۔۔"

امیر نے اپنی کمر سے لٹکی ہوئی تلوار پر ایک نظر ڈالی۔ پھر ایک پل کے لیے آنکھیں بند کر کے خدا کو یاد کرنے لگا پھر یکایک وہ پیر خان کا ہاتھ تھام کر آگے بڑھ گیا۔ لیکن جاتے جاتے وہ موتی رام سے کہنا نہیں بھولا تھا۔ "تم اپنے تمام ساتھیوں کو ہوشیار رکھنا۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے تو بھاگنے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر مت کرنا۔"

موتی رام بے وقوفوں کی طرح ان دونوں کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ یہ آفت اسی کے ایک با اعتماد ساتھی ہدایت خان کی وجہ سے نازل ہوئی تھی۔ وہ اس بات سے اس قدر گھبرا گیا تھا کہ امیر کو روک بھی نہیں سکا۔ انجام کیا ہوگا؟ یہ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔

**

اندھیرے میں دبے پاؤں سرکتے سرکتے امیر اور پیر خان چیتو کے خیمے تک پہنچ گئے۔ امیر کو یہ بات معلوم تھی کہ جب چیتو کسی سے کوئی خفیہ بات چیت کرتا ہے تو اس وقت وہ اپنے پہرے داروں کو بھی اپنے خیمے سے جان بوجھ کر ادھر ادھر کر دیا کرتا تھا۔ گھٹنوں کے بل جھک کر اس نے خیمے کے قنات پر کان لگا دیئے۔

"تم یقین سے یہ بات کہہ سکتے ہو کہ غفور خان امیر علی کے ہاتھوں مارا گیا ہے؟" چیتو کی آواز امیر صاف پہچان گیا تھا۔

"جناب میں آپ سے ایک لفظ بھی جھوٹ نہیں بولوں گا۔" ہدایت خان کی آواز امیر کی سماعت سے ٹکرائی "غفور خان کو امیر نے ہی ہلاک کیا تھا یہ منظر خود میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے مہاراج۔"

ہدایت خان کی یہ بات سن کر امیر کے جبڑے تنگ گئے۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اسی وقت ننگی تلوار ہاتھ میں لے کر خیمے میں داخل ہو جائے اور ہدایت خان کا سر قلم کر دے لیکن سانس روک کر چپ چاپ اس کی باتیں سننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

"میں اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ امیر علی ٹھگ بھی ہو سکتا ہے۔" چیتو کی بھاری بھرکم آواز سن کر

امیر کے کان کھڑے ہو گئے۔

"جناب اگر میں جھوٹ بول رہا ہوں تو بے شک آپ میری گردن اڑا دیں۔" ہدایت خان ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہہ رہا تھا۔ "امیر علی کا باپ بھی اور اس کے تمام ساتھی بھی پکے ٹھگ ہیں جن میں میں بھی شامل ہوں۔"

پیر خان یہ سُن کر ہی کانپنے لگا۔ اس نے بہ مشکل امیر کا کندھا دبایا اور جُھک کر دھیرے سے اس کے کان میں بولا۔ "اب یہاں ٹھہرنا عقل مندی نہیں ہے۔" لیکن امیر تو جیسے چیتُو کے مُنہ سے فیصلہ سنے بغیر وہاں سے ہٹنے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔ وہ پیر خان کی بات کا جواب دیئے بغیر اندر ہونے والی گفتگو پر کان لگائے بیٹھا تھا۔

"حضور میں تو ثبوت پیش کرنے کے لیے بھی تیار ہوں۔" یکایک امیر اپنی جگہ پر چونک پڑا کیونکہ یہ تو کسی تیسرے ہی آدمی کی آواز تھی۔ اس آواز کو وہ پہچان نہیں پایا تھا اس لیے اس کا تجسس اور بھی بڑھ گیا۔ اس نے اپنی کمر میں سے اپنا خنجر کھینچ نکالا پھر ہوا سے پھڑ پھڑاتے ہوئے خیمے کے تنات پر اس نے اپنے خنجر کی نوک رکھ کر اسے دھیرے سے چیر دیا۔ پیر خان کی گھبراہٹ بڑھتی جا رہی تھی وہ وہاں سے بھاگ نکلنے کے لیے بری طرح بے چین تھا۔ امیر نے خیمے کے اندر نگاہ ڈالی تو دیئے کی دھیمی روشنی میں اُسے چیتُو اور ہدایت خان کے علاوہ ایک اور شخص بھی دکھائی دیا جو امیر کے لیے اجنبی تھا۔ ممکن ہے امیر نے اُسے پہلے کبھی دیکھا ہو لیکن اس وقت اُسے کچھ بھی یاد نہیں آ رہا تھا۔ لشکر میں چیتُو کے کتنے جاسُوس تھے یہ امیر جانتا تھا۔ ممکن ہے یہی آدمی ہدایت خان کو چیتُو کے پاس لے آیا ہو؟

"کیا ثبوت ہے تمھارے پاس؟" چیتُو نے کڑک کر ہدایت خان سے پوچھا۔

"حضور پیر خان کی کمر سے جو تلوار لٹک رہی ہے وہ تلوار غفور خان کی ہی تلوار ہے۔" ہدایت خان نے جواب دیا تو خیمے کے باہر کھڑے ہوئے پیر خان کا چہرہ پسینے پسینے ہو گیا۔ مگر ہدایت اب بھی آگے بول رہا تھا۔ "تین روز قبل آپ کا ایک وفادار ساتھی حبیب اللہ بھی امیر کے قاتل رومال کا شکار ہو کر اللہ کو پیارا ہو چکا ہے۔ اس کی لاش بھی زمین کھودنے پر برآمد ہو جائے گی۔"

"تو کیا اُس نیک اور وفادار شخص کو ان لوگوں نے ہلاک کر دیا ہے؟" چیتُو غصّے سے سُرخ ہو کر بولا۔ "امیر علی کو میں ایک رحم دل انسان سمجھ کر اس کی عزت کرتا تھا۔ ہمارے باغی ساتھیوں کے ظلم و ستم سے وہ ہمیشہ اپنی نفرت کا اظہار کرتا رہتا تھا اور تب میں خود بھی کبھی کبھی اس سے شرما جاتا تھا۔ لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ خود ہی ایک نیچ اور ذلیل قاتل ہے۔"

چیتُو کی زبان سے اپنے لیے اتنے گندے الفاظ سننے کے باوجود وہ کسی بھاری پتھر کی طرح زمین پر بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ دراصل وہ چیتُو کے اگلے قدم کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ کیونکہ اب چیتُو کے فیصلے پر ہی وہ یہاں سے بھاگ نکلنے کی کوئی ترکیب ڈھونڈ سکتا تھا۔

"اب اُسی شخص کو میں اپنے ہاتھوں سے سزا کس طرح دے سکوں گا۔" چیتُو اُلجھن میں بڑبڑا رہا تھا۔ "میں نے غفور خان کو بھگوڑا اور بزدل سمجھ کر نہ جانے کتنی گالیاں دے ڈالی تھیں۔ لیکن امیر پر شک کرنے کا مجھے خیال بھی نہیں آیا تھا۔" دھیرے دھیرے اس کا چہرہ خوفناک ہوتا جا رہا تھا اس نے اپنے جاسُوس کی طرف ایک نظر ڈالی اور پھر بولا۔ "امیر اور اس کے ساتھیوں کو گھیر لینے کا تمام بندوبست مکمل ہے نا؟"

"جی ہاں جناب صرف آپ کے حکم کا ہی انتظار ہے۔" اس آدمی نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ "پچاس باغی بالکل ہی تیار بیٹھے ہیں۔"

"تو جاؤ اُن ٹھگوں کے بچوں کو پکڑ کر میرے پاس لے آؤ۔" چیتُو نے اُسے حکم دیا۔ "اور اُس امیر علی کو زندہ ہی پکڑ لانا میں اس کی زبان سے اقرار سننا چاہتا ہوں۔"

چیتُو کا یہ فیصلہ سُن لینے کے باوجود یوں لگ رہا تھا جیسے امیر کو اس فیصلے سے کوئی دلچسپی ہی نہ ہو وہ ابھی تک پتھر کی مورت کی طرح چُپ چاپ بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے سے ایسا لگ رہا تھا جیسے اُس کے سوچنے سمجھنے کی ساری قوت سلب ہو گئی ہو اور اس کی وجہ سے وہ اُٹھ کر بھاگنے کی ہمت بھی نہ کر سکتا ہو۔

"ہدایت" یکایک چیتُو کی آواز نے اندر کی خاموشی کو توڑ دیا۔ "اب بتاؤ اس مخبری کے لیے تمھیں کیا انعام چاہیئے؟"

"حضور پیر خان کے گھوڑے کی زین میں جو تھیلی چھپی ہوئی ہے وہ تھیلی اگر مجھے دے دی جائے تو آپ کا بہت احسان ہو گا۔"

"ٹھیک ہے۔" چیتُو نے ہاتھ اٹھا کر اُسے جانے کا اشارہ کیا۔ "تمھیں بدلہ مل جائے گا۔"

پیر خان کے صبر کا پیمانہ اب لبریز ہو چکا تھا اُس نے امیر کے دونوں کاندھوں کو پکڑ کر ہلایا۔ "اب تو اٹھ جاؤ امیر۔ معاملہ اب ختم ہو چکا ہے۔" وہ دبی آواز میں بولا تو امیر اس طرح جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا جیسے کسی نے اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا ہو۔ یکایک اُس کے اندر آفت کا سامنا کرنے کا جوش جاگ پڑا اُس نے پیر خان کا ہاتھ پکڑا اور تیزی سے پلٹ کر اپنی چھاؤنی کی جانب سرکنے لگا۔ اندھیرے میں قدم بڑھاتے ہوئے وہ دل ہی دل میں اپنے آپ سے یہ عہد کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "میں چیتُو کے سامنے ہرگز ہرگز زندہ حاضر نہیں ہوں گا۔"

امیر کسی پھرتیلے چیتے کی طرح چھلانگیں لگاتا ہوا اپنی چھاؤنی میں گھس آیا اور آتے ہی بولا۔ "جلدی بھاگو۔"

پیر خان بھی ہانپتے ہانپتے چیخ کر بولا۔ "اگر زندگی عزیز ہے تو ایک لمحے کی بھی تاخیر مت کرو۔"

ان کے آدھے ساتھی تو تقریباً پہلے ہی سے گھوڑے پر سوار ہو کر بیٹھ چکے تھے۔ نذر علی، غوث خان اور رام دین بھی تھوڑے بہت سامان کو سمیٹ کر گھوڑے پر سوار ہو گئے۔ امیر نے چیتُو کی چھاؤنی کی جانب نگاہ ڈالی لیکن وہاں کوئی خاص ہلچل ہوتی نظر نہیں آئی۔ اپنے جسم پر بکتر چڑھا کر اور ڈھال کو ہاتھ میں لے کر امیر اپنے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ "جے بھوانی" اس نے دھیمی آواز میں نعرہ بلند کر کے جیسے اپنے ساتھیوں کو کوچ کا حکم دے دیا۔ پھر اس کا گھوڑا اس کا اشارہ پاتے ہی سرپٹ دوڑ گیا۔ لیکن پچاس ساٹھ گز کا فاصلہ طے کرتے ہی امیر کو اپنے گھوڑے کی لگام کھینچ لینی پڑی کیونکہ اندھیرے میں سامنے سے چند گھوڑ سوار آتے دکھائی دے رہے تھے۔ ان کے سائے دیکھ کر امیر کو اپنا اندازہ غلط ثابت ہوتا دکھائی دیا۔ چیتُو کے ساتھی انھیں گھیر لینے کے لیے بڑھے چلے آ رہے ہیں اس خیال کے آتے ہی امیر کی رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی اس نے نیام میں سے تلوار کھینچ نکالی اور پلٹ کر اپنے ساتھیوں سے بولا۔ "کوئی بھی پیچھے بھاگنے کی کوشش نہ کرے۔ بلکہ ان کا گھیراؤ توڑ کر بھاگ نکلو زندہ گرفتار ہونے کی بجائے بہادری کی موت مرجانا زیادہ بہتر ہے۔" یہ بات اپنے ساتھیوں سے کہہ کر اصل میں امیر تو خود اپنی ہمت باندھ رہا تھا۔ اس نے ننگی تلوار ہاتھ میں لے کر اپنے گھوڑے کو پوری رفتار سے ان آنے والے گھوڑ سواروں کی طرف دوڑا دیا۔ سامنے سے آتے ہوئے لُٹیرے امیر کی اس اچانک حکمت عملی سے گھبرا گئے۔ ان کا خیال تھا کہ امیر انھیں دیکھ کر پیچھے سے بھاگنے کی کوشش کرے گا اور اس طرح وہ اور اس کے ساتھی خود ہی لشکر کے نرغے میں پھنس جائیں گے لیکن اس کی بجائے امیر تو سینہ تان کر ان کے سامنے آ گیا تھا۔ اندھیرے میں بڑھے چلے آنے والے امیر کو روکنے کے لیے دو لُٹیروں نے تلوار اٹھائی لیکن پھر بھی وہ تیز رفتار گھوڑے کو روکنے میں ناکام رہے۔ ان دونوں میں سے ایک کی گردن پر امیر کی تلوار کی نوک دھنس گئی وہ چیخ مار کر اپنے گھوڑے کی پیٹھ سے گرا اور امیر پلٹ کر دیکھے بغیر آگے بڑھتا چلا گیا دوسرے لُٹیرے کی تلوار امیر کے بائیں کندھے پر لگی تھی۔ لیکن اس نے اپنے زخم کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ ٹھیک اُسی وقت ایک جانب سے ان کا تیسرا ساتھی بھی آ چکا تھا۔ لیکن وہ وقت پر ہوشیار ہو گیا اور اس نے اس کے وار کو اپنی ڈھال پر روک لیا اور اسے زخمی کر کے گھوڑے کی پیٹھ سے نیچے گرا دیا۔

ٹھگوں اور لُٹیروں کے درمیان اندھیرے میں جو جھڑپ ہو رہی تھی اس میں دونوں فریق ایک دوسرے کی صورت بھی دیکھ نہیں پا رہے تھے۔ بجلی کی طرح چمکنے والی تلواریں ایک دوسرے سے ٹکراتیں اور زخمی ہونے والے کی چیخوں کی آواز کے سوا اور کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ امیر پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر سرپٹ اپنا گھوڑا دوڑائے جا رہا تھا اُس کے پیچھے اس کے ساتھیوں کے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز میں آ رہی تھیں۔ جب وہ سب ایک گاؤں کا فاصلہ طے کر چکے تو اچانک انھوں نے پیچھے سے بندوق چلنے کی آواز سُنی۔ امیر نے پلٹ

کر پیچھے کی جانب دیکھا اور اپنے ساتھیوں سے بولا۔ "گھوڑے کی ضرورت نہیں ہے یہ گولیاں ہم تک نہیں پہنچ سکیں گی۔"

وہ جانتا تھا کہ اس قسم کی بندوقیں ایک جگہ زمین پر کھڑے کھڑے ہی چلائی جاسکتی ہیں اور ان کی گولیوں کی پہنچ زیادہ دور تک نہیں ہوتی۔ ایسی بندوقیں دوڑتے ہوئے گھوڑوں کی پیٹھ پر بیٹھ کر چلائی نہیں جاسکتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ امیر اس طرف سے بالکل ہی مطمئن تھا۔ جنگل کا راستہ دکھائی دیا تو امیر نے اپنے گھوڑے کی رفتار دھیمی کردی پھر اسے روک لیا۔ ہانپتے ہانپتے اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا ... ایک ... دو ... تین ... چار ... پانچ ... چھ، وہ اپنے پیچھے آنے والے اپنے ساتھیوں کا شمار کرنے لگا۔ اسے لگا کہ شاید کچھ لوگ بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ اس خیال کے آتے ہی اُس نے دُور دُور تک نگاہ ڈال کر دیکھنے کی کوشش کی اندھیرے میں چھاؤنی کے آس پاس جلتی ہوئی مشعلیں لشکر کے پڑاؤ کی موجودگی کا اشارہ کر رہی تھیں اس کے علاوہ پورے ماحول پر سناٹا طاری تھا امیر نے اطمینان کا گہرا سانس لیا اور آنکھیں بند کر کے خدا کا شکر ادا کرنے لگا کہ اس نے انھیں موت کے مُنہ جانے سے بچا لیا۔

ایک ایک کر کے اُس کے ساتھیوں کے گھوڑے اس کے قریب آکر کھڑے ہو جاتے اور امیر بند آنکھوں سے ان کی تعداد گننے لگتا۔ کافی دیر سے امیر کو اس طرح آنکھیں بند کیے خاموش دیکھ کر پیر خان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا اور وہ بولا۔ "گولیوں کی اس بوچھاڑ میں خود ان کے ہی آدمی زخمی ہوئے ہیں۔"

"لیکن ہمارے کتنے آدمی کم ہوئے ہیں؟" امیر نے آنکھ کھول کر ایک ایک کا چہرہ دیکھنا شروع کیا۔ لیکن اندھیرے میں وہ اپنے لوگوں کو بھی پہچان نہیں رہا تھا۔ یکایک وہ اونچی آواز میں بولا۔ "اندھیرے کی وجہ سے میں کچھ دیکھ نہیں سکتا۔ تم لوگ اپنا اپنا نام بتاؤ۔"

امیر کی آواز میں ایک عجیب سی کپکپاہٹ تھی۔ نام بتانے کی ابتدا پیر خان نے ہی کی۔ ایک کے بعد وہ ایک نام سنتا گیا اور اس کی سانسوں کی رفتار تیز ہوتی گئی۔ اس نے آنکھیں موند رکھی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی خاص آدمی کا نام سننے کے لیے تیار ہو۔

پیر خان امیر کے درد کو سمجھ کر بولا۔ "امیر میاں موتی رام غیر حاضر ہے۔" لیکن امیر نے جب کوئی جواب نہیں دیا تو پیر خان نے آگے کہا۔ "نذر علی، غوث خان اور رام دین بھی موجود نہیں ہیں۔"

"اور وہ غدار ہدایت خان تو ظاہر ہے کہ ہوگا ہی نہیں۔" امیر کا غم غصے میں بدل گیا اور وہ چیخ کر بولا۔ "اُس نمک حرام کی وجہ سے ہمارے چار ساتھی ان لٹیروں کے ہاتھ لگ گئے ہیں۔ چیتو اب ان کی کھال کھینچ لے گا۔"

لیکن موتی رام کا وہ لوگ کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔" پیر خان نے دلاسہ دیتے ہوکہا تو امیر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے پوچھا۔ "تو کیا موتی رام ...؟" وہ آگے نہ بول سکا تو پیر خان نے کہا۔ "وہ لڑتے لڑتے ختم ہوگیا ہے۔ میں نے ایک لٹیرے کو اس پر تلوار اٹھاتے دیکھا تھا۔ میں اسے بچانے کے لیے لپکا تھا لیکن مجھے دیر ہو چکی تھی۔"

"مو... تی..." امیر کی آواز کانپ رہی تھی۔ "بہت اچھا ہوا تم ان ظالموں کے ہاتھ زندہ گرفتار نہیں ہوئے میرے دوست۔"

امیر بہت ہی جذباتی ہوگیا تھا۔ اسے اپنے آپ کو سنبھالنے میں تھوڑی دیر لگی۔ پھر تھوڑی دیر بعد وہ اپنے ساتھیوں سے بولا۔ "اگر تم لوگوں کی اجازت ہو تو اس لوٹ مار سے ہمیں جو رقم ملی ہے ان میں سے ان چاروں کا حصہ ان کی بیواؤں کو پہنچا دیا جائے۔"

"اس نیک کام میں ہماری اجازت کی ضرورت نہیں ہے امیر میاں۔" پیر خان نے سب لوگوں کی طرف سے جواب دیا۔ "یہ تو ہم ٹھگ لوگوں کا سب سے بڑا فرض ہے۔ لیکن اس وقت تو ہمیں یہاں سے دُور نکل جانا چاہیے۔ کیا پتا وہ لوگ کہاں تک ہمارا تعاقب کریں گے؟"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" کہہ کر امیر نے اپنے گھوڑے کی لگام کھینچ لی پھر اپنے چار ساتھیوں کو کھو دینے کے غم کو تھوڑی دیر کے لیے بھول کر گیارہ ٹھگوں کی ٹولی جنگل میں گم ہوگئی۔ چیتو اور اُس کے باغی ساتھیوں کے خوف سے وہ اپنی تھکن بھوک اور پیاس سب کچھ بھول چکے تھے۔

جالان کے اُونچے اُونچے درخت دکھائی دینے لگے تو سفر کی تکان سے چور چور ہو جانے والے امیر کے جسم میں ایک عجیب سی سرسراہٹ دوڑنے لگی وہ سوچ رہا تھا عظیمہ اور افلاطون اُسے اچانک دیکھ کر خوشی سے پھولے نہیں سمائیں گے۔ پہلے تو اس نے یہی سوچا تھا کہ کیوں نہ گھر جانے سے قبل وہ گاؤں کی ندی میں نہا دھو لے پھر تازہ دم ہو کر اپنے پہنچنے کی اطلاع گھر بھیج دے۔ لیکن عظیمہ سے ملنے کی بے قراری نے اسے ایسا کرنے نہیں دیا۔ ہاتھ مُنہ دھونے کے لیے وہ تھوڑی دیر تک گاؤں کی ندی میں اُترا بھی تھا لیکن یہ تاخیر بھی اُس سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ ندی کے بہتے ہوئے صاف اور شفاف پانی میں امیر نے اپنا لرزتا ہوا عکس دیکھا تو چند ساعتوں کے لیے وہ بالکل ساکت ہی رہ گیا۔ اُسے یوں لگ رہا تھا کہ ایک مہینے کی اِس دوڑ بھاگ نے اُس کی جوانی کو پانچ سال آگے دھکیل دیا ہے۔ اُسے اپنا چہرہ بھی اس وقت اجنبی لگ رہا تھا۔

عظیمہ اُسے دیکھ کر خوش ہو جائے گی؟ وہ عجیب عجیب سے سوالوں میں گھر گیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ عظیمہ اس سے کہے دولت کی لالچ میں تم نے اپنی کیا حالت بنائی ہے؟ یہ کہہ کر کہیں وہ اس سے ناراض نہ ہو جائے۔ افلاطون بھی طرح طرح کے سوالات پوچھے گا۔ کیا وہ اُس کو مطمئن کر سکے گا؟ چیتو کا خوف بھی ابھی تک جُوں کا توں سر پہ لٹک رہا ہے وہ اُسے زندہ یا مُردہ گرفتار کرنے کے لیے اپنے آدمیوں کو جالان تک بھی بھیج سکتا ہے۔ اسی لیے پیر خان اپنے گھر روانہ ہونے سے پہلے اُس سے کہہ گیا تھا کہ دسہرے کے موقع پر ہمیں سفر پہ نکل جانا چاہیے۔ اسی میں ہماری بہتری ہے۔ اس وقت وہ انکار نہیں کر سکا تھا۔ چیتو سے ہوشیار رہنے کے لیے اُس کا جالان سے باہر رہنا ضروری تھا۔

یکایک اُس نے عظیمہ کے تصورات میں خلل ڈالنے والے ان خیالوں کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا پھر اپنے گھوڑے پہ سوار ہو کر وہ گھر کی جانب چل پڑا راستے میں گاؤں کے جان پہچان والوں نے اُسے سلام بھی کیا تھا لیکن ان کے سلاموں کا جواب دینے کے لیے بھی اس نے گھوڑے کی رفتار ہلکی نہیں کی۔ اس وقت اُس کے دل میں ایک ہی خواہش تھی کہ وہ کسی طرح جلد سے جلد اپنے گھر پہنچ جائے۔

اپنے گھر کا دروازہ کھلا دیکھ کر اُس کی خوشی دوہری ہو گئی۔ وہ چور کی طرح اندر داخل ہو کر عظیمہ کو حیران کر دے گا۔ اس خیال سے وہ دل ہی دل میں ہنس پڑا وہ سوچ رہا تھا اگر عظیمہ اس وقت گھر میں تنہا ہوئی تو وہ اسے بانہوں میں جکڑ لے گا۔ انھیں سب خیالوں میں کھویا ہوا وہ دبے پاؤں گھر کی دہلیز میں داخل ہوگیا۔ برآمدے میں کوئی نہیں تھا لیکن کمرے کا دروازہ اندر سے بند دیکھ کر اُسے حیرت سی ہوئی کیونکہ ابھی تو شام کا ہلکا ہلکا اندھیرا بھی نہیں پھیلا تھا۔ اچانک اس کا جی چاہا کہ وہ دروازے کو دھکا دے کر ایک جھٹکے سے کھول دے۔ مگر یکایک اندر سے آتی ہوئی ایک آواز نے اس کے ہاتھ روک لیے۔ "پیاری اب تم اس قدر شرما کیوں رہی ہو؟ دیکھو تنہائی کا یہ موقع ہاتھ سے نکلتا جا رہا ہے۔"

یہ افلاطون کی آواز تھی جسے سُن کر امیر بُری طرح ٹھٹھک گیا۔ اس کے ساتھ اندر کمرے میں اور کون ہے؟ ذہن میں اس سوال کے اُبھرتے ہی وہ طرح طرح کے وسوسوں میں گھر گیا۔ پھر وہ آپ ہی آپ بڑبڑانے لگا۔ نہیں... نہیں ایسا ہو ہی نہیں سکتا یقیناً افلاطون کوئی ناٹک وغیرہ دیکھ آیا ہوگا اور اکیلے ہی اکیلے عشق کے مکالمے بول رہا ہوگا۔ لیکن اچانک چوڑیوں کی کھنک سُن کر امیر کا دل اُچھل کر اس کے حلق میں آگیا اور پھر چند ہی لمحوں میں امیر کو اپنا گھر ڈوبتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اُس نے ایک آنکھ بند کر کے دروازے کی جھری میں سے اندر جھانکنے کی کوشش کی اور پھر دھیرے دھیرے نیام سے اپنی تلوار نکالنے لگا۔ چمکتی ہوئی تلوار کی تیز دھار دیکھ کر اُس کا خون کھولنے لگا۔ پہلے تو دانت پیس کر وہ دروازے کو توڑنے کے لیے تیار ہوگیا مگر پھر اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ اور دھیرے دھیرے دروازے کی زنجیر کھڑکھڑانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اسے اندر سے دھیمے لہجے میں باتوں کی آواز سنائی دی تو اس نے دوسری بار زور سے دستک دی۔

"لگتا ہے کوئی گھوڑے پر چڑھ کر آیا ہے۔ ارے کھولنا

ہوں بھئی۔" کہہ کر افلاطون نے دروازہ کھول دیا مگر سامنے امیر کو کھڑا دیکھ کر وہ ایک پل کے لیے حیران رہ گیا۔" ارے تم آگئے؟ اس طرح اچانک؟" یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکلنا ہی چاہتا تھا کہ امیر نے تلوار کی نوک اس کے سینے پر رکھ دی۔ امیر کا گمبھیر چہرہ دیکھ کر افلاطون جہاں تھا وہیں رُک گیا۔

" لگتا ہے میرا اس طرح اچانک آجانا تمھیں اچھا نہیں لگا ہے۔" غصے کی حالت میں ایک ایک لفظ پر زور دیتا ہوا امیر اسے دھکیلتے ہوئے اندر کی جانب بڑھنے لگا۔ پہلے تو افلاطون نے یہی سمجھا تھا کہ امیر اُس سے مذاق کر رہا ہے لیکن امیر کی سنجیدگی دیکھ کر وہ ڈر گیا۔

" امیر تمھارے دماغ پر کوئی بھوت سوار ہو گیا ہے کیا؟" کہتے کہتے افلاطون پیچھے ہٹتا جا رہا تھا۔ یکایک امیر کے قدم رُک گئے۔ کمرے کے ایک کونے میں کوئی عورت گھونگھٹ سے اپنا چہرہ چھپائے مُنہ پھیرے کھڑی تھی۔ اس سہمی ہوئی عورت کی طرف دیکھ کر امیر نے اپنی تلوار سے اس کی جانب اشارہ کر کے افلاطون کو حکم دیا۔" اسے میرے سامنے لے آؤ۔"

لیکن افلاطون جب اس کا حکم سننے کے باوجود اپنی جگہ سے نہیں ہلا تو امیر چیخ کر بولا۔" کیا تم نے سنا نہیں؟ لے آؤ اسے میرے سامنے۔" اس بار افلاطون سہم کر اپنی جگہ سے ہٹا اور آگے بڑھ کر اُس نے اس عورت کا بازو تھام لیا۔ وہ عورت چُپ چاپ اس کے پیچھے پیچھے کھنچی چلی آئی مگر ابھی تک اس نے اپنے چہرے پر سے اپنا لمبا گھونگھٹ نہیں ہٹایا تھا اور نہ ہی اس نے سر اٹھا کر امیر کی طرف دیکھنے کی کوشش کی تھی۔

" لالٹین کی روشنی تیز کرو۔" امیر نے لالٹین کی طرف اشارہ کر کے افلاطون سے کہا۔" میں اس کا چہرہ دیکھنا چاہتا ہوں۔"

افلاطون اس طرح لڑکھڑاتے ہوئے لالٹین کی جانب بڑھا جیسے وہ اچانک چوری کرتے پکڑا گیا ہو۔ اس نے لالٹین کی روشنی تیز کر دی پھر اسے امیر کے چہرے تک اٹھا کر بولا۔

" لو دیکھ لو۔"

امیر نے ہاتھ کی بجائے تلوار کی نوک سے اس عورت کا گھونگھٹ ہٹانے کی کوشش کی اور وہ ابھی اس کا چہرہ دیکھ بھی نہ پایا تھا کہ اس عورت نے جھٹ دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔

" نہیں... نہیں... یہ عظیمہ نہیں ہو سکتی۔" امیر دل ہی دل میں بولا۔ تلوار کے دستے پر جمے ہوئے ہاتھ کی کلائی میں درد سا محسوس ہونے لگا اور امیر کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ آنکھوں میں امنڈی ہوئی سُرخی بھی دم توڑنے لگی تھی۔ اچانک افلاطون نے اس کی پیٹھ پر ایک زور کا ہاتھ مارا تو وہ چونک پڑا۔

" اس طرح خالی ہاتھ یہ تمھیں اپنا مُنہ نہیں دکھائے گی۔" افلاطون نے کہا تو امیر نے اس کے ہنستے ہوئے چہرے پر نگاہ ڈالی پھر یکایک ہی اس کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ کر فرش پر گر پڑی۔ اس کے دل میں جن شکوک نے سر اٹھایا تھا انھیں اپنے دل و دماغ سے دور کرنے میں اسے کافی دیر لگی پھر اپنے آپ کو سنبھال کر اسے بگڑے ہوئے معاملے کو بھی سنبھالنا پڑا۔" راستے میں مجھے معلوم ہوا کہ دوست نے کسی عورت کو گھر میں بٹھا رکھا ہے تو مجھے بات کا یقین ہی نہیں آیا۔" امیر نے مسکراتے ہوئے کہنا شروع کیا۔" بے وقوف تم میرے آنے کا انتظار بھی کر سکے۔ غصے کی حالت میں اگر اس وقت میرے ہاتھ کچھ ہو جاتا تو...؟" اتنا کہہ کر وہ افسوس ناک لہجے میں بولا۔" میں بڑا بدنصیب ہوں کہ مجھے اپنے اکلوتے دوست کی شادی میں شریک ہونے کا موقع بھی نہیں ملا۔"

افلاطون نے لالٹین کو نیچے رکھ دیا اور ہنستے ہوئے بولا۔" لیکن تم نے بھی مجھے ایسا موقع کہاں دیا تھا؟"

" میری بات دوسری تھی۔ مجھے تو مجبوری کی حالت میں جلدی سے شادی کرنا تھی۔" امیر نے جواب دیا۔

" تو میری حالت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔" افلاطون نے بیوی کی طرف مسکراتی نظروں سے دیکھ کر بولا۔" اب تمھیں یہ سب عظیمہ بہن بتائے گی پہلے تم نور کو کمرے سے جانے کا راستہ دو نہیں تو یہ شرما شرما کر اسی جگہ پگھل جائے گی۔"

امیر نے نیچے جھک کر اپنی تلوار اٹھائی اور پھر نور کے سامنے سے ہٹ گیا۔ نور راستہ پاتے ہی باہر کی جانب لپکی تو افلاطون کی آواز اس کی پیٹھ سے ٹکرائی۔" گنگا کے گھر سے عظیمہ بہن کو بُلا لاؤ۔ اُن سے کہنا کہ آپ کا سپہ سالار شوہر واپس آگیا ہے۔"

امیر خوش ہو کر اسے گلے لگانے کے لیے آگے بڑھا لیکن اب افلاطون کا مزاج بدل چکا تھا۔" امیر کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں تمھارے اس شک سے انجان تھا؟" افلاطون کہہ رہا تھا۔" تم نے مجھے عظیمہ بہن کی حفاظت کے لیے یہاں بھیجا تھا لیکن کمرے کے بند دروازے کو دیکھ کر تمھارا اعتماد ڈگمگا دیا۔ لُٹیروں کے ساتھ رہ کر تم شکی بھی ہو گئے ہو۔"

افلاطون کی آواز جذباتی ہو گئی اُس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر امیر کا دل تڑپ اٹھا جنون میں اس نے اپنے دوست کے دل کو کتنی ٹھیس پہنچائی تھی؟ اور اگر عظیمہ کو اس بات کا علم ہو گیا تو وہ کیا سوچے گی؟

" افلاطون تم میری اس غلطی کو معاف کر دو۔" امیر دھیمی آواز میں کہتا ہوا اس کی طرف بڑھا لیکن ٹھیک اسی وقت باہر سے عظیمہ کے قدموں کی آواز سُنائی دی افلاطون نے فوراً ہی اپنے آنسو پونچھ لیے اور امیر سے لپٹ کر بولا۔

" میں عظیمہ بہن کو اس کا علم نہیں ہونے دوں گا۔"

عظیمہ کمرے میں داخل ہوئی اور دونوں دوستوں کو ایک دوسرے سے بغلگیر دیکھ کر دروازے پر ہی رُک گئی۔

" ارے بھائی اب تو مجھے چھوڑ دو۔" افلاطون نے مذاق میں کہا۔" دیکھو عظیمہ بہن حسد سے جل گئی ہے شاید اُسے یہ اچھا نہیں لگ رہا ہے۔" امیر ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹا تو اس نے دیکھا عظیمہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ عظیمہ اسے کچھ کمزور دکھائی دے رہی تھی۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا عظیمہ بول پڑی۔" کتنے دن ہوئے آئینے میں اپنی شکل دیکھے ہوئے؟" عظیمہ اپنے آنسو پونچھ کر بولی۔" ذرا دیکھو تو تم کتنے کمزور ہو گئے ہو۔"

امیر نے دھیرے دھیرے اس کی تھوڑی کو انگلی سے اونچا کیا اور جذباتی لہجے میں بولا۔" تمھاری آنکھوں کے آئینے کے سوا مجھے کہیں اپنا عکس دکھائی نہیں دیتا عظیمہ۔" ان دونوں کو ایک دوسرے کے قریب دیکھ کر افلاطون دھیرے سے باہر نکل گیا اور باہر آکر اس نے کمرے کا دروازہ آہستہ سے بھیڑ دیا...

" عظیمہ یہ افلاطون اپنے لیے بیوی کہاں سے اُٹھا لایا ہے؟" امیر نے عظیمہ کی زلفوں سے کھیلتے ہوئے جب اُس سے پوچھا تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی پھر لپک کر اُس نے امیر کا کان پکڑ لیا اور بولی۔" اس میں سراسر تمھارا ہی قصور ہے۔ آخر تمھیں اس بات کا خیال کیوں نہیں آتا کہ گھر میں اتنے مہینوں تک اکیلے رہنے سے ہماری کیا حالت ہو گی۔" یہ سُن کر امیر چونک پڑا۔ دراصل وہ تو یہ سمجھ رہا تھا کہ افلاطون نے کوئی ایسی ویسی حرکت کی ہو گی جس کے نتیجے میں اُسے نور سے شادی کرنی پڑی ہو گی لیکن اس کے بجائے بات تو کچھ اور ہی تھی۔ عظیمہ اب بے حد گمبھیر لہجے میں کہہ رہی تھی۔" تم نے تو افلاطون بھائی کو میری حفاظت کے لیے یہاں بھیجا تھا لیکن میں سوچتی ہوں کہ اگر میں اکیلی ہی رہ جاتی تو مجھے اتنی تکلیف نہ ہوتی۔" اُس کی بات سُن کر امیر کو لگا کہ عظیمہ اب بولتے بولتے رو پڑے گی۔ اُس نے اٹھ کر اُس کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور بڑی محبت سے بولا۔" عظیمہ کیا تم ناراض ہو گئی ہو؟ تمھیں اس جگہ تنہا چھوڑ کر میں بھلا اپنا کاروبار کس طرح چلا سکتا تھا؟ تمھیں پتا ہے اس سفر میں مَیں کتنی زبردست کمائی کر کے آیا ہوں؟ یہ کمائی اتنی ہے کہ تمھارے بیٹوں کے بیٹے کھائیں گے تب بھی یہ دولت ختم نہیں ہو گی۔"

" مگر اتنی دولت کما کر لانے کے بعد اگر تم نے مجھے گھر میں زندہ نہ دیکھا ہوتا تو؟" عظیمہ نے نظریں جھکا کر پوچھا تو امیر کانپ کر رہ گیا اور گھبرا کر بولا۔" عظیمہ تم گول گول باتیں کیوں کر رہی ہو؟ افلاطون پر مجھے اتنا تو بھروسہ ہے کہ جب تک وہ زندہ ہے تمھیں کوئی آنچ نہیں آنے دیگا۔"

" تم تو بالکل بدھو جیسی باتیں کر رہے ہو۔" عظیمہ عجیب سے لہجے میں بولی۔" جان بچانے سے زیادہ مشکل کام آدمی کے لیے اپنی عزت بچانا ہوتا ہے۔"

" تم کس کی عزت کی بات کر رہی ہو؟" امیر نے پوچھا۔

" تمھاری۔ میری اور تمھارے دوست کی عزت کی بات کر رہی ہوں۔" عظیمہ نے فوراً ہی جواب دیا۔" لوگ کتنی بُری

نظریں ڈال دیتے ہیں اس کا تمھیں احساس ہی نہیں ہے۔"

"لیکن سارا گاؤں یہ بات جانتا ہے کہ افلاطون میرا جگری دوست ہے اور وہ تمھارے بھائی کی طرح ہے۔" امیر نے جواب دیا۔

"ہاں یہ ساری باتیں درست ہیں مگر اس کے باوجود بھی محلّے کے لوگوں نے گھروں کی دیواروں پر کوئلے سے ہم دونوں کے نام لکھنے شروع کر دیئے تھے۔ یہاں تک کہ..." کہتے کہتے عظیمہ اٹک گئی اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا اور پیشانی کی سلوٹیں تنگ ہو گئیں۔

"کہو رُک کیوں گئیں؟" امیر مٹھیاں بھینچ کر بولا۔ "بتاؤ ساری باتیں مجھے سُننی ہیں۔"

"لوگوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ سفر کے دوران افلاطون نے تمھیں ختم کر کے تمھاری دولت اور تمھاری بیوی پر قبضہ جما لیا ہے۔" عظیمہ ایک گہرا سانس لے کر کہا۔

"میں ایسا کہنے والوں کی زبان اب کھینچ لوں گا۔" امیر غصے سے کھڑا ہو گیا۔ "کس کس نے ایسی گندی باتیں کر کے تمھیں دکھ پہنچایا تھا؟" وہ عظیمہ کے دونوں کندھوں کو پکڑ کر جھنجھوڑتا رہا اور پوچھتا رہا مگر عظیمہ کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے وہ ہچکیاں بھرتی ہوئی امیر سے لپٹ گئی۔ اور روتے ہوئے بولی۔ "ایسی باتیں کہنے والے دو چار آدمی تو نہیں تھے جن سے تم لڑ لو گے۔ سامنے آ کر گالیاں کوئی نہیں دیتا۔ غیبت لوگوں کے پیٹھ پیچھے ہوتی ہے امیر۔" اتنا کہہ کر اُس نے آنسو پونچھ لیے اور امیر کے چہرے پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ "اور اب تو یہ سب باتیں میں بھول بھی چکی ہوں۔ نُور کے گھر میں آ جانے کے بعد اب وہی لوگ گھر میں ملنے ملانے کے لیے آتے ہیں اور یہ بھی کہہ جاتے ہیں کہ کوئی کام ہو تو انھیں بتاؤں۔"

امیر اب ڈھیلا پڑ گیا۔ اچانک اسے خیال آیا کہ وہ خود بھی تو ایسے ہی لوگوں میں سے ایک ہے۔ بند کمرے میں افلاطون کو اپنی بیوی سے باتیں کرتے دیکھ کر وہ بھی تو شک میں پڑ گیا تھا۔ اگر یہ بات عظیمہ کو معلوم ہو گئی تو اسے کتنا صدمہ ہو گا۔ اس خیال سے گھبرا کر اس نے بات بدلنے کی کوشش میں آگے کہا۔ "خیر جو ہو گیا سو ہو گیا۔ لیکن اس بہانے افلاطون کی شادی ہو گئی یہ بات مجھے اچھی لگی ہے مگر عظیمہ یہ نُور ہے کون؟"

عظیمہ بھی اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتی تھی۔ ایک طویل عرصے کے بعد ملن کی جو گھڑیاں نصیب ہوئی تھیں اسے وہ اسی طرح گنوا دینا نہیں چاہتی تھی۔ "نُور گاؤں کے مولوی کی اکلوتی بیٹی ہے۔ وہ میرے پاس سلائی وغیرہ سیکھنے کے لیے آیا کرتی تھی۔ بس تب ہی سے محبت ہو گئی۔"

"کس کے ساتھ؟"

"میرے ساتھ۔" عظیمہ نے ہنس کر کہا۔ "تمھارے دوست کے ساتھ نہیں... میں نے خود ہی افلاطون بھائی کی تعریف کرنی شروع کیں تو اس کے دل میں بھی محبت پیدا ہو گئی۔"

"اور افلاطون بھی شادی کے لیے تیار ہو گیا۔"

"ارے اس کے سر میں تو شیوا پوری کے مُنّی کی بیٹی روشن کے پیار کا بھُوت سوار تھا وہ اکثر کہتا تھا کہ اب ہم غریب نہیں رہیں گے۔ ہماری عزت بھی بڑھ جائے گی۔ میں بے کار نہیں ہوں بلکہ کمانے لگا ہوں۔ امیر آ جائے تو ہم منّی کے گھر بات ڈال دیں گے۔"

روشن کی یاد امیر کو ایک جھٹکا دے گئی مگر اس نے عظیمہ کو یہ محسوس ہونے نہیں دیا اور جلدی سے پوچھ بیٹھا۔ "تو پھر افلاطون نُور سے شادی کے لیے تیار کیسے ہوا؟"

"اس کے لیے مجھے تھوڑا سا جھوٹ بولنا پڑا تھا۔"

"کیا مطلب؟" امیر کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"کیا جھوٹ بولا تھا؟"

"میں نے اس سے کہا تھا کہ روشن تمھارے انتظار میں بیٹھی ہوئی نہیں ہے بلکہ وہ تو کب کی شادی کر چکی ہے۔"

"کیا تم نے واقعی ایسی بات کہہ دی ہے؟" امیر اس طرح پوچھا جیسے اسے یقین ہی نہ آ رہا ہو۔ "تمھیں ایسی بات کہنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟"

"کیونکہ میں جانتی تھی کہ روشن کو افلاطون سے محبت نہیں تھی۔" اتنا کہہ کر وہ ہونٹوں پر مسکراہٹ سجا کر بولی۔ "مجھے معلوم تھا کہ وہ تمھیں چاہتی ہے۔"

"مجھے؟" امیر بُری طرح چونک پڑا۔ "بھلا یہ بات تمھیں کس نے بتائی؟"

"بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو بغیر بتائے ہی سمجھ میں آ جاتی ہیں۔" عظیمہ اس کے اور زیادہ نزدیک آ کر بولی۔ "میں اگر جھوٹ بول رہی ہوں تو تم مجھے ایک تھپڑ رسید کر سکتے ہو۔"

امیر نے پہلے تو حیرت سے اور پھر بڑی ہمدردی سے اس کی طرف دیکھا پھر مسکرا کر اس نے عظیمہ کا ہاتھ تھام لیا اور اسے اپنے قریب کھینچنے لگا۔

"ارے... ارے۔" کہہ کر عظیمہ نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی لیکن امیر کی گرفت خاصی مضبوط تھی۔

★ افلاطون، نُور، امیر اور عظیمہ چاروں کی زندگی کے دن سُکھ اور چین سے بسر ہو رہے تھے۔ جالان کے راجا کو اکیاون سونے کی مہریں۔ سچے موتیوں کا ایک ہار اور کم خواب کا ایک تھان نذرانے کے طور پر پیش کرنے کے بعد راج دربار میں بھی امیر کی عزت بڑھ گئی۔ جالان کے راجا کے لیے یہ اندازہ لگانا اب دشوار نہیں کہ نذرانے کے طور پر اتنی قیمتی چیزیں اسے دینے والا امیر سفر میں کتنی زیادہ کمائی کر کے لوٹا ہے۔ وہ اندر ہی اندر امیر سے جلنے لگا تھا لیکن اس نے اپنی جلن کا اظہار امیر پر نہیں ہونے دیا بلکہ خوشی ظاہر کرتے ہوئے اس نے کہا تھا۔ "تم چاہو تو ہمارے اصطبل سے بار بار گھوڑے لے جا سکتے ہو اور ہر بار ایسا ہی کامیاب سفر کر سکتے ہو۔"

پھر دو مہینے کے اندر ہی اندر امیر نے جالان میں اپنا وجود مستحکم کر لیا۔ اب اس کا شمار مہاجنوں میں ہونے لگا تھا اور اُس نے ایک حویلی بھی خرید لی تھی۔ سفر سے واپسی پر جب افلاطون سے اس کی پہلی ملاقات ہوئی تھی تو اُس وقت امیر کے رویّے سے افلاطون کو دُکھ ہوا تھا لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا افلاطون کا وہ دُکھ کم ہوتا گیا۔ وہ عظیمہ اور نُور کی موجودگی میں تو امیر سے خوش مزاجی سے پیش آتا۔ لیکن جب وہ دونوں تنہا ہوتے تو افلاطون کے دل میں اس ملاقات کی یاد تازہ ہو جاتی اور افلاطون اس طرح اپنی نظریں چرا لیتا جیسے وہ کبھی بھی امیر کو معاف نہیں کرے گا۔ ہنس مکھ اور زندہ دل افلاطون کا اس طرح اداس رہنا امیر کو اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس نے دو چار بار اپنی اس غلط فہمی پر افسوس کا اظہار بھی کیا تھا مگر ہر بار افلاطون بہانہ کر کے اس کی بات ٹال جاتا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اس معاملے پر کوئی بات سننے کے لیے تیار ہی نہ ہو۔

آخر امیر نے ایک ترکیب سوچ ہی لی اُس نے جیتو کے لشکر کی باتیں کرتے کرتے ایک دن غفور خان کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا۔ "آخر ایک دن ہم نے اسے ختم کر دیا۔"

افلاطون کے کان کھڑے ہو گئے اور اس نے تفصیل جاننے کی ضد کی تو امیر نے شروع سے آخر تک کا واقعہ اُسے سُنا دیا۔ لیکن اس نے یہ احتیاط ضرور رکھی تھی کہ اس پوری بات میں ٹھگوں کا کوئی ذکر نہ آنے پائے۔ افلاطون جب اس کی باتوں میں کھنچتا چلا گیا تو امیر نے یکایک ہی اسے چونکا دیا۔ "مگر سفر کا اختتام ہوتے ہی جیتو کو اس بات کا علم ہو گیا۔"

"وہ کس طرح؟" افلاطون نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"ہمارے ہی ایک آدمی نے غدّاری کی تھی۔ غفور خان کی غیر حاضری کی اصل وجہ جان کر جیتو اس قدر خفا ہوا کہ اس نے ہم لوگوں کو زندہ گرفتار کرنے کے لیے اپنا لشکر دوڑا دیا۔ ہم لوگ بہ مشکل ان سے جان بچا کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ لیکن پھر بھی ہم اپنے چار ساتھیوں کو کھو چکے ہیں۔" امیر کہتے کہتے رُک گیا اور افلاطون کی آنکھیں ہمدردی سے بھیگ چکی تھیں یہ دیکھ کر امیر اس گفتگو کے اصل مقصد پر پر آ گیا اور آگے بولا۔ "اور ان کے خوف سے ہم بھوکے پیاسے دن رات بھاگتے رہے۔" امیر کی آواز میں لرزش تھی۔ "میں سچ کہہ رہا ہوں دوست خوف اور گھبراہٹ کا حملہ اتنا شدید تھا کہ مجھ میں سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت بھی نہیں رہی۔ یوں لگتا تھا جیسے دماغ مفلوج ہو کر رہ گیا ہو۔ یہی وجہ تھی کہ میں تم پر شک کر بیٹھا جو مجھے ہرگز نہیں کرنا چاہیے تھا۔" امیر کو اس قدر جذباتی دیکھ کر افلاطون نے اپنی آنکھیں موند لیں پھر اس طرح اس نے اپنی انگلیوں سے اپنی آنکھوں کو دبایا جیسے اسے ڈر ہو کہ کہیں اس کے آنسو نہ نکل پڑیں۔ تھوڑی دیر بعد اس نے آنکھوں کو کھول کر دیکھا تو امیر کسی مجرم کی طرح اس کا فیصلہ سننے کے لیے سر جھکا بیٹھا تھا۔

"امیر!" افلاطون نے کہنا شروع کیا۔ "اب تمھیں مجھ

سے صرف ایک وعدہ کرنا ہے۔"

"کیا؟" امیر نے دھیرے دھیرے اپنی گردن اٹھائی۔

"ہمارے درمیان ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ اس بات کو تم بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بھول جاؤ۔ اب تم آئندہ کبھی بھی اس بات کو یاد نہیں کرو گے اس کا تمھیں وعدہ کرنا پڑے گا۔" افلاطون انتہائی گمبھیر لہجے میں بولا تو امیر ایک گہرا سانس لے کر سوچنے لگا کہ افلاطون کا دل کتنا وسیع ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ایک ذرا سی غلط فہمی کی سزا دونوں کو بھگتنی پڑ رہی ہے۔ افلاطون کی اس بات کا جواب دینے کے لیے امیر ابھی الفاظ ڈھونڈ ہی رہا تھا کہ گھر کے ملازم نے آکر کہا۔ "مالک کوئی آپ سے ملنے کے آیا ہے۔"

امیر نے فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھال لیا اور بولا۔ "جاؤ اسے اندر لے آؤ۔"

"مالک وہ اندر آنے کے لیے تیار نہیں ہے۔" ملازم نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ "کوئی اجنبی شخص ہے جو اپنا نام بھی بتانا نہیں چاہتا۔"

"اندر بھی آنا نہیں چاہتا اور نام بھی بتانا نہیں چاہتا۔" امیر ہونٹوں ہی ہونٹوں میں بڑبڑایا پھر اس کے چہرے کی لکیریں تنگ ہوتی چلی گئیں۔ چیتو کا خیال آتے ہی اس کی آنکھوں کی پتلیاں تھرتھرانے لگیں۔ افلاطون امیر کی اس گھبراہٹ کو سمجھ گیا اور فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ "میں جا کر دیکھتا ہوں کون ہے وہ؟"

اس سے پہلے کہ امیر اُسے روکتا ملازم نے کہا۔ "مالک اس نے کہا تھا کہ آپ کے سوا کوئی اسے پہچان نہیں سکے گا۔"

امیر کو یہ سب بہت پُراسرار لگنے لگا تھا لیکن وہ ایک جھٹکے سے اٹھا اور افلاطون کو ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہوئے بولا۔ "میں جا کر دیکھتا ہوں۔ ضرورت پڑی تو تمھیں بلا لوں گا۔"

افلاطون نے گھر کے ملازم کے سامنے کسی قسم کی بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا لیکن امیر جیسے ہی کمرے سے باہر نکلا کہ اس نے دوڑ کر دیوار پر سے اپنی تلوار اتار لی۔

نہ جانے کون ہوگا؟ کون ہو سکتا ہے؟ امیر زینوں سے اترتے وقت سوچ رہا تھا۔ اُس کی الجھن لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ برآمدے میں آکر دیکھا تو اسے وہاں کوئی بھی نظر نہیں آیا۔ تب ہی ملازم نے ایک اندھیرے گوشے میں کھڑے ہوئے ایک سائے کی جانب اشارہ کیا۔ امیر نے چند لمحوں تک دُور سے ہی اُس سائے کو پہچاننے کی کوشش کی مگر اُسے کامیابی نہیں ہوئی ٹھیک اسی وقت افلاطون ننگی تلوار ہاتھ میں لے کر تیزی سے زینے اترتا ہوا اس کے برابر آکر کھڑا ہو گیا۔ اپنے ہی گھر میں کسی اجنبی سے ڈرنا اب امیر کو کچھ عجیب سا لگنے لگا تھا اسی لیے شاید وہ افلاطون کو مخاطب کر کے بولا۔ "افلاطون تم جو سمجھ رہے ہو ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ تم میرے ساتھ مت آنا میں غافل نہیں ہوں۔" اتنا کہہ کر وہ دھیرے دھیرے اس اندھیرے گوشے کی جانب بڑھنے لگا۔ آنے والے اجنبی شخص نے چادر سے اپنا جسم ڈھانک رکھا تھا۔ وہ اس طرح سر جھکائے کھڑا تھا کہ امیر کے لیے اس کو پہچان لینا اب بھی آسان نہیں تھا۔

"تمھیں کس سے ملنا ہے؟" امیر اُس سے چند قدم کے فاصلے پر رُک کر بولا۔

"آپ سے۔" یہ مختصر سا جواب دے کر وہ پھر خاموش ہو گیا وہ نہ تو اپنی جگہ سے ہلا تھا اور نہ ہی اس نے اپنی گردن اٹھائی تھی۔ اسے اس طرح ساکت دیکھ کر امیر نے ذرا سختی سے پوچھا۔ "اگر تمھیں مجھ سے ہی ملنا تھا تو تمھیں گھر کے اندر آنا چاہیئے تھا۔ کون ہو تم؟"

"میرا خیال تھا کہ آپ مجھے پہچان لیں گے۔" اجنبی شخص نے ذرا سی جُنبش کی۔

"ایک تو یہاں اندھیرا ہے اور اس پر تم نے چادر اوڑھ رکھی ہے۔" امیر نے غصّے سے کہا۔ "چہرہ دکھاؤ گے تو ضرور پہچان لوں گا۔"

لیکن جب دو چار ساعتوں تک امیر کو کوئی جواب نہیں ملا تو اس کا جی چاہا کہ وہ آگے بڑھ کر خود ہی اس پُراسرار شخص کو بے نقاب کر دے مگر ایسا کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا کیونکہ ممکن ہے کہ وہ شخص یہی کچھ سوچ کر ہی کھڑا ہو۔

"امیر میاں۔ میں آپ کا ساتھی ہوں۔" اتنا کہہ کر پُراسرار اجنبی کی آواز کانپنے لگی۔ "میرا نام غوث خان ہے۔"

"غوث خان۔" امیر ایک جھٹکے سے اس کے قریب پہنچ گیا۔ "تم ابھی زندہ ہو...؟"

غوث خان دو قدم پیچھے ہٹ گیا اور بولا۔ "سردار میں دُور سے ہی اندھیرے میں رہ کر آپ سے بات کرتے آیا ہوں۔" وہ تھوڑی دیر کے لیے رُکا یوں لگ رہا تھا جیسے بات کرنے میں اسے سخت تکلیف محسوس ہو رہی ہو۔ "نزدیک سے تو میری صورت آپ سے دیکھی نہیں جائے گی چیتو نے میری عجیب حالت بنا دی ہے۔"

امیر کا دل بُری طرح دھڑکنے لگا۔ اسے اپنے آپ کو سنبھالنے میں تھوڑی دیر لگی اور پھر چند لمحوں کے بعد وہ اپنے ملازم سے بولا۔ "جمال ذرا روشنی لے کر آؤ۔" لیکن جمال کی بجائے افلاطون لالٹین لے کر وہاں آگیا۔ اُس نے اپنی تلوار اب نیام میں ڈال لی تھی۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ آنے والا شخص امیر سے خوف زدہ نظر آ رہا ہے اس لیے اُسے کوئی فکر نہیں تھی۔

"یہ کون ہے امیر؟" افلاطون نے قریب آکر لالٹین اونچا کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہمارا ساتھی غوث خان ہے۔" امیر نے جواب دیا۔ "لٹیروں کے چنگل سے زندہ بچ آیا ہے۔" اتنا کہنے کے بعد غوث خان سے مخاطب ہوا۔ "غوث خان تمھیں میری قسم ہے اگر تم نے مجھ سے مُنہ چھپایا تو۔"

غوث خان نے دھیرے دھیرے اپنے سر پر سے چادر اتاری۔ لیکن جب اس نے گردن اٹھائی تو لالٹین کی روشنی میں اس کا دولخت چہرہ دیکھ کر امیر دنگ رہ گیا اور افلاطون نے "باپ رے" کہہ کر اپنا مُنہ دوسری جانب پھیر لیا غوث خان کا ناک کٹا ہوا تھا اور داڑھی کے بالوں کے درمیان تھوڑی درمیان سے کٹی ہوئی تھی۔ دونوں گالوں پر پکے ہوئے زخموں کے گہرے نشانات تھے۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں جس کے اندر سے جھانکتی ہوئی پتلیاں دیکھ کر امیر نے اپنے اندر ایک کپکپاہٹ سی محسوس کی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ بھی افلاطون کی طرح اپنا مُنہ پھیر لے لیکن ہمدردی کی وجہ سے وہ ایسا نہ کر سکا اس نے لالٹین افلاطون کو واپس کر دیا اور غوث سے بغلگیر ہونے کے لیے آگے بڑھا ٹھیک اسی وقت غوث خان نے اپنے بدن پر سے بھی چادر ہٹا دی اور امیر کے ہاتھ اٹھے کے اٹھے ہی رہ گئے۔ غوث خان کے دونوں ہاتھ کلائیوں سے کٹے ہوئے تھے یہ دیکھ کر اس کے مُنہ سے ایک زبردست چیخ نکل گئی۔ "انھوں نے تمھارے دونوں ہاتھ بھی کاٹ دیئے ہیں غوث خان۔"

افلاطون کے ہاتھ سے لالٹین چھوٹ گیا اور فرش پر گرتے ہی وہ بجھ گیا۔ تھوڑی دیر تک اندھیرے میں سناٹا چھایا رہا۔ پھر غوث خان کی آواز اُبھری۔ "چیتو نے جان لینے کے سوا تمام ہی ظلم کر ڈالے ہیں۔"

امیر کو یوں لگا جیسے غوث خان کی آواز کسی اندھے کنوئیں سے آ رہی ہو۔ غوث خان کہہ رہا تھا۔ "یہ خوفناک کہانی سنانے کے لیے ہی میں دردر کی ٹھوکریں کھا کر یہاں تک پہنچا ہوں۔ امیر یہ بدصورت چہرہ دیکھ کر لوگ نفرت سے مُنہ پھیر لیتے ہیں اور تب شرم سے میرا چہرہ جُھک جاتا ہے۔ خدا جانے مجھے اس حالت میں کب تک زندہ رہنا پڑے گا۔"

امیر نے آگے بڑھ کر غوث خان کو اپنے سینے سے لگا لیا اور بڑی ہمدردی سے بولا۔ "نہیں غوث ایسا مت کہو۔ میں تمھارے لیے بہت کچھ کر گزروں گا۔ پہلے تم نہا دھو کر آرام کر لو پھر اطمینان سے تم مجھے چیتو کے ظلم کی داستان سنانا۔" اتنا کہہ کر امیر نے غوث خان کی کلائی سے کٹا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ اب اُسے اس بات کا یقین ہو چکا تھا کہ چیتو سے دشمنی مول لے کر وہ سکھ چین سے زندہ نہیں رہ سکے گا۔ تو کیا خود بھی اس کی حالت غوث خان جیسی ہو جائے گی؟ اس خیال کے اثر سے امیر کو اپنی پوری حویلی ڈولتی ہوئی سی محسوس ہونے لگی...

لٹیروں نے جس کے جسم کے کسی بھی حصّے کو سلامت نہیں چھوڑا تھا اس غوث خان کے زخموں کو خود امیر نے اپنے ہاتھوں سے دھویا اور حکیم کو بلوا کر اس کی مرہم پٹی کروائی پھر اپنے ہاتھ سے اسے کھانا کھلایا اس کا یہ خلوص اور محبت دیکھ کر غوث خان کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔ "سردار آپ کی یہ مہربانیاں اب مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی ہیں۔ میں تو آپ کا خادم ہوں میری خاطر آپ اتنی تکلیف کیوں اٹھا رہے ہیں؟ آپ ملازم سے کہہ دیں تو وہ کھانا کھلا دیا کرے گا۔"

"غوث خان میں تمھارا سردار ضرور ہوں لیکن تم میرے خادم نہیں ہو بلکہ میرے ساتھی ہو۔ مجھے تو اس بات کا افسوس ہے کہ میری غلطی کی سزا میرے ساتھیوں کو برداشت کرنا پڑی ہے۔ اس کے لیے میں خود کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔" یہ کہہ کر امیر نے اس کے منہ میں نوالہ ڈال دیا۔ غوث خان انکار نہ کر سکا مگر وہ اپنے آنسو بھی روک نہ سکا۔ وہ کھاتا گیا اور روتا گیا۔ روٹی کا ہر نوالہ اُس کے پیٹ کی بھوک مٹاتا جا رہا تھا۔ اور غوث خان زخموں کی تکلیف کو بھولتا جا رہا تھا۔

"لیکن سردار میں جس کام کے لیے یہاں آیا ہوں وہ تو کہنے کا مجھے موقع ہی نہیں ملا۔" اپنے کندھے پر چہرہ رکھ کر غوث خان نے اپنے آنسو پونچھے اور آگے بولا۔ "ہمارے تینوں ساتھیوں اور اُس غدار ہدایت خان کا کیا ہوا؟"

افلاطون کی موجودگی میں شاید امیر کوئی بات سننا نہیں چاہتا تھا اسی لیے اس نے درمیان میں ہی غوث خان کو روک دیا اور بولا۔ "یہ ساری باتیں اطمینان سے ہوں گی۔ اس وقت تو تمھیں آرام کی ضرورت ہے۔" یہ کہہ کر وہ افلاطون سے مخاطب ہوا۔ "اس کے لیے ایک علیحدہ کمرے کا بندوبست کر دو افلاطون۔" امیر کا خیال تھا کہ اس بہانے افلاطون وہاں سے ہٹ جائے گا تو وہ خود ہی غوث خان کو سمجھا دے گا کہ افلاطون کی موجودگی میں وہ ایسی ویسی کوئی بات نہ کہے۔ لیکن افلاطون نے اسے یہ موقع نہیں دیا۔

"میں نے آخری کمرے میں اس کا بستر لگوا دیا ہے۔" یہ کہہ کر افلاطون جب غوث خان کو اپنے ساتھ لے گیا تو امیر اور زیادہ الجھن میں پڑ گیا۔ اُسے یہ ڈر تھا کہ انجانے میں کہیں غوث خان افلاطون کے سامنے اس کا بھید نہ کھول بیٹھے۔ افلاطون کے ساتھ ایک غلط فہمی تو ہو ہی چکی ہے۔ اب اگر اسے یہ علم ہو گیا کہ ان کا اصل دھندہ ٹھگی کا ہے اور یہ بات اس نے اب تک اس سے چھپا رکھی ہے تو وہ نفرت سے اسے چھوڑ کر چلا جائے گا۔ اس خیال کے آتے ہی وہ افلاطون کے پیچھے لپکا اور بولا۔ "اسے بستر پر لٹا کر کمرا باہر سے بند کر دینا تاکہ کھولنے اور بند کرنے کی اسے تکلیف نہ کرنی پڑے۔" اتنا کہنے کے بعد اس نے دھیرے سے یہ بھی کہہ دیا۔ "اور دیکھو اس تھکے ہارے شخص سے زیادہ باتیں کر کے اسے پریشان مت کرنا۔ اسے آرام کی سخت ضرورت ہے۔"

امیر کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ عظیمہ کی باتوں سے بھی یوں لگ رہا تھا جیسے وہ خود بھی ابھی سونا نہ چاہتی ہو۔ اس کے سوالات امیر کو سکون سے کچھ سوچنے بھی نہیں دے رہے تھے۔ امیر کچھ سچے اور کچھ جھوٹے جوابات دے کر اُسے ٹالنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن لٹیروں کے ہاتھوں غوث خان کی یہ حالت ہوئی ہے یہ جان کر تو عظیمہ کچھ اور بھی بے چین ہو کر سوالات کر رہی تھی۔ "راستوں میں اگر لٹیروں کا خوف ہو تو تمھیں سفر پر جا کر دولت کمانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ گھر بیٹھ کر بھی کوئی کاروبار کیوں نہ کیا جائے؟"

جواب میں امیر ہوں اور ہاں کے سوا کچھ اور بولتا نہیں تھا۔ یہ دیکھ کر عظیمہ جھنجھلا کر کہتی۔ "میں کہہ دیتی ہوں کہ آئندہ اب میں تمھیں گاؤں سے باہر نہیں جانے دوں گی۔"

امیر بات آگے بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اس وقت چیتو کے بارے میں سوچنا چاہتا تھا اسی لیے اس نے عظیمہ کے بال سہلانے شروع کر دیئے تاکہ عظیمہ جلد سے سو جائے اور تھوڑی دیر بعد جب عظیمہ واقعی سو گئی تو اس نے دھیرے سے اس کا سر اپنے سینے پر سے ہٹا کر تکیے پر رکھ دیا پھر اس کے چہرے پر نگاہ ڈال کر بستر پر سے نیچے اتر آیا۔ جب وہ کمرے سے باہر نکلا تو چاروں طرف سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ چند لمحوں تک وہ افلاطون کے کمرے کے دروازے پر کان لگائے اندر کی آہٹ سننے کی کوشش کرتے رہا مگر اندر بھی مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی یہ دیکھ کر اسے کچھ اطمینان ہوا اور وہ تیزی سے غوث خان کے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ اُسے اپنے ہی گھر میں اس طرح چوری چھپے چلنا کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ وہ غوث خان کے کمرے کے دروازے پر آ کر کھڑا ہو گیا اور اتنی احتیاط سے دروازے کو دھیرے سے اندر کی جانب دھکیل دیا کہ کوئی آہٹ نہ پیدا ہو لیکن اس احتیاط کے باوجود ہلکی سی آواز پیدا ہو ہی گئی اس نے ایک پل کے لیے اپنا سانس روک لیا اسے ڈر تھا کہ کہیں ملازم کی آنکھ نہ کھل جائے لیکن ایسی کوئی بات

نہیں ہوئی تو وہ دبے پاؤں سے کمرے کے اندر داخل ہو گیا۔ غوث خان گہری نیند میں سو رہا تھا وہ اس کے بستر کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔

غوث خان شاید کئی دنوں کے بعد گہری نیند سویا تھا اسی لیے اس کے خراٹوں کی آوازیں کمرے میں گونج رہی تھیں۔ زخموں کی تکلیف کو بھول کر سو جانے والے غوث خان کو گہری نیند سے جگا دینا اب امیر کو مناسب نہیں لگ رہا تھا تھوڑی دیر کھڑا رہ کر وہ واپس جانے کے لیے مڑا مگر ابھی وہ دروازے تک پہنچا بھی نہیں تھا کہ "کون ہے؟ کون ہے؟" کہتا ہوا غوث خان خوف سے اٹھ بیٹھا۔

رات کے سناٹے میں اُس کی خوف سے تھرتھراتی ہوئی آواز نے امیر کو بھی ذرا دیر کے لیے ڈرا دیا مگر پھر وہ فوراً ہی اس کے پاس آ گیا اور جلدی سے بولا۔ "یہ تو میں ہوں غوث خان۔" اتنا کہہ کر لالٹین کی روشنی اُس نے تیز کر دی پھر بولا۔ "میں تو یہ دیکھنے آیا تھا کہ تمھیں ٹھیک سے نیند آئی ہے یا نہیں؟"

یہ سُن کر غوث خان کی آنکھوں سے خوف جھانکنے لگا۔ اُس کا سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ امیر سے اس کی یہ گھبراہٹ پوشیدہ نہ رہ سکی اس لیے وہ پوچھ بیٹھا۔ "تم اس قدر خوف زدہ کیوں دکھائی دے رہے ہو غوث؟" وہ اس کے بستر پر بیٹھ گیا اور آگے بولا۔ "کیا زخموں سے بہت زیادہ ٹیس اٹھ رہی ہے؟"

اپنے جیسے معمولی آدمی کے لیے امیر کو اتنا فکر مند دیکھ کر غوث خان کا دل بھر آیا۔ امیر اسے اس وقت ایک فرشتہ لگ رہا تھا۔ اُس نے اپنے دونوں کٹے ہوئے ہاتھوں کو چادر سے باہر نکال کر اُونچا کیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ امیر کا شکریہ ادا کر رہا ہو۔ پھر اس نے اپنا ٹنڈ ہاتھ امیر کے کندھے پر رکھ دیا اور گلوگیر آواز میں بولا۔ "امیر میاں زخموں کی ٹیسیں تو اب تقدیر بن چکی ہیں لیکن اس بھیانک رات کی یاد تو نیند میں بھی پیچھا نہیں چھوڑتی۔ سوتے جاگتے وہ خوفناک منظر آنکھوں میں گھومتا رہتا ہے اور اس وقت دل بری طرح کانپنے لگتا ہے ایسی گھبراہٹ طاری ہو جاتی ہے جیسے شیطان سینے پر سوار ہو کر گلا دبا رہا ہو، میں نیند میں چیختا رہتا ہوں لیکن آواز حلق سے باہر نہیں نکلتی، جاگ جاتا ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے دوزخ سے چھٹکارا ملا ہو۔"

"میں جانتا ہوں غوث کہ انسان پر کبھی ایسا وقت آتا ہے جسے ہزار کوشش کے باوجود وہ بھول نہیں پاتا۔" امیر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے دلاسا دینے کی کوشش کی۔ "مگر ایسے واقعات کو دل میں رکھنے کی بجائے دوسروں سے کہہ دیا جائے تو دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ تمھیں اگر ناگوار نہ گزرے تو مجھے میرے ساتھیوں پر گزرے ہوئے واقعات سنا دو۔"

"ضرور سناؤں گا سردار۔ میں یہ سب آپ کو سُنانے کے لیے ہی تو زندہ رہ کر یہاں تک پہنچا ہوں۔" غوث خان نے جواب دیا پھر اس سے قبل کہ غوث خان اپنی داستان شروع کرتا امیر نے اٹھ کر کمرے کا دروازہ بند کر دیا اور لالٹین کی روشنی بھی دھیمی کر دی۔

"یوں لگتا ہے جیسے کل ہی کی بات ہو۔" غوث خان آنکھیں بند کر کے بول رہا تھا اور امیر دھڑکتے ہوئے دل سے سُن رہا تھا۔ "جب آپ نے ہمیں بھاگ جانے کا حکم دیا تھا تو کسی کو یہ خیال بھی نہیں تھا کہ چیتو کے لٹیرے ہم کو سامنے سے گھیرنے کی کوشش کریں گے۔ مال سامان گھوڑوں پر لادنے میں ہمیں ذرا دیر ہو گئی تھی اس لیے ہم پیچھے رہ گئے مگر پھر بھی ایک لٹیرے کو میں نے اپنی تلوار سے دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا تھا، پھر اندھیرے میں میرا گھوڑا دو گز ہی آگے بڑھا تھا کہ اچانک دائیں جانب سے مجھ پر حملہ ہو گیا۔ نیزے کے وار سے بچنے کے لیے مجبوراً مجھے گھوڑے کی پیٹھ سے نیچے کودنا پڑا، میرا خیال تھا کہ میں اندھیرے میں ان حملہ آوروں کو دھوکہ دینے میں کامیاب ہو جاؤں گا مگر کمبخت ایک لٹیرے نے مجھ پر پیچھے سے وار کیا اور مجھ سے لپٹ پڑا اُس کی گرفت سے شاید میں چھوٹ جاتا لیکن کسی نے میرے سر پہ نیزے کی لاٹھی ماری اور مجھے چکر سا آ گیا۔" غوث خان سانس لینے کے لیے ذرا دیر کے لیے رکا مگر امیر سانس روکے آگے سننے کے لیے بے چین تھا۔ "جب مجھے ہوش آیا تو میں چیتو کی چھاؤنی کے قریب پڑا ہوا تھا اور میرے چاروں طرف ہزاروں لٹیرے شور مچاتے کھڑے تھے۔ مشعل کی روشنی میں میں نے نظریں اُٹھا کر دیکھا

تو ہمارے کچھ دوسرے ساتھی بھی میری طرح گرفتار دکھائی دیئے جن میں نذر علی، رام دین اور موتی رام کو ہی میں دیکھ سکا تھا۔"

"تو کیا موتی رام کو بھی انھوں نے زندہ گرفتار کیا تھا؟" امیر نے گہرا سانس لے کر پوچھا۔

"ہاں وہ کافی زخمی تھا اور بے ہوش پڑا تھا۔" غوث خان نے بتایا۔

"پھر؟" امیر سانس روک کر بہ مشکل پوچھ سکا۔

"پھر کی بات اپنے دل کو مضبوط بنا کر سنیئے گا سردار۔" غوث خان نظریں جھکا کر کہنے لگا۔ "چیتو اس غدار ہدایت خان کو لے کر ہمارے پاس آیا تو میں نے گھور کر ہدایت خان کی طرف دیکھا مگر وہ بے شرم تو مجھے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ چیتو کی آنکھیں تو جلتے ہوئے انگاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ اُس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ "بدمعاشو اب تم لوگ اپنی سزا بھگتنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔" یہ سُن کر بہت سارے لٹیرے چیخ چیخ کر کہنے لگے "سرداران لوگوں کی جیتے جی کھال اتاری جائے، ٹھگ بن کر دھوکہ دینے والوں کی موت بھی سُکھ چین سے نہیں ہونی چاہیئے۔" تب چیتو نے اُن لوگوں کو درمیان میں بولنے سے روکا خبردار کوئی اپنی ہوشیاری نہ دکھائے پہلے مجھے ان کی زبان سے ان کے گناہوں کی داستان سننی ہے۔ اتنا کہہ کر اُس نے میری طرف قاتل نظروں سے دیکھا۔ اپنی ہمت اکٹھی کر کے مجھے بولنے میں ذرا دیر لگی اور بچاؤ کی کوشش کرتے ہوئے بولا "مہاراج ہم نے پوری وفاداری سے آپ کی خدمت کی ہے ہم لوگ ہمیشہ لشکر کے ہراول دستے میں رہ کر ہر خطرہ مول لیتے رہے ہیں اور آپ اس جھوٹے شخص کی باتوں میں آکر ہمارے ساتھ ناانصافی کر رہے ہیں؟" مگر میری بات سنتے ہی ہدایت خان چیخ پڑا، "نہیں حضور میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہ لوگ ٹھگ ہیں۔ میں نے ساری حقیقت سے آپ کو آگاہ کر دیا ہے۔ غفور خان کو قتل کرنے والے یہی لوگ تھے اور گم ہونے والے ہمارے بقیہ تین ساتھی بھی ان ہی کے رومال کے شکار ہوئے تھے۔" ٹھگ لفظ سُن کر چیتو نفرت سے بول اٹھا "میں ایسے انسان نما شیطانوں پر کبھی رحم نہیں کرتا غوث خان امیر علی مجھے بھولا بھالا اور رحم دل نظر آتا تھا لیکن اب مجھے پتا چلا کہ میٹھی زبان سے دوسروں کو دھوکہ دینے میں ٹھگ لوگ ماہر ہوتے ہیں۔"

"مگر میں نے تو چیتو کے غصے کی پروا کیے بغیر اپنے بچاؤ کی کوشش جاری رکھی اور دلیلیں پیش کرتا رہا۔ میں نے اس سے یہ بھی کہا کہ چونکہ آپ کو امیر علی پر شک ہو گیا تھا اسی لیے اُسے فرار ہونے پر مجبور ہونا پڑا۔ ہدایت خان نے جھوٹ بول کر آپ کو بہکانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن میری یہ کوشش ناکام رہی، چیتو کو یقین دلانے کے لیے ایک ثبوت مل ہی گیا، ایک گم ہو جانے والے لٹیرے کی تلوار انھوں نے پہچان لی جو ہمارے ساتھی رام دین کی کمر سے لٹک رہی تھی اور میرے گھوڑے کی زین میں میں نے ان کے روپوں کی جو تھیلی چھپا رکھی تھی اس تھیلی پر فارسی زبان میں اُس لٹیرے کا نام لکھا ہوا تھا اور اس نام سے اس کے بھائی نے اُسے شناخت کر لیا۔ ایسی حالت میں اپنے بچاؤ کے لیے میں آگے کچھ بھی نہ کر سکا۔ مجھے خیال آیا کہ جب سزا بھگتنی ہی ہے تو کیوں نہ مردوں کی طرح سر اُٹھا کر بات کروں اس خیال کے آتے ہی میں نے دو ٹوک لہجے میں شروع کیا۔ "ہاں میں ٹھگ ہوں اور ہم سب ٹھگ ہیں اس کے لیے ہمیں کسی قسم کی کوئی شرم نہیں ہے، بھوانی دیوی کے سونپے ہوئے کام کو کرنے میں ہمیں کوئی پچھتاوا نہیں ہے آپ چاہیں تو ہمیں قتل کرا سکتے ہیں۔" میری یہ بات سُن کر چیتو نے دانت پیس کر اپنی تلوار اٹھا لی تو میں بولتے بولتے رُک گیا مگر اچانک اس کا ہاتھ تلوار کے ساتھ ہی اُٹھا رہ گیا تو میرے دل میں اُمید کی ایک کرن سی پیدا ہوئی نہ جانے مجھ میں کہاں سے ہمت آگئی تھی کہ میں نے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر اس سے کہہ دیا۔ "چیتو مہاراج اگر آپ واقعی سچا انصاف کرنا چاہتے ہیں تو سزا ہم چاروں کو ہی نہیں بلکہ آپ کے برابر کھڑے ہوئے ہدایت خان کو بھی ملنی چاہیے کیا یہ بھی ٹھگ نہیں ہے؟ کیا اس نے ہماری بھوانی دیوی اور پوتر کلہاڑی کی قسم کھانے کے باوجود ہمارا راز کھول کر اپنے پیشے سے غداری نہیں کی ہے؟ آپ دھیان سے اس کی طرف دیکھیں خوف سے اُس کا چہرہ زرد ہو رہا ہے۔ جبکہ ہم لوگ مسکراتے ہوئے اپنی سزا بھگتنے کے لیے آپ کے سامنے کھڑے ہیں۔"

"میری بات سُن کر دوسرے لٹیروں نے بھی اس کی تائید کی۔ ہدایت خان کو بھی سزا ملنی چاہیئے۔ جب یہ نعرے لگائے جانے لگے تو چیتو نے ایک زبردست لات مار کر ہدایت خان کو دُور اُچھال دیا اور چیخ کر بولا "پہلے اسے ہی ختم کر دو۔" پھر تھوڑی ہی دیر میں لٹیرے اس پر ٹوٹ پڑے اور چند ہی لمحوں میں اسے غداری کا انعام مل گیا۔ اس کی موت پر مجھے چونکہ خوشی ہوئی تھی اس لیے میں چیتو کی تلوار کا وار برداشت کرنے کے لیے سر جھکا کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ لیکن اتنی دیر میں چیتو نے اپنا ارادہ بدل دیا تھا۔ اُس نے بے ہوش موتی رام کے قریب جا کر اُسے ہلایا مگر وہ ہوش میں نہیں آیا تب اس نے ہم تینوں کو ایک قطار میں کھڑا کر دیا اور اس کے وہ الفاظ اب بھی میرے کانوں میں گونج رہے ہیں "انسانوں سے دھوکہ کر کے ان کی جان لینے والے تم ٹھگ لوگ اپنی آخری گھڑی میں بھی نادم ہونے کے بجائے اپنے کیے پر فخر کر رہے ہو۔ لیکن کتوں میں تمھیں اتنی آسانی سے مرنے بھی نہیں دوں گا۔ تم جب تک زندہ رہو گے تڑپتے اور سسکتے ہی رہو گے۔ میں تم لوگوں کا اتنا بُرا حال کروں گا کہ جہاں جاؤ گے لوگ نفرت کی نگاہ سے تمھیں دیکھیں گے۔"

"اتنا کہہ کر اس نے خون کے پیاسے لٹیروں کو حکم دیا، ان چاروں کے ناک کاٹ دو، یہ سُن کر نذر علی نے اپنی زبان چبا کر مر جانے کی کوشش کی لیکن اُسے اس کوشش میں کامیابی نہیں ہوئی۔ رام دین چیتو کے قدموں میں گر کر گڑگڑانے لگا کہ آپ ہماری گردن اڑا دیں لیکن ہماری ناک نہ کاٹیں مگر چیتو نے اس کے گڑگڑانے پر کوئی توجہ نہیں دی۔ ہمارا یہ خیال تھا کہ چیتو ہمیں مارنا نہیں چاہتا ہے بلکہ وہ ہماری ناک کاٹ کر ہمیں چھوڑ دے گا۔ پہلے میری ہی باری آگئی۔ یا خدایا... میں نے کتنی بھیانک چیخ ماری تھی؟ انھوں نے تیز خنجر سے اس طرح میری ناک کاٹ لی تھی جس طرح چھری سے خربوزے کی قاش کو کاٹتے ہیں۔ ہماری کربناک چیخیں لٹیروں کے شور و غل میں دب گئیں، اپنے خون آلود چہرے پر دونوں ہاتھ رکھ کر میں زمین پر اوندھا پڑا تھا کہ چیتو کی چیخ میری سماعت سے ٹکرائی "گرم گرم تیل کی کڑھائی لے آؤ۔"

"میرے تن بدن میں ایک سنسناہٹ سی دوڑ گئی ایک اور سخت سزا ابھی باقی تھی۔ چیتو نے قریب آکر میرے بالوں کو مٹھی میں جکڑ لیا اور بولا "جو سزا میں تمھارے سردار امیر کو دینا چاہتا تھا وہ اب تمھیں بھگتنی پڑے گی۔ چلو اٹھو۔"

غوث خان کی زبانی چیتو کے کہے ہوئے یہ الفاظ سُن کر امیر کو اپنا دل ڈوبتا ہوا سا محسوس ہونے لگا چند ساعتوں تک تو اسے یوں لگا جیسے وہ سچ مچ مجرم کی طرح چیتو کے سامنے کھڑا ہے اور اس پر چیتو مظالم ڈھا رہا ہے۔ اس کا جی چاہا کہ وہ غوث خان سے کہہ دے کہ اب بس کرو اب آگے اسے نہیں سُننا ہے لیکن یہ کیسے ممکن تھا جو خاص بات اسے جاننی تھی وہ تو ابھی باقی تھی۔

"اور پھر دو آدمیوں نے آمنے سامنے کھڑے ہو کر میرے دونوں ہاتھوں کو پکڑ کر اونچا کیا۔" غوث خان نے کانپتی آواز میں کہنا شروع کیا۔ "چیتو میرے سامنے کھڑا تھا میں اپنا لہولہان چہرہ جھکائے بڑی مشکل سے کھڑا رہ سکا تھا اور میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ میرے پیچھے کھڑے ہوئے میرے دو ساتھیوں کی حالت بھی اس وقت کچھ مجھ جیسی ہی ہو رہی تھی۔ اچانک چیتو نے چیخ کر حکم دیا "کاٹ دو ان کے ہاتھ۔"

"پھر کلچ کی آواز پیدا کرتی ہوئیں دو تلواریں لہرا کر پیچھے سے میرے ہاتھوں کی کہنیوں پر پڑیں اور میرے دونوں ہاتھ کٹ کر زمین پر جا پڑے ہماری بھیانک چیخوں سے رات کا سناٹا جاگ پڑا اور میں چکرا کر نیچے گر پڑا۔" کہتے کہتے غوث خان پسینے پسینے ہو گیا۔ امیر اس کے کٹے ہوئے ہاتھوں کو دیکھ کر اپنے بہتے ہوئے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ "پھر اس سے پہلے کہ ہم سب اپنے ہوش و حواس کھو دیتے انھوں نے ہمارے کٹے ہوئے ہاتھوں کو جلتی ہوئی آگ میں ڈال دیا۔"

"لیکن موتی رام کا کیا حشر ہوا؟" امیر نے بہ مشکل پوچھا۔

"وہ چھوٹ گیا تھا۔" غوث خان کی زبان سے یہ سنتے ہی امیر کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں مگر غوث خان نے ایک گہرا سانس لے کر آگے کہنا شروع کیا "چیتو اُسے سزا نہ دے سکا وہ بے ہوشی سے ہوش میں آ ہی نہ سکا۔"

"تو گویا وہ اس طرح چھوٹ گیا؟" امیر دھیرے سے بڑبڑایا۔

"ہاں صرف میں ہی ایک زندہ ہوں۔" غوث خان

نے پہلے سے بھی زیادہ گہرا سانس لیا۔" ان لوگوں نے ہمیں وہیں بھٹکتا ہوا چھوڑ دیا پھر رام دین اور نذر علی زخموں کی تاب نہ لا کر آدھے راستے میں ہی دم توڑ گئے۔ میں بھی خودکشی کر لینا چاہتا تھا کہ آپ کی یاد آ گئی۔ آپ کو یہ ساری باتیں بتانے کے لیے مجھے زندہ رہنا ہی تھا۔"

اب اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے تھے یوں لگ رہا تھا جیسے ان دونوں کی زبانیں سُن ہو گئی ہوں وہ تھوڑی دیر تک تو بالکل ہی خاموش بیٹھے رہے۔ غوث خان گزرے ہوئے بھیانک واقعات کو یاد کرتے ہوئے کانپ رہا تھا اور امیر سوچ رہا تھا کہ اُس سے زیادہ سوالات کر کے اسے اور زیادہ پریشان کرنا مناسب نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی وہ اپنے بارے میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔ "شاید چیتو نے مجھے پکڑنے کے لیے اپنے آدمی دوڑا دیئے ہوں گے؟"

"نہیں۔" غوث خان نے اپنا سر اٹھایا۔

"کیوں؟" امیر کو خود اپنی آواز عجیب سی محسوس ہوئی۔

"تو کیا وہ مجھ سے بدلہ لینا نہیں چاہتا؟"

"نہیں۔" غوث خان دھیمی آواز میں بولا۔ "معاف کرنا سردار اُس کے خیال میں آپ مر چکے ہیں۔"

"اوں۔" امیر بُری طرح چونک پڑا۔

"چیتو نے آپ کو زندہ گرفتار کرنے کے لیے تو چاروں طرف اپنے آدمی دوڑائے تھے لیکن وہ سب ناکام واپس آ گئے اور تب آپ کے بارے میں مجھے یہ منحوس بات کہنا پڑی تھی۔"

"کیا؟" امیر نے پوچھا۔

"یہی کہ فرار ہوتے وقت مقابلے کے دوران اُسے کسی کی تلوار کا گہرا زخم لگا تھا جس کی وجہ سے وہ تھوڑی دُور جا کر دم توڑ گیا۔ اس کے دوسرے ساتھی اس کی لاش لے کر وہاں سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔"

"اور چیتو نے تمھاری اس بات پر یقین کر لیا؟" اپنی موت کی بات سُن کر امیر خوشی سے چونک کر بولا۔

"ہاں اس جھوٹ کو نبھانے کے لیے مجھے کہنا پڑا کہ اندھیرے میں امیر علی کی لاش کو کہیں دفن کرنے کے بعد ہمارے بقیہ ساتھی اِدھر اُدھر بکھر جائیں گے پھر کسی کا پتا لگانا بہت دشوار ہو جائے گا کہ کون کہاں گیا؟" غوث خان نے کہا۔

یہ سُن کر امیر نے کافی سکون محسوس کیا جیسے اسے نئی زندگی مل گئی ہو۔

☼ ☼

سکھ کے دن بڑی جلدی سے گزر جاتے ہیں۔ ایک سال کا عرصہ پلک جھپکتے ہی گزر گیا تھا اس کا امیر کو احساس ہی نہ ہو سکا۔ چیتو کے خیال سے وہ اب زندہ نہیں ہے۔ یہ بات غوث خان کی زبانی سننے کے بعد تو امیر کی زندگی میں کسی قسم کا کوئی خوف باقی نہیں رہا تھا۔ دسہرے سے قبل پیر خان اسے سفر پر اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آیا تھا۔ لیکن اس نے یہ کہہ کر اُسے ٹالنے کی کوشش کی تھی کہ عظیمہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ لیکن پیر خان نے عاجزی کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی اس نے امیر سے کہا تھا۔ "تمھارے بغیر ہم لوگ کس کی سواری میں سفر پر جائیں گے؟ اور اگر ہم لوگ بھی سفر پر نہ گئے تو اپنے گھر کا خرچ کس طرح چلائیں گے؟ اللہ کے کرم سے تمھارے پاس تو بے شمار دولت ہو گئی ہے۔ لیکن سچا ٹھگ کبھی بھی عیش و آرام کی زندگی نہیں گزار سکتا۔ بھوانی دیوی نے جو کام اس کے سپرد کیا ہے اُسے برسوں برس تک کرنا ہی پڑتا ہے اگر ایسا نہ کیا گیا تو دیوی کا قہر نازل ہوتا ہے۔"

لیکن امیر پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ اپنی بات پر قائم رہا اور جواب دیتے ہوئے بولا۔ "عظیمہ کی طبیعت ٹھیک نہ ہو تو بھلا میں چھ سات مہینے کے لیے گھر سے باہر کس طرح رہ سکتا ہوں؟"

"امیر میاں، افلاطون اور اُس کی بیوی تو گھر میں موجود ہی ہیں۔" پیر خان نے جب یہ دلیل پیش کی تب بھی امیر کے قدم نہیں ڈگمگائے اس کے پاس اس دلیل کا بھی جواب تیار تھا

"نہیں پیر خان تم نہیں سمجھتے افلاطون اوّل تو مجھے اکیلے نہیں جانے دے گا۔ پھر اس کی بیوی بھی ماں بننے والی ہے۔"

یہ سُن کر پیر خان کو سخت صدمہ پہنچا اس نے امیر کے بھروسے پر دوسرے ساتھیوں کو سفر کے لیے تیار کر لیا تھا وہ امیر کے باپ ابراہیم کے ٹوٹے ہوئے گروہ اور بکھری ہوئی ٹولی کو پھر سے جمع کر کے مضبوط بنانا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ امیر اگر اس گروہ کا سردار ہو تو تمام پرانے ٹھگ اُس میں ضرور شامل ہو جائیں گے لیکن جب وہ امیر کو رضامند نہ کر سکا

تو گلوگیر آواز میں اس نے کہا۔ "ٹھیک ہے جیسی تمھاری مرضی اس بار ہم چھوٹا اور مختصر سفر اختیار کریں گے اور جو شکار ملے گا اسی سے کام چلا لیں گے۔"

"نہیں پیر خان۔" امیر نے اُسے چونکاتے ہوئے کہا۔ "تمھیں بھی اب سفر پر جانے کی ضرورت نہیں ہے لو یہ ڈھائی سَو روپے تمھارے سال بھر کا خرچ تو چل ہی جائے گا۔"

امیر کی دی ہوئی روپوں کی تھیلی کو پیر خان احسان مند نظروں سے دیکھنے لگا۔ اُسے بہت پہلے سے امیر کی ہمدردی حاصل تھی۔ یوں بھی امیر اُسے ہمیشہ کچھ نہ کچھ دیتا ہی رہتا تھا۔ اس لیے ڈھائی سَو روپے کی تھیلی دیکھ کر اسے خوشی ہوئی تھی لیکن ایک بات تھی جسے وہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا اس لیے وہ بول پڑا۔ "تم دینے کے لائق ہو اور میں ہمیشہ لیتا رہا ہوں۔" پیر خان نظریں چراتے ہوئے بولا۔ "پھر بھی ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ مجھے سَو میں نہ جانے دینے کے بدلے تم یہ رقم مجھے کیوں دے رہے ہو؟"

یہ سُن کر امیر اُلجھن میں پڑ گیا دراصل اُسے ٹھگی کے اس دھندے سے نفرت سی ہو گئی تھی اور شاید پیر خان بھی اس خطرناک دھندے سے باہر نکلنا چاہتا تھا۔ مگر شاید صاف صاف کہنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ کوئی بھی ٹھگ کسی دوسرے ٹھگ کو ایسا کوئی مشورہ نہیں دے سکتا تھا کیوں کہ ان کی نظر میں یہ ایک بھیانک گناہ سمجھا جاتا تھا کہ کوئی ٹھگ اپنے پیشے کو چھوڑ دے۔ انھیں اس بات پر بھی کامل یقین تھا کہ ایک بار اپنا لینے کے بعد اس دھندے کو چھوڑ دینے والے پر بھوانی دیوی کا قہر نازل ہوتا ہے اسی لیے امیر نے ہوشیاری سے اس موضوع کو ٹال دیا۔

"پیر خان ان ڈھائی سَو روپوں سے اگر تمھارا کام چلتا ہو تو سفر میں جانے کی ضرورت نہیں ہے لیکن اگر تم جانا ہی چاہتے ہو تو بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟"

"تو ٹھیک ہے۔" کہہ کر امیر کے سامنے پڑی ہوئی تھیلی کو اٹھا کر پیر خان جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ دیکھ کر امیر کو لگا کہ شاید پیر خان نے سفر پر جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا ہے لیکن اس کا یہ اندازہ غلط ثابت ہوا پیر خان نے اپنی جگہ سے اٹھ کر آگے کہا۔ "امیر میاں سفر میں تو جاؤں گا ہی اتنے عرصے تک رومال کا استعمال نہیں ہوا ہے۔ اس لیے اب دل کو چین نہیں پڑتا۔ اچھا خدا حافظ۔" کہہ کر وہ امیر کے کمرے سے نکل گیا تھا اور اب اس بات کو بھی سال بھر کا عرصہ ہو چکا تھا۔

* *

جالان کے راجا کی مہربانیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ اب جاگیر اور گاؤں کے محصولات کی وصولیابی کا کام زیادہ سے زیادہ امیر کو سونپا جانے لگا تھا۔ راجا کی یہ عنائتیں دیکھ کر امیر نے یہ سمجھ لیا تھا کہ اب سُکھ و چین کی زندگی ہمیشہ کے لیے اس کے گھر کی لونڈی بن چکی ہے۔ افلاطون کی بیوی نے ایک بچے کو جنم دیا تھا اور اس کی پیدائش کے بعد سے ہی امیر کی ترقی ہونے لگی تھی اس لیے امیر نے افلاطون کے بیٹے کا نام برکت رکھنے کی ضد کی تھی۔ ننھا برکت افلاطون اور نُور کے پاس زیادہ نہیں رہتا تھا۔ اس کا زیادہ پر وقت اور اور عظیمہ کے ساتھ گزرتا تھا۔ افلاطون کو اس بات کا احساس تھا کہ اولاد کے لیے تڑپتی ہوئی عظیمہ کا دل اس بات سے خوش ہوتا ہے۔ اسی لیے اُس نے نُور سے بھی کہہ رکھا تھا کہ عظیمہ بہن کو یہ ذرا بھی احساس نہ ہونے دینا کہ برکت پر اُس کا حق ہم سے کم ہے۔ اس کی یہ بات سُن کر نُور ذرا ناراض لہجے میں کہتی۔ "تم تو یہ بات اس طرح کہہ رہے ہو جیسے عظیمہ بہن کبھی ماں نہیں بنے گی۔ ماں بن جانے کے بعد عورت پرائی اولاد کی محبت کو دل سے نکال دیتی ہے۔"

"بعد کی بات بعد میں دیکھی جائے گی۔" اُس کا جواب سُن کر افلاطون مذاق میں بات اُڑانے کی کوشش کرتا اور اُس کا کان پکڑ کر کہتا۔ "میں تو چاہتا ہوں کہ عظیمہ بہن کی گود سال دو سال بعد ہی بھرے۔"

"کیوں؟ تم ایسا کیوں چاہتے ہو؟"

"اس میں ہمارا ایک فائدہ ہے۔" افلاطون نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "دو سال بعد عظیمہ بہن کے بیٹی پیدا ہو تو ہمیں برکت کے لیے لڑکی کی تلاش میں باہر نہ جانا پڑے۔"

"ارے باپ رے۔" نُور ہنسے بغیر نہ رہ سکی۔ "تم تو ابھی سے بیٹے کی شادی کے بندوبست میں لگ گئے۔" اتنا کہنے کے بعد نُور نے ایک پل کے لیے کچھ سوچا پھر آگے بولی۔ "لیکن فرض کرو کہ اگر بیٹی کے بدلے بیٹا پیدا ہو گیا تو؟"

"تو..." افلاطون چٹکی بجا کر جواب سوچنے لگا پھر یکایک وہ خوش ہو کر بولا "تو امیر کے بیٹے کے لیے ہم لوگ بیٹی پیدا کریں گے۔ بھلا یہ کون سی بڑی بات ہے؟"

نُور الجھن میں پڑ گئی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اتنی بے ہُودہ بات پر اُسے اپنے شوہر پر ناراض ہونا چاہیے یا بات کو ہنسی میں اُڑا دینا چاہیے؟ ابھی وہ کوئی فیصلہ نہ کر پائی تھی کہ اچانک امیر کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی "افلاطون۔ نُور۔ جلدی آؤ۔"

امیر کی گھبرائی ہوئی آواز کے ساتھ ساتھ جب انھیں برکت کی چیخ بھی سنائی دی تو وہ دونوں ہی بدحواس ہو کر امیر کے کمرے کی جانب دوڑ پڑے۔ کمرے میں آ کر انھوں نے دیکھا کہ عظیمہ گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھی ہوئی زور زور سے سر ہلا رہی تھی اور امیر ایک سال کے برکت کو سینے سے لگائے مُنہ پھاڑے کھڑا تھا۔ نُور نے آتے ہی برکت کو اس کے ہاتھوں سے لے لیا اور اس کے جسم پر ہاتھ پھیر کر دیکھنے لگی کہ کہیں برکت کو کچھ ہو تو نہیں گیا؟

"کیا ہوا ہے عظیمہ بہن کو؟" افلاطون نے کبھی کسی عورت کو اس طرح سر ہلتے نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے اسے سخت حیرت ہو رہی تھی۔ لیکن امیر نے جواب دینے کی بجائے جُھک کر عظیمہ کا ہاتھ پکڑ لیا اور پوچھنے لگا "کیا بات ہے عظیمہ؟"

مگر امیر کی بات کا جواب عظیمہ نے نہیں دیا وہ اب اور زور زور سے سر ہلانے لگی تھی۔ امیر نے فرش پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں میں اُسے جکڑ لیا اور چیخ کر بولا "عظیمہ ہوش میں آؤ کیا ہو رہا ہے تمھیں؟"

لیکن امیر کی گرفت کی پروا کیے بغیر عظیمہ اور زیادہ جنونی کیفیت میں سر ہلانے لگی عظیمہ کا زور کم نہیں ہوا تو امیر بہت زیادہ گھبرا گیا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ عظیمہ کے نازک جسم میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی؟ "افلاطون تم اس کے پاؤں پکڑ لو تاکہ ہم اسے اٹھا کر بستر پر لٹا دیں۔" اتنی دیر میں گھر کے دونوں ملازم بھی وہاں آ گئے انھیں دیکھتے ہی امیر نے سلیمان سے کہا "جاؤ جلدی جا کر حکیم صاحب کو بلا لاؤ۔"

پھر امیر اور افلاطون نے مل کر بہ مشکل عظیمہ کو اٹھایا اور بستر پر لٹا دیا۔ مگر جیسے ہی افلاطون اور امیر کی گرفت اس کے جسم پر سے ڈھیلی ہوئی وہ بستر پر اکڑوں بیٹھ گئی اور زور زور سے جھومنے لگی۔ امیر نے اسے پکڑ کر جب دوبارہ لٹانے کی کوشش کی تو گھر کا دوسرا ملازم بھولا رام تیزی سے قریب آ کر بولا "نہیں مالک ان پر زبردستی نہ کریں لگتا ہے ان پر دیوی آئی ہے۔"

"دیوی؟" امیر ایک جھٹکے سے بھولا رام کی طرف دیکھنے لگا۔ دیوی کا نام آج سے قبل اس کے گھر میں کسی نے بھی نہیں لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ امیر کی چمکتی آنکھوں کو دیکھ کر بھولا رام اب خوفزدہ نظر آ رہا تھا۔

"اپنی غلطی کے لیے میں معافی چاہتا ہوں مالک" بھولا رام نے دونوں ہاتھ جوڑ کر اپنا سر جُھکا لیا "میں چونکہ ہندو ہوں اس لیے عقیدے کے مطابق کہہ گیا دراصل چاند کی پہلی تاریخ کو ہمارے یہاں کی اکثر عورتوں پر دیوی آتی ہے اور جب کسی پر دیوی آ جاتی ہے تو وہ عورت اسی طرح سر دُھنتی ہے۔"

"چُپ رہو۔" امیر غصّے سے چیخ پڑا اُسے اب یاد آ چکا تھا کہ آج دسہرے کا پہلا روز ہے آج کا دن بھوانی دیوی کے پُوجا کا دن ہے اور دیوی کے ماننے والوں کے لیے منّت پر جانے کا دن ہے۔ لیکن بھلا عظیمہ سے ان باتوں کا کیا تعلق ہے؟ اچانک اس کے ذہن میں پیر خان کی کہی ہوئی دیوی کے قہر کی بات تازہ ہو گئی اس بات کے یاد آتے ہی وہ ایک پل کے لیے عظیمہ کو بھول گیا۔

نُور اور افلاطون نے مل کر عظیمہ کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ ٹھیک اسی وقت گھر کا ملازم سلیمان حکیم صاحب کو لے کمرے میں داخل ہوا۔ عظیمہ اب بستر پر بیٹھی ہوئی بُری طرح ہانپ رہی تھی۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر افلاطون اور نُور وغیرہ کو دیکھ رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ان لوگوں کو بستر کے قریب دیکھ کر انھیں سخت حیرت ہو رہی ہو۔ اس کی سانس تیز تیز چل رہی تھی۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن بڑھتی ہوئی تیز سانسوں کی وجہ سے وہ کچھ نہیں کہہ پاتی۔ امیر بڑے غور سے اس کی ایک ایک حرکت کو دیکھ رہا تھا اچانک اس کے دماغ میں کئی سال پہلے کا ایک منظر گھومنے لگا۔ اس کی ماں بھی اسی طرح کی کسی بیماری میں مبتلا ہو کر بستر سے لگ گئی تھی۔ اس پر فالج کا زبردست

حملہ ہوا تھا جس کی وجہ سے اس کی زبان بند ہو گئی تھی۔

تو کیا عظیمہ بھی...؟

"بیماری تو کچھ بھی نہیں ہے۔" حکیم صاحب نے عظیمہ کی نبض دیکھنے کے بعد کہا "پھر بھی میں دوا بنا کر بھیجتا ہوں۔ مگر بیٹی تم ایک دو روز آرام کر لو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

اتنا کہہ کر بوڑھا حکیم جانے لگا تو اچانک امیر بھی اٹھ کر اُس کے پیچھے ہی کمرے سے باہر نکل گیا۔

"چاچا" اس نے بوڑھے حکیم کو مخاطب کیا لیکن اس سے آگے وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ مگر بوڑھے حکیم چاچا نے پلٹ کر اسے دیکھا پھر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا "امیر میاں فکر مند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے لیکن..."

"آپ رُک کیوں گئے؟" حکیم چاچا کے چُپ ہوتے ہی امیر بے قراری سے پوچھ بیٹھا۔

"نہیں نہیں کوئی خاص بات نہیں ہے۔" حکیم چاچا محتاط ہو کر بول رہا تھا "میں سوچ رہا تھا جب کوئی بیماری ہی نہیں ہے تو ایسا کیسے ہو گیا؟ اس سے پہلے بھی ایسا کبھی ہوا تھا؟"

"نہیں چاچا۔ یہ تو پہلی بار ہوا ہے ویسے میری ماں پر فالج کا حملہ ہوا تھا" امیر نے بتایا۔

"ارے امیر میاں تم ایسے غلط اندازے لگا کر کسی وہم میں مت پڑو میں دوا دے رہا ہوں دو چار دنوں میں ٹھیک ہو جائے گی۔"

"لیکن کوئی بیماری تو ہو گی ہی۔" امیر کو حکیم چاچا کی بات پر تسلی نہیں ہوئی۔

"بیٹے یہ من کی بیماری ہے اور کچھ نہیں ہے۔" مجبوراً حکیم چاچا نے کہا۔

"من کی بیماری؟" امیر سوچ میں پڑ گیا کہ اس قدر سُکھ چین سے رہنے کے باوجود عظیمہ کو کس بات کی کمی محسوس ہو رہی ہے؟

"میرا برکت کہاں ہے؟" اچانک کمرے کے اندر سے عظیمہ کی آواز سنائی دی "نُور یہ تم لوگ احمقوں کی طرح گھور گھور کر مجھے کیوں دیکھ رہے ہو؟ میں پوچھتی ہوں میرا برکت کہاں ہے؟ جاؤ جا کر اسے لے آؤ۔"

کہیں اولاد کی خواہش تو عظیمہ کی بیماری کا سبب نہیں بن گئی؟ امیر نے عظیمہ کی بات سُن کر سوچا پھر کمرے میں داخل ہو کر عظیمہ کے بستر پر بیٹھ گیا اور دھیرے دھیرے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

"برکت کو نوکر سیر کرانے باہر لے گیا ہے۔" امیر نے دھیرے سے جواب دیا اور پھر پوچھا "اب کیسی طبیعت ہے تمھاری؟"

عظیمہ نظر اٹھا کر چپ چاپ اس کی طرف دیکھتی رہی پھر تھوڑی دیر بعد اُس کے ہونٹوں میں جنبش ہوئی "مجھے... مجھے کیا ہوا ہے؟ کیوں میری خیریت پوچھ رہے ہو؟ کیوں حکیم صاحب کو بلوایا تھا؟ میں ذرا تھکن سی محسوس کر رہی ہوں، بس ذرا بدن میں جلن سی ہو رہی ہے ویسے میں بیمار نہیں ہوں۔"

"حکیم چاچا بھی یہی کہہ رہے تھے۔" اُسے تسلی دینے کے لیے امیر کو اپنی آواز میں تازگی لانی پڑی "مگر کیا تمھیں پہلے بھی ایسا کبھی ہوا تھا؟"

"ایسا سے کیا مطلب ہے تمھارا؟" عظیمہ نے ایک جھٹکے سے چونک کر اس کی طرف دیکھا "مجھے تو کچھ بھی نہیں معلوم ہوا آخر تم لوگوں نے کیوں مجھے بستر پر لٹا رکھا ہے؟" اتنا کہہ کر وہ اٹھنے لگی لیکن ایسا کرتے وقت اُسے اپنی کمر میں تکلیف سی محسوس ہوئی تو وہ پھر سے لیٹ گئی۔ امیر نے افلاطون اور نُور کو اشارے سے باہر جانے کے لیے کہا۔ پھر دھیرے دھیرے عظیمہ کا سر سہلاتے ہوئے کہنے لگا "تمھیں یاد ہے عظیمہ دوپہر کا کھانا کھا کر تم برکت سے کھیل رہی تھیں اور میں لیٹے لیٹے حقہ پی رہا تھا۔ پھر میری آنکھ لگ گئی تھی کہ اچانک ایک دھماکہ ہوا میں نے ہڑبڑا کر آنکھ کھول دی اور دیکھا کہ برکت تمھارے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر پڑا تھا اور تم..." امیر جان بوجھ کر رک گیا تھا اور عظیمہ کی آنکھوں کی پتلیاں اس طرح گھومنے لگیں جیسے وہ کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔ دھیرے دھیرے اُس کی آنکھیں امیر کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔

"ہاں مجھے یاد آ گیا۔" چند لمحوں بعد وہ بولی "میں نے برکت کو اٹھا کر اپنی چھاتی سے لگا لیا تھا اور وہ اس طرح میری چھاتی پر مُنہ مارنے لگا تھا جیسے اُسے بھوک لگ رہی ہو۔ اس وقت مجھے کچھ عجیب سا محسوس ہونے لگا تھا میرا سارا جسم کانپنے لگا تھا اس کے بعد کیا ہوا تھا یہ مجھے یاد نہیں آتا۔" امیر نے

دیکھا اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ امیر سمجھ گیا کہ اولاد کی خواہش نے ہی عظیمہ کو یہ بیماری بخشی ہے۔ اس نے عظیمہ کے آنسو پونچھ کر اُسے تسلی دی "پگلی ابھی ہم بوڑھے تو نہیں ہو گئے۔ اولاد کے لیے آخر تم اس قدر بے چین کیوں ہو گئی ہو؟"

"یہ تم سے کس نے کہہ دیا؟" عظیمہ پھیکی مسکراہٹ سے بولی "برکت تو میرا ہی بیٹا ہے وہ سارا دن میرے ہی پاس تو رہتا ہے۔ میری گود میں کھیلتا ہے میرے ساتھ ہی سوتا ہے۔" اتنا کہہ کر وہ ذرا دیر کے لیے رکی پھر دھیمی آواز میں بولی "اس کے لیے میرے سینے میں کتنی محبت بھری جاتی ہے تمھیں کس طرح بتاؤں؟"

امیر ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا اور یہ بات آگے نہ بڑھ سکی۔

★
★

دوسرا برس امیر کے لیے بہت ہی بُرا گزرا۔ عظیمہ کو اکثر دورے پڑنے لگتے اور وہ سر پٹکنے لگتی۔ حکیم نے تو چند ہی دنوں میں یہ کہہ کر اپنی جان چھڑا لی تھی کہ وہ مرض کو سمجھ نہیں سکتا۔ اس طرح ہنستی بولتی عظیمہ اچانک ہی ہوش و حواس کھو بیٹھتی۔ ہُور بھی اب اپنے بیٹے برکت کو عظیمہ کے حوالے کرنے سے خوف کھاتی تھی اگر برکت عظیمہ کے پاس بیٹھ کر کھیل رہا ہوتا تو وہ اس کے پاس ہی بیٹھی رہتی۔ نہ جانے اسے کیوں یہ ڈر لگنے لگا تھا کہ عظیمہ کہیں اس کے بچے کو کچھ کر نہ دے۔ امیر بھی اب گھر سے کم ہی باہر نکلتا تھا۔ وہ شاید عظیمہ کو تنہا چھوڑنا مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ محصول کی وصولیابی کے لیے افلاطون ہی کو جانا پڑتا تھا۔

امیر کی پُرانی پڑوسن گنگا بھابی اکثر امیر کو سمجھاتی رہتی تھی اور کہا کرتی "تم عظیمہ کو کسی سادھو یا پیر فقیر کو دکھلا دو اگر کسی جن بھوت کا سایہ ہوا تو وہ بھگا دیں گے۔"

لیکن امیر کو یہ بات ہضم نہیں ہوتی تھی وہ جواب میں کہتا "مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ ہو کیسے سکتا ہے؟"

"تم سمجھتے کیوں نہیں؟" گنگا اُسے سمجھاتی "اکثر لوگوں کی میلی نظریں پڑ جاتی ہیں۔ سادھو یا پیر فقیر آکر مرچوں کی دھونی دیں گے تو جو بھی سایہ ہو گا بھاگ جائے گا۔ وہ خود ہی بولے گا کہ اُسے کیا چاہیے؟ اس کی خواہش پوری کر دی جائے تو وہ عظیمہ کا جسم چھوڑ دے گا۔"

"مگر وہ بول کیسے سکے گا؟" امیر جھنجھلا کر کہتا۔

"یہ بات اس لیے تمھاری سمجھ میں نہیں آتی کہ تم نے یہ کبھی دیکھا نہیں ہے۔" گنگا اپنے تجربے کا پُرجوش لہجے میں اظہار کرتی "میں نے اپنی زندگی میں ایسے بہت سے واقعات دیکھے ہیں، میں نے جن بھوتوں کی آوازیں بھی سُنی ہیں لیکن اگر دیوی سر پہ آگئی ہو تو وہ باقاعدہ بتاتی ہے کہ میں کون ہوں؟ کیوں یہاں آئی ہوں اور جو کہوں گی وہ پورا ہو گا تو یہاں سے چلی جاؤں گی۔"

"اچھا..." امیر سوچنے لگتا کہ اگر ایسی بات ہے تو اسے کسی بھی عالم یا سادھو وغیرہ کو گھر میں نہیں بلانا چاہیے اگر سچ مچ ہی کہیں عظیمہ کے سر پہ دیوی آکر بیٹھی ہو تو وہ سب لوگوں کی موجودگی میں یہ بتا دے گی کہ امیر پر اس کی نافرمانی کا غضب نازل ہوا ہے۔ اس طرح تو اس کی اصلیت سب پر ظاہر ہو جائے گی اور ساری عزت آبرو خاک میں مل جائے گی اور وہ کہیں کا بھی نہیں رہے گا... نہیں۔ نہیں ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ کسی قیمت پر بھی نہیں ہو گا۔

دن بہ دن امیر کی پریشانی بڑھنے لگی اُسے یہ یقین تھا کہ ماما کی تڑپ اور ماں نہ بن سکنے کے صدمے کی وجہ سے ہی عظیمہ کی یہ حالت ہوئی ہے۔ پھر جیسے ہی وہ ماں بن جائے گی اُس کی یہ بیماری غائب ہو جائے گی۔ لیکن کبھی کبھی اس کا یہ خیال اُسے دھوکہ دینے لگتا اور وہ الجھن میں پڑ جاتا تھا تب اندر ہی اندر اُسے لگتا کہ یقیناً یہ بھوانی دیوی کا ہی غضب نازل ہو رہا ہے۔ اُس کی بھول کا خمیازہ اُس کی بیوی کو بھگتنا پڑ رہا ہے۔ چونکہ اُس نے ٹھگی کا پیشہ ترک کر دیا ہے اس لیے اس سے بدلہ لیا جا رہا ہے۔ کون جانے بھوانی دیوی کا یہ انتقام کب تک جاری رہے گا؟ اور نہ جانے اس کا انجام کیا ہو گا؟ اِن دنوں اُسے پیر خان بھی بار بار یاد آتا رہتا تھا۔ پچھلے دسہرے کے موقعے پر وہ کیوں نہیں آیا تھا؟ اگلے دسہرے پر وہ ضرور آئے گا۔ اگر وہ آگیا تو کیا وہ اس کے ساتھ سفر پر جانے کے لیے تیار ہو سکے گا؟ سوچتے سوچتے وہ پھر اپنے ارادے پر اٹل ہو جاتا۔ نہیں

نہیں وہ ایسے توہمات کو دل میں جگہ نہیں دے گا۔ بس عظیمہ کے ماں بننے کی ہی دیر ہے پھر کوئی تکلیف نہیں رہے گی۔

دن گزرتے گئے لیکن خوشی کا دن تو عظیمہ سے رُوٹھا ہی رہا۔ پھر ایک دن پیر خان آ ہی پہنچا وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ وہ تنہائی میں امیر سے کوئی خاص بات کہنے کے لیے بے چین نظر آ رہا تھا۔

"مجھے دیکھ کر تم ناراض تو نہیں ہوئے نا؟" تنہائی پاتے ہی پیر خان نے بات چھیڑی "شاید یہ سوچ کر تم بھنائے ہو گے کہ میں تمھیں پھر سفر پر لے جانے کے لیے آگیا ہوں؟"

"نہیں پیر خان مجھے تو اس بات پر حیرت ہو رہی تھی کہ پچھلے دسہرے پر تم کیوں نہیں آئے تھے؟" امیر نے کہا۔

"پچھلے سال میں دو مہینے تک بیمار ہی رہا۔" اتنا کہہ کر پیر خان نے چاروں طرف محتاط نظروں سے دیکھا پھر دھیمی آواز میں بولا "تمھیں کچھ پتا چلا؟"

"کس بات کا؟" امیر چونک پڑا۔

"تمھیں بھوانی دیوی کے قہر پہ اعتبار نہیں ہے نا۔ اسی لیے میں تمھیں بتانے آیا ہوں۔" پیر خان بے حد سنجیدہ لہجے میں بولا۔

"کیا؟" امیر اس بار بھی اتنا ہی پوچھ سکا۔

"تمھیں یاد ہے تمھارے والد ابراہیم میاں نے مرتے مرتے شیوا پوری کے راجا کو بد دعا دی تھی؟"

"ہاں انھوں نے راجا کو بہت بد دعائیں دی تھیں۔ میں اس وقت وہاں موجود تھا۔" امیر نے کہا "لیکن ان باتوں کے تذکرے سے اس وقت کیا فائدہ ہونا ہے؟"

"شیوا پوری کے راجا کے پورے جسم میں کوڑھ کا موذی مرض پھوٹ نکلا ہے۔"

"اوہ۔" امیر نے ایک جھٹکا سا محسوس کیا۔

"ہاں اور آج وہ پچھتاوا محسوس کر کے روتا رہتا ہے۔ لوگ آپس میں یہ باتیں کرتے ہیں کہ راجا کو ضرور کسی بے قصور شخص کی آہ لگی ہے۔ ہم ٹھگ لوگوں کو تو اس بات کا یقین ہے کہ ابراہیم میاں کی بات بھوانی دیوی نے ضرور سُنی ہے۔ اپنے پوجنے والے کی آہ سُن کر اُس نے راجا سے اس کا انتقام لیا ہے۔" پیر خان کی یہ بات سُن کر امیر سوچ میں پڑ گیا پھر کافی دیر کی خاموشی کے بعد اُس نے پیر خان کو چونکاتے ہوئے کہا "مجھے تمھاری یہ بات سچی لگ رہی ہے۔ جس دیوی نے میرے باپ کا بدلہ لیا ہے اس کا حکم بھلا میں کیسے ٹال سکتا ہوں؟ اب بتاؤ ہمیں کب سفر پر چلنا ہے؟"

"تم جب کہو تب۔" پیر خان مارے خوشی کے اُچھل پڑا "مجھے تو یقین تھا کہ سفر پر جانے کے لیے تم میری راہ دیکھ رہے ہو گے۔ شاید دیوی نے ہی مجھے یقین دلایا ہو گا۔"

"بس تو پھر برسوں ہم روانہ ہو جائیں گے۔" اتنا کہنے کے بعد امیر پھر گہرے خیالوں میں کھو گیا۔ مرحوم باپ کی یادیں دیر تک اُسے تڑپاتیں رہیں۔

"میں دو ایک دن میں سفر پر جاؤں گا۔" یہ سن کر افلاطون چونک پڑا۔ اُس نے امیر کو گھور کر دیکھا "دو ایک دن میں؟ کس جگہ کا سفر کرنا ہے تمھیں؟"

"اس کا ابھی فیصلہ نہیں کیا ہے۔" امیر نے نظریں چُراتے ہوئے جواب دیا۔ اس نے یہ بات کہنے سے قبل بہت بار سوچا تھا۔ دوست کو کھو دینے کا خطرہ تو تھا ہی لیکن افلاطون سے کہے بغیر چارہ بھی تو نہیں تھا "افلاطون تمھیں تو پتا ہی ہے کہ میں دو سال سے گھر میں بیٹھا ہوا ہوں۔ پیر خان کو بار بار ٹالنا بھی اچھا نہیں لگتا اور میرے جائے بغیر کام بھی نہیں چل سکتا۔"

امیر نے آخری جملہ کچھ زیادہ ہی جوش میں کہا تھا جسے سُن کر افلاطون کی آنکھیں پھیل گئیں چند لمحوں تک تو وہ امیر کو دیکھتا رہا پھر انتہائی سنجیدہ لہجے میں بولا "تم مجھ سے کچھ چھُپا رہے ہو امیر۔ مجھے یوں لگتا رہتا ہے کہ ہماری دوستی میں ضرور کہیں کوئی دراڑ پڑ گئی ہے۔"

امیر نے اپنے تن بدن میں ایک کپکپاہٹ سی محسوس کی مگر پھر وہ فوراً ہی سنبھل گیا "تم ایسا کیوں سمجھتے ہو؟ اس کی کوئی وجہ ہے؟"

"بس مجھے ایسا لگتا رہتا ہے۔" افلاطون الجھے الجھے سے لہجے میں بولا "بہت سی باتیں ہوتی ہیں امیر جو آپ ہی آپ دل میں پیدا ہو جاتی ہیں مگر اس کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں

آتی۔" کوئی اور موقع ہوتا تو امیر مذاق میں اس سے ضرور کہتا کہ جب سے تم کسانوں سے محصول وصول کرنے لگے ہو تب سے تمھارے دل میں بھی کچھ نہ کچھ پیدا ہونے لگا ہے۔ لیکن امیر یہ مذاق نہیں کر سکا۔ افلاطون بڑی گمبھیر نظروں سے اس کی طرف تاک رہا تھا۔ اس کی بات بھی سچی تھی۔ اس نے اپنے جگری دوست سے ایک انتہائی بھیانک بات اب تک چھپا رکھی تھی۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا افلاطون نے ہی سوال پوچھ لیا۔" امیر تم سچ سچ بتانا سفر میں تم اپنے ساتھ مجھے نہیں لے جانا چاہتے نا؟"

امیر اس کا سوال سُن کر سٹپٹا گیا اسے توقع نہیں تھی کہ بات اتنی جلدی ایک خطرناک موڑ پر آجائے گی۔ اُس نے فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھالا اور جواب دیتے ہوئے بولا۔

"افلاطون تمھارا اندازہ غلط ہے۔ تمھیں اپنے ساتھ لے جانے میں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے مگر پھر بھی..." کہتے کہتے امیر ایک پل کے لیے رکا پھر جلدی سے آگے کہہ گیا۔" میرے ساتھ تمھاری جتنی ضرورت ہے اس سے زیادہ ضروری تمھارا یہاں رہنا ہے۔"

"وہ کس طرح؟" افلاطون نے فوراً ہی پوچھا۔

"ایک تو عظیمہ، نُور اور برکت کا خیال رکھنا ہے۔ اس کے علاوہ گھر وغیرہ کی دیکھ بھال بھی ضروری ہے۔"

"اگر یہ بات ہے تو پھر تمھیں سفر پر جانے کی کیا ضرورت ہے؟ عظیمہ بہن کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور ہماری آمدنی بھی بُری نہیں ہے مگر پھر بھی تم اپنی بیوی، اپنا گھر اور اپنے دوست کو چھوڑ کر سفر پر جانے کے لیے تیار ہو گئے ہو؟ تمھیں کون سے کاروبار کے سلسلے میں سفر پر جانا ہے؟ ہماری تو کوئی دکان نہیں ہے خرید و فروخت کا کوئی بھی دھندہ نہیں ہے۔"

افلاطون کی اس بات نے تو دو گھڑی کے لیے امیر کو بوکھلا کر رکھ دیا لیکن جواب تو اسے بہر حال دینا ہی تھا۔ اسی لیے وہ جلدی سے سوچ کر بولا۔" میں نے ابا جان سے وعدہ کیا تھا کہ میں ان کا دھندہ جاری رکھوں گا۔"

"کون سا دھندہ؟" افلاطون کا یہ سوال ایک گولی کی طرح امیر کے دل پر لگا جب اس کی تکلیف اس سے برداشت نہیں ہوئی تو وہ چڑ کر بولا۔" افلاطون کیا یہ ضروری ہے کہ میں تمھیں ہر بات بتاؤں؟"

"تو کیا یہ ضروری ہے کہ مجھ سے ہر بات چھپائی جائے؟" افلاطون دو ٹوک لہجے میں بولا۔" مجھے نہ لے جانا ہو تو یہ تمھاری مرضی کی بات ہے۔"

"افلاطون میں نہیں چاہتا کہ تم اس دھندے میں پڑو۔" مجبوراً امیر کو تھوک نگل کر کہنا پڑا۔

"کیا تمھیں یہ لگتا ہے کہ میں تمھاری کمائی میں حصہ دار بن جاؤں گا؟"

"چُپ رہو۔" امیر چیخ پڑا۔" یہ کیسی بے ہودہ باتیں کر رہے ہو تم؟" لیکن افلاطون کے چہرے پر جب کوئی تبدیلی نظر نہیں آئی تو اُسے اپنے غصّے کو پی جانا پڑا پھر وہ اپنی آواز میں نرمی پیدا کرتے ہوئے بولا۔" بہت سے دھندے ایسے ہوتے ہیں جن کی کمائی میں کسی کو حصّے دار نہیں بنایا جاتا۔"

"ایسا کون سا دھندہ ہے؟" افلاطون اس کا پیچھا چھوڑنے والا نہیں تھا جبکہ امیر کو اپنے سینے میں جلن سی محسوس ہو رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اندر کی بات جب تک اُگل نہیں دے گا اس وقت تک اُسے چین نہیں آئے گا۔ وہ افلاطون کو سب کچھ بتا دینا چاہتا تھا۔ لیکن اس کی زبان اُس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ حقّے کا کش لگاتے لگاتے اس نے آس پاس نظریں گھما کر دیکھ لیا۔ رات تاریک تھی اور ماحول پر سناٹا طاری تھا۔ وہ دونوں اس وقت باغ میں بیٹھے ہوئے تھے، اس لیے یہ خوف نہیں تھا کہ کوئی ان کی باتیں سُن لے گا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے حقّے کی نلی افلاطون کی جانب بڑھا دی اور بولا۔" تم میرے ساتھ سفر پر چلنے کے لیے تیار ہو؟"

"نہیں، تم مجھے مت لے جاؤ۔" افلاطون کے لہجے میں ناراضگی کی جھلک تھی۔

"میں جو کروں گا اُس میں تم میرا ساتھ دو گے؟" یہ سوال پوچھتے پوچھتے امیر کی سانسوں کا اتار چڑھاؤ بڑھ گیا تھا اور یہ بات افلاطون سے چھپی ہوئی نہ رہ سکی اُس نے فوراً ہی کہا۔

"امیر میں تمھارے لیے اپنی جان دینے کے لیے تیار ہوں۔"

"یہ جان دینے کی بات نہیں ہے افلاطون۔" امیر جلدی سے بول گیا۔" یہ دھندہ تو دوسروں کی جان لینے کا دھندہ ہے۔" یہ بات وہ اچانک ہی کہہ گیا تھا اور کہہ کر بُری طرح چونک پڑا لیکن افلاطون کے چہرے پر اُسے اب بھی کسی قسم کے کوئی تاثرات دکھائی نہیں دیئے، اندھیرے میں بھی وہ افلاطون کی آنکھوں میں اپنے لیے ہمدردی کی چمک دیکھ رہا تھا، جب تھوڑی دیر تک افلاطون نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ خود ہی بولا۔" بس بند ہو گئی نا زبان؟ تمھارے ہونٹ تو پوری بات سنے بغیر ہی سل گئے۔"

"یہ تم سے کس نے کہا کہ میں پوری بات نہیں جانتا؟" یہ سُن کر امیر اس طرح بوکھلا گیا جیسے کسی سانپ نے اس کے دونوں پاؤں کو جکڑ لیا ہو۔" کیا مطلب؟" وہ تھوک نگل کر بہ مشکل بول سکا۔

"امیر میں سب کچھ جانتا ہوں۔" افلاطون بے حد سنجیدہ تھا۔

"سب کچھ جاننے سے کیا مراد ہے تمھاری؟" امیر اس طرح اپنے ہاتھ سے اپنا سینا سہلانے لگا جیسے اُسے سینے میں تکلیف ہو رہی ہو۔" جلدی بتاؤ افلاطون تم کیا جانتے ہو؟"

"وہی جسے تم نے آج تک مجھ سے چھُپا کر رکھا ہے۔"

بے دھڑک افلاطون نے یہ بات کہہ دی تو امیر کو لگا کہ اب اس کا دل کسی بھی پل دھڑکنا بند کر دے گا، پھر یکایک ایک جھٹکے سے اُس کی گردن جُھک گئی۔ اس کے اندر ہزاروں طوفان اٹھ رہے تھے اور وہ سوچ رہا تھا کہ افلاطون کو ساری باتوں کا علم کب ہو گیا ہوگا؟ کیا میں شام کو پیر خان سے باتیں کر رہا تھا تب؟ یا غوث خان کی کہانی سننے کے بعد؟ یکایک افلاطون نے دھیرے سے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا امیر حیران تھا کہ غصّے سے اٹھ کر چلے جانے کی بجائے افلاطون اُس سے ہمدردی کا اظہار کیوں کر رہا ہے؟

"تمھاری اصلیت سے میں واقف ہوں امیر۔" یہ کہہ کر افلاطون نے زور سے اُس کا کندھا دبا دیا تب بھی امیر کو یہی لگا کہ افلاطون اُس سے مذاق کر رہا ہے لیکن افلاطون نے بات جاری رکھتے ہوئے آگے کہا۔" میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تمھیں یہ دھندہ تمھارے باپ کی طرف سے ورثے میں ملا ہے۔"

امیر کو ایک شدید جھٹکا لگا اُس نے فوراً ہی افلاطون کا ہاتھ اپنے کندھے پر سے ہٹا دیا اور بولا۔" اس کے باوجود تم میرے دوست بن کر رہنا چاہتے ہو؟"

"اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی کیا میری دوستی میں تمھیں کوئی کمی محسوس ہوئی ہے؟" افلاطون نے بڑی محبت سے پوچھا۔

"کیا مطلب؟" امیر بُری طرح بوکھلا گیا۔" تم کب سے یہ راز جانتے ہو، کس نے بتایا ہے تمھیں؟"

"لٹیروں کے ساتھ اپنا پہلا سفر کر کے جب میں واپس آیا تب سے ہی یہ بات جانتا ہوں۔" افلاطون دھیمی آواز میں بولا۔ "مجھے کسی نے بھی نہیں بتایا مگر پھر بھی میں جانتا ہوں۔"

"افلاطون۔" امیر نے افلاطون کا ہاتھ تھام لیا اور جذباتی لہجے میں بولا۔" تم مجھے ٹالنے کی کوشش مت کرو۔"

"تمھیں اگر سننا ہی ہے تو ہمّت کر کے سنو۔" افلاطون چند ساعتوں کے لیے رُکا پھر جب امیر نے آنکھیں اُونچی کر کے اس سے نظریں ملائیں تو وہ آگے بولا۔" ہمیں رخصت کرنے کے بعد جب تم چیتوؤ کے پاس ٹھہر گئے تھے تو واپسی کے دوران ہم ایک جگہ رات گزارنے کے لیے ٹھہرے تھے۔ دوسرے دن مجھے تمھارے ساتھیوں سے جُدا ہو جانا تھا، اس درمیان میں نے دیکھا تھا کہ موتی رام اور پیر خان مجھ سے چھُپ چھُپ کر اکیلے میں سرگوشیاں کرتے رہتے ہیں، یہ دیکھ کر مجھے ان دونوں پر یہ شک ہو گیا کہ یہ دونوں میری دولت پر قبضہ کرنے کا منصوبہ تو نہیں بنا رہے ہیں، اس خیال کے آتے ہی میں ہوشیار رہنے لگا تھا علیحدہ ہونے سے پہلے کی رات میں دل پر پتھر رکھ کر جاگتا رہا۔ میرے ساتھ چالبازی کرنے کے لیے ان کے پاس یہ آخری موقع تھا مجھے یقین تھا کہ جو کچھ ہونا ہے وہ آج رات ہی ہو جائے گا، میرا خیال تھا کہ مجھے گہری نیند میں دیکھ کر وہ دونوں میرا مال اسباب لے کر بھاگ جائیں گے۔"

"اوہ... تو تم نے یہ سمجھ لیا تھا؟" امیر ایک گہرا سانس لے کر بولا۔

"ہاں مال کے لُٹ جانے کے خوف سے زیادہ مجھے تو اُن کی غدّاری کا خیال آ رہا تھا، میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اپنے سردار کی دولت پر بُری نظر رکھنے والوں کو تو میں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"پھر؟"

"نیند کا بہانہ بنا کر میں ان کی حرکتوں پر نظر رکھنے کے لیے چپ چاپ لیٹا رہا، مجھے خرّاٹے بھرنے کی عادت ہے اس لیے

جیسے ہی میں نے خراٹوں کی آوازیں نکالیں تو پیر خان اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا، تھوڑی دیر بعد موتی رام بھی اٹھ کر اس کے پیچھے گیا، مجھے یقین ہوگیا کہ میرا اندازہ غلط نہیں ہے، ان دونوں نے یقیناً منصوبہ بنا رکھا ہے اور یہ دونوں میرے سو جانے کی ہی راہ دیکھ رہے تھے۔ تھوڑی دیر تک تو کچھ بھی نہیں ہوا، بغیر نیند کے خراٹے بھرنے میں مجھے دقت ہو رہی تھی مگر پھر بھی میں نے صبر سے کام لیا۔

"پھر؟" اس بار امیر کی آواز کانپ گئی۔

"لیکن جب وہ دونوں باتیں کرنے لگے تو میں چونک پڑا۔ موتی رام تمھاری تعریف کر رہا تھا پھر تھوڑی دیر بعد پیر خان ہم دونوں کی دوستی کا ذکر کرتے ہوئے کہنے لگا "تم جانتے ہو موتی رام کہ امیر نے دوسرے سفر میں افلاطون کو نہ لے جانے کا فیصلہ کیوں کیا ہے؟"

موتی رام نے وجہ پوچھی تو پیر خان نے اسے بتایا۔

"دراصل امیر اپنے اس جگری دوست سے اپنی اصلیت چھپانا چاہتا ہے۔ اس نے افلاطون کو ابھی تک یہ نہیں بتایا ہے کہ ہم لوگ ٹھگ ہیں اور بھوانی دیوی کے بھگت ہیں۔" اتنا کہہ کر افلاطون رُک گیا اور امیر کی گردن کسی مجرم کی طرح آپ ہی آپ جُھک گئی، مگر تھوڑی دیر بعد اس نے کھنکھار کر آواز میں کہا۔ "تم نے جو کچھ سنا ہے وہ سب سچ ہے، لیکن یہ بات تمھیں کس نے بتائی کہ میرے ابا جان بھی یہی دھندہ کرتے تھے؟"

"یہ راز بھی مجھے ان کی باتوں سے معلوم ہوگیا۔"

"اس کے باوجود تمھیں ابا جان سے اور مجھ سے نفرت نہیں محسوس ہوتی؟ تم نے تو مجھے یہ جاننے کا موقع ہی کبھی نہیں دیا کہ تم کب سے یہ بات جانتے ہو۔"

"ابتدا میں مجھے صدمہ لگا تھا۔" افلاطون تھوڑی دیر بعد بولا۔ "مگر امیر ایک جانب ہماری دوستی تھی اور دوسری طرف ٹھگوں کا بدنام دھندہ تھا۔ ان دو برسوں میں میں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ تم اس دھندے کو چھوڑ دینا چاہتے ہو تمھیں اس سے اب کوئی دلچسپی نہیں رہی ہے۔"

"ہاں افلاطون۔" امیر گمبھیر لہجے میں بولا۔ "میرا خیال تھا کہ میں اس پیشے کو چھوڑ دوں گا، ابا جان سے کیا ہوا وعدہ اور بھوانی دیوی کی کھائی ہوئی قسموں کو بھول جاؤں گا، مگر میں مجبور ہوں۔"

"لیکن اگر تم یہ نہ چھوڑ سکے تو تمھیں کچھ اور چھوڑنا پڑے گا۔" افلاطون نے کہا۔ تو امیر بُری طرح گھبرا گیا اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ افلاطون اس سے دوستی چھوڑنے کی بات کرے گا پھر بھی وہ پوچھ بیٹھا۔ "کیا چھوڑنے کے لیے کہہ رہے ہو تم؟"

"میں گھر پر رہوں اور تم اکیلے سفر پر جاؤ یہ مجھے چھوڑنی پڑے گی۔"

"کیا مطلب؟" امیر کو جیسے یقین بھی نہ آ رہا ہو۔ "کیا تم میرے ساتھ...؟" وہ اس سے زیادہ نہ بول سکا۔

"ہاں امیر ہمارے بچپن کا یہ وعدہ ہے کہ جہاں رہیں گے ساتھ رہیں گے اور جہاں جائیں گے ساتھ ہی جائیں گے۔" افلاطون بھرائی ہوئی آواز میں بولا تو امیر کا دل پانی پانی ہوگیا اس کا جی چاہا کہ وہ افلاطون کو اپنی باہوں میں سمیٹ کر خوب روئے لیکن وہ ایسا نہیں کر سکا بلکہ اس نے اپنی بھیگی ہوئی آنکھوں کو فوراً ہی پونچھ لیا اور بولا۔ "نہیں افلاطون ہم دونوں کے ساتھ جانے کی بات عظیمہ اور نور کو پسند نہیں آئے گی خود میرا دل بھی انھیں تنہا چھوڑ کر جانے کو نہیں چاہتا۔"

"یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔" افلاطون جوشیلے لہجے میں بولا۔ "مجھے عظیمہ بہن کو منانا آتا ہے۔" افلاطون نے یہ بات اتنے یقین سے کہی تھی کہ امیر کوئی دلیل نہ پیش کر سکا، افلاطون کافی عرصے سے اُس کا راز جانتا تھا اور اُس نے جس ہوشیاری اور ضبط سے اس بھیانک راز کو ہضم کرنے کی کوشش کی تھی، اس سے امیر اس قدر متاثر ہوگیا تھا کہ وہ کچھ کہہ نہیں سکا۔ اس نے تو کبھی یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ افلاطون ہچکچاہٹ کے بغیر اتنی آسانی سے اس کا ساتھ دینے کے تیار ہو جائے گا۔ پل بھر کے لیے اس کے دل میں یہ خیال آیا تھا کہ وہ اپنے اس پُرخلوص دوست کو غلط راستے تو نہیں لے جا رہا ہے؟ لیکن فوراً ہی اس نے ذہن اس خیال کو جھٹک دیا۔

* *

ایک ٹھگ کی حیثیت سے وفاداری کا حلف اٹھا وقت افلاطون نے کسی ہچکچاہٹ کا اظہار نہیں کیا اور نہ

بھوانی دیوی کی پوجا پاٹ کے وقت اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے کوئی آثار دکھائی دیتے تھے۔ خود کو دوسروں سے زیادہ عقل مند اور سمجھدار سمجھنے کی اُسے بچپن ہی سے عادت تھی، شاید اسی لیے دوسرے ٹھگوں کے سامنے اس نے خود کو بے خوف اور ہوشیار بنائے رکھنے کی کوشش کی تھی۔ جب تمام ٹھگ سفر پر جانے سے پہلے اپنی رسم کے مطابق شگون دیکھ رہے تھے تو افلاطون بھی دوسرے ٹھگوں کی طرح چپ چاپ آسمان کو تکنے لگا تھا۔ کافی دیر بعد جب مغرب کی سمت سے انھیں کسی گدھے کی "ڈھینچو ڈھینچو" کی آوازیں سُنائی دیں تو وہ بھی سب ٹھگوں کے ساتھ خوشی سے ناچنے لگا تھا۔ امیر کو اس کی اس حرکت پر تعجب سا ہوا تو اس نے افلاطون سے پوچھ ہی لیا۔ "افلاطون بھلا تم کیا سمجھ کر خوشی سے ناچ رہے ہو؟ تم تو نئے ہو ان شگون وگون کو کیا سمجھو گے؟"

یہ سُن کر افلاطون نے اپنی ایک آنکھ دبا کر مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "میرے دوست تم میری ہنسی نہ اڑاؤ میں تمھارے ساتھیوں کے ساتھ خوش ہو کر یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے سب کچھ معلوم ہے۔"

"اوہ اچھا اچھا۔" کہہ کر امیر نے اس کے بازو میں چٹکی بھری اتنے میں پیر خان وہاں آ گیا اور بولا۔ "امیر میاں تمھارے دوست کا یہ پہلا ہی سفر یادگار بن جائے گا۔"

افلاطون کچھ بھی نہیں سمجھا لیکن اس کے باوجود وہ بڑے رعب سے امیر کی طرف دیکھنے لگا، امیر نے اس کے چہرے پر سے نظریں ہٹالیں اور پیر خان سے پوچھا۔

"پیر خان مغرب کے اس سفر میں ایسی کیا خاص بات ہے؟"

"طرف بمبئی ہے امیر میاں... بمبئی کی بندرگاہ ہے۔" پیر خان پُرجوش لہجے میں بولا۔ "زبردست سمندر ہے کروڑوں کا کاروبار اور لاکھوں کالین دین بمبئی شہر میں ہوتا رہتا ہے۔ میاں ہر وقت مسافروں کی آمد و رفت ہوتی ہے وہاں ہم کافی شکار کر سکتے ہیں اور کافی دولت کما سکتے ہیں۔"

امیر کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک لہرا گئی اور وہ افلاطون کو مخاطب کر کے بولا۔ "تب تو ہمارا یہ سفر واقعی یادگار بن جائے گا" افلاطون لہراتے ہوئے سمندر اور اُچھلتی ہوئی موجوں کو دیکھ کر بڑا مزہ آئے گا۔" لیکن افلاطون نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ گہرے خیالوں میں کھو گیا ہو اور یہ سچ بھی تھا۔ سمندر کی بات سُن کر اُس کے ذہن میں برسوں پُرانی بات تازہ ہوگئی تھی، اُسے اپنے اُس باپ کی یاد آ گئی جو یہ کہہ کر گھر سے گیا تھا کہ میں سمندر کے سفر پر جا رہا ہوں، لیکن وہ آج تک واپس نہیں آیا تھا۔ باپ کے ساتھ ساتھ اُسے اپنی مرحوم ماں بھی یاد آ گئی، جو کبھی واپس نہ آنے والے شوہر کی آس لگائے زندگی کے دُکھ جھیلتی رہی اور آخر کار تھک کر مر گئی... یادوں کی پرچھائیاں افلاطون کے دل پر ناچتی رہیں اور وہ دیر تک نہ جانے کیا کیا سوچتا رہا۔

* *

"یا خدا تُو واقعی باکمال ہے۔" پہلی بار بمبئی کا سمندر دیکھ کر امیر کسی بچے کی طرح خوشی سے ناچ اٹھا۔ "افلاطون ذرا دیکھو تو سہی یہ موجیں کتنے زور سے اُچھل رہی ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے یہ ہمیں بُلا رہی ہوں آؤ۔ یہاں آؤ۔"

لیکن افلاطون گُم سُم بیٹھا رہا اُس کی نظریں تا دُور دُور جہاں سمندر اور آسمان ایک دوسرے سے ملتے دکھائی دیتے تھے وہیں بھٹکتی رہتی تھیں، مگر امیر کی خوشیوں میں کوئی خلل نہ پڑے اس لیے وہ ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیرے رہتا۔ "جی چاہتا ہے کہ ساری عمر سمندر کے کنارے بیٹھا رہوں۔" امیر سبز گھاس پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتا۔ "میں تو سمندر کی اس خوبصورتی پر قربان ہو چکا ہوں۔"

راستے میں اکتیس مسافروں کو ختم کرنے اور چار ہزار کی رقم پر قبضہ کر کے امیر اپنے سوا سو ساتھیوں کے ساتھ بمبئی پہنچا تھا۔ اس وقت تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ سمندر کو دیکھ کر وہ بالکل ہی بے ہوش ہو جائے گا۔ کسی کو ان پر کوئی شک و شبہ نہ ہونے پائے اس لیے اس نے اپنی ٹولی کو کئی حصوں میں تقسیم کر دیا تھا وہ شہر سے باہر کے بازار کے قریب ایک مسافر خانے میں ٹھہرا ہوا تھا، انھوں نے آپس میں یہ طے کر لیا تھا کہ جب بہت ہی ضروری ہو تو ایک دوسرے سے ملاقات کریں گے۔ ٹھیک دس روز بعد پہلے سے طے کی ہوئی جگہ پر مل لیں گے۔ لیکن پانچ روز تو صرف سمندر کو دیکھنے میں ہی گزر گئے۔ دوپہر ہوتے ہی امیر قلعے سے باہر کے میدان میں افلاطون کے ساتھ آ کر بیٹھ جاتا۔ لہروں کی

اُچھل کود دیکھ کر اس کا جی چاہتا کہ وہ بچہ بن جائے۔ اسے اپنا بچپن یاد آنے لگتا اور گُل کی یاد تازہ ہو جاتی۔ گُل کی یادوں کے ساتھ ساتھ اُسے غظیمہ کی یاد بھی ستانے لگتی۔ غظیمہ کے ماں بننے کی بے چینی خود اُسے بھی بے چین بنا دیتی تھی سمندر کی اُبھرتی بیٹھتی لہروں کی طرح اُس کے دل میں بھی لہریں اُٹھ جاتی تھیں۔

"مہربان آپ لوگ پردیسی لگ رہے ہیں؟" ایک اجنبی آواز نے اچانک ہی امیر اور افلاطون کو چونکا دیا، اُن کے سامنے ایک بزرگ شخص کھڑا تھا، اجنبی ہونے کے باوجود وہ ہنس رہا تھا۔ امیر اُسے دیکھ کر اٹھنے لگا تو وہ بزرگ شخص خود ہی گھاس پر بیٹھ گیا اور دونوں کی جانب دیکھ کر بولا "کہاں سے آرہے ہو؟"

"ہندوستان سے۔" امیر نے اس کے لباس اور سراپے کا جائزہ ایک پل میں ہی لے لیا، افلاطون بھی تجسس بھری نظروں سے اس اجنبی بزرگ کو دیکھ رہا تھا۔

"لگتا ہے تم لوگوں نے پہلی بار ہی سمندر دیکھا ہے؟" بزرگ شخص نے بڑی میٹھی آواز میں پوچھا۔

"ہاں۔" امیر ذرا شرما گیا "یوں تو پورے پانچ روز سے ہم یہ منظر دیکھ رہے ہیں لیکن دل نہیں بھرتا۔"

"ہندوستان میں کہاں رہتے ہو؟"

"جالان۔" امیر کو اُس کا یہ سوال کوئی حیرت انگیز نہیں لگا تھا۔ ویسے وہ دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ دیوی نے ایک شکار کو خود ہی اُس کے پاس بھیج دیا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ یہ شخص اب اُس سے یہ سوال بھی پوچھے گا کہ یہاں کیوں آئے ہو؟ لیکن اس کے بجائے اس شخص نے دوسرا ہی سوال پوچھا "تم لوگوں نے کبھی پانی کا جہاز دیکھا ہے؟"

"جہاز؟" امیر ہنس پڑا "ہمیں یہاں آئے ہوئے پانچ دن ہو چلے ہیں اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم نے پانی کا جہاز نہ دیکھا ہو؟"

"تم شاید میرا مطلب نہیں سمجھے۔" اجنبی بزرگ جلدی سے بولا "میں دُور سے اُسے دیکھنے کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ وہ تو اس جگہ بیٹھ کر بھی دیکھا جا سکتا ہے لیکن کبھی تم لوگوں نے کسی جہاز پر قدم بھی رکھا ہے؟"

"ارے باپ رے۔" امیر کو دلچسپی پیدا ہو گئی تھی لیکن اس کے باوجود وہ گھبراہٹ کا اظہار کرتے ہوئے بولا "تو کشتی میں بھی پیر رکھنے سے ڈرتا ہوں سمندر کی لہروں کس طرح ہچکولے کھاتی ہے؟ یوں لگتا ہے جیسے ڈوب ہی جائے گی میرا تو اس خیال سے ہی دم گھٹنے لگتا"

"تم شاید میرا مذاق اُڑا رہے ہو۔" بزرگ نے دلچسپی کو تاڑتے ہوئے کہا "تمھارا چہرہ بتا رہا ہے کہ تم نہیں ہو۔ چلو اٹھو میں تمھیں جہاز دکھانے لے جا رہا ہوں"

"ہوں۔" افلاطون اور امیر دونوں اس طرح چونکے جیسے انھیں یقین ہی نہ آ رہا ہو، وہ چُپ چاپ اُس اجنبی کو تاکنے لگے لیکن اُس شخص کے چہرے پر کسی قسم کے کوئی دکھائی نہیں دیئے تو وہ دونوں دوست ایک دوسرے کی جانب دیکھنے لگے۔

"گھبراؤ مت۔ اس کے بدلے میں مجھے تم لوگوں سے نہیں لینا ہے۔" اجنبی شخص نے ان کی گھبراہٹ دُور کرنے کی کوشش کی "بندرگاہ پر میری اچھی خاصی جان پہچان ہے میں بھی ہندوستان کا رہنے والا ہوں۔" اتنا کہہ کر وہ رکنے کے لیے رکا پھر آگے بولا "میرا نام سبحان خان ہے تمھارا؟"

"میرا نام امیر علی ہے اور میرے دوست کا نام افلاطون ہے۔" امیر بولا۔

"اچھا۔" بزرگ شخص نے بمبئی کا خاص لفظ استعمال کیا پھر امیر کا ہاتھ پکڑ کر بولا "امیر میاں اور افلاطون میاں تم لوگوں کو میں انگلستان کے بادشاہ کا جہاز دکھانے لے جا رہا ہوں۔"

اس کے اِن آخری چار لفظوں نے ان پر مقناطیسی اثر کیا اور وہ دونوں ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔

**

بندرگاہ پر کام کرنے والے لوگ جب سبحان خان کو جھک کر سلام کرنے لگے تو امیر کو یقین ہو گیا کہ واقعی یہ کوئی حیثیت رکھتا ہے جب وہ لوگ سمندر کے کنارے آ گئے تو دو تین جہازوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس شخص نے کہا "وہ جو سب سے بڑا جہاز ہے ہمیں اس میں جانا ہے۔"

سبحان خان کو دیکھتے ہی کنارے پر کھڑی ہوئی کشتی کے خلاصیوں نے ایک ساتھ آوازیں دینی شروع کر دیں۔

"آیئے جناب تشریف لایئے۔"

"قاسم آج ہم تمھارے ساتھ جائیں گے۔" سبحان خان ایک بوڑھے خلاصی کی جانب بڑھتے ہوئے بولا۔

افلاطون قاسم کا نام سُن کر چونک پڑا، کشتی پر بیٹھتے وقت پتوار پکڑ کر کھڑے ہوئے شخص کو دیکھ کر پہلے سے بھی زیادہ وہ چونک پڑا لیکن امیر تو سمندر پر ہچکولے کھاتی ہوئی کشتیوں کو دلچسپی سے دیکھ رہا تھا، وہ کبھی پانی پر ہاتھ ڈال کر خوش ہوتا اور کبھی پتوار کی 'چپ چپ' کی آواز سے لطف اندوز ہونے لگتا۔ جوں جوں کشتی آگے بڑھتی جا رہی تھی توں توں وہ جہاز نزدیک سے بڑا دکھائی دینے لگتا تھا وہ خوش ہو کر بار بار سبحان کا شکریہ ادا کرنے لگتا "جناب اگر آپ سے ملاقات نہ ہوئی ہوتی تو ہمیں یہ موقع نہیں ملتا۔"

مگر افلاطون تو پتوار چلاتے ہوئے خلاصی کو دیکھنے میں ہی مشغول تھا۔ یکایک اس کی نظر کشتی چلانے والے خلاصی کے داہنے بازو پر پڑ گئی اور وہ بُری طرح اُلجھ گیا۔ اسے یاد آ گیا کہ اُس کے باپ کے داہنے بازو پر بھی اسی طرح کا لنگر کا نشان کھُدا ہوا تھا۔ سمندر کی لہروں کی طرح افلاطون کے دل میں بھی ہزاروں لہریں چنگھاڑنے لگیں، وہ گھُور گھُور کر خلاصی کے بازو پر بنے ہوئے لنگر کے نشان کو دیکھنے لگا اور باپ کی چھوٹی بڑی نشانیوں کو یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا، نام، شکل و صورت اور بازو پر بنا ہوا نشان اور بائیں ہاتھ کی ایک ٹوٹی ہوئی انگلی... افلاطون بوکھلا گیا اُسے یقین ہو گیا کہ سامنے بیٹھا ہوا خلاصی ضرور اس کا باپ ہے۔ تو کیا وہ ان سب کو بے سہارا چھوڑ کر بمبئی میں موج اڑانے کے لیے ٹھہرا ہوا ہے؟ اس خیال کے آتے ہی افلاطون کی آنکھوں میں سُرخ سُرخ لکیریں سی دوڑنے لگی تھیں۔

**

انگلستان کے بادشاہ کے جہاز کے قریب آ کر ان کی کشتی رُک گئی، اور تب امیر اس پہاڑ جیسے اُونچے جہاز کو گردن اُٹھا اُٹھا کر حیرت سے دیکھنے لگا۔ اُس کا مُنہ حیرت کے مارے کھُلا رہ گیا تھا، اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ اتنا بھاری بھرکم جہاز پانی کی سطح پر کس طرح تیر سکتا ہے؟ مگر افلاطون ابھی تک کشتی کے خلاصی پر ہی نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ اُس نے تو یہ بات سپنوں میں بھی نہیں سوچی تھی کہ اس کا باپ زندہ ہو گا اور اسی لیے وہ سوچ رہا تھا کہ اس وقت وہ جو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے وہ بھی کاش ایک سپنا ہی ہوتا تو کتنا اچھا ہو... اُس کے سامنے کھڑا ہوا کشتی کا خلاصی اگر سچ مچ اُس کا باپ ہی ہے تو اب اُسے زندہ نہیں رہنا چاہیئے، اُس نے اس بات کو اپنی گرہ میں باندھ لیا۔

"افلاطون ذرا اِدھر تو دیکھو، بے وقوفوں کی طرح بیٹھے کیوں ہو؟" امیر نے آواز دی تو وہ چونک پڑا لیکن اس سے زیادہ کشتی کا خلاصی چونک پڑا تھا کیونکہ اُس کے سامنے بیٹھا ہوا نوجوان بڑی دیر سے اسے گھُور گھُور کر دیکھ رہا تھا یہ بات خود اُس نے بھی محسوس کی تھی لیکن اب امیر کے مُنہ سے اُس کا نام سُن کر اُس کی آنکھوں میں بھی ایک عجیب سی چمک لہرانے لگی تھی اور اب وہ خود بھی افلاطون کو گھُور گھُور کر دیکھنے لگا تھا۔ جیسے جیسے وہ افلاطون کے چہرے کو غور سے دیکھتا گیا ویسے ویسے اس کے چہرے پر حیرت کی لکیریں سی ابھرنے لگیں۔

"قاسم۔" اچانک بوڑھے سبحان خان نے اُسے آواز دی اور کہا "ہم لوگ جہاز کو اندر سے دیکھ کر آتے ہیں تم کشتی کو اسی جگہ رکھنا۔"

"جو حکم جناب۔" قاسم کو جواب دینے میں کافی دیر لگی تھی اور افلاطون سے یہ بات پوشیدہ نہ رہ سکی، دونوں کی نگاہیں ایک دوسرے سے ٹکرائیں اور قاسم کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ سی ناچنے لگی مگر افلاطون نے جب اس کی مسکراہٹ کے جواب میں نفرت سے اپنے دانت پیسے تو قاسم نے اپنا مُنہ دوسری جانب پھیر لیا، پھر وہ جان بوجھ کر اپنی کشتی کے پتوار کو صاف کرنے میں مصروف ہو گیا، جھٹکے لگتے ہی کشتی پانی پر ڈولنے لگی افلاطون اپنا توازن برقرار رکھنے کی کوشش میں گرتے گرتے بچا تب امیر نے فوراً ہی اسے سنبھال لیا اور بولا "اے خلاصی کے بیٹے ہو کر پانی سے ڈر گئے؟"

خلاصی کا بیٹا؟ ان الفاظ نے ایک بار پھر قاسم کو چونکا دیا اور وہ گردن گھُما کر ان دونوں کی طرف دیکھنے لگا۔

"امیر۔" افلاطون کچھ اتنی زور سے بولا جیسے وہ قاسم کو بھی سنانا چاہتا ہو "جب میں بھی دریا یا سمندر کا پانی دیکھتا

ہوں تو مجھے اپنے ڈوب جانے والے باپ کی یاد آجاتی ہے۔"

اُس کے یہ دھار دار الفاظ قاسم کا دل چیر گئے ہیں اس بات کا یقین کرنے کے بعد افلاطون خوشی خوشی امیر کے پیچھے چلتا ہوا جہاز کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

"اب یہاں سے دیکھو پانی کیسا دکھائی دیتا ہے؟"

سُبحان خان نے امیر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر خوشی سے کہا "کنارے پر کھڑی ہوئی کشتیاں کھلونوں جیسی لگتی ہیں نا؟"

امیر حیرت بھری نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگا، اسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ موجوں کی اتنی زبردست اچھل کود میں بھی یہ عظیم الشان جہاز بے حس و حرکت کس طرح کھڑا رہ سکتا ہے؟ انگریزوں سے ہمیشہ نفرت کرنے والا امیر اس جہاز کو دیکھ کر ان کی عقلمندی کی تعریف کرنے لگا۔ اچانک ایک خیال تیزی سے اس کے ذہن میں جاگا کہ شاید انگریز لوگوں نے شیطان کو اپنے بس میں کر رکھا ہے اور اسی کی مدد سے یہ لوگ اتنے بڑے بڑے کام کر لیتے ہیں۔

"امیر میاں یہ جہاز مسافروں کے لیے نہیں ہے۔" یکا
سُبحان خان نے اُسے اور زیادہ حیرت میں ڈال دیا۔ "اس
کے نیچے تہہ خانہ ہے جس میں بڑی بڑی توپیں نصب ہیں
کنارے پر جا کر یہ توپیں اگر گولے برسا دیں تو دشمن کا پو
شہر جلا سکتی ہیں۔"

"اچھا!" امیر کی آنکھیں پھڑکنے لگیں اور وہ دل ہی
دل میں بڑبڑانے لگا، ایسی شیطانی طاقت کے آگے بھلا جیت
اور اس کے لشکر کی حیثیت ہی کیا ہے؟ چینو کتنے غلط خواب
میں کھویا ہوا ہے؟ وہ انگریزوں سے ملک چھین کر خود را
کرنا چاہتا ہے اور مجھے اپنا وزیر بنانا چاہتا تھا۔ یہ اچھا
ہوا کہ اس کا ساتھ چھوٹ گیا۔ نہیں تو اس کی طرح میں بھی جا
جنگل بھٹکتا ہوا خوار ہو جاتا۔

"امیر موٹی سی نلکی کو تو دیکھو!" افلاطون نے پہلی با
اپنی زبان کھولی۔ "اس کے اندر اگر آدمی کو ڈال دیا جا
تو وہ سیدھا سمندر کے پانی میں چلا جائے گا۔" یہ الفاظ کہ
وقت بھی اس کے خیالوں میں کشتی کا خلاصی ہی چھایا ہوا تھا

لیکن سبحان خان نے اس کی بات ہنسی میں اُڑاتے ہوئے کہا۔ "میاں یہ نلکی گہرے پانی میں نہیں جاتی ہے نیچے جا کر دیکھو گے تو پتا چلے گا۔" اتنا کہہ کر سبحان خان نے جہاز کے ایک خلاصی کو دو روپے دے کر نیچے جانے کا انتظام کر لیا تھا اور امیر اس کی اس حرکت پر سوچنے لگا تھا کہ آخر یہ اجنبی شخص ان کے لیے اپنی جیب کے پیسے کیوں خرچ کر رہا ہے؟ وہ کیوں انھیں یہ سب چیزیں دکھلا رہا ہے؟ اس کے پیچھے اس کا کیا مقصد ہو سکتا ہے؟ یہی سب باتیں سوچ کر وہ سبحان خان سے بولا۔ "جناب یہ دو روپے آپ مجھ سے لے لیجیے گا، ہماری خاطر آپ کیوں اپنا خرچ کر رہے ہیں؟"

"ارے مہمان آپ تو ابھی سے لین دین کی فکریں کرنے لگ گئے؟" سبحان خان مسکرایا۔ "ابھی تو ہماری پوری طرح جان پہچان بھی نہیں ہوئی ہے۔ یہ حساب کتاب بعد میں ہو جائے گا۔"

یہ سن کر امیر کو یقین ہو گیا کہ یہ شخص مطلبی ہی ہے، اس خیال آتے ہی اس نے اپنے دل میں یہ فیصلہ کر لیا کہ اسے ہر وقت ہوشیار رہنا ہو گا تاکہ اس کی کسی چال میں وہ پھنس نہ جائے۔ تھوڑی دیر بعد وہ افلاطون کے ساتھ سبحان خان کے پیچھے جہاز کے تہہ خانے میں اتر رہا تھا۔

● امیر نے بہت کوشش کی لیکن جہاز سے نکل کر کشتی کے ذریعہ کنارے تک پہنچ کر بھی وہ سبحان خان کے ارادے کو نہیں سمجھ سکا تھا۔ بندرگاہ سے باہر آنے کے بعد سوائے اس کے اور کوئی بات نہیں رہ گئی تھی کہ وہ ایک دوسرے سے رخصت ہو کر اپنی اپنی راہ چل پڑیں، اسی لیے امیر احسان مند نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ جان پہچان کے بغیر ہم جیسے پردیسیوں کو آپ نے اپنے خلوص اور محبت سے نوازا ہے۔"

"امیر میاں یہ مت کہو۔" سبحان خان نے برجستہ جواب دیا۔ "تمھاری آواز سنگیت کی طرح میٹھی ہے۔" اتنا کہہ کر وہ دھیمی آواز میں آگے بولا۔ "لیکن ہمیں اپنی جان پہچان کو مضبوط بنائے بغیر ایک دوسرے سے جدا نہیں ہونا ہے۔"

"کیا مطلب؟" امیر ایک بار پھر چونک پڑا۔ افلاطون نے تو پہلے ہی سے سبحان خان میں کوئی دلچسپی نہیں دکھائی تھی۔ اس کے دماغ پر تو ابھی تک کشتی کا خلاصی سوار تھا۔ سبحان خان امیر کا بازو تھام کر ایک جانب لے گیا اور رازدارانہ لہجے میں بولا۔ "سچ سچ بتانا امیر تم بھی وہی دھندہ کرتے ہو نا جس دھندے میں کبھی میں بھی رہ چکا ہوں؟"

اچانک امیر کی آنکھوں میں ایک چمک سی لہرا گئی۔ لیکن جواب دینے میں اسے دیر لگی تو سبحان خان نے ٹھگوں کے خفیہ اشارے میں اُس سے کہا۔ "علی خان بھائی سلام۔" یہ مخصوص اشارہ سمجھ کر امیر کا چہرہ سُرخ ہو گیا اور وہ پُرجوش لہجے میں بول اُٹھا۔ "وعلیکم سلام۔"

بس ان دو لفظوں کے تبادلے میں ہی ان کی جان پہچان پکی ہو گئی۔ بمبئی جیسے عظیم الشان شہر میں ایک ٹھگ بھائی کو مل جانا امیر کو کسی غیبی امداد سے کم نہیں لگ رہا تھا۔

"افلاطون یہ تو ہمارے ہی ذات بھائی نکلے۔" کہہ کر امیر نے دور کھڑے ہوئے افلاطون کو بھی اپنے ساتھ شامل کر لیا۔

"سبحان خان ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔" امیر نے اپنی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "آپ ہمیں پہچان کس طرح گئے؟ ہماری بات چیت سے تو کہیں بھی یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا۔"

"یہی تو بات ہے۔" سبحان خان اب کھلے دل سے کہہ رہا تھا۔ "میں روزانہ تم لوگوں کو اس جگہ بیٹھے ہوئے دیکھتا رہتا تھا۔ تم لوگ کہاں ٹھہرے ہوئے ہو یہ بات بھی میں پہلے سے جان چکا تھا۔ تم لوگ کسی کاروبار کے سلسلے میں آئے ہو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ اجنبی لوگوں سے بہت جلد گھل مل جانے کی تمھاری عادت سے بھی میں نے تمھیں پہچان لیا تھا۔"

"تب تو آپ بھی کم قابل نہیں ہیں۔" امیر ایک بار پھر اُسے اُوپر سے نیچے تک گھور کر بولا۔ "بمبئی میں رہ کر ہی شاید آپ اپنے اس دھندے کو آگے بڑھا رہے ہیں۔"

"نہیں میاں اس دھندے کو تو میں نے کافی عرصے سے چھوڑ دیا ہے۔" سبحان خان نے اپنی سفید داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "اب کافی عمر ہو چکی ہے پہلے جیسی طاقت اب نہیں رہی۔ اب تو ایک سیٹھ کے یہاں اچھی ملازمت کر رہا ہوں لیکن پھر بھی اپنے ذات بھائیوں کی مدد کرنے

سے نہیں چوکتا۔"

"تب تو ہمیں بھی ضرور آپ کی مدد ملے گی۔" امیر خوش ہو کر بولا۔ "پانچ چھ دن گزر چکے ہیں اور ہم لوگ تو گھبرانے لگے تھے۔ میرے ساتھ سوا سو آدمی ہیں۔"

امیر اپنے سوا سو ساتھیوں کے ساتھ بمبئی آیا ہے یہ جان کر سبحان خان کو بڑی حیرت ہوئی پھر وہ بولا۔ "ایک بات پوچھنے کو جی چاہتا ہے۔"

"ایک کیوں دو پوچھیے۔" امیر نے خلوص کا مظاہرہ کیا۔ "اب ہمارے درمیان کوئی پردہ نہیں رہا۔"

"اتنی کم عمری میں تم اتنے بڑے گروہ کے سردار بن گئے ہو یہ بات واقعی حیرت زدہ کر دینے والی بات ہے۔ میرا خیال ہے تمھارے والد بھی یہی دھندہ کرتے ہیں۔" سبحان خان نے کہا۔

"ہاں وہ بھی سردار تھے۔" امیر نے جواب دیا۔ "انھیں کی دعاؤں کا نتیجہ ہے کہ میں بھی اس اُونچے عہدے تک پہنچ سکا ہوں۔"

"کیا نام ہے ان کا؟"

"ابراہیم سردار۔"

ابراہیم سردار کا نام سنتے ہی سبحان خان کے چہرے کا رنگ اور اُس کی آواز بدل گئی۔ "تو تم ابراہیم سردار کے بیٹے ہو؟" اچانک سبحان خان اس سے لپٹ گیا۔ "میں اُن کے ہی گروہ میں رہ چکا ہوں۔ خدا کی قدرت بھی عجیب ہے کہ جس کے ساتھ لڑ جھگڑ کر میں نے ٹولی کو چھوڑ دیا تھا آج اُسی ٹولی کے سردار کے بیٹے سے یوں اچانک ملاقات ہو گئی۔" سبحان خان نے ہنستے ہنستے یہ بات کہی تھی مگر امیر پھر بھی بہت چوکنا ہو گیا تھا، اس لیے اس نے سنبھل کر پوچھ لیا۔ "لیکن اس کے باوجود آپ میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانا چاہتے ہیں؟ کیا یہ کچھ عجیب سی بات نہیں ہے؟"

امیر کے چہرے پر حیرت کے تاثرات دیکھ کر سبحان خان نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور کہنے لگا۔ "اپنی جوان عمر کے جھگڑوں کو آدمی اپنے بڑھاپے میں بھول جانا چاہتا ہے۔ اس وقت میری عمر تمھاری جتنی ہو گی اور تمھارا باپ بھی جوان تھا۔ ہم دونوں کے مزاج میں تیزی تھی۔ ایک دن ایک بات پر ہماری تکرار ہو گئی یہاں تک کہ ہم دونوں تلوار کھینچ کر ایک دوسرے کے سامنے تک آ گئے شاید بہت آگے بات چلی جاتی لیکن ابراہیم ٹولی کا سردار تھا، میں اگر اُس پر تلوار اٹھاتا تو ٹولی کے اور لوگ مجھے زندہ نہ چھوڑتے، اس خیال کے آتے ہی میں نے اپنے غصّے کو اپنے قابو میں رکھ لیا، میں نے تلوار کو نیام میں ڈال لیا اور پھر موقع ملتے ہی ٹولی چھوڑ کر بھاگ نکلا، ویسے تو میں ان کا احسان مند بھی ہوں۔"

"وہ کس طرح؟" امیر نے تجسس سے پوچھا۔

"آج میں جو کچھ بھی ہوں اُسی جھگڑے کا ہی نتیجہ ہے۔" سبحان خان نے کہا۔ "ٹولی سے نکل کر میں اندور چلا گیا جہاں مجھے ایک سیٹھ کے یہاں ملازمت مل گئی، پھر انھیں کے ساتھ بمبئی آنا پڑا اور دھیرے دھیرے میں نے یہاں کے لوگوں میں اپنا ایک مقام بنا لیا۔ تم تو دیکھ ہی رہے ہو کہ لوگ میری کتنی عزت کرتے ہیں۔" سبحان خان کی باتیں سُن کر امیر کو لگا کہ جیسے وہ جھوٹ نہیں بول رہا ہے جب اُسے سبحان خان کی سچائی پر یقین ہونے لگا تو اُس کے چہرے کی تنی ہوئی لکیریں خود بخود ڈھیلی ہوتی چلی گئیں۔ "نئے دھندے میں شامل ہو جانے کے باوجود آپ پُرانے دھندے والوں کا ساتھ دیتے رہتے ہیں؟" امیر نے اچانک ہی پوچھ لیا۔

"ہاں اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟" اب سبحان خان کی آواز جوشیلی ہو چلی تھی۔ "جو شخص ایک بار ٹھگ رہ چکا ہو وہ کبھی بھی مٹ نہیں سکتا کیا یہ بات مجھے تم جیسے سوا سو کی ٹولی کے سردار کو سمجھانی پڑے گی؟"

امیر کے چہرے سے یوں لگ رہا تھا جیسے یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آئی ہو لیکن سبحان خان بدستور بول رہا تھا۔ "ہر سال ٹھگوں کی ایک دو ٹولیاں یہاں آ کر ٹھہرا کرتی ہیں، پھر جس راستے سے انھیں واپس جانا ہوتا ہے اُس راستے کے شکاروں کے بارے میں انھیں معلومات فراہم کرتا ہوں کون سے راستے سے کون سا مسافر کتنی رقم لے کر جا رہا ہے۔ یہ ساری تفصیل میں ہی انھیں بتاتا ہوں اس طرح ان کا کام آسان ہو جاتا ہے۔"

"لیکن اس سے آپ کو کیا فائدہ ہوتا ہے؟"

امیر کا یہ سوال سُن کر سبحان خان کے چہرے کی شکنیں

گہری ہوگئیں مگر تھوڑی دیر بعد وہ بولا۔ "امیر علی تم بہت چالاک ہو تم تو ہر بات پکی کر لینا چاہتے ہو۔"

امیر اُس کا جواب سُن کر الجھن میں پڑ گیا اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ سبحان خان اس کی تعریف کر رہا ہے یا اُس پر طنز کر رہا ہے؟ لیکن اِس کے باوجود وہ مسکرا کر بولا۔ "اگر ہر بات پہلے سے صاف ہو جائے تو بعد میں کسی الجھن کا ڈر نہیں رہتا۔"

"شاباش۔" سبحان خان دونوں ہاتھ اُس کے کندھے پر رکھ کر خوشی سے بولا۔ "واقعی تمھاری دلیل قابل تعریف ہے۔ مگر مجھے تمھارے باپ کے ساتھ ہونے والے جھگڑے کو یاد رکھنے کی ضرورت نہیں ہے جوان۔ میں تو ان کی آج بھی عزت کرتا ہوں، اور میں تمھیں اس بات کا یقین بھی دلا دوں گا کہ ہمارے درمیان جو کام ہوگا وہ ایمانداری سے ہوگا۔"

"تو ٹھیک ہے مجھے منظور ہے۔" کہہ کر امیر اس سے رخصت ہونے کے ارادے سے بولا۔ "تو اب کب ملاقات ہوگی؟"

"ارے میں تمھیں اس طرح جانے تھوڑی دوں گا۔" سبحان خان نے محبت بھری آواز میں اسے ڈانٹا۔ "آج میرے گھر پر ہم تینوں ساتھ کھانا کھائیں گے۔"

یہ سُن کر امیر نے اچانک ہی افلاطون کی طرف دیکھا، لیکن افلاطون نے جب اُسے صاف انکار کر دینے کا اشارہ کیا تو امیر کو فوراً ہی بہانہ بناتے ہوئے کہنا پڑا۔ "آپ کی اس دعوت کا شکریہ مگر آج ذرا کچھ مشکل ہے آج میں نے اپنے تین ساتھیوں کو ملاقات کے لیے اپنے ٹھکانے پر بلایا ہے۔ میرا خیال ہے ہم کل یا پرسوں ضرور ساتھ کھانا کھائیں گے۔" سبحان خان نے بھی زیادہ ضد نہیں کی۔ "ٹھیک ہے تو پھر کل پر ہی رکھ لو میں سورج غروب ہوتے ہی اسی جگہ آجاؤں گا۔" اتنا کہنے کے بعد وہ "خدا حافظ" کہہ کر ان دونوں سے رخصت ہوگیا، جب وہ کافی دور نکل گیا تو امیر افلاطون سے بولا۔ "یار تم تو گونگے کی طرح چُپ چاپ سر جھکائے کھڑے ہی رہے۔ یوں تو تمھاری زبان ہر وقت چلتی رہتی ہے۔ اب تمھیں دوستی اور بھائی چارہ باندھنا بھی میں ہی سکھاؤں؟"

"مجھے یہ آدمی کچھ پسند نہیں آیا۔" افلاطون نے کہا۔

"مجھے بھی وہ کب اچھا لگا ہے؟" امیر صاف لہجے میں بولا۔ "وہ لالچی لگتا ہے لیکن اس کے باوجود کام کا آدمی ہے اس میں شک نہیں ہے۔ یار مجھے تو یوں لگ رہا ہے جیسے اتنے دنوں بعد ہمارا کوئی کام ہوا ہے اور تم ہو کہ الو کے اونٹ کی طرح مُنہ اٹھائے کھڑے ہو۔"

لیکن جواب میں جب افلاطون ذرا بھی نہیں ہنسا تو امیر غصّے سے اس کا بازو پکڑ لیا۔ "چلو اب سمندر کی ہوا کھا چکے اب چل کر بھوک مٹانی ہے۔ آج کی خوشی میں تمھیں کوئی خاص چیز کھلاؤں گا۔" مگر افلاطون نے ذرا بھی جنبش نہیں کی، اس کے چہرے پر اب بھی گہری سنجیدگی طاری تھی، کبھی کسی بات کا بُرا نہ ماننے والا افلاطون اس قدر سنجیدہ تھا کہ امیر کو اس پر حیرت ہو رہی تھی لیکن اُس نے کچھ کہنے کی بجائے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا پھر دھیرے سے بولا۔ "اب چلو بھی یار۔"

"نہیں امیر۔ جانے سے پہلے تم میرے ساتھ ایک بار پھر بندرگاہ کی طرف چلو۔"

"کیوں؟" امیر کے لہجے میں غصّے اور حیرت کے ملے جلے تاثرات تھے۔ "وہاں کون ہے تیرا؟"

"میرا باپ۔" افلاطون نے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر جواب دیا تو امیر کی آنکھیں ایک جھٹکے سے پھیل گئیں۔ پہلے تو اُسے لگا کہ افلاطون کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ لیکن افلاطون کی آنکھوں میں جو سُرخی دوڑ رہی تھی اسے دیکھ کر امیر نے ایک دوسرا جھٹکا لگا۔

"ہاں امیر ہم لوگ جسے مردہ سمجھ بیٹھے تھے۔" افلاطون کی آواز اب بہت ہی بدلی ہوئی تھی۔ "میری ماں جسے زندہ سمجھ کر زندگی بھر انتظار کرتی رہی وہی کمینہ باپ یہاں بہت میں چین کی زندگی بسر کر رہا ہے۔"

"تم نے اُسے کہاں دیکھا تھا؟" امیر نے پوچھا۔

"جس کی کشتی میں بیٹھ کر ہم لوگ جہاز دیکھنے گئے تھے اس کا نام قاسم تھا اس کے داہنے بازو پر لنگر کا نشان کھدا ہوا تھا اور ہاتھ کی ایک انگلی بھی کٹی ہوئی دکھائی دے

رہی تھی اور جب تم نے مجھے افلاطون کہہ کر پکارا تو وہ بُری طرح چونک پڑا تھا۔"

امیر مُنہ پھاڑے اس طرح افلاطون کو دیکھ رہا تھا جیسے اسے یقین ہی نہ آرہا ہو۔ اس نے کشتی کے خلاصی قاسم کا چہرہ یاد کرنے کی کوشش کی مگر اس وقت تو وہ جہاز دیکھنے میں اس قدر مشغول تھا کہ اس نے کسی دوسری جانب توجہ ہی نہیں دی تھی۔ تو کیا افلاطون کی بات سچی ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ اس کا وہم ہو؟ اُس نے ایک گہرا سانس لیا اور سوچنے لگا کہ اتنے برسوں کے بعد بیٹے کو اُس کا باپ نظر آئے تو خوش ہونے کے بجائے بیٹے کی آنکھوں میں نفرت کی چنگاریاں کیوں دکھائی دے رہی ہیں؟

"چلو افلاطون ہم سمندر کے کنارے جا کر اُس خلاصی کو ایک بار اور دیکھ لیں۔ تاکہ تمھارے دل کی تسلی ہو جائے۔"

امیر کی یہ بات سُن کر افلاطون اس طرح آگے آگے چل پڑا جیسے وہ اسی کا منتظر تھا۔ اس وقت دونوں دوست نہ سمجھ میں آنے والا بوجھ اٹھائے ایک دوسرے کے آگے پیچھے سمندر کے کنارے کی جانب بڑھتے چلے جا رہے تھے۔

امیر اور افلاطون بندرگاہ کے اندر داخل ہونے کی تکلیف سے بچ گئے کیونکہ جب وہ بندرگاہ کے بڑے پھاٹک تک پہنچے تو افلاطون کو کشتی کا خلاصی قاسم سامنے سے آتا ہوا دکھائی دیا، اُس نے قاسم کو دیکھتے ہی امیر کا بازو پکڑ کر اسے روک لیا اور بولا۔ "دیکھو امیر وہ سامنے سے چلا آرہا ہے، ہمیں اس پیڑ کی اوٹ میں چھپ جانا چاہیے۔" امیر کو پیڑ کے پیچھے چھپنے کی ضرورت تو محسوس نہیں ہو رہی تھی مگر اس نے انکار بھی نہیں کیا پھر وہ بھی چُپ چاپ افلاطون کے پیچھے ایک موٹے سے پیڑ کی اوٹ میں سرک گیا۔

"ارے اس کے ساتھ تو کوئی لڑکا بھی ہے۔" افلاطون نے دھیمی آواز میں کہا۔

"تم ذرا چُپ تو رہو۔" امیر نے اس کا کندھا دبایا۔

قاسم نزدیک آتا جا رہا تھا اور امیر غروب ہوتے ہوئے سورج کی پھیکی روشنی میں گھور گھور کر اس کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کرنے لگا، اس وقت وہ اس بات کو بھول گیا تھا کہ افلاطون کے باپ کو اُس نے تو پہلے کبھی دیکھا ہی نہیں ہے پھر اس طرح گھور گھور کر دیکھنے سے وہ کیسے یقین کر سکتا تھا کہ یہی شخص افلاطون کا باپ ہے؟

جب قاسم اور زیادہ قریب آگیا تو امیر اور افلاطون کو یہ اندازہ لگانے میں دیر نہ لگی کہ اس کی انگلی پکڑ کر چلنے والے لڑکے کی عمر پانچ چھ سال سے زیادہ نہیں ہے اس کی صورت شکل قاسم سے بہت زیادہ ملتی جُلتی دکھائی دے رہی تھی۔ کسی مجرم کو پکڑنے والے جاسوسوں کی طرح دونوں دوست سانس روکے پیڑ کے پیچھے کھڑے تھے۔ پیڑ کے قریب سے گزرتے وقت قاسم کی آواز ان کی سماعت سے ٹکرائی وہ لڑکے سے کہہ رہا تھا۔ "بیٹے اب آئندہ کبھی اپنی بیمار ماں کو گھر پر اکیلا چھوڑ کر بندرگاہ پر مت آنا۔"

لڑکے نے اپنی باریک اور دھیمی آواز میں کوئی جواب تو دیا تھا لیکن اس کا جواب ان لوگوں کی سمجھ میں نہیں آسکا کہ اُس نے قاسم سے کیا کہا تھا؟

"تو گویا اس کی بیوی اور بچہ بھی ہے۔" افلاطون دانت پیس کر غصّے سے بولا۔ "اسی لیے یہ ہمیں بھول گیا ہے۔" یہ کہتے کہتے افلاطون قاسم کے پیچھے جانے کے لیے آگے بڑھا لیکن امیر نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا۔ "بے وقوفی مت کرو افلاطون ہمیں اس اجنبی ملک میں کوئی حماقت نہیں کرنی ہے۔"

"مگر میں اپنا اطمینان کیے بغیر اسے چھوڑنے والا نہیں ہوں، میں تم سے یہ بات کہہ دیتا ہوں۔" افلاطون اور زیادہ بھنا گیا۔

"اس کے لیے میں تمھیں منع نہیں کروں گا۔" امیر اسے ٹھنڈا کرتے ہوئے بولا۔ "میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ تمھارے اس وہم کو دور کیے بغیر ہم بمبئی نہیں چھوڑیں گے بس۔"

لیکن اس کے باوجود افلاطون سے صبر نہیں ہوا۔ "اچھی بات ہے لیکن اس وقت تو ہمیں اس کا پیچھا کرنا ہی ہے۔"

"لیکن کیوں؟"

"یہ جان لینا اچھا ہے کہ وہ کہاں رہتا ہے؟" یہ کہہ کر افلاطون نے امیر کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے کھینچا۔ "میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں کوئی ایسی ویسی حرکت نہیں کروں گا۔"

"تو چلو۔" امیر نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور قاسم کا پیچھا کرنے کے لیے اُس کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ قاسم اور وہ لڑکا شاید دونوں ہی کچھ جلدی میں دکھائی دے رہے تھے اس لیے باتیں کرتے ہوئے وہ پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ قلعے کے باہر سمندر کے کنارے مچھیروں کی بستی تک پہنچ کر امیر نے افلاطون کو روک لیا اور بولا۔ "شاید یہ اسی جگہ کسی جھونپڑے میں رہتا ہو گا، جب ضرورت پڑے گی تو کسی سے پوچھ کر اس کے گھر پہنچ جائیں گے۔"

افلاطون کھڑا تو رہ گیا لیکن اس کی نگاہیں اب بھی قاسم پر جمی ہوئی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد قاسم اور وہ لڑکا بستی میں داخل ہو کر نظروں سے اوجھل ہو گئے لیکن اس کے باوجود افلاطون کی آنکھیں نہ جانے کب تک اسی سمت گھورتی رہیں۔

"امیر۔" اچانک اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ "کشتی میں اُس نے مجھے پہچان لیا تھا لیکن اس کے باوجود مجھ سے نظریں نہیں ملا رہا تھا۔ اُس کی اس حرکت سے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ انسان کے اندر کا شیطان کبھی بھی اُس کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ شاید اس نے یہی سمجھا ہو گا کہ اب آئندہ کبھی مجھ سے ملاقات نہیں ہو گی، لیکن اب بدلہ لیے بغیر میں اسے چھوڑ دوں تو میرا نام افلاطون نہیں۔" ٹھیک اسی وقت لال سورج دوسری صبح کو نکلنے کا وعدہ کر کے سمندر کے پانی میں ڈوب گیا۔

روزانہ رات کو گھوڑے بیچ کر سونے والے افلاطون نے یہ رات بڑی بے چینی میں گزاری تھی۔ اُسے اس بات کا پورا یقین ہو چکا تھا کہ کشتی کا وہ خلاصی قاسم یقیناً اس کا باپ ہی ہے۔ اُس نے بمبئی میں دوسری شادی کر رکھی ہے اور اب بیٹے کا باپ بھی بن چکا ہے۔ یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ دوسری بیوی سے اُس کے کتنے بچے ہوں گے؟ وہ سوچ رہا تھا کہ ایک ٹھگ بن کر امیر کے ساتھ بمبئی آنے میں ضرور خدا کی کوئی مصلحت پوشیدہ ہو گی۔ شاید گلے میں پھندہ ڈال کر خودکشی کر لینے والی ماں کا بدلہ لینے کے لیے اُسے قاسم کی گردن پر اپنے رومال کا پھندہ ڈالنا ہی ہو گا۔ وہ اب امیر سے صاف صاف کہہ دینے کی سوچ رہا تھا کہ تم میرے ارادے میں یا تو میرا ساتھ دو یا چپ چاپ پیچھے ہٹ جاؤ اور مجھے اپنے طور پر اس معاملے سے نپٹ لینے دو۔ اس نے دل ہی دل میں ایک منصوبہ بنا لیا تھا۔ اور وہ منصوبہ یہ تھا کہ وہ قاسم کی کشتی میں بیٹھ کر سمندر کی سیر کے لیے جائے گا اور اُس سے کہے گا کہ وہ اُسے دُور تک لے جائے۔ وہ جی بھر کر سیر کرے گا تو بخشش سے قاسم کی جیب بھر دے گا۔ بخشش کے لالچ میں قاسم اسے انگلستان کے بادشاہ کے جہاز سے بھی دُور لے جائے گا۔ جہاں کوئی بھی انھیں دیکھنے والا نہیں ہو گا اور نہ ہی کوئی درمیان میں ٹپکے گا۔ اسی جگہ پہنچ جانے کے بعد وہ قاسم سے پوچھے گا۔ "تم پانی کے سفر میں کتنی دُور تک گئے ہو؟ کبھی کسی جہاز میں پردیس کا بھی سفر کیا ہے تم نے؟"

جواب میں وہ کہے گا۔ "میں نے بہت سفر کیا ہے کئی ملکوں کی بندرگاہیں دیکھی ہیں۔" اس کا جواب سُن کر وہ پوچھے گا۔ "کبھی ایران دیکھنے کا موقع بھی ملا ہے؟"

ایران کا نام سُن کر وہ ذرا بوکھلا جائے گا لیکن اُسے جواب تو دینا ہی ہو گا کہ ہاں اس نے ایران بھی دیکھا ہے، اس جواب کے بعد وہ سیدھا سوال پوچھے گا۔ "تمھیں معلوم ہے ہندوستان میں ایک گاؤں ہے جس کا نام مُرنائی ہے؟"

اور وہ چونک پڑے گا پھر اس کے رونگٹے رونگٹے میں کپکپاہٹ طاری ہو جائے گی اور وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُسے گھورنے لگے گا پھر بات کو ٹالنے کے ارادے سے زور زور سے چپو چلا کر کشتی کو کنارے کی جانب لے جانے کی کوشش کرے گا۔ لیکن وہ اُسے ایسا نہیں کرنے دے گا بلکہ دانت پیس کر کہے گا۔ "اب اُس کنارے تک تم کبھی بھی نہیں پہنچ سکو گے، اب تمھاری زندگی کا دوسرا کنارا آ چکا ہے میرے ظالم باپ۔"

باپ کا لفظ سن کر وہ احمقوں کی طرح اس کا چہرہ تکنے لگے گا پھر شاید چپو اٹھا کر اُسے مارنے کے لیے لپکے۔ لیکن تب تک تو اُس کے گلے میں اُس کا یا امیر کا رومال پھنس چکا ہو گا۔ رومال

کا پھندہ تنگ ہوتے ہی وہ دوہرا ہو جائے گا اور اُس کا دم گھٹنے لگے گا، پھر تھوڑی دیر تڑپنے کے بعد آخر کار اُس کی لاش اُس کے بیٹے کے قدموں پر گر کر ٹھنڈی ہو جائے گی... بس پھر اُس کی لاش کو تو سمندر کی لہروں ہی کے حوالے کر دینے کی دیر ہو گی۔ برسوں پہلے جس نے یہ افواہ پھیلائی تھی کہ وہ دریا میں ڈوب کر مر چکا ہے اب سچ مچ ہی وہ بمبئی کے سمندر میں ڈوبے گا۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ اتنے اطمینان سے کنارے پر واپس آ جائے گا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

لیکن افلاطون کے خیالات کا سلسلہ اچانک ہی ٹوٹ گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ وہ کنارے کیسے واپس آئے گا؟ کشتی چلانا کسے آتا ہے؟ کیا خبر ہوا کا رُخ کدھر ہو اور کشتی کس طرف ہو؟ لیکن اگر یہ مرحلہ بھی خوش اسلوبی سے طے ہو گیا مگر کنارے پہنچ جانے کے بعد دوسرے خلاصیوں نے ان کے ساتھ قاسم کو نہ دیکھا تو ضرور شک میں پڑ جائیں گے اس طرح تو وہ اور امیر مصیبت میں گرفتار ہو سکتے ہیں۔

"تو کیا کرنا چاہیے۔" افلاطون نے دل ہی دل میں سوچا اور سر کھجاتے ہوئے بستر پر بیٹھ گیا اور اپنے قریب لیٹے ہوئے امیر کو ہلاتے ہوئے بولا۔ "ارے یار ذرا اٹھو تو سہی۔"

"کیا بات ہے؟" امیر نے آنکھیں کھولے بغیر پوچھا اور کروٹ دوسری جانب بدل لی۔ "ابھی صبح کہاں ہوئی ہے؟"

"ایک خیال میرے ذہن میں آیا ہے۔" افلاطون نے پھر اس کا کندھا ہلایا اور آگے بولا۔ "مجھے تمھارے مشورے کی ضرورت ہے۔"

"بولو کیا بات ہے؟" امیر نے آنکھیں کھولے بغیر کہا۔

"قاسم کی موت کا علاج میری سمجھ میں آ گیا ہے۔"

"ہوں۔" امیر چونک کر بیٹھ گیا۔ "اس وقت تم یہ بات کیوں سوچنے لگے ہو؟"

"یہ کام انجام دیئے بغیر مجھے چین نہیں پڑے گا امیر۔ تم پہلے میری ترکیب تو سُن لو۔" افلاطون نے کہا۔

"بتاؤ۔" امیر جماہی لے کر بولا تو افلاطون نے اپنی سوچی ہوئی ترکیب اُسے بتانی شروع کی۔ "سمندر میں بہت دُور نکل جانے کے بعد ہم قاسم کی گردن میں رومال ڈال دیں گے۔ پھر اس کی لاش کو ہم پانی میں ڈبو دیں گے اور پھر ہم کنارے پر واپس آ جائیں گے لیکن اس کا کیا علاج کہ ہمیں چپو چلانا نہیں آتا ہے؟"

لیکن امیر کی اس ترکیب پر خوش ہونے کے بجائے بھنا کر رہ گیا۔ "تم سے میں نے یہ کتنی بار کہا ہے کہ یہ کام تم مجھ پر چھوڑ دو۔" تھوڑی دیر بعد امیر نے کہا۔ "پہلے تو ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ وہ واقعی تمھارا باپ ہے یا نہیں؟ اور دوسری بات کہ کشتی میں بھلا کسی کی گردن میں رومال کس طرح ڈالا جا سکتا ہے؟ اس زور آزمائی میں اگر کشتی اُلٹ گئی تو قاسم کی بجائے ہم دونوں ڈوب کر ہلاک ہو جائیں گے۔"

یہ سُن کر افلاطون پھر اپنا سر کھجانے لگا تب امیر اس کا کان مسلتے ہوئے بولا۔ "غصّے سے تمھارا دماغ سڑ گیا ہے اب چُپ چاپ سو جاؤ۔ سارا کام خود بخود ٹھیک سے ہو جائے گا۔"

افلاطون کو یہ جان کر غصّہ آ گیا کہ امیر ہر حالت میں اُس کی بات ٹالنے پر اڑا ہوا ہے۔ مگر اس کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ ہی نہ تھا کہ وہ گہرا سانس لے کر چُپ چاپ سو جائے۔ اسے ڈر صرف ایک ہی بات کا تھا کہ اگر قاسم نے اُسے پہچان لیا ہے تو یقیناً وہ چند دنوں کے لیے کہیں غائب ہو جائے گا اور اگر وہ واقعی غائب ہو گیا تو اس کو تلاش کرنا آسان نہیں ہو گا۔

ٹھنڈے پہر امیر، افلاطون اور پیر خان سمندر کے کنارے آ کر بیٹھ گئے اور سبحان خان کا انتظار کرنے لگے۔ امیر جان بوجھ کر پیر خان کو ساتھ لے آیا تھا کیونکہ سبحان کا نام سُن کر پیر خان نے اُسے فوراً ہی پہچان لیا تھا اور اُس نے امیر سے کہا تھا۔ "وہ تو ہماری ہی ٹولی میں تھا اور اب بمبئی میں رہ کر عیش کر رہا ہے کیا؟"

"پیر خان اُس کا کہنا ہے کہ ابا جان سے جھگڑ کر وہ ٹولی سے الگ ہو گیا تھا۔ لیکن مجھے بدری ناتھ نے جس آدمی کے بارے میں بتایا تھا اُس کا نام تو کچھ اور ہی تھا۔" امیر نے کہا۔

پیر خان سوچ میں پڑ گیا، اسے یہ یاد نہیں آ رہا تھا کہ سبحان خان کے علاوہ اور کون سرکش ٹھگ ایسا تھا جو ابراہیم سے لڑ جھگڑ کر ٹولی سے نکل گیا ہو؟

"ہاں یاد آ گیا۔" اچانک امیر نے کہا۔ "اُس کا نام شاید

رمیش یا گنیش جیسا ...“

گنیش کا نام سنتے ہی پیر خان کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور اُس کی آنکھیں جلدی جلدی کھلنے اور بند ہونے لگیں۔

”امیر میاں یہ گنیش بے حد خطرناک اور بھیانک قسم کا آدمی ہے جس سفر میں تمھارے والد کے ساتھ اُس کا جھگڑا ہوا تھا اُس سفر میں میں شریک نہیں تھا، لیکن بعد میں مجھے ساری بات معلوم ہوگئی وہ جھگڑا اس قدر بڑھ گیا کہ تمھارے والد کو ہی سفر ادھورا چھوڑ کر لوٹ آنا پڑا تھا۔“

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ انھیں سبحان خان آتا ہوا دکھائی دیا۔ اُس پر نظر پڑتے ہی پیر خان نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔ اچانک پیر خان اُسے دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا اور سبحان خان سے لپٹ کر بولا ”ارے یار کتنے دنوں بعد ملے ہیں ہم لوگ۔“

”ارے پیر خان تم ؟“ سبحان خان کے لیے یہ ملاقات بالکل ہی غیر متوقع تھی۔ ”مجھے تو امیر نے بتایا ہی نہیں کہ تم بھی ساتھ ہو۔“

”میں تو تمھارا نام سن کر ہی دوڑا آیا ہوں۔“ پیر خان کی بات سن کر امیر نے محسوس کیا کہ پیر خان شاید اُوپری دل سے ہی اپنی خوشی کا اظہار کر رہا ہے پیر خان نے آگے کہا ”سبحان خان میں تو بغیر دعوت کے ہی تمھارے گھر کھانا کھاتے آؤں گا۔“

”یار اب تو اور بھی مزہ آئے گا۔“ سبحان خان امیر کی جانب دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”دکھن اور گجرات کے ٹھگ بھائیوں کو بھی میں نے مدعو کیا ہے اس لیے جگہ جگہ کی باتیں ہوں گی اور طرح طرح کے تجربات سننے کا موقع ملے گا۔“

”ارے یار بمبئی کے یہ آٹھ دن کسی صحبت کے بغیر بڑے ہی بھاری گزرے ہیں۔“ پیر خان اب رنگ میں آکر بول رہا تھا۔ ”ہمارے امیر میاں کی بہادری کے قصے سن کر یہ دکھن اور گجرات والے ٹھگ حیرت سے منہ میں انگلیاں دبالیں گے۔“

امیر اپنی تعریف سے شرما گیا اور اس نے گفتگو کا موضوع بدلنے کی غرض سے سبحان خان سے کہا ”کیا ہمارے لیے شکار کا کوئی پروگرام بنا ہے ؟“

یہ سن کر سبحان خان ہنس پڑا اور ہنسی ہنسی میں وہ اُس کے سوال کا جواب گول کرتے ہوئے بولا ”اس وقت ہمیں اپنے دھندے کی بات ایک طرف رکھ دینی چاہیے اب چلو گھر چلیں وہاں سب لوگ ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔“ امیر سمجھ گیا کہ سبحان خان اُس کے سوال کا جواب نہ دے کر اپنی اہمیت بڑھانا چاہتا ہے۔ اِس لیے جلد بازی سے کی ہوئی اپنی بھول کو اُس نے درست کرنے کی کوشش میں کہا ”ہمارا اِس افلاطون کو بمبئی بہت پسند آگیا ہے اس لیے ہمیں چار چھ دن تو یوں بھی رُکنا ہی پڑے گا اور اُس وقت تک پیر خان بھی ایک دو بہترین شکار ڈھونڈ لائے گا۔“ اتنا کہہ کر وہ سبحان خان کے ساتھ چل پڑا، لیکن دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ جیب کی رقم اب آہستہ آہستہ ختم ہونے لگی ہے اور اگر جلد ہی کوئی شکار نہیں ملا تو شاید سبحان خان کا مقروض ہونا پڑے گا۔

صبح کے وقت جب افلاطون نے امیر کو جگایا تو اُس کو بھی اس کے دماغ پر رات کی دعوت کا خمار چھایا ہوا تھا۔ سبحان خان نے ان سب کی جو خاطر مدارات کی تھی وہ یقیناً قابلِ داد تھی، دکھن گجرات کے ٹھگوں کی صحبت بھی یادگار ثابت ہوئی تھی، اُس محفل میں پیر خان نے چونکہ امیر کی بہادری کی کہانی ان لوگوں کو سنائی تھیں اس لیے اُس کی عزت تو اور زیادہ بڑھ گئی تھی، اس گفتگو کے دوران دوسرے ٹھگوں نے جو سبحان خان پر اپنے اطمینان کا اظہار کیا تھا۔ اس لیے امیر کو اس پر بھروسا ہونے لگا تھا۔ دعوت سے رخصت ہوتے وقت سبحان خان نے اُس سے پکا وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کے لیے ضرور کوئی تگڑا شکار تلاش کر کے اُس کی نشاندہی کرے گا۔ امیر اس وقت اسی شکار کے خواب دیکھ رہا تھا کہ افلاطون نے اسے جگا دیا ویسے افلاطون نے اُسے رات ہی کو بتا دیا تھا کہ صبح اٹھتے ہی ہمیں اُس قاسم کو تلاش کرنا ہے۔ امیر کو چونکہ بہت زور کی نیند آرہی تھی اس لیے اُس نے بلا سوچے سمجھے ہی حامی بھر لی تھی۔

”میں نماز پڑھ لوں اُس وقت تک تم نہیں اٹھے تو میں پانی کا لوٹا تمھارے سر پہ انڈیل دوں گا۔“ افلاطون نے اسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا تو امیر جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا

دراصل وہ خود بھی افلاطون کے دماغ سے اس وہم کو نکال دینا چاہتا تھا۔ سبحان خان کسی وقت بھی یہ اطلاع آکر دے سکتا ہے کہ کل فلاں شکار کا قافلہ روانہ ہونے والا ہے۔ اس اطلاع کے فوراً بعد انھیں بھی بمبئی سے اپنا پڑاؤ اٹھا دینا پڑے گا۔ امیر کا اب بھی یہی خیال تھا کہ قاسم افلاطون کا باپ نہیں ہے۔ یہ درست ہے کہ اُس کی شکل صورت نام اور پیشہ سب ہی کچھ افلاطون کے باپ سے مشابہت رکھتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ سینکڑوں کاؤں دُور رہنے والا یہی آدمی افلاطون کا باپ ہو، ان ساری باتوں کو سوچنے کے بعد اس نے افلاطون سے کہا ”دیکھو میں تمھارے ساتھ چل تو رہا ہوں لیکن ایک شرط ہے۔“

افلاطون کو امیر کی یہ بات پسند نہیں آئی وہ ذرا ناراض لہجے میں بولا ”تمھارے ساتھ یہاں تک آنے میں کیا میں نے کوئی شرط رکھی تھی ؟“

اس کی بات کسی حد تک درست تھی اس لیے امیر کو اپنے مطلب کی بات الفاظ بدل کر کہنا پڑی ”میری مُراد کسی شرط سے نہیں تھی بلکہ تمھیں ایک سمجھوتہ کرنا پڑے گا۔“

”بولو۔“

”وہ تمھارا باپ ہی ہے اس کا اطمینان میں خود کروں گا۔“ امیر نے کہا ”اس کے بعد کیا کرنا ہوگا اس کا فیصلہ ہم دونوں کریں گے۔“

”مگر مجھے تو پورا یقین ہے اور میں نے فیصلہ بھی کر رکھا ہے۔“ افلاطون نے جواب دیا۔ یہ بات افلاطون نے اتنے اعتماد سے کہی تھی کہ امیر کو فوراً خاموش رہ جانا پڑا پھر تھوڑی دیر بعد وہ بولا ”تو ٹھیک ہے چلو آج تمھاری تسلی ہو جائے گی۔“ مسافر خانے سے باہر نکلتے وقت افلاطون نے امیر کو یاد دہانی کرادی کہ وہ اپنا رومال اپنے ساتھ لے لے۔

”اچھی بات ہے۔“ امیر ایک فرمانبردار دوست کی طرح بولا ویسے اس کا جی تو چاہا کہ وہ افلاطون کو بتا دے کہ جب تک میں تمھیں اشارہ نہ کروں اس وقت تک تم اپنا رومال استعمال نہیں کر سکتے کیونکہ یہ ہمارے دھندے کا قانون ہے کہ اپنے سردار کے اشارے کے بغیر کوئی ٹھگ اپنے رومال کا استعمال نہیں کر سکتا لیکن افلاطون کسی اور ہی خیال میں کھویا ہوا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر ضرورت پڑی تو وہ امیر کی تلوار سے ہی قاسم کی گردن اُڑا دے گا۔

سبحان خان کی جان پہچان اور بخشش کے زور سے ان دونوں کو بندرگاہ کے اندر داخل ہونے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ افلاطون کی متلاشی نظریں ایک ایک کشتی والے خلاصی کو گھور رہی تھیں، لیکن جب ان خلاصیوں میں اُسے قاسم نظر نہیں آیا تو اُس کے چہرے پر ناامیدی کے سائے لہرانے لگے۔ اپنے دل کو تسلی دینے کے لیے وہ سوچنے لگا کہ وہ شاید جہاز کا پھیرا لگانے گیا ہوگا اور تھوڑی دیر میں واپس آجائے گا۔ وہ اُس کی تلاش میں سمندر کے پانی پر دُور دُور تک نظریں دوڑا رہا تھا۔

لیکن جب امیر نے پوچھ گچھ کی تو اسے پتا چلا کہ قاسم دو دن سے کام پر نہیں آرہا ہے۔ یہ بات جب افلاطون کو معلوم ہوئی تو وہ ناک مُنہ پھُلا کر بولا ”مجھے تو پہلے ہی سے شک تھا کہ وہ ضرور بھاگ جائے گا۔“

”چُپ رہو۔“ امیر نے اُسے ڈانٹ دیا پھر آنکھ کے اشارے سے اُسے سمجھانے کی کوشش کی کہ دوسروں کی موجودگی میں اُسے ذرا احتیاط سے کام لینا چاہیے۔

”آپ لوگ قاسم کو کیوں ڈھونڈ رہے ہیں ؟“ ایک چوکیدار نے افلاطون کی بات سُن کر کہا ”اس کے بھاگ جانے کی کیا وجہ ہے ؟“

”نہیں بھائی کوئی خاص بات نہیں ہے۔“ امیر نے ہوشیاری سے بات بدلنے کی کوشش کی ”دو دن قبل ہم اس کی کشتی میں بیٹھ کر انگلستان کے راجا کا جہاز دیکھنے گئے تھے اس وقت ہمارا بٹوہ شاید کشتی میں گر گیا تھا۔ بس اسی لیے اس کو ڈھونڈ رہے ہیں کہ شاید اسے بٹوے کے بارے میں کچھ معلوم ہو۔“

چوکیدار کو لگا کہ یہ تو اس کے مطلب کی بات ہے اس لیے وہ پہلے سے زیادہ دلچسپی لیتے ہوئے پوچھ گچھ کرنے لگا تب امیر کو مجبوراً اُسے ٹالنے کی کوشش میں کہنا پڑا ”بھائی ہم اس کی کوئی شکایت کرنے نہیں آئے ہیں۔ بٹوے میں دس پندرہ روپے سے زیادہ رقم نہیں تھی اور وہ بٹوہ کشتی میں ہی گرا ہے اس لیے بھی ہمیں یقین نہیں ہے ہم تو بس یونہی ...“

دس پندرہ روپے کی رقم تو اس چوکیدار کی مہینے بھر کی تنخواہ تھی۔ جیسے معمولی کہنے والا پردیسی امیر اُسے کچھ عجیب سا لگنے لگا تھا۔ اُسے بڑی حسرت سے اپنی جانب تاکتے دیکھ کر امیر نے اپنی جیب سے ایک روپیا نکال کر اُس کے ہاتھ پر رکھ دیا

"خدا کرے آپ کا کھویا ہوا بٹوہ مل جائے۔" ایک روپے کا چمکتا ہوا سکہ دیکھ کر چوکیدار نے دعا دی پھر آگے بولا "ویسے قاسم بے ایمان آدمی نہیں ہے وہ بہت ہی نیک اور ایماندار ہے۔"

یہ سُن کر افلاطون نے اپنے دانت اس طرح پیسے جیسے اس کے آخری الفاظ نے اس کا دل چھید دیا ہو۔ وہ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں بڑبڑایا "ایسے نیک اور ایماندار آدمی کو ہم ایمانداری سے اُوپر پہنچا دینے کے لیے آئے ہیں۔"

امیر نے اُس کی یہ بڑبڑاہٹ سُن لی تھی۔ لیکن وہ خاموش ہی رہا۔ افلاطون کا یہ غصہ اور یہ جوش اُسے بہت خطرناک لگ رہا تھا۔ افلاطون کا چہرہ دیکھتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ کیا کسی شخص کو اپنے باپ سے اس قدر نفرت بھی ہو سکتی ہے؟ یا پھر کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ قاسم چونکہ افلاطون کا سگا باپ نہیں تھا اس کی وجہ سے افلاطون اُس کو محبت نہیں تھی اور محبت کی یہی کمی افلاطون کی نفرت کا سبب بن گئی ہو؟ تھوڑی دیر تک وہ ان باتوں کو سوچتا رہا پھر یہ بات اس کی زبان پر آ ہی گئی اور اُس نے افلاطون سے کہا "سچ سچ بتانا افلاطون اپنے باپ سے اتنے برسوں کے بعد ملنے کے باوجود تمھارے دل میں اس کی محبت پیدا نہیں ہوئی؟ یہ جان کر کہ وہ تمھیں ذرا بھی خوشی نہیں ہوئی کہ وہ ابھی تک زندہ ہے؟"

"اس میں خوش ہونے کی بات ہی کیا ہے؟" افلاطون بدستور ناراض لہجے میں بولا "امیر اگر میں اس کا سگا بیٹا ہوتا تو بھی اُسے معاف نہ کرتا۔"

امیر کو پھر چپ ہو جانا پڑا۔ اب اس کی چال بھی دھیمی ہو چکی تھی۔

"جلدی جلدی چلو۔" افلاطون نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ "ہم اُسے اُس کے گھر پر ہی اُسے پکڑ لیں گے۔"

لیکن امیر کے قدم تو وہیں جم گئے تھے اور اس نے افلاطون کو گھورتے ہوئے پوچھا "تو کیا تم اُس کے گھر میں جا کر تماشا کرنا چاہتے ہو؟ اُس کے بیوی بچوں کے سامنے؟"

"نہیں میں اُسے گھر سے باہر لا کر ختم کروں گا۔" افلاطون نے سخت مگر دھیمے لہجے میں کہا "مجھے میری ماں کی قسم ہے کہ جب تک پورا یقین نہیں ہو جائے گا اُس وقت تک میں اُس پر ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا۔" اتنا کہہ کر اُس نے آگے بڑھنے کے لیے پھر امیر کا ہاتھ کھینچا تو مجبوراً امیر کو بھی اپنے قدم اٹھانے پڑے، وہ دل ہی دل میں خدا سے دعا مانگ رہا تھا کہ اے پروردگار کاش یہ قاسم افلاطون کا باپ نہ نکلے نہیں تو ایک ماں کا بدلا لینے پر دوسری ماں بیوہ ہو جائے گی۔

جھونپڑوں کی بستی کے اردگرد وہ دونوں آدھے پون گھنٹے تک چکر لگاتے رہے لیکن جب افلاطون کو قاسم کہیں دکھائی نہیں دیا تو اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور وہ امیر سے بولا "اس طرح اُسے ڈھونڈنے سے بہتر تو یہی ہے کہ ہم کسی سے پوچھ کر اس کے گھر پہنچ جائیں۔ آخر اس میں تمھیں کیا اعتراض ہے؟"

"ہم ایسا کرتے ہیں۔" افلاطون کے غصے کو قابو میں کرنے کے لیے امیر نے ایک اور ترکیب آزمائی "کہ پہلے کسی سے پوچھ لیتے ہیں کہ قاسم اپنے گھر میں موجود ہے یا نہیں؟"

"جو کرنا ہے جلدی کرو۔" کہہ کر افلاطون آگے بڑھ گیا بستی کی گلی میں داخل ہوتے ہی انھیں کئی ننگ دھڑنگ بچے گلی میں کھیلتے ہوئے دکھائی دیئے، پھر اس سے پہلے کہ امیر ان سے کچھ پوچھتا خود افلاطون نے ہی ایک لڑکے سے پوچھ لیا "کیا تم بتا سکتے ہو کہ یہاں قاسم خلاصی کس گھر میں رہتا ہے؟"

آدھے ننگ دھڑنگ بچے اپنے سامنے دو رئیس قسم کے آدمیوں کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے تھے ان میں سے ایک لڑکے نے آگے بڑھ کر کہا "چلئے میں آپ کو اپنا گھر دکھاتا ہوں۔" اتنا کہہ کر جب وہ لڑکا افلاطون کی انگلی پکڑنے اس کے قریب آیا تو افلاطون نے اُسے پہچان لیا۔ یہ وہی لڑکا تھا جسے پرسوں افلاطون نے قاسم کے ساتھ دیکھا تھا۔

"میری انگلی پکڑے بغیر آگے آگے چلو۔" افلاطون نے ناگوار لہجے میں اُس سے کہا مگر امیر نے آگے بڑھ کر اس لڑکے کا ہاتھ تھام لیا اور مسکراتے ہوئے بولا "چلو اپنا گھر دکھاؤ تمھارے ابا جان

تو گھر میں ہیں نا؟"

"ہاں... ہاں۔" کہہ کر اُس لڑکے نے دوڑ لگا دی۔ شاید ان رئیس لوگوں کی آمد پر اُسے خوشی محسوس ہوئی تھی۔

بستی کے غریب لوگ بڑی حیرت سے ان دونوں کو دیکھ رہے تھے اور وہ دونوں ان کی حیرت بھری نظروں کی پروا کیے بغیر قاسم کے گھر تک پہنچ گئے۔ قاسم اپنے جھونپڑے کے دروازے پر ہی کھڑا تھا۔ افلاطون اور امیر کو اپنے گھر کے دروازے پر کھڑا دیکھ کر وہ اس قدر بوکھلا گیا تھا کہ انھیں خوش آمدید کہنے کے لیے بھی بھول گیا۔ افلاطون کترائی ہوئی نظروں سے اُس کے چہرے کے تاثرات کو دیکھ رہا تھا۔ لیکن امیر نے عقل مندی سے کام لیتے ہوئے کہا "ہم ایک دن کے لیے تمھاری کشتی کرائے پر لینے کے لیے بندرگاہ پر گئے تھے۔" یہ بات سننے کے باوجود بھی قاسم کی آنکھیں افلاطون کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور تب امیر کو مجبوراً افلاطون کے برابر میں کھڑے ہو کر بات مکمل کرنی پڑی "وہاں جانے کے بعد معلوم ہوا کہ تمھاری بیوی بیمار ہے اور تم کام پر نہیں آ رہے ہو۔"

اتنی دیر میں بستی کے کچھ لوگ ان کے آس پاس آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ یہ دیکھ کر قاسم کو مجبوراً ہنستے ہوئے کہنا پڑا "آپ لوگ اندر تشریف لائیں۔ آیئے اندر آ جایئے۔" پھر اُس نے پلٹ کر ایک چارپائی اٹھائی اور اُسے بچھانے لگا۔ اُس کی اس بوکھلاہٹ کو دیکھ کر امیر کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اُسے لگا کہ شاید افلاطون کا اندازہ درست ہے یہ شخص یقیناً اس کا باپ ہی ہے ورنہ انھیں دیکھ کر وہ اس قدر نہ گھبراتا دوسری طرف قاسم یہ سوچ رہا تھا کہ صرف کشتی کرائے پر لینے کے لیے دو پردیسی کسی خلاصی کے گھر پر کیوں جائیں گے؟ بندرگاہ پر بھی تو کافی کشتیاں بے کار کھڑی ہوئی ہوتی ہیں؟

"اب تمھاری بیوی کی طبیعت کیسی ہے؟" امیر نے قاسم کی گھبراہٹ کو دور کرنے کی کوشش میں پوچھا "کیا بیماری ہے اُسے؟"

"بیماری؟" کہہ کر قاسم تھوڑی دیر تک چپ رہا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا حلق سوکھ رہا ہو اور زبان اُس کا ساتھ نہیں دے رہی ہے۔ اُس نے اپنے لڑکے سے پانی لانے کا کہہ کر جواب دینے میں تھوڑا وقت لے لیا مگر آخر کار اسے جواب دینا ہی پڑا "جناب وہ اُمید سے ہے اور اسے کوئی بیماری نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن چونکہ منصور کی پیدائش کے وقت بڑی مشکل سے اس کی جان بچی تھی اس لیے وہ خوف زدہ سی رہتی ہے۔"

امیر نے ہمدردی سے اس کی جانب دیکھا اور پھر افلاطون کی طرف دیکھنے لگا اس اُمید پر کہ شاید قاسم کی یہ بات سُن کر اُس کا غصہ کم ہو گیا ہو لیکن افلاطون کے چہرے کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آئی وہ ابھی تک غرایا ہوا لگ رہا تھا۔ اس کی نظریں قاسم کی جھکی ہوئی گردن پر جمی ہوئی تھیں۔

"اب جلدی سے پوچھ لو۔" اچانک اُس نے امیر کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر دھیمی آواز میں کہا۔ اس کی پھسپھساہٹ سُن کر قاسم نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کے گڑھوں میں خوف کے سائے لہراتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے اور اس کے شکن آلود چہرے پر ایک عجیب سی بے بسی چھائی جا رہی تھی، سمندر کے نمکین پانی کے اثر سے پیلی پڑ جانے والی اپنی داڑھی پر انگلیاں پھیر کر اُس نے بہ مشکل کہا "میں آپ لوگوں کے لیے دوسرے کی کشتی کا بندوبست کر دیتا ہوں کیونکہ میں تو دو تین دنوں تک باہر نہیں نکل سکوں گا۔"

جواب میں افلاطون کچھ کہنے ہی والا تھا کہ امیر نے اُسے روک دیا اور خود ہی بولا "قاسم میاں ہمیں کوئی بھروسے والا آدمی دینا۔ ویسے تم بندرگاہ تک تو ہمارے ساتھ چلو گے نا؟"

افلاطون امیر کی اس چال پر خوش ہو گیا۔ لیکن قاسم کے چہرے سے تو یوں لگ رہا تھا جیسے اُسے اپنے گلے سے تھوک اتارنے میں بھی تکلیف ہو رہی ہو وہ تھوڑی دیر تک تو چپ رہا پھر کانپتے کانپتے اٹھ کر بولا "ٹھیک ہے جناب جیسا آپ کا حکم۔"

پھر جب وہ اندر چلا گیا تو افلاطون نے آنکھ مار کر امیر سے اُس کی چالاکی کی تعریف کی۔ لیکن امیر نے اُس کے اشارے پر کوئی توجہ نہیں دی۔

"میں ان محترم مہمانوں کے لیے کشتی کا بندوبست کر کے ابھی واپس آتا ہوں۔" قاسم کی آواز ان دونوں کی سماعت سے ٹکرائی۔ شاید قاسم اپنی بیوی سے کہہ رہا تھا، لیکن افلاطون اس کی یہ بات سُن کر دانت پیستے ہوئے دھیرے سے بولا "کمینے اب آخری بار اپنی دوسری بیوی کا مُنہ دیکھ کر باہر نکلنا کیونکہ اب تم اس جھونپڑے میں کبھی واپس نہیں آؤ گے۔"

تھوڑی دیر بعد قاسم افلاطون اور امیر کے پیچھے اپنے گھر سے باہر نکل رہا تھا۔

آگے آگے دو نوجوان اور پیچھے ایک بزرگ، تینوں تقریباً ایک ہی رفتار سے چل رہے تھے امیر کی چال میں الجھن تھی اور افلاطون کی چال میں غصّے کی تیزی اور کاٹ تھی مگر قاسم تو اس طرح زمین پر قدموں کو گھسیٹ رہا تھا جیسے وہ مجبوری کی حالت میں زبردستی آگے بڑھنے پر مجبور ہو۔ یوں تو وہ تینوں ہی خاموش تھے، لیکن اس وقت ان تینوں کے دلوں میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔

چلتے چلتے افلاطون کبھی کبھی ترچھی نظر ڈال کر اس بات کا اطمینان کر لیتا تھا کہ قاسم بھاگنے کی کوشش تو نہیں کر رہا ہے؟ اُسے اُس وقت بڑی حیرت ہوئی تھی جب قاسم نے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر ان کے ساتھ بندرگاہ تک جانے کی حامی بھر لی تھی۔ اُس وقت افلاطون نے اس کی رضامندی پر یہی سوچا تھا کہ وہ انھیں راستے میں دھوکہ دے کر ضرور فرار ہونے کی کوشش کرے گا اور اگر اُس نے واقعی یہ حرکت کی تو امیر کو ضرور یہ یقین ہو جائے گا کہ وہ اس کا باپ ہی ہے۔

صبح کی دھوپ دھیرے دھیرے تیز ہوتی جا رہی تھی۔ سمندر کی موجیں کنارے سے ٹکرا کر شور مچانے لگی تھیں اور راستے کی چہل پہل بھی بڑھتی جا رہی تھی، امیر یہ سوچ کر قلعے کے دروازے کے قریب رُک گیا کہ اندر جانے کے بعد انھیں تنہائی میسّر نہیں ہو سکے گی۔ اُسے رُکتے دیکھ کر افلاطون کو بھی چلتے چلتے ٹھہر جانا پڑا۔ پھر اس سے پہلے کہ پیچھے پیچھے آنے والا قاسم ان کے قریب آجاتا اُس نے امیر سے پوچھ لیا۔

"ہم اسے کہاں لے جائیں گے امیر؟"

لیکن امیر کے جواب دینے سے قبل ہی قاسم ان دونوں کے قریب پہنچ گیا تو امیر نے اُس سے ہی مخاطب ہو کر کہا۔

"کیوں نہ ہم اس میدان میں بیٹھ کر تھوڑی دیر آرام کر لیں؟"

"جیسی آپ کی مرضی۔" قاسم نے کسی قسم کا کوئی اعتراض نہیں اٹھایا بلکہ ایک مشورہ دیتے ہوئے بولا۔ "آپ حضرات کو پیدل چلنے کے بجائے ایک گھوڑا کرائے پر لے لینی چاہیئے تھی۔"

لیکن افلاطون اور امیر دونوں میں سے کسی نے کوئی جواب نہیں دیا اور کچھ آگے جا کر گھاس پر بیٹھ گئے، مگر قاسم ان سے کچھ فاصلے پر کھڑا رہا تو امیر نے اس سے کہا۔

"قاسم علی تم بھی بیٹھ جاؤ۔"

یہ سُن کر قاسم اسی جگہ بیٹھنے لگا جہاں وہ کھڑا تھا مگر امیر نے ہاتھ اٹھا کر اُسے روکتے ہوئے کہا۔ "نہیں نہیں قاسم تم اِدھر آکر بیٹھ جاؤ تم سے کچھ باتیں کرنا ہیں۔"

تھوڑی دیر تک وہ تینوں ہی چُپ رہے پھر اچانک اُسے لگا کہ اگر گفتگو شروع کرنے میں اُسے اور تاخیر ہوئی تو افلاطون کی زبان سے کوئی اُلٹی سیدھی بات نکل جائے گی اور معاملہ بگڑ جائے گا اس خیال کے آتے ہی اس نے کھنکار کر اپنا گلا صاف کیا اور بولا۔ "بات یہ ہے قاسم کہ....."

یہی ایک جُملہ کہہ کر اُس نے قاسم کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی لیکن اپنے حلقوں کی گہرائی میں ڈوبی ہوئی قاسم کی آنکھوں میں کسی قسم کی کوئی چمک نہ دیکھ کر وہ جلدی سے آگے بول گیا۔ "تمھاری کشتی کو تو کرائے پر لینے کا ایک بہانہ تھا ہم تو تم سے صرف ایک بات پوچھنا چاہتے ہیں۔"

"کیا؟"

لیکن امیر جلدی سے جواب نہ دے سکا وہ تو کچھ اور ہی کہنا چاہتا تھا لیکن اس کے مُنہ سے کچھ اور ہی نکل گیا۔ اور اسی لیے اُسے بات بنانا پڑی۔ "دراصل اُس دن جب ہم تمھاری کشتی میں بیٹھ کر جہاز دیکھنے گئے تھے تو میرا بٹوہ کھو گیا تھا۔"

یہ سُن کر قاسم اس طرح چونک پڑا جیسے اس نے خلاف توقع کوئی بات سُن لی ہو۔ "کیا میری کشتی میں آپ کا بٹوہ رہ گیا تھا؟"

"نہیں ہم یہ بات یقین سے نہیں کہہ سکتے۔" امیر نے کہا۔ "اسی لیے تو یہ مناسب سمجھا ہے کہ کوتوالی میں رپورٹ درج کرانے سے پہلے تم سے پوچھ لیں۔"

"یا خدا!" قاسم نے ایک گہرا سانس لیا۔ "آپ کا بٹوہ اگر مجھے ملا ہوتا تو میں خود اسے آپ تک پہنچا دیتا، میں تو ایسی دولت کو اپنے لیے حرام سمجھتا ہوں۔" یہ کہنے کے بعد جب اُس

نے محسوس کیا کہ اس کی بات کا دونوں پر دلیسیوں پر کوئی اثر نہیں ہو رہا ہے تو اُس کی آواز بھرّا گئی۔ "دیکھئے اگر آپ لوگ کوتوالی میں شکایت کریں گے تو میں غریب آدمی مفت میں مارا جاؤں گا۔ میں آپ سے سچ کہہ رہا ہوں اپنی بیوی کی قسم کھا رہا ہوں۔"

"کون سی بیوی کی قسم کھا رہے ہو؟ پہلی یا دوسری کی؟" افلاطون اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا امیر نے اسے آگے بولنے سے روکنے کی کوشش کی لیکن افلاطون نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور کرخت لہجے میں بولا۔ "نہیں امیر لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔"

اس کا یہ لب و لہجہ دیکھ کر قاسم کا چہرہ پھیکا پڑ گیا اور اس کی آنکھوں میں پانی اترنے لگا۔ مگر اس کے باوجود بھی افلاطون کو اس سے کوئی ہمدردی پیدا نہیں ہوئی۔ قاسم نے بدحواس ہو کر ان دونوں کی طرف باری باری دیکھا پھر ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "میں سچ کہہ رہا ہوں مجھے آپ کے بٹوے کے بارے میں کوئی علم نہیں ہے۔"

"ارے تم سے بٹوے کا کون پوچھ رہا ہے؟" افلاطون نے غصّے سے کہا۔ "میری طرف دیکھ کر کہو کہ میں کون ہوں؟ میرا اور تمھارا کیا رشتہ ہے؟"

قاسم ڈر کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا کیونکہ افلاطون کے چہرے سے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ چھلانگ لگا کر اس کے سینے پر سوار ہو جائے گا، لیکن امیر نے فوراً ہی اس کا ہاتھ پکڑ کر ایک جھٹکے سے اسے بٹھا دیا اور تیز آواز میں بولا۔ "میں کہتا ہوں کہ صبر سے کام لو اور اسے تفصیل سے سب کچھ بتا دو۔"

"یہ جب تک دو چار ہاتھ نہیں کھائے گا کوئی بات نہیں سمجھے گا۔" سانپ کی طرح پھنکارتے ہوئے افلاطون کو قابو میں رکھنے کے لیے امیر کو تھوڑی دیر لگی۔ راستے سے گزرتے ہوئے راہگیر بھی انہیں دیکھ کر کھڑے ہو گئے تھے اس لیے امیر کو بھی سمجھداری سے کام لینا پڑا، قاسم اپنے اُوپر چوری کا الزام لگتے دیکھ کر گھبرا گیا تھا، افلاطون کا رویہ دیکھ کر اُسے غصہ تو بہت آرہا تھا لیکن پھر بھی اس میں افلاطون کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی کافی کوشش کے بعد وہ بہ مشکل اتنا ہی بول سکا۔ "بھائی صاحب کسی قصور کے بغیر آپ مجھے کیوں پھنسا رہے ہیں؟"

"قاسم علی،" امیر نے کہنا شروع کیا۔ "میرے اس دوست کو یہ شک ہے کہ تم اس کے باپ ہو۔"

"باپ؟" قاسم کے چہرے کا رنگ اچانک ہی اڑ گیا۔ تھوڑی دیر تک وہ افلاطون کو گھور گھور کر دیکھتا رہا پھر بولا۔ "میں اور اس رئیس نوجوان کا باپ؟ ایک غریب خلاصی کی ایسی تقدیر کہاں؟"

امیر نے افلاطون کی طرف دیکھا لیکن اس کے چہرے سے یہ تو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ قاسم کے جواب سے اس کو تسلّی نہیں ہوئی ہے۔ اس لیے اس نے بات آگے بڑھائی "تمھارے بازو پر لنگر کا یہ نشان۔ ایک ٹوٹی ہوئی انگلی اور نام بھی قاسم یہ سب باتیں اس کے باپ کی نشانیوں سے مشابہہ ہیں۔"

قاسم کی نظریں اپنے بازو پر بنے ہوئے نشان پر سے پھسلتی ہوئیں پھر سے افلاطون کے چہرے پر جم گئیں مگر چند لمحوں بعد اچانک ہی بول پڑا۔ "اس نشان کی وجہ سے میں ان کا باپ تھوڑی بن سکتا ہوں؟"

"میں بھی اس سے یہی کہہ رہا ہوں۔" امیر افلاطون کو بولنے کا موقع دیئے بغیر بول پڑا۔ "پھر بھی اس کا شک دور کرنے میں ہمارا کیا نقصان ہے؟"

"تو آپ یہ شک کس طرح دُور کرنا چاہتے ہیں؟" قاسم اپنے آپ کو سنبھالتے بولا۔ "میرا اگر ایسا جوان بیٹا ہوتا تو مجھے اس بڑھاپے میں چپّو چلانے نہ پڑتے۔"

"بمبئی میں تم کتنے سالوں سے ہو؟"

"سال؟" قاسم سوچ میں پڑ گیا پھر اپنی انگلیوں پر حساب لگاتے ہوئے بڑبڑانے لگا۔ "سولہ... سترہ... اٹھارہ۔" پھر وہ انگلیوں کا حساب چھوڑ کر بولا۔ "بہت سال گزر چکے ہیں۔"

"تمھارا اصل وطن کون سا ہے؟"

اس سوال پر قاسم تھوڑا سا اُلجھ گیا اور اپنی یادداشت پر زور دینے کی کوشش کی لیکن جب اسے یاد نہیں آیا تو اس نے انکار میں سر ہلا دیا اور دھیمی آواز میں بولا۔ "مجھے معلوم نہیں ہے۔"

"معلوم نہیں ہے؟" افلاطون اور امیر تقریباً ایک

ساتھ ہی بول پڑے ان دونوں کی تیز دھار دار نظریں قاسم کو اپنے دل میں اترتی ہوئی محسوس ہوئی تھیں "مجھے کچھ بھی یاد نہیں۔"

"دیکھا تم نے؟" افلاطون امیر سے بولا "بے وقوف یہ کہتا ہے کہ مجھے کچھ بھی یاد نہیں ہے۔ لاؤ اپنی تلوار مجھے دو اس کی چمک دیکھ کر اسے سب کچھ یاد آجائے گا۔" یہ کہہ کر افلاطون نے امیر کی تلوار کی جانب ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ قاسم پہلی بار غصے سے چیخ کر بولا "مجھے بے وقوف کہنے والے بدتمیز تمھیں۔" وہ غصے کے جوش میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور پہلے سے زیادہ کرخت لہجے میں بولا "مجھے بوڑھا سمجھ کر تم رعب جھاڑ رہے، لیکن یہ مت بھولنا کہ اگر تم نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا تو بمبئی کی بندرگاہ کا کوئی خلاصی تمھیں زندہ واپس جانے نہیں دے گا۔" بولتے بولتے اس کی سانس تیز چلنے لگی تھی لیکن پھر بھی وہ ہانپتے ہانپتے بولا "تم میں ہمت ہے تو تلوار اٹھاؤ اور کرو مجھ پر وار۔"

قاسم کا یہ بدلا ہوا انداز اور غیض و غضب افلاطون اور امیر کے لیے قطعی غیر متوقع تھے۔ اس کی دھمکی بھی ایسی نہیں تھی جسے وہ دونوں ہنسی میں اڑا دیتے۔ افلاطون کی جلد بازی نے کام بگاڑ دیا تھا جس کی وجہ سے امیر اس پر ناراض ہوتے ہوئے بولا "تم نے جو وعدہ کیا تھا کیا اسے تم بھول گئے؟ اب ایک لفظ بھی منہ سے نکالے بغیر چپ چاپ بیٹھ جاؤ۔"

تلوار کے دستے پر سے ہاتھ ہٹانے سے قبل افلاطون نے تیز نظروں سے قاسم کو گھورا لیکن قاسم تو اب بھی دونوں مٹھیاں بھینچ کر پاؤں پھیلائے کھڑا تھا، اچانک افلاطون کو اپنا بچپن یاد آگیا جب وہ اس شخص کے کندھے پر بیٹھ کر سیر کیا کرتا تھا اور خوش ہوا کرتا تھا، وہ اس کے دونوں ہاتھوں میں اچھلنے کی ضد کیا کرتا تھا۔ بچپن کی ان یادوں نے جب افلاطون کے چہرے کی سختی کو مٹا دیا تو امیر نے موقعے کا فائدہ اٹھا کر قاسم کا ہاتھ تھام لیا اور بولا "تم بیٹھو تو سہی۔"

لیکن قاسم کا غصہ اب بھی اترا نہیں تھا وہ بدستور غراتی ہوئی آواز میں بولا "اب میرا کیا کام ہے؟"

"جو بات تمھیں یاد نہیں ہے وہ بات تمھیں یاد دلا دوں۔"

امیر نے کہا تو قاسم کے چہرے کا تناؤ کچھ کم ہو گیا لیکن اس نے بیٹھنے کے لیے جلد بازی نہیں دکھائی، امیر تھوڑی دیر اسے دیکھتا رہا پھر اپنی آواز میں مٹھاس لاتے ہوئے بولا۔ "تمھیں تمھاری بیمار بیوی کی قسم قاسم۔ میری بات سننے سے انکار مت کرو۔"

قاسم کے دونوں پاؤں ایک جھٹکے سے مڑ گئے اور وہ کچھ کہے بغیر زمین پر بیٹھتا چلا گیا "تمھیں ایسی قسم نہیں دینی چاہیے تھی۔" ایک گہرا سانس لے کر اس نے کہا۔ اس وقت اس کی آواز میں ایک عجیب سی کپکپاہٹ تھی، مگر افلاطون کو تو یہی لگ رہا تھا کہ قاسم اب بھی ڈھونگ کرنے میں مصروف ہے۔

"قاسم علی ہندوستان میں مرنائی نام کا ایک گاؤں ہے۔" امیر نے کہنا شروع کیا "اس گاؤں میں سیدوں کا ایک محلہ ہے اس محلے کے آخری سرے پر ایک کنواں بھی ہے اس کنوئیں کے بالکل سامنے املی کا ایک درخت ہے اس درخت کی دائیں جانب ایک چھوٹا سا مکان ہے جس میں ایک خلاصی رہتا ہے۔" یہاں تک کہہ کر امیر اٹک گیا اس نے غور سے قاسم کے چہرے کی طرف دیکھا اس کے چہرے کے تاثرات سے یوں لگ رہا تھا جیسے امیر کی بات کا اس پر کچھ کچھ اثر ہوتا جا رہا تھا وہ اپنے آس پاس کے ماحول کو بھول کر گردن جھکائے گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

"اس خلاصی کی بیوی کا نام شیریں ہے۔ اس کے بیٹے کا نام افلاطون ہے اور بیٹی کا نام گلبدن ہے جسے پیار سے گل کہتا ہے۔ وہ خلاصی ایک دن ایران سے کشتی پر آرہا تھا اس بڑی سی کشتی میں شیریں بھی موجود تھی، کئی خلاصی اس سے شادی کرنا چاہتے تھے اور آخر کار ان میں شرط لگ گئی، کشتی میں قاسم نام کا جو خلاصی تھا اس نے یہ شرط جیت لی تھی اور اس طرح شیریں اس کی بیوی بن گئی۔"

"پھر؟" قاسم امیر کے چپ ہوتے ہی پوچھ بیٹھا۔

"وہ خلاصی سال ڈیڑھ سال بعد سمندر کے سفر پر جایا کرتا تھا اور چھ آٹھ مہینے کے سفر کے بعد واپس آجاتا تھا وہ خلاصی ہونے کے باوجود دریا سے دور مرنائی نامی گاؤں میں کیوں رہتا تھا؟ اس پر سبھی کو حیرانی تھی لیکن ایک بار سفر پر جانے والا وہ خلاصی اپنے گھر واپس نہیں آیا۔ مہینے سال بیت گئے اور سال کئی سالوں میں تبدیل ہو گئے۔ گھر والے اس کی راہ دیکھتے رہے، گاؤں والوں کو تو اس بات کا یقین ہو چکا تھا کہ کشتی کے ڈوب جانے کی وجہ سے قاسم بھی ہلاک ہو چکا ہے اور اب وہ کبھی بھی اپنے گھر واپس نہیں آئے گا مگر..."

"مگر کیا؟" قاسم کی آنکھیں پھیل گئیں اور وہ بلند آواز میں بولا "جناب جلدی سے بتائیے۔"

"لیکن اس کی بیوی نے کسی کی بات نہیں مانی، وہ اپنے شوہر کا انتظار کرتی رہی اور بیٹے بیٹی کی پرورش کرتی رہی وہ آج کل کی امیدوں پر اپنی زندگی اور اپنی جوانی کا بوجھ ڈھوتی رہی۔" یہاں تک کہہ کر امیر نے ایک گہرا سانس لیا، پھر گل کی موت کا ذکر اس نے اس گہرے سانس میں ہی دبا دیا اور آگے بولا "اس کا بیٹا امیر نامی ایک دوست کے ساتھ اس کے دھندے میں شریک ہو گیا اور اپنے دوست کے ساتھ بمبئی کے سفر پر آیا بیٹے کا خیال تھا کہ اس کا باپ مر چکا ہے لیکن سمندر کی سیر کے دوران جب اس کی نظر کشتی کے خلاصی پر پڑی تو اچانک اسے لگا کہ اس کا باپ زندہ ہے۔ وہ لڑکا اس وقت تمھارے سامنے بیٹھا ہے۔" امیر اور افلاطون کا یہ خیال تھا کہ قاسم اس کہانی کو سننے کے بعد فوراً ہی اس بات کا اقرار کر لے گا کہ وہ افلاطون کا باپ ہے، مگر وہ بالکل ہی بے حس و حرکت بیٹھا تھا، اس کی آنکھوں کے سامنے تو کوئی اور ہی منظر ابھر رہا تھا وہ زمین پر آنکھیں گاڑے گم سم کچھ سوچ رہا تھا۔

"تم کیوں خاموش ہو قاسم علی؟" امیر نے دھیرے سے اس کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر اسے ہلایا تو اسے قاسم کے چہرے کی جھریوں میں تھرتھراہٹ سی محسوس ہوئی۔ اس کے ہونٹ اس طرح کھلے کہ جیسے وہ کہنے کے لیے الفاظ ڈھونڈ رہے ہوں کچھ تھوڑی دیر بعد اس کی آواز امیر اور افلاطون کی سماعت سے ٹکرائی "ہم اپنی جہاز نما کشتی پر واپس آرہے تھے، ہمیں کنارے پہنچنے کی جلدی تھی اپنی بیوی بچوں سے ملنے کے لیے سب ہی لوگ بے چین تھے، ہمارے ارمانوں کی طرح اس دن ہوا اٹھکھیلیاں کر رہی تھی، موسم بہت ہی سہانا تھا، پانی کی موجیں بھی مستی میں تھیں یوں لگ رہا تھا جیسے ان پر بھی جوانی آئی ہوئی ہے، ہمارا ایک ساتھی لمک لمک کر گا رہا تھا، اس کا راگ ابھی بہت دور تھا لیکن وہ ہماری آنکھوں میں بسا ہوا تھا مگر یہ کیا؟ ہوا اچانک بدل کیوں گئی؟ موجوں نے اچانک اس قدر اچھلنا کیوں شروع کر دیا؟ اور یہ ہماری کشتی کسی مست شرابی کی طرح کیوں ڈولنے لگی؟ ہر شخص دوڑ بھاگ میں مصروف ہو گیا طوفان بہت شدید تھا لیکن ہمارا خیال تھا کہ وہ تھوڑی دیر میں تھم جائے گا۔ ہم تے بچپن سے دریا کے پانی سے دوستی کی ہے وہ کھیلا ہم سے دشمنی تھوڑی کرے گا۔ مگر آہ۔ ظالم کوئی دشمن بھی اس قدر ظالم نہیں ہو سکتا بادبان کے چیتھڑے ہو گئے، کشتی کو بچانے کے لیے ہمیں مجبوراً اپنا سامان پانی میں پھینکنا پڑے گا، لیکن کم بخت موجوں کو ہم پر ذرا بھی رحم نہیں آیا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ منہ پھاڑ کر ہماری جہازی کشتی کو نگل لینا چاہتی ہیں۔ اچانک بھری ہوئی موجیں دو چار گز اونچائی پر جا کر ہم لوگوں پر ٹوٹ پڑیں اور کشتی کے اونچے اونچے مضبوط ستون تڑ تڑا کر ٹوٹ گئے، پانی کے شور میں انسانی چیخیں دبتی چلی گئیں کون مرا اور کون اچھل کر کہاں گرا؟ اس کا کسی کو ہوش نہیں تھا۔ ہماری کشتی بپھری ہوئی موجوں کے تھپیڑے برداشت نہیں کر سکتی تھی اور ہم سے موت کا خیال برداشت نہیں ہو رہا تھا، ہوائیں ضدی ہو چکی تھیں اور سمندر شیطان بن چکا تھا، ہم اس طرح مرنا نہیں چاہتے تھے۔ ہمیں اپنے بیوی بچے اور گھر یاد آرہا تھا، ہم زندہ رہنا چاہتے تھے اور موت کے منہ میں بھی ہمارا جوش بڑھتا جا رہا تھا، اچانک کشتی کا ایک ٹوٹا ہوا لکڑی کا ستون میرے ہاتھ لگ گیا، میں نے اس لکڑی کے ٹکڑے کو مضبوطی سے تھام لیا پھر مجھے پتا نہیں چلا کہ کب طوفان تھما؟ بھوکے شیر کی طرح چنگھاڑتی ہوئی موجیں کب خاموشی سے سو گئی تھیں؟ اور کب ہواؤں کے تند تھپیڑے خاموش ہوئے تھے؟ صرف مجھے اتنا معلوم ہو سکا کہ میرے پانی میں ڈوبے ہوئے ہاتھ بالکل تن سے ہو کر رہ گئے ہیں اور بدن اکڑا ہوا سا لگ رہا ہے مگر وہاں میں اکیلا نہیں تھا تین اور آدمی تھے جو میری طرح موت سے لڑ کر زندگی کی آغوش میں لوٹ آئے تھے۔ ہمیں اب دوسروں کی موت کا افسوس نہیں ہو رہا تھا۔ ہم لوگ تو اپنے زندہ بچ جانے پر خوش تھے۔ تھوڑی دیر بعد ہمارا پیٹ بھوک کی آگ سے جلنے لگا اور تب ہمیں خیال آیا کہ ہم زندہ

بچنے میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں بلکہ تڑپ تڑپ کر مرنے کے لیے زندہ ہیں، کشتی کی لکڑی کا یہ ٹوٹا ہوا ستون بہتا ہوا کس جگہ پہنچے گا کس کو معلوم ہے؟ نہ معلوم قدرت کا ارادہ کیا ہے اور وہ ہمیں کس طرف دھکیل رہی ہے؟ منزل بغیر کا سفر شروع ہو چکا تھا۔ بھوک اور پیاس سے بُری حالت ہو رہی تھی، تھکن سے آنکھیں بند ہو رہی تھیں مگر پھر بھی جاگنا پڑ رہا تھا۔ کیونکہ لکڑی کا یہ ستون ہاتھ سے چھوٹ گیا تو پھر ہمیشہ کے لیے سو جانا پڑے گا۔ ہم چاروں ایک دوسرے سے بکواس کر کے اپنے آپ کو زندہ رکھنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ جہاں ہمیں موجیں دھکیل دیتی تھیں ہم اسی طرف بہنے لگتے تھے۔ ہماری ہمت دم توڑنے لگی تھی، پھر ہم جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھنے لگے۔ خواب ہی خواب میں ہم نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور عمدہ قسم کی شراب پی کر دیوانوں کی طرح قہقہے لگانے لگے، اچانک میری سماعت سے ایک آواز آ کر ٹکرائی۔"

"قاسم.. مجھ سے تو ایک شہزادی ملنے آئی ہے جو بہت خوبصورت ہے.. کیا شاندار جوانی ہے اس کی؟" یہ آواز سُن کر میرا دماغ اور زیادہ بہک جاتا ہے اور مجھے یہ تک پتا نہیں چلتا کہ اس وقت دن ہے یا رات؟ لیکن نگاہوں کے سامنے ایک تصویر سی اُبھرتی رہتی ہے۔ یہ تصویر میری پیاری بیوی کی تصویر ہے جو بن سنور کر مجھے لینے کے لیے آئی ہے۔ میں خوشی سے چلا کر آواز دیتا ہوں۔ دوستو۔ میری بیوی آ رہی ہے وہ دیکھو وہ آ گئی ہے، بس اسی لمحے لکڑی کا ستون میرے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ پھر مجھے نہ اپنی ڈوبتی ہوئی کشتی نظر آتی ہے اور نہ ہی میری بیوی مجھے دکھائی دیتی ہے۔ کوشش کے باوجود میں اپنے ہاتھ نہیں ہلا سکتا تھا میرے پیروں میں ذرا بھی طاقت نہیں رہی۔ موت کے خوف سے دل کی دھڑکن تیز ہو چکی ہے اور دماغ سوچنے سمجھنے کی قوت سے محروم ہوتا جا رہا ہے۔ پھر جب مجھے ہوش آتا ہے تو مجھے یہی کنارہ دکھائی دیتا ہے جہاں میں لکڑی کے ٹکڑے کی طرح ریت پر پڑا تھا چاروں طرف سے لوگوں نے مجھے گھیر رکھا ہے، وہ مجھ سے پوچھ رہے ہیں۔ لیکن انھیں میری طرف سے کوئی جواب نہیں ملتا ہے۔ پھر ایک بوڑھا مجھے اپنے جھونپڑے میں لے جاتا ہے جہاں وہ دن رات میری تیمارداری کرتا ہے، لیکن پھر بھی اُسے اپنے سوالوں کا جواب نہیں ملتا۔ تم کون ہو؟ کس بندرگاہ کے خلاصی ہو؟ کیا نام ہے تمھارا؟ لیکن ان سوالوں سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوا کیونکہ میرے دماغ پر چھایا ہوا اندھیرا ہٹتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ مجھ سے زندگی کا ایک کنارہ چھوٹ چکا تھا اس لیے دوسرے کنارے کو تھام کر زندہ رہنے پر مجبور تھا۔ اور اب آپ مجھ سے یہ کہہ رہے ہیں کہ میں اس نوجوان کا باپ ہوں؟"

قاسم خاموش ہوا تو ماحول پر ایک سوگوار سا سناٹا طاری ہو گیا۔ قاسم کے ہانپنے کی آواز کے سوا کوئی اور آواز سنائی نہیں دے رہی تھی، یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی بہت بڑا طوفان اچانک رُک گیا ہو، امیر اور افلاطون اب ایک دوسرے کی جانب اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے وہ ابھی ابھی گہری نیند سے جاگے ہوں افلاطون کی آنکھیں یکایک نم ہو گئیں۔ امیر کو اس بات کا یقین ہو چکا تھا کہ قاسم ہی افلاطون کا باپ ہے لیکن پھر بھی وہ اپنے آپ کو افلاطون کا باپ نہیں سمجھ سکتا کیونکہ اس کی پچھلی زندگی اپنی تمام یادداشتوں کے ساتھ دریا میں ڈوب چکی ہے، اور اب مرجھائی یادوں پر پانی ڈالنے سے کوئی فائدہ نہیں۔

"میرا کام ختم ہو گیا افلاطون آؤ اب ہم چلیں۔" تھوڑی دیر بعد اس نے کہا مگر افلاطون نے کوئی جواب نہیں دیا اس کا چہرہ ہر قسم کے تاثرات سے عاری تھا اب نہ تو اس کے چہرے پر قاسم سے نفرت کے آثار تھے اور نہ ہی محبت کی جھلک نظر آ رہی تھی۔

"میں جا رہا ہوں جناب میری بیوی اور میرا بیٹا میری راہ دیکھ رہے ہوں گے۔" یہ کہہ کر قاسم اُٹھ کھڑا ہوا لیکن افلاطون اپنی جگہ پر چُپ چاپ بیٹھا ہی رہا۔ جب قاسم چلتے چلتے نظروں سے اوجھل ہو گیا تو افلاطون نے ایک سرد آہ بھر کر صرف اتنا ہی کہا "مرے ہوئے آدمی کو اب کیا مارنا ہے؟"

یہ سُن کر امیر نے اطمینان کا سانس لیا لیکن دل کی گہرائیوں میں اب بھی ایک سوال مچل رہا تھا کہ اگر قاسم اپنی یادداشت کھو چکا ہے تو اُسے اس کا اصلی نام کیسے یاد رہ گیا؟

اس سوال کے ذہن میں اُبھرتے ہی امیر اُلجھن میں پڑ گیا کہ افلاطون سے اس کا ذکر کرے یا نہ کرے؟

☆

افلاطون کا باپ قاسم علی اپنی یادداشت کھو چکا ہے، اس بات کا یقین کر لینے کے بعد افلاطون کے دماغ پر سے جنون کے بادل چھٹ گئے۔ اب اس آدمی سے اُس کا کوئی رشتہ نہیں ہے یہ سوچ کر اس نے قاسم کے خیال کو بھی اپنے ذہن سے جھٹک دیا تھا۔ لیکن امیر کی حالت بگڑی ہوئی تھی، اس کا دل اس بات کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھا کہ قاسم اپنی یادداشت کھو چکا ہے، ایک شک تھا جو بار بار اپنا سر اٹھا رہا تھا کہ اپنے بیوی بچوں کو چھوڑ کر بھاگ آنے کے جرم اور افلاطون کے غصے سے بچنے کے لیے ہی قاسم نے اپنی یادداشت کھونے کا ڈھونگ رچایا تھا، دریا کے طوفان کی بات بھی اس کے ذہن کی پیداوار ہے تو کیا قاسم علی نے ان دونوں کو ہی بے وقوف بنا دیا ہے؟

اس کے دل میں یہ شبہ مضبوط ہو گیا۔ پہلے جب افلاطون قاسم سے بدلہ لینے کے لیے تیار تھا تو امیر نے اسے قابو میں رکھا ہوا تھا، مگر اب بات پہلے جیسی نہیں تھی۔ امیر کے اندر چھپا ہوا اٹھگ سامنے آتا جا رہا تھا اور اُس نے دل ہی دل میں یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ ایک بار تو قاسم سے سچائی ضرور اگلوائے گا، حقیقت کو جانے بغیر اب اسے چین نہیں پڑے گا۔ یہ ارادہ لمحہ بہ لمحہ اس کے دل میں مضبوط سے مضبوط تر ہوتا گیا لیکن پھر بھی تین چار دنوں تک اس نے افلاطون پر اپنے ارادے کا اظہار نہیں کیا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ اگر ایک بار افلاطون کو یہ بات معلوم ہو گئی تو وہ کچھ سوچے سمجھے بغیر کوئی غلط قدم اٹھا لے گا، امیر کے ذہن میں یہ بات بھی تھی کہ وہ کیوں نہ افلاطون کو خود سے الگ کر دے اور تن تنہا ہی قاسم سے نپٹ لے؟

مگر قاسم کی قسمت زور پر تھی، امیر اپنے ارادے پر عمل کرنے کے لیے جیسے ہی تیار ہوا کہ اچانک حالات بدل گئے جس خوش خبری کو سننے کے لیے وہ سب بے چین تھے سبحان خان وہ خوش خبری لے کر آ پہنچا تھا۔

"تم لوگوں کا کام ہو گیا ہے۔" سبحان خان اپنی پیشانی کا پسینا پونچھ کر مسکراتے ہوئے بولا "میں نے تم لوگوں کے لیے بہترین شکار ڈھونڈ نکالا ہے۔"

امیر نے اس کی بات سُن کر اپنی غرض دکھانا مناسب نہیں سمجھا اس لیے اپنی خوشی کا اظہار کیے بغیر وہ دھیرے سے بولا "تو آخر آپ نے ہم لوگوں کے لیے شکار تلاش کر ہی لیا۔" اتنا کہہ کر وہ ایک پل کے لیے رکا پھر آگے بولا۔ "ہم سوچ ہی رہے تھے کہ ایک دو روز بعد سامان سمیٹ کر روانہ ہو جائیں گے۔ ہمارا خیال تھا کہ بھوانی دیوی راستے میں ہمیں ضرور کوئی شکار دکھا دے گی۔"

"لیکن امیر علی یہ شکار تو ایسا شکار ہے جس کے متعلق تم نے کبھی سوچا بھی نہیں ہو گا۔" سبحان خان پُرجوش لہجے میں بولا "یہ تو میں نے بھی نہیں سوچا تھا کہ تمھاری قسمت اتنی زوردار ہو گی۔"

امیر کا تجسس بڑھ گیا۔ اصل میں تو وہ خود بھی پریشان تھا۔ بمبئی کا یہ سفر اس کے لیے اچھا ثابت نہیں ہو رہا تھا۔ خرچ کے پیسے ختم ہوتے جا رہے تھے اور کسی شکار کا دُور دُور تک پتا نہیں تھا اور واپسی میں دیر ہو گئی تو برسات کا موسم شروع ہو جائے گا۔ سوا سو کی ٹولی کا خالی ہاتھ گھر واپس جانا اس میں تو خود ٹولی کے سردار کی بھی بے عزتی تھی، مگر امیر نے سبحان خان کو اپنی اس اُلجھن کا احساس نہیں ہونے دیا اور مسکرا کر بولا "خان میری قسمت کی تو آپ نے تعریف کر دی لیکن شکار کے بارے میں کوئی معلومات فراہم نہیں کیں۔"

"معلومات..." سبحان ہنس کر بولا "تمھارا کیا خیال ہے وہ کتنی رقم کا شکار ہو گا؟"

یہ سُن کر امیر کو اس پر غصہ آ گیا کہ یہ شخص خواہ مخواہ بات کو طول دے کر اپنی بڑائی مار رہا ہے۔ لیکن چونکہ اس وقت اسے اپنی غرض تھی اس لیے وہ اپنے غصے کو پی گیا اور بولا "خان بمبئی جیسے دولت مند شہر کے شکار کے لیے لاکھ روپے کا اندازہ بھی کم ہی ہو گا۔" یہ بات تو امیر نے یوں ہی کہہ دی تھی ویسے اس کا اندازہ دس بیس ہزار سے زیادہ کا نہیں تھا۔

"تو سنو امیر علی تمھارے لیے میں نے دو لاکھ کا شکار ڈھونڈا ہے۔"

"ہوں۔" امیر اس کی بات سُن کر چونک پڑا "آپ مذاق تو نہیں کر رہے ہیں؟"

"کام دھندے کے معاملے میں مذاق کرنے کی مجھے عادت نہیں ہے۔" سبحان خان سنجیدہ لہجے میں بولا "اسی لیے تو

کہتا ہوں کہ قدرت تم پر مہربان ہے۔"

"ہم سب بھی آپ سے بہت خوش ہوئے ہیں خان۔" امیر کو اب اس کی تعریف کرنا پڑی۔ "دو لاکھ کی رقم سو اسو آدمیوں میں تقسیم کی جائے تو کم نہیں پڑے گی۔"

یہ سُن کر سبحان خان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک لہرانے لگی اور وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "تم سے غلطی ہو رہی ہے امیر سو اسو آدمی نہیں بلکہ ایک سو چھبیس آدمی کہو کیونکہ یہ بندہ بھی اس میں شامل ہے۔"

"ارے ہاں ہاں آپ کا تو زیادہ حق ہے۔" امیر نے جان بوجھ کر خوشامدانہ انداز اختیار کیا۔

"تو پھر پہلے ہمیں اس کا فیصلہ کر لینا چاہیئے۔" سبحان خان کی مسکراہٹ میں لالچ کی جھلک نمایاں تھی۔ "یہ طے ہو جائے تو پھر میں اس کے متعلق تمھیں ساری معلومات فراہم کر دوں۔"

امیر تھوڑی دیر تک تو الجھن میں پڑ گیا اسے ڈر تھا کہ دلالی کی رقم اگر سبحان خان نے پہلے ہی مانگ لی تو معاملہ کھٹائی میں پڑ جائے گا ایک تو اس کے پاس زیادہ رقم نہیں تھی، لیکن اگر اس کے پاس رقم ہوتی تو بھی وہ سبحان خان پر اعتماد کر کے دھوکہ کھانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اسی لیے وہ چند لمحوں تک غور کرتا رہا پھر سبحان خان کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ "آپ تو جانتے ہی ہیں کہ اس وقت میری حالت ایسی نہیں ہے کہ میں آپ کو پہلے سے کچھ دے سکوں، لیکن یہ ضرور ہے کہ طے کی ہوئی رقم میں جالان پہنچتے ہی ہنڈی کے ذریعہ آپ کو بھجوا دوں گا۔"

"ارے یہ کیا بات ہوئی؟" سبحان خان کی آواز میں حیرت کی ایک جھلک تھی۔ "مجھے تم پر پورا بھروسا ہے۔ ہمیں تو صرف رقم کا فیصلہ ہی پہلے سے کرنا ہے۔"

"تو پھر بتا دیں۔" امیر نے کہا۔

سبحان خان حالانکہ پوری تیاری کر کے آیا تھا لیکن وہ تھوڑی دیر تک سوچنے کے بعد بولا۔ "میں تو دوسرے ٹھگوں سے چوتھائی حصہ لیتا ہوں۔" اتنا کہنے کے بعد اس کا لہجہ کچھ اداس ہو گیا۔ "لیکن اپنے پرانے دوست کے بیٹے سے میں صرف دسواں حصہ لوں گا۔"

"دسواں حصہ؟" امیر کو دسویں حصے کی رقم بہت بڑی لگ رہی تھی۔

"ہاں دو لاکھ میں سے صرف بیس ہزار ہی تمھیں دیتا ہوں۔" سبحان خان اس طرح بولا جیسے بیس ہزار کی رقم بہت ہی معمولی ہو، لیکن امیر نے اسے ایک جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے آپ کا یہ فیصلہ مجھے منظور ہے۔" امیر کا لہجہ کچھ ایسا تھا کہ سبحان خان کو ذرا بھی شک نہ ہو سکے۔ "دو لاکھ اگر مل جائیں تو اس کے عوض بیس ہزار تو اس کے عوض بیس ہزار تو دینے ہی چاہئیں۔"

"بس تو پھر ہم تحریری معاہدہ کر لیتے ہیں۔" سبحان خان نے کہا۔ شاید وہ پکا کام کرنا چاہتا تھا اور امیر کو مجبوراً اس کی بات منظور کرنا پڑ رہی تھی، تحریری معاہدہ کرنے کے بعد امیر نے اس پر اپنے دستخط کر دیئے، معاہدے کے کاغذ کو اپنی جیب میں رکھ لینے کے بعد سبحان خان بڑی ہوشیاری سے بولا۔ "اب غور سے میری بات سُن لو اندور کے ایک ساہوکار کا مال فروخت کر کے اس کے پندرہ آدمی دو، چار دنوں میں بمبئی سے روانہ ہونے والے ہیں دو لاکھ میں سے صرف دس ہزار روپے ہی ہنڈی کی شکل میں ہیں باقی رقم سے انھوں نے سونا چاندی اور زیورات خرید لیے ہیں۔ وہ لوگ فوجیوں کے لباس میں سفر کریں گے تاکہ کسی کو ان پر کوئی شک نہ ہو دورانِ سفر وہ لوگ یہ ظاہر کریں گے کہ وہ پونا سے اندور جا رہے ہیں تاکہ راستے میں لُٹ جانے کا خطرہ کم سے کم رہے، ویسے میں نے ایسا انتظام کر لیا ہے کہ تم بڑی آسانی سے ان میں گھل مل سکتے ہو۔" سبحان خان نے جیب سے ایک کاغذ نکالتے ہوئے کہا۔ "اس پروانے پر تمھارا نام فتح محمد لکھا ہوا ہے۔"

"یہ کس لیے؟"

"اس پروانے میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ تم بنارس کے ہری داس نامی سوداگر کے آدمی ہو اور اپنا کاروباری دورہ مکمل کر کے واپس لوٹ رہے ہو۔" سبحان خان نے تفصیل سے اُسے سمجھایا تو امیر سبحان خان کی چالاکی پر خوش ہوا لیکن پھر بھی جو شک اس کے دل میں تھا اس کا اظہار اس نے کر ہی دیا۔ "مگر کسی کو یہ شبہ تو نہیں ہو گا نا کہ میں اصلی فتح محمد نہیں ہوں؟"

"نہیں فتح محمد تمھارا ہی ہم عمر ہے اور دیکھنے میں بھی وہ تم جیسا ہی لگتا ہے۔" سبحان خان نے کہا۔ "بنارس سے اس کی سرداری میں جو قافلہ یہاں آیا ہوا ہے وہ ابھی واپس نہیں جائے گا میں نے اس کے متعلق بھی معلومات حاصل کر لی ہیں اس کے علاوہ اس پروانے پر فرنگیوں کی مہر لگی ہوئی ہے اس لیے کسی جگہ بھی تمھیں روکا نہیں جائے گا۔"

امیر نے بڑے دھیان سے پروانے کو دیکھا اس میں فارسی اور مراٹھی زبان میں کچھ لکھا ہوا تھا، سبحان خان نے چالاکی اور ہوشیاری سے کام لے کر اس کے لیے بہترین بندوبست کر دیا تھا جس کے لیے سبحان خان یقیناً داد کا مستحق تھا، لیکن اس بندوبست کے دوسرے پہلو پر غور کرنے کے بعد امیر کو کچھ اور ہی محسوس ہوا اُسے لگا کہ سبحان خان نے یہ سارا انتظام اپنے لیے ہی کیا ہے کیونکہ اگر وہ لوگ لوٹ مار کر کے صحیح سلامت نکل نہ سکے تو اسے بیس ہزار کیسے ملیں گے؟ شاید اپنے مطلب کے لیے ہی سبحان خان کو یہ سب کرنا ضروری تھا۔

"اب تم سوچنے میں اپنا وقت ضائع نہ کرو اور سفر کی تیاری شروع کر دو۔" سبحان خان اس طرح بولا جیسے وہ بہت جلدی میں ہو۔

"ناسک پہنچ کر تم ترائن داس کے قافلے کی راہ دیکھنا، اس کے بعد اس قافلے کو کس طرح پھانسنا ہے یہ کام میں تمھاری عقل مندی اور ہوشیاری پر چھوڑتا ہوں۔" اتنا کہہ کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور آگے بولا۔ "بھوانی دیوی تمھیں کامیابی عطا کرے۔"

سبحان خان سے ہاتھ ملانے کے بعد امیر بہت جوشیلے انداز میں اس سے لپٹ پڑا اور اسے سینے سے لگا کر بولا۔ "انشا اللہ جالان پہنچتے ہی میں آپ کی ہنڈی روانہ کر دوں گا۔"

"مجھے اس کی فکر نہیں ہے۔" سبحان خان مسکرا کر بولا۔ "میری تو یہ دلی خواہش ہے کہ تم جلد سے جلد دوبارہ بمبئی کے سفر پر آؤ اور اس بندے کو خدمت کا موقع دو۔" یہ کہہ کر وہ چل پڑا لیکن جاتے جاتے اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر یہ تسلی کر لی کہ بیس ہزار کا تحریری اقرار نامہ موجود تو ہے نا... اس کے جانے کے بعد امیر نہ جانے کتنی دیر تک اس پروانے کے کاغذ کو دیکھتا رہا، یہ پروانہ اسے اس وقت دو لاکھ کی ہنڈی کی طرح لگ رہا تھا۔ اور پھر اُسی شام امیر کی ٹولی بمبئی کو سلام کر کے رخصت ہو گئی۔

★

دو لاکھ کے شکار کے متعلق امیر نے افلاطون اور پیر خان کے سوا کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا، دو لاکھ کی لمبی چوڑی رقم کا سُن کر پیر خان تو حیرت زدہ رہ گیا تھا لیکن یہ بات اسے اچھی نہ لگی تھی کہ امیر نے سبحان خان کو بیس ہزار روپے دینے کا تحریری طور پر وعدہ کر لیا ہے۔ "صرف انگلی سے اشارہ کرنے کے بیس ہزار؟" پیر خان ذرا غصے سے بولا۔ "اُس حرام خور کے کرتوتوں کی داستان مجھے دکھن کے ٹھگوں کے ایک سردار نے آج ہی سنائی ہے۔ سبحان خان اپنے ہم پیشہ بھائیوں کی مدد تو ضرور کرتا ہے لیکن اپنا ہاتھ اُن کے سروں پر رکھ کر اُن سے ناجائز فائدہ بھی اٹھا لیتا ہے، ایک بار اس کے چنگل میں آ جانے کے بعد ٹھگوں کو ہمیشہ اس سے دبنا پڑتا ہے وہ جس ساہوکار کے یہاں ملازمت کرتا ہے اس کا آمگلنگ کا دھندہ ہے یہی وجہ ہے کہ اس کی پہنچ بہت اونچی ہے، اگر کوئی ٹھگ اس کے آگے سر اٹھانے کی ہمت کرتا ہے تو سبحان خان اُسے سرکاری مقدمے میں ملوث کر کے اُس کی زندگی پامال کر دیتا ہے۔ اپنی انھیں سب حرکتوں سے وہ حرامی آج اس قدر دولت مند بنا ہوا ہے۔"

پیر خان کی اس بات کی امیر نے کوئی پرواہ نہیں کی، لیکن اس کے دل میں سبحان خان سے نفرت اور زیادہ بڑھ گئی تھی، وہ پیر خان کو سمجھاتے ہوئے بولا۔ "یہ درست ہے پیر خان کہ میں نے بیس ہزار روپے دینے کے لیے اسے تحریری اقرار نامہ دے دیا ہے لیکن بیس ہزار روپے اسے دینا یا نہ دینا یہ تو اپنے ہی ہاتھ میں ہے تم ابھی سے اس پر سوچنا چھوڑ دو، تم تو صرف یہ دیکھنے کے لیے بے قرار ہو کہ ہمارا شکار کیسا ہے؟"

ناسک میں تین روز کے قیام کے بعد آخر کار امیر کو ایک شکار کے آنے کی اطلاع مل گئی۔ پیر خان نے یہ خوش خبری

سُناتے ہوئے کہا۔" خدا کا شکر ہے امیر میاں ان کا قافلہ یہاں پہنچ چکا ہے۔"

یہ خبر سُن کر امیر کا رواں رواں ناچ اٹھا۔" تم نے اُنھیں ٹھیک سے پہچانا ہے نا؟"

" اس معاملے میں پیر خان کبھی دھوکہ نہیں کھاتا۔" پیر خان فخریہ لہجے میں بولا۔" وہ لوگ لشکری لباس میں ہیں ان کے ساتھ تین ٹٹو ہیں اور وہ لوگ پونا سے اندور جا رہے ہیں۔"

" تمھاری ہوشیاری پر واقعی کوئی شک نہیں ہے پیر خان۔" امیر ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اب ہم پچھلے راستے سے گاؤں سے باہر نکلیں گے اور گاؤں کا چکر لگا کر صدر دروازے سے گاؤں میں داخل ہو جائیں گے اور ان کے قریب ہی اپنا پڑاؤ ڈال دیں گے۔ تم جاؤ اور سب کو تیار کیا حکم دے دو۔

ٹولی کا ہر رکن اچانک ہی جوش میں آگیا۔ ان میں سے ہر کوئی یہ سمجھ رہا تھا کہ اب اسے اپنا ہاتھ دکھانے کا موقع ملے گا، وہ سب کے سب یہ سوچ رہے تھے کہ انھیں بڑی ہوشیاری سے کام لے کر ان مسافروں کا اعتبار حاصل کرنا ہو گا اگر اُن سے ذرا سی بھی لغزش ہو گئی تو ان کے پورے گروہ کی جان خطرے میں پڑ جائے گی۔

جس گاؤں میں وہ تین دن تک رہ چکا تھا اسی گاؤں میں امیر دوبارہ اپنی ٹولی کے ساتھ داخل ہو گیا اور نئے آنے والے مسافروں کی طرح اُس نے اپنے شکار کے بالکل برابر ہی اپنا پڑاؤ ڈال دیا۔ ساہوکار کے قافلے کے سردار نرائن داس سے دو ایک بار اس کی نظریں ملیں اور دونوں میں مسکراہٹوں کا تبادلہ بھی ہوا، اونچے قد کے نرائن داس کی بار بار پلک جھپکتی ہوئی آنکھوں سے امیر کو یہ اندازہ ہو گیا کہ یہ شخص کافی پہنچا ہوا ہے۔ اسے کوئی آسانی سے اپنے جال میں نہیں پھانس سکتا، لیکن پھر بھی امیر کو اپنی ہمت اور طاقت پر پورا بھروسا تھا اس نے افلاطون کے کان میں کہا۔" دوست اس آدمی کی موت تیرے ہاتھوں لکھی جا چکی ہے۔ بس یہ سمجھ لو دو لاکھ کی رقم اب ہماری جیب میں ہے۔"

" امیر میں تمھاری پہلی بات تو مان لیتا ہوں کہ اس کی موت تمھارے ہاتھوں لکھی ہوئی ہے۔" افلاطون نے سنجیدگی سے کہا۔" لیکن دوسری بات کو ماننے کے لیے میرا ذہن تیار نہیں ہے۔"

" کیا مطلب؟" امیر نے چونک کر افلاطون کی طرف دیکھا۔" ہمارے ہاتھوں ختم ہونے کے بعد اس کی دولت ہمارے ہاتھ میں نہیں آئے گی کیا تم یہی کہنا چاہتے ہو؟"

" نہیں۔" افلاطون نے اپنے شک کا اظہار کیا۔" میں یہ تسلیم ہی نہیں کرتا کہ دو لاکھ روپے ان لوگوں کے پاس ہوں گے۔ اتنی بڑی رقم کا خطرہ مول لے کر صرف چند آدمی سفر پر جانے کی ہمت نہیں کر سکتے، اگر ان کے پاس رقم کا خطرہ ہوتا تو وہ یوں ہنستے مسکراتے نظر نہ آتے۔"

" یہ تمھاری بھول ہے افلاطون۔" امیر نے دلیل پیش کرتے ہوئے اُس سے کہا۔" سفر کے دوران اگر کوئی شخص بے فکری سے بات چیت کرتا نظر آئے تو سمجھ لو کہ اُس کے پاس بہت مال ہے، لوگ اس طرح کا دکھاوا اس لیے کرتے ہیں کہ سامنے والوں کو ان پر کوئی شک نہ ہو۔"

امیر کی بات ابھی ختم ہی ہوئی تھی کہ پیر خان ان کے قریب آکر بولا۔" امیر میاں میں نے اس قافلے کے دو ایک آدمیوں سے جان پہچان پیدا کر لی ہے۔ ہمارے اتنے بڑے قافلے کو دیکھ کر وہ پوچھنے لگے کہ ہم لوگ کون سا راستہ اپنائیں گے؟ تو میں نے انھیں جواب دیا کہ یہ سب ہمارا سردار فتح محمد ہی بتا سکتا ہے کیونکہ ہم تو اپنے سردار کے حکم پر ہی چلتے ہیں۔"

پیر خان کا یہ جواب امیر کو پسند آیا۔" اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ انھیں بھی کسی بڑے قافلے کے ساتھ کی ضرورت ہے۔ ویسے یہ تم نے اچھا کیا کہ اپنی غرض کا اظہار نہیں کیا۔ اس کے علاوہ تم نے یہ بھی اچھا کیا کہ میرا نقلی نام بھی ان کے کانوں تک پہنچا دیا، اب تم لوگوں کو بھی مجھے مخاطب کرتے ہوئے احتیاط سے کام لینا پڑے گا، بلکہ مجھے امیر کہنے کے بجائے صرف "میاں" کہنے کی عادت ڈال لو۔" پھر دوسرے ہی دن امیر نے نرائن داس سے جان پہچان پیدا کر لی۔ گفتگو کی ابتدا تو اِدھر اُدھر کی فالتو باتوں سے ہوئی تھی۔

نرائن داس کہنے لگا...

" بزدل باجی راؤ نے ساری بازی بگاڑ کر رکھ دی ہے اگر اُس نے ایمانداری سے سرداری کے فرائض پورے کیے ہوتے تو انگریزوں کی یہ ہمت کبھی نہ ہوتی کہ وہ مراٹھوں کے مقابلے پر اترتے بلکہ اُن کی فوجیں صرف بمبئی کے علاقے تک ہی محدود رہتیں۔"

" مگر اس میں باجی راؤ کا ہی قصور نہیں ہے۔" امیر نے بات کو جاری رکھنے کی غرض سے دلیل پیش کی۔ " انگریزوں کے پاس تجربہ کار سردار ہیں اور ان کے پاس بہترین جدید ہتھیار ہیں، مجھے یقین ہے انھیں ہندوستان کو فتح کرنے سے کوئی روک نہیں سکتا۔"

" میاں آپ تو اس طرح کہہ رہے ہیں جیسے آپ کافی لڑائیاں لڑ چکے ہیں؟"

" آپ کا اندازہ کچھ درست بھی ہے۔" امیر نے چالاکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے آگے کہا۔" میں کافی عرصے تک سپاہی رہ چکا ہوں، لیکن اس پیشے میں مجھے مزہ نہیں آیا اس لیے مجبوراً میں نے ساہوکار کی ملازمت کر لی اور اُس کے کاروباری قافلے کا سردار ہوں، زندگی سکھ چین سے بسر ہو رہی ہے اور ساہوکار کی بھی خاص مہربانی ہے۔"

نرائن داس امیر کو گھور گھور کر دیکھنے لگا، اُس کا تجسس بڑھتا جا رہا تھا۔" تب آپ یہ بھی بتا دیں کہ آپ کس لشکر میں سپاہی تھے؟"

اُس کا سوال سُن کر امیر تھوڑی دیر تک تو خاموش رہا پھر اِدھر اُدھر نظر ڈالنے کے بعد دھیمی آواز میں بولا۔" یہ آپ اپنے تک ہی محدود رکھیے گا اگر یہ بات کھل گئی تو میں اپنی سکھ کی زندگی سے محروم ہو جاؤں گا۔"

" آپ بالکل بے فکر رہیں۔" نرائن داس کا تجسس جب حد سے زیادہ بڑھ گیا تو امیر نے وقت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے دھماکہ کر ہی دیا۔" میں باغیوں کے سب سے بڑے سردار چیتو کے لشکر میں شامل تھا۔"

" کیا؟" نرائن داس چونک کر اس طرح اُسے دیکھنے لگا جیسے اُسے یقین نہیں آرہا ہو، امیر چند لمحوں تک تو اُس کے تاثرات کو دیکھتا رہا پھر بولا۔" جی ہاں... میرا اصلی نام امیر علی ہے چیتو کی دو چڑھائیوں میں میں اس کے ساتھ تھا، اور آخر میں اُس نے مجھے تین ہزار باغیوں کی سرداری سونپی تھی۔ چیتو بڑا ہی ہمت والا اور بہادر تھا، لیکن باغیوں کے ظلم و ستم کو دیکھ کر میرا دل کڑھتا رہتا تھا، مجھے یہ یقین ہو چکا تھا کہ رعایا پر اس طرح بے رحمی سے ظلم کرتے رہنے سے وہ انگریزوں کو کبھی بھی شکست نہیں دے سکے گا، میرا اسی بات پر چیتو سے اختلاف ہو گیا اور پھر میں اس کے لشکر سے علیحدہ ہو گیا۔" اتنا کہنے کے بعد امیر خاموش ہو گیا، لیکن نرائن داس کے چہرے سے اُسے یہ لگ رہا تھا جیسے وہ یقینی اور بے یقینی کی کشمکش میں مبتلا ہو۔ تب اس نے پچھلی دونوں چڑھائیوں کے کچھ واقعات بھی اُسے سُنا دیے ان واقعات کو سُن کر وہ حیرت سے چونک کر بولا۔" تو گویا غفور خان کے بعد چیتو کا جو سب سے چہیتا سردار امیر علی تھا وہ امیر علی آپ ہی تھے؟"

" جی ہاں جناب وہ امیر علی میں ہی ہوں۔" امیر کا خیال تھا کہ پہلی بازی وہ جیت چکا ہے، اس لیے وہ آگے بولا۔" میں تین ہزار باغیوں کا سردار رہ چکا ہوں۔ یہ جان کر کوئی بھی مجھے ملازمت نہ دیتا اس لیے میں نے اپنا نام فتح محمد رکھ لیا یہ دیکھیے یہ رہا پروانہ۔" امیر نے موم لفافے کے اندر سے پروانے کا کاغذ نکال کر اُس کے آگے رکھ دیا تو اس کا نتیجہ کچھ اچھا ہی ظاہر ہوا۔

" ارے واہ اس میں تو انگریزوں کی سرکاری مہر لگی ہوئی ہے۔ یعنی راستے میں تمھیں کہیں کوئی روک ٹوک نہیں ہو گی۔" نرائن داس پروانہ دیکھ کر خوشی سے بولا۔

" بھلا یہ پروانہ آپ نے کس طرح حاصل کیا؟"

" ہمارے ساہوکار کے سبحان خان نامی ایک شخص سے گہرے تعلقات ہیں۔ اُسی نے انگریزی سرکار سے یہ پروانہ لا کر مجھے دیا تھا۔"

" تو یہ بات ہے۔" نرائن داس کی آنکھوں میں ایک چمک سی لہرا گئی۔" سبحان خان کو تو میں بھی اچھی طرح جانتا ہوں اور اب تو ہماری جان پہچان بھی ایک دم پکی ہو گئی ہے یہ بہت ہی اچھا ہوا کہ سفر میں ہمارا ساتھ

رہے گا۔"

امیر کا جی خوشی سے ناچنے لگا لیکن اُس نے بہ مشکل خود کو روکے رکھا۔ اُس نے نرائن داس پر اپنی خوشی کا ذرا بھی اظہار نہیں ہونے دیا۔ اُس نے جان بوجھ کر نرائن داس کی بات کا جواب نہیں دیا تھا، اس لیے اُسے خاموش دیکھ کر نرائن داس خود ہی بول اٹھا "یہ آپ آخر کس سوچ میں پڑ گئے؟ کیا ہمارے ساتھ سفر کرنے میں آپ کو خوشی محسوس نہیں ہو رہی ہے؟"

"یہ آپ نے کیسے سمجھ لیا؟" امیر نے دھیرے دھیرے جال بچھانا شروع کر دیا۔

"بات دراصل یہ ہے کہ میرے قافلے میں سوا سو آدمی شامل ہیں۔ اس لیے ہم مختصر سے مختصر راستہ پسند کریں گے۔ اور اگر آپ کے پاس رقم کا خطرہ ہو گا تو آپ گھاٹ کے راستے جانا منظور نہیں کریں گے۔"

"آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔" نرائن داس نے جیسے امیر کو ایک جھٹکا سا دیا اور امیر کو لگا کہ جیسے وہ ابھی یہ کہہ دے گا کہ ہاں ہم لوگ تو لمبے راستے سے ہی سفر کریں گے آپ لوگ جس راستے سے جانا ہو جائیں۔ یہ سوچ کر امیر چند لمحوں کے لیے تو پریشان سا ہو گیا، لیکن نرائن داس کو تو اس کی توقع کے خلاف کچھ اور ہی کہنا تھا۔ "جناب مجھے اگر پندرہ بیس آدمیوں کے ساتھ ہی جانا ہوتا تو سندھوا گھاٹ کا راستہ خطرناک سمجھتا لیکن اگر آپ سب لوگوں کا ساتھ رہے گا تو پھر ہمیں ڈر کس بات کا ہے؟ اور اب آپ سے کیا چھپانا دراصل اس بار ہمارے پاس کافی رقم موجود ہے۔"

یہ بات میں اچھی طرح جانتا ہوں بیٹے اس لیے تو تم سے دوستی گانٹھنے کے لیے آیا ہوں، امیر دل ہی دل میں بڑبڑایا مگر پھر فوراً ہی اُسے ڈر لگا کہ کہیں اس کے دل کی بات نرائن داس سُن نہ لے اس لیے وہ جلدی سے بول پڑا۔ "تب تو ہمارا یہ سفر دلچسپ ثابت ہو گا، ویسے تو ہم دونوں ہی ہم پیشہ ہیں آج مال و دولت کا خطرہ آپ کے پاس ہے تو کل یہ خطرہ ہمارے پاس بھی ہو سکتا ہے، اس لیے ہمیں ایک دوسرے کا ساتھ دینا ہی چاہیے۔"

"تو پھر بات پکی ہو گئی۔" نرائن داس جلدی سے بولا "یہاں سے جانے کا فیصلہ کر لیجیے گا تو بتا دیجیے گا کہ لشکر میں رہ کر آپ نے جو کارنامے انجام دیے ہیں ان کے دوران ان کو سُن کر ہمیں خوشی ہو گی۔"

"ٹھیک ہے تقدیر نے اگر ہمیں ہم سفر بنا ہی دیا تو ساتھ تو دینا ہی پڑے گا۔" امیر اٹھتے ہوئے بولا۔ اس میں اب ایک عجیب سا جوش پیدا ہو گیا تھا وہ پیر اور افلاطون کو جلد سے جلد ساری باتیں بتا دینا چاہتا تھا مگر اس نے اپنی چال سے کسی کو بھی یہ اندازہ لگنے نہ دیا کہ وہ خوشی سے بے قابو ہوتا جا رہا ہے۔

"اچھا پھر ملاقات ہو گی۔" اتنا کہہ کر وہ باہر نکل گیا تھا لیکن دل ہی دل میں وہ سوچ رہا تھا کہ اب تو وہ لاکھ کا مالک بن ہی چکا ہے۔

✱

بیس دنوں کے اس سفر میں نرائن داس کو اس بات کا ذرا سا بھی شبہ نہیں ہوا کہ اس نے اپنی اور ساتھیوں کی جان و مال کی حفاظت کے لیے جن لوگوں کا سہارا لیا ہے وہ لوگ خطرناک ٹھگ ہیں اور وہ ان بچھائے ہوئے جال میں پوری طرح پھنس چکا ہے، اس کی جان لینے والے یہ لوگ باہر سے کتنے بھولے اور شریف دکھائی دیتے ہیں اس کا تو اسے اندازہ ہو سکا۔ سفر بڑے ہی خوش گوار ماحول میں طے ہو رہا تھا، نرائن داس بے حد خوش تھا اسے امیر علی تو ایسا شخص لگ رہا تھا جس سے زندگی بھر کے لیے دوستی کو اُس کا جی چاہنے لگا تھا، امیر علی کا ہم سفر بن کر اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھنے لگا تھا اور اسے اپنے بھگوان کا احسان سمجھتا تھا۔ جبکہ دوسری طرف امیر، پیر خان اور افلاطون کا دماغ کبھی کبھی تن جاتا تھا اور وہ کہتا دل ہی دل میں بھوانی دیوی کے شکر گزار ہو رہے تھے کہ اس نے ایک بہت موٹا تازہ شکار ان کی جھولی میں ڈال دیا۔ کام کو ابھی اور اسی وقت آسانی سے انجام دیا جا سکتا ہے اسے کل پر کیوں چھوڑنا چاہیے؟" لیکن تجربہ کار

دلیل امیر کے دل کو زیادہ لگتی تھی۔ پیر خان کا کہنا تھا کہ جب تک ہم لوگ خود کسی محفوظ مقام تک نہیں پہنچ جاتے اس وقت تک... نرائن داس اور اس کے ساتھیوں کو زندہ رکھنا ہمارے لیے ضروری ہے کیونکہ گھاٹ اور جنگل میں باغیوں اور لٹیروں کی موجودگی کا خطرہ ہوتا ہے۔ اس خطرناک اور سنگی علاقے سے گزرنے کے بعد ہی ہم انھیں ختم کریں گے، ممکن ہے آگے چل کر لٹیروں کے گروہ سے ہماری مڈبھیڑ ہو جائے اگر ایسا ہو گیا تو ہمیں مقابلے کے لیے ان لوگوں کے ساتھ کی ضرورت پڑے گی۔

باہر کی خوشی اور اندر کی تنگ دلی کے درمیان امیر کے ٹھگ ساتھیوں نے بیس روز کا سفر طے کر لیا تھا یہاں سے اندور اب صرف پانچ منزلوں کے فاصلے پر تھا روزانہ تیس میل کا سفر طے ہو رہا تھا، لیکن اب اُن سب لوگوں کو تھکن سی ہونے لگی تھی اور ان کے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہوتا جا رہا تھا۔

"اب اس جگہ سے ہمارے راستے الگ ہو جائیں گے۔" نرائن داس کے لہجے میں اپنا سفر پورا ہو جانے کی خوشی بھی تھی اور امیر علی سے جدا ہونے کا رنج بھی تھا۔ "آپ کی یہ صحبت میں زندگی بھر نہیں بھولوں گا شام یا رات تک شاید ہم لوگوں کی راہیں جدا ہو جائیں گی۔"

یہ سُن کر امیر دل ہی دل میں ہنسا جیسے اپنے آپ سے کہہ رہا ہو... بس اب وہ گھڑی آ پہنچی ہے اس سے پہلے کہ رات کا چاند طلوع ہو تمھاری زندگی کا سورج غروب ہو جائے گا اور تمھارا سفر بھی پورا ہو جائے گا۔

"ابھی تو بہت دیر ہے۔" امیر نرائن داس کی طرف دیکھ کر بولا۔ لیکن دراصل وہ اپنے ساتھوں کو سنا رہا تھا۔ "مگر جدا ہو جانے سے آخری بار ہم گانے بجانے کی محفل ضرور جمائیں گے کسے خبر ہے کہ پھر کبھی ہماری ملاقات ہو یا نہیں؟"

سورج غروب ہو چکا تھا اور چاند بادلوں کے درمیان دھیرے دھیرے رینگنے لگا تھا نرائن داس نے چاند پر نظر ڈالنے کے بعد اپنے سامنے بیٹھے ہوئے گانے والے کی جانب توجہ دی، گیت کے بول سُن کر اُسے اپنے گھر کی یاد ستانے لگی تھی، بیوی اور بچوں کے چہرے اس کی نگاہوں میں گھومنے لگے تھے، جدائی کے دن اب ختم ہونے والے تھے ملاپ کی گھڑیاں قریب آتی جا رہی ہیں اس خیال سے اس کی آنکھوں کے گوشوں میں ہلکی سی نمی آ گئی تھی اور تب امیر نے اس کی جانب دیکھ کر یہ اندازہ لگا لیا کہ جدائی کے دُکھ کو یہ شخص محسوس کر سکتا ہے، اچانک امیر کے دل میں اس کے لیے ہمدردی کا ایک جذبہ جاگا اور وہ سوچنے لگا کہ محبت کا یہ بندھن آدمی کو کس قدر مجبور کر دیتا ہے اُسے نرائن داس پر تھوڑا سا غصہ بھی آ رہا تھا کہ کم بخت ٹھگ لوگوں کی پہچان بھی نہیں کر سکا۔ آخر اُسے اتنی بڑی رقم کا خطرہ اٹھا کر سفر کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟

"بس تیار۔" گیت کے ختم ہوتے ہی نرائن داس نے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "اب ہم چلیں گے۔"

اس کے ساتھ ہی اس کے تمام ساتھی اپنا اپنا سامان سنبھالتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ امیر نے ایک ہی نظر میں یہ دیکھ لیا تھا کہ اُس کے تین تین چار چار ساتھی نرائن داس کے ایک ایک ساتھی کے پیچھے کھڑے ہو چکے تھے۔

"جناب رخصت ہونے سے پہلے ہم لوگ گلے تو مل لیں۔" امیر مسکرا کر بولا۔

"ارے ہاں یہ تو مسلمانوں میں رواج ہے، میں تو اسے بھول ہی گیا تھا۔" کہہ کر نرائن داس امیر سے بغل گیر ہونے کے لیے تھوڑا سا جھکا اور امیر نے اس موقعے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے ساتھیوں کو اشارہ دے دیا۔

"پان لاؤ۔" اس کی زبان سے ان الفاظ کا نکلنا تھا کہ ہر شکار کی گردن پر رومال کا پھندہ پڑ گیا، دو ایک گھٹی گھٹی سی چیخیں بلند ہوئیں اور کھیل ختم ہو گیا، امیر کا پیلا رومال نرائن داس کی گردن پر کسی سانپ کی طرح لپٹا ہوا تھا اس کی زبان سے صرف 'آہ' اور 'اف' کے سوا کوئی آواز نہیں نکلی تھی صرف دو تین منٹوں میں ہی بائیس لاشیں زمین پر پڑی تھیں۔

ان لاشوں کو دفنانے کے لیے ایک بہت بڑا گڑھا تیار کر لیا گیا تھا۔ لاشیں چپ چاپ اٹھتی گئیں اور اس گڑھے میں گرتی گئیں، اس وقت تک امیر نے ان کے مال اسباب کی جانچ کر لی تھی وہ اس جانچ پڑتال کے بعد اچانک ہی وہ

چیخ اٹھا تھا... "جے بھوانی دیوی کی ہمارا یہ سفر انتہائی کامیاب سفر ثابت ہوا ہے۔ سبحان خان کی بات بالکل سچ نکلی ہے اس پورے دو لاکھ کے مال کے ہم مالک بن چکے ہیں۔"

دو لاکھ... ؟ جو ٹھگ ناواقف تھے ان کے لیے تو یہ بات خوشی کا جھٹکا بن گئی تھی انھوں نے جس جگہ نرائن داس اور اس کے ساتھیوں کو دفنایا تھا اُسی جگہ بیٹھ کر ایک بار پھر زور زور سے گانا بجانا شروع کر دیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنی خوشی کو روک نہیں پا رہے ہیں۔

◇

گھر پہنچتے ہی امیر کو پتا چل گیا کہ عظیمہ کو پانچواں مہینا چل رہا ہے یہ خوش خبری سُن کر وہ دو لاکھ کی رقم کی خوشی کو بالکل ہی بھول گیا، اسے اس بات کا یقین ہو چکا تھا کہ بھوانی دیوی اب اُس پر مہربان ہو چکی ہے، اس لیے تو دوبارہ اس کی قسمت کے دروازے کھل رہے ہیں اور اُسی وقت امیر نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اب وہ زندگی بھر اپنے پیلے بال کو نہیں چھوڑے گا، اور زندگی کے آخری لمحوں تک بھوانی دیوی کا کام کرتا رہے گا۔

◇

بیٹا آنی ہے۔" نُور نے خوش خبری سُنائی تو افلاطون خوشی سے اچھلتا ہوا امیر کمرے کی طرف دوڑ گیا...

عظیمہ کو پچھلے دو ماہ سے بڑی تکلیف اٹھانی پڑی تھی، پہلوٹھی اولاد کو کھو دینے کے بعد عورت جب دوسری بار ماں بننے والی ہوتی ہے تو اُسے دوہری تکلیف اور دوہرے وسوسوں سے گزرنا پڑتا ہے، جب مہینے گننے کا وقت گزر گیا اور دن شمار ہونے لگے تو امیر کو بھی عظیمہ کی زندگی کی فکر ہونے لگی تھی۔ جیسے جیسے اس کے باپ بننے کی گھڑی نزدیک سے نزدیک تر ہوتی جا رہی تھی ویسے ویسے وہ خدا کی عبادت میں زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے لگا تھا۔ روز بروز کمزور اور پھیکی پڑتی ہوئی عظیمہ کو دیکھ کر امیر کو خوف سا آنے لگا تھا وہ ڈر رہا تھا کہ اولاد دے کر قدرت کہیں اس کی بیوی کو اُس سے چھین نہ لے۔ اس وقت تک تو اس نے خدا سے ایک ہی درخواست کی تھی کہ خدا تم نے مجھ پر رحم کیا ہے تو اتنی مہربانی بھی ضرور کرنا کہ عظیمہ کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ لیکن آخری وقت میں تو وہ بیٹے کے آنے کو بھی بھول گیا اور خدا سے یہ دُعا کرنے لگا کہ پروردگار تیری مرضی ہے تو چاہے مجھے بیٹا دے یا بیٹی لیکن عظیمہ کو زندگی ضرور دینا۔

جب دائی نے کمرا اندر سے بند کر لیا اور دو گھنٹے بعد بھی امیر کو اندر سے بچے کے رونے کی آواز نہیں آئی تو امیر کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور اپنے بے قرار دل کو سمجھانے کے لیے اپنے کمرے میں بند ہو کر خدا کی عبادت کرنے میں مصروف ہو گیا۔

"امیر دروازہ کھولو جلدی۔" افلاطون کی آواز میں چھپی ہوئی خوشی نے امیر کو بے قابو کر دیا اُس نے بھاگ کر دروازہ کھولا تو سامنے کھڑے ہوئے افلاطون نے جھپٹ کر اُس کا ہاتھ پکڑ لیا اور ہنستے ہوئے بولا۔ "تم باپ بن گئے ہو امیر بیٹی کے باپ۔"

"خدا کا شکر ہے۔" کہہ کر اس نے افلاطون کو اپنے سینے سے لگا لیا اور آگے بولا۔ "عظیمہ کی طبیعت کیسی ہے میں جا کر دیکھ آتا ہوں۔"

"لیکن ابھی ہم سب کے لیے اندر جانا منع ہے۔" افلاطون کی اس بات کو سُن کر بھی امیر وہاں رُک نہیں سکا وہ افلاطون سے اپنا ہاتھ چھڑا کر سیدھا عظیمہ کے کمرے کی طرف بڑھتا چلا گیا، ابھی وہ کمرے کے دروازے تک پہنچا ہی تھا کہ اچانک دائی اپنے دونوں ہاتھوں میں نومولود بچی کو اٹھائے اُس کے سامنے آ گئی اور اس سے بخشش مانگتے ہوئے بولی۔ "خدا نے چاند جیسی بیٹی دی آپ اس خوشی کے موقعے پر مجھے کیا دیں گے مالک۔"

لیکن امیر تو اپنی نوزائیدہ بچی کے ناک نقشے کو دیکھنے میں مصروف ہو چکا تھا... اس کے پتلے پتلے نازک ہونٹ چھوٹی سی ناک، بند آنکھوں کی پلکوں پر ریشمی جھالر سُرخ سُرخ گال، یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ایک ٹک عظیمہ کو دیکھ رہا ہو، اچانک وہ بچی کی پیشانی پر بوسہ دینے کے لیے جُھکا لیکن اس سے پہلے کہ اس کے ہونٹ بچی کو چھوتے نوزائیدہ بچی یکایک ہی رونے لگی، یہ

دائی نے اُسے فوراً ہی عظیمہ کے پہلو میں لٹا دیا۔

اب امیر کی نظر عظیمہ کی جانب اٹھی، عظیمہ بھی اسی کی جانب دیکھ رہی تھی۔ دونوں کی نگاہیں ملیں عظیمہ کی نظروں سے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ امیر سے طنزیہ لہجے میں کہہ رہی ہو، کیوں اولاد پیدا ہوتے ہی میری قدر و قیمت گھٹ گئی نا؟

امیر دھیرے دھیرے چلتا ہوا عظیمہ کے بستر کے قریب آ گیا اور گنگا بھابی، نُور اور دائی کی موجودگی کو بھول کر گھٹنوں کے بل عظیمہ کے پلنگ کے قریب بیٹھ گیا اور عظیمہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ "بالکل تم جیسی ہے ہماری بیٹی۔" اتنا کہہ کر اُس نے عظیمہ کے چہرے کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا، لیکن دوسروں کی موجودگی سے شرما کر عظیمہ نے فوراً ہی اپنا مُنہ پھیر لیا۔ ٹھیک اسی وقت افلاطون نے آ کر پُر مذاق لہجے میں عظیمہ سے کہا۔ "بہن ہمارے برکت کے لیے دلہن کی تلاش میں اب ہمیں گھر سے باہر نہیں جانا پڑے گا تم کہو تو ابھی سے منگنی کر لی جائے۔" یہ سُن کر عظیمہ کو ہنسی آ گئی مگر اُس نے اپنے ہونٹ اس طرح بھینچ رکھے تھے جیسے اُس کو ہنسنے میں شدید تکلیف محسوس ہو رہی ہو۔ افلاطون نے اُن دونوں کو تنہائی میں باتیں کرنے کا موقع فراہم کرنے کی غرض سے ایک بار پھر مذاق کا سہارا لیتے ہوئے نُور سے کہا۔ "نُور چلو اب ہم سب باہر چلے جائیں۔ میاں بیوی کو صلاح مشورے کے لیے ہمیں تھوڑا وقت دینا بھی چاہیے۔"

وہ سب ہنستے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے اور کمرے کے اندر مکمل خاموشی چھا گئی، لیکن عظیمہ جب کافی دیر تک کچھ نہ بولی تو مجبوراً امیر کو ہی پوچھنا پڑا۔ "کیا مجھ سے ناراض ہو؟"

عظیمہ نے انکار میں سر ہلایا تو امیر نے ایک پھیکی مسکراہٹ سے دوسرا سوال پوچھا۔ "شاید تمھیں بیٹا نہ ہونے کا دکھ ہے؟" ابھی تو یہ سوال اُس کے ہونٹوں پر ہی تھا کہ عظیمہ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ یہ دیکھ کر امیر نے فوراً ہی اپنی دو انگلیوں سے اس کے آنسو اس طرح پونچھ دیئے جیسے وہ انھیں عظیمہ کے چہرے پر بہتے ہوئے دیکھ ہی نہ سکتا ہو۔ "ارے پگلی خدا نے جو کچھ بھی دیا ہے اُسے خوشی سے قبول کر لینا چاہیئے آج اُس نے بیٹی دی ہے تو دوسری بار بیٹا بھی دے گا۔" مگر عظیمہ کے چہرے پر اُسے اپنے اس دلاسے کا کوئی اثر ہوتا نظر نہیں آیا۔ وہ سسکیاں بھرتی ہوئی بہ مشکل اتنا ہی کہہ سکی۔ "میں جانتی ہوں تم یہ سب مجھے خوش کرنے کے لیے کہہ رہے ہو۔"

"کیا جانتی ہو تم؟" امیر اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ "اس میں تمھیں خوش کرنے والی کون سی بات ہے؟"

"ہے کیوں نہیں؟" عظیمہ نے بڑی مشکل سے اپنی سسکیاں روک کر کہا۔ "جو عورت اپنے شوہر کو بیٹا نہیں دے سکتی وہ بدنصیب کہلاتی ہے۔ تم ہی بتاؤ کیا تم بیٹے کے لیے اتنے سالوں سے ترس نہیں رہے ہو؟"

"تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہم بیٹی کی پیدائش پر خوشی نہ منائیں؟" امیر نے ذرا اُونچی آواز میں کہا اور پھر پیار بھرے لہجے میں آگے بولا۔ "اپنی اس بیٹی کو دیکھنے کے بعد تو مجھے تم پر اور زیادہ پیار آنے لگا ہے۔"

لیکن امیر کو اُس کی آنکھوں کے تاثرات سے یوں لگ رہا تھا جیسے اُس کی بات کا عظیمہ کو یقین ہی نہ آیا ہو اسی لیے وہ آگے بولا۔ "کیا یہ بات بھی میں تمھیں خوش کرنے کے لیے کہہ رہا ہوں؟"

"میں تو صرف اتنا ہی جانتی ہوں۔" عظیمہ بولتے بولتے اٹک گئی لیکن تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد وہ بولی۔ "بیوی اگر اپنے خاندان کو بیٹا نہ دے سکے تو خاوند کا دل دوسری شادی کے لیے سوچنے لگتا ہے۔"

"ہٹ تیری۔" امیر نے مذاق میں اس کے گال پر چپت ماری، لیکن عظیمہ ابھی تک سنجیدہ تھی۔ اُس کی اس سنجیدگی کو دیکھ کر امیر کو اپنی گھٹی ہوئی آواز میں کہنا پڑا۔ "عظیمہ تم دوسری بیوی کے شک کو اپنے دل سے نکال دو۔ میں اپنی اس معصوم بچی کے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاتا ہوں کہ تم ہی میری پہلی اور آخری بیوی رہو گی۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ گیا اور آگے بولا۔ "تم نے اگر مجھے بیٹا نہیں دیا تو کیا ہوا؟ اس بار سفر میں اگر مجھے کوئی اچھا سا لڑکا مل گیا تو میں اسے بیٹا بنا کر تمھارے لیے لے آؤں گا بس...؟" اتنا کہنے کے بعد امیر تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆

اس سال بہت سے ٹھگ امیر کی سرداری میں سفر پر جانے کے لیے تیار ہوئے تھے۔ بمبئی کے سفر میں دو لاکھ کی خطیر رقم حاصل کرنے کے بعد تو امیر کا طوطی ٹھگوں کی چھوٹی بڑی ٹولیوں میں گونجنے لگا تھا۔ اس خوش قسمت سردار کی ٹولی میں شامل ہو کر اپنی قسمت آزمانے کے لیے تقریباً چار سو نئے اور پرانے ٹھگ اس سے ملنے کے لیے آئے تھے۔ وہ سب دسہرے کے تہوار سے قبل ہی ایک جگہ اکٹھے ہو گئے تھے، ٹھگوں کی اتنی بڑی تعداد میں سے اپنی ٹولی کے لیے آدمیوں کا انتخاب کرنا امیر کے لیے خاصا مشکل مسئلہ بن گیا تھا۔ اس بار وہ پہلے سے بھی زیادہ بڑی ٹولی کو ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ کیونکہ اب دیس میں تقریباً سکون اور امن و امان بحال ہو چکا تھا اور مالدار کاروباری لوگ باہر کے سفر پر آنے جانے لگے تھے۔ یہ ہی وجہ تھی کہ اس نے تقریباً پونے تین سو ٹھگوں کی ایک بہت بڑی ٹولی بنائی تھی۔ نئے آنے والوں میں سے اس نے زیادہ تر ایسے ہی ٹھگوں کا انتخاب کیا تھا جو گانے بجانے اور سفر کے دوران مسافروں کا دل بہلانے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اس دوران اس نے پیر خان سے اپنی دلی تمنا کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا۔ "اس سفر کے دوران میں پورے ملک کے ٹھگوں کی دنیا میں اپنے نام کا ڈنکا بجا دینا چاہتا ہوں۔ میں ایک بار تو ان کی زبان سے یہ کہلوا دینا چاہتا ہوں کہ امیر علی جیسا ٹھگ آج تک دنیا میں پیدا نہیں ہوا ہے۔"

"مگر اس میں اب کسر ہی کیا رہ گئی ہے؟" پیر خان خوشامدانہ لہجے میں بولا۔ "میں ایک طویل عرصے سے سفر پر جاتا رہا ہوں، لیکن کبھی میں نے کسی سردار کی ٹولی میں ایک ساتھ اتنے ٹھگوں کو شامل ہوتے نہیں دیکھا۔"

اتنا کہہ کر وہ دھیرے سے بولا۔ "اس بار تو ایک کم عمر لڑکا بھی تمہاری ٹولی میں شامل ہونے کے لیے آیا ہے۔"

"لڑکا؟" امیر نے پُرتجسس نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ "کون ہے؟ کہاں ہے وہ؟ میں نے تو کسی لڑکے کو نہیں دیکھا؟"

"میں نے اُسے ایک جگہ ٹھہرایا ہے۔" پیر خان نے عاجزانہ انداز میں تفصیل بتائی۔ "وہ میرا بھانجا عالم نام ہے اس کی عمر ابھی صرف گیارہ ہی سال ہے لیکن وہ بے چالاک اور ہوشیار ہے۔ وہ تمہیں دیکھتے ہی پسند آجائے گا۔"

"لیکن اتنی کم عمری میں اُسے سفر پر کیوں لے جا رہے ہو؟" امیر کی آواز میں ناراضگی کی جھلک تھی جسے محسوس کر کے پیر خان تھوڑی دیر کے لیے خاموش رہا پھر آہستہ سے بولا۔ "امیر میاں تم تو جانتے ہی ہو کہ میرا کوئی بیٹا نہیں ہے اس لیے اپنی بہن سے میں نے اسے مانگ لیا ہے، میں بوڑھا ہوتا جا رہا ہوں دو چار سفر تک جی سکوں گا یا نہیں یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ میرے بعد ہمارا سارا دارومدار اسی لڑکے پر ہے، میں اسے ٹھگی کے سوائے کسی اور دھندے میں نہیں ڈال سکتا۔ اب تم ہی بتاؤ تم جیسا دوسرا سردار اسے کیسے مل سکتا ہے۔ تمہاری ٹولی میں رہے گا تو وہ دیکھتے ہی ہوشیار اور قابل ٹھگ بن جائے گا۔"

"لیکن وہ کم عمر اور معصوم ہے کیا وہ مسافروں کو شکار اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے گا؟" امیر کو اب بھی اس گیارہ سالہ بچے کو ساتھ لے جانے کی خواہش نہیں تھی۔

"نہیں میاں اس سفر میں ہم اُسے یہ سب دیکھنے کا موقع نہیں دیں گے۔ ویسے تو میں بھی جب صرف تیرہ سال کا تھا تو تمہارے والد کے ساتھ سفر پر روانہ ہوا تھا اور بڑی آسانی سے میں نے یہ سب برداشت کر لیا تھا۔" پیر خان نے کہا۔

اُس کی بات سُن کر امیر کسی سوچ میں ڈوب گیا۔ اُسے خاموش دیکھ کر پیر خان نے آگے کہا۔ "تم ایک بار اسے دیکھ تو لو۔ مجھے یقین ہے کہ تم ساتھ لے جانے سے انکار نہیں کرو گے، اس کے علاوہ اگر وہ ہمارے ساتھ ہو گا تو کسی کو ہم لوگوں پر شک نہیں ہو گا۔"

"ٹھیک ہے جاؤ لے آؤ اُسے۔" امیر یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا تھا کہ اچانک ایک ٹھگ نے آکر پیر خان کے کان میں کچھ کہا۔ اُس کی بات سُن کر پیر خان کی آنکھوں میں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔ اس کے چہرے کے بدلے ہوئے تاثرات کو دیکھ کر امیر نے پوچھا۔ "یہ مجھے بات چھپانے ہے ہو تم لوگ؟"

پیر خان نے جلدی سے اپنے آپ کو سنبھال لیا پھر تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ "ایک پرانا ٹھگ ہماری ٹولی میں شامل ہونے کے لیے آیا ہے۔"

"کون ہے وہ؟"

"گنیش۔" نام لیتے وقت پیر خان نے تھوڑی سی تکلیف محسوس کی۔ "یہ وہی گنیش ہے جس نے ایک بار تمہارے والد سے ٹکر لی تھی۔"

امیر کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ "کیا وہ خود چل کر ہماری ٹولی میں شامل ہونے آیا ہے؟"

"ہاں۔ شاید اسے یہ بات معلوم نہیں ہو گی کہ تم ابراہیم سردار کے بیٹے ہو۔"

پیر خان کو گنیش کا آنا اچھا نہیں لگا تھا۔ اس لیے وہ امیر کو سمجھاتے ہوئے بولا۔ "ہمیں اسے ساتھ لینا نہیں چاہیے نہ جانے وہ کب کیا کر بیٹھے؟"

لیکن گنیش کے لیے امیر کا تجسس بڑھنے لگا تھا۔ اس کے دل میں یہ ارادہ پرورش پانے لگا کہ اپنے باپ سے ٹکرار کرنے والے پر حکم چلا کر وہ بدلہ لے سکتا ہے۔

"پیر خان میں گزری ہوئی باتوں کو بھول جانا چاہتا ہوں۔ گنیش کو ٹولی میں شامل کرنے پر مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔" یہ کہہ کر وہ پیر خان کو خوش کرنے کے لیے آگے بولا۔ "اپنے بھانجے کو بھی اپنے ساتھ لے لینا۔"

"ٹھیک ہے۔" کہہ کر پیر خان گنیش سے ملنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تب ہی امیر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے تاکید کی۔ "لیکن ایک بات یاد رکھنا گنیش کو کبھی یہ نہ معلوم ہونے پائے کہ میں ابراہیم سردار کا بیٹا ہوں۔"

★

گنیش کے چوبیس ساتھیوں اور پیر خان کے گیارہ سالہ بھانجے کو ملا کر پورے تین سو کی ٹولی ہو چکی تھی۔ امیر اس تین سو کی ٹولی کے ہمراہ سفر پر روانہ ہو گیا۔ امیر جس گنیش کو دیکھنے کے لیے بہت بے چین تھا وہ گنیش اُسے عجیب بے ڈول سا دکھائی دیا۔ جب دونوں کی نظریں پہلی بار ملیں تو گنیش نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا تھا امیر کو اس کی یہ مسکراہٹ بھی جانی پہچانی سی لگ رہی تھی۔ پچاس سال سے اُوپر تک پہنچے ہوئے گنیش میں شاید اب پہلے جیسا وحشی پن نہیں رہا تھا۔ اسی لیے وہ شاید بہت زیادہ پرجوش دکھائی نہیں دے رہا تھا، لیکن نہ جانے کیوں اس کی آنکھیں امیر کو بہت ڈراؤنی لگ رہی تھیں نہ جانے امیر کو ایسا کیوں لگ رہا تھا جیسے اُس نے ان آنکھوں کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے؟ اسے یاد آ رہا تھا کہ بچپن میں ڈراؤنے خواب دیکھ کر چونک جایا کرتا تھا، نیند سے اس کی آنکھ کھل جاتی تھی تو اسے لگتا کہ اُس نے کسی کا بے حد بھیانک چہرہ اور خوفناک آنکھیں دیکھی تھیں خواب میں آنے والا وہ ڈراؤنا چہرہ اور ڈراؤنی آنکھیں گنیش کی آنکھوں سے بہت مشابہت رکھتی تھیں۔

"امیر علی تم میرے اس ظاہری دکھاوے پر نہ جاؤ۔" گنیش نے دھیرے سے ہنس کر وضاحت کی۔ "میرے جیسا تجربہ کار ٹھگ تمہیں کہیں نظر نہیں آئے گا۔ میں دیکھنے میں بدصورت ضرور ہوں لیکن دل کا بُرا نہیں ہوں۔"

یہ سُن کر امیر نے زبردستی ہنس کر بات ٹال دی۔ اُس کے بعد نہ جانے کیوں امیر گنیش سے جان بوجھ کر دُور دُور رہنے لگا، اُسے یوں لگنے لگا کہ گنیش کی موجودگی اُس کے جوش و خروش کو دبا دیتی ہے۔ شاید اسی لیے اس نے گنیش کو اگلے دستے کی سرداری سونپ رکھی تھی اور اسے آگے روانہ کر دیا تھا۔ ایسا کرتے وقت اُس نے گنیش سے کہا تھا۔

"ہماری اتنی بڑی ٹولی کو دیکھ کر کسی نہ کسی کو ہم پر شک بھی ہو سکتا ہے اس لیے بہتر یہ ہی ہے کہ تم سو آدمیوں کے ساتھ ہم سے آگے روانہ ہو جاؤ۔ راستے میں اگر کوئی پوچھ گچھ ہو تو کہہ دینا کہ ہم لوگ حیدر آباد کے نظام کے ملازم ہیں، اپنی چھٹی ختم کر کے واپس کام پر جا رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے سردار۔" کہہ کر گنیش نے بے دلی سے یہ ذمے داری سنبھال لی۔ پیر خان کو امیر کی یہ بات پسند نہیں آئی تھی لیکن دوسری طرف یہ بات اُسے اچھی بھی لگ رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ گنیش کے آگے جانے کے بعد اُس کو امیر سے ٹکرار کرنے کا موقع نہیں ملے گا اور سفر کسی

ناخوشگوار واقعے کے بغیر آرام سے کٹ جائے گا۔

امیر کو پیر خان کا ننھا بھانجا پہلی ہی نظر میں پسند آگیا تھا۔ پیر خان نے اپنے بھانجے کی جھوٹی تعریف نہیں کی تھی۔ وہ جتنا خوب صورت تھا اتنا ہی چالاک بھی تھا۔ وہ امیر سے اس قدر گھل مل گیا تھا جیسے امیر سے اُس کی پُرانی جان پہچان ہو۔ پیر خان نے عالم خان کو گھوڑے سواری میں پوری طرح طاق کر دیا تھا۔ ایک گیارہ سالہ بچے کو اتنی مہارت سے گھوڑے سواری کرتے دیکھ کر امیر خود بھی دنگ رہ گیا تھا۔ "شاباش عالم اتنی چھوٹی سی عمر میں تم نے تو کافی مہارت حاصل کر لی ہے۔"

"یہ سب تو ماموں جان کی مہربانی ہے۔" عالم کی میٹھی زبان چل پڑی۔ "اور چچا جان اگر آپ کی مہربانی شامل ہو گئی تو میں تلوار بازی میں بھی ماہر ہو جاؤں گا۔"

"شاباش بیٹے۔" کہہ کر جب امیر نے اس کا گال سہلایا تو سمجھ میں آنے والی تھرتھراہٹ اس کے پورے بدن میں دوڑ گئی اور تب ایک خیال تیزی سے اُس کے دل میں دوڑ گیا کہ وہ عالم کو کیوں نہ اپنا بیٹا بنا لے؟ عظیمہ بھی خوش ہو جائے گی اور بیٹے کی کمی بھی دُور ہو جائے گی۔

جیسے جیسے امیر اس خیال کو گہرائی سے سوچتا گیا ویسے ویسے عالم اُسے پہلے سے زیادہ پیارا لگتا گیا۔ سفر کے پہلے دو دنوں تک وہ اسی حسین تصور میں کھویا رہا اور آخر تیسرے دن اُس نے پیر خان سے اپنے دل کی بات کہہ ہی دی۔ "تمھارا بھانجا واقعی مجھے بہت اچھا لگنے لگا ہے۔ وہ ایسا ہے کہ اسے ہمیشہ کے لیے اپنے پاس رکھا جا سکتا ہے۔"

پیر خان پہلے تو اپنے بھانجے کی تعریف سُن کر خوش ہوا لیکن جب امیر نے اپنی بات کی وضاحت کی تو اس کے چہرے پر درد کی ایک لہر سی دوڑ گئی اور وہ اداس لہجے میں بولا۔ "امیر میاں تم اگر مجھ سے میری جان بھی مانگو تو میں دینے کے لیے تیار ہوں۔ عالم کے بغیر تو میں ایک پل بھی چین سے جی نہیں سکتا۔" اتنا کہہ کر وہ ایک لمحے کے لیے رکا پھر اس خیال سے آگے بولا کہ امیر کو اس کی بات بُری نہ لگ جائے۔ "تم نے بالکل ٹھیک ہی کہا ہے۔ اسے سفر پر ساتھ لے جانے کی وجہ بھی یہی ہے کہ اسے مجھ سے بے حد پیار ہے وہ میرے بغیر اکیلے گھر پر رہ ہی نہیں سکتا اور مجھے اس کے بغیر کچھ اچھا نہیں لگتا۔ اسی لیے تو دو سال قبل میں اسے گھر سے باہر اپنے ساتھ لے آیا ہوں۔"

امیر کا خیال تھا کہ پیر خان شاید یہ دلیل پیش کرے گا کہ عالم خان ان کا واحد سہارا ہے اس کے بغیر یا دو سال بعد ہماری کفالت کون کرے گا؟ اگر پیر خان نے ایسی کوئی بات کہی ہوتی تو امیر کے پاس اس کا جواب تیار ہی تھا کہ عالم کے بدلے میں پیر خان کے خاندان کی کفالت کی ذمے داری وہ خود اٹھانے کے لیے تیار ہے۔

"پیر خان تمھارا دل توڑ کر مجھے عالم نہیں چاہیے۔" امیر نے جذباتی لہجے میں کہا۔ "لیکن وہ تم سے زیادہ دور پاس سکھی رہے گا۔ اس طرح بڑا ہو کر وہ میرا عہدہ بھی کر سکتا ہے اس بارے میں بھی تم سوچ لینا۔ فیصلہ کرنے کے لیے ابھی یہ پورا سفر پڑا ہے۔"

لیکن قدرت نے سفر کے ختم ہونے کا انتظار کرنے کی بجائے پانچویں ہی روز اپنا فیصلہ کر دیا۔

ابلیکا

اسلم راہی

جس میں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک دنیا کی تاریخ پیش کی گئی ہے

بہت جلدوں میں مکمل سیٹ۔/1950 روپے

ناشر: مکتبۃ القریش

اردو بازار لاہور

** چار مسافروں نے امیر کی ٹولی کے ساتھ سفر کرنے کی حامی بھر لی تھی اور اپنی جان کی سلامتی کی خاطر وہ امیر کی ٹولی کے سہارے اپنی منزل کی طرف چل پڑے تھے۔ وہ چاروں مسافر بہت زیادہ مار دار تو نہیں تھے۔ لیکن امیر کو فی الحال چند ایسے مسافروں کی ضرورت تھی تاکہ اس کی ٹولی میں خوش و خروش قائم رہ سکے۔ شگون دیکھا گیا اور دیوی کی طرف سے انھیں اچھا جواب بھی مل گیا اور پھر انھوں نے ان چاروں کو ختم کر دینے کا فیصلہ بھی کر لیا۔ گڑھا کھودنے والوں سے کہہ دیا گیا کہ سامنے آنے والی ندی کے کنارے وہ گڑھا کھود لیں اُس وقت تک بقیہ لوگ شکار کے ساتھ وہاں پہنچ جائیں گے۔ امیر نے پیر خان کو تاکید کرتے ہوئے کہا تھا۔ "میں تمھارے بھانجے کو اپنا گھوڑا دے دیتا ہوں اس سے کہنا کہ وہ بالکل پیچھے ہی رہے۔ تاکہ وہ لاشوں کو دیکھنے نہ پائے۔"

امیر، افلاطون، پیر خان اور دوسرے دس بارہ ٹھگ ان چار مسافروں کے ساتھ ساتھ تیزی سے آگے بڑھتے گئے۔ انھوں نے مسافروں سے یہ بہانہ کیا کہ آگے جا کر وہ پڑاؤ کے لیے کسی اچھی سی جگہ کا انتخاب کرنا چاہتے ہیں۔

سُورج مغرب کی طرف جھک رہا تھا اور امیر کا ارادہ اتنی جلدی پڑاؤ ڈالنے کا نہیں تھا، وہ تو ان چاروں مسافروں کو ختم کر کے اپنا سفر جاری رکھنا چاہتا تھا۔

"وہ دیکھو سامنے ندی دکھائی دے رہی ہے۔" پیر خان انگلی اٹھا کر خوشی سے بولا۔ ندی کے کنارے پہنچتے ہی امیر کے پاؤں تھم گئے اُس نے ان چار مسافروں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "ہم اُس درخت کے نیچے پڑاؤ ڈال دیں تو کیسا رہے گا؟"

لیکن اس سے پہلے کہ وہ چاروں وہاں یا نا، کا کوئی جواب دیتے ان کے پیچھے دو دو تین تین کی تعداد میں ٹھگ جمع ہو چکے تھے۔ تمام تیاری مکمل تھی یہ دیکھ کر امیر نے اشارہ دے دیا۔ "پان لاؤ۔"

اس اشارے کے ساتھ ہی ان چاروں مسافروں کی گردنوں میں رومال کے پھندے پھنس گئے۔

"ٹھہرو۔" پیچھے سے گیارہ سالہ عالم خان کی آواز سُنائی دی۔ وہ ان کے ساتھ آجانے کے لیے پوری رفتار سے گھوڑا دوڑاتا ہوا وہاں پہنچ گیا تھا۔

"میں نے آپ لوگوں کو پکڑ لیا ہے چچا جان۔" یہ کہنے کے لیے عالم خان نے اپنا مُنہ کھولا ہی تھا کہ اس کا مُنہ کھلا کا کھلا رہ گیا، چاروں مسافروں کی گردنوں میں رومال کا پھندہ دیکھ کر اس کے مُنہ سے ایک چیخ نکل گئی۔

"یہ لڑکا یہاں کہاں سے آگیا؟" امیر چلا کر اُسے روکنے کے لیے جھپٹا مگر اُس کے پہنچنے سے پہلے ہی خوف زدہ عالم خان گھوڑے کی پیٹھ سے پھسل کر زمین پر گر پڑا۔

"بیٹا عالم۔" پیر خان دونوں ہاتھ پھیلا کر اس کی طرف لپکا۔ امیر نے عالم خان کو دونوں ہاتھوں پر اٹھا لیا، لیکن وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ اس کے معصوم چہرے پر خوف کے گہرے سائے پھیلے ہوئے تھے۔ "جاؤ جلدی سے کوئی پانی لے آؤ۔" امیر گھبرائی ہوئی آواز میں چیخا۔

"کیا ہو گیا میرے بھانجے کو؟" پیر خان کی آواز لرز رہی تھی۔ "امیر میاں اسے کسی طرح ہوش میں لاؤ۔"

جب امیر نے عالم کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے تو اُس کے ہونٹوں پر ہلکی سی کپکپاہٹ ہوئی۔ یہ دیکھ کر پیر خان نے کچھ اطمینان محسوس کیا۔ "شاید اب یہ ہوش میں آرہا ہے۔۔ عالم بیٹے۔۔۔"

اچانک عالم نے آنکھیں کھول دیں اور اپنے چاروں طرف بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھ کر حیرت سے بولا۔ "یہ۔۔۔ یہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟" اُس کی آواز بہ مشکل اس کے حلق سے باہر آرہی تھی۔

"تمھیں کچھ نہیں ہوا ہے بیٹے۔" پیر خان اس کے سر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ "تم گھوڑے پر سے گر پڑے تھے۔"

"نہیں میں گھوڑے پر سے نہیں گرا تھا۔" کہہ کر عالم نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن جونہی اس کی نظر ایک مسافر کی لاش پر پڑی تو اس کی آواز پھٹ گئی۔ "دیکھو دیکھو اُس کی آنکھیں باہر نکل آئی ہیں۔" وہ چلاتا ہوا اوندھے مُنہ زمین پر لیٹ گیا اور ایک بار پھر وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ اب سب کو خیال آیا کہ عالم کی اچانک بے ہوشی کی وجہ سے وہ لوگ مسافر کی اُس لاش کو وہاں سے ہٹا کر دفنانا بھول گئے تھے۔

"عالم۔۔۔ میرے بیٹے عالم۔" پیر خان نے اُسے آواز

دی لیکن اُسے کوئی جواب نہیں ملا تو اس کی آنکھوں میں آنسو نہ رُک سکے۔ "یہ کیا ہو گیا امیر میاں؟ کہیں میری زندگی کا واحد سہارا چھن نہ جائے؟"

اب امیر کو بھی گھبراہٹ محسوس ہونے لگی تھی، اُسے لگا کہ اگر وقت اسی طرح گزر گیا تو عالم پھر کبھی ہوش میں نہیں آسکے گا۔ یہ سوچ کر وہ پیر خان سے بولا۔ "چلو ہم اسے کندھے پر لے چلتے ہیں۔" کہہ کر اُس نے عالم کو اپنے کندھے پر اٹھا لیا پھر اپنے دوسرے ساتھیوں سے بولا۔ "تم لوگ جلدی سے لاشوں کو ٹھکانے لگا دو۔"

عالم کو ندی کے کنارے لٹا کر ایک بار پھر اُس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے گئے۔ پیر خان روتے روتے بڑبڑاتا رہا۔ "یا خدا عالم کو ٹھیک کر دے۔"

تھوڑی دیر بعد عالم نے آنکھیں کھول دیں اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ جب پہلے جیسا منظر اُسے نظر نہیں آیا تو اس نے ذرا سکون سا محسوس کیا مگر جب امیر نے کپڑے سے اس کا چہرہ صاف کرنے کی کوشش کی تو عالم کی آنکھوں میں پھر خوف کی پرچھائیاں رقص کرنے لگیں۔

اُسے جب یہ خیال آیا کہ امیر ایک مسافر کے صافے کے کونے سے اُس کا چہرہ صاف کر رہا ہے تو اس کی آنکھوں کی پتلیاں کانپنے لگیں اس نے ایک جھٹکے سے اپنی گردن گھما لی۔

"عا... لم۔" سینہ چیر دینے والی چیخ کے ساتھ پیر خان اپنا سر پٹکنے لگا۔ تھوڑے ہی دنوں میں جو سب کی آنکھوں کا تارا بن چکا تھا، وہ اچانک ہی بجھ گیا تھا اور سب لوگوں کو روتا چھوڑ گیا۔ اس کی موت سے ساری ٹولی پر اداسی چھا گئی۔

★★

آدھی رات کے سناٹے میں سنسناتی ہوئی ہوا اداس گیت گنگنا رہی تھی اور امیر دری پر لیٹا ہوا کروٹیں بدل رہا تھا، جس خیمے میں وہ دری بچھا کر لیٹا ہوا تھا اسی خیمے میں ننھے عالم خان کی قبر کھودی گئی تھی، شام کو ان لوگوں نے اُسے وہیں دفنا دیا تھا۔ امیر زمین پر بار بار اس طرح ہاتھ پھیر رہا تھا جیسے ننھے عالم خان کے جسم پر ہاتھ پھیر کر اُسے سلانے کی کوشش کر رہا ہو، اچانک خیمے کا پردہ ہٹ گیا اور ایک انسانی سایا اندر داخل ہوا۔ امیر نے چونک کر پوچھا۔ "کون ہے؟"

"میں ہوں۔" پیر خان کی درد میں ڈوبی ہوئی آواز امیر نے پہچان لی۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور پیر خان سے بولا۔ "نیند نہیں آرہی ہے پیر خان۔"

پیر خان جواب دیے بغیر اُس کے قریب آگیا اُس کا اداس چہرہ دیکھ کر امیر نے اُسے دلاسا دینے کی کوشش کی لیکن پیر خان نے اُسے ایسا کوئی موقع ہی نہیں دیا، وہ امیر کے کچھ بولنے سے پہلے ہی بول اٹھا... "میں تم سے اجازت لینے آیا ہوں امیر میاں۔"

"اجازت؟" امیر چونک پڑا۔

"ہاں امیر میاں اب میرا دل ہر چیز سے اُٹھ گیا ہے مجھے اب واپس چلے جانے دو، میں اب آگے سفر جاری نہیں رکھ سکوں گا۔ میں اب تمہارے لیے بے کار سی شے بن کر رہ گیا ہوں۔"

امیر نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنی ہمدردی کا اظہار کیا، لیکن پیر خان نے اس کی ہمدردی پر کوئی توجہ نہیں دی، اس نے اُسی گھمبیر لہجے میں کہا۔ "مجھے روکنا مت میں نے گھر جا کر بقیہ زندگی خدا کی عبادت میں گزار دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ عالم کے بغیر اب میری زندگی گھٹ کر رہ گئی ہے۔ میں بھی اب بہت جلد زمین کے اندر سو جانا چاہتا ہوں امیر میاں۔" پیر خان کے لہجے میں جو خود اعتمادی تھی اُس نے امیر کی زبان کو بند کر دیا اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ انکار کر سکے مگر ہاں کہنے کے لیے بھی اس کی زبان نہ کھل سکی۔

یہ کیسا عجیب اتفاق اُس کے سامنے آگیا تھا؟ وہ پیر خان جو اُس کے پہلے ہی سفر سے اُس کے ساتھ تھا جس نے اُسے دوبارہ ٹھگی کا دھندہ اپنانے کے لیے مجبور کیا تھا، جس نے اس کو سمجھاتے ہوئے کہا تھا کہ امیر جس نے ایک بار بھی بھوانی دیوی کے سامنے کھڑے ہو کر ٹھگ بننے کا عہد کیا ہے وہ کبھی بھی اس پیشے سے الگ نہیں

ہو سکتا اگر وہ ایسا کرتا ہے تو بھوانی دیوی کا اُس پر قہر نازل ہوتا ہے۔ اُسے اپنا رومال استعمال کیے بغیر چین نہیں پڑتا... امیر سوچ رہا تھا ایسی باتیں کہنے والا پیر خان آج خود اس سے کہہ رہا ہے کہ وہ ہمیشہ کے لیے اس پیشے کو چھوڑ کر اپنے گھر واپس جانا چاہتا ہے، اس نے بدری ناتھ سے دوستی کی تھی لیکن وہ اُسے چھوڑ کر چلا گیا اور اب پیر خان بھی اُس کا ساتھ چھوڑ دینا چاہتا ہے۔

"امیر میاں میں تمہارے جذبات کو سمجھتا ہوں۔" امیر کو خاموش دیکھ کر پیر خان نے اس کے دونوں پاؤں پکڑ لیے اور روتے ہوئے بولا۔ "میں نے اپنے دل کو بہت سمجھایا کہ کم از کم یہ سفر تو پورا کر لینے دو پھر گھر جا کر بیٹھ جانا لیکن ضدی دل اب کچھ سمجھنے کے تیار ہی نہیں ہے۔ امیر میاں اب تم مجھے جانے ہی دو میری حالت پر رحم کھا کر مجھے جانے کی اجازت دے دو۔"

"ٹھیک ہے پیر خان۔" امیر نے بہ مشکل ٹھہر ٹھہر کر کہا۔ "میں تمہیں مجبور کرنا نہیں چاہتا۔" اچانک ہی پیر خان کے بہتے ہوئے آنسو تھم گئے، چاند کی پھیکی روشنی میں اُس نے امیر کا جذباتی چہرہ دیکھا اور اگر وہ اس وقت امیر کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھ لیتا تو شاید اُس میں اپنی جگہ سے اُٹھنے کی طاقت بھی باقی نہ رہتی مگر یکایک اُسے یاد آیا کہ جس جگہ وہ بیٹھا ہوا ہے اُسی جگہ کے نیچے اُس کا لاڈلا بھانجا عالم سو رہا ہے۔ اس خیال نے اُس میں ایک عجیب سا جوش پیدا کر دیا تھا وہ ایک جھٹکے سے اُٹھا اور مڑے بغیر دو قدم پیچھے ہٹ گیا کچھ کہنے کے لیے اُس کے ہونٹ کھلے، لیکن پھر فوراً ہی اُس نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے اور کچھ کہے بغیر خیمے سے باہر چلا گیا۔

امیر آنسو بھری آنکھوں سے اُسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اُس کے ہونٹوں نے پیر خان کو خدا حافظ کہنے کے لیے جنبش نہیں کی، اُس نے تو اُس سے یہ بھی نہیں کہا کہ جب کبھی تمہارا جی چاہے تو میرے ساتھ سفر پر چلنے کے لیے آجانا۔ پیر خان بھی جاتے جاتے اُس سے کہنا چاہتا تھا کہ تم گنیش سے ہوشیار رہنا، لیکن وہ بھی کچھ نہیں کہہ سکا تھا۔

اچانک امیر چونک کر اس طرح خیمے سے باہر نکلا جیسے اچانک گہری نیند میں کوئی خواب دیکھ کر چونک پڑا ہو۔ باہر نکل کر اُس نے دیکھا تو پیر خان دُور نکل چکا تھا اور امیر چپ چاپ کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔

**

عالم خان کی موت اور پیر خان کی غیر حاضری نے دوسرے ٹھگ ساتھیوں کو بھی اداس کر دیا تھا۔ سفر کی ابتدا ایسے غمگین واقعے سے ہوئی تھی کہ اُس نے ان سبھوں کا دل چھلنی کر کے رکھ دیا تھا۔ امیر کو جب اپنے بقیہ ساتھیوں کی اس حالت کا پتا چلا تو اُس نے اپنے دل پر سے غم کے اس بوجھ کو ہٹا دیا اور اپنے ہر ساتھی کے دل میں جوش پیدا کرنے کی غرض سے اپنے سفر میں دلچسپی لینی شروع کر دی۔

گنیش پر اس واقعے کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اتنے کم عمر بچے کو اس خطرناک سفر میں ساتھ لینے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ بھانجے کی موت کے بعد آخر پیر خان کیوں بھاگ گیا؟ وہ پیر خان کو اتنے کمزور دل کا آدمی نہیں سمجھتا تھا۔

"جذبات کو تم دل کی مجبوری سمجھتے ہو گنیش؟" امیر نے پہلی بار دلیل پیش کرتے ہوئے اُس سے کہا۔ "ٹھگ بن جانے کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ ہم انسان ہی نہ رہے؟ کیا ٹھگ لوگوں سے انسانیت کے تمام رشتے چھوٹ جاتے ہیں؟"

یہ سُن کر گنیش دھیرے سے ہنس دیا اس کے بھیانک چہرے پر مسکراہٹ بھی آکر بھیانک رُوپ دھار لیتی تھی۔

"امیر گھر گھر ہے اور سفر سفر ہے۔ گھر سے باہر نکلنے کے بعد ہمیں بھوانی دیوی اور اُس کے احکامات کے سوا کچھ اور یاد ہی نہیں رہتا، جذبات بہت ہی بُری چیز ہے سردار جو اس کے جال میں ایک بار آجاتا ہے اُس کی تمام اُمنگیں اور تمنائیں دم توڑ دیتی ہیں۔"

گنیش نے یہ بات چونکہ کئی لوگوں کے سامنے کہی تھی اس لیے امیر نے بات زیادہ نہیں بڑھائی، وہ یہ

سوچ کر چپ ہو گیا تھا کہ اگر گنیش کے خیالات سے اُس کے دوسرے ساتھیوں کا خون گرم رہتا ہے تو اُس میں اُن کا ہی فائدہ ہے اس لیے اُس سے مُنہ ماری کرنا بے کار ہے، اب چونکہ پیر خان نہیں ہے اس لیے گنیش کو بھی اُسے ہی سنبھالنا پڑے گا، وہ سوچ رہا تھا کہ جبل پور تک کوئی نہ کوئی موٹا شکار مل جانا چاہیئے، کیونکہ اب تک کے سفر میں تو کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی تھی۔

جبل پور اب صرف دو ایک منزل کی دوری پر تھا کہ انھیں اطلاع ملی کہ ایک دولت مند منشی کا قافلہ ناگپور کے راستے آگے بڑھ رہا ہے، اس اطلاع نے تین سو ٹھگوں کی ٹولی میں ایک نیا جوش و خروش پیدا کر دیا اس اطلاع کے سنتے ہی امیر نے جلد سے جلد مختصر راستہ اپنا لیا۔ وہ اپنا گھوڑا دوڑاتے ہوئے گنیش سے بولا "ہمیں اتنے دن

شکار کو زندہ نہیں جانے دینا چاہیئے۔"

"سردار۔ اگر تم میری بات مانو گے تو ہمارے ہاتھ سے بھی کوئی شکار بچ کر نہیں جا سکتا۔" گنیش نے امیر سے کہا۔

"کون سی بات؟" امیر پر تجسس لہجے میں بولا۔

"جذبات کی بات۔" گنیش نے اپنی ادھوری بات سے چھیڑ دی۔ "یہیں سے فیصلہ کر کے آگے بڑھو کہ چاہے بھلا ہو یا بُرا ہو۔ وہ اکیلا ہو یا بال بچے اس کے ساتھ ہوں ہمیں اس کا شکار کرنا ہی ہے۔ بس پھر ہی دیکھ لینا کہ بھوانی دیوی ہمارا کام کتنا آسان کر دیتی ہے۔"

"ہر آدمی کے کام کرنے کا انداز الگ الگ ہوتا ہے گنیش۔" امیر نے پُر اعتماد لہجے میں اُس سے کہا "مجھے ارادوں پر پورا بھروسا ہوتا ہے، شکار اور حالات کا جائزہ لیے بغیر میں کبھی کوئی فیصلہ نہیں کرتا۔"

گنیش کو امیر کی یہ خود اعتمادی پسند نہیں آئی۔ لیکن کچھ بھی ہو امیر چونکہ اس ٹولی کا سردار تھا اس لیے اس کو بھی اس کی مرضی کے مطابق ہی کام کرنا تھا یہ ہی وجہ تھی کہ وہ آگے ایک لفظ بھی نہ بول سکا مگر اس نے اپنے دل میں یہ گانٹھ باندھ لی تھی کہ امیر علی کو ایک نہ ایک دن اس کے آگے جُھکنا ہی پڑے گا۔ اس چھوٹی سی عمر میں چند اچانک مل جانے والی کامیابیوں سے امیر کو غرور سا ہو گیا ہے لیکن شاید اسے گنیش جیسا کوئی سرکش ملا نہیں ہے۔ آگے آگے دیکھنا ہوتا کیا ہے؟

●

آخر کار ٹھگوں کی ٹولی نے منشی کے قافلے کو جا لیا۔ دور سے ہی خیموں کی قطار کو دیکھ کر امیر نے اپنے ساتھیوں کو خبردار کر دیا "اب ہم سب کو ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے انھیں ہم پر کسی قسم کا کوئی شک نہیں ہونا چاہیئے۔" اُس نے گنیش کو بھی خاص تاکید کرتے ہوئے کہا تھا۔ گنیش

تم مجھے میری مرضی سے کام کرنے دو ہمیں ذرا بھی جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کرنا ہے۔" گنیش کو سمجھانے کے بعد اُس نے افلاطون کے کان میں بھی پھونک ماری۔ "تم گنیش پر برابر نظر جمائے رکھنا اُس کا اٹھایا ہوا ایک غلط قدم بھی ہماری ساری بازی الٹ سکتا ہے۔"

امیر نے منشی کے خیموں کے قریب ہی اپنا پڑاؤ ڈال دیا تھا۔ ان کے اونٹ گھوڑے اور ملازموں کی تعداد سے ہی امیر نے منشی کے دولت مند ہونے کا اندازہ لگا لیا تھا۔ اُسے خیموں کے قریب ایک پالکی بھی دکھائی دے رہی تھی جس سے یہ اندازہ باآسانی لگایا جا سکتا تھا کہ منشی کے ساتھ زنانہ سواریاں بھی ہیں، اس پالکی کو دیکھ کر امیر نے تھوڑی سی ہچکچاہٹ بھی محسوس کی تھی کہ اب اسے منشی کے ساتھ ساتھ ان عورتوں کو بھی ختم کرنا پڑے گا۔

امیر نے پہلے دو دنوں تک تو منشی اور اُس کے آدمیوں سے بات چیت کرنے کی بالکل ہی کوشش نہیں کی، وہ جان بوجھ کر ان لوگوں سے دُور دُور رہ رہا تھا تاکہ اس کی شرافت کی چھاپ ان لوگوں پر اچھی طرح بیٹھ جائے۔ وہ جانتا تھا کہ اجنبی لوگوں سے اگر فوراً ہی بات چیت کرنے کی کوشش کی جائے تو وہ لوگ شک میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور پھر ان کا اعتماد حاصل کرنے میں کافی عرصہ لگ جاتا ہے، شروع میں اپنے شکار کو یہ تاثر دینا ضروری ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو ان سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اُس کی یہ چال کامیاب رہی کیونکہ دوسرے ہی دن شام کو خود منشی نے ہی اُس سے آکر بات چیت شروع کر دی اور پوچھنے لگا "بھائی کون ہو تم لوگ کہاں جا رہے ہوئے؟ تمھاری روانگی کب ہے؟"

تب امیر نے ہوشیاری سے اٹک اٹک کر جواب دیا اور آخر میں دھیرے سے کہا "معاف کیجیے گا ہم لوگ آپ کو کچھ اکھڑ مزاج لگ رہے ہوں گے۔ لیکن سفر کے دوران ہر اجنبی سے ہوشیار رہنا پڑتا ہے، زمانہ بے حد خراب ہے۔ کون ساہوکار ہے اور کون ٹھگ ہے اس کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔" اتنا کہہ کر وہ منشی کے چہرے کو گھور گھور کر اپنی بات کا اثر دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔

پہلے تو اُسے یہی لگا تھا کہ منشی اُس سے اپنی ناراضگی کا اظہار کرے گا اور کہے گا کہ شریف اور بدمعاشوں کو ایک ہی نظر میں پہچانا جا سکتا ہے اگر تمھارے پاس تاڑنے والی نظر ہو تو، لیکن یہ کہنے کے بجائے تو وہ امیر کی جانب دیکھ کر مسکرایا اور بولا "میر صاحب آپ نے تو میرے دل کی بات کہہ دی ہے۔ میں بھی دو دنوں سے آپ سے بات کرتے ہوئے گھبرا رہا تھا، مگر اب تو اس قدر قریب رہ کر دُور رہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کے خیموں سے گانے بجانے کی آواز سُن کر ہی آپ لوگوں سے ملنے کے لیے دل بے چین ہو گیا تھا میں بھی اس گانے بجانے سے شوق رکھتا ہوں۔"

"تب تو ہماری یہ خوش نصیبی ہے منشی جی، آپ آج رات ہی ہمارے مہمان بن سکتے ہیں اور ہماری طرف سے کھانے کی دعوت بھی قبول کر لیں۔" امیر نے اپنا پہلا پانسہ پھینکا تو منشی جی نے اپنی خاندانی ریت دکھاتے ہوئے کہا "یہ نہیں ہو سکتا پہلے آپ میرے ساتھ کھانا کھائیں گے۔ میری بیگم کے ہاتھ کا کھانا چکھ لیں گے تو آپ کو گھر یاد آ جائے گا۔"

ایک اجنبی آدمی پہلی ہی ملاقات میں اپنی بیگم کے ہاتھ کے کھانے کی تعریف کرے اس سے امیر کا دل شک میں مبتلا ہو گیا، لیکن وہ ایک ٹھگ تھا اور ٹھگوں کا تو کام ہی یہ ہوتا ہے کہ شکار کو جال میں پھانس کر اُس کا کام تمام کر دیا جائے۔

"اچھی بات ہے جناب آپ بزرگ ہیں اس لیے میں آپ کی دعوت کو نامنظور نہیں کر سکتا۔" امیر دل کو مضبوط کر کے بولا "نماز سے فارغ ہو کر میں حاضر ہو جاؤں گا۔"

● منشی جی کے خیمے میں مشعل جل رہی تھی مہمان اور میزبان دونوں آمنے سامنے دسترخوان پر بیٹھے تھے۔ کھاتے کھاتے امیر کی نظر بار بار منشی کی گود میں کھیلتے ہوئے ایک دو ڈھائی سال کے بچے پر پڑ رہی تھی، وہ بچہ بھی کبھی کبھی امیر کی طرف دیکھ لیا کرتا تھا اور پھر مسکرا کر مُنہ پھیر لیتا تھا۔

"خدا نے آپ کو بہت خوبصورت بیٹا عطا کیا ہے۔" یہ کہہ کر امیر نے بچے کے سر پر ہاتھ پھیرا "کیا نام رکھا ہے اس کا؟"

"ابھی تک تو ہم نے اس کا نام نہیں رکھا ہے۔" منشی اُس بچے کے مُنہ میں نوالہ ڈالتے ہوئے بولا "برسوں بعد اولاد کی شکل دیکھنے کو ملی ہے اس لیے نام رکھنے کی ہمیں کوئی جلدی نہیں ہے، ویسے ہم پیار سے اسے لاڈلا کہتے ہیں۔"

امیر کا دھیان اب اُس کی باتیں سننے میں نہیں تھا، اُس بچے کو دیکھتے ہی اُسے عظیمہ سے کیا ہوا وعدہ یاد آ گیا تھا، اُس نے عظیمہ سے کہا تھا کہ وہ خود ہی اس کے لیے بیٹا لے آئے گا۔ وہ سوچنے لگا کہ عظیمہ اس بچے کو دیکھ کر کتنی خوش ہو جائے گی، ان باتوں کو سوچتے سوچتے اس کے دل میں منشی جی کو ختم کر دینے کا ارادہ پہلے سے بھی زیادہ مضبوط ہو گیا۔

"آپ شاید کسی گہری سوچ میں پڑ گئے ہیں؟" اُسے خاموش دیکھ کر منشی نے اُسے چونکاتے ہوئے کہا "کیا گھر یاد آ رہا ہے؟ میرے اِس لاڈلے کو دیکھ کر کہیں آپ کو اپنا بیٹا تو نہیں ..."

"نہیں نہیں منشی جی۔" امیر نے جلدی سے اُس کی بات کاٹ دی اور اُس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی اُس کی یہ حالت دیکھ کر منشی نے بھی سنجیدگی اختیار کر لی اور بولا "آپ جب میرے لاڈلے کو گھور گھور کر دیکھ رہے تھے تب ہی مجھے شک ہو گیا تھا۔"

"کیا؟" امیر بُری طرح چونک پڑا۔

"یہی کہ بیٹے کے پیار میں آپ کا دل تڑپ رہا ہے۔" منشی کی یہ بات سُن کر امیر نے فوراً ہی اپنے چہرے کے تاثرات چھپا لیے پھر شرما کر اُس نے گردن جھکا لی اور منشی کو ہی بولنے دیا "لیکن میر صاحب آدمی کو اُمید کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے آپ تو ابھی جوان ہیں، مجھ پر خدا نے کتنے برسوں بعد مہربانی کی ہے یہ تو آپ اپنی نظروں سے دیکھ ہی رہے ہیں۔"

"مجھ پر تو خدا کی مہربانی جلدی ہو گئی تھی۔" امیر نے جواب دیتے ہوئے کہا "لیکن اُس نے مجھے بیٹا دے کر جلد ہی واپس لے لیا، اور اب تو ایک بیٹی سے ہی ہم اپنا دل بہلا رہے ہیں۔"

اچانک منشی نے محسوس کیا کہ اُس نے تو خوشی منانے کی خاطر یہ محفل سجائی تھی لیکن اس خوشی کے موقعے پر رونے دھونے کی باتیں شروع ہو چکی ہیں اس خیال کے آتے ہی اُس نے امیر کو خوش کرنے کی غرض سے فرنگیوں کی باتیں چھیڑ دیں۔ دھیرے دھیرے امیر اس کی باتوں میں کھوتا چلا گیا۔ منشی فرنگیوں کی بہت تعریفیں کر رہا تھا یہ بات شروع شروع میں امیر کو ناگوار محسوس ہوئی تھی لیکن جیسے جیسے وہ اس قصّے کو آگے سنتا گیا ویسے ویسے اُس کی دلچسپی اور تجسس بڑھتا گیا پھر جب وہ ہاتھ دھونے کے لیے اُٹھا تو اچانک ہی اُس کے مُنہ سے نکل گیا "منشی جی یہ صاحب لوگ خدا کی بخشی ہوئی خوبصورت انگلیوں سے کھانے کی بجائے کانٹے اور چمچوں سے کیوں کھاتے ہیں؟ میں نے تو سُنا ہے کہ ان کے ناخنوں میں زہر ہوتا ہے۔ اسی لیے وہ کھانے پینے کی چیزوں کو ہاتھ نہیں لگاتے۔"

اور امیر کی یہ بات سُن کر منشی کھل کھلا کر ہنس پڑا صرف یہی نہیں بلکہ پردے کے پیچھے سے اس کی بیوی کے ہنسنے کی آواز بھی امیر کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔

"آپ بھی میر صاحب کمال کرتے ہیں۔" منشی نے بہ مشکل اپنی ہنسی کو روک کر اُسے سمجھایا "یہ ناخنوں میں زہر کی بات بالکل غلط ہے اُن لوگوں کی خوراک ہی ایسی ہوتی ہے کہ اُس کو ہاتھ سے کھانا آسان نہیں ہوتا۔ اگر اُن کے ناخنوں میں زہر ہو تو اُن کے بچے اپنا انگوٹھا کیسے چوستے؟"

یہ دلیل سُن کر امیر نے اپنی شرمندگی مٹا کر اپنی غلطی تسلیم کر لی اور بولا "آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں فرنگیوں سے شدید نفرت کی وجہ سے ہی ہم لوگوں کے دماغ میں ان کے خلاف ایسی باتیں جنم لیتی ہیں، یہ تو بہت اچھا ہے کہ آپ ان کے بارے میں کافی معلومات رکھتے ہیں آپ کے ساتھ سفر کرنے سے میری معلومات میں بھی یقیناً اضافہ ہو گا۔"

اس بہانے امیر نے اُس کا ہم سفر بننے کی حامی بھر لی تھی، جس پر منشی نے کوئی اعتراض نہیں کیا، خیمے سے باہر نکلتے وقت امیر نے اس دعوت کے لیے اس کا شکریہ ادا

کیا، اُس نے منشی کے بیٹے لاڈلے کو بھی اپنے ہاتھ میں لے کر پیار کیا ایسا کرتے وقت وہ دل ہی دل میں کہہ رہا تھا۔
"تھوڑے دنوں بعد تم میرے بیٹے بن جاؤ گے لاڈلے۔"

● منشی کے قافلے کے ساتھ سفر شروع ہو چکا تھا۔ دوسری منزل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد انھوں نے ایک جگہ پڑاؤ ڈال دیا۔ اس سفر کے دوران گنیش نے دو ایک بار امیر سے پوچھا تھا "شکار کو کب ختم کرنے کا فیصلہ کیا ہے؟"

لیکن امیر اُسے ہر بار ٹالتا رہا تھا "ابھی تھوڑی دیر ہے موقع محل دیکھ کر یہ کام کرنا پڑے گا منشی کافی مشہور آدمی لگتا ہے اُس کی غیر موجودگی کا جلد ہی لوگوں کو علم ہو جائے گا اور ہمیں اس کے لیے سخت احتیاط کی ضرورت ہے۔"

گنیش کی طرح کچھ اور ٹھگ بھی بے چین ہو رہے تھے۔ خود امیر بھی منشی کے بیٹے کو اپنانے کے لیے تڑپ رہا تھا، لیکن پھر بھی وہ صبر سے کام لینے پر مجبور تھا۔ بیسنی گاؤں بہت ہی چھوٹا گاؤں تھا، جہاں کا مکھیا امیر کی جان پہچان والا تھا۔ امیر نے سب سے پہلے تو اُس مکھیا کو ڈھونڈ نکالا اور اُسے ایک پگڑی ایک چادر اور کچھ نقدی کا نذرانہ پیش کر کے اُس نے اچھی طرح گاؤں کا جائزہ لے لیا، اِن دنوں چونکہ چوروں اور ڈاکوؤں نے ہر طرف خوف و ہراس پھیلا رکھا تھا اس لیے انگریزوں نے ایک راجپوت سردار کو چھ گھوڑ سواروں کے ساتھ بیسنی گاؤں کی نگرانی کے لیے مقرر کر دیا تھا۔ لیکن وہ راجپوت سردار مکھیا سے ملا ہوا تھا۔ امیر نے دو سو روپے کی لالچ دے کر اسے بھی منا لیا۔ اُس نے راجپوت سردار کے کان میں چپکے سے کہا تھا "تمھیں صرف اتنا ہی کرنا ہے کہ اگر ہمارے خلاف کوئی شکایت آئے تو اُس پر کان مت دھرنا اور اگر کوئی پوچھ گچھ کرے تو ہماری طرف اشارہ مت کرنا۔"

دو برس کی ملازمت میں بھی اُس راجپوت کو دو سو روپے کی رقم نہیں ملتی تھی اس لیے وہ اس لالچ میں بہ آسانی پھنس گیا۔ "تم لوگ بالکل بے فکر رہو اور جلد سے جلد اپنا کام ختم کر کے یہاں سے بھاگ جاؤ۔ تم لوگوں کے جانے کے بعد کسی کو پوچھ گچھ کا موقع ہی نہیں ملے گا۔"

چھاؤنی پر واپس آ کر امیر نے اپنے چند خاص ساتھیوں کو مشورے کے لیے اپنے خیمے میں طلب کیا۔ اب ہر کوئی یہ سمجھ چکا تھا کہ منشی کے دن اب پورے ہو چکے ہیں اب تو صرف چند گھنٹوں کی ہی دیر ہے۔

"آج رات کو ہمیں اپنا کام ختم کر لینا ہے۔" امیر نے مخصوص رامسی زبان میں کہنا شروع کیا "بِل (قبر) کے لیے جگہ پسند کر کے گڑھا کھود لو اگر ایک گڑھے میں گنجائش نہ ہو تو دوسرا بھی تیار رکھو۔"

"سردار ایک گڑھے سے ہی کام چل جائے گا اور وہ بھی کھودنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔" نور محمد نے اپنی چالاکی دکھائی "منشی کے خیمے کے برابر میں ہی ایک گڑھا کھدا ہوا ہے۔ شاید کسی نے ہماری محنت بچا لی۔"

"کُل ملا کر کتنی لاشیں ہوں گی؟" امیر نے یہ سوال نور محمد سے ہی پوچھا تھا لیکن گنیش درمیان میں ٹپک پڑا "میں نے سروں کو گن لیا ہے کُل ملا کر بیس ہوتے ہیں۔" اتنا کہہ کر وہ انگلیوں پر شمار کرتے ہوئے بولا "پالکی اٹھانے والے آٹھ کہار، دو اونٹ والے اُس میں سے ایک بے وقوف اپنی بیوی کو بھی اپنے ساتھ لے آیا ہے، چار سائیس، دو خدمت گار اور ایک کنیز کو ملا کر اُن کی تعداد اٹھارہ ہو جاتی ہے۔"

"اور منشی اور اُس کی بیوی کو ملانے کے بعد یہ تعداد بیس ہو جاتی ہے۔"

امیر نے جلدی سے گنیش کی ہاں میں ہاں ملا دی۔ منشی کے ننھے بیٹے لاڈلے کو اس گنتی میں شامل نہیں کیا گیا تھا اور وہ چاہتا بھی یہی تھا کہ اُس بچے کو قتل ہونے والوں میں شامل نہ کیا جائے، اسی لیے وہ جلدی سے آگے بول گیا "بالکل ٹھیک ہے میں وہ گڑھا دیکھ لیتا ہوں اور منشی کو رات کی دعوت بھی دے آتا ہوں۔" امیر یہ کہہ کر اُٹھ کھڑا ہوا اور تب ہی جوش میں آئے ہوئے گنیش نے "جے بھوانی" کا زوردار نعرہ لگایا مگر امیر نے فوراً ہی پلٹ کر اُس کی طرف دیکھا اور کرخت لہجے میں بولا "گنیش یہ کیا کر رہے ہو تم؟ میرے خیمے میں سے 'جے بھوانی' کے نعرے سُن کر منشی کو شک ہو جائے گا۔ مجھے تمھاری یہ جلد بازی ذرا بھی پسند نہیں ہے۔"

افلاطون نے باہر جاتے ہوئے گنیش کے چہرے کو غور سے دیکھا، اُس نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ امیر کے خیمے سے باہر نکلتے وقت گنیش غصّے میں اپنے ہونٹ چبا رہا تھا۔

** بہروپ بدل کر کھیل تماشا دکھانے کی تمام تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ امیر نے اس تماشے کی اتنی زیادہ تعریف کی تھی کہ منشی سے اب انتظار کرنا بھی مشکل ہو رہا تھا، اس لیے امیر سے کہا تھا کہ یہ تماشا اس کے اپنے ہی خیمے میں دکھانے کا انتظام کیا جائے تاکہ پردے کے پیچھے سے عورتیں بھی اِس سے لطف اندوز ہو سکیں، اس کے لیے اس نے اپنے خیمے سے کئی ایک چیزیں بھی ہٹوا دی تھیں تاکہ اچھی خاصی جگہ پیدا ہو جائے اس کے علاوہ اس نے خیمے میں ایک کی بجائے دو مشعلیں جلانے کا بھی بندوبست کر رکھا تھا۔

"آئیے آئیے میر صاحب یہاں آپ ہی کا انتظار ہو رہا ہے۔" منشی نے حقّے کی نے کو ہونٹوں سے ہٹا کر اُسے کپڑے سے صاف کر دیا اور پھر اُسے امیر کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا "کہاں ہیں آپ کے وہ ساتھی؟"

حقّے کے دو تین کش لے کر امیر نے اس کی نے منشی کو واپس کرتے وقت ترچھی نظروں سے پردے کے پیچھے دیکھ لیا جہاں منشی کا ننھا بیٹا اپنی ماں کی گود میں کھیل رہا تھا "وہ آنے ہی والے ہیں۔" امیر بولا۔

"منشی جی آپ کے لاڈلے کو بھی یہ تماشا دیکھ کر مزہ آ جائے گا، اُسے آپ نے پردے کے اندر کیوں بٹھا رکھا ہے؟" چند لمحوں بعد اس نے کہا۔

"وہ رات کے وقت اپنی ماں سے دور نہیں رہ سکتا" منشی نے مسکراتے ہوئے کہا "ویسے بھی حقّہ پیتے وقت میں اُسے اپنے پاس نہیں رکھتا وہ مجھے چین سے حقّہ بھی پینے نہیں دیتا۔"

اپنی اولاد کی بُری عادتوں کا ذکر کرتے وقت بھی ایک طرح سے ماں باپ اُس کی تعریف ہی کرتے ہیں منشی کی بات سن کر امیر کو دل ہی دل میں ہنسی آ گئی ویسے وہ سوچ رہا تھا کہ یہ اچھا ہی ہوا کہ لاڈلا اس وقت اپنے باپ کی گود میں موجود نہیں ہے کیوں کہ اگر منشی کے گلے میں رومال کا پھندہ ڈالتے وقت وہ معصوم بھی اس کی لپیٹ میں آ گیا تو پھر دل کی حسرت دل ہی میں رہ جائے گی اُس نے اس بات کا بھی فیصلہ اپنے دل میں کر لیا تھا کہ منشی کو ختم کرنے کے بعد وہ سب سے پہلا کام یہی کرے گا کہ لاڈلے کو اُس کی ماں کی گود سے چھین لے گا۔ اُس نے افلاطون کو سمجھا دیا تھا کہ جب تک لاشوں کو دفنانے کا کام ختم نہیں ہو جاتا اُس وقت تک گانا بجانا جاری رہنا چاہیے تاکہ شکار کی چیخیں گانے بجانے کی آوازوں میں دب کر رہ جائیں۔

اچانک باہر سے گھنگھروؤں کی آواز سنائی دی تو امیر چوکنا ہو کر بیٹھ گیا "لیجیے منشی جی وہ لوگ بہروپ بدل کر آ پہنچے ہیں۔ ایک مرد کو ایک عورت کے روپ میں دیکھ کر آپ بھی حیران رہ جائیں گے۔"

منشی جی پُرشوق نظروں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں چمک سی لہرا رہی تھی ڈھول، دف اور ستار کے ساتھ بیجوؤں کے بھیس میں کچھ لوگ اندر داخل ہو رہے تھے، اِن میں سے دو آدمیوں نے تو مکمل طور پر عورت کا بہروپ بدلا ہوا تھا انھوں نے جب منشی کے قریب آ کر اُسے ایک خاص ادا سے جھک کر سلام کیا تو پردے کے اندر بیٹھی ہوئی اُس کی بیوی بھی کھل کھلا کر ہنس پڑی تھی یہ بات امیر سے پوشیدہ نہیں رہ سکی تھی۔

وہ سب ناچنے گانے والے ایک کونے میں بیٹھ گئے اور کھیل تماشا شروع ہو گیا۔ منشی کے دوسرے ساتھی خیمے کے باہر چاندنی پر بیٹھے ہوئے تھے اور اُن کے آس پاس امیر کے دوسرے ٹھگ ساتھی اُن کو گھیرے میں لے کر بیٹھے ہوئے تھے۔

ستار کے سُر اور دف کی تھاپ پر رقص اور گیت کی آواز زور پکڑتی جا رہی تھی۔ آہستہ آہستہ ان کا شور بڑھتا جا رہا تھا۔ منشی رقص دیکھنے میں محو تھا پردے کے پیچھے بیٹھی ہوئی اُس کی بیوی بھی اپنے بچے کے سر پر

ہاتھ پھیرتی ہوئی ایک ٹک رقص دیکھنے میں مصروف تھی۔ اِس درمیان کبھی کبھی اس کی ہنسی کی آواز امیر کی سماعت سے ٹکرا جاتی۔ یکایک امیر نے چاروں طرف چوکنا نظروں سے دیکھ کر اِس بات کا اطمینان کر لیا کہ اُس کے ساتھی تیار ہیں یا نہیں؟ ہر ٹھگ رقص دیکھنے میں مشغول نظر آتا تھا لیکن اصل میں اُن کا دھیان تو امیر کی ایک ایک حرکت پر لگا ہوا تھا۔ وہ سب امیر کے اشارے کے منتظر تھے کہ وہ کب اشارہ دے اور وہ رومال اپنے شکار کی گردن میں ڈال دیں، امیر بھی کھڑے ہونے کے لیے کسی بہانے کی تلاش میں تھا تاکہ منشی کی گردن پر رومال کا پھندہ ڈالنے میں آسانی ہو۔

اچانک گنیش کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر وہ چونک پڑا۔ اُس نے گنیش کو باہر نظر رکھنے کی تاکید کی تھی، اُسے اپنے قریب آتے دیکھ کر امیر نے یہی سمجھا کہ شاید اپنی عادت کے مطابق وہ اس سے یہ پوچھنے آیا ہے کہ کام کب شروع ہوگا؟

لیکن نہیں امیر کو اس کے چہرے پر اِس قسم کے کوئی آثار نظر نہیں آئے جیسے ہی دونوں کی نظریں ٹکرائیں ویسے ہی گنیش نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے باہر آنے کے لیے کہا، پہلے تو امیر نے اُس کے اشارے پر کوئی توجہ نہیں دی، پھر یہ سوچ کر اُٹھ کھڑا ہوا کہ اگر وہ گنیش کے پاس نہیں گیا تو منشی کو گنیش کی حرکتوں پر ضرور شک ہو جائے گا اس خیال کے آتے ہی "میں ابھی آیا" کہہ کر وہ تیزی سے خیمے کے باہر نکل گیا۔

باہر آکر اُس نے چبھتی ہوئی نظروں سے گنیش کی طرف دیکھا لیکن گنیش نے جب اپنی نظریں چرانے کی کوشش کی تو امیر سمجھ گیا ضرور کوئی نہ ہونے والی بات ہو گئی ہے "کیا بات ہے؟" آخر اس نے پوچھا۔

"ابھی ابھی یہ خبر ملی ہے کہ انگریزوں کا ایک قافلہ اِس گاؤں میں داخل ہوا ہے" گنیش نے بتایا "ہمارا ایک مخبر یہ اطلاع لے کر آیا ہے"

"تو اس سے کیا ہو گیا؟" امیر پُرجوش لہجے میں بولا "تم ہی تو مجھے مشورے دیتے ہو کہ جو فیصلہ کر لو اُسے کبھی مت بدلو"

"مگر انگریزوں کو شک ہو گیا تو ہم سب پکڑے جائیں گے" گنیش کی آواز میں گھبراہٹ کی جھلک تھی "میرا تو خیال ہے کہ ابھی آپ اشارہ نہ دیں بلکہ اگلے پڑاؤ پر موقع دیکھ کر ہم یہ کام انجام دے لیں گے"

"نہیں گنیش یہی بہترین موقع ہے۔ اگر یہ موقع ہاتھ سے نکل گیا تو پھر منشی ہمارے ہاتھ نہیں آئے گا" انکار کر وہ اپنے فیصلے پر قائم رہتے ہوئے آگے بولا "تم یہاں نظر رکھنا میں اندر جا کر اشارہ کرتا ہوں"

گنیش نے اُسے روکنے کے لیے اُس کا کندھا پکڑ لیا، لیکن امیر اُس کا ہاتھ جھٹک کر اندر چلا گیا اور جاتے جاتے کہتا گیا "خبردار اب مجھے روکنے کی کوشش کی تو"

امیر کا یہ انداز دیکھ کر گنیش ڈھیلا پڑ گیا اور جہاں تھا وہیں کھڑا رہ گیا۔

★★

"کیا بات ہے میر صاحب؟" امیر اندر داخل ہو کر جب منشی کے قریب پہنچا تو اس نے بے قراری سے پوچھا "آپ کا وہ آدمی گھبرایا ہوا کیوں دکھائی دے رہا تھا؟"

منشی کی اس حاضر دماغی سے امیر چونک گیا "اب ہوشیاری سے بات بدلنی تھی، حاضر جوابی میں تو وہ اب اتنا تیز ہو چکا تھا کہ اگر کوئی نیند سے جگا کر بھی اُس سے کچھ پوچھے تو وہ فوراً ہی جواب دے سکتا تھا۔ وہ گھبرایا ہوا نہیں تھا بلکہ کچھ اُلجھن سی محسوس کر رہا تھا امیر منشی کے قریب ہی اکڑوں بیٹھ کر بولا "انگریزوں کا ایک قافلہ گاؤں میں داخل ہوا ہے اُن کا ایک آدمی یہ پوچھنے آیا تھا کہ اگر ہم لوگ بھی یہاں اپنا پڑاؤ ڈال دیں تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟" امیر نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ اُس کی بات سُن کر منشی کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک لہرا گئی ہے۔

"پھر آپ نے اِس کا کیا جواب دیا؟" اُس نے پوچھا

"میں نے کہہ دیا ہے کہ یہاں ہمارے ساتھ عورتیں بھی ہیں اس لیے صاحب لوگوں کی موجودگی سے ہمیں تکلیف ہو جائے گی آپ لوگ کہیں اور بندوبست کر لیں تو بہتر ہوگا" یہ کہہ کر امیر ایک پل کے لیے رکا پھر آگے بولا "وہ میری بات سمجھ گئے اور چلے گئے میں نے ٹھیک ہی کہا نا؟"

"ہاں آپ نے جواب تو ٹھیک ہی دیا ہے" منشی کے چہرے کے تاثرات اب کچھ بدل گئے تھے "مگر یہ بہت ہی اچھا ہوا کہ وہ لوگ اس گاؤں میں آ گئے اب ہم انہی کے ساتھ سفر کریں گے"

امیر کو یہ سُن کر صدمہ تو ہوا لیکن اُس نے اپنے چہرے سے اس کا اظہار نہیں ہونے دیا وہ اب منشی اور اُس کے آدمیوں کو ختم کرنے میں ذرا بھی تاخیر ہونے دینا نہیں چاہتا تھا۔

"آپ ٹھیک سے بیٹھ تو جائیں" منشی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا "اس وقت ذرا موج اُڑا لیں پھر دوسری بات سوچیں گے"

لیکن امیر کو بیٹھنا نہیں تھا وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کے سارے ہی ساتھی اُس کے اشارے کے منتظر ہیں، دراصل امیر کو یہ دشواری پیش آ رہی تھی کہ منشی خیمے کی قناعت سے بیٹھ لگائے بیٹھا تھا اور اس حالت میں پیچھے سے اُس کی گردن میں رومال کا پھندہ ڈالنا خاصا مشکل مسئلہ تھا پیچھے کھڑے ہونے کی ذرا بھی جگہ نہ تھی ہیجڑوں کے لباس میں گانے بجانے والے ٹھگوں نے شاید امیر کی اِس اُلجھن کو محسوس کر لیا تھا اِسی لیے وہ ناچتے گاتے ہوئے منشی کو کچھ اشارہ کرنے لگے تھے۔

"یہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں؟" منشی نے امیر سے پوچھا۔

"آپ ذرا آگے سرک کر بیٹھیں" امیر نے منشی کو سمجھایا "یہ لوگ اب شاید کوئی خاص چیز پیش کرنا چاہتے ہیں جو آپ نزدیک سے ہی دیکھ سکیں گے"

"اچھا یہ بات ہے" کہہ کر منشی بیٹھے بیٹھے ہی آگے سرک گیا اور امیر فوراً ہی اُس کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ ستار بجانے والے ٹھگ کی انگلیاں بڑی تیزی سے اُس کے تاروں پر پھسلنے لگیں دف پر بھی زور زور سے تھاپ پڑنے لگی گانے والے کی آواز بھی اُونچی ہوتی جا رہی تھی اور ناچنے والوں کے گھنگھروؤں کی جھنکار بھی تیز سے تیز تر ہونے لگی۔ امیر نے چاروں طرف ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر اپنا اطمینان کر لیا، پھر ایک جھٹکے سے اُس نے اپنی کمر میں سے اپنا رومال کھینچ لیا اور چیخ کر بولا "پان لاؤ" اس کے ساتھ ہی مسافروں کی گردنوں پر ایک ساتھ ہی رومال کے پھندے تنگ ہونے لگے۔ منشی نے اپنے دونوں ہاتھ اس طرح اپنے گلے پر رکھ لیے جیسے کوئی طاقتور اژدھا اُس کی گردن سے لپٹ گیا ہو جیسے جیسے امیر کی گرفت سخت ہوتی جا رہی تھی ویسے ویسے منشی کا دم گھٹتا جا رہا تھا، اُس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور پیشانی کی رگیں اُبھر آئی تھیں پھر اچانک اس کے مُنہ سے جھاگ نکلنے لگا۔ ناچنے والے ناچ رہے تھے اور گانے والے اور زور زور سے گانے لگے تھے۔

اس شور و غل میں منشی کی بیوی کے لیے بھی یہ اندازہ لگانا دشوار تھا کہ اندر کیا ہو رہا ہے؟ لیکن جب اُسے اپنا شوہر فرش پر گرتے اور بکھرتے دکھائی دیا تو اُس کے مُنہ سے ایک بھیانک چیخ نکل گئی وہ اپنے بچے کو اپنی چھاتی سے لگا کر پردے کے پیچھے سے بھاگ جانا چاہتی تھی لیکن ٹھیک اُسی وقت امیر کی نظر اُس پر پڑ گئی اور پھر دو ٹھگ منشی کی بیوی کو پکڑنے کے لیے اُس کی جانب لپکے۔

"ٹھہرو" امیر چیخ کر بولا اور منشی کو تڑپتا چھوڑ کر ایک ہی چھلانگ میں وہاں پہنچ گیا پھر اُس نے دونوں ہاتھ بڑھا کر ماں کی گود میں روتے ہوئے بچے کو زبردستی اُس سے چھین لیا اور پھر اپنے ساتھیوں کو حکم دیتا ہوا بولا "اب تم لوگ اس عورت کو ختم کر سکتے ہو" پھر جب تک منشی کی بیوی کی گردن میں اُن ٹھگوں کا رومال پڑتا امیر روتے ہوئے بچے کو ایک ہاتھ پر اٹھائے وہیں کھڑا رہا پھر اچانک وہ بچے کو اٹھائے ہوئے تیزی سے خیمے سے باہر نکل گیا۔

منشی کا لاڈلا بچہ اب امیر کے قبضے میں تھا امیر اُس کے پانے کی خوشی میں دیوانہ ہوا جا رہا تھا، خیمے سے باہر نکل کر اُس نے جلدی سے خود کو ایک درخت کی آڑ میں چھپا لیا

بچہ اب رو رہا تھا امیر اُسے اپنے سینے سے لگا کر اُسے سمجھاتے ہوئے بولا "نہیں بیٹے رو مت! تھوڑے ہی دنوں میں تم بھول جاؤ گے کہ تمہارے اصلی ماں باپ کون ہیں؟ چُپ ہو جاؤ بیٹے چُپ ہو جاؤ" لیکن بچہ تو اور زور زور سے رونے لگا تھا اور امیر کے ہاتھوں سے نکلنے کے لیے اچھلنے لگا تھا۔ ماں... ماں کی چیخیں مارتا ہوا وہ معصوم بچہ روتا ہی رہا۔

جب کافی کوشش کے باوجود لاڈلا خاموش نہیں ہوا تو امیر نے اُسے بہلانے کے ارادے سے کہا "چلو میں تمہاری ماں کے پاس لے چلتا ہوں"

تین سال کے ناسمجھ بچے پر اُس بات کا خاطر خواہ اثر ہوا اُس نے رونا بند کر دیا تھا لیکن اُس کی ہچکیاں اب بھی جاری تھیں۔ اُس کی اُمید بھری نظریں امیر کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں جیسے کہہ رہا ہو "مجھے جلدی سے میری ماں کے پاس لے چلو۔"

امیر نے جلدی جلدی اُس کے آنسو پونچھ دیے اور اُس کے گال پر بوسہ دے کر اُٹھ کھڑا ہوا امیر اُسے اپنے خیمے میں لے جا کر سمجھا بجھا کر سلا دینا چاہتا تھا لیکن جیسے ہی اُس نے اپنے خیمے کی طرف قدم بڑھائے کہ لاڈلا اُس کی گود میں مچلنے لگا وہ ہاتھ کے اشارے سے امیر کو اپنے باپ کے خیمے کی طرف چلنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ تب امیر نے اُسے خوش کرنے کی غرض سے اُسی سمت قدم بڑھا دیے۔

منشی کے خیمے سے اب بھی زور و شور سے گانے بجانے کی آوازیں آ رہی تھیں، امیر کا خیال تھا کہ وہاں جانے سے لاڈلا رونا بھول جائے گا اور گانے بجانے میں شاید اپنی ماں کو بھی بھول جائے گا اس بہانے خیمے کے اندر کا جائزہ لے کر وہ خود بھی یہ دیکھ لے گا کہ سارا کام ہو گیا یا نہیں؟ منشی کے خیمے سے لاشیں ہٹائی جا رہی تھیں یہ دیکھ کر امیر نے لاڈلے کا سر اپنے کندھے پر رکھ دیا اور تھوڑی دیر دور کھڑا کھڑا یہ منظر دیکھتا رہا مگر اس اثنا میں لاڈلا پھر اپنے ہاتھ پاؤں مارنے لگا تھا اور جب وہ ماں ماں پکارتا ہوا رونے لگا تو امیر کو نہ چاہتے ہوئے بھی خیمے کی جانب بڑھنا پڑا۔

لیکن ابھی وہ خیمے کے دروازے پر پہنچا ہی تھا کہ اپنے سامنے گنیش کو کھڑے دیکھ کر اُس کے قدم رُک گئے گنیش ایک قدم آگے بڑھ کر کہہ رہا تھا "بڑی جلدی سے یہ سارا کام ہو گیا ہے۔ اب ذرا چل کر آپ بھی تسلی کر لیں لاشوں کو گڑھے میں ڈالا جا رہا ہے" اتنا کہہ کر وہ امیر کا بازو تھام کر اُسے پیچھے کی جانب کھینچنے لگا اور امیر کچھ کہے بغیر چپ چاپ اُس کے ساتھ چل پڑا۔

ابھی وہ گڑھے سے دس گز کے فاصلے پر ہی تھے کہ اچانک لاڈلا پھر زور زور سے رونے لگا اُس کی آواز سُن کر گنیش نے پہلی بار اُس کی طرف دھیان سے دیکھا "ارے اِس سانپ کے بچے کو ابھی تک تم نے گلے سے لگا رکھا ہے لاؤ میں اس کا بھی خاتمہ کر دیتا ہوں"

"نہیں گنیش!" امیر دو قدم پیچھے ہٹتا ہوا چیخا "اِسے مت مارنا یہ اب میرا بیٹا بن چکا ہے"

"بیٹا!" بدصورت گنیش کی آنکھیں انگارے کی طرح سُرخ ہو گئیں اور وہ قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا لاڈلا اُس کی بھیانک ہنسی کی آواز سُن کر ڈر گیا اور زور زور سے رونے لگا اچانک گنیش کا قہقہہ رُک گیا اور وہ امیر کے نزدیک آ کر دھیمی مگر خوف ناک آواز میں بولا "میں کہتا ہوں سردار یہ بچہ میرے حوالے کر دو"

"خبردار گنیش! اگر تم نے ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو مجبوراً مجھے اپنی تلوار نکالنی پڑے گی" امیر ایک قدم اور پیچھے ہٹ کر بولا۔

"امیر یہ دھمکیاں تم کسی اور کو دینا اِس گنیش پر ان دھمکیوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا"

امیر نے دونوں ہاتھوں سے لاڈلے کو اپنے سینے میں دبا رکھا تھا اور گنیش سے کہہ رہا تھا "گنیش پہلے تم میری بات تو سنو" اُس نے اب ٹھنڈے دل سے کام لینا شروع کر دیا "اِس معصوم کو ختم کرنے سے ہمیں کچھ بھی حاصل نہیں ہو گا بلکہ اگر یہ زندہ رہا تو میری بیوی کی خواہش پوری ہو جائے گی، اتنے ننھے سے بچے پر تو رحم کرو گنیش"

"رحم" گنیش نے دانت پیسے "برسوں پہلے ایک بار میں نے یہ غلطی کی تھی لیکن اب میں قسم کھا چکا ہوں کہ

ایسی غلطی آئندہ نہیں کروں گا"

"تو پھر سُن لو گنیش" امیر نے لہجہ بدل کر کہا "اِس لڑکے کے معاملے میں میں تمہاری کوئی بات نہیں سُنوں گا"

اِدھر اِن دونوں میں تکرار ہو رہی تھی اور اُدھر منشی کے خیمے سے ناچ اور گانے کی آوازیں آ رہی تھیں گڑھے میں لاشیں ایک ایک کر کے گرائی جا رہی تھیں، لیکن لاشوں کو گڑھے میں گرانے سے قبل خنجر سے ان کے پیٹ چاک کر دیے جاتے تھے تاکہ لاشیں زمین کے اندر پھول نہ جائیں امیر اور گنیش آمنے سامنے کھڑے ایک دوسرے کو گھور رہے تھے۔

"سردار اب ہم گڑھے میں مٹی بھر رہے ہیں" ایک ٹھگ نے امیر کو دور سے مخاطب کر کے پوچھا تو امیر نے ہاتھ اُٹھا کر اُسے گڑھے میں مٹی ڈالنے کی اجازت دے دی، لیکن اُس کے ہاتھ اٹھانے سے گنیش کو موقع مل گیا اُس نے جھپٹا مار کر لاڈلے کو اُس کی گود سے چھین لیا۔

"گنیش" امیر گرجدار آواز میں بولا "بچے کو واپس کر دو" یہ کہہ کر وہ لاڈلے کو اُس کے ہاتھ سے لینے کے لیے آگے بڑھا، لیکن اس سے پہلے گنیش نے لاڈلے کا بازو پکڑ کر اُسے ہوا میں دو چار بار گھمانے کے بعد گڑھے کی جانب اُچھال دیا۔

گنیش کا چہرہ اِس وقت اِس قدر بھیانک دکھائی دے رہا تھا کہ امیر ایک لمحے کے لیے گھبرا گیا اُس نے اُچھل کر اُس بچے کو زمین پر گرنے سے روکنے کی کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہیں ہو سکا زمین پر گرتے ہی معصوم بچے نے ایک چیخ ماری، امیر لپکا لیکن گڑھے میں پڑی ہوئی اُس بچے کی ماں کی لاش پر نظر پڑتے ہی اُس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا وہ پتھر کی مورتی کی طرح بے حس و حرکت کھڑا رہ گیا، اُس کی آنکھوں میں ایک برسوں پرانا منظر گھومنے لگا وہ اب گنیش کی طرف اس طرح آنکھیں پھاڑ کر دیکھ رہا تھا جیسے ماضی کا کوئی واقعہ یاد آنے لگا ہو، گنیش کا بھیانک چہرہ دیکھ کر امیر کے جسم میں ایک کپکپاہٹ سی دوڑنے لگی تھی وہ اس قدر ڈھیلا ڈھالا دکھائی دے رہا تھا جیسے اُس کے جسم میں کھڑے رہنے کی بھی طاقت نہ ہو، وہ بُری طرح کانپ رہا تھا لاڈلا زمین پر گرتے ہی دم توڑ چکا تھا دوسرے ٹھگوں نے اُس کی لاش بھی گڑھے میں ڈال کر اُس گڑھے کو مٹی سے بھر دیا لیکن امیر ابھی تک خاموش کھڑا تھا اُس کے مُنہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا ایک نہ سمجھ میں آنے والی درد کی لہر تھی جو اس کے پورے جسم میں سرایت کر چکی تھی ٹھنڈی چاندنی رات ہونے کے باوجود اُس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ وہ زیادہ دیر تک کھڑا نہ رہ سکا تو چُپ چاپ سر پکڑ کر اُسی جگہ بیٹھ گیا۔

گنیش کو امیر کی یہ حالت کچھ عجیب سی لگ رہی تھی لیکن چونکہ اُس نے اپنی ضد پوری کر لی تھی اس لیے ایک فاتحانہ مُسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر کھیل رہی تھی چند لمحوں بعد وہ آگے بڑھا اور امیر سے بولا "حیرت کی بات ہے کہ بہادری کی باتیں کرنے والا ٹھگوں کا سردار ایک پرائے بچے کی خاطر اس طرح ٹوٹ کر گر پڑے"

یہ طنزیہ الفاظ سنتے ہی امیر نے ایک جھٹکے سے گردن اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھا تھوڑی دیر تک تو وہ گنیش کو گھور گھور کر دیکھتا رہا پھر دھیرے دھیرے اُس کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے اور آنکھ میں سُرخی دوڑنے لگی۔

"گنیش یاد رکھنا ایک دن تمہیں اس کا بدلہ چکانا پڑے گا" وہ بولا۔

"ارے ایک دن کی بات کیوں کر رہے ہو؟" گنیش حقارت آمیز لہجے میں بولا "جو کرنا ہے اِس وقت ہی کر کے دکھا دو"

یہ سُن کر امیر کا خون غصے سے کھولنے لگا اُس کا جی چاہا کہ وہ اُچھل کر گنیش کی گردن دبوچ لے لیکن وہ جلد بازی کا مظاہرہ کر کے حماقت کرنا نہیں چاہتا تھا وہ جانتا تھا کہ یہاں سے نزدیک ہی انگریزوں نے پڑاؤ ڈال رکھا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی جلد بازی سے گنیش کا کوئی ساتھی انگریزوں تک اُن کی اصلیت کی خبر پہنچا دے۔ اگر ایسا ہو گیا تو وہ معہ ثبوت کے اپنے سارے

اُن کے بچوں کو ڈھونڈنے لگتیں اُس وقت یہ خیال بھی نہیں آتا تھا کہ ایک بچے کی خاطر اُسے اُس کی ماں کو ختم کرنا پڑے گا۔

گنیش نے جب یہ بات اس سے کہی تھی کہ ٹھگی کے اس دھندے میں جذبات سے کام نہیں لیا جاتا تو اس نے اس بات پر اعتراض کیا تھا لیکن دھیرے دھیرے وہ خود ویسا ہی بنتا جارہا تھا اور حیرت کی بات تو یہ تھی کہ وہ خود اپنے اندر ہونے والی اس تبدیلی سے بے خبر تھا۔ ایک جگہ اُسے اطلاع ملی کہ آگے کچھ لشکری لوگوں کے ساتھ مسافروں کا ایک بہت بڑا قافلہ جارہا ہے۔ یہ خبر سن کر امیر کے ساتھی تو ڈر گئے کیوں کہ لشکر والوں سے ٹھگ لوگ ہمیشہ ہی خوف کھاتے تھے لیکن امیر نے اُن سے کہا۔ "چلو ہم لوگ بھی اُن کے ساتھ شامل ہو جائیں اگر اُن میں کوئی شکار ہمارے لائق ہوا تو ہم اُسے بہلا پھسلا کر اُس قافلے سے الگ کرلیں گے۔"

لیکن اُس کے ساتھیوں نے اُس کی تائید نہیں کی تب گوپال نے اپنے دوسرے ساتھیوں کی جانب سے کہا۔ "اُن کے ساتھ شامل ہونے کی بجائے اگر ہم دوسرا راستہ پکڑ لیں تو کیسا رہے گا؟ اگر اُن فوجیوں کو ہم پر شک ہو گیا تو ہم پھنس جائیں گے۔"

"سردار گوپال کی بات قابلِ غور ہے۔" رامو نے گوپال کی بات کی تائید کی۔ "ہمارے سوا سو آدمیوں کے قافلے کو دیکھ کر کسی کو بھی ہم پر شک ہو سکتا ہے۔"

امیر کو اپنے ساتھیوں کی یہ بات پسند نہیں آئی کیونکہ اُسے اطلاع مل چکی تھی کہ آگے جانے والے قافلے میں عورتیں اور بچے بھی ہیں اِس لیے اُسے یقین ہو چکا تھا کہ اُن میں سے کوئی ایک آدھ بچہ ایسا تو ضرور ہو گا جسے وہ گود لے سکے گا۔ اِسی لیے اُس نے اپنے ساتھیوں کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ "ہم لوگ پکے ٹھگ ہیں اور ہمیں یہ زیب نہیں دیتا کہ ہم اتنی سی بات پر گھبرا جائیں اور پھر یہ بات اُن لوگوں کو معلوم کیسے ہوگی کہ ہم سب ایک ساتھ ہی سفر پر روانہ ہوئے ہیں؟ ہم لوگوں میں سے کچھ لوگ سپاہی بن جائیں گے اور کچھ لوگ یاترا پر جانے والے مسافروں کا رُوپ دھار لیں گے اور کچھ لوگ، خود کو سوداگر بنا لیں گے، بھلا بدلنے میں کیا ہم کم ماہر ہیں؟ کس میں اتنی صلاحیت ہے کہ ہماری اصلیت کو پہچان سکے؟" امیر کا یہ جوش و خروش دیکھ کر اُس کے ساتھیوں کا خوف پگھلنے لگا اور وہ سوچنے لگے کہ امیر جیسا بہادر سردار سوچے سمجھے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا، ویسے بھی اس وقت تک انھیں کوئی مالدار شکار نہیں ملا تھا اس لیے خطرہ تو مول لینا ہی تھا نہیں تو پھر سارے خالی جانے کا خطرہ تھا۔

"تم لوگوں کو اگر مجھ پر بھروسا ہے تو پھر جلدی سے فیصلہ کرلو۔" امیر نے اپنے ساتھیوں کو جوش دلایا تو اُس کے سارے ہی ساتھی رضامند ہو گئے۔

"لیکن ہم لوگوں کو شگون تو دیکھ ہی لینا چاہیے۔" گوپال نے یاد دلایا تو امیر کو بھی اُس کی بات ماننا پڑی۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ شگون کے زور پر ٹھگ لوگ موت کے مُنہ میں جانے کے لیے بھی تیار ہو جاتے ہیں، جب تک شگون کی رسم پوری ہوتی رہی وہ اندر ہی اندر بے چینی سی محسوس کرتا رہا لیکن جب بہترین شگون کا اشارہ ملا تو وہ پھر پہلے کی طرح پُرجوش لہجے میں بولا۔ "اب تو دیوی کی اجازت مل گئی ہے اب تو ہماری مرضی اور ہماری خواہش کے مطابق ہی ہر کام ہو گا۔" اور پھر امیر کی ٹولی نے شام کو اُس لشکری قافلے کو جالیا۔ امیر جستجو بھری نظروں سے پورے قافلے کا جائزہ لینے لگا۔ چھاؤنی کے قریب ہی تین چار بچے کھیل رہے تھے اُن میں سے ایک تین سال کے بچے کو اُس نے پسند بھی کر لیا تھا۔ وہ بچہ ہندو تھا لیکن پھر بھی امیر اپنے دل کو تسلی دیتا ہوا اپنے آپ سے کہہ رہا تھا۔ یہ بچہ ہندو ہے تو کیا ہوا؟ معصوم بچے کو مذہب کا کوئی خیال نہیں ہوتا۔ جب وہ اُسے گود لے گا تو وہ سیدھا کا ہو جائے گا۔

● پھر امیر نے وہ رات اُسی بچے کے خیال میں گزار دی۔

تین ہی دنوں کے سفر کے دوران امیر نے یاترا پر جانے والے کچھ مسافروں کا اعتماد حاصل کر لیا۔ وہ لوگ بہت جلدی میں تھے، اُن کا کہنا تھا کہ انھیں پانچ چھ دنوں میں تیرتھ گاؤں پہنچنا ہے اگر پورنیما کی شبھ گھڑی گزر گئی تو

ہمارا وہاں جانا بے کار ہو جائے گا۔

لیکن کھیم چند سیٹھ آپ لوگوں کی منزل تو ابھی بہت دور ہے۔ اگر آپ لوگ دن رات اپنا سفر جاری رکھیں تو شاید پہنچ جائیں۔" امیر اُس ہندو مارواڑی کو اپنے جال میں پھنساتے ہوئے بولا۔ "ان تین دنوں میں ہم خود بھی اِن لشکریوں سے تنگ آچکے ہیں۔ یہ لوگ تو جہاں جی چاہتا ہے پڑاؤ ڈال دیتے ہیں اور ایک رات آرام کرنے کی بجائے دو دو دن تک اُسی جگہ پڑے رہتے ہیں بھلا اس طرح کوئی اپنی منزل تک کیسے پہنچ سکتا ہے؟"

امیر کی یہ بات کھیم چند سیٹھ کے دل کو لگ گئی کیونکہ اُس نے بھی لشکریوں سے کئی بار کہا تھا کہ ذرا اپنی رفتار تیز کر دو تاکہ بروقت منزل پر پہنچا جا سکے، لیکن ہر بار اُسے یہی جواب ملتا کہ ہم لوگ تو اپنی عادت کے مطابق ہی اپنا سفر کریں گے تم لوگوں کا جی چاہے تو ہمارے ساتھ چلو ورنہ ہم سے الگ ہو جاؤ۔

یہ جواب سُن کر کھیم چند سیٹھ مجبوراً چُپ ہو کر بیٹھ جاتا لیکن جب امیر کو اُس نے اپنا ہم خیال پایا تو اُس کے دل میں یہ اُمید پیدا ہو گئی کہ اب وہ پورنیما تک تیرتھ گاؤں پہنچ سکتا ہے۔

"سیٹھ جی ہم لوگ تو کل سے ہی الگ ہو جانے کا سوچ رہے ہیں۔" امیر نے چالاکی سے کہا۔ "ہم لوگ کوئی مختصر راستہ اپنائیں گے تو ہمارے چھ سات دن بچ جائیں گے۔" اُس نے جان بوجھ کر کھیم چند سے یہ نہیں کہا تھا کہ وہ لوگ بھی اُن کے ساتھ چلیں کیوں کہ اُس کا خیال تھا کہ خود کھیم چند ہی اُس سے یہ بات کہے گا اور ہوا بھی یہی۔ تھوڑی دیر تک سوچنے کے بعد کھیم چند نے پوچھا۔ "تو میں اپنے ساتھیوں سے پوچھ لوں؟"

"کیا؟" امیر نے سمجھ لینے کے بعد بھی انجان بن کر پوچھا۔

"یہی کہ ہم لوگ بھی آپ کے ساتھ مختصر راستے سے چلیں گے۔" کھیم چند نے کہا اور پھر تھوڑی دیر ٹھہر کر آگے بولا۔ "اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو ہم سب ساتھ ہی چلیں گے۔"

"اعتراض؟" امیر دھیرے سے ہنس کر بولا۔ "یاترا پر جانے والوں سے ہم انکار کیسے کر سکتے ہیں؟ مگر آپ کے ساتھ بال بچے بھی ہیں اُس لیے ہمارا سفر ذرا دھیما پڑ جائے گا۔"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہو گی میں پالکی والوں کو تھوڑی بخشش دے کر سمجھا لوں گا کہ وہ اپنی رفتار تیز رکھیں عورتوں کو اپنے پیروں سے تھوڑی چلنا ہے؟" کھیم چند سیٹھ اپنے ساتھیوں سے پوچھنے کی بجائے خود ہی سارا معاملہ طے کر لینا چاہتا تھا۔ اس لیے امیر نے بھی بات کو طول دینا مناسب نہیں سمجھا اور اپنی رضامندی کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔ "تو پھر آپ ہمارے ساتھ چلنے کی تیاری کریں۔"

یہ سنتے ہی کھیم چند سیٹھ اپنے ساتھیوں کو خوش خبری سنانے کے لیے دوڑ گیا امیر تھوڑی دیر تک اُسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر دانت پیس کر دبے لہجے میں بولا۔ "بے وقوف ہم تمھیں تیرتھ گاؤں کی بجائے سیدھے بھگوان کے پاس ہی پہنچا دیں گے اور وہ بھی پورنیما کا چاند نکلنے سے قبل۔"

★★

انتیس مسافروں کے قافلے کے ساتھ امیر کی ٹولی جنگل کے راستے پر چل پڑی دو دنوں کے سفر کے درمیان امیر نے بہت کوشش کی کہ وہ تین سال کا ہندو بچہ اُس سے گھل مل جائے۔ اُسے گھوڑے پر بٹھانے کی لالچ بھی دی اور ڈھول بجا بجا کر اپنے پاس بلانے کی کوشش بھی کی لیکن وہ بچہ کسی طرح بھی اُس کی طرف مائل ہوتا نظر نہیں آرہا تھا۔ جب وہ بچے کو اپنی جانب متوجہ کرنے میں کامیاب نہیں ہوا تو اُس نے مزید کوشش ترک کر دی اور اپنے اصل مقصد کی طرف متوجہ ہو گیا۔

چاندنی رات کی روشنی میں سفر کو جاری رکھنے کا فیصلہ کر کے اُس نے اپنے ان ساتھیوں کو آگے روانہ کر دیا جن کا کام مرنے والے مسافروں کے لیے گڑھا کھودنا تھا۔ امیر نے انھیں ہدایت دیتے ہوئے کہا تھا۔ "تم لوگ ایک بڑا گڑھا کھود لینا اس گھنے جنگل میں زیادہ محنت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے آنے تک اپنا کام مکمل کر لینا۔"

چاندنی رات میں اُن کا قافلہ مسلسل آگے بڑھتا جارہا

ساتھیوں کے ساتھ گرفتار ہو سکتا ہے کیوں کہ منشی کا سامان اور اس کی بیوی کی پالکی ابھی تک خیمے کے باہر ہی موجود ہیں۔

"دیکھو گنیش ان سب سے کہہ دو کہ سارا کام جلد سے جلد ختم کر دیں۔" امیر اپنے لہجے میں نرمی پیدا کرتے ہوئے بولا۔ "ہم اپنے آپس کا حساب موقع ملے گا تو بے باک کر لیں گے۔"

یہ سن کر گنیش حقارت سے ہنستا ہوا وہاں سے چلا گیا اُس کا خیال تھا کہ امیر اُس سے ڈر گیا ہے۔ وہ خوش تھا کہ اب امیر پر اس کی دھاک ہمیشہ کے لیے بیٹھ گئی ہے۔

**

گنیش کے ساتھ جو منہ ماری ہوئی تھی۔ اُسے امیر نے اُس وقت تو ٹال دیا تھا لیکن اُس نے دو باتوں کا فیصلہ تو کر ہی لیا تھا جس میں سے پہلا فیصلہ تو یہ تھا کہ اِس سفر کے دوران ہی وہ کسی نہ کسی مسافر کے بچے کو اپنا بنا کر گھر لے جائے گا اور دوسرا فیصلہ اُس نے یہ کیا تھا کہ سفر کے بعد گنیش سے وہ بدلہ ضرور لے گا۔

منشی کے قافلے کو ختم کرنے کے بعد دو ٹٹو ایک اُونٹ اور مال و سامان کے علاوہ تین ہزار کی رقم اُن کے ہاتھ لگی تھی۔ اتنی معمولی سی رقم کو دیکھ کر امیر کو ایک دھچکا سا لگا کیوں کہ تین سو ٹھگوں کے لیے یہ رقم تو معمولی ہی تھی۔ امیر نے تو منشی کو بڑی موٹی آسامی سمجھ کر اُس کے ساتھ سفر شروع کیا تھا لیکن اُس کی یہ اُمید پوری نہیں ہوئی۔ ایک طرح سے یہ سفر اُس کے لیے سود مند ثابت نہیں ہوا تھا کیوں کہ ایک طرف تو اُس کا سب سے پُرانا بااعتماد ساتھی پیر خان اس کا ساتھ چھوڑ گیا تھا اور دوسری طرف گنیش نے اُسے اِس کا موقع نہیں دیا کہ وہ منشی کے بچے کو اپنا بنا سکے۔ اتنا کچھ کھونے کے بعد بھی جب صرف تین ہزار کی رقم ہاتھ آئی تو وہ ایک گہرا سانس بھر کر رہ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ نہ جانے اس سفر میں اور کیا کیا ہونے والا ہے؟

صبح کے وقت ٹھگوں کی ٹولی امیر کی سرداری میں انگریزوں کی چھاؤنی کے قریب سے کسی قسم کی رکاوٹ کے بغیر گزر گئی۔ جب اُن سے کوئی پوچھ گچھ نہیں ہوئی تو امیر نے سکون کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "یہ لوگ اتنے قریب ہونے کے باوجود مسافروں کی چیخیں نہ سن سکے۔ ناچ گانوں کے شور و غل میں اُن کی چیخیں نہ دب جاتیں تو نہ معلوم کیا ہو جاتا؟"

"آخر آپ کو اُن خوف ناک لمحات کا خیال آ ہی گیا۔" گنیش نے اپنی بات کو سچ ثابت کرنے کے لیے دلیل پیش کی۔ "اگر منشی کے لڑکے کو ساتھ لے لیا ہوتا تو کیا ہوتا اور اس طرح ایک لڑکے کی خاطر ہم تین سو آدمی پھنس جاتے۔"

لیکن امیر نے اس کی باتوں پر کان نہیں دھرا۔ وہ تو اس وقت کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ گنیش کی بات کا جواب دینے کی بجائے اُس نے اپنے نائب سردار امام بخش سے کہا۔ "ہمیں اب اپنی ٹولی کو تین حصوں میں تقسیم کر دینا چاہیے ایک ٹولی میرے ساتھ، دوسری ٹولی تمہاری سرداری میں اور تیسری..." اتنا کہنے کے بعد امیر ایک لمحے کے لیے ٹھہر گیا مگر ٹھیک اسی لمحے گنیش نے اُس کی خاموشی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہہ دیا۔ "تیسری ٹولی کو میں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

یہ سن کر امیر نے تیز نگاہوں سے اُسے گھورا وہ چاہے تو انکار کر سکتا تھا کیوں کہ ان تمام معاملوں میں سردار کا فیصلہ ہی آخری فیصلہ ہوتا ہے۔ اس کے فیصلوں پر اعتراض کرنے والوں کو غدار سمجھا جاتا تھا اور اُسے ٹولی سے علیحدہ کر دیا جاتا تھا لیکن امیر گنیش کو اس طرح جانے دینا نہیں چاہتا تھا۔

"شاید میرے لیے آپ کو بہت زیادہ سوچنا پڑ رہا ہے؟" امیر کو خاموش دیکھ کر گنیش نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "مجھے ٹھگی کے اِس دھندے میں پورے تیس سال ہو چکے ہیں، پھر بھی میری صلاحیتوں پر آپ کو اعتبار نہیں آتا؟"

امیر کا جی چاہا کہ وہ جواب میں اُس سے کہہ دے کہ تم میری پیدائش سے قبل ٹھگوں کی ٹولی میں شامل ہوئے ہو، تمہاری صلاحیتوں کا سب سے بڑا ثبوت تو یہی ہے کہ تم سردار بننے کی بجائے ابھی تک ایک خدمت گار کے

درجے سے آگے نہیں بڑھ سکے ہو لیکن اس وقت گنیش سے یہ ساری باتیں کہنا بے فائدہ تھیں اس لیے وہ ٹال گیا۔ "ٹھیک ہے گنیش۔" تھوڑی دیر بعد اُس نے اپنی رضامندی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "تیسری ٹولی کو تم ساتھ لے جاؤ۔"

امیر نے اتنی آسانی سے اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا تھا اس پر خود گنیش کو بھی حیرت ہو رہی تھی وہ خوش ہونے کی بجائے اس بات کا افسوس کرنے لگا کہ امیر سے جھگڑنے کا ایک بہترین موقع اس کے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔

اگلے سفر کو شروع کرنے سے قبل اُن لوگوں نے حسبِ معمول شگون دیکھا گنیش کی ٹولی کے لیے اچھا شگون ملا تھا یہ دیکھ کر گنیش نے فخریہ لہجے میں کہا۔ "دیکھ لیا نا تم لوگوں نے مجھ پر دیوی کی کتنی مہربانی ہے؟ دیوی کی نظر عنایت کا ثبوت تو ابھی سے ملنے لگا ہے۔"

"انشاء اللہ۔" امیر نے ایک فراخ دل سردار کی طرح اُس کی کامیابی کی خواہش کا اظہار تو کیا لیکن پھر بھی وہ کہے بغیر نہ رہ سکا۔

"کس نے کیا حاصل کیا ہے یہ تو اس وقت معلوم ہوگا جب دو مہینے بعد ہم اِسی جگہ پھر ملیں گے اس وقت ثابت ہو جائے گا کہ دیوی کس پر کتنی مہربان ہے؟" امیر کا یہ طنز سن کر بھلا گنیش کیسے چُپ رہ سکتا تھا؟ وہ فوراً ہی بولا۔ "جُدا ہونے سے قبل میں ایک بار یہ ضرور کہوں گا کہ کسی مسافر کے بچے کو گود لینے کا ارادہ اپنے دل سے نکال دو امیر میاں نہیں تو دوبارہ اِس جگہ واپس نہیں آ سکو گے۔"

اس کے یہ الفاظ سنتے ہی امیر کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ وہ سوچنے لگا کہ گنیش اس سے الجھنے کا کوئی بھی موقع اپنے ہاتھ سے جانے دینا نہیں چاہتا مگر اُس نے بھی تہیہ کر لیا تھا کہ وہ گنیش کو اس مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دے گا، اس نے دل ہی دل میں اپنے اس ارادے کو اور زیادہ مضبوط بنا لیا کہ سفر کے ختم ہوتے ہی وہ گنیش کا کام تمام کر دے گا۔ اُس کے اندر کا غصہ اُس کے چہرے پر نمایاں نہ ہو جائے اس کے لیے اُسے بہت ضبط کرنا پڑا تھا۔ ٹھگ بننے کے بعد اُسے اپنے غصے کو قابو میں رکھنے کا ہُنر آ گیا تھا۔

"گنیش ایک بار پھر ملنے کے لیے اس وقت ہم جُدا ہو رہے ہیں۔" امیر نے اپنے ہونٹوں پر جھوٹی مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کہا۔ "اور ایسے وقت میں ہمیں ایک دوسرے پر کوئی نکتہ چینی نہیں کرنی چاہیے تم اپنی سوچ کے مطابق آگے بڑھو اور اپنا راستہ میں خود سمجھ لوں گا۔"

اس بار گنیش خوش ہو گیا، اُسے اب اس بات کا پورا یقین ہو چکا تھا کہ امیر پر اس کا رعب اچھی طرح بیٹھ چکا ہے۔ وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ جس امیر کو لوگ بہادر اور نڈر آدمی سمجھتے ہیں وہ اندر سے بے حد نرم اور ڈرپوک آدمی ہے۔

**

ناگپور پہنچ کر امیر نے منشی کے اُونٹ اور ٹٹو کو فروخت کر دیا اور پھر اپنی ٹولی کے ہمراہ حیدر آباد کی جانب روانہ ہو گیا۔ اصل میں اس کا ارادہ حیدر آباد جانے کا نہیں تھا، لیکن اس طرف جانے والے مسافروں کو پھانسنے کے لیے اُسے یہ بہانا بنانا پڑا تھا۔

امیر کی نظریں اب ان مسافروں کی تلاش میں لگی ہوئی تھیں جو اپنے بیوی بچوں کے ساتھ سفر پر روانہ ہوئے ہوں۔ اب تک تو عورتوں اور بچوں کے ساتھ والے قافلے کو دیکھ کر اُس کے جسم میں ایک کپکپاہٹ سی دوڑ جاتی تھی یہ بات اُسے اچھی نہیں لگتی تھی کہ مردوں کے ساتھ عورتوں کو بھی ختم کر دیا جائے یہی وجہ تھی کہ وہ عورتوں کو ختم کرنے کا کام زیادہ تر اپنے دوسرے ساتھیوں کے سپرد کر دیتا تھا اور جب اس کے ساتھی عورتوں کے پیٹ اپنے خنجر سے چاک کرتے تو وہ اپنی نظریں وہاں سے ہٹا لیتا تھا۔

لیکن اب ایک لڑکے کو گود لینے کی تمنا اُس کے اندر شدت سے پیدا ہونے لگی تھی، گنیش کی باتوں نے تو اُسے اور بھی زیادہ جنونی بنا دیا تھا، اب اُس کی نظریں آپ ہی آپ زنانہ سواری کی طرف اُٹھ جاتی تھیں کسی قافلے میں جب اُسے عورتیں نظر آ جائیں تو اُس کی آنکھیں

تھا۔ چلتے چلتے کبھی چند سیٹھ کبھی کہہ دیتا۔ ہم لوگوں نے جنگل کا یہ عنصر راستہ اختیار کر کے اچھا ہی کیا ہے اب ہم ایک دو دن قبل ہی اپنی منزل پر پہنچ جائیں گے، بھگوان کو ہماری مشکلات کا اندازہ ہو گیا تھا اسی لیے اُس نے اِن بھلے لوگوں سے ہماری ملاقات کرا دی ہے۔" لیکن یہ بات بھلا امیر کے ارادوں کو کیسے بدل سکتی تھی؟ پہلے سے مقرر کی ہوئی جگہ پر پہنچتے ہی امیر نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ دے دیا اور اس طرح اُن انتیس لوگوں کے گلے پر اُن کے رومال پھنس گئے۔ امیر نے اشارہ دیتے ہی سب سے پہلا کام اُس بچے کو اپنے قبضے میں لینے کا ہی کیا تھا۔ اُس کے ماں باپ کے گلے گھونٹے جا رہے تھے اور ان کا دم گھٹتا جا رہا تھا، بچہ اپنے ماں باپ کی موت کا منظر دیکھ کر خوف سے تھر تھر کانپنے لگا تھا اور گھبرا کر امیر کی گود سے نکل بھاگنے کی کوشش میں مصروف تھا لیکن اس کے رونے اور چیخنے کے باوجود امیر کو اس بات کا یقین تھا کہ اس بار اس کی خواہش ضرور پوری ہو گی کیوں کہ اُس کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرنے والا گنیش اس وقت وہاں موجود نہیں تھا لیکن اچانک جب دو ٹھگوں نے آ کر بچے کی ماں کی لاش کو اٹھانے کی کوشش کی تو ٹھیک اسی وقت وہ بچہ تڑپ کر امیر کی گود سے نکل گیا اور اپنی ماں کی لاش سے لپٹ کر رونے لگا، اُس معصوم بچے کو یہ کہاں معلوم تھا کہ اس کی ماں کی رُوح پرواز کر چکی ہے اور وہ اب کبھی بھی اُسے اپنے سینے سے نہیں لگا سکے گی وہ بے چارہ تو اپنی ماں سے جُدا نہ ہونے کے لیے اُس کی لاش سے لپٹا ہوا چیخ رہا تھا۔ "ماں... ماں... اُٹھ جاؤ ماں۔" امیر نے بڑی مشکل سے بچے کو ماں کی لاش سے الگ کیا اور اپنے ساتھیوں سے بولا۔ "چلو اب جلدی سے اس لاش کو لے جاؤ۔" اتنا کہنے کے بعد وہ بہت زور سے چیخا۔ "میرا مُنہ کیا دیکھ رہے ہو جلدی کرو۔" وہ نازک سے نازک اور خطرناک سے خطرناک گھڑی میں بھی اپنے ہوش و حواس نہیں کھوتا تھا لیکن اس وقت ایک بچے کو پانے کی تمنا میں وہ بے قابو سا ہو کر رہ گیا تھا۔ اُس نے ایک بار پھر اُس بچے کو بہلانے کی کوشش کی۔ "مُنے تمہاری ماں بیمار ہے یہ لوگ اُسے پالکی میں سُلانے کے لیے لے جا رہے ہیں۔"

"نہیں۔ نہیں۔" بچہ اپنی عمر سے زیادہ سمجھدار لگ رہا تھا۔ "تم لوگ بدمعاش ہو میری ماں کو مار ڈالنا چاہتے ہو۔" روتے اور بلکتے ہوئے اُس نے اپنی چھوٹی چھوٹی مُٹھیوں سے امیر کے سینے پر گھونسے برسانے شروع کر دیے اور چیخ چیخ کر کہنے لگا۔ "چھوڑ دو مجھے جانے دو۔" لیکن اُس بچے کے باپ بننے کی خواہش نے امیر کی رحمدلی کو کچل دیا تھا ایک عجیب سی ضد تھی جو اُس پر سوار ہو کر اُس کے دل کو پتھر بنا رہی تھی اور وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ آخر یہ بچہ کب تک روئے گا؟ جب یہ اپنے ماں باپ یا کسی اور جان پہچان والے کو نہیں دیکھے گا تو پھر کس کے پاس جانے کی ضد کرے گا؟ اِس کی آنکھوں کے آنسو خود بخود ختم ہو جائیں گے اور روتے روتے گلا خشک ہو جائے گا تو یہ خود ہی چُپ ہو جائے گا پھر تھوڑے ہی دنوں میں یہ سب کچھ بھول جائے گا۔ آخر بچہ ہی تو ہے بیمار پڑتے ہی اس کا پرایا پن دور ہو جائے گا۔

"امیر سب لاشوں کو دفنا دیا گیا ہے۔" افلاطون کی آواز سُن کر امیر کو خیال آ گیا کہ بہت دیر ہو چکی ہے وہ اپنے خیالوں سے چونک کر بولا۔ "اب سب لوگوں سے آگے بڑھنے کے لیے کہہ دو۔" اتنا کہہ کر اُس نے روتے ہوئے بچے کے مُنہ پر ہاتھ رکھ دیا پھر آگے بولا۔ "پھر ہم دونوں تھوڑی دیر بعد چلیں گے اُس وقت تک تم معائنہ کر لو کہ مسافروں کی کوئی نشانی رہ تو نہیں گئی؟"

افلاطون کی نظر امیر کی گود میں دبکے ہوئے بچے پر پڑ چکی تھی۔ اُس کو دیکھ کر اُسے اپنے لاڈلے بیٹے برکت کی یاد آ گئی تھی۔ اس بچے کو افلاطون کی آنکھوں میں ہمدردی کی جھلک دکھائی دے گئی تھی، اسی لیے وہ پُر اُمید نگاہوں سے افلاطون کی جانب تک رہا تھا جیسے وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں افلاطون سے کہہ رہا ہو۔ "مجھے بچا لو... مجھے میری ماں کے پاس پہنچا دو۔"

"افلاطون۔" امیر ضرورت سے زیادہ اُونچی آواز میں بولا "میں کہہ رہا ہوں کہ سب لوگوں کو آگے روانہ کر دو۔"

امیر کی آواز سُن کر افلاطون نے ایک جھٹکے سے گردن

گھمائی اور واپس چلا گیا لیکن پھر بھی اُس کی چال میں بہت زیادہ تیزی نہیں تھی، اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے اُس کی پیٹھ پر اُس معصوم بچے کی آنکھیں چپکی ہوئی ہوں جو اُسے واپس بلا رہی ہیں۔ اُسے اچانک ہی یوں محسوس ہونے لگا جیسے اُس کا اپنا بچہ برکت کسی ٹھگ کے ہاتھوں میں جکڑا ہوا سسک رہا ہے۔

تھک ہار کر جب وہ بچہ امیر کی گود میں ہی سو گیا تو امیر کے چہرے پر اُمید کی ایک کرن سی لہرانے لگی وہ ایک باپ کی طرح اُس کی پیٹھ سہلاتے ہوئے بڑبڑانے لگا۔ "آخر مجھے میرا بیٹا مل ہی گیا گنیش اِسے دیکھے گا تو جل بھن کر رہ جائے گا اور عظیمہ جب اس بچے کو دیکھے گی تو وہ خوشی سے دیوانی ہو جائے گی۔"

"امیر۔" اس بار افلاطون نے بیس گز کے فاصلے سے ہی اُسے آواز دی۔ "اب کب تک بیٹھے رہنا ہے؟ رات بہت گزر چکی ہے اور ساتھی کافی دور نکل جائیں گے چلو جلدی کرو۔"

یہ سُن کر امیر نے سوئے ہوئے بچے کو دھیرے سے اٹھایا اور اُس کا سر اپنے بازو پر رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا لیکن ٹھیک اُسی وقت بچہ چونک کر جاگ پڑا امیر کا چہرہ دیکھتے ہی تھوڑی دیر پہلے کا واقعہ اس کے ذہن میں تازہ ہو گیا اور وہ چلا کر امیر کے ہاتھوں سے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ امیر نے پیچھے کی جانب پلٹ کر دیکھا تو افلاطون اب بھی اسی جگہ بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اِس کام سے کوئی دلچسپی ہی نہ ہو۔ امیر کو اُس کی خاموشی دیکھ کر یوں لگا جیسے وہ اس کی لاچاری کا مذاق اُڑا رہا ہو، مگر افلاطون پر آیا ہوا غصہ اُس نے اُس بچے پر اُتارتے ہوئے ڈانٹا۔ "چُپ چاپ میرے ساتھ چل رہا ہے یا نہیں؟" اتنا کہہ کر اُس نے بچے کے آنسو بھرے گال پر ایک تھپڑ رسید کر دیا لیکن اس تھپڑ نے بچے کو بھی طیش دلا دیا اچانک ہی اُس نے امیر کے کان پر مُنہ مارا اور اُس پر اپنے دانت گڑا دیے۔ امیر کے مُنہ سے ایک زبردست چیخ نکلی اور بچہ ایک جھٹکے سے اُس کی گود سے پھسل کر نیچے آ گیا۔ گال پر دبی ہوئی امیر کی ہتھیلی خون سے سُرخ ہو رہی تھی

اُس نے غصے سے پہلے تو اپنے خون آلود ہاتھ کو دیکھا پھر تلملا کر اُس نے کمر بند میں سے اپنی تلوار کھینچ نکالی اور زمین پر پڑے ہوئے بچے پر تلوار اٹھاتے ہوئے چلایا۔ "کمینے اُٹھتا ہے یا نہیں؟"

چاندنی رات میں تلوار کی چمکتی ہوئی دھار پر بچے کی نگاہیں جم کر رہ گئیں اور وہ زمین پر پڑے ہی پڑے کانپنے لگا، تب امیر نے دھمکی آمیز لہجے میں اُس سے کہا۔ "چل اُٹھ اور میری انگلی پکڑ کر میرے ساتھ چل۔" اس کا خیال تھا کہ تلوار دیکھ کر بچہ خوف زدہ ہو کر اُس کے ساتھ چل پڑے گا لیکن اس کا یہ اندازہ غلط ثابت ہوا کیوں کہ بچہ اس کی تلوار پر نگاہیں جمائے چُپ چاپ زمین پر ہی پڑا رہا "امیر۔" افلاطون نے پھر اُسے پکار کر کہا۔ "تم آ رہے ہو یا میں چلا جاؤں۔"

بچے کی ضد اور افلاطون کی جلد بازی نے امیر کو اور زیادہ جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر دیا بھلا یہ بات وہ کیسے برداشت کر سکتا تھا کہ اتنی چھوٹی عمر کا بچہ اُس کے مقابلے پر اتر آئے اور وہ بے وقوفوں کی طرح مُنہ تکتا رہے؟ دھیرے دھیرے اس کے چہرے پر خون کی سُرخی دوڑنے لگی اور دھیرے دھیرے اس کے دل و دماغ پر سے رہی سہی ہمدردی بھی غائب ہونے لگی۔ اُس کے دماغ پر شیطان سوار ہو چکا تھا۔ یکایک ہی اُس کا تلوار والا ہاتھ پوری قوت سے اُس معصوم بچے پر گرا اور پھر آنکھیں بند کر کے وہ وار کرنے لگا ایک، دو، تین، چار بار چیخیں سنائی دیں پھر بچہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا لیکن پھر بھی امیر کا ہاتھ نہیں رُکا۔ وہ جس کو اپنا بیٹا بنانا چاہتا تھا اسی بچے کا اُس نے قیمہ بنا دیا تھا، اُسے پتا ہی نہیں چلا کہ ایک معصوم سی جان کے اُس نے کتنے ٹکڑے کر دیے ہیں۔ افلاطون دور کھڑا یہ بھیانک منظر دیکھ رہا تھا اور اُسے لگ رہا تھا کہ اس کا بیٹا برکت ہی ایک ظالم کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتر گیا ہے امیر کے ہاتھوں ہی اس کے بیٹے کی زندگی کا چراغ گُل ہو رہا ہے۔ آج تک اُس کا جو سب سے پیارا دوست تھا وہ اِس وقت اُسے ایک بے رحم قصائی لگنے لگا تھا تلوار کے ان جھٹکوں نے اُس کے اندر بندھی ہوئی دوستی کی گانٹھ کو کاٹ

کمر کھ دیا۔

"نہیں اب ایسے آدمی کا ساتھ میں نہیں دوں گا۔" افلاطون نے دانت پیستے ہوئے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا، پھر ذہن ہوتی ہوئی دوستی پر بہتے ہوئے آنسوؤں کو اس نے جلدی سے پونچھ لیا۔ پھر برکت کی قسم کھا کر اس نے خدا سے وعدہ کیا۔ "پروردگار ایک ٹھگ بن کر میں نے جو گناہ کیے ہیں انھیں تو معاف کر دینا، میں ابھی اور اسی وقت اس راستے سے واپس لوٹ رہا ہوں۔ خدایا تو میرے بیٹے کی حفاظت کرنا۔"

افلاطون کو یاد کر کے امیر بار بار آہیں بھرنے لگتا۔ اس نے جن کا کبھی تصور ہی نہیں کیا تھا وہی سب باتیں اس کے ساتھ پیش آ رہی تھیں اور زندگی میں جو کچھ اس نے سوچا تھا ان باتوں کا تو دور دور تک پتا نہیں تھا۔

اس وقت بھی امیر اسے یاد کرتے ہوئے دل ہی دل میں اپنے آپ سے کہہ رہا تھا... آہ میں نے اسے روکنے کی کتنی کوشش کی تھی لیکن وہ بے وقوف نہیں مانا۔ میرے ہاتھوں سے اگر اس لڑکے کا قتل ہو بھی گیا تھا تو اس میں اس قدر گھبرا جانے کی کیا بات تھی؟ میں خود بھی اس لڑکے کی جان نہیں لینا چاہتا تھا؟ میں تو اسے زندہ رکھنا چاہتا تھا اسے اپنے ساتھ لے جا کر میں اسے اپنا بیٹا بنانا چاہتا تھا لیکن وہ کم بخت روتا ہی رہا اور ضد کرتا رہا۔ میری تلوار کی چمک سے بھی وہ نہیں ڈرا بلکہ الٹے اس نے میرے کان میں دانت گاڑ دیے تھے۔ افلاطون کو میری مجبوری کا احساس ہونا چاہیے تھا۔ بیٹے کے لیے میں اور عظیمہ کب سے ترس رہے ہیں یہ بات اسے معلوم ہے وہ یہ بھی جانتا ہے کہ میں اس کے بیٹے سے کتنا پیار کرتا ہوں۔ یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود وہ مجھے قاتل کہہ کر آدھے راستے ہی میں میرا ساتھ چھوڑ کر چلا گیا؟ ٹھگ کا حلف اٹھاتے وقت بھی اس کا دل مضبوط تھا اور اس کے بعد آج تک اس نے لاتعداد مسافروں کو ختم کرنے میں اس کا ساتھ دیا تھا اور اب غصے کی حالت میں ایک لڑکے پر اگر میری تلوار اٹھ گئی تو اس میں اتنا برا ماننے کی کیا بات تھی؟

"افلاطون مجھے آدھے راستے میں چھوڑ کر تمھیں نہیں جانا چاہیے۔" امیر نے اسے سمجھانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ "یہ مت بھولنا کہ تم ایک ٹھگ ہو اور بھوانی دیوی کا قہر تمھیں برباد بھی کر سکتا ہے۔" اس کی یہ بات سن کر افلاطون نے بڑے کڑے لہجے میں اسے جواب دیتے ہوئے کہا تھا۔ "امیر دیوی کے قہر جیسی واہیات بات سے اب میں ڈرنے والا نہیں ہوں۔ اب میرا فیصلہ نہیں بدل سکتا میں خدا کی ذات کے سوا اور کسی کو نہیں مانتا۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اب میں ایک ٹھگ کی حیثیت سے زندہ نہیں رہوں گا۔"

"لیکن اس جنگل کے راستے اکیلے واپس جانے میں بڑا خطرہ ہے۔" امیر نے دلیل پیش کرتے ہوئے کہا تھا۔ "اور آگے جانے والے ساتھیوں نے اگر پوچھا کہ افلاطون کہاں گیا تو میں انھیں کیا جواب دوں گا؟"

"جو تمھارے جی میں آئے کہہ دینا۔" افلاطون نے امیر کی طرف دیکھے بغیر ہی جواب دیا تھا۔ "ان سے کہہ دینا کہ اسے اپنا گھر یاد آ گیا تھا۔ بال بچوں کی جدائی اس سے برداشت نہیں ہو رہی تھی اس لیے وہ واپس چلا گیا۔"

"اور اگر گھر میں تم سے پوچھا گیا کہ تم اکیلے کیوں واپس آ گئے تو تم عظیمہ کو کیا جواب دو گے؟" امیر کی آواز بھرا گئی۔ "کیا تم اس سے بھی جھوٹ بولو گے؟"

"اب جھوٹ بولنے میں باقی ہی کیا رہ گیا ہے؟" افلاطون نے چبھتی ہوئی نظروں سے امیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن تم گھبراؤ مت میں عظیمہ بہن پر تمھاری اصلیت ظاہر نہیں کروں گا۔ میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں۔"

امیر نے جب دیکھا کہ افلاطون پر اس کی باتوں کا اثر نہیں ہو رہا ہے تو اس نے دوسری کوشش کی۔ "تم بھول گئے افلاطون... تم نے مجھ سے زندگی بھر ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا تھا؟"

"وعدہ...؟" افلاطون نے دانت پیس کر ایک گہرا سانس لیا اور پھر بولا۔ "امیر یہ سب بے کار ہے الفاظ ہیں یہاں کون اپنا وعدہ نبھاتا ہے؟ انسان جب پیدا ہوتا ہے تو خدا اس سے وعدہ لیتا ہے کہ تم نیک اور پاک زندگی گزارو گے ہر روز پانچ وقت میری بندگی کرو گے اس وعدے کے پابند رہو گے۔ اب تم ہی بتاؤ امیر کہ خدا کی

عبادت کرنے کے فوراً ہی بعد ہم اس وعدے کو توڑتے ہیں یا نہیں؟"

"افلاطون۔" امیر بڑی حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ افلاطون میں اتنی سمجھداری کیسے آ گئی؟ لیکن یہ تعریف کا موقع نہیں تھا اسی لیے وہ اپنے لہجے میں سختی پیدا کرتے ہوئے بولا۔ "تم بزدل بن گئے ہو میرے دوست بزدل۔"

"مجھے یہ الزام قبول ہے۔" افلاطون پھیکی ہنسی ہنس کر بولا۔ "مجھے تم جیسا بہادر بننے کی خواہش نہیں ہے اور نہ ہی ٹھگ سردار بن کر دنیا میں مشہور ہونے کی تمنا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے تم میرا مذاق اڑا رہے ہو؟" امیر کا ہاتھ اس کی تلوار کے دستے پر گیا اور وہ غصے سے بولا۔ "افلاطون گروہ کا سردار ہونے کے ناتے میں تمھیں واپس جانے سے منع کرتا ہوں۔"

"میں اب ٹھگ نہیں ہوں اور اس لیے تم میرے سردار بھی نہیں ہو۔" افلاطون گھوڑے پر سوار ہونے کے لیے اس کی لگام تھامتے ہوئے بولا۔ "تم میں طاقت ہو تو مجھ پر تلوار اٹھاؤ اور دوستی کے نام پر داغ لگا دو۔"

پھر اس سے پہلے کہ امیر کچھ کہتا یا کچھ کرتا افلاطون گھوڑے پر سوار ہو کر اسے ایڑ لگا چکا تھا۔ "خدا حافظ امیر۔"

امیر دم بخود رہ گیا نہ تو وہ افلاطون کو روک ہی سکا تھا نہ اس کے منہ سے "خدا حافظ" کے الفاظ ہی سن سکا تھا۔ وہ دھیمی دھیمی چاندنی میں گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھا ہوا افلاطون جب اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تو وہ ایک سرد سی آہ بھر کر رہ گیا لیکن یہ آہ افلاطون کے چلے جانے کے غم میں تھی یا اس غم میں کہ وہ خود افلاطون کی طرح واپس نہیں جا سکتا تھا؟ اچھا ہی ہوا... آخر دو دلوں کی پریشانی کے بعد اس نے اپنے دل کو سمجھا لیا اور دل ہی دل میں اس عہد کو دہرانے لگا کہ ایک بار جس راستے کو اپنا لیا ہے اس راستے سے امیر کبھی پیچھے نہیں ہٹے گا۔ افلاطون ایک دن تمھارے اس دوست کی شان و شوکت کسی مہاراجا سے بھی بڑھ جائے گی اور تب تمھیں اپنی غلطی کا احساس ہو گا۔ تم نے مجھے قاتل کہا ہے لیکن اب میں تمھیں صحیح معنوں میں قاتل بن کر دکھاؤں گا۔ تم خدا سے کیا ہوا وعدہ نبھاؤ اور میں بھوانی دیوی سے کیا ہوا عہد نبھاؤں گا۔ پھر دیکھنا کامیابی کس کے قدم چومتی ہے؟

امیر نے جس طرح اپنے دل کو سمجھایا تھا اسی طرح اس نے اپنے ساتھیوں کو بھی سمجھا لیا۔ اس نے ان سب سے کہا۔ افلاطون کو میں نے ہی واپس بھیج دیا ہے۔ اس کی بیوی کو بچہ ہونے والا ہے اس لیے وہ ہر وقت اس کی فکر کرتا رہتا تھا اور میری جان کھاتا رہتا تھا کہ میں سفر کو مختصر کر کے واپس چلا چلوں۔ اس کا دل کام میں نہیں لگ رہا تھا اس لیے مجھے اس پر غصہ آ گیا اور میں نے اس سے کہہ دیا کہ اگر تمھیں جانا ہی ہے تو میری جان کیوں کھا رہے ہو؟ جاؤ چلے جاؤ یہاں سے ابھی اور اسی وقت..." امیر نے کہتے وقت بناوٹی غصے کا اظہار کیا تھا۔ "دوست تھا تو کیا ہوا؟ سفر میں بچوں کو یاد کیا جائے تو ٹھگ کیسے بنا جائے؟"

یہ سننے کے بعد اس کے سارے ساتھیوں کو اطمینان ہو گیا اور اپنے سردار پر ان کا اعتماد اور مضبوط ہو گیا۔ اس طرح افلاطون کے جانے کا کسی کو افسوس بھی نہیں ہوا۔

**

ساگر شہر پہنچ کر انھوں نے شگون دیکھا تو دیوی کی طرف سے انھیں جنوب کی جانب جانے کا اشارہ ملا۔ اس لیے انھوں نے بشیر آباد کا راستہ اختیار کیا لیکن ان دنوں اس طرف نگرانی بہت سخت کر دی گئی تھی۔ ملک کے زیادہ تر حصوں پر انگریزوں نے اپنے قدم جما لیے تھے اور انھوں نے جگہ جگہ اپنی چوکیاں قائم کر لی تھیں۔ خاص طور پر انھوں نے ان شکاریوں پر بہت زیادہ توجہ دینی شروع کر دی تھی کہ سفر پر نکلے ہوئے بڑے سے بڑے قافلے کے تمام مسافر کہاں غائب ہو جاتے ہیں؟ ان کا خیال تھا کہ ٹھگ لوگوں کے سوا یہ کام کسی اور کا نہیں ہو سکتا کیوں کہ چور اور ڈاکو لوگوں کو ختم کرنے کے بعد ان کی لاشوں کو دفنانے کی فکر نہیں کرتے اور اگر مسافر جنگلی درندوں کے شکار بن جاتے ہوں تو بھی ان کی ہڈیاں تو کہیں نہ کہیں سے مل ہی جاتیں لیکن چونکہ آج تک گم ہونے والوں کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ اس لیے ان کا شک ٹھگوں پر ہی جاتا تھا۔

انگریز عملداری کے علاقے میں داخل ہونے کے بعد امیر نے ایک بار پھر اپنے گروہ کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا۔ انگریزوں کی نگرانی سخت ہونے کے باوجود امیر کو رشوت اور خوشامد سے کام نکالنے کا طریقہ آتا تھا۔ اپنی میٹھی میٹھی باتوں کے زور پر وہ بے دھڑک اپنی ٹولی کو آگے بڑھاتا رہا۔ اُس کی قابلیت پر بھروسا کرتے ہوئے اُس کے ساتھی بھی بلا کسی خوف و خطر کے اُس کا ساتھ دے رہے تھے۔ وہ ایک دن میں دو چار شکار پر ضرور ہی ہاتھ صاف کر لیتے تھے اور زیادہ مال و دولت ہاتھ نہ لگے تب بھی خوش نظر آتے تھے۔

ہولکر کی راجدھانی میں داخل ہونے کے بعد امیر نے ذرا اطمینان کا سانس لیا اور شہر سے باہر چھاؤنی ڈال کر اُس نے اپنے سب سے بااعتماد ساتھی رامو کو شکار کی تلاش میں روانہ کرتے ہوئے کہا۔ "جاؤ رامو شہر میں جا کر معلوم کرو اگر کسی کو ہم سفر کی ضرورت ہو تو اُسے کھینچ لاؤ۔"

پھر شکار کی تلاش میں سپاہی کا بھیس بدل کر گیا ہوا رامو دو ہی گھنٹے میں خوش خبری لے کر واپس آ گیا اُس نے امیر سے کہا۔ "سردار میں نے ایک معزز اور عزت دار آدمی کو اپنے پھندے میں پھنسا لیا ہے۔ وہ اپنی بیوی کے ہمراہ یہاں نزدیکی ایک گاؤں میں جانا چاہتا ہے۔ اس نے کہا تھا اگر اُسے سپاہیوں کا ساتھ مل جائے تو وہ کسی بھی وقت یہاں سے روانہ ہونے کے لیے تیار ہے۔"

"شاباش۔" امیر نے اس کی پیٹھ پر تھپکی دی۔ "وہ اگر دور نہیں جانا چاہتا تو کیا ہوا لیکن بیوی کے ساتھ ہونے سے اُس کے پاس زیورات وغیرہ تو ضرور ہوں گے۔"

"لیکن میں نے اُس سے کہا ہے کہ آپ پہلے ہمارے جمعدار صاحب سے مل لیں۔ اُن کی اجازت کے بغیر ہم آپ کو اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتے۔" رامو نے کہا۔

"یعنی وہ مجھ سے اجازت لینے کے لیے یہاں آنے والا ہے کیوں؟"

"ہاں سردار اُس نے شام سے پہلے آنے کا وعدہ کیا ہے۔"

"اُس کی موت اُسے ضرور یہاں کھینچ لائے گی۔" امیر نے دونوں ہتھیلیوں کو رگڑ کر اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ "میں اُس سے ملاقات کے لیے بے چین ہوں۔"

لیکن امیر یہ بات نہیں جانتا تھا کہ قدرت اُس کی ملاقات کس سے کرانے والی ہے؟

**

عصر کے وقت ایک نوجوان پٹھان اپنے ایک ملازم کے ساتھ امیر کے خیمے میں داخل ہوا۔ تب رامو نے اُس کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "جمعدار صاحب میں صبح آپ سے کہنا بھول گیا تھا۔ شہر میں میری اِس نوجوان سے ملاقات ہوئی تھی۔ انھیں یہاں سے تھوڑی دور واقع ایک گاؤں میں جانا ہے یہ ہمارے ساتھ چلنا چاہتے ہیں تاکہ راستوں کے خطرات سے محفوظ رہ سکیں اِسی لیے یہ آپ سے ملنے آئے ہیں۔"

"تشریف رکھیے خان صاحب۔" نوجوان پٹھان اُس کا ہم عمر ہی تھا لیکن امیر نے اُسے احترام سے مخاطب کیا۔ نوجوان نے بھی ادب سے اُس کا شکریہ ادا کیا اور اُس کے سامنے بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر تک وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ امیر کو جب اِس بات کا خیال آیا کہ یہ نوجوان اُسے گھور گھور کر دیکھ رہا ہے تو اُس نے خاموشی کو توڑتے ہوئے پوچھا۔ "آپ کی تعریف؟"

اُس کی آواز سُن کر پٹھان نوجوان اپنے خیالوں سے چونک پڑا اور کمر سیدھی کر کے بیٹھتا ہوا بولا۔ "میرا نام رحمت خان ہے اور اللہ کے فضل سے میرے بزرگ ابا جان کی گاؤں میں بڑی عزت ہے اور گھر میں آپ جیسی خوبصورت بیوی بھی ہے۔"

اُس کی اِس مثال پر امیر کو ہنسی آ گئی وہ سوچنے لگا کہ اپنی غرض کی وجہ سے یہ نوجوان تعریف کرنے میں بھی بخل کھلا گیا ہے۔ کوئی مرد بھلا یہ کیسے برداشت کر سکتا ہے کہ اُس کا مقابلہ کسی عورت سے کیا جائے؟ لیکن امیر اِس وقت کچھ اور ہی سوچ رہا تھا کہ اگر یہ نوجوان شادی شدہ ہے تو اُس کے ساتھ بچے بھی ہوں گے۔ اِسی لیے اُس نے پوچھ لیا۔ "تب تو خدا نے آپ کو خوبصورت اولاد بھی بخشی ہو گی؟"

یہ سن کر نوجوان پٹھان کے چہرے پر شرم کی سُرخی دوڑ گئی اور وہ نگاہیں جھکا کر بولا۔ "ابھی تو نہیں لیکن خدا کی یہ مہربانی بھی ہونے والی ہے۔"

"اوہ..." امیر خوشی کا اظہار کرنے والا تھا لیکن ایک سرد آہ بھر کر رہ گیا لیکن اِس سے پہلے کہ اُس نوجوان کو اُس کی افسردگی کا خیال آتا اُس نے جلدی سے بات بدل دی "ہاں تو آپ ہمارے ہم سفر بننا چاہتے ہیں؟"

"اگر آپ ہماری حفاظت کی ذمے داری لیں تو..."

"حفاظت تو خدا کے ہاتھ میں ہے۔" امیر نے اُس کی بات کاٹ کر اپنی ہوشیاری کا ثبوت دیا۔ "ویسے ہم سپاہیوں کا کام ہی تو لوگوں کی جان و مال کی حفاظت کرنا ہے۔ سُنا ہے کہ آگے کا راستہ ذرا پُرخطر ہے چور ڈاکوؤں کے خوف سے لوگ اکیلے سفر کرنے سے ڈرتے ہیں۔"

"چور لٹیروں سے تو اتنا ڈر نہیں ہے۔" نوجوان پٹھان گھبرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "اصل خوف تو ٹھگ لوگوں سے ہے۔"

"ٹھگ لوگ؟" امیر چونکتا ہو گیا اُس کی آنکھوں میں ایک چمک سی لہرا گئی لیکن دوسرے ہی پل اُس نے خود کو سنبھال لیا۔ "تب تو آپ یقیناً ٹھگوں کے بارے میں کچھ نہ کچھ جانتے ہوں گے۔ حالانکہ میں سنی سنائی بات پر زیادہ یقین رکھتا۔ آج کل بہت سے لوگ ٹھگوں کا تذکرہ کرتے رہتے ہیں۔"

"پھر بھی جمعدار صاحب یہ بات نہ ماننے والی بھی نہیں ہے۔" پٹھان نوجوان نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔ "خود میرے سسر صاحب اُن کا شکار بن چکے ہیں۔"

امیر نے ایک ہلکا سا جھٹکا محسوس کیا۔ "اوہ تب تو آپ کی بات سچ ہو گی۔"

"میں نے تو ٹھگوں کے بارے میں اپنے ابا جان سے بہت کچھ سنا ہے۔"

رحمت خان بتانے لگا۔ "برسوں پہلے میرے سسر صاحب اِسی راستے سے سفر پر روانہ ہوئے تھے لیکن وہ اپنی منزل پر نہیں پہنچ سکے تھے۔"

امیر نے جب تھوڑی دیر تک کوئی جواب نہیں دیا تو رحمت خان نے اُسے آگے کی بات کہہ کر چونکا دیا۔ "آپ کو اگر ٹھگ لوگوں کے بارے میں کچھ جاننا ہو تو میرے بزرگوں سے ملیں کسی دن گھر تشریف لائیں آپ سے مل کر انھیں خوشی ہو گی اور وہ تفصیل سے آپ کو اُن کے متعلق بتائیں گے۔"

امیر اُس کی بات سن کر دل ہی دل میں مُسکرایا۔ بھلا ٹھگوں کے بارے میں اُس سے زیادہ اِس پٹھان کے بزرگ کیا جانتے ہوں گے؟ لیکن پھر بھی اُن سے ملنے کی خواہش تو اُس کے دل میں پیدا ہو چکی تھی۔ یہ رحمت خان اُسے بہت زیادہ بھالا لگ نظر آ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ سفر پر چلنے سے پہلے یہ نوجوان اُسے اپنے باپ کے پاس لے جا کر اپنا اطمینان کر لینا چاہتا ہے لیکن بھلا وہ بوڑھا اس کی اصلیت کیسے جان سکتا ہے؟ اُس سے مل کر ذرا تفریح رہے گی۔ اِس خیال سے اُس نے اپنی رضامندی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "بڑی خوشی سے میں آپ کے بزرگ سے ملنے ضرور آؤں گا۔ بزرگوں کے تجربات سے بہت سی باتیں سیکھنے کو ملتی ہیں۔" اتنا کہہ کر وہ چند لمحوں کے لیے رُکا پھر اس طرح بولا جیسے اُسے اچانک ہی کچھ یاد آ گیا ہو۔ "مگر ہم لوگ تو کل صبح ہی یہاں سے روانہ ہو جانا چاہتے ہیں۔"

"تو کیا ہوا؟ آپ اسی وقت میرے ساتھ چل سکتے ہیں۔" رحمت خان اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "ہم پٹھان لوگ تو مہمانوں پر جان تک نچھاور کر دیتے ہیں۔"

"تو پھر چلیے۔" امیر بھی اُٹھ کھڑا ہوا اور ہنستے ہوئے بولا۔ "اِس بہانے آپ کا شہر بھی دیکھ لوں گا لیکن آپ مجھے زیادہ دیر نہ روکیے گا۔ آپ کے شہر کا دروازہ جلدی بند تو نہیں ہو جاتا؟"

"آپ بے فکر رہیں۔" رحمت خان نے پٹھانی انداز سے امیر کا ہاتھ تھام لیا۔

"مہمانوں کے لیے ہمارے شہر کا گھر کا اور دل کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔" اور امیر ہنستا ہوا جوش جوش میں اُس کے ساتھ خیمے سے باہر نکل گیا۔

**

سورج غروب ہونے کی تیاری میں مصروف تھا اور جنگل سے چر کر واپس جانے والے جانوروں کے زیوڑ دھول اڑاتے ہوئے دوڑ رہے تھے۔ امیر رحمت خان سے باتیں کرتا ہوا شہر کی جانب بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر

کی اِس ملاقات میں وہ دونوں اِس قدر گھل مل گئے کہ ایک دوسرے کو آپ کی بجائے تم کہہ کر مخاطب کرنے لگے تھے۔ امیر نے چلتے چلتے رحمت خان سے کہا "تمھارے گاؤں میں شام بڑی سہانی لگتی ہے۔"

"شام تو سب ایک سی ہوتی ہیں میر صاحب۔" رحمت خان نے کہا۔

"شاید تم جیسے سپاہی کی مہمان نوازی کا انھیں موقع نہیں ملتا ہوگا۔"

لیکن امیر کا دھیان اب اُس کی باتوں سے ہٹ کر دوسری جانب دوڑ رہا تھا۔ جانوروں کی گردنوں میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی آوازیں اس کے اندر ایک عجیب سی ہلچل مچا رہی تھیں۔ چند قدم آگے جا کر اُسے کسی فقیر کا جھونپڑا اور اُس جھونپڑے کے برابر ایک چھوٹا سا باغ دکھائی دیا تو اُسے اچانک کچھ یاد آنے لگا اور اُس کے قدم خود بخود تیزی سے اُٹھنے لگے۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ جس شہر کو اُس نے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا اُس کی گلیاں اُسے اجنبی کیوں نہیں لگ رہی ہیں؟ کیوں ایک بچے کی طرح اُس کا دل اِن راستوں پر دوڑنے کے لیے بے چین ہوتا جا رہا ہے؟

شہر کے بڑے پھاٹک میں داخل ہوتے ہی امیر کی آنکھیں حیرت سے پھیلنے لگیں یہ کوتوالی اِلٰہی کے درخت والی یہ مسجد اور مہادیو کا یہ مندر۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اِن سب کو اس نے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ اچانک اُس کا جی چاہا کہ وہ رحمت خان سے پوچھ لے کہ اِس مندر کے قریب پیپل کا جو بہت بڑا درخت تھا وہ اب کیوں نظر نہیں آرہا ہے؟ لیکن پھر اُس نے خود ہی اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ اُسے اپنے اس وہم پر ہنسی آنے لگی۔ اُسے لگا کہ اُس کا یہ سوال سُن کر رحمت خان کہیں اُسے بے وقوف نہ سمجھ بیٹھے۔

"بھئی کس خیال میں کھو گئے ہو میر صاحب؟" یکایک رحمت خان نے اُسے چونکا دیا۔ "اچانک تم اس قدر سنجیدہ کیوں ہو گئے؟"

"اوں" امیر خیالوں سے چونک پڑا۔ "میں سوچ رہا تھا کہ اتنے سارے مکانوں میں سے تمھارا مکان کون سا ہوگا؟"

"سمجھ لو کہ اب آ ہی گیا۔" رحمت خان ایک گلی میں مڑتے ہوئے بولا۔ "وہ سامنے چوڑے زینے اور چوڑے صحن والا مکان ہے نا...؟"

امیر پھر چُپ ہو گیا اُس نے بھی ٹھیک ایسے ہی مکان کا تصور کر رکھا تھا۔ اُس نے بہ مشکل اپنی حیرت کو دبا کر پہلا قدم رکھا۔ پھر گھر میں داخل ہوتے وقت اُسے لگا کہ اس صحن میں وہ اس سے پہلے بھی قدم رکھ چکا ہے لیکن کب؟ اُسے یاد نہیں آرہا تھا۔

بیٹھک خانے میں لے جا کر رحمت خان نے اسے ایک گدّے پر بٹھا دیا اور بولا "اب تم ذرا آرام کر لو اتنے میں میں ابا جان کو بلا کر لاتا ہوں۔"

پانی کا ایک گلاس پی کر اُس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور رحمت خان کے باپ کا سامنا کرنے کے لیے پورے طور سے تیار ہو کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد دروازے پر لٹکتی ہوئی چٹائی کا پردہ ہٹا اور رحمت خان کے ساتھ ایک بزرگ کمرے میں داخل ہوتا دکھائی دیا۔ امیر اُسے سلام کرنے کے لیے اٹھا تو بُری طرح چونک پڑا یہ کیا؟ اِس بزرگ کو اُس نے کہیں دیکھا ہے ایسا کیوں لگ رہا ہے؟ کیا ہوا اس کا؟ اُس نے اس بزرگ کا نام یاد کرنے کے لیے اپنے دماغ کو جھنجھوڑا... رحیم خان جیسا کوئی نام اُسے یاد آ رہا تھا لیکن رحمت خان نے اس کا یہ وہم دور کر دیا اُس نے بزرگ کا تعارف کرتے ہوئے کہا "میر صاحب یہ ہیں میرے والد محمد خان۔"

"نوجوان تم کھڑے کیوں ہو؟ بیٹھ جاؤ۔" محمد خان نے بڑی محبت سے اُسے برابر بٹھا لیا اور بولا "گھر میں جب کوئی مہمان آتا ہے تو بہت اچھا لگتا ہے۔"

امیر اس طرح خاموش بیٹھا تھا جیسے مارے حیرت کے اُس کی زبان بند ہو گئی ہو۔

"رحمت خان نے مجھے بتایا تھا کہ تم حیدر آباد کی طرف جانے والے ہو۔" بوڑھا محمد خان اپنی سفید داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ "بہت سارے لوگ اگر ساتھ ہوں تو کوئی حرج نہیں ہے ورنہ یہ راستہ بہت زیادہ خطرناک ہے۔"

"محترم، ہم جیسے سپاہی ایسے خطروں کے عادی ہوتے ہیں۔" امیر کو اپنی زبان چلاتی پڑی۔ "جب تک خدا کی مہربانی

ہوگی تب تک کوئی بال بیکا نہیں کر سکتا۔"

"ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔" محمد خان نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔ "رحمت خان نے کہا تھا کہ تم مجھ سے ٹھگوں کی کہانی سننا چاہتے ہو۔ سپاہیوں سے چونکہ ٹھگ لوگ خوف کھاتے ہیں اِس لیے شاید تمھیں اُن کا تجربہ نہیں ہوا ہوگا۔"

امیر پھر چُپ ہو گیا لیکن اُس کے چہرے پر ٹھگوں کا قصّہ سننے کی بے چینی صاف دکھائی دے رہی تھی۔

"بیس پچیس سال پہلے کی بات ہے۔" بوڑھا محمد خان کچھ یاد کرنے کی کوشش کرتا ہوا بولا۔ "میرے اس بیٹے کی بیوی کے ماں باپ حیدر آباد سے اندور کی طرف جا رہے تھے۔ اُن کے ساتھ اُن کا چار پانچ سالہ بیٹا بھی تھا اپنی حفاظت کے لیے انھوں نے کچھ ہتھیار بردار آدمیوں کو بھی اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ خان صاحب کو اندور میں اچھی ملازمت مل گئی تھی۔ اُن کے پاس نقدی اور کچھ زیورات بھی تھے۔ تقریباً آدھا سفر تو انھوں نے خیر و خوبی سے طے کر لیا تھا۔ پھر اُن سے غلطی یہ ہو گئی کہ انھوں نے اپنے ساتھیوں کو وہاں سے واپس بھیج دیا۔ انھیں یقین تھا کہ سپاہیوں کے ساتھ ہونے کی وجہ سے انھیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی لیکن آگے بڑھتے ہی وہ ٹھگوں کے شکار ہو گئے۔"

"اوہ..." امیر کو سچ مچ جھٹکا محسوس ہوا اُسے اِس بات کا بھی ڈر تھا کہ چونکہ اُس نے خود کو سپاہی ظاہر کیا ہے۔ اس لیے کہیں اُس بوڑھے کو اس پر بھی شک نہ ہو جائے۔ اُس نے اِس بات سے ہوشیار ہونے کی غرض سے پوچھ لیا۔ "کیا ٹھگ لوگ اتنے بے رحم ہوتے ہیں کہ چھوٹے بچوں کو بھی قتل کر دیتے ہیں؟"

"افسوس... اس سوال کا تو ہمیں آج تک جواب ہی نہیں ملا۔" محمد خان نے درد بھری آواز میں کہا۔ "وہ بچہ ہر کسی کو پیارا لگنے والا بچہ تھا۔ جن سپاہیوں کے ساتھ خان صاحب سفر پر روانہ ہوئے تھے اُن کے سردار سے امیر بہت گھل مل گیا تھا۔"

"امیر؟" امیر کا منہ ایک زبردست جھٹکے سے کھل گیا لیکن اُس نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا۔ "اوہ سمجھا اُس لڑکے کا نام بھی امیر ہی ہوگا۔"

"ہاں۔" بوڑھے محمد خان نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔ "وہ اگر زندہ ہوگا تو آج تمھارے برابر ہی ہوتا۔" بولتے بولتے نہ جانے کیا ہوا کہ وہ امیر کو گھور گھور کر دیکھنے لگا پھر سر ہلا کر بڑبڑانے لگا۔ "ارے ابھی تک گھر میں روشنی کیوں نہیں کی گئی؟"

چند لمحوں تک تو کمرے میں خاموشی چھائی رہی پھر امیر کو چٹائی کے پیچھے ایک عورت کا سایا دکھائی دیا جس کے ہاتھوں میں جلتا ہوا چراغ تھا۔ رحمت خان اٹھ کر اس طرف گیا تو امیر نے اندازہ لگا لیا کہ پردے کے پیچھے کھڑی ہوئی عورت اُس کی بیوی ہی ہوگی۔ وہ کمرے کی جانب پیٹھ کیے کھڑی تھی اور پردے کی رکاوٹ کے باوجود امیر کو لگا کہ وہ بے حد نازک سی ہونی چاہیے۔

رحمت خان نے جلتے ہوئے چراغ کو اپنے قریب ہی رکھ لیا تھا اور بوڑھا محمد خان اُس کی روشنی میں امیر کو گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ اُس کے چہرے کے تاثرات بار بار بدلتے جا رہے تھے پھر اچانک وہ اس کے چہرے پر سے نظریں ہٹا کر بول اٹھا۔ "رحمت ذرا دیکھو تو سہی اِس کا چہرہ تو بہو سے بے حد ملتا جلتا دکھائی دے رہا ہے۔"

"ہاں ابا جان پہلے تو میں بھی یہ دیکھ کر چونک پڑا تھا۔" رحمت خان نے بھی جب اپنے باپ کی تائید کی تو امیر اُن دونوں کو عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر یہ لوگ کہنا کیا چاہتے ہیں؟ کیا اُسے جان بوجھ کر یہاں لایا گیا ہے؟

"کہیں تم..." بوڑھے نے بولتے بولتے ایک کپکپاہٹ سی محسوس کی۔ "تم ہماری بہو کے بھائی تو نہیں ہو؟"

"بہو کا بھائی؟" امیر اُلجھن میں پڑ گیا۔

"تم سے میں ایک بات کہنا بھول گیا تھا۔" بوڑھا محمد خان اُس کی طرف دیکھ کر بولا۔ "جس خان صاحب کا قصّہ میں نے تمھیں سنایا تھا اُن کی بیٹی سفر میں اُن کے ساتھ نہیں تھی۔ وہ اکثر بیمار رہتی تھی اِس لیے اُسے حیدر آباد میں اپنے چچا کے یہاں چھوڑ دیا گیا تھا اِسی لیے وہ بچ گئی۔"

"میں ابھی تک آپ لوگوں کا مطلب نہیں سمجھ سکا ہوں۔" امیر نے کہا تو محمد خان اُسے ایک پھر اُسے گھور گھور کر دیکھنے

لگا۔ تھوڑی دیر تک وہ چُپ چاپ اُسے دیکھتا رہا پھر بولا۔
"میرے اِس بیٹے کی شادی اُسی خان صاحب کی بیٹی کے ساتھ ہوئی ہے جو بچپن میں ہی اپنے ماں باپ اور اپنے اکلوتے بھائی کو کھو چکی تھی۔ اب تم ہی بتاؤ کہ اگر خان صاحب کا بیٹا امیر بچ گیا ہو اور وہ اگر تم ہی ہو تو کیا تم اُس کے بھائی نہیں ہوئے؟"

"نے... لیکن" امیر کی زبان اُس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی لیکن پھر وہ ایک دھماکے سے بول پڑا "یہ کس طرح ہو سکتا ہے میں ایک سیّد کا بیٹا ہوں جب کہ وہ لڑکی پٹھان ہے میں جب نو سال کا تھا تب میں نے اپنی ماں کو مرتے دیکھا تھا اور میرے والد بھی ابھی تک حیات تھے۔"

اُس کی بات سُن کر بوڑھے محمد خان نے ایک ٹھنڈی سانس لی پھر اپنے کانپتے ہاتھ کو ہلا کر اُس نے کہا "برا نہ لگانا لیکن تمھیں دیکھ کر ہم غلط فہمی میں ضرور پڑ گئے تھے۔ اکثر کسی رشتے ناتے کے بغیر دو آدمیوں کی شکلیں ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہوتی ہیں۔ اُس پر میر صاحب آپ کا نام بھی تو امیر سے ملتا جلتا ہی ہے۔"

"یہ بھی ایک اتفاق کہا جائے گا" امیر نے اُسے تسلّی دینے کی کوشش کی "خان صاحب کی بیٹی سے ہمدردی کا اظہار کرنے کے سوا اور میں کر بھی کیا سکتا ہوں؟"

لیکن محمد خان ابھی اُس موضوع کو ختم کر دینے کے موڈ میں نہیں تھا اِسی لیے وہ جلدی سے بولا "رحمت خان کی بیوی یوں تو میری اپنی بیٹی کی طرح ہے بچپن میں خان صاحب اسی گاؤں میں رہتے تھے۔ ہم دونوں میں گہری دوستی تھی پھر جب اُن کے گھر بیٹی نے جنم لیا تو ہم نے رشتہ طے کر لیا۔ مجھے یاد ہے انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ چھوٹی بڑی ہو گئی تو تمھارے بیٹے سے میں اُس کی شادی کروں گا۔"

"اور آپ نے بھی اِس وعدے کو خوب نبھایا۔"

"ہاں۔ کئی سال گزر جانے کے بعد بھی یہی لگتا تھا کہ یہ لڑکی کبھی بھی ٹھیک نہیں ہو گی۔ وہ ہمیشہ سے یہی کہتی آ رہی ہے کہ میرا بھائی زندہ ہے۔ سفر پر جانے کے بعد امیر نے اپنی بہن چھوٹی کے لیے ایک سکّہ بھیجا تھا جسے دن رات وہ دیکھ دیکھ کر روتی رہتی تھی۔ آخر ایک پیر صاحب کی تعویذ نے اُسے بہلا لیا۔"

"پیر صاحب کی تعویذ؟" امیر نے اپنی دلچسپی کا اظہار کیا۔

"ہاں خدا کی مہربانی تھی کہ ایسا تعویذ مل گیا۔ اُس کی [illegible] میں تو جیسے جادو ہے۔ جب وہ تعویذ پہنے ہوتی ہے تو [illegible] خوش دکھائی دیتی ہے لیکن جیسے ہی وہ اُسے گردن سے [illegible] کرتی ہے تو اُس کی طبیعت بگڑ جاتی ہے اور وہ ادا[illegible] جاتی ہے۔ ہم سب کی ایک ہی خواہش تھی سو وہ [illegible] اس تعویذ کی برکت سے پوری ہونے والی ہے۔ [illegible] ماہ بعد ہمارے گھر میں بچّے کا پالنا بندھے گا۔" بوڑھے [illegible] خان کی آواز میں اب خوشی چھلک رہی تھی۔

"یہ تو اللہ کی دین ہے" امیر نے خوشی کے ساتھ [illegible] کا بھی اظہار کیا۔

"خدا نے مجھے ایک بیٹا دیا تھا لیکن پیدا ہوتے [illegible] واپس چلا گیا۔ اب ایک بیٹی پر ہی اپنا پیار برسا[illegible]"

"نوجوان اِس قدر نا اُمید ہونے کی ضرورت نہیں" بوڑھے محمد خان نے دھیرے سے امیر کے کندھے پر [illegible] رکھ دیا "تم تو ابھی جوان ہو کبھی نہ کبھی کسی پیر فقیر سے تمھاری ملاقات ہو جائے گی تب تم اُن کی خدمت کر کے ایسا تعویذ حاصل کر لینا۔ انشاء اللہ تمھارے سارے دُکھ [illegible] ہو جائیں گے۔"

امیر نے پہلے محمد خان کی طرف اور پھر اُس کے [illegible] کی طرف دیکھ کر بولا "محترم اگر آپ کو اعتراض نہ [illegible] کیا آپ وہ تعویذ مجھے دکھا سکتے ہیں؟ ممکن ہے اُس [illegible] دیدار سے ہی میری بگڑی سنور جائے۔"

"بے شک تم اُسے دیکھ سکتے ہو" بوڑھے نے [illegible] بیٹے کی طرف دیکھ کر کہا "بیٹا ذرا میر صاحب کو وہ [illegible] دکھا دو۔"

رحمت خان اُٹھ کر اندر چلا گیا۔ تعویذ لانے [illegible] تھوڑی دیر ہوئی۔ امیر سے یہ تاخیر برداشت نہیں [illegible] تھی۔ اُس کی سمجھ میں خود نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس تعویذ [illegible] کے لیے اس قدر بے چین کیوں ہوا جا رہا ہے؟ تھوڑی [illegible] بعد رحمت خان نے تعویذ لا کر اپنے باپ کے ہاتھ [illegible] رکھ دیا تو امیر نے بے صبری سے ہاتھ بڑھا کر کہا "[illegible]

دیکھوں تو..."

اس نے تعویذ کو ہاتھ میں لے کر دیکھا لیکن اس میں اُسے کوئی خاص بات نظر نہیں آئی مگر اُس کے لمس سے اُس نے اپنے اندر ایک سنسناہٹ سی ضرور محسوس کی تھی

"محترم تعویذ کے ساتھ بندھا ہوا یہ سکّہ کیسا ہے؟"

"یہی تو بہو کے بھائی کی آخری نشانی ہے" بوڑھا محمد خان اپنی داڑھی کھجاتے ہوئے بولا "بے چاری نے اِسے اپنی جان کی طرح سنبھال کر رکھا ہے۔ اب تو یہ سکّہ بالکل ہی گھس گیا ہے۔ اس پر لکھی ہوئی تحریر بھی پڑھی نہیں جاتی۔"

تعویذ کے ساتھ بندھے ہوئے اُس سکّے نے امیر کے دل میں ایک ہلچل سی مچا دی۔ ایک منظر اُس کی آنکھوں میں ناچ رہا تھا۔ پانچ برس کا ایک بچّہ کسی آدمی کے ہاتھ میں یہ سکّہ دیتے ہوئے کہہ رہا ہے "یہ سکّہ میری چھوٹی کو دے دینا اور اُس سے کہنا کہ بھائی کی نشانی سمجھ کر اسے سنبھال کر رکھنا۔" یہ منظر اُس کے ذہن کے پردے پر بہت دھندلا دھندلا سا دکھائی دے رہا تھا لیکن اُس کے باوجود وہ بچّہ اُسے اپنے ہی جیسا لگ رہا تھا۔ امیر نے اس کا یہ مطلب نکالا کہ اگر یہ تعویذ اس کے ہاتھ میں آ جائے تو وہ ایک ایسے ہی خوبصورت بیٹے کا باپ بن سکتا ہے۔ بوڑھے محمد خان کی بات اُسے سچی لگ رہی تھی۔ کیوں کہ تعویذ کو ہاتھ میں لیتے ہی اُس پر عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ اب اس کا جی نہیں چاہتا تھا کہ وہ اِس تعویذ کو واپس کر دے۔ اُس نے دل میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ جس طرح بھی ہو وہ اس تعویذ کو حاصل کر کے ہی رہے گا۔

"اچھا اب میں آپ سے اجازت چاہوں گا" اچانک اُس نے تعویذ واپس کرتے ہوئے بوڑھے محمد خان سے کہا۔

"لیکن ہم آپ کو کھانا کھائے بغیر جانے نہیں دیں گے" محمد خان نے کہا "باتوں باتوں میں ہم آپ کی خاطر وغیرہ کرنا ہی بھول گئے۔"

"اس تکلیف کی کوئی ضرورت نہیں ہے" امیر کو ایک عجیب سی بے چینی محسوس ہو رہی تھی "صبح ہمیں یہاں سے روانہ ہو جانا ہے۔ سپاہی میری راہ دیکھ رہے ہوں گے آپ سے مل کر مجھے ایسا لگا کہ جیسے اپنے کسی قریبی رشتے دار سے میری ملاقات ہوئی ہے۔"

"تو تم کل صبح ہی روانہ ہو جاؤ گے"

"ارادہ تو کچھ ایسا ہی ہے" امیر محمد خان کے ہاتھ میں دبے ہوئے تعویذ پر نظریں جما کر بولا "رحمت خان کو اگر ہمارے ساتھ چلنا ہو تو اُسے بھی تیاری کرنی پڑے گی۔"

"ہاں... ہاں" محمد خان کو جیسے کچھ یاد آ گیا "رحمت خان تمھارے ساتھ ہی جائے گا۔ تیاری تو اس نے بہت دنوں سے کر رکھی ہے۔ صرف تم جیسے کسی ہم سفر کا انتظار تھا پھر"

"اس کے لیے آپ بالکل فکر مند نہ ہوں" امیر نے بہ شکل تعویذ پر سے نظریں ہٹائیں "انھیں میں خیریت سے اِن کی منزل پر پہنچا دوں گا۔"

یہ آخری الفاظ ادا کرتے وقت اس کا لہجہ کچھ عجیب سا ہو گیا تھا لیکن باپ بیٹے کو کوئی شک نہ ہو جائے اس لیے وہ جلدی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ ٹھیک اُسی وقت بوڑھے محمد خان نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا "تم ساتھ ہو تو مجھے اپنے بیٹے اور بہو کی کوئی فکر نہیں ہو گی۔ تم اگرچہ اس کے بھائی نہیں ہو لیکن بھائی جیسے تو ہو ہی۔"

بوڑھے محمد خان کے یہ الفاظ امیر کو بُری طرح سے کھٹکے اور وہ کمرے سے باہر نکلنے کے لیے جلدی جلدی دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ دروازے کے قریب پڑی ہوئیں جوتیاں پیر میں ڈالتے وقت اُس نے دیکھا تو چٹائی کے پردے کے پیچھے رحمت خان کی بیوی کھڑی ہوئی تھی اور رحمت خان اُسے تعویذ واپس کر رہا تھا۔ گھر سے باہر نکل جانے کے بعد امیر بوڑھے محمد خان کے آخری الفاظ کو یاد کرتے ہوئے دل ہی دل میں کہہ رہا تھا "بے وقوف بوڑھے میں تیری میٹھی میٹھی باتوں میں آنے والا نہیں ہوں۔ مجھے کسی کا بھائی بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے تو ایک خوبصورت بیٹے کا باپ بننا ہے۔ میں اِسی لیے وہ تعویذ حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

اُس کرامتی تعویذ کے خیال میں امیر رات بھر کروٹیں بدلتا رہا لیکن پو پھٹنے سے قبل اُس کی پلکیں نیند سے بوجھل ہو گئیں۔ اِسی لیے صبح اٹھنے میں اُسے دیر ہو گئی تھی۔ آنکھ کھول کر اُس نے دیکھا تو سفر کی تیاریاں تقریباً مکمل ہو چکی تھیں۔ اُس کے ساتھیوں نے خیمے سمیٹ لیے تھے اور اب وہ لوگ اس کے جاگنے

کی ہی راہ دیکھ رہے تھے۔ فجر کی نماز پڑھنے کے بعد وہ جلدی جلدی خیمے سے باہر نکل آیا۔ اُس کے چند ساتھی خیمے کے باہر کھڑے تھے۔

"سردار اب ہمیں کوچ کر دینا چاہیئے۔" رامو نے امیر کا خیمہ اکھاڑتے ہوئے پوچھا۔ "آج آپ نے بھرپور نیند کھینچی ہے۔"

امیر نے اس بات کا جواب دیئے بغیر چاروں طرف نظریں گھمائیں۔ پھر صبح کی تازہ ہوا پھیپھڑے میں بھرنے کے بعد آسمان پر اُڑتے ہوئے ایک پرندے کو وہ بڑے غور سے دیکھنے لگا پھر یکایک رامو کی طرف مڑ کر بولا۔ "ہمیں اپنے شکار کا انتظار کرنا ہے۔ وہ لوگ ابھی تک کیوں نہیں آئے؟" اس کی آواز میں عجیب سی بے چینی تھی۔

"آپ کل والے نوجوان پٹھان کی بات ہی کو رہے ہیں نا؟" رامو نے اُسے ترچھی نظروں سے دیکھ کر پوچھا۔ "کیا وہ لوگ واقعی آنے والے ہیں؟"

"ہاں۔" امیر کو اُس کا شک پسند نہیں آیا۔ "کل رات میں نے سب کچھ طے کر لیا تھا۔ انھیں ساتھ لیے بغیر ہمیں یہاں سے جانا نہیں ہے۔"

"تو پھر ہمیں کسی آدمی کو اُن کی خبر لینے کے لیے بھیج دینا چاہیئے۔" رامو کے اس مشورے کا امیر فوراً ہی کوئی جواب نہ دے سکا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس طرح آدمی بھیجنے سے تو انھیں ہم پر شک ہو جائے گا۔ اُسے اپنے دیر سے جاگنے پر افسوس ہو رہا تھا۔ خیمے اور سامان سمیٹ لیے گئے تھے اور اب اگر وہ اپنے ساتھیوں سے ایک آدھ دن اور ٹھہر جانے کی بات کرے گا تو گڑبڑ ہو جائے گی۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ لیکن رحمت خان کی بیوی کا تعویذ تو اُسے ہر حالت میں حاصل کرنا ہی تھا۔

"دیکھو رامو کسی چالاک آدمی کو وہاں بھیجنا۔" آخر بہت سوچ سمجھ کر اُس نے رامو سے کہا۔ "ہمیں بہت زیادہ غرض دکھانے کی ضرورت نہیں ہے اور اگر وہ لوگ سامنے سے آتے نظر آئیں تو اپنے آدمی سے کہہ دینا کہ وہ چپ چاپ لوٹ آئے۔" اتنا کہہ کر وہ ایک پل کے لیے رکا پھر بڑے گمبھیر لہجے میں بولا۔ "ایک بار اُن کا رشتہ دار ٹھگوں کا شکار بن چکا ہے اس لیے وہ بہت ہوشیار ہو گئے ہیں۔"

"اچھا تو یہ بات ہے؟" امیر کی بے چینی کی وجہ معلوم ہو جانے کے بعد رامو نے کہا۔ "تب تو میں لالو کو ہی بھیجتا ہوں اُس جیسا چالاک آدمی کوئی غلطی نہیں کرے گا۔" لالو کو رحمت خان کی خبر لینے کے لیے بھیج کر رامو نے امیر سے پوچھا۔ "وہ لوگ کل کتنے آدمی ہیں؟ دھن دولت اُن کی ٹھیک ٹھاک ہی ہوگی؟"

"یہ تو مجھے معلوم نہیں۔" امیر سپاٹ لہجے میں بولا۔ "میں رحمت خان کی بیوی کا تعویذ حاصل کرنا تھا لیکن اپنے ساتھیوں کو وہ یہ بات بتانا نہیں چاہتا تھا۔ اُس نے سوچ رکھا ہے کہ مال و دولت کی لالچ دلا کر وہ اپنے ساتھیوں کو بہلائے رکھے گا۔ اسی لیے اُس نے کہا۔ "پٹھان کے ساتھ جو لڑکی ہے اُس کی بیوی ہوگی اس لیے یقیناً زیورات بھی ہمارے ہاتھ لگیں گے۔"

اس کے بعد رامو نے اور زیادہ پوچھ گچھ نہیں کی۔ وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ امیر کو اُس پٹھان کے قافلے کا اتنا شدید انتظار کیوں ہے؟ کہیں پٹھان کی بیوی سے اُسے دلچسپی تو نہیں ہو گئی؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ بیوی کی تمنا میں امیر دوسری شادی کے لیے تیار ہو گیا ہو؟ لیکن اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے شوہر کو قتل ہوتا دیکھ کر کوئی عورت ایسی ہوگی جو اپنے شوہر کے قاتل کے ساتھ اپنی رضامندی ہوگی؟ یہ ساری باتیں سوچنے کے بعد رامو کو امیر سے ہمدردی سی ہو گئی۔

"وہ لوگ آ رہے ہیں۔" اچانک لالو نے آ کر بتایا تو امیر خوشی سے اُچھل پڑا اور اُس کی یہ حرکت رامو کو اچھی نہیں لگی تھی۔

"وہ کتنے آدمی ہیں؟" امیر نے بڑی بے قراری سے پوچھا۔

"چھ سات آدمی ہیں۔" لالو گھوڑے کی پیٹھ سے اُتر پڑا۔ "انھیں آتا دیکھ کر ہی میں واپس آ گیا ہوں۔ دو عورتیں ٹٹو پر سوار ہیں اور ایک بڑھیا پیدل چل رہی ہے۔ اُس کے پیچھے تین جوان تلوار اور بندوق تانے آ رہے ہیں۔"

"یعنی تین تین بندوقیں ہیں؟" امیر اپنی مونچھوں کو تاؤ دے کر بولا۔ "اچھا ہوا اپنے کام آئیں گی۔"

"السلام علیکم۔" اچانک رحمت خان کی آواز اُس کی سماعت سے ٹکرائی۔

"وعلیکم السلام۔" امیر اپنے دھڑکتے دل پر قابو رکھ کر بڑی میٹھی آواز میں بولا۔ "میں تو یہی سمجھا تھا کہ شاید آپ لوگوں نے سفر کا ارادہ ملتوی کر دیا ہے۔ بس ہم روانہ ہونے ہی والے تھے۔"

"عورتوں کو ساتھ لے کر چلنے میں ایسا ہی ہوتا ہے۔" رحمت خان نے پیچھے آتے ہوئے ٹٹوؤں کی طرف دیکھ کر کہا۔ "کل رات جو تعویذ آپ کو دکھایا گیا تھا اسی نے آج دیر کر دی۔"

"تعویذ کی وجہ سے دیر ہو گئی؟" امیر کو ایک شدید جھٹکا لگا۔

"ہاں۔ شام کو وہ اُسے گلے میں ڈالنا بھول گئی تھی صبح کو یاد نہ رہا اور ہم اُسے گھر چھوڑ کر نکل پڑے۔"

"ہوں۔" امیر ہونٹ کر بڑبڑایا۔ "تو آپ لوگ بغیر تعویذ کے ہی آگے ہیں۔" اُس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر رحمت خان کو حیرت سی محسوس ہوئی، اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ تعویذ گھر بھول آنے کی وجہ سے یہ سپاہی آخر اس قدر فکرمند کیوں ہو رہا ہے؟ ٹھیک اُسی وقت امیر کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور جلدی سے اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ لاتے ہوئے بولا۔ "اوہ میں بھی کیسا ہوں! آپ کے اتا جان نے تعویذ کے کرشمے کی جو بات بتائی تھی وہ ابھی تک میرے ذہن سے محو نہیں ہوئی ہے کہیں تعویذ کے بغیر سفر میں آپ کی بیوی کی طبیعت بگڑ تو نہیں جائے گی؟ مجھے یہی فکر ہونے لگی ہے۔"

"میر صاحب یہ تو آپ کی مہربانی ہے کہ آپ ہم لوگوں کے لیے اتنے فکرمند ہیں۔" رحمت خان اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "لیکن گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے میں گھر واپس جا کر وہ تعویذ ساتھ لے آیا ہوں۔"

یہ سن کر امیر نے اندر ہی اندر سکون کا سانس لیا اور دل ہی دل میں بولا اب کوئی فکر کی بات نہیں ہے اب تو شاید قدرت بھی مجھ پر مہربان ہے۔

"چلیے اب جلدی سے آگے بڑھیں۔" امیر ٹٹو پر بیٹھی ہوئی پٹھان کی برقعہ پوش بیوی کی جانب نظر ڈالتے ہوئے بولا۔ "میرے آدمی تو بالکل تیار ہیں۔" یہ کہہ کر امیر اپنے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ مگر... اُسے نہیں معلوم تھا کہ اس گھڑی سے اُس کی زندگی کا ایک اہم سفر شروع ہو چکا ہے۔

**

سفر کی پہلی منزل پر امیر نے اپنا کام انجام دینے کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ اُس پاس کے تمام گاؤں ایک دوسرے سے بہت زیادہ قریب قریب تھے۔ جس کی وجہ سے ہر وقت لوگوں کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ رحمت خان نے اپنے قافلے کے لیے علیحدہ چھاؤنی بنائی تھی۔ امیر چاہتا تھا کہ رحمت خان اُسے اپنی چھاؤنی میں آنے کی دعوت دے تو وہ اُس کی بیوی کا چہرہ دیکھ سکتا ہے راستے میں کئی بار اُس نے رحمت خان کی بیوی کے حسن کی ایک جھلک دیکھنے کی کوشش کی تھی لیکن رحمت خان کی بیوی نے ایک بار بھی اپنے چہرے کا نقاب نہیں ہٹایا تھا۔ اُس کی اس پردہ داری کو دیکھ کر امیر نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ واقعی بے حد حسین ہونی چاہیئے۔

انگڑائی لے کر امیر اپنے خیمے سے باہر نکلا تو اچانک ہی رحمت خان سے اُس کی ملاقات ہو گئی۔ "میر صاحب آپ کے لیے میں ناشتا لے آیا ہوں۔"

امیر نے رحمت خان کی بڑھائی ہوئی پلیٹ پر نظر ڈالی گرما گرم کوفتے دیکھ کر اُس کے منہ میں پانی بھر آیا اور وہ بولا۔ "آپ نے یہ تکلیف کیوں کی؟"

"اس میں تکلیف کی کیا بات ہے؟" رحمت خان اُس کے پیچھے اُس کے خیمے میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔ "میری بیوی نے یہ کوفتے خود پکائے ہیں وہ کہتی تھی کہ اُس کے بھائی کو کوفتے بے حد پسند تھے۔"

گرم کوفتے کو امیر نے منہ میں رکھا تو اُس کی زبان جلنے لگی مگر پھر بھی وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "بے حد لذیذ بنے ہیں یہ کوفتے۔"

"سچ کہتا ہوں میر صاحب۔" رحمت خان بھی ناشتے میں اُس کے ساتھ شریک ہوتا ہوا بولا۔ "آج سے پہلے میں نے اُسے اتنا خوش کبھی نہیں دیکھا۔"

"اچھا۔" امیر کو لگا کہ شاید اُس کے ساتھ سفر کر کے ہی اُسے خوشی ہو رہی ہے لیکن کسی عورت کے شوہر کو یہ بات

بھلا کیسے کہی جاسکتی تھی؟ اسی لیے وہ کچھ سوچ کر بولا "خان صاحب عورت جب اپنے میکے جاتی ہے تو بہت ہی خوش ہوتی ہے اور پھر آپ کی بیوی کی خوشیوں کی ایک خاص وجہ بھی تو ہے۔"

"خاص وجہ؟" رحمت خان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"کیوں؟ کیا آپ یہ بھول گئے کہ آپ باپ بننے والے ہیں؟"

یہ سن کر رحمت خان شرما گیا۔ ناشتا ختم کرنے کے بعد امیر اپنی انگلیاں چاٹتے ہوئے بولا "میری طرف سے اپنی بیوی کا شکریہ ادا کر نا مت بھولیے گا خان صاحب۔"

"یہ کام ہم سفر پورا ہو جانے کے بعد کریں تو کیسا رہے گا؟" رحمت خان مسکراتے ہوئے بولا "اُس نے تو یہ بھی کہلوایا ہے کہ میر صاحب کو کھانا پکانے کے لیے منع کر دینا میں اُن کے لیے کھانا بھیج دوں گی۔"

امیر کو یہ بات اچھی لگی تھی لیکن یہ کھٹکا اُس کے ذہن میں پیدا ہو گیا کہ اگر وہ اس عورت کے احسانوں تلے دبتا چلا گیا تو اُس کی گردن میں رومال ڈالنے کے لیے اُس کا ہاتھ کس طرح اُٹھ سکے گا؟ اس خیال کے آتے ہی وہ ذرا اُونچی آواز میں بول گیا "نہیں۔ نہیں... ایسی تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" اتنا کہہ کر وہ ایک پل کے لیے رُکا پھر پُرسکون لہجے میں بولا "کھانے کے لیے مجھے کوئی محنت نہیں کرنی پڑتی۔ میرے آدمی خود ہی سب کام کر لیتے ہیں۔"

"جیسی آپ کی مرضی۔" رحمت خان نے بھی زیادہ ضد نہیں کی۔

اُس کے جانے کے بعد بھی امیر کافی دیر تک اُس کے خیمے کی جانب تکتا رہا اور سوچتا رہا۔ آخر یہ عورت اس سے اتنی ہمدردی کیوں کر رہا ہے؟ وہ اپنا چہرہ اُس سے کیوں چھپا رہی ہے؟ ایک بار اگر وہ اپنا نقاب اُلٹ دے تو اُس کی آنکھوں کے تاثرات دیکھ کر ہی وہ اندازہ لگا لے گا کہ اس کے دل میں کیا ہے!

اچانک امیر کے خیالات ایک جھٹکے سے ٹوٹ کر بکھر گئے کیوں کہ رحمت خان کی بُرقعہ پوش بیوی اپنے خیمے سے باہر آکر کھڑی ہو گئی تھی۔ امیر نے سنبھل کر اُس کی طرف دیکھا وہ بھی اُسی کی جانب دیکھ رہی تھی۔ امیر کا جی چاہا کہ وہاں بیٹھے وہ اُس سے کہہ دے "کوفتے بھیجنے کا بہت بہت شکریہ" لیکن گفتگو کا یہ طریقہ اُسے پسند نہیں آیا اس لیے کچھ کہنے کی بجائے اُس نے ایک میٹھی مسکراہٹ سے کام لینا پسند کیا۔ رحمت خان کی بیوی نے اپنا سر جھکا دیا اس سے امیر نے یہ اندازہ لگایا کہ وہ شرما گئی ہے۔

پسینا پونچھنے کے بہانے امیر نے اشارے سے اُسے سمجھایا کہ اپنے چہرے پر سے نقاب ہٹا دو اور مجھے اپنا دیدار کر لینے دو، رحمت خان کی بیوی نے ایک بار پھر ویسے اس طرح اپنا سر جھکا لیا جیسے وہ اس کا اشارہ سمجھ گئی ہو۔ امیر نے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ بُرقعے کے اندر اُس کا نازک بدن ذرا کانپ سا گیا ہے، پھر دوسرے ہی پل جب وہ اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی تو امیر ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ یکایک وہ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں خود کو لعن طعن کرتے ہوئے بڑبڑانے لگا "بھلا مجھے اُس کے محسن کے دیدار کی ضرورت ہی کیا ہے۔ مجھے تو اُس کے گلے میں لٹکتے ہوئے تعویذ کے سوا اور کچھ سوچنا ہی نہیں چاہیے۔"

★★

ڈھلتے پہر ایک بار پھر سفر جاری رکھنے کی تیاری ہو گئی تھی۔ کافی آرام کر لینے کے بعد انھوں نے رات کو بھی سفر جاری رکھنے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ لالو دو قبر کھودنے والوں کے امیر کے خیمے میں داخل ہوا۔ امیر سمجھ گیا کہ وہ اُس سے اجازت لینے کے لیے آیا ہے۔

"ہمیں تو آگے جا کر قبر کے لیے جگہ ڈھونڈنی ہے۔"

"ہاں یہاں سے چند میل کے فاصلے پر ایک آبادی آتا ہے وہیں کوئی اچھی جگہ تلاش کر لینا۔" اتنا کہہ کر امیر نے اُس پاس نظریں گھمائیں اور پھر دھیمی آواز میں بولا "بات کا خیال رکھنا کہ لاشوں کو دفنانے میں زیادہ دیر ایک گڑھا ہی کافی ہو گا۔" کس ٹھاٹ سے امیر کہہ رہا تھا وقت دراصل اُس کی نگاہوں میں وہ تعویذ گھوم رہا تھا کے ہونٹ بھینچ گئے اور ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی ہی اُسے خیال آگیا کہ لالو ابھی تک اُس کے سامنے ہی

اِس خیال کے آتے ہی وہ بولا "تم ابھی تک کھڑے ہو؟"

لالو کے جاتے ہی رامو خیمے میں داخل ہوا اور امیر سے بولا "رحمت خان سفر کے لیے تیار ہے کہہ رہا تھا کہ چاندنی رات میں سفر کرنے کا مزہ آجائے گا۔ وہ آپ کی تعریف بھی کر رہا تھا۔"

"کیا؟"

"کہہ رہا تھا میر صاحب جیسے آدمی بہت کم نظر آتے ہیں انھوں نے عورتوں کو یہ محسوس بھی نہیں ہونے دیا کہ وہ اجنبی مردوں کے ساتھ سفر کر رہی ہیں۔" رامو نے بتایا۔

"یہ سب تعریفیں مطلب کی ہیں۔" امیر دل پر جبر کیے ہوئے کہہ رہا تھا "انھیں تو حیدر آباد پہنچنے کی جلدی ہے اس لیے وہ میری تعریف تو کریں گے ہی۔"

رامو کا جی چاہا کہ وہ امیر سے پوچھ لے کہ اُس نے رحمت خان کی بیوی کو دیکھا ہے یا نہیں؟ مگر اس خیال سے وہ چپ ہو رہا کہ کہیں امیر ناراض نہ ہو جائے۔

شام دھیرے دھیرے رات کی چادر اوڑھنے لگی تھی۔ مگر اُس کا قافلہ بغیر رُکے آگے بڑھتا رہا۔ امیر کا اندازہ غلط ثابت ہوا تھا اُس نے لالو کو جس جگہ کے لیے بتایا تھا وہ جگہ اب بھی کافی دور تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ اب آدھی رات کے لگ بھگ ہی لالو سے ملاقات ہو سکتی تھی لیکن نہ جانے کیوں اب اُس سے مزید تاخیر برداشت نہیں ہو رہی تھی اس کی حالت کچھ عجیب سی ہوئی جا رہی تھی نہ تو اُس کا جی چاہتا تھا کہ وہ دوڑتا ہوا یہ راستہ طے کر لے اور نہ ہی رحمت خان کی بیوی کی صورت دیکھنے کی خواہش ہی اُس کے دل میں رہ گئی تھی۔

رحمت خان راستے سے واقف تھا اِس سے پہلے بھی وہ ایک بار وہاں سے ہی راستوں سے حیدر آباد اپنے سسرال میں جا چکا تھا۔ اُس کے کہنے کے مطابق ندی اب زیادہ دور نہیں تھی۔ اُس کی باتوں سے امیر نے یہی اندازہ لگایا کہ شاید لالو بھی ندی کنارے اُن کی راہ دیکھ رہا ہو گا۔

"میں ذرا آگے جا کر دیکھتا ہوں۔" امیر اپنے گھوڑے کو ایڑ لگاتے ہوئے بولا "آرام کرنے کے لائق جگہ ہوئی تو آگے جانے والے ساتھیوں کو روک لوں گا۔"

کافی دور نکل جانے کے باوجود بھی جب اُسے لالو کہیں دکھائی نہیں دیا تو اُسے لالو پر غصہ آنے لگا وہ بڑبڑاتے ہوئے خود سے بولا "میں نے تو کم بخت کو کوئی اچھی سی جگہ تلاش کرنے کے لیے کہا تھا مگر نہ جانے وہ اپنی ہوشیاری میں کہاں نکل گیا؟ کیا اتنی دور آنے پر اُسے کوئی نرم زمین نہیں ملی ہو گی؟" اس نے بڑبڑاتے ہوئے گھوڑے کی رفتار تیز کر دی۔ پھر دو میل کی مسافت کے بعد اُس نے لالو کو جا لیا۔ "پل موبنجھو" مخصوص رامسی زبان میں اس نے پوچھا قبر تیار ہے؟"

"موبنجھو" لالو نے خوش ہو کر جواب دیا "تیار ہے۔"

"کہاں ہے؟"

"نزدیک ہی ہے۔" لالو نے انگلی سے اشارہ کیا "وہاں سامنے ایک سوکھا سا نالہ ہے اُس کے آس پاس کی زمین کافی نرم ہے۔ وہیں ہم نے ایک بہت بڑا گڑھا کھود لیا ہے۔"

امیر اپنے گھوڑے کی پیٹھ سے نیچے اتر گیا اور لالو سے بولا "تم اُسی جگہ جا کر کھڑے رہو اور میں اِسی جگہ بیٹھ کر قافلے کا انتظار کرتا ہوں۔"

امیر کو یہ کرنے کی ضرورت نہیں تھی مگر پھر بھی اُس نے لالو کو ذرا دور ہٹا دیا تھا امیر کا دل خوشی سے اُچھل رہا تھا۔ ایک نہ سمجھ میں آنے والا احساس تھا جس سے اُس کا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا اور اُس کے دل کی دھڑکن سے ایک ہی صدا نکل رہی تھی۔ تعویذ... تعویذ... تعویذ... پیچھے سے آنے والے قافلے کے سائے دکھائی دینے لگے تھے۔ مگر امیر کی نگاہیں تو ٹٹو پر بیٹھی ہوئی رحمت خان کی بُرقعہ پوش بیوی پر جمی ہوئی تھیں۔ اُس نے اُس پر سے نظریں ہٹائے بغیر اپنے ہاتھ سے اپنی کمر کو ٹٹول کر اس بات کا اطمینان کر لیا کہ اُس کا رومال اُس کی کمر میں موجود ہے یا نہیں؟ رومال اُس کی کمر میں موجود تھا۔ یکایک اُسے اپنی بے چینی پر ہنسی سی آگئی پھر وہ سوچنے لگا کہ آج ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ عورتوں کو شکار کرنے کی بات تو اب اُس کے لیے کوئی نئی بات نہیں رہی تو کیا رحمت خان کی بیوی سے اُسے کچھ ہمدردی ہو گئی ہے؟ مگر نہیں بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اُس نے جس کی صورت تک نہیں دیکھی ہے۔ اُس سے ہمدردی کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تب پھر شاید یہ ممکن ہو کہ اس عورت نے اس کے لیے ناشتا بھیجا تھا اور کھانے کے

لیے بھی پوچھا تھا اسی لیے اُس کے دل میں ہمدردی کا جذبہ جاگا ہو لیکن نہیں اُس نے اِس خیال کو بھی ذہن سے جھٹک دینے کی کوشش کرتے ہوئے خود ہی دلیل پیش کی کہ ناشتا اور کھانے کی پیش کش کرنے میں اُن لوگوں کا اپنا ہی مفاد شامل تھا اس عورت نے اپنی سلامتی کی خاطر ہی یہ سب کیا ہے۔ بھلا ان باتوں میں اُس جیسا ٹھگ کیسے پھنس سکتا ہے؟ لیکن شاید یہ سارا اثر اُس تعویذ کا ہی ہو جو اُس کے ہاتھ میں آئے بغیر ابھی سے اپنا اثر دکھانے لگا ہو۔ سوچتے سوچتے اچانک ہی امیر کی نظر اُوپر اٹھ گئی اور وہ چونک پڑا یہ کیا؟ آسمان پر بادل کیوں گھرنے لگے ہیں؟ یہ بادل کہیں چاند کو ڈھانپ نہ دیں؟ دور آسمان پر صرف ایک ہی تارا دکھائی دے رہا ہے لیکن یہ تارا بھی اُس کے دل کی طرح کیوں پھک پھک کر رہا ہے؟

"کیا بات ہے میر صاحب؟" اچانک رحمت خان کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔ "شاید آرام کرنے کے لیے بیٹھ گئے ہیں آپ؟"

امیر اُٹھ کھڑا ہوا اور ہنس کر رحمت خان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "آگے کا راستہ بے حد دشوار گزار اور تکلیف دہ لگ رہا ہے۔ میرے گھوڑے کی نال بھی اُکھڑ گئی ہے۔ اب پیدل ہی آگے چلنا ہوگا۔" یہ کہہ کر وہ ہنستے ہوئے آگے بولا۔ "خان صاحب آپ کو تو معلوم ہی ہوگا کہ یہ ناہموار راستہ کہاں ختم ہوتا ہے؟"

"بس اب یہ راستہ بہت زیادہ لمبا نہیں ہے۔" رحمت خان بھی اپنے گھوڑے سے اُتر پڑا اور اُس کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا بولا۔ "ہم لوگ ایک سُوکھی ندی کے قریب پہنچ رہے ہیں۔ وہاں سے ڈیڑھ دو کوس کے فاصلے پر جو گاؤں ہے وہیں ہم اپنا پڑاؤ ڈالیں گے۔"

"تب تو وہاں تک پیدل ہی چلتے ہیں۔" امیر نے کہا۔ پھر اس سے پہلے کہ رحمت خان کوئی جواب دیتا امیر کی سماعت سے ایک میٹھی مترنم آواز ٹکرا گئی۔ "میر صاحب آپ میرے ٹٹو پر بیٹھ جائیں۔" رحمت خان کی بُرقعہ پوش بیوی کہہ رہی تھی "یوں بھی میرا جسم ٹٹو پر بیٹھے بیٹھے اکڑ گیا ہے پیدل چلنے سے ذرا چستی آجائے گی۔"

اِس عورت کے ان بولوں نے امیر کے دل کو گُدگُدایا آج پہلی بار اُسے اِس عورت کی آواز سنائی دی تھی تو پھر ہی میٹھی تھی اُس نے کتنی محبت سے اس کا نام لیا تھا۔ اُس نے گردن گھما کر پیچھے کی جانب دیکھا تو بُرقعہ پوش عورت نے اپنا ٹٹو کھڑا کر رکھا تھا۔ یہ دیکھ کر امیر کو لگا کہ بُرقعہ کی جالی کے پیچھے چھپی ہوئی اُس کی آنکھوں میں ضرور پیار آیا ہوگا۔ اچانک وہ عورت اُسے ٹٹو پر سے اترتی ہوئی دکھائی دی تو اُسے فوراً ہی کہنا پڑا۔ "نہیں نہیں... یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟ چند میل چلنے سے میرے پیروں کو کچھ نہیں ہوگا۔ میں ایک سپاہی بھی تو ہوں۔" امیر اُسی کے مُنہ سے جواب سُننا چاہتا تھا لیکن اُس کی بجائے اُس کا شوہر رحمت خان جواب دیتے ہوئے کہا۔ "تب تو میں بھی آپ کے ساتھ ساتھ چلوں گا۔ آپ نے اتنے خطرناک سفر میں ہماری حفاظت کی ہے یہ بات ہم کیسے بھول سکتے ہیں؟ کون جانے اِس ویرانے میں ٹھگ اور لٹیروں کے ہاتھوں کتنی انسانی جانیں ضائع ہو چکی ہوں؟"

"ارے... ارے... آپ ایسی باتیں کر کے اپنی بیوی کو خوف زدہ کیوں کر رہے ہیں؟" بولتے بولتے خود امیر کی آواز سے بھی گھبراہٹ کا اظہار ہونے لگا۔ "ایسی باتوں سے اِن کے نازک دل پر خوف طاری ہو جائے گا۔ خدا اِس کا خیال کریں۔" اتنا کہہ کر اُس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور یقین لہجے میں بولا۔ "ویسے اِس علاقے میں خطرے کی کوئی ایسی بات نہیں ہے۔"

اُس کی بات سُن کر بے چارہ رحمت خان تو یہی سمجھا اُس کی حاملہ بیوی کا اِس نوجوان کو کتنا خیال ہے لیکن امیر کے دل میں تو کچھ اور ہی تھا وہ سوچ رہا تھا کہ تھوڑی دیر پہلے جس عورت کو وہ قتل کرنے والا ہے وہ بے چاری اُس سے کتنی ہمدردی کا اظہار کر رہی ہے؟

"ارے یہ میرے پیروں میں کیا چبھ گئی؟" امیر نے چونک کر پھلانگ لگائی۔ ایک خرگوش اُس کے پیروں تلے آتے آتے رہ گیا۔ تیزی سے بھاگتے ہوئے خرگوش کو دیکھ کر امیر کے چہرے کی ساری خوشی اچانک ہی غائب ہو گئی۔

"ارے وہ تو خرگوش تھا۔" رحمت خان امیر کے چہرے

ہوئے چہرے کی طرف دیکھ کر بولا۔ "مگر اِس بات پر آپ اِس قدر چونک کیوں گئے؟"

"اوہ" امیر نے زبردستی ہنسنے کی کوشش کی۔ "میرے چونکنے کی وجہ یہ ہے کہ ہماری طرف سفر کے دوران خرگوش کے سامنے آجانے کو اچھا شگون نہیں سمجھا جاتا۔" پھر وہ ایک ہی سانس میں آگے بول گیا۔ "لیکن یہ سب پرانے وہم ہیں۔ بے دھڑک آگے بڑھیں۔" امیر نے کہنے کو یہ بات کہہ تو دی تھی لیکن اندر ہی اندر اُس کا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا اُسے اس بات کی خوشی تھی کہ اُس کے دوسرے ساتھی اُس سے کچھ فاصلے پر اُس کے پیچھے چلے آرہے تھے۔ اگر اُن لوگوں نے خرگوش کو دیکھ لیا ہوتا تو بدشگونی کے خوف سے وہ اِن مسافروں کو ختم کرنے کے لیے تیار ہی نہ ہوتے اور امیر کو مجبوراً یہ کام ملتوی کر دینا پڑتا۔ اپنے دل سے اِس بدشگونی کے خوف کو کم کرنے کے لیے وہ کوئی غزل گنگنانے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ ابھی غزل کا پہلا شعر ہی گنگنا پایا تھا کہ اچانک رامو اُس کے قریب آکر اُس کے ساتھ چلتا ہوا بولا۔ "کیا بات ہے میر صاحب آپ تو بہت خوش دکھائی دے رہے ہیں؟"

"کوئی بات نہیں ہے۔" امیر نے اُس کی طرف دیکھ کر دھیرے سے ایک آنکھ دبا دی۔ "میرا حقہ کہاں ہے؟"

"ابھی لے کر آتا ہوں۔" یہ کہہ کر امیر پھر پیچھے کی جانب مُڑ گیا اور پھر تھوڑی ہی دیر کے اندر اندر اُن کی پوری ٹولی میں حقے کی بات گردش کرنے لگی۔ تیار رہنے کے لیے یہ ایک مخصوص اشارہ تھا اور یہ اشارہ پاتے ہی اُن میں پہلے سے زیادہ جوش و خروش پیدا ہو گیا۔

"حقہ آرہا ہے۔" یہ کہہ کر رامو امیر اور رحمت خان کے درمیان چلنے لگا۔ کون کس کے گلے میں رومال کا پھندہ ڈالے گا یہ بات ابھی پوری طرح طے نہیں ہوئی تھی۔ سب کی آنکھیں امیر کی جانب لگی ہوئی تھیں۔ امیر اپنی چال دھیمی کر کے پیچھے آتے ہوئے رحمت خان کی بیوی کے ٹٹو کے ساتھ ہو گیا اُس کی اِس حرکت سے اُس کے ساتھی یہ سمجھ گئے کہ اِس عورت کا شکار ان کا سردار خود کرنا چاہتا ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں بقیہ مسافروں کے گرد دھیرے دھیرے تین چار ٹھگ اپنا گھیرا تنگ کرتے چلے گئے۔ امیر نے اپنے برابر چلتے ہوئے ٹٹو پر بیٹھی ہوئی رحمت خان کی بیوی کی طرف ایک نظر ڈالی پھر وہ آسمان کی جانب دیکھنے لگا۔ بادل چاند کے گرد اپنا گھیرا تنگ کرتے جا رہے تھے اور امیر کو یوں محسوس ہوا جیسے یہ کالے بادل چاند کا شکار کرنے کی تیاری میں مصروف ہیں۔

نالہ اب تقریباً سو قدم کے فاصلے پر تھا۔ امیر نے چاروں طرف نظر ڈالی اُسے معلوم تھا کہ اب اُس کے ساتھی صرف اُس کے اشارے کے ہی منتظر ہیں۔

"لاؤ میرا حقہ۔" اچانک وہ چیخ کر بولا اور کمر سے اپنا رُومال کھینچ کر ٹٹو پر بیٹھی ہوئی بُرقعہ پوش عورت کا بازو تھام کر اُسے ایک جھٹکے سے نیچے گرا دیا۔

"آ... ہا... ہ۔" اُس عورت کے مُنہ سے اتنی ہی آواز نکلی۔ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اُس وقت تک تو امیر کے قاتل رومال کا پھندہ اُس کی گردن میں پھنس چکا تھا۔

ایک نازک گردن کے لیے جتنی طاقت لگانی چاہیے تھی۔ اُس سے دوگنی طاقت لگا کر امیر نے بے خبری میں اپنی سگی بہن کی جان لے لی۔ تعویذ کی لالچ میں شیطان بن جانے والے امیر علی ٹھگ نے اُس بے چاری کے چہرے پر سے نقاب ہٹانے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی تھی بلکہ اُس نے اپنا ہاتھ سیدھا اُس کی گردن پر ڈال دیا تھا۔ ریشمی بُرقعے کے لمس نے اُس کی انگلیوں میں ایک عجیب سی سرسراہٹ پیدا کر دی تھی۔ گردن پر سے پھسلتا ہوا اُس کا ہاتھ اُس عورت کے سینے پر آکر رُک گیا اُس کے سینے کی گرماہٹ ابھی باقی تھی۔ امیر کی انگلیاں جب تعویذ اور اُس کے ساتھ بندھے ہوئے سکے سے ٹکرائیں تو اُس کی مسرت کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا یوں لگ رہا تھا جیسے دنیا بھر کا خزانہ اُس کے ہاتھ لگ گیا ہو۔ تعویذ کو حاصل کرنے کے لیے اُس نے ڈوری کو مٹھی میں پکڑ کر ایک جھٹکا دیا لیکن تعویذ کی ڈوری نہیں ٹوٹی تو امیر کے ماتھے پر پسینہ چمکنے لگا اپنے بائیں ہاتھ سے تعویذ پکڑ کر داہنے ہاتھ سے اُس نے اپنی کٹاری اپنی کمر سے کھینچ نکالی پھر تعویذ کی ریشمی ڈوری کو اُس نے کٹاری کی دھار سے کاٹ دیا۔ اب تعویذ اُس کی مٹھی میں آچکا تھا۔

"یا خدا۔" بادلوں سے گھرے ہوئے چاند کی دھیمی روشنی

میں امیر نے مٹھی کو کھول کر تعویذ کو دیکھا اُس کی آنکھیں ایک عجیب سی خوشی سے چمک رہی تھیں اور وہ ہونٹوں میں بڑبڑایا "آخر کار یہ تعویذ میرے قبضے میں آ ہی گیا۔" اُسے اتنا بھی ہوش نہیں تھا کہ وہ اپنے آس پاس نظر ڈال کر یہ دیکھ لے کہ آس پاس کیا ہو رہا ہے؟ اُس نے تعویذ کو رُومال کے ایک کونے میں احتیاط سے باندھ لیا پھر سکون کا ایک گہرا سانس لے کر بڑبڑایا۔ "اب ایک بار اِس عورت کا چہرہ تو دیکھ لوں۔"

نیچے جھک کر اُس نے دھیرے سے اُس عورت کے چہرے کا نقاب ہٹا دیا۔ "آہ۔" یکایک اُس کے مُنہ سے ایک درد میں ڈوبی ہوئی آواز نکلی۔ اُسے لگا جیسے چاند پر سے سیاہ بادل اچانک ہی ہٹ گئے ہوں۔ "خدا نے اس عورت کو کتنا حُسن بخشا تھا؟" وہ دھیمی آواز میں بڑبڑایا "یہ تو عظیمہ سے بھی زیادہ خوبصورت ہے۔" اچانک اُس کا ہاتھ اُٹھا اور دھیرے دھیرے اُس عورت کے بے جان چہرے پر پھسلنے لگا۔ اُس کی اُنگلیوں کے پوروں میں ایک جھنجھناہٹ سی ہونے لگی اور وہ دل ہی دل میں سوچتے ہوئے اپنے آپ سے کہنے لگا "یہ تو بہت ہی اچھا ہوا کہ میں نے اِس کا یہ حسین چہرہ پہلے نہیں دیکھا اگر میں نے اس کا حُسن دیکھ لیا ہوتا تو اِس کی گھونٹ میں رومال ڈالنے کے لیے میرا ہاتھ کبھی نہ اُٹھ پاتا۔ یہ چہرہ تو دونوں ہاتھ کی ہتھیلیوں میں رکھ کر پیار کرنے کے قابل ہے لیکن یہ چہرہ تو اب اس کے ہی ہاتھوں بے جان ہو چکا ہے۔ اُسے اب کیوں اس سے دلچسپی پیدا ہو رہی ہے!

اچانک اُس نے اس طرح اپنا ہاتھ کھینچ لیا جیسے اُس سے کوئی بہت بڑا گناہ سرزد ہو گیا ہو۔ اُس نے فوراً ہی اُس کے بُرقعے کے نقاب سے اُس کا چہرہ ڈھک دیا اور آہستہ سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا، لیکن کھڑے ہوتے وقت اُسے اپنے پیروں میں ایک عجیب سی سنسناہٹ محسوس ہو رہی تھی یکایک ایک خیال کے تحت اُس نے چاروں طرف نظریں گھما کر دیکھا تو کچھ فاصلے پر اُسے رحمت خان کی بیوی کی ایک چادر پڑی ہوئی دکھائی دی۔ وہ پھلانگ لگا کر اُس چادر پر جھپٹا اور اُسے اُٹھا کر واپس آ گیا۔ عورت کی لاش کے قریب آ کر اُس نے چادر کو زمین پر بچھا دیا پھر دھیرے سے لاش کو اُٹھا کر اس چادر پر سُلا دیا پھر اُس کے سر اور پیروں کی جانب چادر کے سروں پر گانٹھ باندھ کر پوری طرح سے لاش کو ڈھک دیا۔

"ارے جمعدار صاحب۔" رامُو نے آ کر کہا۔ "چادر روپے کی اس چادر کو کیوں برباد کر رہے ہیں لائیے میں لے لیتا ہوں۔" اتنا کہہ کر وہ لاش کی جانب لپکا مگر امیر نے چیخ کر اُسے روک دیا۔ "نہیں رامُو رہنے دو اِس چادر میں جالان واپس پہنچ کر تمھیں نئی چادر دلوا دوں گا۔"

یہ سُن کر رامُو عجیب سی نظروں سے امیر کو تکنے لگا۔

"اور دیکھو۔" امیر اس سے نظریں ملائے بغیر کہنے لگا "اس لاش کو احتیاط سے دفن کرنا اپنے ساتھیوں سے کہہ کر اِس کا پیٹ نہ چیریں یہ میرا حکم ہے۔"

امیر کی یہ بات رامُو کو کچھ اچھی نہ لگی پھر بھی "جیسا آپ کا حکم۔" کہہ کر اُس نے لاش کو وہاں سے ہٹانے کے لیے لالُو کو آواز دی۔ "جلدی کرو اب یہ ایک ہی لاش رہ گئی ہے۔"

دفن ہوتی ہوئی لاش کو دیکھ کر امیر کے دل میں ایک بار پھر بے چینی سی پیدا ہونے لگی اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ اُس نے خود کو تسلی دینے کے لیے رُومال کے کونے میں بندھے ہوئے تعویذ کو کھولا اور بڑبڑانے لگا۔ "اب میری کوئی مُراد ادھوری نہیں رہے گی۔"

"سردار اتنی محنت کے باوجود ہمیں کوئی خاص مال نہیں ملا ہے۔" رامُو کی آواز سُن کر امیر نے تعویذ کو مٹھی میں دبا لیا۔ رامُو کہہ رہا تھا۔ "صرف چالیس روپے اور معمولی زیور کے علاوہ تھوڑے سے کپڑے ہاتھ لگے ہیں۔"

"اور اُن تین بندوقوں کو کیوں بھول گئے؟" امیر نے تعویذ کو مٹھی میں دبا کر باقی کا جملہ اپنے دل میں ہی کہہ دیا۔ "سب سے قیمتی دولت تو میری مٹھی میں ہے۔"

بے چارہ امیر... بھلا اُسے یہ بات کہاں معلوم تھی کہ اُس کے ہاتھوں سے کتنا بڑا گناہ سرزد ہو چکا ہے اگر وہ اپنے اِس گناہ کا علم ہو گیا تو اُس کی باقی بچی ہوئی زندگی بھی اِس گناہ پر پچھتانے کے لیے کم ہو گی۔

★★

رحمت خان اور اُس کے قافلے کو ختم کرنے کے بعد امیر اپنی ٹولی کے ساتھ مالوہ کے سرحد پر پہنچ گیا لیکن اب اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس راستے پر آگے بڑھا جائے؟ جب اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو اُس کے مُنہ سے نکل گیا۔ "اب ہمیں جالان واپس جانا چاہیے۔"

اس کے ساتھی اُس کی یہ بات سُن کر دنگ رہ گئے وہ سب حیران تھے کہ امیر اتنی جلدی واپس جانے کی بات کیوں کر رہا ہے؟ ابھی تو ایک بھی بڑا شکار اُن کے ہاتھ نہیں لگا ہے۔ سال بھر کا خرچ چلانے کے لیے اُن سبھوں کو بھی اچھی خاصی رقم کی ضرورت تھی اور ابھی تک اتنی رقم انھیں نہیں ملی تھی اِس لیے وہ اتنی جلدی گھر واپس جانے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔

"ہم لوگ شمال کی جانب آگے بڑھیں تو؟" دو ایک ساتھیوں نے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ "شاید اس طرف ہمیں کوئی بڑا شکار مل جائے۔"

"یہ کس کو معلوم ہے کہ کس راستے پر بڑا شکار ملے گا؟" امیر اپنے ارادے میں اٹل رہا۔ "جالان واپس جاتے ہوئے بھی تو راستے میں ہمیں شکار مل سکتے ہیں۔ بھوانی دیوی کی مہربانی ہو گی تو وہ کہیں سے بھی شکار کو ہماری طرف دھکیل دے گی۔"

"تو پھر کیوں نہ ہم دیوی کی خواہش جان لیں؟" ایک بوڑھے ٹھگ نے مشورہ دیا جو امیر کو جچا نہیں لیکن پھر بھی اُسے ٹھگوں دیکھنے کی اس بات کو مان لینا پڑا۔

رحمت خان کی بیوی کا تعویذ جب سے اُس کے ہاتھ لگا تھا اُسی وقت سے نہ جانے کیوں امیر کو اپنا گھر، اپنی بیوی اور بچی کی یاد ستانے لگی تھی۔ مسافروں کو پھنسانے اور انھیں ختم کرنے میں اُس کی دلچسپی بہت کم ہو گئی تھی۔ صرف یہی نہیں بلکہ گنیش سے بدلہ لینے کی خواہش بھی اُس کے اندر دم توڑتی جا رہی تھی۔ اُس کا جی چاہتا تھا کہ وہ تعویذ کے ساتھ بندھے ہوئے سکے کی گھسی ہوئی تحریر پر بار بار اپنا ہاتھ پھیرتا رہے اُس کے دل پر ہر وقت ایک نہ سمجھ میں آنے والی سنسناہٹ طاری ہونے لگی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اُس تعویذ کی تاثیر پر اُس کا یقین بڑھتا جا رہا تھا۔ اب اُسے رحمت خان کی بیٹی کو مارنے کا کوئی افسوس نہیں تھا، اب تو وہ اپنی بیوی کو جلد سے جلد یہ تعویذ پہنانے کے لیے بے چین تھا۔

"بھوانی دیوی کی جانب سے کسی خاص راستے کے لیے کوئی اشارہ نہیں ملتا۔" شگون دیکھنے کے بعد دو بوڑھے ٹھگوں نے آ کر امیر کو بتایا تو امیر نے ایک سردار ہونے کے ناتے اپنے فیصلے کو ہی آخری فیصلے کی حیثیت سے برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ "بس تو پھر ہمیں جالان کی جانب ہی چلنا چاہیے۔" مجبوراً سب لوگوں کو اُس کا حکم ماننا پڑا۔

★★

بُندل کھنڈ کے ایک شہر ٹیری میں جب انھوں نے پڑاؤ ڈالا تو امیر کی پوری ٹولی تقریباً ناامید ہو چکی تھی۔ واپسی کے سفر میں جب انھیں ایک بھی تگڑا شکار نہیں ملا تو اُن سبھوں کے چہروں پر ناامیدی اور اداسی کے سائے لہرانے لگے۔ اس ٹولی میں جو لوگ امیر کی بہادری کی داستانیں سُن سُن کر شامل ہوئے تھے انھیں اب وہ داستانیں جھوٹی اور بناوٹی لگنے لگی تھیں۔ ان سب کا خیال تھا کہ جس شخص کے ساتھ انھوں نے اپنی تقدیر باندھ رکھی ہے وہی شخص اگر اتنا لاابرواہ ثابت ہو تو زندگی کی گاڑی کیسے چل سکتی ہے؟ اس کی سرداری پر بھروسا کرنے والے ٹھگوں کو اب امیر ایک کمزور اور ناتجربہ کار آدمی لگنے لگا تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ چھوٹی عمر میں آدمی کو جب اچانک کچھ کامیابیاں مل جاتی ہیں تو وہ مغرور ہو جاتا ہے۔ امیر کے مقابلے میں اب انھیں گنیش زیادہ تجربہ کار اور طاقتور نظر آنے لگا تھا۔ بہت سے ٹھگوں نے تو دل ہی دل میں یہ فیصلہ بھی کر لیا تھا کہ اب دوسرے سفر میں وہ امیر کی ٹولی میں شامل نہیں ہوں گے۔

"پورے تین دنوں سے ہم اسی جگہ پڑے ہیں لیکن کوئی بھی شکار نظر نہیں آیا۔" کافی ضبط کرنے کے بعد رامُو نے کہا۔ "واپسی کے سفر کا یہ آخری بڑا پڑاؤ ہے یہاں سے خالی ہاتھ گئے تو..."

"لیکن اس میں مَیں کیا کر سکتا ہوں؟" امیر نے ٹھنڈا سا جواب دیتے ہوئے کہا۔ "میں تو روزانہ ہی دو تین ساتھیوں کو شکار کی تلاش میں شہر بھیجتا ہوں لیکن وہ ہاتھ ملتے ہوئے واپس آ جاتے ہیں۔ ٹیری شہر میں سے کیا کوئی بھی مالدار آدمی

سفر کے لیے نہیں نکلتا؟"

"بے ادبی معاف ہو تو ایک بات کروں؟" کہہ کر رامو نے نظریں نیچی کر لیں۔

"کیا کہنا ہے تمھیں؟" امیر نے سنجیدگی اور حیرانی سے پوچھا۔

"مجھے وہی کہنا ہے جو سب لوگ کہتے ہیں۔" رامو رک رک کر کہہ رہا تھا۔ "آپ خود ہی شکار کو پھنسانے میں دلچسپی نہیں لے رہے ہیں۔"

"کیا مطلب؟" امیر اونچی آواز میں بول گیا۔ "کیا میرے سوا کسی اور کا یہ فرض نہیں ہے؟ بڑا شکار ملتا ہے تو سب اُسے بھوانی دیوی کی دین سمجھتے ہیں اور شکار نہ ملے تو اپنے سردار کو قصوروار ٹھہراتے ہیں۔"

"آپ ناراض نہ ہوں سردار۔" رامو نے چالاکی دکھائی۔ "میرا کہنے کا مطلب تو یہ تھا کہ آپ کی ہوشیاری اور دانائی پر ہمیں اتنا بھروسا ہے کہ اگر آپ یہ کام اپنے ہاتھ میں لے لیں تو کبھی ناکام واپس نہیں آسکتے۔" رامو نے انداز بدل کر وہ بات کہہ دی تھی اور امیر کا غصہ بھی آپ ہی آپ اتر گیا تھا۔ تھوڑی دیر تک چپ رہنے کے بعد رامو سے بولا۔ "ٹھیک ہے تم دس بارہ آدمیوں کو تیار رکھنا۔" اتنا کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھ گیا اور آگے بولا۔ "اُن سے کہنا وہ سپاہیوں کی وردی پہن لیں میں پاتال میں سے بھی شکار کھینچ کر لے آتا ہوں۔"

تم سب لوگ دیکھنا۔"

رامو کو اتنا ہی چاہیے تھا۔ امیر کے جوش و خروش میں اُسے کامیابی کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ وہ چھلانگ لگا کر اپنے ساتھیوں کو خوش خبری سنانے کے لیے دوڑ گیا۔

**

امیر نے ٹیری شہر کے دو تین چکر لگائے لیکن کوئی بھی مالدار شکار اُس کی نظروں میں نہیں جچا۔ رامو اور اُس کے دیگر دس بارہ ساتھی امیر کے گھوڑے کے پیچھے پیچھے پیدل چل رہے تھے۔ اِس وقت امیر کی ہوشیاری اور چالاکی داؤ پر لگی ہوئی تھی۔ امیر اِس وقت اندر ہی اندر پریشانی سی محسوس کر رہا تھا اور کوئی ایسی ترکیب وہ سوچ رہا تھا جو ابھی تک آزمائی نہیں گئی تھی۔ وہ کسی ایسے شکار کی تلاش میں تھا جو اپنے قیمتی سامان کے ساتھ اُس کے ساتھ سفر کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔

اچانک ایک جگہ اُس نے اپنے گھوڑے کی لگام کھینچ لی۔ اُس کی نظر چوک میں پیپل کے درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے تین مسافروں پر پڑ چکی تھی۔ اُنھیں دیکھتے ہی اُس کی آنکھوں میں ایک چمک سی لہرائی اور وہ اپنے ساتھیوں کو دور کھڑے رہنے کا اشارہ کر کے اپنے گھوڑے کو اُن مسافروں کی جانب بڑھا لے گیا اور اُنھیں سلام کر لے کے بعد اُس نے پوچھا۔ "جناب آپ لوگ کیا مجھے اِس شہر کے سب سے بڑے جوہری کا پتا بتا سکتے ہیں؟"

باتیں کرتے ہوئے تینوں مسافروں کی نظریں ایک ساتھ امیر کی طرف اُٹھ گئیں اُن میں سے ایک شخص نے

حقے کی نلی اپنے دوسرے ساتھی کی طرف بڑھاتے ہوئے پُر مذاق لہجے میں کہا۔ "اجنبی کیا آپ واقعی کسی جوہری کا پتا معلوم کرنا چاہتے ہیں یا ہمارے اس غریب شہر کا مذاق اُڑا رہے ہیں؟"

"توبہ... توبہ" امیر نے اپنی میٹھی زبان چلائی۔ "بھلا مجھ جیسا سپاہی آپ جیسے بزرگ کا مذاق اُڑا سکتا ہے؟ مجھے تو سچ مچ جوہری سے کچھ زیورات خریدنے ہیں۔"

"تو پھر آپ گھوڑے پر سے نیچے اتر آئیں۔" اُسی ادھیڑ عمر شخص نے کہا۔ "اس کے لیے آپ کو کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہے، ہمارے یہ نصیر الدین شیخ یہاں کے مشہور جوہری ہیں۔"

"ہاں ہاں۔" تیسرے شخص نے اُس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔ "ان کی ٹکر کا کوئی اور جوہری اس شہر میں نہیں ہے۔"

"شکر ہے خدا کا۔" کہہ کر گھوڑے کی پیٹھ سے نیچے اتر آیا اور آگے بولا۔ "تب تو میرا کام آرام سے ہو جائے گا۔"

جوہری نصیر الدین امیر کے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کے ساتھ کتنے کا سودا ہو سکتا ہے؟ امیر جب اُن کے قریب آگیا تو اُن میں سے ایک نے شربت کا پیالہ اُس کے سامنے رکھ دیا۔

"لیجیے پہلے گلا تر کر لیجیے پھر باقی باتیں ہوں گی۔"

جب تک امیر شربت پیتا رہا اس وقت تک وہ تینوں بھی خاموش رہے پھر جیسے ہی امیر نے شربت کا پیالہ خالی کر کے رکھا تو اُسی ادھیڑ عمر شخص نے پوچھا۔ "آپ کا مبارک نام؟"

"میں ایک ادنیٰ سید ہوں۔"

"ماشاء اللہ۔" اُس شخص نے اپنے دوسرے ساتھی سے کہا۔ "ان کی زبان تو حافظ کے کلام کی طرح میٹھی ہے۔"

"آپ لوگ اس خادم کو شرمندہ کر رہے ہیں۔" امیر نے اپنا جال پھیلایا۔ "خادم تو ایک معمولی سپاہی ہے جسے ادب لحاظ سے باتیں کرنے کا سلیقہ بھی نہیں آتا۔"

جوہری نصیر الدین شیخ کو اس کی حیثیت جاننے کی جلدی تھی اس لیے اُس نے پوچھا۔ "تو گویا آپ سندھیا کے لشکر میں شامل ہیں؟"

**

"نہیں جناب میں تو پہلے دکھن میں ایلچی پور کے صلابت خان کے پرچم تلے کام کرتا تھا۔" امیر نے جواب دیا۔

"اوہ اُن کی بہادری تو سارے ہندوستان میں مشہور ہے۔" بھلا ادھیڑ عمر ایک بار پھر باتوں کی لگام کو اپنے ہاتھوں میں تھامتے ہوئے بولا۔ "تو اب آپ کیا کرتے ہیں؟"

"مجھے جمالان کے راجا کے یہاں ایک اچھی ملازمت مل گئی ہے اس لیے میں نے صلابت خان کا لشکر چھوڑ دیا ہے۔" امیر نے کہا۔

"تو اس وقت کہاں جا رہے ہیں؟" ادھیڑ عمر شخص نے پوچھا۔

"جمالان ہی جا رہا ہوں۔" امیر دھیرے دھیرے اپنی شخصیت کو اونچا کرتا جا رہا تھا۔ "راجا نے مجھے دولت راؤ کے دربار میں بھیجا تھا۔ ایک جھگڑے کا فیصلہ کرنے کے لیے، خدا کے فضل سے مجھے یہ عزت نصیب ہوئی کہ میں بہتر طور پر اس جھگڑے کا فیصلہ کر کے واپس لوٹ رہا ہوں۔" کہتے کہتے امیر نے دیکھ لیا تھا کہ ان تینوں پر اس کی باتوں کا گہرا اثر ہوتا جا رہا ہے، تب اُس نے محسوس کر لیا کہ ان تینوں کے ذہن پر اُس کا اچھا خاصا رعب بیٹھ چکا ہے تو وہ بات بدل کر آگے بولا۔ "اب آپ لوگ مجھے اجازت دیں تو میں جاؤں۔" پھر وہ دور کھڑے ہوئے اپنے ساتھیوں کی طرف گردن گھما کر بولا۔ "ابھی مجھے کوتوالی جا کر حساب کتاب کرنا ہے اور کل صبح کے سفر کی تیاری بھی کرنا ہے۔"

امیر نے صرف دکھاوے کی خاطر اٹھنے کی کوشش کی تھی اور تب ہی اُس جوہری نصیر الدین شیخ نے اُس کی کلائی تھام لی۔ "ارے سید میاں ایسے کس طرح چلے جائیں گے آپ؟ آپ نے تھوڑی دیر قبل یہ کہا تھا کہ آپ کو کچھ خریداری بھی کرنی ہے چلیے میرا گھر نزدیک ہے آپ کو دیر نہیں لگے گی۔"

"ہاں ہاں تھوڑی دیر بیٹھیے۔" پہلے والے ادھیڑ عمر شخص نے کہا۔ "کچھ کھائے پیے بغیر اس طرح نہیں جانا چاہیے۔"

امیر انکار نہ کر سکا۔ پھر مہمان نوازی کی رسم کے طور انھوں نے اُسے پان پیش کیا اور اُس کی داڑھی اور ہاتھ پر عطر لگا دیا۔ امیر کے دوسرے ٹھگ ساتھی دور کھڑے کھڑے یہ سب دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہے تھے کہ اُن کے سردار نے واقعی شکار پر اپنی گرفت مضبوط کر لی ہے۔

تھوڑی دیر بعد اُس جوہری نصیر الدین شیخ کے ساتھ وہاں سے اُٹھ کھڑا ہوا لیکن وہ چند قدم آگے بڑھ کر جب اپنے بقیہ

ساتھیوں کے قریب سے گزرنے لگا تو راموں نے رامسی زبان میں دھیرے سے پوچھا۔ "کیا یہ ہمارا شکار ہے؟"

"چپ رہو۔" امیر نے اُسے رامسی زبان میں ڈانٹتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔ "تم لوگ میرے گھوڑے کی لگام تھام کر ادب سے آگے آگے چلو اور میرے لیے آگے کا راستہ صاف کرتے جاؤ تاکہ سب لوگوں کو محسوس ہو کہ میں کوئی بہت بڑا آدمی ہوں۔"

"میاں صاحب۔ آپ ان لوگوں پر اس قدر خفا کیوں ہو رہے ہیں؟" نصیر الدین شیخ نے اس اجنبی زبان کا مطلب سمجھنے کے لیے پوچھا تو امیر کو ہوشیار ہو کر جواب دینا پڑا۔

"شیخ صاحب یہ بے وقوف مجھے یاد دلا رہے ہیں کہ کوتوال کے پاس جانے میں ہمیں کافی دیر ہو رہی ہے۔"

"تب تو چلیے، ہم ذرا جلدی کریں۔" نصیر الدین شیخ کو یہ لگا کہ کہیں گاہک اُس کے ہاتھ سے نکل نہ جائے۔ "میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔"

"ٹھیک ہے چلیے۔" کہہ کر امیر رعب سے اُس کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

**

امیر کو دیوان خانے میں بٹھا کر جوہری نصیر الدین شیخ نے کہا۔ "آپ بیٹھیے میں ابھی موتی لے کر آتا ہوں۔"

امیر غالیچہ پر بچھی ہوئی ریشمی چادر پر گاؤ تکیے کے سہارے ترچھا ہو کر بیٹھ گیا۔ دیوان خانے کے بالکل سامنے ایک گول سا صحن تھا جس کے بیچو بیچ ایک فوارہ تھا جس کے چاروں طرف پھولوں کے پودے لگے ہوئے تھے جس کی وجہ سے تپتی ہوئی دوپہر میں بھی وہاں ٹھنڈک سی محسوس ہو رہی تھی۔ امیر کو شیخ کے گھر کی سجاوٹ بہت ہی پسند آئی اور وہ بیٹھے ہی بیٹھے اپنے گھر کو بھی اسی طرح سجانے اور سنوارنے کا منصوبہ بنانے لگا۔ نصیر الدین شیخ کے اس پُر سکون گھر کو دیکھ کر اُسے شیخ سے حسد سی ہونے لگی اور دھیرے دھیرے اُسے ختم کر دینے کا جذبہ اُس کے دل میں زور کرنے لگا۔

"لیجیے جناب۔" نصیر الدین شیخ اپنی بغل میں لکڑی کی ایک پیٹی دبائے ہوئے کمرے میں داخل ہوا اُس کے ساتھ ایک بارہ برس کا لڑکا بھی تھا۔ اُس کا چہرہ شیخ سے بہت ملتا جلتا تھا جس سے امیر نے یہ اندازہ لگایا کہ یہ خوبصورت لڑکا یقیناً نصیر الدین شیخ کا بیٹا ہی ہے۔ اب نصیر الدین شیخ کے لیے اُس کے دل میں اور زیادہ حسد پیدا ہو چکی تھی۔

"یہ آپ کے صاحبزادے لگتے ہیں۔" امیر نے اس لڑکے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔ "خدا کی آپ پر بڑی مہربانی ہے کتنا خوبصورت بیٹا دیا ہے اُس نے۔"

"خدا کی عنایت سے ایسے تین بیٹے ہیں میرے۔" شیخ نے زیورات کی پیٹی کھول کر امیر کے سامنے رکھ دیا اور بولا۔ "لیجیے جس پر نظر ٹھہر جائے وہ پسند کر لیں سب ہی اصلی موتی ہیں۔"

لیکن اُس وقت امیر کی نظریں تو شیخ کے خوبصورت بیٹے پر جمی ہوئی تھیں۔ اُس کے دل میں اِس لڑکے کو اپنا بیٹا بنانے کی تمنا جاگ اٹھی تھی۔ مگر اچانک ہی اُسے تعویذ کی یاد آگئی اور اس کے ساتھ ہی اُس نے اپنے دل پر قابو پا لیا۔

"شیخ جی مجھے موتیوں کی پہچان نہیں ہے۔" دو چار موتیوں کو ہتھیلی پر رکھ کر اس نے کہا۔ "خدا نے مجھے ایک بیٹی دی ہے جس کی شادی کے لیے مجھے اپنی حیثیت کے مطابق تیاری کرنا ہے۔ میں نے آپ کی خدمت میں صورت اور سندیپ کے موتی پیش کر دیے ہیں جو بادشاہوں کے لائق ہیں۔" نصیر الدین شیخ نے کہا۔

"مگر آپ مجھ غریب سپاہی کے لیے تین سو روپے تک کا کوئی موتی دکھائیں۔" امیر کی آنکھوں میں اِن قیمتی موتیوں کی چمک لہرا رہی تھی۔ پھر وہ ہوشیاری سے اپنا جال پھیلاتے ہوئے بولا۔ "ویسے ان نادر موتیوں کو دیکھ کر، ہمارا راجا ضرور خوش ہو گا۔"

"تو کیا اُنھیں بھی موتی خریدنے ہیں؟" شیخ کا دل خوشی سے اُچھل پڑا۔

"ہاں جناب آئندہ سال راج کماری کی شادی ہے اور راجا یہ شادی بڑی دھوم دھام سے کرنا چاہتا ہے۔" امیر نے کامیابی سے ایک جال چلی۔

"تب تو یہ موتی انھیں کے لائق ہیں۔" شیخ نے اپنے موتیوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "ان کے لائق کسی گاہک کا یہاں ملنا مشکل ہے دیکھیے نا کیسی چمک ہے اِن میں۔"

"کیا قیمت ہے اِس کی؟" امیر نے پوچھا۔

"آپ کے لیے تو صرف چھ ہزار لیکن راجا سے تو میں آٹھ دس ہزار سے کم نہیں لوں گا۔" شیخ امیر کے جال میں پھنستا

جا رہا تھا۔

"تو سنیئے جناب میں اپنے راجا کے ہاتھ آپ کے یہ موتی آٹھ ہزار میں فروخت کرادوں گا' اس کے بدلے کیا آپ تین سو کا ایک موتی مجھے دیں گے؟"

امیر نے کہا تو شیخ بڑے غور سے اُس کی طرف دیکھنے لگا اس کا کاروباری ذہن اب پوری طرح لالچ میں آگیا تھا پھر بھی وہ کچھ سوچ کر بولا "لیکن جالان یہاں سے کافی دور ہے اگر یہ موتی مُنہ مانگے داموں پر بک بھی گئے تو اتنی بڑی رقم کو لے کر واپس آنے میں کتنا خطرہ ہے۔ جو رلیٹروں کو اس سودے کی خبر ہو ہی جائے گی اور میں..."

"یہ فکر فضول ہے" امیر اُس کے خوف کو دور کرنے کے لیے جلدی سے بول پڑا "اتنی دور سے آنے والے سوداگر کا ہمارا راجا ضرور خیال کرے گا واپسی پر آپ کی حفاظت کے لیے محافظوں کا انتظام بھی ضرور کر دے گا۔"

"اچھا" شیخ پگھل گیا لیکن ایک بار پھر تسلی کرنے کے لیے وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکا "کیا واقعی آپ کے راجا یہ موتی خرید لیں گے؟ ممبا یہ پھیرا کہیں خالی تو نہیں جائے گا نا؟"

"یہ آپ نے کیا کہہ دیا؟" امیر کے لہجے میں اعتماد کی جھلک تھی "وہ راجا ہیں اگر خریداری کرنے پر آجائیں تو چالیس پچاس ہزار کی اُن کے سامنے حقیقت ہی کیا ہے۔"

یہ سُنتے ہی شیخ کی لالچی طبیعت زور کرنے لگی اور وہ دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ اگر جانا ہی ہے تو کیوں نہ دوسرے زیورات بھی ساتھ لیتا جائے۔ ممکن ہے اُن کا بھی سودا ہو جائے یہ فیصلہ کر لینے کے بعد وہ امیر سے بولا "تو پھر ٹھیک ہے میں اِس سلسلے میں جوتشی سے بھی مشورہ کر لوں۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" امیر جلدی سے بولا "ہم جیسے خدا کے بندوں کو ایسے توہمات کا شکار نہیں رہنا چاہیئے، یہ تو بڑی حیرت کی بات ہے کہ آپ جیسا سچا مسلمان بھی اتنے بہترین سودے میں ایک ہندو جوتشی کے مشورے کو زیادہ اہمیت دیتا ہے؟"

نصیر الدین شیخ کا بارہ سالہ بیٹا جو ابھی تک خاموش بیٹھا تھا امیر کی بات سُن کر بول اٹھا "ابا جان آپ مجھے بھی اپنے ساتھ لے جائیں گے نا؟ آپ نے کہا تھا کہ جب سفر پر جاؤں گا تو تمھیں ضرور ساتھ لے جاؤں گا؟"

یہ سُن کر امیر چونک پڑا اُس نے موتیوں پر سے نظر ہٹا کر اُس لڑکے کی طرف دیکھا اُس کی آنکھوں میں ایک چمک لہرا رہی تھی اور وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ شاید قدرت ہی اُسے اِس لڑکے کا باپ بنانا چاہ رہی ہے۔ پھر اِس سے پہلے کہ نصیر الدین شیخ اپنے بیٹے کو کوئی جواب دیتا خود ہی بول اٹھا "صاحبزادے پہلے اپنے والد کو تو فیصلہ کرنے دو کہ یہ مسافری کے لیے تیار ہیں یا نہیں؟"

"سیّد میاں اگر آپ کے کہنے کے مطابق واقعی راجا یہ اِن موتیوں کو خرید لیتا ہے تو میں آپ کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوں" شیخ نے کہا۔

"انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا" امیر کی آواز میں خوشی کی جھلک تھی "آخر آپ نے ایک بیوپاری کی طرح فیصلہ کر ہی لیا تو پھر کل روانہ ہونے کے لیے تیار رہیئے گا۔"

لیکن شیخ اب بھی ہچکچاہٹ سی محسوس کر رہا تھا وہ امیر کو جواب دیتے ہوئے بولا "کل صبح ہی... نہیں... نہیں اتنی جلدی مت کیجیے مجھے اپنے گھر کی عورتوں سے بھی مشورہ کرنا پڑے گا۔"

امیر کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی وہ اُسے لگا کہ شیخ نے اپنی رضامندی کا اظہار تو کر ہی دیا ہے آج نہیں تو کل وہ اُس کے ساتھ سفر ضرور کرے گا۔

"ہاں سیّد صاحب۔ گھر کی عورتوں کی مرضی کے خلاف جیسے لوگوں کے لیے گھر چھوڑنا مشکل ہے" نصیر الدین شیخ نے پھیکی مسکراہٹ سے کہا۔

"جیسی آپ کی مرضی" کہہ کر امیر اُٹھ کھڑا ہوا اُسے یقین تھا کہ اُس کے ساتھ آنے کی لالچ کو اب یہ شیخ چھوڑ ہی نہیں سکتا' اس لیے وہ زیادہ غرض دکھا کر اُسے شک میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا تھا "ہم لوگ تو کل صبح ہی یہاں سے گو کر جائیں گے اگر آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہو تو صبح کو ہمارے پڑاؤ پر آجایئے گا۔"

"لیکن آپ یہ اس طرح کہاں چل دیئے؟" نصیر الدین شیخ اُس کے اُٹھ جانے پر جلدی سے بولا "آپ نے تو کہا تھا آپ کوتوال کے پاس حساب کتاب کے لیے جانا ہے؟ تو آپ ایسا کریں کہ اِسی وقت یہ کام کر لیں۔ میں شام تک کوئی نہ کوئی فیصلہ کر لوں گا۔ یوں بھی اپنے لیے موتی لینے

لیے تو آپ کو آنا ہی پڑے گا۔"

امیر کو بھی کوئی نہ کوئی بہانہ تو چاہیئے ہی تھا۔ اس لیے وہ بات بدلتے ہوئے بولا "تین سو روپے کے بغیر آپ موتیوں کی مالا مجھے تھوڑی ہی دیں گے؟"

"ٹھیک ہے میں مغرب کی نماز سے قبل یہاں آجاؤں گا" اتنا کہہ کر اُس نے شیخ کے لڑکے کے سر پر ہاتھ پھیرا اور مسکراتے ہوئے بولا "صاحبزادے اپنے والد سے کہنا کہ تمھاری شادی کے وقت وہ مجھے نہ بھولیں۔"

نصیر الدین شیخ کو امیر ایک رحم دل اور محبت کرنے والا شخص نظر آرہا تھا' اُسے امیر پر اب پورا بھروسا ہو چکا تھا' اُس کا جی چاہا کہ وہ ابھی اپنا فیصلہ سناتے ہوئے اُس کے ساتھ چلنے کی حامی بھر لے لیکن بیوی کا خیال آتے ہی وہ چپ ہو گیا' اُسے اس بات کا یقین تھا کہ جوتشی سے معلومات حاصل کیے بغیر اُس کے گھر کی عورتیں اُسے سفر پر جانے نہیں دیں گی، اسی لیے اُس نے امیر سے اتنا ہی کہا "شام کو ضرور آئیے گا بھولیے گا نہیں۔"

اور چالاک امیر نے اُس کے اِن الفاظ سے ہی اپنے مطلب کا اندازہ نکال لیا اور دل ہی دل میں بولا "بے وقوف مجھے یقین ہے کہ تم ضرور میرے ساتھ چلو گے تمھارے زیورات اور موتی سب میرے ہو جائیں گے اور تمھارا بیٹا..." لیکن امیر کے خیالوں کا سلسلہ اسی جگہ اٹک گیا کیوں کہ وہ خود ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ وہ شیخ سے اپنے بیٹے کو ساتھ لے چلنے کے لیے کہے یا نہ کہے؟

پڑاؤ پر آکر امیر نے اپنے خاص آدمیوں کو شیخ کے شکار کا سارا معاملہ سمجھا دیا۔ اُس نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "اس سفر کا ہمارا یہ آخری اور سب سے زیادہ مال دار شکار ہے۔"

ساتھیوں کے لیے تو یہ ایک خوشی کی بات تھی لیکن پھر بھی رامو نے اپنے شک کا اظہار کیے بنا نہ رہ سکا "لیکن سردار ہمارے لیے یہ منع ہے کہ ہم کسی کے گھر جا کر اُسے اپنا شکار بنا کر اپنے ساتھ لے جائیں۔"

"مگر کیوں؟" امیر تلخ لہجے میں بولا "میں اتنی محنت سے سارا معاملہ طے کر کے آیا ہوں اور تم ہو کہ اپنے بے ہودہ قوانین کو درمیان میں لا رہے ہو؟ اگر ایسی بات تھی تو مجھے رضامند کر کے کیوں شکار کی تلاش میں بھیجا تھا؟"

"بات یہ نہیں ہے" رامو نے تھوک گلے سے نیچے اتارتے ہوئے کہا۔

"ایسا کرنے سے اگر ہمارے سر پر کوئی آفت ٹوٹ پڑی تو؟"

"کیسی آفت؟" امیر نے گھور کر اُسے دیکھا۔

"آپ اُس شیخ کے گھر گئے تھے اِس لیے اُس کے گھر کے افراد نے آپ کو پہچان لیا ہے۔ اِس کے علاوہ پیپل چوک پر شیخ کے ساتھ دو اور آدمیوں نے بھی آپ کو دیکھا ہے اگر شیخ ہمارے ساتھ جالان جانے کے لیے گھر سے نکلتا ہے اور پھر واپس گھر نہیں آتا ہے تو اُس کی گمشدگی پر یقیناً سب لوگوں کو آپ پر شک ہو جائے گا اور ہم سب لوگ پکڑے جائیں گے" رامو نے ڈرتے ڈرتے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

"لیکن اتنی دور کون آئے گا شیخ کو تلاش کرنے کے لیے؟" امیر نے یہ بات کہہ تو دی لیکن اپنا یہ جواب اُسے خود ہی کھوکھلا لگا اِس لیے اُسے کہنا پڑا "اگر کوئی پوچھ گچھ کرنے کے لیے آئے گا تو ہمارے پاس اس کا جواب تیار ہی ہوگا۔ ہم ان لوگوں سے کہہ دیں گے کہ شیخ کے ساتھ جو اُن کے چوکیدار آئے تھے اُن کی نیت بگڑ گئی تھی اور اُن ہی لوگوں کے کہنے پر شیخ ہم لوگوں سے علیحدہ ہو گئے تھے اس کے بعد کیا ہوا یہ ہمیں معلوم نہیں ہے اور پھر جالان میں میری جو عزت ہے اُسے دیکھ کر کوئی بھی مجھ پر شک کرنے کی ہمت نہیں کرے گا اس کے علاوہ ہمارا راجا بھی کب کسی کی بات سُننے والا ہے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے" رامو نے امیر کی دلیل سُن کر کہا "مجھے معلوم ہے آپ بلا سوچے سمجھے کوئی قدم نہیں اٹھاتے تو پھر ہمیں فکر مند ہونے کی کیا ضرورت ہے؟"

اور تب امیر کو واقعی فکر مند ہو جانا پڑا وہ اب سنجیدگی سے سوچ رہا تھا کہ ایسی حالت میں شیخ کے لڑکے کو ساتھ لینا عقل مندی نہیں ہوگی۔ ممکن ہے بعد میں شیخ کی تلاش ہو اور اگر شیخ کا لڑکا اُس کے گھر سے برآمد ہو گیا تو وہ ضرور مصیبت میں پھنس سکتا ہے۔

تھوڑی دیر تک ان باتوں پر غور کرنے کے بعد اُس نے اپنے دل کو یہ کہہ کر سمجھا لیا کہ اب مجھے کسی کے بیٹے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ تعویذ کی برکت سے اب تو میری ساری

مُرادیں پوری ہو جائیں گی۔ بس اب تو اپنی آئندہ زندگی میں عیش سے گزاروں گا۔ اس فیصلے کے بعد اس کے چہرے پر خوشی کی چمک تو لہرا گئی تھی لیکن آدمی کو یہ کب معلوم ہوتا ہے کہ اُس کی آئندہ زندگی میں اُس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟

★★

امیر کا ساتھی رامُو نصیر الدین شیخ کے گھر کے باہر بھیس بدل کر بیٹھا تھا۔ دوپہر ڈھل رہی تھی لیکن جس کام کے لیے وہ آیا تھا وہ کام ابھی تک نہیں ہو سکا تھا امیر کو اس بات کا یقین تھا کہ نصیر الدین شیخ کسی جوتشی سے مشورہ کیے بغیر سفر پر نہیں نکلے گا اسی لیے اُس نے رامُو کو جوتشی بنا کر اُس کے گھر کے باہر بھیج دیا تھا تاکہ وہ اس کی جنم کُنڈلی دیکھ کر اُسے سفر پر جانے کی اجازت دے دے۔ اس مہم پر روانہ ہوتے وقت تو رامُو نے بڑے یقین سے یہ کہا تھا "آپ کو کہنا نہیں پڑے گا سردار میری طرف سے تو یہ سمجھ لیجئے کہ یہ کام ہو گیا۔"

لیکن شام ہونے لگی تھی اور اس کے ساتھ شیخ سے امیر کی دوسری ملاقات کا وقت بھی ہو گیا تھا لیکن اس کے باوجود رامُو اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا تنگ آ کر وہ بڑبڑانے لگا "شیخ کے گھر سے تو کوئی باہر ہی نہیں نکلتا اب یہ کام کیسے انجام دیا جائے؟" وہ سوچ رہا تھا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ شیخ اپنے کسی جوتشی سے ہی مشورے لیتا ہو۔ رامُو کے صبر کا پیمانہ اب لبریز ہونا جا رہا تھا' وہ اس جگہ سے ناامید ہو کر اٹھنے ہی والا تھا کہ اچانک نصیر الدین شیخ کے گھر سے اُسے ایک آدمی باہر نکلتا دکھائی دیا۔ وہ شخص جیسے ہی اُس کے قریب سے گزرا رامُو نے اُسے روکتے ہوئے پوچھا "ارے بھائی ذرا ٹھہرو تو سہی۔ اُس کی دکان کہاں ہے؟"

"کس کی دکان؟" وہ شخص رامُو کی طرف دیکھ کر حیرت سے بولا "آپ کو کس ساہوکار کی دکان کی تلاش ہے؟"

"ارے ساہوکار کی نہیں" رامُو نے مُنہ کھول کر جمائی لی اور آگے بولا "بھائی میں سستی اڑانے والی دکان کے بارے میں پوچھ رہا ہوں" اتنا کہہ کر وہ آنکھ دبا کر بولا "مجھے نشہ کرنے کی عادت ہے۔"

نشہ کا لفظ سُنتے ہی اُس شخص کے مُنہ میں پانی آ گیا اور وہ اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا "تو یوں کہو نا کہ تمھیں دارو کے اڈّے کی تلاش ہے؟"

رامُو شرما جانے کی اداکاری کرتے ہوئے دھیرے سے کہا "آپ تو واقعی بہت سمجھدار ہیں۔"

"چلو میں تمھیں اڈّہ دکھاتا ہوں" یہ کہہ کر وہ شخص آگے آگے چلنے لگا اور رامُو اُس کے پیچھے اِس طرح بڑبڑاتے ہوئے چل رہا تھا جیسے خود سے باتیں کر رہا ہو "دارو تو دیوتا بھی پیا کرتے تھے اُس وقت اُسے سومرس کہا جاتا تھا لیکن ہمیں نام سے کیا مطلب ہے؟ جس نے اِس کی لذّت چکھی ہو گی وہی جانتا ہے اس میں کیا مزہ ہے؟" اتنا کہہ کر وہ اُس شخص کو مخاطب کر کے بولا "کیوں بھائی آپ نے کچھ کہا نہیں؟"

رامُو یہ محسوس کر چکا تھا کہ اُس شخص کے مُنہ میں پانی بھر آیا ہے۔ پھر جب تھوڑی دیر بعد اُس نے دارو کے اڈّے کی جانب انگلی سے اشارہ کیا تو رامُو نے اُس کا بازو تھام لیا اور بڑی اپنائیت سے بولا "اکیلے پینے میں کوئی مزہ نہیں آتا۔ تم نے مجھے اڈّہ دکھایا ہے اس کا انعام تو تمھیں ملنا ہی چاہیے۔ چلو آؤ۔"

اس طرح رامُو کے ساتھ شیخ کا ملازم شمبھو بھی اڈّے کی جانب کھنچتا چلا گیا۔ رامُو کو اپنا کام نکالنے کی جلدی تھی اور شمبھو کی کوشش یہ تھی کہ وہ جلد سے جلد دارو کے گلاس خالی کرتا رہے۔ رامُو نے اِدھر اُدھر کی باتوں میں لگا کر اُسے نشے میں چوڑ کر دیا پھر اُسے اصل مقصد کی طرف لاتے ہوئے بولا "شمبھو مہاراج تم نے ایک کام میں تو میری مدد کی ہے اگر تم میرا دوسرا کام بھی کر دو تو تمھاری بڑی مہربانی ہو گی۔"

"بولو پردیسی" نشے سے تھرتھراتی آواز میں شمبھو نے پوچھا "اس دنیا میں کوئی کام ایسا نہیں ہے جو شمبھو نہ کر سکے بولو کیا کام ہے؟"

"تمھاری جان پہچان کا کوئی جوتشی ہو تو اُس سے مجھے کچھ پوچھنا ہے۔"

"جوتشی" شمبھو نے ہچکی لے کر کہا "میں تو دو گھنٹے قبل ہی جوتشی کے پاس گیا تھا اگر اُس وقت تم مل جاتے تو میں تمھیں اپنے ساتھ لے جاتا۔"

"مگر تمھیں جوتشی کے پاس کیوں جانا پڑا تھا؟" رامُو نے پوچھا۔

"ارے بھائی ہمارے مالک کو سفر پر جانا ہے۔ اس کے لیے کون سا دن اچھا ہو گا یہ پوچھنے کے لیے مالک نے مجھے اُس کے پاس بھیجا تھا۔"

یہ سُن کر رامُو کی آنکھوں میں ایک چمک سی لہرا گئی۔ "تب تو پھر تمھارے جوتشی نے کوئی شبھ دن بتا دیا ہو گا؟"

شمبھو نے دو چار بار گردن ہلائی کچھ کہنے کے لیے اُس کی زبان ہِل رہی تھی لیکن الفاظ اُس کے مُنہ سے نہیں نکل رہے تھے اس کی یہ حالت دیکھ کر رامُو کو لگا کہ شاید اِسے ضرورت سے زیادہ نشہ ہو گیا ہے اور اگر اس سے ذرا بھی تاخیر ہوئی تو شمبھو اپنا ہوش کھو بیٹھے گا اِس خیال کے آتے ہی اُس نے شمبھو کو کندھے سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا "کیا اس نے کوئی اچھا دن نہیں بتایا؟"

"نہیں بھائی" شمبھو نے ڈولتے ڈولتے ہوا میں ہاتھ ہلایا "اس نے کہا تھا کہ اِس وقت سفر کرنا ٹھیک نہیں ہو گا۔ اس ارادے کو اس وقت تک ملتوی کر دیا جائے جب تک ستارے موافق نہیں ہو جاتے۔"

"تب تو وہ جوتشی واقعی تجربہ کار ہونا چاہیے" رامُو نے کہا "کہاں رہتا ہے وہ؟"

شمبھو نے بوتل میں بچی ہوئی شراب کو حلق میں انڈیل کر اٹھنے کی کوشش کی لیکن اس کے پاؤں اُس کے جسم کا بوجھ نہیں اٹھا سکے جس کی وجہ سے وہ لڑکھڑا کر فرش پر گر پڑا۔ رامُو کو پریشانی ہو گئی کہ یہ کم بخت عین وقت پر ہی لُڑھک گیا۔ اس نے اِس کے دونوں کاندھوں کو پکڑ کر زور سے ہلایا "آپ کو تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں ہے شمبھو مہاراج۔ آپ صرف مجھے اُس کا پتا بتا دیں پھر بھلے بے ہوش ہو جائیں۔"

"کس کا پتا؟" شمبھو غنودگی میں بڑبڑایا۔

"اُس جوتشی کا" رامُو نے عاجزی بھرے لہجے میں کہا "اُس جوتشی کا نام کیا ہے۔ وہ کہیں نزدیک میں رہتا ہے یا دور؟"

"نام سے ہمیں کیا مطلب؟" شمبھو سر ہلاتے ہوئے کہہ رہا تھا "وہ... مندر کا پجاری ہے۔"

"کس مندر کا؟" رامُو نے اُسے جھنجھوڑ دیا۔

"بالا جی" اتنا کہہ کر شمبھو نے آنکھیں بند کر لیں اور فرش پر لُڑھک گیا۔ رامُو کا مطلب نکل چکا تھا اس لیے وہ شمبھو کو وہیں چھوڑ کر باہر نکل گیا اُس نے دارو کے اڈّے سے باہر آ کر آسمان کی طرف دیکھا تو سورج مغرب کی جانب اپنا مُنہ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔

کمر میں بندھی ہوئی روپے کی تھیلی کو ٹٹولتا ہوا امیر نصیر الدین شیخ کے گھر میں داخل ہو گیا۔ اُسے اس بات کی توقع تھی کہ شیخ مسکراتے ہوئے اس کا استقبال کرے گا اور سب سے پہلی بات اُس کے مُنہ سے یہ ہی نکلے گی کہ میں آپ کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوں لیکن جب شیخ نے صرف "آئیے... آئیے" کہہ کر اُسے اندر بلایا تو اُس کی اُمیدوں پر پانی پھر گیا "یہاں بہت گرمی ہے۔ چلیے ہم لوگ چھت پر جا کر بیٹھتے ہیں" شیخ نے اپنے ماتھے کا پسینا پونچھتے ہوئے کہا۔

امیر اُس کے پیچھے پیچھے سیڑھیاں چڑھنے لگا وہ شیخ کے قدموں کی آواز سے ہی یہ تاڑ گیا تھا کہ شکار اُس کے ہاتھ سے نکلتا جا رہا ہے۔ اُس نے دل ہی دل میں رامُو کو دو چار گالیاں بھی دے ڈالیں "کم بخت صرف چٹکی بجانا ہی جانتا ہے۔"

"تشریف رکھیے" چھت پر بچھی ہوئی دری پر بیٹھتے ہوئے شیخ نصیر الدین نے کہا "سیّد میاں بات کچھ بگڑ گئی ہے۔"

"کیوں کیا ہوا؟" امیر نے انجان بننے کی کوشش کی مگر پھر بھی اُس کی آواز لرز رہی تھی "کون سی بات بگڑ گئی ہے؟"

"جالان جانے کی۔"

امیر نے اپنی پیشانی پر آیا ہوا پسینا پونچھنے کے بہانے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی اور بولا "تو کیا زنانخانے سے آپ کو جانے کے لیے منع کیا گیا ہے؟"

"جی نہیں" شیخ نے کہا "مجھے جوتشی نے سفر کے لیے منع کیا ہے۔ میں نے اُس سے پوچھوایا تھا کہ کل کا دن سفر کے لیے کیسا رہے گا؟ تو اُس نے کل پرسوں کے علاوہ اور بھی پندرہ دنوں کو سفر کے لیے منحوس قرار دیا ہے۔"

"اور آپ اس کی بات مان گئے؟" امیر نے حیرت کا اظہار کیا۔

"ارے آپ میری بات کو چھوڑیں" شیخ نصیر الدین شیخ نرم لہجے میں بولا "جوتشی کی بات سُن کر تو میرے زنانخانے میں کھلبلی سی مچ گئی۔ میرے سفر پر جانے کے بعد گھر میں کتنی

بڑی قیامت ٹوٹ پڑے گی، اس خیال سے ہی بیوی پریشان ہو گئی تھی۔"

یہ سُن کر امیر کو لگا کہ بازی اُس کے ہاتھ سے نکلتی جا رہی ہے اور اب اُسے کوئی ایسا پانسہ پھینکنے کی ضرورت ہے کہ بازی پلٹ کر رہ جائے۔ اُسے رامُو پر سخت غصہ آ رہا تھا جس کی حماقت کی وجہ سے ہاتھ آیا ہوا شکار نکلتا جا رہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے دھیرے دھیرے اپنی کمر میں سے روپے کی تھیلی نکالی اور اُسے شیخ کے سامنے رکھتے ہوئے بولا "لیجئے گن لیجئے پورے تین سو ہیں۔" پھر ایک گہرا سانس لے کر وہ آگے بولا "شاید آٹھ ہزار کا سودا آپ کی تقدیر میں نہیں ہوگا۔"

یہ سُن کر شیخ کا منہ لٹک گیا اور وہ افسوسناک لہجے میں بولا "کیا کروں؟ جوتشی نے تو اس معاملے کو ہی ٹال دیا ہے۔"

"ارے ہاں۔" امیر اس طرح چونک کر بولا جیسے اُسے اچانک ہی کچھ یاد آ گیا ہو "آپ نے اُسے معقول نذرانہ تو بھیج دیا تھا نا؟"

"یہ آپ کیوں پوچھ رہے ہیں سیّد میاں؟" شیخ نے بے چینی سے پوچھا۔

"اکثر ایسا ہی ہوتا ہے شیخ صاحب کہ براہمن کو اگر پوری دکھشنا نہ ملے تو وہ کوئی نہ کوئی رکاوٹ کھڑی کر دیتے ہیں اور اگر انھیں زیادہ انعام مل جائے تو وہ ستاروں کی چال بھی بدل دیتے ہیں۔"

"نہیں وہ جوتشی ایسا نہیں ہے۔" شیخ نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا "وہ مندر کا پجاری بھی ہے اور اکثر میں اُسے کچھ نہ کچھ دیتا رہتا ہوں۔"

"مالک۔" اچانک ایک بوڑھے ملازم نے چھت پر آ کر ادب سے کہا "مندر کا پجاری آپ سے فوراً ملنا چاہتا ہے۔"

"پجاری؟" شیخ کی آنکھوں میں حیرت کے آثار تھے اس نے امیر کی طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا "وہی جوتشی مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ دیکھیں تو سہی وہ کیا کہنا چاہتا ہے؟" اتنا کہہ کر شیخ اپنی جگہ سے اٹھا اور جوتیاں پہن کر جلدی جلدی نیچے جانے کے لیے آگے بڑھ گیا۔ امیر اس اچانک ہونے والی تبدیلی سے سٹپٹا گیا تھا۔ اس لیے اس نے اپنے روپے کی تھیلی کو پھر سے اپنی کمر میں اُڑس لیا پھر اُٹھ کر چھت کے منڈیرے کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اور نیچے صحن پر نظر ڈالی

تو ننگے بدن اور گنجے سر والا پستہ قد براہمن پجاری کہیں اُوپر کی جانب تکتا دکھائی دیا۔ اُس کی نظریں امیر کی نظروں سے صرف چند لمحوں کے لیے ہی ملیں تھیں لیکن پھر بھی امیر کو اُس کی نظروں میں کچھ عجیب سی بات محسوس ہوئی تھی کہ اس لیے اُس نے فوراً ہی اپنی نظریں ہٹا لیں اُس کے دل میں طرح طرح کے شکوک ابھرنے لگے تھے۔ آخر یہ برہمن آخر یہاں میں کیوں ہے؟ کہیں وہ شیخ نصیر الدین کو آنے والے خطرات سے آگاہ کرنے تو نہیں آیا؟ اُس نے پھر دیوار سے نیچے جھانکا تو پجاری اُسے شیخ کی پھیلائی ہوئی ہتھیلی کو دیکھ کر کچھ بڑبڑاتا دکھائی دیا، شیخ نصیر الدین کے چہرے کے تاثرات سے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اس کی بات سُن کر کچھ گھبرا سا گیا ہے یہ دیکھ کر امیر کو اب سچ مچ ہی خوف سا ہونے لگا اُسے یقین ہونے لگا کہ یقیناً رامُو سے کوئی حماقت سرزد ہو چکی ہے جس کے نتیجے میں اس جوتشی کو کچھ شک ہو گیا ہے اور وہ شیخ کو ہوشیار کرنے کے لیے آیا ہے۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ شکار تو ہاتھ سے نکل ہی چکا ہے لیکن اب وہ خود یہاں سے کیسے نکل سکے گا؟

آنے والے خطرناک لمحات سے نپٹنے کے لیے امیر نے پورے چھت پر ایک نظر دوڑائی اور پھر وہ چھت کے پچھلے حصے کی طرف آ گیا۔ چھت بہت زیادہ اُونچی نہیں تھی اس لیے ضرورت پڑنے پر باآسانی چھلانگ لگائی جا سکتی تھی لیکن چور کی طرح نکلنے میں اُسے اور زیادہ خطرہ دکھائی دیا اس لیے بجائے اُسے شیخ کا سامنا کرنے میں ہی بہتری نظر آ رہی تھی اس اُلجھن میں امیر کے پسینے چھوٹ گئے وہ تیزی سے پھر منڈیر پر آ گیا اُسے توقع تھی کہ شیخ کی حرکتوں سے وہ یہ اندازہ لگا لے گا کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے؟ لیکن اب صحن میں شیخ موجود نہیں تھا اور وہ پستہ قد پجاری بھی وہاں سے جا چکا تھا۔ اچانک اُسے خیال آیا کہ مغرب کی نماز کا وقت ہو چکا ہے اور خطرہ چاہے کیسا بھی ہو بھلا خدا کی بندگی کا موقع ہاتھ سے کیسے جانے دیا جائے؟ اس خیال کے آتے ہی اُس نے خوف کو اپنے سر سے جھٹک دیا اور نماز پڑھنے کے لیے دری پر آ کر کھڑا ہو گیا اور آنکھیں موند کر خدا کے خیالوں میں کھو گیا۔ نماز ختم کرنے کے بعد اُس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو شیخ ایک جانب مسکراتی نظروں سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا تھوڑی دیر

لیے تو امیر کو اُس کی مسکراہٹ بڑی قاتل لگی تھی جیسے یہ مسکراہٹ اس سے کہہ رہی ہو کہ سیّد میاں اپنے خدا کو یاد کر لو اب تمھاری آخری گھڑی آ پہنچی ہے۔

"قدرت بھی کیسے کیسے تماشے کرتی ہے سیّد میاں۔" شیخ حیرت بھری آواز میں کہہ رہا تھا "کل صبح میں بھی آپ کے ساتھ چل رہا ہوں۔"

"اچھا۔" امیر کا دل خوشی سے اُچھل کر اُس کے حلق میں آ گیا "سچ کہہ رہے ہیں آپ؟"

"ہاں۔ وہ پجاری اِسی لیے تو بھاگتا ہوا آیا تھا۔" شیخ نے اُسے بتاتے ہوئے کہا "اُس کے زائچے میں کچھ غلطی ہو گئی تھی پھر جب اُسے اپنی غلطی کا احساس ہوا تو وہ بھاگتا آیا اب وہ کہہ گیا ہے کہ سفر کے لیے کل کا دن بہت ہی اچھا ہے کاروبار کے لیے بھی یہ سفر میرے لیے انتہائی فائدہ مند ثابت ہوگا۔"

امیر کو اس کی بات کا یقین نہیں آ رہا تھا وہ اب بھی یہی سمجھ رہا تھا کہ یہ شیخ اُس سے مذاق کر رہا ہے ممکن ہے اُس نے کوتوال کو بلانے کے لیے اپنا آدمی بھیج دیا ہو اور کوتوال کے آنے تک اُسے باتوں میں اُلجھائے رکھنا چاہتا ہو۔

"شکر ہے خدا کا آپ کے دل کو تسلی تو ہو گئی۔" امیر زبردستی خوش ہو کر بولا "اب سفر پر چلنا نہ چلنا تو آپ کی مرضی پر منحصر ہے۔"

"لیکن اب سفر پر نہ جانے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔" شیخ نے کہا۔

امیر نے اس کی بات سُن کر روپے کی تھیلی اپنی کمر سے نکال کر دوبارہ اُس کے سامنے رکھ دی اور بولا "لیجئے اور مجھے وہ ہار دیجئے۔"

"لیکن اب اس کی کیا جلدی ہے۔" شیخ کو امیر کی یہ بات کچھ عجیب سی لگ رہی تھی "یہ رہا جائے اگر میرے سارے موتی خرید لیے تو آپ کو اس ہار کی قیمت نہیں ادا کرنی پڑے گی۔"

"کیا پتا رات کو آپ کا جوتشی آ کر یہ کہہ دے کہ ستاروں کا رُخ بدل گیا ہے اور آپ سفر پر نہ جائیں تو...؟" امیر نے ہنس کر کہا۔

"آپ تو مذاق کر رہے ہیں میاں۔" شیخ عاجزانہ لہجے میں بول رہا تھا "اب کوئی تبدیلی نہیں ہوگی گھر کی عورتوں نے بھی خوشی سے اجازت دے دی ہے لیکن بچّے کو ساتھ بھیجنے کے لیے وہ تیار نہیں ہیں۔"

"تو اُسے ساتھ نہ لیں۔" امیر کو اب یقین ہو گیا کہ بازی ایک بار پھر اُس کے ہاتھ میں آ چکی ہے۔ اِسی لیے روپے کی تھیلی کو کمر میں اُڑسنے کے بعد اُس نے کہا "ہمارا قافلہ بہت بڑا ہے اس لیے آپ زیادہ آدمیوں کو بھی ساتھ مت لیجئے گا۔"

"اب آپ نے کام کی بات کی ہے۔" شیخ کو اُس کے بدلے ہوئے سلوک پر کوئی شک نہیں ہوا "میں سورج طلوع ہونے سے قبل ہی آپ کے پاس آ جاؤں گا۔ انشاء اللہ آپ کی مدد سے میرے قیمتی موتی فروخت ہو جائیں گے۔"

شیخ کی بات سُن کر امیر دل ہی دل میں یہ کہہ کر ہنس پڑا کہ موتیوں کو فروخت کرنے کے لیے انشاء اللہ تم زندہ ہی نہیں رہو گے۔ تھوڑی دیر بعد وہ "خدا حافظ" کہہ کر شیخ کے گھر سے رخصت ہو گیا۔ وہ جلد سے جلد چھاؤنی پر پہنچ کر رامُو سے جوتشی کا بھید جاننا چاہتا تھا کیوں کہ اُس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ نصیر الدین شیخ نے اتنی جلدی اپنا فیصلہ کیسے بدل دیا تھا؟

"نصیر الدین شیخ پھنس گیا نا؟" رامُو امیر کے گھوڑے کی لگام تھام کر مسکراتے ہوئے بولا "جوتشی نے اپنا کام یقیناً دکھا دیا ہوگا۔"

امیر اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر گھوڑے سے نیچے اتر آیا اور ہنستے ہوئے بولا "یار تم نے تو کمال ہی کر دیا۔" اتنا کہہ کر وہ اُسے اپنے خیمے میں لے گیا اور اندر آ کر بولا "جوتشی جب بھاگتا ہوا شیخ کے پاس آیا تو میں گھبرا سا گیا تھا کہ کہیں وہ کوئی الٹی سیدھی بات نہ کر بیٹھے۔"

رامُو مسکراتی نظروں سے امیر کی طرف دیکھ رہا۔ اُس کا جی تو چاہ رہا تھا کہ وہ اپنے اس کارنامے کو پوری تفصیل سے امیر کے گوش گزار کر دے ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ امیر کی آواز نے اُسے چونکا دیا "اب پہلے تم مجھے یہ بتاؤ کہ جوتشی صبح تک ہمارے راز کو اپنے پیٹ میں چھپا سکے گا یا نہیں؟"

اُس کی بات سُن کر رامُو پہلے تو دھیرے سے مسکرایا پھر جواب دیتے ہوئے بولا "سردار آپ صبح کی بات کرتے ہیں۔ وہ تو زندگی بھر ہمارے راز کو اپنے پیٹ میں رکھے گا۔"

"تو کیا تم نے اُس پر ہماری اصلیت ظاہر کر دی ہے؟" امیر

کی آواز میں ہلکی سی کپکپاہٹ تھی۔ "کسی کو بے وقوف بنانے کے چکر میں کہیں ہم بے وقوف تو نہیں بن گئے رامو؟"

"ایسی بات نہیں ہے۔" رامو اپنی آستین چڑھاتے ہوئے بولا "بالاجی کے مندر میں داخل ہو کر میں نے پجاری کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے تو وہ مجھے گھور گھور کر دیکھنے لگا تب میں نے اُس سے کہا۔ آپ سے مجھے ایک بہت ضروری کام ہے۔ میری بات سُن کر اُس نے مجھے اندر آنے کے لیے کہا۔ میں ڈرتے ڈرتے اپنی جوتیاں اتار کر اُس کے حجرے میں داخل ہو گیا۔ حجرے میں آتے ہی میرا دم خوف سے گھٹنے لگا تھا۔ تھوڑی دیر تک تو ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر اُس نے دھماکہ کیا۔ "ہم نے تمھیں پہچان لیا ہے۔" یہ سنتے ہی میرا جی چاہا کہ میں وہاں سے بھاگ جاؤں۔ مگر پھر اُس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دھیرے سے کہا۔ "علی خان بھائی سلام۔"

"ارے رامو۔ وہ تو ہمارا ٹھگ بھائی نکلا۔" امیر خوشی سے تقریباً چیخ اٹھا۔ "لیکن پجاری کا ڈھونگ رچا کر وہ یہاں کیا کر رہا ہے؟"

"اُس کا نام وشوا ناتھ ہے۔" رامو نے کہا۔ "وہ بندھیا چال کا بھگت تھا وہاں سے وہ بنارس چلا گیا اور وہیں جوتشی کی تعلیم حاصل کی پھر وہ گھومتے گھومتے یہاں آگیا اور مندر کا پجاری بن گیا۔ اس طرح یہاں سے گزرنے والے اپنے ٹھگ بھائیوں کی وہ مدد بھی کرتا رہتا ہے۔"

"تب تو اُس نے تمھارے ساتھ کوئی سودا کیا ہوگا؟"

"ہاں۔ میں نے اُسے پانچ سونے کی مہریں دی تھیں لیکن وہ جانتا تھا کہ شیخ نصیر الدین بہت بڑا شکار ہے۔ میں نے اُسے سمجھایا کہ ہم لوگوں کی ٹولی بہت بڑی ہے۔ حصے میں زیادہ رقم نہیں آئے گی۔ مگر پھر بھی اُس نے پانچ سو روپے اور مانگے۔"

"پھر؟" امیر نے پوچھا۔

"میرے پاس چونکہ بحث کرنے کا وقت نہیں تھا اس لیے میں نے یہ سودا منظور کر لیا۔" رامو نے کہا۔ "ہم اُسے ہُنڈی کے ذریعہ بھی یہ رقم ادا کریں گے تو چلے گا۔"

"پانچ سونے کی مہریں اور پانچ سو روپے؟" امیر کو جوتشی کی یہ دلالی بہت زیادہ لگ رہی تھی لیکن وہ جانتا تھا کہ اُس کی مدد کے بغیر یہ شکار اُس کے ہاتھ نہیں آسکتا تھا اس لیے وہ بولا۔ "ٹھیک ہے رامو وہ بھی ٹھگ ہے اپنی محنت کی رقم تو ضرور ہی وصول کرے گا۔"

"ہمیں شیخ کے پاس سے کتنے ہزار کا مال ملنے کی توقع ہے؟" رامو نے پوچھا۔

"کم سے کم دس ہزار اور زیادہ سے زیادہ..." امیر اچانک رُک گیا اپنے ساتھیوں کو بہت زیادہ کی اُمید میں رکھنا اُسے پسند نہیں تھا اس لیے اُس نے بات بدل دی۔ "زیادہ سے زیادہ ہماری قسمت میں جتنا ہوگا۔"

"تو میں اپنے ساتھیوں کو اِس کے بارے میں بتا دوں۔" رامو نے اُٹھتے ہوئے کہا اُسے اپنے کارنامے کی داستان اپنے ساتھیوں کو سنانے کی جلدی تھی۔ امیر نے یہ بات محسوس کر لی تھی اِس لیے اُس نے اُسے اجازت دیتے ہوئے کہا۔ "جاؤ جا کر اُنھیں بھی بتا دو کہ شکار ہمیں مل گیا ہے۔ میرے اندازے کے مطابق شیخ دو آدمیوں سے زیادہ آدمی اپنے ساتھ نہیں لائے گا۔"

اور دوسرے دن صبح ہوتے ہی شیخ اپنے دو محافظوں کے ساتھ امیر کی چھاؤنی پر آپہنچا، موت کے سفر پر روانہ ہونے کے لیے۔

**

"آنندی سنبھلنا۔" امیر زور سے چیخا لیکن اِس سے پہلے کہ آنندی سنبھل پاتا ایک تیز کٹاری اُس کی پسلیوں میں پیوست ہو گئی۔ امیر نے تھوڑی دیر قبل "پان لاؤ" کا اشارہ دیا تھا۔ آنندی سے شیخ کے ایک محافظ کی گردن میں رومال ڈالنے میں چند لمحوں کی تاخیر ہو گئی تھی، جس کی وجہ سے نوجوان محافظ نے دیکھ لیا تھا کہ اُس کے مالک شیخ نصیر الدین پر حملہ ہو چکا ہے یہ دیکھ کر اُس نے بڑی پھرتی سے اپنی کٹاری نکال لی تھی لیکن ٹھیک اُسی وقت پیچھے سے اُس کی گردن پر رومال کا پھندہ ڈال دیا گیا تھا اور آنندی نے پوری طاقت لگا کر اُس پھندے کو تنگ کرنا شروع کر دیا تھا مگر نوجوان محافظ نے پلٹ کر کٹاری اُس کی پسلیوں میں پیوست کر دی آنندی نے چیخ سُن کر دوسرے ٹھگ اُس کی مدد کو لپکے اور انھوں نے شیخ کے محافظ کو پلک جھپکتے ہی ٹھنڈا کر دیا۔ آنندی اپنے زخم پر ہاتھ رکھ کر زمین پر گر پڑا تھا۔

"تم لوگ لاشوں کو جلدی سے دفنا دو۔" امیر اُس نوجوان محافظ کی لاش کو ٹھوکر مار کر غرایا۔ "اُس وقت تک میں اور رامو آنندی کے زخم کی مرہم پٹی کر لیتے ہیں۔"

رامو اور امیر نے زخمی آنندی کو اٹھا کر ایک درخت کے سائے میں لٹا دیا پھر امیر نے کہا۔ "رامو تم جا کر پانی لے آؤ تاکہ پہلے ہم اس کے زخم کو دھو دیں۔"

بوڑھا آنندی رحم طلب نظروں سے امیر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں سے عاجزی کا اظہار ہو رہا تھا۔ زخم پر رکھی ہوئی اُس کی ہتھیلی خون سے سُرخ ہو رہی تھی وہ کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اُس کے ہونٹ کانپتے رہے۔

"ابھی تمھیں آرام آجائے گا آنندی۔" امیر نے اُس کی ہمت بندھانے کی کوشش کی لیکن بوڑھے آنندی نے اشارے سے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ اُس کا زخم بہت ہی گہرا ہے۔ آپ بے کار ہی محنت کر رہے ہیں تھوڑی دیر بعد بھی جب آنندی کو سکون محسوس نہیں ہوا تو اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"اِسے اِس حالت میں اٹھا کر لے جانا تو بہت ہی مشکل ہے۔" امیر کی آواز میں لاچاری کی جھلک تھی۔ "راستے میں اگر کوئی قافلہ ٹکرا گیا تو وہ ضرور پوچھ گچھ کرے گا اور ہمیں گاؤں کی کوتوالی میں جا کر خلاصہ کرنا پڑے گا۔"

"اُس وقت تک کیا یہ زندہ رہے گا؟" رامو نے ایک گہرا سانس لیا۔ "اِس سے تو بہتر یہ تھا کہ یہ اُسی وقت ختم ہو جاتا اور اِسے اِس تکلیف سے بھی نجات مل جاتی۔"

امیر نے ایک جھٹکے سے رامو کی طرف دیکھا۔ رامو نے ٹھیک ہی کہا تھا لیکن امیر کے چہرے سے یوں لگ رہا تھا جیسے یہ بات اُسے اچھی نہ لگی ہو، وہ کبھی رامو کی طرف دیکھتا اور کبھی آنندی کی جانب وہ ایک عجیب سی کشمکش میں مبتلا تھا جو بات اُس کے دل میں تھی اُسے وہ اپنے ہونٹوں تک لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ آخر کافی دیر کے بعد اُس نے ہمت کر ہی دی۔ "رامو اِسے اِس تکلیف سے نجات دلانے کی ایک ہی ترکیب ہے۔"

"کیا؟"

"اِسے ہم اپنے ہی ہاتھ سے ختم کر دیں۔" امیر دھیرے سے بولا۔

"ہوں۔" رامو کو ایک جھٹکا لگا لیکن امیر کے اس مشورے میں بھی ہمدردی کی جھلک تھی یہ محسوس کر لینے کے بعد اُس کی نظریں جھک گئیں پھر وہ بولا۔ "یہ کام مجھ سے نہیں ہوگا۔ دوسروں کو اگر معلوم ہو گیا تو وہ مجھے مار ڈالیں گے۔"

"لیکن رامو یہ کام تو ہمیں اس کی بھلائی کے لیے ہی کرنا ہے۔" مگر پھر بھی رامو پر اُس کی بات کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ امیر کو یہ یقین ہو چکا تھا کہ اُس کے سوا یہ کام کوئی اور نہیں کرے گا۔ اِسی لیے ایک سرد آہ بھر کر اُس نے نیام میں سے اپنی تلوار باہر نکال لی پھر بہت بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"اگر ایسی بات ہے تو پھر یہ کام میرے ہی ہاتھوں سے ہوگا۔"

اچانک بوڑھے آنندی نے جھٹکے سے اپنی آنکھیں کھول دیں اور اپنے سامنے کھڑے ہوئے امیر کو دیکھنے لگا نقاہت کی وجہ سے اُسے آنکھیں کھولنے میں دشواری پیش آرہی تھی۔ آنندی نے ایک ہاتھ اُوپر اٹھا دیا اور امیر کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اُسے آخری سلام کر رہا ہے یا اُسے تلوار کا وار کرنے سے روک رہا ہے؟ امیر کو اس بات کا بھی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ اُس کے دیگر ساتھی اپنا کام ختم کر کے کسی بھی وقت وہاں آسکتے ہیں۔ اس خیال کے آتے ہی امیر ہونٹ بھینچ کر درخت کے تنے کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ پھر یکایک ہی اُس نے اپنی تلوار کو اپنے سر سے بلند کیا۔ اُس کی تلوار اُوپر اٹھی تو رامو نے فوراً ہی اپنا مُنہ اِس طرح دوسری جانب پھیر لیا جیسے اِس منظر کو دیکھنے کی اِس میں تاب ہی نہ ہو۔

آنندی کے ہونٹ پھڑکنے لگے، اپنے ہاتھ کو زخم پر سے ہٹا کر وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن امیر نے ہونٹ بھینچ کر تلوار کی نوک اُس کے زخم میں بھونک دی، آخری بار تڑپنے کے بعد آنندی کی گردن ایک جانب ڈھلک گئی اور تب رامو نے پلٹ کر امیر کی طرف دیکھا تو اُسے امیر کی آنکھوں میں آنسو چمکتے دکھائی دیئے۔

"رامو یہ بات تم کسی کو بھی مت بتانا۔" امیر بھرائی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔ "اس کے سوا ہمارے پاس کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔" اتنا کہہ کر اس نے اپنی تلوار کی نوک سے خون پونچھ کر اُسے دوبارہ نیام میں ڈال دیا۔

جبل پور کے ایک گاؤں گوپال پور میں انگریز سپاہیوں نے

بڑا ڈال رکھا تھا۔ "حضور ایک براہمن آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر کچھ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہے۔" ایک خدمت گار نے ادب سے جھک کر کہا لیکن اُس وقت ولیم سلومن کوئی کتاب پڑھنے میں مشغول تھا، خدمت گار تھوڑی دیر تک سر جھکائے کھڑا رہا، وہ اپنے صاحب کی عادت سے اچھی طرح واقف تھا، وہ اکثر سوچتا رہتا تھا کہ اُس کا گورا صاحب فرصت ملتے ہی کتاب پڑھنے کیوں بیٹھ جاتا ہے؟ دوسرے صاحب لوگ تو کلب میں چلے جاتے ہیں یا فرصت کے وقت وہ شکار کے لیے نکل جایا کرتے تھے اور کچھ صاحب لوگ تو گوری میموں کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے سیر سپاٹے میں مصروف ہو جاتے ہیں لیکن ولیم سلومن کو شاید ان چیزوں سے کوئی دلچسپی ہی نہیں تھی۔

"وہ کیا کہنا چاہتا ہے؟" تھوڑی دیر بعد ولیم سلومن نے کتاب کے درمیان انگلی رکھ کر کہا۔ "جاؤ اُسے اندر لے آؤ۔"

"بہت اچھا جناب۔" کہہ کر خدمت گار باہر چلا گیا وہ جانتا تھا کہ یہ گورا صاحب چاہے جیسے بھی کام میں مصروف کیوں نہ ہو اپنی رعایا کی فریاد سُننے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کرتا تھا۔

لکڑی کی کرسی پر پاؤں پھیلا کر بیٹھے ہوئے ولیم سلومن نے ایک بار پھر کتاب کھولنے کی کوشش کی، یہ ایک دلچسپ رومانی ناول تھا جس میں ایک شاعر عورت اپنے شوہر سے کہتی ہے "جنت کا تصور چاہے سچا ہو یا جھوٹا لیکن تمہارے ساتھ رہ کر مجھے جنت کا سکھ مل گیا ہے۔" کنوارے ولیم سلومن کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ سی دوڑ گئی اور اُس کی آنکھوں میں ایک چمک سی لہرانے لگی وہ سوچ رہا تھا کہ کیا واقعی کوئی عورت کسی مرد سے اتنی شدید محبت کر سکتی ہے؟

تھوڑی دیر بعد جب اُس کے خدمت گار کے پیچھے ایک براہمن بھی اندر داخل ہوتا دکھائی دیا تو اُس نے کتاب ایک طرف رکھ دی۔ بوڑھے براہمن نے اپنی درخواست خدمت گار کے ہاتھ میں دے دی۔ کاغذ ہاتھ میں لینے سے قبل گورے صاحب نے بوڑھے براہمن کو غور سے دیکھا تو اُس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ ضرور اِس بوڑھے پر کوئی مصیبت آپڑی ہے۔

لیکن وہ جیسے جیسے درخواست کو پڑھتا گیا ویسے ویسے اُس کے گورے چہرے پر سُرخی بڑھنے لگی درخواست میں لکھا تھا۔ محترم کمپنی سرکار کے محترم صاحب کی خدمت میں گزارش ہے کہ چونکہ میرے پتا جی اُمید سنگھ کا آج صبح سویرے انتقال ہو گیا ہے اور ہمارے براہمن خاندان کے رواج کے مطابق میری ماں میرے باپ کے ساتھ ہی ستی ہونا چاہتی ہے جب میرے باپ کا دم نکل چکا تھا تب میری ماں نے ویدوں کے مطابق تین بار "ست، ست، ست" کہہ کر اپنے شوہر کی لاش کے ساتھ ستی ہونے کا عہد کر لیا تھا، اِس لیے ہم اُسے ستی ہونے سے اب روک نہیں سکتے اسی لیے آپ جیسے بڑے افسر کی خدمت میں ہم اہل خاندان والے یہ درخواست کر رہے ہیں کہ آپ میری ماں کو اُس عہد کو پورا کرنے اور میرے باپ کی چتا کے ساتھ جل کر ستی ہونے کی اجازت دیں آپ کا نہ صرف مجھ پر بلکہ میرے خاندان پر بھی بڑا احسان ہوگا ہمیشہ اپنی رعایا کو مسکراتی نظروں سے دیکھنے والے ولیم سلومن کی آنکھوں میں اس درخواست کو پڑھتے ہی غصے کی سُرخی دوڑنے لگی پھر یکایک وہ چیخ کر بولا۔ "نہیں نہیں یہ کسی طرح بھی نہیں ہو سکتا۔" یوں لگ رہا تھا کہ زندہ آگ میں کود کر جل مرنے کے تصور سے ہی وہ کانپنے لگا ہو۔ "ارے بھلے لوگوں میں یہ تمھیں کیسے سمجھاؤں کہ یہ سب دھوکہ ہے، یہ مذہب کے نام پر ایک بھیانک فریب ہے، ایک جوان بیٹا اُٹھ کر اپنی ماں کے لیے یہ اجازت مانگنے آیا ہے کہ اُسے اُس کے شوہر کی لاش کے ساتھ زندہ آگ میں کود جانے کی اجازت دی جائے۔ چھی چھی تمھاری اِس بات سے تو خود مجھے شرم آنے لگی ہے۔"

اُس کی بات سُن کر درخواست گزار براہمن کی نگاہیں جھک گئیں اور وہ ڈرے ڈرے سے لہجے میں بولا۔ "سرکار آپ کا دیش بھیس اور مذہب ہم سے الگ ہے اِس لیے آپ کو صدمہ تو ہونا ہی چاہیے۔"

"مجھے یہ سب نہیں سُننا ہے۔" ولیم سلومن کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ "پندرہ سولہ سال سے میں تمھارے اس ملک میں رہ رہا ہوں اور تمھارے مذہب کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں، ہماری کمپنی سرکار تمھارے مذہب میں سر کھپانا نہیں چاہتی لیکن زندہ آگ میں جل مرنے کی بات کسی بھی مذہب میں ہو سکتی ہے یہ بات میں نہیں مان سکتا۔"

"حضور۔" براہمن ہاتھ جوڑ کر لاچار آواز میں کہہ رہا تھا۔ "اپنی ماں کو میں نے اور خاندان والوں نے بہت سمجھایا۔ ہم نے

اُسے یہ بھی بتایا کہ کمپنی سرکار نے اِس کے لیے سخت منع کیا ہے مگر وہ اپنے عہد سے ہٹنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ ہم تو دھرم کرم کے چکروں میں اِسی طرح اُلجھے ہوئے ہیں جناب۔"

ولیم سلومن اُس کی اِس بات پر پگھلنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ستی ہونے پر پابندی عائد کرنے پر انگریز سرکار بڑی مشکل سے تیار ہوئی تھی اور وہ خود بھی کافی عرصے سے اِس فرسودہ رواج کو ختم کرنے کی کوشش میں مصروف تھا، اس لیے وہ اُس شخص کو اِس بات کی اجازت کیسے دے سکتا تھا؟

"تمھیں اِس کے لیے ہرگز ہرگز اجازت نہیں ملے گی۔" ولیم سلومن اپنا فیصلہ سناتے ہوئے بولا۔ "اور یہ بات بھی یاد رکھنا کہ اگر مرنے والے کی چتا پر تمھاری ماں ستی ہو گئی تو سب قانون کی نظر میں مجرم سمجھے جاؤ گے۔"

یہ کہہ کر اُس نے اپنے خدمت گار کو حکم دیا۔ "جاؤ چار پانچ سپاہیوں کو بلا لاؤ میں اُنھیں نربدا ندی کی طرف روانہ کروں گا اور دیکھوں گا کہ اُمید سنگھ کی بیوہ اُس کی چتا پر کیسے ستی ہوتی ہے؟"

اُس کے یہ الفاظ سن کر براہمن کی ساری اُمیدیں ٹوٹ گئیں وہ ایک گہرا سانس لے کر وہاں سے چلا آیا۔ اُس کے جانے کے بعد ولیم سلومن غصے کی حالت میں اٹھ کر ٹہلنے لگا اُسے توقع تھی کہ اب اُمید سنگھ کی بیوہ اُس کے حکم کی خلاف ورزی کرنے کی ہمت نہیں کرے گی۔ اُس کے رشتے دار کسی نہ کسی طرح اُسے سمجھا لیں گے۔

**

نربدا ندی کے پانی پر چاندنی تیر رہی تھی اور اپنے شوہر کی چتا پر ستی ہو جانے کی خواہش مند ترسٹھ سالہ بڑھیا ابھی بھی اپنی ضد پر اڑی ہوئی تھی رشتہ داروں، گاؤں والوں اور خود اُس کے لڑکے نے بھی اُسے بہت سمجھایا پولیس کی موجودگی اور سرکار کا حکم اِس کے علاوہ گورے صاحب کی ناراضگی کی باتیں بھی اُسے بتائی گئیں لیکن براہمن بڑھیا اپنی ضد چھوڑنے کے لیے کسی طرح بھی تیار نہیں ہوئی۔ ولیم سلومن نے پولیس کے سپاہیوں کو خاص طور پر کہا تھا۔ "اُمید سنگھ کی چتا پر اگر اُس کی بیوہ ستی ہونے کی کوشش کرے تو اُس چتا کے لیے لکڑیاں لانے والے، چتا کو آگ لگانے والے اور اُس جگہ موجود رہنے والے ہر شخص کو قانون کی خلاف ورزی کے الزام میں گرفتار کر لیا جائے۔"

ساری رات صلاح مشورے کے بعد اُمید سنگھ کے رشتہ داروں نے یہ فیصلہ کیا کہ صبح ہوتے ہی اُمید سنگھ کی لاش کو آگ دکھا دی جائے گی اُس کے بعد جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ بھلا ندی کنارے ایک لاش کو کب تک سڑنے کے لیے چھوڑا جا سکتا تھا؟ اُمید سنگھ کی بیوہ نے بھی یہ بات مان لی اپنے شوہر کے مُردہ جسم کو وہ زیادہ دیر تک روک کر گناہ گار ہونا نہیں چاہتی تھی سب لوگوں کا خیال تھا کہ اُمید سنگھ کی چتا کے جل جانے کے بعد یہ بڑھیا خود بخود اپنی ضد چھوڑ دے گی اور گھر واپس چلی جائے گی۔

پھر جب اُمید سنگھ کی چتا جل کر راکھ ہو رہی تھی اُس وقت اُس کی بیوہ چتا پر سے اُٹھتے ہوئے لال پیلے آگ کے شعلوں کو پلکیں جھپکائے بغیر گھور رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں کے آنسو سوکھ چکے تھے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ خود بھی اپنے شوہر کی چتا کے ساتھ جل رہی ہو۔ وہ بے حس و حرکت ندی کے کنارے بیٹھی ہوئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے اُس میں حرکت کرنے کی سکت ہی نہ ہو۔

اُمید سنگھ کی آخری رسومات میں شرکت کرنے کے بعد گاؤں والے تو اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے لیکن اُمید سنگھ کے عزیز و اقارب تو اُس کی بیوہ کو گھیر کر بیٹھ گئے۔ شام کے بعد رات بھی گزر گئی اور پھر دوسرے دن کا سورج بھی طلوع ہو گیا لیکن پھر بھی بوڑھی براہمن بیوہ ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ اُسے جتنی بار پانی دیا گیا اتنی بار اُس نے پانی پینے سے انکار کر دیا، سوائے پان کے وہ کچھ مُنہ میں ڈالنے کے تیار ہی نہیں تھی وہ پورا دن اور پوری ایک رات سے اُسی جگہ بیٹھی تھی اور گھر جانے کی بات پر کان دھرنے کے لیے بھی تیار نہ تھی وہ تو اپنی ہی ضد پر اڑی ہوئی ایک ہی بات کہتی تھی۔ "میں بھوکی پیاسی اِسی جگہ مر جاؤں گی۔ بھگوان کے لیے تم لوگ مجھے چین سے مر جانے دو۔"

آس پاس کے گاؤں میں بھی اِس بوڑھی بیوہ کی بات پھیل چکی تھی اور لوگ دور دور سے اِس بڑھیا کو دیکھنے کے لیے نربدا ندی کے کنارے آ آ کر جمع ہونے لگے تھے۔ اپنے مُردہ شوہر کی چتا کے ساتھ عورتوں کے جل کر ستی ہونے کی بات کوئی نئی بات نہیں تھی، لوگ تو یہ جاننے کے لیے بے قرار تھے کہ سرکار کے منع کرنے کے باوجود یہ بڑھیا کیوں اپنی ضد پر اڑی ہوئی ہے؟

نربدا ندی سے دس میل کے فاصلے پر ولیم سلومن کی چھاؤنی تھی۔ وہاں بھی لوگ بہت بڑی تعداد میں یہ جاننے کے لیے جمع ہوئے تھے کہ دیکھیں سرکار اُس بڑھیا کے خلاف کیا قدم اٹھاتی ہے؟

بہت سے لوگ تو گورے صاحب ولیم سلومن کو یہ سمجھا رہے تھے کہ اگر اُمید سنگھ کی بڑھیا بیوہ اِسی طرح بھوکی پیاسی مر گئی تو ہم سب پر عورت کے قتل کا پاپ لگ جائے گا اِس لیے بہتر یہی ہے کہ اُسے ستی ہونے کی اجازت دے دی جائے تاکہ وہ بھوک پیاس کی تکلیف سے نجات حاصل کر سکے۔ مگر بہت سے لوگوں کا یہ خیال تھا کہ گورے صاحب کو اپنے فیصلے پر اٹل رہنا چاہیے۔ اُمید سنگھ کی چتا جل کر راکھ ہو چکی ہے اس لیے اُس کی بیوہ کو جل کر ستی ہونے کی اب ضرورت ہی کیا ہے؟ تین چار دنوں کے بعد وہ خود ہی سمجھ جائے گی اور اپنے گھر واپس آ جائے گی۔

لیکن چوتھے دن لوگوں کو یہ اطلاع ملی کہ اُس بیوہ بڑھیا نے اپنے سر پر کپڑا لپیٹ کر اپنی چوڑیاں توڑ دی ہیں۔ ولیم سلومن کو جب یہ اطلاع ملی تو اُس نے اطلاع دینے والے سے پوچھا "اِس کا مطلب کیا ہوا؟ کیا اُس نے ضد چھوڑ دی ہے؟"

"جی نہیں۔" اُس شخص نے اُسے اِس کا مطلب سمجھاتے ہوئے کہا۔ "بیوہ اپنے سر پر کپڑا لپیٹ لے تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ اُس نے کفن پہن لیا ہے۔ اِس طرح وہ اپنے خاندان اور سماج سے سارے رشتے توڑ لیتی ہے اور اب وہ کبھی بھی گھر واپس نہیں جائے گی اور ایسی حالت میں اُسے خاندان والے بھی گھر میں نہیں رکھے گیں۔"

یہ سن کر ولیم سلومن نے ایک گہرا سانس لیا وہ سمجھ چکا تھا کہ اُس بوڑھی بیوہ نے اپنے بیٹوں اور رشتہ داروں کے سمجھانے کے خلاف اپنا آخری ہتھیار استعمال کیا ہے۔ ہندو عورتوں کو اپنے مرحوم شوہروں کی چتا کے ساتھ جل کر ستی ہو جانا پڑتا ہے۔ بیوہ کی حیثیت سے وہ زندہ نہیں رہ سکتیں اُن کا دھرم اور اُن کا سماج انھیں ستی ہو جانے کا حکم دیتا ہے اس کے علاوہ عزیز و اقارب کا دباؤ بھی اُسے ستی ہونے کے لیے مجبور کر دیتا ہے یہ سب باتیں ولیم سلومن نے سن رکھی تھیں، لیکن اُمید سنگھ کی بوڑھی بیوہ تو اُسے کچھ مختلف ہی دکھائی دے رہی تھی۔ سرکار کے حکم اور رشتہ داروں کے سمجھانے کے باوجود وہ کئی دنوں سے ندی کے کنارے بیٹھی ہوئی ہے اور اب تو اپنے سر پر کفن باندھ کر وہ سب سے اپنا ناتا توڑ چکی ہے۔ ولیم سلومن نے دل ہی دل میں یہ فیصلہ کیا کہ وہ خود جا کر اُس ضدی عورت کو سمجھائے گا۔ پھر دیکھنا وہ کیسے نہیں مانتی یہ فیصلہ کرنے کے بعد اُس نے اپنے خدمت گار کو گھوڑا تیار کرنے کا حکم دیا اور اُس سے بولا "میں ابھی اور اِسی وقت نربدا ندی کے کنارے پہنچ جانا چاہتا ہوں۔"

★★

"سرکاری صاحب آ گئے" اور "گورے صاحب آ گئے" کی آوازوں نے لوگوں میں ایک ہلچل سی مچا دی۔ بیوہ عورت کے بیٹوں کو یہ سن کر دھڑکا لگا کہ اب کیا ہو گا؟ انھوں نے اپنی ماں کو صاحب کے آنے کے بارے میں بتایا لیکن اُس بیوہ عورت پر اِس بات کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ ولیم سلومن اپنے گھوڑے پر سے اتر کر سیدھا اُس عورت کی طرف آ گیا۔ اُس کی نظریں دور سے ہی اُس عورت کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اُس کے جسم پر ایک ساری لپٹی ہوئی تھی اور وہ سر پر سفید کپڑا باندھے بیٹھی ہوئی تھی اور اُس کا چہرہ بے حد سنجیدہ اور گمبھیر دکھائی دے رہا تھا۔ ولیم سلومن کا خیال تھا کہ اُسے دیکھتے ہی بڑھیا رونا دھونا شروع کر دے گی اور اُس کے عاجزی کرنے لگے گی لیکن اُس کا اندازہ غلط ثابت ہوا کیوں کہ بوڑھی بیوہ اُس کے قدموں کی آہٹ پا کر بھی اُسی طرح بے حس و حرکت بیٹھی رہی اُس نے تو گورے صاحب کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا جب ولیم سلومن کو اُس عورت کے چہرے پر اُس کی شخصیت کا کوئی خوف دکھائی نہیں دیا تو اُس نے ہچکچاہٹ سے کام نکالنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

"بیٹھیے نا صاحب۔" کہہ کر کسی نے پتھر کی ایک سِل وہاں لا کر رکھ دی کچھ لوگ لکڑی کا ایک بڑا سا تختہ اس خیال سے اٹھا لائے تھے کہ گورا صاحب زمین پر کس طرح بیٹھ سکے گا مگر اس سے پہلے کہ وہ لوگ ولیم سلومن سے کچھ کہتے وہ اپنے جوتے اُتار کر اُس بیوہ عورت کے قریب زمین پر بیٹھ چکا تھا۔

"مجھے تم سے دو چار باتیں کرنا ہیں۔" ہندوستانی زبان میں جب اُس نے عورت سے کہا تو اُس عورت نے اپنی جھکی ہوئی گردن کو ذرا سا اُوپر اٹھایا اور دھیمی آواز میں بولی "کہیے میں

سرکاری صاحب کی ہر بات سننے کے لیے تیار ہوں۔" اُس کا پُراعتماد لہجہ اور کھنک دار آواز سن کر ولیم سلومن دنگ رہ گیا وہ حیران تھا کہ چار پانچ دنوں سے اِس دھوپ میں بھوکی پیاسی بیٹھی ہوئی اِس عورت کی آواز اب تک اتنی صاف کیسے ہے؟ اُس نے اِدھر اُدھر نظریں ڈال کر اپنے آس پاس کھڑے ہوئے لوگوں سے کہا۔ "آپ لوگ ذرا پیچھے ہٹ جائیں۔"

گورے صاحب کا یہ حکم سنتے ہی پل بھر میں وہ سب لوگ دور جا کھڑے ہوئے اس کے بعد ولیم سلومن نے بوڑھی عورت کی طرف دیکھا۔ اُس نے پہلے تو سخت لہجے میں بات کرنے کے متعلق سوچا لیکن یہ اُسے مناسب نہیں معلوم ہوا۔ اپنی رعایا سے سخت لہجے میں باتیں کرنا اُسے کبھی بھی پسند نہیں تھا اس لیے اُس کی آواز میں آپ ہی آپ نرمی آ گئی۔ "اُمید سنگھ اُپادھیا کی بیوی بھلا تم کب تک یونہی بھوکی پیاسی بیٹھی رہو گی؟"

"جب تک آپ مجھے ستی ہونے کی اجازت نہیں دیں گے اُس وقت تک میں یونہی بیٹھی رہوں گی۔" اتنا کہہ کر وہ ایک پل کے لیے رکی پھر آسمان پر چڑھتے ہوئے سورج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "میری رُوح تو پانچ دن ہوئے میرے شوہر کے ساتھ وہاں پہنچ چکی ہے صرف یہ کھوکھلا جسم ہی یہاں رہ گیا ہے جسے چتا میں جل جانے کے سوا کوئی اور کام نہیں ہے۔"

بوڑھی بیوہ نے یہ اندازہ لگا لیا کہ گورا صاحب اس کی باتیں اطمینان سے سن رہا ہے تو اُس کی آواز پہلے سے زیادہ پُراعتماد ہو گئی۔

"مجھے یقین ہے آپ جیسا رحم دل شخص میری اس تکلیف میں مزید اضافہ نہیں کرے گا۔ آپ کی اجازت ملتے ہی میرا یہ کھوکھلا جسم جل کر اپنی آخری منزل پر پہنچ جائے گا۔"

"نہیں۔" ولیم سلومن بولا۔ "میری رحم دلی کا تقاضہ تو یہ ہے کہ تم کو زندہ رکھا جائے۔ تم گھر واپس جا کر اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کے ساتھ سکھ چین سے اپنی زندگی بسر کرو، یہی میری خواہش ہے۔ میں تمھیں جل مرنے کی اجازت کیسے دے سکتا ہوں؟ اور اگر ضد میں آ کر تم بھوکی پیاسی اِسی جگہ جان دے دو گی تو یہ ان لوگوں بدنامی کا سبب بنے گی۔"

ولیم سلومن کی بات کو دھیان سے سننے کے بعد بوڑھی بیوہ عورت نے ایک گہرا سانس لیا اور بولی "مجھے اب اِس بدنامی کا خیال کرنے کی ضرورت نہیں ہے صاحب حضور میں نے اپنے سر پر کفن باندھ لیا ہے۔ چوڑیاں توڑ ڈالی ہیں اِس لیے گھر سے اب میرا کوئی تعلق نہیں رہا۔ سارے رشتے ٹوٹ چکے ہیں مجھ پر اب کوئی ذمے داری عائد نہیں ہوتی۔" وہ سانس لینے کے لیے ایک پل رکی پھر آگے بولی "اِن سب لوگوں نے تو مجھے بہت سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ ان لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ میں اگر گھر واپس چل چلوں تو یہ لوگ مجھے سُکھ شانتی سے زندہ رہنے دیں گے۔ مجھ ان باتوں پر یقین ہے لیکن اس کے باوجود مجھ سے یہ نہیں ہو گا۔ میں تو اپنے شوہر اُمید سنگھ اُپادھیا کی خدمت کرنے کے لیے اُس کے پاس جانا چاہتی ہوں یہی میرا سچا کرم اور دھرم ہے۔"

"اُمید سنگھ اُپادھیا۔" ولیم سلومن یہ نام سن کر چونک پڑا کیوں کہ آج سے پہلے اُس نے کبھی کسی ہندو عورت کو اپنے شوہر کا نام لیتے نہیں سنا تھا جب بھی کسی ہندو عورت سے اس کے شوہر کا نام پوچھا جاتا تھا تو وہ اپنے آس پاس کھڑے ہوئے لوگوں کو اشارے سے کہتی کہ وہ اس کے شوہر کا نام بتا دیں ہندو عورتیں جب کبھی کورٹ کچہری میں جاتیں تو کسی نہ کسی کو ضرور اپنے ساتھ لے جاتی تھیں تاکہ انھیں اپنے شوہر کا نام نہ لینا پڑے۔ تو پھر ستی ہو جانے کی خواہش مند یہ بوڑھی عورت کسی ہچکچاہٹ کے بغیر اپنے شوہر کا نام اُسے کیسے بتا گئی؟ ولیم سلومن نے اپنے اِس تجسس کو اپنے دل میں ہی دبا کر آگے کہا۔ "تم تو جانتی ہی ہو بہن کہ سرکار نے تمھاری زمین کا محصول معاف کر رکھا ہے اور اگر تم نے سرکار کا حکم نہ مانا تو محصول کی معافی کا حکم رد کر دیا جائے گا اور تمھاری اِس غلطی کا خمیازہ تمھارے لڑکوں کو بھگتنا پڑے گا۔"

یہ سن کر بوڑھی بیوہ کسی سوچ میں پڑ گئی تب ولیم سلومن کو لگا کہ اُس کے سمجھانے کا کچھ نہ کچھ اثر تو ہونے ہی لگا ہے "اور دوسری بات" اُس نے اپنی آواز میں ذرا سختی پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "ضد ہی ضد میں اگر تم مر بھی گئیں تو بھی میں تمھاری سمادھی بنانے کی اجازت نہیں دوں گا۔ کیوں کہ سرکار کا یہی حکم ہے۔" اتنا کہہ کر وہ ایک بار پھر نرم لہجے میں بولا۔ "بہتر تو یہ ہے کہ تم جل کر مر جانے کی ضد چھوڑ دو گھر جا کر رہو گی تو تمھاری زمین کی محصول کی معافی برقرار رہے گی اور میں تمھیں اِس کا بھی یقین دلاتا ہوں کہ تمھارے سماج کی طرف سے کوئی تم پر انگلی نہیں اٹھائے گا۔ میں تمھاری خبر گیری کے لیے کبھی کبھی تمھارے گھر آتا رہوں گا۔"

"یہ سب تو ٹھیک ہے حضور۔" بوڑھی بیوہ اس طرح بولنے لگی۔ جیسے اُس نے جواب پہلے ہی سے سوچ رکھا ہو "میں نے آپ سے کہا نا کہ میرے کھوکھلے جسم میں اب زندگی کے آثار نہیں ہیں۔ آپ میرے ہاتھ کو چھو کر دیکھیں میرا جسم تو لکڑی کی طرح سخت ہو گیا ہے۔" اتنا کہہ کر اُس نے ولیم سلومن کی طرف اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ ولیم سلومن حیرت سے اُس کے سُوکھے ہوئے ہاتھ میں دیکھتا رہا لیکن اُسے چھونے کی اُس نے ہمت نہیں کی۔ وہ تو اِسی بات پر حیران ہو رہا تھا کہ ایک ہندو عورت ایک غیر مذہب کے آدمی کے سامنے اپنا ہاتھ بڑھا کر یہ کہہ رہی ہے کہ اِسے چھو کر دیکھو۔

بوڑھی بیوہ اُس کی اُلجھن کو تاڑ گئی اُس نے فوراً ہی ایک آدمی کو اشارے سے اپنے پاس بلایا اور اپنا ہاتھ اُس کی طرف بڑھا کر اپنی نبض دیکھنے کے لیے کہا۔ ولیم سلومن کو یہ سب بڑا عجیب لگ رہا تھا لیکن پھر بھی اُس نے اُس شخص کو ایسا کرنے سے نہیں روکا، جب اُس شخص نے بیوہ کی کلائی پر انگلیاں رکھ کر نبض دیکھنے کی کوشش کی تو ولیم سلومن کو ہنسی آگئی اُسے یقین تھا کہ آدمی جب تک زندہ رہتا ہے اُس کی نبض چلتی رہتی ہے۔ یکایک نبض دیکھنے والے شخص کی آنکھیں دھیرے دھیرے پھیلتی چلی گئیں اور وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولا "صاحب واقعی نبض نہیں چل رہی ہے۔"

لیکن ولیم سلومن جیسا آدمی یہ بات کیسے مان لیتا؟ اُس نے ہنس کر بات ٹالنے کی کوشش کی تو اُس بیوہ عورت نے ایک اور عجیب بات کہہ کر اُسے چونکا دیا۔ "صاحب اگر آپ کو یقین نہ آیا ہو تو ایک جلتی ہوئی لکڑی میرے ہاتھ پر رکھ دیں میرے مُنہ سے ایک سسکاری بھی نہیں نکلے گی کیوں کہ مجھے کچھ احساس ہی نہیں ہوگا۔" جب وہ یہ بات کہہ رہی تھی تو اُس کی آنکھوں میں ولیم سلومن کو بڑی عجیب سی چمک دکھائی دی تھی۔ اُسے اب یقین ہونے لگا تھا کہ یہ عورت جو کچھ کہہ رہی ہے وہ پورے یقین اور بھروسے سے کہہ رہی ہے اور ہر آزمائش کے لیے تیار ہے۔

"اب کیا حکم ہے؟" بوڑھی بیوہ نے پوچھا۔

ولیم سلومن سخت اُلجھن میں تھا۔ اس کے سامنے اپنے حکم کی پاس داری کا بھی سوال تھا اور اگر یہ عورت بھوکی پیاسی اِسی جگہ بیٹھے بیٹھے مر گئی تو بھی مصیبت کھڑی ہو سکتی ہے۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جس عورت نے اپنے گھر سے رشتہ توڑ لیا ہے اور جو اپنے سماج میں کسی بھی قیمت پر واپس جانے کے لیے تیار نہیں ہے جو صرف اپنے شوہر کے پیچھے خود کو بھی موت کے حوالے کر دینے کا عہد کیے بیٹھی ہے ایسی عورت کو وہ بھلا کس طرح روک سکتا ہے؟ کیا ایک عورت پر وہ زبردستی کر سکتا ہے؟

وہ تقریباً پون گھنٹے تک نربدا ندی کے کنارے ٹہلتا رہا کوئی راستہ سمجھائی نہیں دے رہا تھا۔ ضدی کے سامنے ضدی بن جانے سے کوئی فائدہ نہیں تھا تو کیا اُسے ستی ہونے کے لیے اجازت دے دینی چاہیے؟ سوچتے سوچتے جب وہ تھک گیا تو کسی شکست خوردہ سپاہی کی طرح تھکے تھکے قدموں سے اُمید سنگھ کی بیوہ کے پاس واپس آگیا۔ ایک نظر اُس بوڑھی بیوہ پر ڈالنے کے بعد اُس نے اپنی گردن جھکا لی اور ٹھہری ہوئی آواز میں بولا "میں اپنا حکم واپس لے رہا ہوں۔ اب تم جو چاہو میں آسانی کر سکتی ہو۔"

اُس کی یہ بات سن کر سب ایک دوسرے کا مُنہ تکنے لگے انھیں یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ ولیم سلومن صاحب ہی یہ بات کہہ رہا ہے۔ وہ سب اب تک یہی دیکھتے آ رہے تھے کہ ولیم سلومن نے آج تک کبھی اپنا حکم واپس نہیں لیا تھا لیکن آج یہ یکایک۔

"حضور کی بڑی مہربانی۔" بوڑھی بیوہ نے ولیم سلومن کی طرف دیکھا۔

"لیکن میری ایک شرط ہے۔" ولیم سلومن اُس کے رشتہ داروں اور عزیزوں کی طرف تکتے ہوئے بولا "تمھارے خاندان میں ستی ہونے کا یہ واقعہ آخری واقعہ ہونا چاہیے تمھیں یہ لکھ کر دینا ہوگا کہ تمھارے گھر کی کوئی عورت اپنے شوہر کی موت کے بعد ستی ہونے کی ضد نہیں کرے گی۔"

"اچھا حضور۔" بھرائی ہوئی آواز میں جواب دے کر بیوہ کے بڑے لڑکے نے ولیم سلومن کی شرط مان لی "اب آئندہ ہمارے خاندان کی کوئی بھی عورت اپنے شوہر کی موت کے بعد ستی نہیں ہوگی۔" یہ کہتے وقت اُس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے تھے۔

**

دو پہر تک چتا تیار ہو گئی اور بیوہ نے نربدا ندی میں غسل بھی کر لیا اور گیلے کپڑوں سمیت کنارے پر آ کر بیٹھ گئی اس نے

اپنے لیے پان منگوایا اور پان کھانے کے بعد اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ولیم سلومن حیرت بھری نظروں سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا اُس کا خیال تھا کہ یہ عورت جلتی ہوئی چتا کے قریب جا کر اپنی ہمت توڑ بیٹھے گی اور واپس آ جائے گی اور اس طرح اُس کی جیت ہو جائے گی۔

لوگ جوق در جوق جمع ہونے لگے، ڈھول بجنے لگے اور ستی ہونے والی بیوہ عورت ایک ہاتھ اپنے بیٹے کے کندھے پر اور دوسرا ہاتھ اپنے بھتیجے کے کندھے پر رکھ کر جلتی ہوئی چتا کی جانب پُراعتماد انداز میں آگے بڑھ رہی تھی ساری آنکھیں بھڑکتی ہوئی چتا پر لگی ہوئی تھیں۔ پھر جب دس بارہ قدموں کا فاصلہ رہ گیا تو بوڑھی بیوہ نے اپنے بیٹے اور بھتیجے کے کندھوں پر سے اپنے ہاتھ ہٹا لیے۔ کیوں کہ سلومن صاحب کا حکم تھا کہ جلتی ہوئی چتا پر چڑھنے کے لیے اُسے کوئی سہارا نہیں دے گا اس لیے اُس کا لڑکا اور بھتیجا دونوں ہی واپس آ گئے۔ آگ کی تپش سے اُن کے چہرے بھی سُرخ ہو رہے تھے۔ ولیم سلومن ایک جانب کھڑا بڑے غور سے اُس بیوہ عورت کی ایک ایک حرکت کو دیکھ رہا تھا۔ اُس کا خیال تھا بوڑھی عورت ابھی چیخ مار کر واپس آ جائے گی اور خوف زدہ ہو کر گھر جانے کے لیے رضامند ہو جائے گی، لیکن یہ کیا؟ ایک بار بھی پیچھے پلٹ کر دیکھے بغیر وہ جلتی ہوئی چتا کے قریب پہنچ گئی اور پلک جھپکتے ہی جلتی ہوئی لکڑیوں پر چڑھ کر چتا کے اُوپر بیٹھ گئی اُس کے چہرے پر اتنا سکون تھا کہ جیسے وہ جلتی ہوئی آگ پر نہیں بلکہ پھولوں کی سیج پر بیٹھی ہو۔ تھوڑی ہی دیر میں آگ کے شعلوں نے اُس عورت کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور اِس طرح اُمید سنگھ کی بیوہ نے اپنا عہد پورا کر لیا۔

ولیم سلومن پھٹی پھٹی آنکھوں سے لال پیلے ہوتے ہوئے شعلوں کو دیکھتا رہا نہ تو اُس نے کوئی چیخ سنی تھی اور نہ ہی اُس پاس کھڑے ہوئے لوگوں میں ہی اُسے گھبراہٹ کے کوئی آثار دکھائی دیتے تھے۔ تھوڑی دیر بعد بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلے دھیمے پڑنے لگے اور ولیم سلومن یہ سوچ رہا تھا کہ جو کچھ اُس نے دیکھا ہے وہ خواب تھا یا حقیقت؟

دھرم کے نام پر ایک طرف تو عورت اپنے شوہر پر اپنی جان نچھاور کر دیتی ہے جب کہ دوسری طرف دھرم کے نام پر ہی ٹھگ لوگ ہزاروں بے گناہ مسافروں کو موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ آخر ان سب کا خاتمہ کب ہوگا؟ کون روکے گا اِس اندھیر کو؟ کیا میں اِس دیس کی بھلائی کے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتا؟ ولیم سلومن حیران حیران نگاہوں سے ٹھنڈی ہوتی ہوئی چتا کو دیکھتا رہا۔

**

"عظیمہ تم کہاں ہو؟" امیر آنگن میں داخل ہوتے ہی گھوڑے پر سے اتر گیا اور تیز تیز قدموں سے دروازے کی جانب لپکا، بیوی سے ملنے کی اُسے اتنی بے قراری تھی کہ اُس نے اپنے نوکروں تک کی طرف بھی نہیں دیکھا اُسے نیچے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ عظیمہ حویلی کے اُوپری حصے میں ہے۔ اس لیے وہ جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھ گیا۔ پہلا کمرا خالی تھا، دوسرے کمرے میں بھی کوئی نہیں تھا لیکن تیسرے کمرے میں اُسے اپنی بچی کا پالنا دکھائی دیا وہیں عظیمہ بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ دور سے جب دونوں کی نگاہیں ملیں تو امیر کو لگا کہ وہ ابھی اپنی جگہ سے اٹھ کر دوڑتی ہوئی اُس کے پاس آ جائے گی لیکن عظیمہ نہ صرف اپنی جگہ پر بیٹھی رہی بلکہ اُس نے اُس کی جانب سے اپنا مُنہ بھی پھیر لیا۔ یہ دیکھ کر امیر نے ایک جھٹکا سا محسوس کیا۔ "میں کب سے آوازیں دے رہا ہوں لیکن تم کہتی بھی نہیں کہ میں یہاں بیٹھی ہوں؟"

اُسے اپنے اِس سوال کا کوئی جواب نہیں ملا تو وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھا اور پالنے کے قریب آ کر اُس نے گہری نیند میں سوئی ہوئی اپنی بچی کے سر پر ہاتھ پھیرا پھر جھک کر اُس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور ہونٹوں ہی ہونٹوں میں بڑبڑایا "تم اگر جاگتی ہوتیں تو میں تمھیں سینے سے لگا لیتا۔" اتنا کہہ کر اُس نے عظیمہ کی جانب دیکھا اور مسکرا کر بولا "تمھاری اماں نے تو مجھے اندر آنے کے لیے بھی نہیں کہا۔"

اس طنز کا بھی جب عظیمہ پر کوئی اثر نہیں ہوا تو اُس نے مُٹھی میں دبائی ہوئی تعویذ کے دھاگوں کے دونوں سرے تھام لیے اور عظیمہ کے پیچھے جا کھڑا ہوا اور بولا "اب ذرا اپنی آنکھیں بند کر لو۔" کہہ کر اس نے عظیمہ کی گردن میں تعویذ ڈال دیا۔ اچانک ہی عظیمہ کی نظر تعویذ پر پڑی تو اُس نے ایک جھٹکے سے اپنی گردن اٹھائی جیسے وہ پوچھ رہی ہو "یہ کیا لے آئے؟"

لیکن عظیمہ کا غصہ زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکا امیر کی پیار بھری نظروں میں اُس کا غصہ پگھل گیا اور آپ ہی آپ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ناچنے لگی۔

"دیکھ لیا نا۔ گردن میں پڑتے ہی اُس کا اثر ظاہر ہونے لگا ہے۔" امیر نے عظیمہ کے سامنے اگر اُس کے سینے پر لٹکتے ہوئے تعویذ کو ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ "دیکھنے میں تو یہ بہت ہی معمولی ہے لیکن بے حد کرامتی ہے اس کے پہننے والے کی ہر مُراد پوری ہو جاتی ہے۔"

عظیمہ گھور گھور کر اس تعویذ کو دیکھ رہی تھی۔ امیر نے جب اپنا دوسرا ہاتھ اُس کے شانے پر رکھا تو وہ چونک کر صرف اتنا ہی بولی "میری تو صرف ایک ہی مُراد ہے۔ وہ اگر پوری ہو گئی تو مجھے کچھ اور نہیں چاہیے۔"

یہ سن کر امیر نے دونوں ہاتھوں میں اُس کا چہرہ لے لیا اور جذباتی لہجے میں بولا "میں جانتا ہوں تمھاری کیا مُراد ہے۔ تم اس تعویذ کو پہنے رہو گی تو تمھاری گود میں بیٹا بھی کھیلنے لگے گا۔"

لیکن عظیمہ کے چہرے پر خوشی کا کوئی تاثر دکھائی نہیں دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ انتہائی سرد لہجے میں بولی "بیٹے کی اُمید تو میں نے چھوڑ دی ہے۔"

اُس کی کانپتی ہوئی آواز سن کر امیر چونک پڑا "عظیمہ یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

یکایک اُس نے دیکھا کہ عظیمہ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ چکی ہیں تو اُس نے بہت ہی جوشیلے انداز میں اُس کا چہرہ اپنے سینے میں دبوچ لیا۔ عظیمہ سسک سسک کر رو رہی تھی۔

"تمھیں میری قسم ہے عظیمہ مجھے بتا دو تمھاری کیا تمنا ہے؟ خدا کی قسم میں اُسے پورا کیے بغیر نہیں رہوں گا۔"

اچانک عظیمہ نے ایک جھٹکے سے اپنا چہرہ اُوپر اٹھایا تو امیر بڑی محبت سے اُس کے آنسو پونچھنے لگا اور عظیمہ کانپتے ہونٹوں سے کہنے لگی۔

"پہلے تم یہ وعدہ کرو کہ مجھے تنہا چھوڑ کر کبھی بھی سفر پر نہیں جاؤ گے۔"

"ارے پگلی۔" امیر ہنس پڑا "اتنی معمولی بات پر تم آنسو بہانے لگی ہو میں تو گھبرا گیا تھا۔"

"تمھیں یہ معمولی بات لگتی ہے؟"

"کیوں کیا لوگ کاروبار کے سلسلے میں شہر سے باہر نہیں جاتے ہیں؟ کیا سب لوگ سال بھر تک گھر میں ہی بیٹھے رہتے ہیں؟"

"میر۔ تمھارا ایسا کون سا کاروبار ہے؟" عظیمہ جوش میں بول پڑی۔

"تم کبھی خرید کر کوئی مال سامان تو نہیں لاتے اور یہاں کوئی دکان بھی نہیں ہے تو پھر..." عظیمہ کہتے کہتے رک گئی۔ چونک پڑا اُسے یوں لگنے لگا کہ شائد عظیمہ کو اُس کی اصلیت کا علم ہو گیا ہے۔ تو کیا اِسے معلوم ہو گیا ہے کہ وہ ایک ٹھگ ہے لیکن یہ بات اِسے کس نے بتائی ہے؟ یکایک اُس کے ذہن میں ایک دھماکہ ہوا... افلاطون۔

افلاطون سفر کے دوران اس سے جھگڑ کر گھر واپس چلا گیا تھا لیکن اِس وقت وہ کہاں ہے اِس کا تو اُسے ابھی تک خیال ہی نہیں آیا تھا۔

"تم کیا سوچنے لگے ہو؟" عظیمہ نے گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا "یکایک تمھارے چہرے کا رنگ کیوں بدل گیا ہے؟"

امیر نے اپنی آستین سے اپنے چہرے کا پسینا پونچھ لیا اور کمرے میں چاروں طرف نظریں ڈالنے کے بعد پوچھ بیٹھا "میں تو بالکل ہی بھول گیا۔ افلاطون اور نور کہاں ہیں؟"

یہ سُن کر عظیمہ کا چہرہ لٹک گیا جواب دینے کی بجائے اُس نے گردن جھکا لی اُس کی یہ حالت دیکھ کر امیر کو لگا ضرور کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی ہے۔

"بتاؤ عظیمہ۔" وہ بے قرار لہجے میں بولا "تمھاری خاموشی مجھے اور زیادہ اُلجھن میں مبتلا کر رہی ہے۔" یہ کہہ کر اُس نے عظیمہ کو کندھے سے پکڑ کر جھنجھوڑ دیا اور آگے بولا "افلاطون سفر پر سے بخیریت واپس تو آ گیا تھا نا؟"

"ہاں۔" عظیمہ صرف اتنا ہی بول سکی۔

"تو وہ اور نور گھر میں کیوں دکھائی نہیں دیتے؟" امیر کی آواز لمحہ بہ لمحہ اُونچی ہوتی جا رہی تھی "کہاں گئے وہ لوگ؟"

"چلے گئے۔" عظیمہ کی آواز کانپ رہی تھی۔

"چلے گئے؟" امیر ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "کہاں؟ کس لیے چلے گئے؟ کیا تمھارے ساتھ نور کا جھگڑا ہوا تھا؟" امیر کی آواز پہلے سے زیادہ بلند ہو گئی تھی یہ دیکھ کر عظیمہ نے اپنے ناک پر انگلی رکھ کر دھیمی آواز میں اُس سے کہا "آہستہ بولو شور کرو گے تو بچی جاگ جائے گی اور نور کو بھی ہماری باتیں سنائی دیں گی۔ ذرا صبر سے کام لو میں تمھیں ساری بات بتاتی ہوں۔"

اپنے جذبات کو قابو میں رکھنے کے لیے امیر اپنے کمرے میں اِدھر سے اُدھر ٹہلنے لگا اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اُس کا جگری دوست افلاطون گھر چھوڑ کر کہیں جا بھی سکتا ہے۔ سفر میں تمھارا افلاطون بھائی سے کوئی جھگڑا ہوا تھا؟ یکایک عظیمہ نے پوچھا۔

"جھگڑا؟" امیر بُری طرح بوکھلا گیا اُسے لگا کہ کیا افلاطون نے ساری باتیں عظیمہ کو بتا دی ہیں؟ لیکن نہیں ایسا نہیں ہو سکتا کیوں کہ افلاطون نے اُس سے رخصت ہوتے وقت یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کی اصلیت کسی پر ظاہر نہیں کرے گا۔ اس بات کا خیال آتے ہی امیر نے ذرا سکون سا محسوس کیا اور وہ سوچنے لگا کہ تھوڑا سا سچ اور جھوٹ بول کر وہ عظیمہ کے سوال و جواب کا رُخ ٹال سکتا ہے۔ "جھگڑا تو گھر واپسی کے سوال پر ہوا تھا۔" امیر اپنے دل کی دھڑکن کو قابو میں رکھ کر دھیرے سے بولا "وہ سفر سے جلد ہی اُکتا گیا تھا اور واپس چلنے کی ضد کر رہا تھا مگر میں نے انکار کر دیا جس پر وہ ناراض ہو کر واپس آ گیا بس اتنی ہی سی تو بات تھی۔"

"بس اتنی ہی سی بات تھی۔" عظیمہ اُس کے آخری جملے کو دہراتی ہوئی بولی "مگر میں کیسے مان لوں کہ صرف اتنی سی بات پر برسوں کا پُرانا دوست ناراض ہو کر جُدا ہو سکتا ہے؟ افلاطون بھائی کی طرح تم بھی سچی بات مجھ سے چھپا رہے ہو۔"

"سچی بات!" امیر چونک پڑا "سچی بات اور کیا ہو سکتی ہے؟ تم تو میرے گلے ہی پڑ گئی ہو۔" امیر ذرا ناراض لہجے میں بولا۔ "یہ کیوں نہیں کہتی کہ نور کے ساتھ تمھارا نبھاہ نہیں ہوا اور اسی لیے افلاطون مجھ سے جُدا ہو گیا۔" اتنا کہہ کر وہ بات بدلنے کی غرض سے بولا "کہاں رہنے چلے گئے وہ؟"

"معلوم نہیں۔"

"کیا؟" امیر نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"وہ لوگ صرف یہ گھر ہی نہیں بلکہ یہ گاؤں بھی چھوڑ گئے ہیں۔" عظیمہ نے بتایا۔

"گاؤں بھی چھوڑ گئے؟" امیر کو اس خبر سے اور بھی صدمہ ہوا "لیکن کیوں؟"

"کہتا تھا کہ ایک ہی گاؤں میں امیر سے الگ رہوں گا تو لوگوں کو باتیں کرنے کا موقع مل جائے گا۔" عظیمہ بھرائی ہوئی آواز میں کہہ رہی تھی "میں نے جب پوچھا کہ کہاں جاؤ گے کس کے پاس رہو گے؟ تو افلاطون بھائی نے جواب دیا کہ اس کا تو خود مجھے بھی علم نہیں ہے کہ میں کہاں جاؤں گا؟ تقدیر میں کیا لکھا ہے اِس کی کسی کو کیا خبر؟"

"تقدیر کا بچہ۔" امیر دانت پیس کر بولا "وہ اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے؟ وہ میرے آنے کا انتظار بھی نہ کر سکا؟" محبت اور غصّے کے جوش میں امیر بہت دیر تک کمرے میں ٹہلتا رہا اور سوچتا رہا کہ اب اُس کا پتا کیسے معلوم کیا جائے؟ اُس نے عظیمہ کو اُس کی اصلیت نہیں بتائی یہ تو اچھا ہی ہوا لیکن اس طرح گھر سے چلے جانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ اس نے اگر کہا ہوتا تو وہ ٹھگی کا یہ دھندہ ہی چھوڑ دیتا مگر وہ اُسے چھوڑ کر کیوں چلا گیا؟ زندگی بھر ساتھ رہنے کا وعدہ کیا وہ بھول گیا؟

"میں یہ بتانا تو بھول ہی گئی۔" عظیمہ اس طرح بولی جیسے اچانک ہی اُسے کوئی بات یاد آ گئی ہو "جاتے جاتے وہ مجھے نصیحت کرتا گیا ہے۔"

"کیا؟"

"یہی کہ اب آئندہ میں تمھیں سفر پر نہ جانے دوں اور نہ ہی یہ دھندہ کرنے دوں۔" عظیمہ چُپ ہو کر اُس کی جانب دیکھنے لگی۔

"کون سا دھندہ؟" امیر پلک جھپکائے بغیر عظیمہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"جس کے لیے تم سفر پر جایا کرتے ہو وہی دھندہ۔" عظیمہ نے کسی تاخیر کے بغیر جواب دیا تو امیر کو ہنسی میں بات ٹالنے کی کوشش کرنا پڑی۔ اگر اُس کو میری اتنی ہی فکر تھی تو مجھے نصیحت کرنے کے لیے خود کیوں نہیں یہاں ٹھہرا؟"

"شاید اُسے اِس بات کا ڈر تھا کہ تم اُسے جانے نہیں دو گے۔"

"ٹھیک ہے۔" امیر اس طرح بولا جیسے خود کو تسلی دینے کی کوشش کر رہا ہو۔

"اُس کے بغیر میرا کوئی کام نہیں رکے گا۔ دو دن کے دھکے کھائے گا تو اُسے احساس ہو گا کہ امیر جیسا دوسرا کوئی دوست اُسے مل نہیں سکتا۔"

اِس طرح یہ بات یہیں اٹک گئی امیر نے عظیمہ کے سامنے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی کہ اُسے افلاطون اور اُس کی بیوی کے چلے جانے کا کوئی دُکھ نہیں ہوا ہے اُس کے دن اپنی

بچی اور بیوی کی صحبت میں گزرنے لگے۔ اُس نے دل ہی دل میں یہ عہد کر لیا تھا کہ وہ اب کبھی بھی سفر پر نہیں جائے گا اور اس دھندے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دے گا، خدا نے جو کچھ اُسے دے دیا ہے اُسی کے سہارے اپنی زندگی کے دن گزارے گا اور اگر تعویذ کی برکت سے بیٹا پیدا ہو گیا تو اُسے دیکھ دیکھ کر بقیہ زندگی بھی عیش و آرام سے گزر جائے گی۔

دن گزرنے کے ساتھ ساتھ امیر کا یہ ارادہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا گیا اور پھر دونوں میاں بیوی نے یہ سمجھ لیا کہ اب اُن کی زندگی میں کبھی کوئی دُکھ کی لہر نہیں اُٹھے گی... زندگی ہنسی خوشی گزرتی رہے گی۔

**

ولیم سلومن کے سُکھ دُکھ کا فلسفہ دوسروں سے بالکل مختلف تھا اکیس سال کی عمر میں ۱۸۰۹ء میں وہ کلکتہ کی بندرگاہ پر آیا تو اُس کا دل خوشی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ اس خیال سے بھی خوش تھا کہ اتنے بڑے ملک میں انگریزوں کا کنٹرول ہے اسی لیے وہ اُس کی فوج میں بھرتی ہو کر ضرور کچھ نہ کچھ کر سکتا ہے لیکن بنگال رجمنٹ میں بھرتی ہو کر اُسے محسوس ہوا کہ ہندوستان کی دھرتی پر آنے والا ہر انگریز ہندوستان کے عوام کو لُوٹنے کے لیے آیا ہے، وہ رعایا کے سُکھ دُکھ کی پرواہ کیے بغیر عیش و عشرت میں مصروف تھے۔ اُنھیں ہندوستان پر حکومت کرتے دیکھ کر نوجوان ولیم سلومن بے چین ہو جاتا تھا اور وہ اکثر سوچتا رہتا کہ کیا وہ خود اپنے انگریز بھائیوں کی طرح بن جائے یا یہاں سے واپس چلا جائے؟

لیکن وہ واپس کس طرح جا سکتا تھا؟ اُس نے تو اپنی ماں سے بڑی مشکل سے اس ملک میں آنے کی رضامندی حاصل کی تھی۔ اس ملک میں دیکھنے کے لیے بہت کچھ تھا اور کرنے کے لیے بھی بہت کچھ تھا۔ اِس لیے اُس نے فیصلہ کر لیا کہ چاہے اُس کے انگریز بھائی اُس کا ساتھ دیں یا نہ دیں وہ اس ملک کی بھلائی کے لیے اپنی مرضی کے مطابق کام کرتا رہے گا، اپنے فوجی فرائض کے درمیان وہ اپنے ارادے کے مطابق ہندوستان کے لوگوں، اُن کی تہذیب اور اُن کی زبانوں کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگا اور تب ہی ایک واقعہ رُونما ہو گیا تھا۔

۱۸۱۲ء کے اکتوبر میں بنگال آرمی کا ایک افسر اپنی فوج سے پچھتر میل دور اٹاوہ جا رہا تھا، اُس کے ساتھ دو سپاہی تھے، گھوڑے پر روانہ ہونے والے ان لوگوں کے پاس بندوقیں اور تلواریں بھی تھیں، آگرے سے وہ تیسرے یا چوتھے روز اٹاوہ پہنچنے والے تھے، اٹاوہ میں اُس کا بڑی بے چینی سے انتظار کیا جا رہا تھا لیکن مانسل اٹاوہ نہیں پہنچ سکا جب پانچ روز بھی گزر گیا تو اُس کی گمشدگی کے بارے میں تفتیش شروع ہو گئی، مگر آگرے سے روانہ ہونے والا افسر راستے میں کہیں غائب ہو گیا تھا اِس کا کسی کو علم نہیں تھا۔

مانسل کی گمشدگی سے انگریز سپاہیوں میں ایک بے چینی سی بے چینی پھیل گئی کیوں کہ ڈاکوؤں نے آج تک کسی انگریز افسر کو لوٹنے یا ہلاک کرنے کی ہمت نہیں کی تھی، انگریزوں کی دھاک سے ہندوستان کی رعایا خوف زدہ تھی۔ اُن کی جرأت کوئی باغی آنکھ اٹھا کر بھی دیکھنے کی ہمت نہیں کرتا تھا اور اِسی وقت میں اُن کا ایک انگریز افسر لاپتا ہو گیا تھا۔ وہ زندہ ہے یا مر چکا ہے اس کا بھی کسی کو پتا نہیں تھا۔

فوج کا دستہ افسر مانسل کی تلاش میں روانہ ہوا۔ اُنھیں حکم دیا گیا تھا کہ جس طرح بھی ہو مانسل کا پتا لگایا جائے اور اگر کسی نے اُسے قتل کر دیا ہے تو مجرم کو گرفتار کر لیا جائے۔ پچھتر میل کے طویل راستے کو چھان مارا گیا اور اِس تفتیش کا نتیجہ یہ نکلا کہ سندھا نامی ایک گاؤں کے قریب سے اس کی فوجی وردی کا ایک بٹن اور ایک بلا اُن کے ہاتھ لگی۔ ان چیزوں کے برآمد ہو جانے پر اُنھیں یہ یقین ہو گیا کہ اُن کو ضرور قتل کر دیا گیا ہے۔ صرف مانسل کو ہی نہیں بلکہ اُس کے دونوں سپاہیوں کو بھی ختم کر دیا گیا ہے لیکن کسی کو یہ خیال نہیں آیا کہ اُن کے پاس پستول اور تلواریں بھی تھیں اور دو سپاہیوں کے پاس بندوقیں بھی تھیں۔ ان ہتھیاروں کی موجودگی میں اُن پر ڈاکوؤں یا لٹیروں نے کس طرح حملہ کیا ہوگا؟ لیکن انگریزوں کو اپنی دھاک بٹھانے کے لیے کسی نہ کسی کو قتل ٹھہرانا ہی تھا۔ اس لیے انھوں نے پورے گاؤں کی تلاشی لی اور مشکوک لوگوں کو گرفتار کر کے اُن سے پوچھ گچھ کی۔ کردی مگر کافی کوشش کے باوجود وہ کسی کے خلاف کوئی ثبوت مُہیا نہ کر سکے۔ تنگ آ کر انھوں نے دس پندرہ لوگوں کو مانسل کا قاتل ٹھہرا کر انھیں پھانسی کے تختے پر چڑھا دیا

اور پورے ملک میں انھوں نے یہ خبر پھیلا دی کہ ڈاکوؤں سے بڑی بہادری سے مقابلہ کر کے کیپٹن مانسل نے اپنی جان دے دی ہے لیکن ولیم سلومن کا ذہن یہ بات تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اُس نے ہندوستان کے ٹھگوں کے متعلق بہت سی افواہیں سن رکھی تھیں، اُس نے یہ بھی سُنا تھا کہ مسافروں کا اعتبار حاصل کر کے اُنھیں بے خبری میں قتل کر دیا جاتا ہے اور اس کے لیے ٹھگوں کی ایک بہت بڑی جماعت پورے ملک میں مصروفِ عمل ہے۔ ولیم سلومن نے اِن ٹھگوں کے بارے میں خاصی معلومات حاصل کی تھیں۔ ایک بہت پرانے مندر میں پتھروں پر کچھ یادداشتیں محفوظ تھیں۔ جن میں ہندوستان کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہوا تھا۔ اُن پتھروں پر ہندوستان کے ٹھگوں کے بارے میں بھی کچھ تحریریں موجود تھیں کہ یہ لوگ رومال کے پھندے سے لوگوں کو قتل کر دیتے ہیں۔ تیرھویں صدی میں دہلی کے سلطان جلال الدین خلجی نے ہزاروں ٹھگوں کو گرفتار کیا تھا لیکن اُن کی دیوی کے قہر سے خوف کھا کر اُس نے اُنھیں سزا دینے کی بجائے بنگال کی حد سے باہر نکال دیا تھا۔ یہ بھی ولیم سلومن نے پڑھا تھا۔

تو پھر کیپٹن مانسل کے قتل کی پشت پر ٹھگوں کا ہاتھ کیوں نہیں ہو سکتا؟ اُس کی لاش چونکہ برآمد نہیں ہوئی تھی اس لیے سلومن نے یہی خیال ظاہر کیا تھا، لیکن ولیم سلومن کی اس بات کی تمام انگریز افسروں نے ہنسی اڑائی تھی اور اس طرح ہر سال تقریباً چالیس ہزار مسافر ٹھگوں کے شکار بنتے رہے۔

**

۱۹۱۴ء میں نیپال کے خلاف گورکھا جنگ میں فتح یاب ہونے کے بعد انگریز لشکر واپس آ گیا تو ولیم سلومن نے آرمی کی ملازمت سے علیحدہ ہو کر سول سروس کی ملازمت کی خواہش کا اظہار کیا۔ اُس نے اپنی حکومت کو یہ یقین دلایا تھا کہ رعایا کے درمیان رہ کر وہ اپنے فرائض نبھانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھے گا۔ آرمی کی سات سالہ ملازمت میں اُس نے اپنے ساتھیوں پر اپنا گہرا اثر چھوڑا تھا۔ اِس لیے اُس کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے انگریز سرکار نے اُسے جبل پور کا ڈسٹرک مجسٹریٹ بنا دیا۔ اپنی اس نئی ذمّے داری کو سنبھالتے ہی ولیم سلومن کو گاؤں گاؤں گھومنے کا موقع ملا، لوگوں کی فرد سننے کے لیے وہ خود ہی اُن کے پاس جانے لگا اور موقع ملتے ہی وہ ٹھگوں کی بات چھیڑ دیتا وہ یہ بھی جاننے کی کوشش کرتا تھا کہ ایسے کون کون سے خاندان ہیں جن کے رشتہ دار سفر پر جانے کے بعد واپس نہیں آئے ہیں ولیم سلومن جُوں جُوں گہرائی سے غور کرتا جاتا تھا کہ ہر سال ٹھگوں کی ٹولیاں سفر پر روانہ ہوتی ہیں اور مسافروں کو پھانس کر انھیں موت کے گھاٹ اتار کر اُن کے مال و اسباب کو لُوٹ لیتے ہیں لیکن اس کے باوجود کسی تھانے میں اُن کے خلاف کوئی رپورٹ درج نہیں کی جاتی تھی اور نہ ہی رعایا کی حفاظت کے لیے کوئی قدم اٹھایا جاتا ہے۔

"گڈ مارننگ سر" کہہ کر ولیم سلومن کچہری میں جج مسٹر مولانی کے کمرے میں داخل ہوا اور باتیں کرنے لگا کچہری کے باہر تقریباً سوڈیڑھ سو لوگوں کو کھڑے دیکھ کر اُس نے جج مولانی سے پوچھا "آج تو بہت زیادہ ملزم گرفتار ہوئے ہیں"

اُس کی بات سُن کر مولانی نے ہنس کر اُس کی نیلی آنکھوں میں جھانکا پھر ہنستے ہوئے بولا "اس میں زیادہ تعداد بے قصور لوگوں کی ہی ہے، مسافروں کے ایک بہت بڑے قافلے کے خلاف بہت سے لوگوں نے یہ شکایت کی ہے کہ وہ سفر کے دوران دوسرے مسافروں کو پھانس کر لوٹ لیتے ہیں"

"اچھا" ولیم سلومن کی دلچسپی بڑھ گئی۔

"مجھے یقین تھا کہ آپ کو اِس طرح کے واقعات سے ضرور دلچسپی پیدا ہو جائے گی" جج مولانی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"آپ کے دماغ پر تو ایک عرصے سے ٹھگوں کا بھُوت سوار ہے" مولانی کی بات سُن کر ولیم سلومن نے کہنا چاہا کہ آپ ہر چیز کو قانون کی نظروں سے دیکھنے کے عادی ہیں، لیکن ٹھیک اُسی وقت کچہری کا ایک کارکُن اس کمرے میں داخل ہوا تو مولانی نے اُس سے پوچھا "کیا بات ہے بابو؟"

"صاحب اُن کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ملتا" آنے والے شخص نے مولانی کی میز پر کچھ کاغذات رکھتے ہوئے کہا۔

"شکایت میں کوئی سچائی نظر نہیں آتی"

"تو پھر چھوڑ دو اِن بے چاروں کو" یہ کہہ کر مولانی اُن کاغذات پر دستخط کرنے لگا۔ ولیم سلومن ایک ٹک اُس کے حرکت کرتے ہوئے قلم کو دیکھ رہا تھا، اُس کا جی چاہا کہ وہ اس سلسلے میں جج مولانی سے کچھ کہے لیکن دوسرے کے معاملات میں دخل اندازی اُسے پسند نہیں تھی اِس لیے وہ خاموش رہ گیا۔

کچہری کا کارکن جب کاغذات لے کر واپس چلا گیا تو مُولانی نے ولیم سلومن سے کہا۔ "میں نے اِن گرفتار کیے ہوئے لوگوں کے چہروں کا بغور مطالعہ کیا ہے، لیکن اِن کے چہروں پر مُجرم ہونے کے کوئی تاثرات دکھائی نہیں دیئے۔ اِس کٹہرے سے دیکھئے وہ لوگ کس طرح ہنس ہنس کر باتیں کر رہے ہیں۔"

"لیکن جناب یہ لوگ اپنی اصلیت چھپانے میں ماہر ہوتے ہیں۔" ولیم سلومن نے دلیل پیش کی۔ "اسی لیے تو اِن لوگوں کو ٹھگ کہا جاتا ہے۔"

"یہ آپ نے کون سی کتاب میں پڑھ لیا؟" جج مُولانی نے پُر مذاق انداز میں ہنستے ہوئے کہا اور پھر اُن کی گفتگو اسی جگہ ختم ہو گئی کیوں کہ جج مُولانی کو کچھ اور بھی کاغذات دیکھنے تھے۔ ولیم سلومن نے اُٹھ کر اُن سے اجازت لی اور کچہری سے باہر نکل آیا۔

●

کچہری کی عمارت سے باہر آ کر ولیم سلومن نے باہر کھڑے ہوئے لوگوں کو گھور گھور کر دیکھ لیا، شاید مُولانی صاحب نے سچ ہی کہا تھا کہ یہ سب لوگ شریف ہیں۔

"صاحب۔" تھوڑی دُور پہنچنے کے بعد ایک شخص نے اُسے سلام کیا۔

"بولو کیا بات ہے؟" کہہ کر ولیم سلومن آگے بڑھنے لگا۔ اس کی عادت تھی کہ کوئی فریاد وغیرہ کرتا تو وہ چلتے چلتے ہی اُس کی بات سنتا تھا لیکن یہ شخص تو گونگے کی طرح اُس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ جب کافی دیر تک اُس کی آواز سلومن کو سُنائی نہیں دی تو اُس نے رُک کر پیچھے کی جانب دیکھا اور بولا۔ "کیا کہنا ہے تمھیں؟" اُس کی آواز میں کچھ سختی آ گئی تھی۔

"صاحب آپ نے شاید مجھے پہچانا نہیں ہے۔" وہ شخص شرماتے ہوئے دھیمی آواز میں بولا۔ "میں کلیان سنگھ ہوں۔"

نام سُنتے ہی ولیم سلومن نے اُسے پہچان لیا اُسے یاد آ گیا کہ گھوڑے کی چوری کے الزام میں اِس شخص کو جیل میں بند کر دیا گیا تھا۔

"اب کیا بات ہے؟" ولیم سلومن نے اُس کی جانب دیکھے بغیر پوچھا۔ مگر اس وقت تک اس کا گھر آ چکا تھا اس لیے وہ برآمدے کے زینے پر ہی کھڑا ہو گیا۔

"جناب وہ لوگ بہت بدمعاش آدمی ہیں۔" کلیان سنگھ نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا تو ولیم سلومن نے پلٹ کر اُس کی طرف دیکھا اور بولا۔ "تم اُن لوگوں کے بارے میں کہہ رہے ہو جو کچہری میں مُلزم کی حیثیت سے کھڑے تھے؟"

"جی۔" کلیان سنگھ نے سر جھکا لیا۔

"لگتا ہے اُن لوگوں نے تمھیں حصّہ نہیں دیا ہے، تم اُن کی شکایت کرنے آئے ہو۔" ولیم سلومن نے اُسے گھورتے ہوئے کہا۔

"نہیں صاحب۔ وہ لوگ واقعی خراب آدمی ہیں۔" کلیان سنگھ اتنا کہہ کر چُپ ہو گیا۔ ولیم سلومن نے فوراً ہی محسوس کیا کہ کلیان سنگھ کچھ کہنے سے ہچکچا رہا ہے۔ اُسے کچھ شک سا ہونے لگا۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا تو اُس کا ملازم ہاتھ باندھے اُس کے پیچھے کھڑا ہو گیا تھا۔ ملازم کو دیکھتے ہی اُس نے اُس سے کہا۔ "تم جاؤ اور جا کر میرے لیے ٹوسٹ بناؤ۔" ملازم کے روانہ ہونے کے بعد وہ کلیان سنگھ سے مخاطب ہوا۔ "اب تم جو کہنا ہے وہ جلدی کہہ ڈالو میرے پاس وقت نہیں ہے۔"

کلیان سنگھ نے گھبرائی ہوئی نظروں سے چاروں طرف دیکھا اور پھر بڑے رازدارانہ لہجے میں بولا۔ "جناب وہ لوگ ٹھگ ہیں۔"

"ٹھگ؟" سلومن چونک پڑا اُس کا گورا چہرہ یکایک سُرخ ہو گیا۔

"ہاں صاحب۔" کلیان سنگھ اِس خیال سے جلد جلد بولنے لگا کہ کہیں یہ گورا صاحب اُس پر ناراض نہ ہو جائے۔ "یہ لوگ ساگر کا سفر کرنے جا رہے ہیں، میرا بھائی بھی اُن کے ساتھ ہے۔"

یہ سنتے ہی ولیم سلومن کا رواں رواں سُلگ اٹھا اور بولا۔ "چلو۔" اتنا کہتے ہی وہ تیز تیز قدموں سے اپنے کمرے میں داخل ہوا اور آواز دے کر اپنے سائیس کو اندر بلا لیا۔ گھوڑے کا گھوڑا دوڑتا ہوا اندر آیا تو ولیم سلومن نے اُسے حکم دیا۔ "اردلی کے پاس بھیج دو اور تم فوراً ہی میرا گھوڑا تیار کرو۔"

چند ہی لمحوں میں صاحب کا حکم ملتے ہی اردلی حاضر ہوا وہاں پہنچ گیا ولیم سلومن نے اُس سے کہا۔ "جاؤ اُس کلیان سنگھ کو تھانے دار کے پاس لے جاؤ اُس سے کہنا کہ اسے جیل میں بند کر دیا جائے۔"

یہ بات سنتے ہی کلیان سنگھ تھر تھر کانپنے لگا۔ وہ اتنا کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ تب ہی ولیم سلومن نے ہنس کر کہا۔ "تم فکر مت کرو کلیان سنگھ میں تمھاری سلامتی کے لیے ہی تمھیں جیل بھیج رہا ہوں۔ جاؤ جا کر آرام سے وہاں بیٹھ جاؤ۔"

اُس کا ملازم اُس کے لیے ٹوسٹ لے کر آ گیا تھا مگر اس وقت اُسے ناشتا کرنے کی فرصت ہی کہاں تھی۔ اُس نے جلدی جلدی ٹوسٹوں کو ایک کاغذ میں لپیٹا اور پھر اُس پیکٹ کو اپنے لمبے کوٹ کی جیب میں ڈال کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ باہر آ کر جب وہ گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھا تو اس وقت ایک عجیب سی سنسناہٹ اُس کے بدن میں دوڑ رہی تھی۔

●

ولیم سلومن اپنے تیز رفتار گھوڑے پر جب فوجی چھاؤنی پہنچا تو چھاؤنی کا ہندوستانی افسر میز پر بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ ولیم سلومن کے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سُن کر وہ کھانا چھوڑ کر اُٹھ کھڑا ہوا اور ولیم سلومن کو سیلوٹ کرتے ہوئے بولا۔ "یس سر۔"

"مجھے گھوڑ سواروں کا ایک دستہ چاہیے۔" ولیم سلومن رومال سے اپنے چہرے کا پسینا پونچھ کر بولا۔ "میں کچھ ڈاکوؤں کا پیچھا کر رہا ہوں۔ یہ دستہ ساگر کے راستے پر میرے پیچھے روانہ ہونا چاہیئے۔"

"اوکے سر۔" کہہ کر ہندوستانی افسر آرڈر لکھنے کے لیے اپنی میز پر بیٹھ گیا پھر تھوڑی دیر بعد جب "وش یو گڈ لک" کہنے کے لیے اُس نے سر اٹھایا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ولیم سلومن اپنے گھوڑے پر بہت دُور جا چکا تھا۔ وہ دل ہی دل میں ہنس پڑا اور بڑبڑانے لگا۔ "کمال کا آدمی ہے اتنی تیز دھوپ میں ڈاکوؤں کے پیچھے دوڑ رہا ہے۔" لیکن وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ولیم سلومن اگر کوئی ارادہ کر لیتا ہے تو پھر وہ دھوپ اور چھاؤں نہیں دیکھتا، اپنی ناکامی پر بھی وہ ہنستے ہنستے واپس آئے گا اور سپاہی پیٹھ پیچھے اُسے گالیاں دیتے رہیں گے۔ ولیم سلومن کا گھوڑا طوفانی رفتار سے بھاگ رہا تھا اُسے اُمید تھی کہ اگر کلیان سنگھ کی اطلاع سچی ثابت ہوئی تو وہ کوئی نہ کوئی ٹھوس ثبوت ضرور حاصل کرے گا اور تب وہ سینہ ٹھونک کر اپنی کمپنی سے کہہ سکے گا کہ تم لوگ تو میری بات کا مذاق اڑاتے رہتے تھے مگر اب اپنی آنکھوں سے یہ ثبوت دیکھ لو۔ لیکن کلیان سنگھ نے یہ اطلاع اُسے کیوں دی؟ اس میں اس کا کیا فائدہ ہو سکتا ہے؟ یہ سوال یکایک ہی اُس کے دماغ میں اٹھا اور وہ تھوڑی دیر شک میں پڑ گیا، لیکن پھر فوراً ہی اُسے اپنے اس سوال کا جواب بھی مل گیا۔ چوری کے جُرم میں اس نے خود ہی کلیان سنگھ کو جیل بھیج دیا تھا اور پھر خود ہی اُس کے گھر والوں کی خبر گیری کرتا رہا تھا اور کبھی کبھی خرچ وغیرہ کے لیے بھی کچھ نہ کچھ بھیجتا رہتا تھا شاید اسی وجہ سے کلیان سنگھ اس کے احسانوں کا بدلہ دینے کی کوشش کی ہے۔ خیر کچھ بھی ہو شام تک اس کے سچ اور جھوٹ کا پتا تو چل ہی جائے گا۔

گھوڑے کی رفتار سے بھی تیزی سے اُس کے خیالات دوڑ رہے تھے۔ وہ رہا تھا کہ بدمعاشوں کی اُس ٹولی میں تو تقریباً سو سے زیادہ آدمی دکھائی دیے تھے تو کیا وہ سب کے سب ٹھگ تھے؟ یا پھر کتنے ہی بے قصور مسافر نما لوگ اُن کے قافلے میں شامل ہو گئے تھے؟ اگر ایسی بات ہے تو اُسے اپنی آنکھوں سے ٹھگوں کی کارستانی دیکھنے کو بھی مل سکتی ہے۔ اس خیال کے آتے ہی ولیم سلومن کانپ گیا پھر اُسے اپنے اس واہیات خیال پر ہنسی بھی آ گئی اور "لٹری گزٹ" میں شائع ہونے والا ڈاکٹر رابرٹ شیورڈ کا ایک مضمون یاد آ گیا جو انھوں نے چور، لیٹروں اور ٹھگوں کے متعلق بڑے تفصیل سے لکھا تھا۔ ٹھگوں کے متعلق ڈاکٹر رابرٹ شیورڈ کا خیال تھا کہ وہ لوگ کسی ویران علاقے اور نسبتاً اندھیرے میں چھپ چھپا کر ہی اپنے شکار کا کام تمام کر دیتے ہیں۔ ولیم سلومن شام ہونے تک یہ واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا چاہتا تھا لیکن اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آگے روانہ ہونے والا قافلہ ابھی تک اُسے دکھائی کیوں نہیں دیتا؟ دھول میں اُن کے قدموں کے نشانات بھی صاف دکھائی دے رہے تھے، اُن کے ساتھ جو ٹٹو تھے اُن کے کھُروں کے نشان بھی دھول میں اُبھرے ہوئے تھے، وہ سوچ رہا تھا کہ یہ لوگ کیا پیدل بھی اتنے تیز چلنے کے عادی ہوتے ہیں؟

اچانک اُس نے اپنے گھوڑے کی رفتار کم کر دی، اُسے خیال آیا کہ اُسے اِس قدر بے چینی سے اُن لوگوں کا پیچھا نہیں کرنا چاہیے۔ اُسے قدم قدم پر ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ پھر پیچھے مڑ کر دیکھنے کے بعد وہ بڑبڑایا۔ "گھوڑ سوار دستہ بھی آتا دکھائی نہیں دیتا۔" اپنی ہیٹ اُتار کر اس نے اپنا پسینا پونچھا پھر کپڑوں پر لگی ہوئی دھول جھاڑنے کے بعد اس نے گھوڑے کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا، وہ چاہتا تھا کہ ایک بار دور سے ہی وہ اُس ٹولی کو دیکھ لے تو اُس کے دل کو تسلی ہو جائے گی۔

اور آخر کار پٹنا کے قریب اُسے ٹھگوں کی ٹولی دکھائی دے ہی گئی۔ وہ سب ہنستے گاتے اور باتیں کرتے ہوئے آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ ولیم سلومن نے محسوس کیا کہ اُسے اپنے پیچھے آتے دیکھ کر بھی انھوں نے کسی قسم کی حیرت کا کوئی اظہار نہیں کیا تھا۔ یہ دیکھ کر ولیم سلومن یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ کہیں کلیان سنگھ کی دی ہوئی اطلاع جھوٹی ہی نہ ہو، کہیں اُس کی جلد بازی اُس کے ساتھیوں کو ہنسنے کا موقع نہ فراہم کر دے؟

ولیم سلومن کے دھول اڑاتے ہوئے گھوڑے کو راستہ دینے کے لیے وہ لوگ راستے سے ایک طرف ہٹ گئے۔ یکایک ولیم سلومن کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں خوف کی ایک لہر سی دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اُسے لگا کہ اُن لوگوں کو اُس پر ذرا بھی شبہہ ہو گیا تو وہ اُسے زندہ نہیں چھوڑیں گے لیکن وہ پھر بھی اپنا گھوڑا دوڑتا ہوا ٹولی کے آگے آ کر کھڑا ہو گیا اور ہاتھ اٹھا کر بولا "ٹھہر جاؤ۔"

مسافروں کا پورا قافلہ اُس کی آواز سن کر چونک پڑا اور وہ سب کے سب گورے صاحب کو دیکھتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ ولیم سلومن کی نظریں اُن کے چہروں پر سے پھسلتی ہوئی ایک آدمی کے چہرے پر جم گئی جو قافلے کے پیچھے حصّے کی جانب سے نکل کر آگے کی طرف آ رہا تھا۔ ولیم سلومن نے دل ہی دل میں سوچا کہ شاید یہی شخص دُرگا ہے کلیان سنگھ نے اس ٹولی کے سردار کا نام دُرگا سنگھ ہی بتایا تھا۔

"سلام صاحب۔" کہہ کر وہ بڑے ادب سے ولیم سلومن کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ "آپ نے ہمیں ٹھہر جانے کا حکم دیا ہے صاحب۔"

"ہاں۔" سلومن مسکرا کر بولا۔

"ہم سے کوئی غلطی ہو گئی ہے کیا؟"

"نرسنگ پور میں کچھ عرصے قبل ایک گھر میں چوری ہوئی تھی۔" ولیم سلومن اتنی لاپرواہ آواز میں بول رہا تھا کہ سب ہی لوگ اس کی آواز سن سکیں۔ "چوری کرنے کے بعد اس گھر کو جلا دیا گیا تھا۔" اتنا کہہ کر وہ کھڑک دار آواز میں بولا۔ "اس کے لیے تم لوگوں پر شک کیا گیا ہے۔"

"ارے باپ رے۔" دُرگا سنگھ کے چہرے پر خوف کے کوئی آثار نہیں تھے وہ کسی ہچکچاہٹ کے بغیر بولا۔ "جہاں پور تو ہم نے کبھی دیکھا ہی نہیں ہے۔"

ولیم سلومن بھی یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ دُرگا غلط نہیں کہہ رہا ہے۔ اس لیے کہ نرسنگ پور میں ایسی کوئی ہوئی ہی نہیں تھی، اُسے تو ان لوگوں کو روکے رکھنے کے ایک بہانہ چاہیے تھا اور وہ بہانہ بھی ایسا ہونا چاہیے کہ ان کو ذرا بھی شک نہ ہو۔

"ممکن ہے تم لوگ نرسنگ پور نہ گئے ہو پھر بھی یہ اطمینان تو کرنا ہی پڑے گا۔"

"جیسی آپ کی مرضی۔" دُرگا سنگھ نے انتہائی خوش اخلاقی سے جواب دیا۔ "ہمیں تو یہی فکر ہے کہ آپ کا وقت نہ برباد ہو۔ ہم مسافروں کو جلدی کہاں ہوتی ہے۔ آپ بخوشی اپنا کام کریں۔"

اِس گفتگو کے دوران ولیم سلومن نے یہ محسوس کر لیا کہ اُس کی بات کا ان لوگوں پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا ہے۔ درختوں کے سائے میں اس طرح بیٹھ کر باتیں کرنے لگے جیسے انھیں آرام کرنے کا وقت مل گیا ہو۔ ولیم سلومن اپنے گھوڑے پر سے نیچے اتر آیا۔

"صاحب پچھلے پڑاؤ پر بھی ایسا ہی ہوا تھا۔" قافلے کے سردار نے اپنا سر کھجاتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "کسی نے ہم پر اپنے شک کا اظہار کیا تو پولیس ہمیں پکڑ کر لے گئی۔ لیکن اِس جھوٹے الزام میں کوئی دم خم نہیں تھا اس لیے چھوڑ دیا گیا۔"

ولیم سلومن اس کی چالاکی پر خوش ہوا۔ اس کا مطلب کہ چونکہ اس شخص نے اُسے کچہری میں دیکھ لیا ہو گا اس لیے جان بوجھ کر اُسے وہ واقعہ سنا رہا ہے۔

"تمھارا نام کیا ہے؟"

"دُرگا... دُرگا سنگھ۔" اس نے فخریہ لہجے میں اپنا نام ادا کرایا۔ "میں راجپوت ہوں اور میرے باپ دادا نے کئی جنگیں جیتی تھیں۔" اتنا کہہ کر اس نے ولیم سلومن کے گھوڑے کی لگام تھام لی۔ سلومن نے دو ایک بار مڑ کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ جب سپاہیوں کا گھوڑ سوار دستہ اُسے دکھائی نہیں دیا تو درخت کے نیچے گزارنے کے لیے درخت کے سائے میں ان لوگوں سے گفتگو کرنے کی ضرورت اُسے شدّت سے محسوس ہونے لگی۔

درخت کے سائے تلے بیٹھتے وقت اُسے اپنے کوٹ کی جیب میں رکھے ہوئے ٹوسٹ کی یاد آ گئی لیکن اتنے سارے لوگوں کی موجودگی میں اکیلے کھانا اُسے مناسب نہیں لگا اس لیے اس نے جیب سے ٹوسٹ نکالنے کا ارادہ ترک کر دیا وہ نہیں چاہتا تھا کہ ان لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ وہ انھیں گرفتار کرنے کے لیے اپنی جیب میں ناشتا لے کر نکلا ہے۔

درخت کے سائے میں بیٹھ کر اُس نے تھوڑی دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کیں پھر اس طرح آنکھیں موند کر درخت کے تنے سے پیٹھ لگا دی جیسے اُسے نیند سی آنے لگی ہو۔ قافلے کے بہت سارے مسافر اِدھر اُدھر بیٹھے باتیں کر رہے تھے اُن کی باتوں میں بھی کوئی دم نہیں تھا، وہ کسی گھبراہٹ کے بغیر باتیں کر رہے تھے۔

"ٹٹوؤں پر سے سامان اتار دو تاکہ انھیں بھی ذرا آرام مل جائے۔" بند آنکھوں سے سلومن نے دُرگا سنگھ کی آواز سنی۔ سپاہیوں کو چونکہ ابھی تک وہاں نہیں پہنچا تھا اس لیے اُسے اُن پر غصہ آ رہا تھا۔

"سام کا نی رانکل۔" اچانک ولیم سلومن نے یہ الفاظ سُنے تو اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی اب وہ لوگ اِسی طرح کے الفاظ استعمال کرتے ہوئے باتیں کرنے لگے تھے۔ ہندوستانی علاقے کے یہ لوگ اپنی خفیہ زبان میں باتیں کرنے لگے تھے۔ یہ دیکھ کر سلومن نے جان بوجھ کر اپنی آنکھوں کو بند رہنے دیا وہ اندر ہی اندر کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مدراس کے "لٹریری گزٹ" نامی اخبار میں ڈاکٹر رابرٹ شیورڈ نے ٹھگوں کی خفیہ راسمی زبان کا تذکرہ بھی کیا تھا، اس مضمون سے ولیم سلومن نے بھی کئی الفاظ کے معنی یاد کر لیے تھے اور یہ الفاظ بھی کچھ اُن ہی سے ملتے جلتے سے لگ رہے تھے۔ وہ کان لگا کر اُن کی باتیں سننے لگا۔ راسمی زبان میں "برلیس" کا مطلب تھا "پیاسا لہو۔ "سنک" سونے کو کہتے تھے جب کہ "نیامت" کا مطلب تھا "المار آدمی"... اس ایک ایک لفظ پر ولیم سلومن کے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جاتی تھی کیوں کہ راسمی زبان میں انھیں گفتگو کرتے دیکھ کر یہ یقین ہو چکا تھا کہ یہ لوگ ٹھگ ہیں۔

تھوڑی دیر بعد سپاہیوں کا گھوڑ سوار دستہ وہاں آ پہنچا تو ولیم سلومن نے انھیں حکم دیتے ہوئے کہا۔ "ان سب لوگوں کو اپنے گھیرے میں لے کر کھڑے ہو جاؤ نرسنگ پور میں ہونے والی ایک چوری کے الزام میں انھیں جیل پور لے جانا ہے۔"

یہ سُننے کے بعد بھی دُرگا سنگھ اور اس کے ساتھیوں نے کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا شاید وہ جانتے تھے کہ اس واردات میں اُن کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ملے گا اور انھیں کچھ بھی نہیں ہو گا یہی وجہ تھی کہ وہ سب اب بھی اطمینان سے بیٹھے باتیں کرنے میں مصروف تھے، لیکن تھوڑی دیر بعد دُرگا سنگھ نے طنزیہ لہجے میں ولیم سلومن سے کہا۔ "جناب کیا ہمیں اسی جگہ بیٹھے رہنا ہو گا؟ واپس چل کر معاملے کی تفتیش کر لیجیے تاکہ آپ کے دل کو سکون ہو جائے۔"

اُس کی اِس دیدہ دلیری پر سلومن اس کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا لیکن اُسے شاباشی دینے کی بجائے اُس نے ہنس کر صرف اتنا ہی کہا۔ "ابھی پولیس کا ایک پیدل دستہ بھی پہنچنے والا ہے پھر تم لوگوں کو جیل پور لے جایا جائے گا۔"

"ٹھیک ہے صاحب۔" کہہ کر دُرگا سنگھ پھر اپنے ساتھیوں سے باتیں کرنے میں مصروف ہو گیا۔ اس درمیان ولیم سلومن نے اِن لوگوں میں سے کلیان سنگھ کے بھائی موتی کو پہچاننے کی کوشش کی لیکن اتنے بہت سارے لوگوں میں سے اُسے پہچان لینا آسان کام نہیں تھا جب کہ اس سے پہلے سلومن نے اُسے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا اس کا جی چاہا کہ وہ دُرگا سنگھ سے کیوں نہ پوچھ لے کہ ان میں سے موتی کون ہے؟ لیکن وہ اس خیال سے چپ ہو گیا کہ ایسا کرنا اس کی سب سے بڑی حماقت ہو گی۔ ایک ذرا سی غلطی بھی ساری بازی اُلٹ سکتی تھی۔ یہ ساری باتیں سوچتے ہوئے وہ سوکھے ہوئے ٹوسٹ کے ٹکڑے چبانے لگا۔

● دوپہر ڈھلنے کے بعد ننانوے لوگوں کے اس قافلے کے پیچھے ولیم سلومن بھی اپنے گھوڑے پر بیٹھا ہوا یہ سوچتا ہوا دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا تھا کہ ان ننانوے آدمیوں کے ایک سو اٹھانوے ہاتھوں نے نہ جانے کتنے معصوم اور بے گناہ لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہو گا کتنی میٹھی میٹھی باتوں میں پھانس کر ان لوگوں نے سینکڑوں لوگوں کے گلے گھونٹے ہوں گے؟ ان لوگوں نے اپنے چہروں پر شرافت کا نقاب ڈال رکھا ہے، ان کے چہروں پر خوف کی کوئی جھلک نہیں ہے، یہ تو اس طرح ہنستے بولتے جا رہے ہیں جیسے ان پر کوئی الزام ہی نہیں ہے، گاتے گاتے وہ سپاہیوں اور فوجیوں کا دل بہلاتے جا رہے ہیں، اپنی اس خوش اخلاقی سے انھوں نے ان سب لوگوں کے دل بھی جیت لیے ہیں جس کی وجہ سے گھوڑ سوار دستے کے

سپاہیوں کی نظروں میں بھی ولیم سلومن ہی قصوروار سمجھا جارہا تھا۔ ان سب کا خیال تھا کہ ولیم سلومن نے ان شریف اور بے قصور لوگوں کے ساتھ زیادتی کی ہے شہر میں داخل ہوتے ہی جیل پور کا تھانے دار اپنے سپاہیوں کے ساتھ ولیم سلومن کے استقبال کے لیے کھڑا تھا۔ اُس کے سلام کا جواب دینے کے بعد ولیم سلومن نے اُسے حکم دیا۔ "ان لوگوں کو بیرک میں بیٹھا دیا جائے۔" پھر گھوڑے کی پیٹھ سے اتر کر اُس نے تھانے دار کے کان میں دھیرے سے کہا۔ "ان کے سامان کو اپنے قبضے میں لے لینا اور سب کے نام پوچھتے رہنا اور موتی نام کا جو شخص سامنے آئے تو اسے ایک الگ کوٹھڑی میں رکھنا۔"

تتانوے لوگوں کی یہ ٹولی جیل کے پھاٹک میں اس طرح داخل ہوئی جیسے وہ کسی مسافر خانے میں رات گزارنے کے لیے آئے ہوں۔ ان کا نظم و ضبط اور صبر و تحمل دیکھ کر ولیم سلومن کو بڑی حیرت ہو رہی تھی اور اس کے دل میں یہ وسوسہ بھی پیدا ہو رہا تھا کہ اگر واقعی یہ لوگ بے قصور نکلے تو؟

"میں رات کے وقت پھر آؤں گا۔" یہ کہہ کر وہ اپنے بنگلے پر واپس آگیا۔

موتی اور کلیان سنگھ دونوں بھائی جب ایک دوسرے کے آمنے سامنے آئے تو چھوٹے بھائی نے بڑی نفرت بھری نظر سے اپنے بڑے بھائی کی طرف دیکھا لیکن ولیم سلومن کی موجودگی میں دونوں کو آپس میں جھگڑنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

"دیکھو موتی اب معاملہ میرے ہاتھ میں ہے۔" سلومن سمجھانے کے انداز میں بولا۔ "سچائی سے منہ پھیر لینے میں کوئی فائدہ نہیں ہے، کلیان سنگھ کا اس میں کوئی قصور نہیں ہے۔ ٹھگوں کو اس دیس سے نکال پھینکنے کا فیصلہ میرا اٹل فیصلہ ہے۔"

"ٹھگ؟" موتی سنگھ پلٹ کر دیکھے بغیر بولا۔ "کون ٹھگ کیسے ٹھگ؟"

پھر اس سے پہلے کہ موتی کچھ کہتا کلیان سنگھ درمیان میں بول پڑا۔ "جناب یہ انجان بننے کی اداکاری کر رہا ہے میں نے اسے بہت سمجھایا ہے کہ ہم جیسے لوگوں کے لیے یہ دھندہ مناسب نہیں ہے اس سے تو چوری بہتر ہے لیکن یہ قتل و غارت گیری تو۔"

"تم چپ رہو کلیان۔" ولیم سلومن نے اُس کا بازو تھام کر اُسے روک دیا پھر اپنی آواز میں سختی پیدا کرتے ہوئے موتی سے مخاطب ہوا۔ "تم راجپوت ہو موتی اور راجپوت بہادر ہوتے ہیں وہ سچ بولنے سے نہیں ڈرتے تمہارا کیا کہنا ہے میری طرف دیکھ کر کہو۔"

تھوڑی دیر تک خاموشی چھائی رہی، موتی چپ چاپ سر جھکائے کھڑا رہا ولیم سلومن نے صبر سے کام لیا لیکن جب پگھلنے کے لیے تیار نہیں ہوا تو سلومن اپنی جگہ سے بڑھا اور گول گھومتا ہوا اُس کے بالکل سامنے آکر کھڑا ہوا تب موتی کو لگا کہ اب اچانک ہی اس کے جبڑے پر زبردست گھونسہ پڑنے والا ہے اس خیال کے آتے ایک جھٹکے سے اُس کی گردن اونچی ہو گئی اور اس کی نظریں سلومن کی نظروں سے ٹکرا گئیں جن آنکھوں میں اُسے غصے نفرت کی جھلک دکھائی دینے کی توقع تھی اُن آنکھوں میں اور ہمدردی کے سائے دیکھ کر اُس کی نظریں جھک گئیں نہ جانے کیوں وہ زیادہ دیر تک اپنی نظریں نہ چرا سکا اور پلکیں جھپکائے بغیر گورے صاحب کی طرف دیکھنے لگا۔

"موتی تم میرا ساتھ دو گے نا؟" انتہائی محبت اور اپنائیت سے ولیم سلومن نے پوچھا تو یہ سوال سن کر موتی کی گردن جھک گئی اور اس نے "ہاں" کر دی۔ کلیان سنگھ اور تھانے دار کو اس بات پر حیرت سی ہوئی اور شاید خود موتی کو بھی اپنی حرکت پر حیرانی ہوئی کہ اس نے اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا؟ لیکن ولیم سلومن کے چہرے پر اطمینان کی جھلک تھی اُسے یقین ہو گیا کہ موتی اس کا ساتھ ضرور دے گا۔ "تو آگے چلو" سلومن نے اتنا ہی کہا اور موتی کے قدم اُٹھ گئے مگر کمرے سے باہر نکلتے وقت وہ رُک گیا اور پلٹ کر ولیم سلومن کی طرف دیکھنے لگا اُس وقت کلیان سنگھ اور تھانے دار کو لگا کہ شاید وہ اپنی زبان سے پھر جائے گا۔

"جناب پھاوڑے اور کدال وغیرہ بھی ساتھ لے لیں" تھانے دار نے پوچھا۔

"یہ سب انتظام ہو چکا ہے۔" ولیم سلومن نے اطمینان سے جواب دیا۔ "سپاہیوں کو میں نے پہلے ہی سے سمجھا دیا ہے۔"

یہ سن کر موتی نے اس طرح ولیم سلومن کی جانب دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو تو کیا آپ کو اس حد تک یقین تھا؟ لیکن یہ سوال زبان کی بجائے وہ چپ چاپ چلتا رہا۔

●

چاندنی رات تھی اور وہ سب ہی لوگ پیدل چل رہے تھے۔ ولیم سلومن نے جان بوجھ کر اپنے گھوڑے کو اپنے ساتھ نہیں لیا تھا۔ اس کے باوجود وہ تھکن کی بجائے اپنے اندر ایک عجیب سی تازگی محسوس کر رہا تھا۔ موتی جلدی جلدی قدم اٹھا رہا تھا اُس کی اس جلد بازی میں ایک عجیب سی بے چینی تھی جیسے وہ جلد سے جلد اپنے دل کا بوجھ کم کر دینا چاہتا ہو۔

جب وہ لکھ دن گاؤں کے قریب پہنچے تو اُس وقت کوئی رات گزر چکی تھی۔ گاؤں پار کرنے کے بعد ایک سنسان میدان میں موتی املی کے ایک درخت کے پاس رک گیا سب لوگ اس طرح اپنی سانس روکے موتی کی طرف دیکھنے لگے جیسے وہ کسی خوف ناک جگہ آگئے ہوں، چاروں طرف سناٹے کی چادر تنی ہوئی تھی اور چاندنی رات ہونے کے باوجود ایک عجیب سی دہشت سے اُن سبھوں کے دل دھڑک رہے تھے۔

"کہاں؟" اچانک ولیم سلومن نے پوچھا تو موتی اُس کی طرف دیکھنے لگا پھر اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھ کر کوئی جواب دیے بغیر آگے بڑھ گیا اس بار اُس کی چال میں وہ تیزی نہیں تھی وہ نڈھال نڈھال قدموں سے آگے بڑھ رہا تھا یوں لگ رہا تھا جیسے وہ بڑی مشکل سے اپنے پاؤں اٹھا پا رہا ہو۔ کچھ دور آگے جاکر وہ ایک بار پھر رُک گیا اور زمین پر نظریں گاڑ کر چپ چاپ کھڑا رہا ولیم سلومن اس کی ایک ایک حرکت کو بغور دیکھ رہا تھا، یکایک موتی نیچے جھکا اور مٹی پر ہاتھ پھیرنے کے بعد گردن اٹھا کر ولیم سلومن کو دیکھنے لگا اور بولا۔ "اس جگہ... سے مٹی کھودیئے..." بولتے بولتے اس کی آواز بھاری ہو گئی اور وہ اُسی جگہ بیٹھ گیا۔ ولیم سلومن نے اشارہ کیا تو سپاہی پھاوڑا اور کدال سنبھال کر تیار ہو گئے۔ کھدائی شروع ہو گئی ولیم سلومن، کلیان سنگھ اور تھانے دار زمین پر نظریں جمائے چپ چاپ کھڑے تھے جب کہ موتی زمین پر بیٹھے بیٹھے اپنی انگلی سے مٹی پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچ رہا تھا۔ اچانک اُس نے نظریں اٹھا کر ولیم سلومن کی طرف دیکھا اور مسکرا کر طنزیہ لہجے میں بولا۔ "صاحب آپ کے سپاہیوں کو گڑھا کھودنا نہیں آتا۔ اس کام میں ہمارے لوگ دھائی بڑے ماہر ہوتے ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے۔" جواب میں سلومن نے ہنس کر کہا تو موتی کو اس پر حیرت ہوئی اور وہ سوچنے لگا کہ جس بات کا علم سوائے ٹھگ لوگوں کے اور کسی کو بھی نہیں ہے وہ بات ولیم سلومن کو کیسے معلوم ہو سکتی ہے؟

"بس... بس۔" موتی نے ہاتھ اٹھا کر سپاہیوں کو روکتے ہوئے کہا۔ "اب آہستہ آہستہ پھاوڑے سے مٹی ہٹاؤ۔"

سپاہیوں کے ساتھ ساتھ تھانے دار اور کلیان سنگھ بھی گڑھے میں جھک کر مٹی ہٹانے لگے۔ ولیم سلومن کے سانس کی رفتار تیز ہوتی جارہی تھی وہ اس طرح ہانپنے لگا تھا کہ جیسے اس کے سینے پر کدال چل رہی ہو۔ اس کا جسم پسینے پسینے ہو رہا تھا یکایک مٹی ہٹاتے ہٹاتے ایک سپاہی کے منہ سے چیخ نکل گئی اور وہ اُچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس کی چیخ سن کر سب کے ہاتھ ایک جھٹکے سے رک گئے ولیم سلومن بھی چونک پڑا۔ "کیا ہوا؟" کہہ کر وہ گھٹنوں کے بل گڑھے کے کنارے بیٹھ گیا پھر دھیرے دھیرے اس کی آنکھیں پھیلتی چلی گئیں اور ہونٹ تھرتھرانے لگے پیشانی کی نسیں تنگ ہوتی چلی گئیں۔ میدانِ جنگ میں سینکڑوں لاشیں اُس نے دیکھی تھیں لیکن اس گڑھے میں پڑی ہوئی لاش کو دیکھ کر جو کپکپاہٹ اس پر طاری ہوئی تھی وہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ بہ مشکل اپنی جگہ سے اُٹھ کر کھڑا ہوا اور اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "لاش کو باہر نکالو۔"

حکم پاتے ہی چند سپاہیوں نے مل کر لاش کو اٹھایا اور گڑھے سے باہر نکال کر زمین پر رکھ دیا اور تب ہی انھیں پتا چلا کہ گڑھے میں اس لاش کے نیچے بھی ایک لاش موجود ہے "یہ تو کسی عورت کی لاش ہے۔" ولیم سلومن نے کہا۔

"ہاں صاحب۔" موتی بھاری آواز میں بولا۔ "اس گڑھے سے ایک تیسری لاش بھی برآمد ہو گی۔"

موتی کی بات سچ نکلی گڑھے میں سے تیسری لاش بھی باہر نکالی گئی ان لاشوں کو دیکھ کر ولیم سلومن یہ سوچنے لگا کہ ان بے چاروں کو آخری وقت تک اس بات کا علم نہیں ہو سکا ہو گا کہ موت پیچھے سے اُن پر حملہ کرنے والی ہے۔ ٹھگوں نے ان سب کو باتوں میں یا گانے بجانے میں پھانس رکھا ہو گا اور پھر ٹھگوں کے سردار دُرگا سنگھ نے موقعہ دیکھ کر اپنے ساتھیوں کو اشارہ کر دیا ہو گا اور اس کے ساتھ ہی ایک مسافر پر دو دو تین تین ٹھگ بیک وقت ٹوٹ پڑے ہوں گے، رومال سے ان کا گلا گھونٹ دیا گیا ہو گا اور پھر ان کی لاشوں کو گڑھے میں ڈال دیا گیا ہو گا اور اس خطرناک کھیل کے بعد اُن ظالموں نے

رات اسی جگہ گزار دی ہوگی اس طرح بھلا کس کو معلوم ہو سکتا ہے کہ اس زمین کے اندر تین بے قصور آدمی کی لاشیں دفنائی گئی ہوں گی؟ سوچتے سوچتے ولیم سلومن نے ایک عجیب سی کپکپاہٹ محسوس کی اور اُسے لگا کہ جس جگہ وہ کھڑا ہے اُس کے نیچے بھی لاشیں نہیں ہوں گی اس کا کیا بھروسا ہے؟ بھلا یہ بات کون یقین سے کہہ سکتا ہے کہ جس جگہ موتی بیٹھا ہے اور جس جگہ سپاہی اور کلیان سنگھ وغیرہ کھڑے ہیں اس جگہ کے نیچے مردے دفن نہیں ہیں؟

"کم بختوں نے عورت کو بھی نہیں چھوڑا ہے۔" ولیم سلومن بڑبڑایا تو موتی نے گردن اٹھا کر دیکھا کہ کہیں گورا صاحب اس سے تو کچھ نہیں کہہ رہا ہے؟ ایک لمحے کے لیے وہ ولیم سلومن کی طرف دیکھتا رہا پھر ایک سرد سی آہ بھر کر بولا۔ "صاحب کسی کو بھی زندہ چھوڑ دینے کا دستور نہیں ہے۔ مسافروں کے ساتھ اگر اُن کا کتا بھی ہوتا ہے تو اُسے بھی ختم کر دیا جاتا ہے۔"

"اس جگہ کیا اور بھی لاشیں دفنائی گئی ہیں؟"

موتی نے سر ہلا کر انکار میں جواب دیا۔ "نہیں یہاں صرف یہی تین ہی تھے نزدیکی گاؤں کے رہنے والے تھے ان سے کچھ مال سامان بھی زیادہ نہیں ملا تھا۔"

کام ختم کر کے واپس جاتے وقت ولیم سلومن کا دل طرح طرح کے خیالات سے دھڑک رہا تھا پچھلے پانچ سال سے وہ جس ثبوت کی تلاش میں دن رات ایک کرتا رہا تھا۔ اس کا پہلا پھل آج اس چاندنی رات میں اُسے مل گیا تھا۔ اس کے سامنے سے ایک گہرے راز کا پردہ دھیرے دھیرے سرکنے لگا تھا۔

● انیتس ٹھگوں کو پھانسی اور بقیہ ستر ٹھگوں کو عمر بھر کی قید سخت کا فیصلہ عدالت نے سنا دیا۔ فیصلہ سننے کے بعد ولیم سلومن نے ٹھگوں کے سردار دُرگا سنگھ کی طرف دیکھا مگر دُرگا سنگھ کو مسکراتے دیکھ کر اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ولیم سلومن نے اُسے بہت سمجھایا تھا کہ تم اپنے تمام گناہوں کا اقرار کر لو کیوں کہ تمھاری ٹولی کے خلاف ثبوت موجود ہیں اور تم لوگ پھانسی کی سزا سے بچ نہیں سکو گے۔ مجھے تم اپنے سارے راز بتا دو اور یہ بھی بتا دو کہ ٹھگوں کی اور ٹولیاں کہاں کہاں ہیں؟ اور کون اُن کے سردار ہیں تمھیں صرف انگلی اٹھانی ہے اور ممکن ہے اس کے بدلے تم پھانسی کی سزا سے بچ جاؤ۔

لیکن دُرگا سنگھ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ اس نے اٹل لہجے میں جواب دیتے ہوئے کہا تھا۔ "مجھے پھانسی کا کوئی خوف نہیں ہے کیوں کہ جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ سب بھوانی دیوی کی مرضی سے ہوتا ہے اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں ہے۔ یقیناً ہم سے کوئی بھول ہو گئی ہوگی جو ہم آج گرفتار ہوئے ہیں ورنہ اکثر جیسے کئی گورے صاحبوں کو ہم دھوکہ دیتے آئے ہیں۔"

پھانسی کی سزا سننے کے بعد بھی دُرگا سنگھ کے چہرے پر اطمینان کی جو جھلک تھی اُسے دیکھ کر ولیم سلومن کو بہت زیادہ حیرت ہو رہی تھی۔ اُسے اُس براہمن عورت کی یاد آ گئی جو شوہر کی چتا پر ستی ہو جانے کی ضد لیے بیٹھی تھی اور آخر کار ضد کی ہی جیت ہوئی تھی۔

ٹھگوں کی گرفتاری پر سارے جبل پور میں ایک تہلکہ مچ گیا اور ہر طرف گورے صاحب ولیم سلومن کے نام کی دھوم مچی ہوئی تھی پھانسی کی سزا پانے والوں میں ایک پولیس افسر اور ایک سرکاری قاصد بھی ان ٹھگوں میں شامل تھا۔ موتی کو ولیم سلومن نے سرکاری گواہ بنا کر معافی دلوا دی تھی اور اس سے کہا تھا۔ "تمھیں کچھ عرصے میرے ساتھ رہنا ہوگا مجھے راستے کی زبان کے لیے۔"

"جو حکم جناب۔" موتی اب ولیم سلومن سے کافی مرعوب ہو چکا تھا۔

"کیا آپ واقعی اس ملک سے ٹھگوں کو نیست و نابود کرنا چاہتے ہیں؟"

"بالکل۔ یہ کام پورا کیے بغیر میں چین سے نہیں بیٹھوں گا۔"

یہ سن کر موتی چپ ہو گیا تو ولیم سلومن نے اس سے پوچھا۔ "یہ سوال تم نے کیوں پوچھا تھا؟"

"معاف کیجیے صاحب۔" موتی بولتے بولتے رُک گیا پھر نظریں جھکا کر بولا۔ "اس کے لیے آپ کا یہ ایک جنم ناکافی ہے ٹھگوں کا خاتمہ کرنے کے لیے آپ کو سات بار جنم لینا پڑے گا۔"

یہ سُن کر ولیم سلومن کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ معمولی آدمی کی یہ مجال کہ وہ اس پر طنز کرے؟ مگر وہ اپنے غصے سے باہر نہیں ہوا اور غصے کا اظہار کیے بغیر بولا۔ "تم سات جنم کی بات کر رہے ہو موتی جب کہ میں تو آدھے جنم میں ہی یہ کام پورا کر لوں گا اور بقیہ زندگی اپنے ملک میں جا کر چین سے بسر کروں گا۔"

ولیم سلومن کی اس بات پر موتی کا جی چاہا کہ وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑے لیکن وہ ہنس نہیں سکا۔

● صبح کا ہلکا ہلکا اُجالا پھیل رہا تھا عظیمہ اپنے بستر پر گہری نیند میں سو رہی تھی امیر اپنے دونوں ہاتھ کمر پر رکھے تھوڑی دیر تک اُسے تکتا رہا پھر وہ اس کے پلنگ پر بیٹھ گیا اچانک اُس نے عظیمہ کا ایک کان پکڑ کر زور سے کھینچا۔ "اٹھو بھی بیگم صبح ہو چکی ہے۔"

"ارے ارے یہ کیا کر رہے ہو؟" عظیمہ بڑبڑا کر اٹھ بیٹھی "شرم نہیں آتی اب بوڑھے ہو چکے ہو۔"

"ارے!" امیر نے اس کا دوسرا کان بھی پکڑ لیا۔ "صبح ہی صبح مجھے گالی دے رہی ہو؟ بوڑھا کہہ رہی ہو مجھے؟"

"ایک بار نہیں سات بار بوڑھا کہوں گی۔" عظیمہ کان چھڑا کر لیٹ گئی اور آگے بولی۔ "مجھے تو اب پچھتاوا ہو رہا ہے۔"

"پچھتاوا؟" امیر اس کی پیٹھ پر گھونسہ مارتے ہوئے بولا۔ "مجھ سے شادی پر تمھیں پچھتاوا ہو رہا ہے؟"

"نہیں۔" عظیمہ نے کہا۔ "تمھیں سفر پر جانے دیتی تو اچھا تھا سال میں چھ مہینے باہر رہتے تو میری جان چھوٹی رہتی، مرد گھر میں بیٹھا رہے تو بیوی کی شامت آ جاتی ہے۔ یہ بات میری سمجھ میں اب آئی ہے۔"

"اچھا۔" کہہ کر امیر اس کی پیٹھ پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔ "تمھاری طرح اب مجھے بھی پچھتاوا ہو رہا ہے۔"

"کس بات کا؟"

"مجھے اس بات کا افسوس ہو رہا ہے کہ اتنی خوبصورت بیوی کے گھر میں ہوتے ہوئے میں نے اپنی جوانی کا زیادہ تر حصہ سفر میں گزار دیا ہے۔" امیر مسکرا کر بولا۔

"تو گویا یہ بات تمھیں قبول ہے کہ تم اب بوڑھے ہو چکے ہو۔" عظیمہ نے کروٹ بدلتے ہوئے پوچھا۔ پھر اس سے پہلے کہ امیر کوئی جواب دیتا اچانک ہی دروازے پر دستک کی آواز ہوئی۔ "مالک۔" نوکر کی آواز اُبھری۔

امیر ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا اور غصے کی حالت میں نوکر کو گالیاں دیتا ہوا دروازے کی جانب بڑھنے لگا۔ عظیمہ کو اس کی حالت پر ہنسی آ گئی۔ امیر نے دروازہ کھولنے سے قبل دروازے کا پردہ گرا دیا تاکہ آنے والے کو عظیمہ دکھائی نہ دے چند لمحوں بعد پردے کی دوسری جانب ہونے والی گفتگو عظیمہ سُن رہی تھی۔ "کیا بات ہے؟ اس وقت آنے کی کیا ضرورت پیش آ گئی؟"

"بے ادبی معاف مالک۔" نوکر نے ہاتھ باندھ کر لوب سے کہا۔ "آپ سے ملنے کے لیے دو آدمی آئے ہیں۔"

"اس وقت کون آ گیا؟" امیر ذرا غصے سے بولا۔ "کون لوگ ہیں کس کام سے آئے ہیں؟"

عظیمہ کو بھی حیرت ہو رہی تھی۔ جالان گاؤں میں امیر اب ایک امیر آدمی سمجھا جاتا تھا اس لیے چھوٹے بڑے کام کے سلسلے میں لوگوں کا آنا جانا ہوتا رہتا تھا یہی وجہ تھی کہ عظیمہ نے یہ سمجھ لیا کہ صبح ہی صبح آنے والے یہ لوگ بھی امیر کے پاس کوئی بے حد ضروری کام سے آئے ہوں گے، اس خیال کے آتے ہی اس نے اپنے شوہر کے لیے اپنے اندر ایک فخر سا محسوس کیا اور پردے کے پیچھے ہونے والی بات چیت کو سننے کے لیے وہ اپنے بستر سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"مالک وہ لوگ کس کام کے لیے آئے ہیں یہ تو انھوں نے نہیں بتایا ہے۔" نوکر کی آواز عظیمہ کی سماعت سے ٹکرائی "لیکن وہ لوگ ہیڑی گاؤں سے یہاں آئے ہیں۔ انھوں نے اتنا ہی بتایا ہے۔"

"ہیڑی گاؤں سے؟" امیر بوکھلاہٹ بھرے لہجے میں بولا اور اس کی یہ بوکھلاہٹ عظیمہ سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔ چند لمحوں بعد امیر نے بہت ہی دھیمی آواز میں نوکر سے کچھ پوچھا جو عظیمہ نہیں سن سکی تھی۔ نوکر کے چلے جانے کے بعد امیر نے پردہ ہٹایا تو اس کا اُترا ہوا چہرہ دیکھ کر عظیمہ چونک پڑی۔ اس نے امیر کو گھورتے ہوئے پوچھا۔ "کون آیا ہے؟"

"ہوگا کوئی۔" امیر نے لاپروائی سے جواب دیا اور دوسری جانب دیکھنے لگا لیکن عظیمہ نے اس کے چہرے کا پھیکا پن دیکھ لیا، مگر اُسے شوہر کے معاملات میں دخل اندازی مناسب نہیں لگی اس لیے وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

"یہ وہی لوگ ہوں گے۔" امیر دل ہی دل میں بڑبڑایا۔ "نصیر الدین شیخ کے دونوں بزرگ دوست وہ شاید ہیڑی سے یہاں تک نصیر الدین شیخ کو تلاش کرتے ہوئے آئے ہیں؟ وہ یہ پوچھنے آئے ہوں گے کہ سال بھر پہلے شیخ نصیر الدین اس کے ہاتھ

جالان آنے کے لیے روانہ ہوا تھا لیکن وہ ابھی تک واپس ہڑی کیوں نہیں پہنچا؟ میں نے بھی بڑی بے وقوفی کی ہے...."

امیر کو اپنے آپ پر غصّہ آنے لگا کہ اُسے اپنا نام اور اپنے گاؤں کا نام و پتا بتا کر شیخ نصیر الدین کو اپنے ساتھ سفر پر چلنے کے لیے رضامند کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ اُس وقت اُسے خیال نہیں آیا تھا کہ جالان کے راجا کے ہاتھوں موتی فروخت کرنے کے لیے آنے والا یہ سوداگر اگر واپس اپنے گاؤں نہ پہنچا تو اس کو تلاش کرنے والے لوگ سب سے پہلے اس کے پاس ہی آجائیں گے، اب ان لوگوں کو کیسے ٹالا جائے؟

سوچتے سوچتے امیر کے اندر چھپا ہوا ٹھگ ایک بار پھر مچلنے لگا۔ اس نے سوچا کہ اس طرح مُنہ چھپانے سے مشکل حل نہیں ہوگی۔ مشکلوں کو تو ہمت سے مسل دینا پڑتا ہے۔ ان بوڑھوں کو بے وقوف بنانا کون سی مشکل بات ہے؟ اس فیصلے پر پہنچنے کے بعد اُس نے نوکر سے مہمانوں کے لیے ناشتا تیار کرنے کے لیے کہا اور جلدی جلدی ہاتھ منہ دھو کر خود بھی نیچے آگیا تاکہ مہمانوں کا سامنا کر سکے

●

"سبحان اللہ آپ؟" مہمان خانے میں بیٹھے ہوئے دونوں آدمیوں کی طرف دیکھ کر امیر خوشی سے بولا اور پھر اُن سے ہاتھ ملاتے ہوئے اس نے آگے کہا۔ "نوکر نے چونکہ آپ لوگوں کا نام نہیں بتایا تھا اس لیے میں تو اسی اُلجھن میں رہا کہ نہ جانے کون لوگ ہوں گے؟ اگر مجھے آپ لوگوں کے بارے میں معلوم ہو جاتا تو میں اسی وقت نیچے دوڑ آتا۔" یہ بات تو امیر نے یونہی کہہ دی تھی ورنہ حقیقت تو یہ تھی کہ وہ ان لوگوں کے نام سے واقف ہی نہیں تھا۔ اس کی بات سن کر اُن دونوں میں سے ایک بڑی عمر کے شخص نے اپنے ساتھی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "میں یہی کہہ رہا تھا اجمل میاں کہ امیر میاں ہمیں دیکھتے ہی پہچان لیں گے۔ شریف لوگ اتنی جلدی کسی کو بھول نہیں جاتے۔"

امیر کو یہ سن کر زبردستی ہنسنا پڑا لیکن وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ اُسے شریف آدمی کہہ کر کہیں یہ لوگ اس پر طنز تو نہیں کر رہے ہیں؟

"شریف و یریف تو بس ٹھیک ہی ہے۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "آپ جیسے بزرگوں کی دُعا سے گاؤں میں یہ ایک گھر ہے اور دو چار آدمیوں میں اپنی عزت ہے۔"

"رہنے دیجئے میر صاحب۔" اب اجمل نے کہا۔ "آپ ہمیں بنانے کی بات نہ کریں۔"

"بنانے کی بات؟" امیر کچھ گھبرا سا گیا۔ "آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں جناب؟"

"ہم ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" اجمل میاں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ کی اصلیت اب ہم لوگوں سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ اس شہر میں ایسا کوئی آدمی نہیں ہے جو آپ کو جانتا نہ ہو۔ میں اترنے کے بعد جب ہم نے کاروباری لوگوں سے کپڑے کے بارے میں پوچھا تو وہ سب ہماری خاطر مدارات کرنے لگے اور کہنے لگے کہ کیا آپ لوگ امیر میاں سے واقف ہیں؟ سرائے کی تعمیر کے لیے انھوں نے کافی رقم دی ہے۔"

"تو اسی لیے آپ سرائے میں ٹھہرے ہیں اور یہاں مجھ سے ملنے آئے ہیں؟" امیر نے بناوٹی محبت دکھاتے ہوئے کہا۔ "میں نے شاید یہ سمجھ لیا ہوگا کہ اُس بے چارے سپاہی کے یہاں ٹھہرنے کا کوئی انتظام نہیں ہوگا کیوں؟"

"نہیں یہ بات نہیں ہے۔" بزرگ شخص نے کہا۔ "آپ کی حیثیت سے ہم لوگ ناواقف نہیں تھے دراصل ہم تو آپ کے دولت خانے پر ہی ٹھہرنے والے تھے لیکن ہمارے ساتھ پانچ مسافر اور بھی تھے اس لیے ہمیں یہ مناسب نہ لگا۔"

امیر سوچ میں پڑ گیا کہ ان دونوں کے ساتھ اور کون ہو سکتے ہیں؟ اور یہ بات ان سے کس طرح پوچھی جائے؟ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ خود اجمل خان نے یہ بات بتا دی۔ "کپڑے کی خریداری کے لیے ہم سفر پر روانہ ہوئے تھے۔ واپسی پر یہ شہر آگیا تو ہمیں آپ کی یاد آگئی۔ ہمارے ساتھ ایک جوہری ہے جسے کچھ مال خریدنا تھا۔ اس لیے ہم نے آدھے دن کے لیے اس جگہ رکنے کا فیصلہ کیا ہے۔"

جوہری کا نام سُن کر امیر چونک پڑا۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ لوگ اپنے مطلب کی بات پر آنے سے پہلے اِدھر اُدھر کی فالتو باتیں کر رہے ہیں۔ اس لیے اس نے فیصلہ کر لیا کہ ان کے پوچھنے سے قبل وہ خود ہی کیوں نہ وہ بات چھیڑ دے؟ یہ سوچتے ہی اُس نے ہوشیاری سے پوچھا۔ "ارے ہاں ٹھیک یاد آیا... آپ کے ساتھ نصیر الدین شیخ کا کیا ہوا؟"

نصیر الدین شیخ کا نام سن کر وہ دونوں چونک پڑے اور کھلا کر ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے۔ امیر اُن کی حالت سے سمجھ گیا لیکن اس کے باوجود وہ انجان بنا رہا۔ "نصیر الدین شیخ صاحب بہت ہی بھولے آدمی تھے۔" امیر نے ان دونوں کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا تو کہنے لگا۔ "میں نے انھیں سمجھا بجھا کر اپنے ساتھ جالان آنے پر رضامند کیا تھا لیکن وہ آدھے راستے میں ہی ہم سے الگ ہو گئے۔"

"آپ سے الگ ہو گئے؟" وہ دونوں ایک ساتھ بول اُٹھے۔

"کیوں کیا انھوں نے یہ بات آپ لوگوں کو نہیں بتائی؟" امیر نے اپنی اداکاری جاری رکھی۔ "جالان شہر جب سات آٹھ دن کے سفر کے فاصلے پر رہ گیا تو راستے میں کچھ مسافر دکھائی دیے جو بیوپاری لگ رہے تھے۔ انھوں نے شیخ صاحب سے کہا کہ شیواپوری کے راجا کے بیٹے کی شادی ہے۔ ہم لوگ وہاں قیمتی کپڑے فروخت کرنے جا رہے ہیں۔ تم ہمارے ساتھ چلو تو تمھیں بھی اچھا فائدہ ہوگا۔" اتنا کہہ کر امیر جان بوجھ کر اٹک گیا وہ دونوں اب بھی سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے تھوڑی دیر بعد اس نے ایک بار پھر آگے کہنا شروع کیا۔ "میں نے شیخ صاحب کو بہت سمجھانے کی کوشش کی کہ اجنبی لوگوں کی باتوں میں نہیں آنا چاہیے کیا معلوم یہ لوگ آپ سے سچ کہہ رہے ہیں یا جھوٹ؟ لیکن نصیر الدین شیخ نے میری بات نہیں مانی۔ شاید انھیں لوگوں نے شیخ صاحب کو میرے خلاف بھڑکایا ہوگا۔ خیر جو بھی ہوا ہو لیکن وہ جالان کی طرف جانے کی بجائے شیواپوری کی جانب چل پڑے تھے۔"

وہ دونوں امیر کی بات سن کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے تھے۔

"آپ دونوں خاموش کیوں ہیں؟" امیر نے انھیں گھورتے ہوئے پوچھا۔ "آپ لوگوں کے چہروں سے تو یوں لگ رہا ہے جیسے کوئی نہ ہونے والی بات ہو گئی ہے۔" اتنا کہہ کر اس نے اپنی آواز میں بے چینی پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے وہ لوگ کچھ اچھے آدمی نہیں لگ رہے تھے۔"

"آپ کا اندازہ درست ہے۔" بوڑھے نادر علی نے کہا۔ "نصیر الدین نے آپ کی بات مان لی ہوتی تو اچھا تھا۔"

"کیوں؟" امیر حیرت سے بولا۔ "کیا وہ راستے میں لُٹ گئے؟"

"اگر بات لُٹنے کی ہوتی تو بھی بہتر تھا۔" اجمل خان بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "وہ تو ہمیشہ کے لیے ہم سے بچھڑ گئے ہیں۔"

"کیا؟" امیر کرسی پر سے اُچھل پڑا۔ "تب تو یقیناً وہ بیوپاری لٹیرے ہوں گے۔ ان کی لاش کہاں سے ملی؟"

"لاش؟" نادر علی نے ایک گہرا سانس لیا۔ "اس کا تو پتا ہی نہیں چلا۔"

"کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" امیر نے کانپ جانے کی اداکاری کی۔ "تب... تو..."

"کیا؟" وہ دونوں ایک ساتھ بولے۔ "امیر میاں آپ رُک کیوں گئے؟"

"مجھے شک ہے کہ وہ لوگ لٹیرے نہیں بلکہ ٹھگ ہوں گے۔" امیر بولا۔

"ہمارا بھی یہی خیال ہے۔" اجمل خان کی یہ بات سن کر امیر پھر چونک پڑا کہ ان لوگوں کو یہ شک کیسے پیدا ہو گیا؟

"اس کی وجہ؟" امیر ایک لمحے کی توقف کے بعد پوچھ بیٹھا۔

"یہ تو آپ نے بھی سنا ہو گا کہ انگریز افسر ولیم سلومن نے ایک سال قبل سو بدمعاشوں کے ایک گروہ کو گرفتار کیا تھا بعد میں وہ لوگ ٹھگ ثابت ہوئے تھے۔ جنھوں نے کئی مسافروں کو ختم کرنے کے بعد ایک گڑھے میں دفنا دیا تھا انگریز افسر نے گڑھے سے اُن لاشوں کو نکلوایا تب یہ بات معلوم ہوئی تھی۔"

"اوہو۔" امیر کے مُنہ سے اس طرح نکلا جیسے اُسے ایک شدید جھٹکا لگا ہو مگر پھر اس نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا۔ "آپ نے کیا نام بتایا اُس انگریز افسر کا؟"

"ولیم سلومن ہی تھا شاید۔"

"سلومن۔" امیر ہونٹوں ہی ہونٹوں میں بڑبڑایا شاید اُسے یقین نہیں آرہا تھا کہ کسی انگریز کا نام بھی سلومن ہو سکتا ہے۔

"خیر۔" امیر نے اس بات کو ختم کرتے ہوئے کہا۔ "وہ آدمی واقعی بہت قابل شخص ہوگا ورنہ دیکھیے نا ہم لوگوں نے ٹھگوں کی باتیں تو بہت سُنی ہیں لیکن کیا کبھی کوئی ٹھگ گرفتار بھی ہوا ہے؟"

ٹھیک اُسی وقت گھر کا ملازم ناشتا اور قہوہ لے کر آگیا اور امیر نے اطمینان کا سانس لیا کہ چلو یہ مصیبت تو ٹلی۔ آدھے گھنٹے تک ناشتے کے ساتھ ساتھ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں اس کے بعد امیر نے کہا۔ "اب ہم لوگ دوپہر کا کھانا بھی ساتھ

ہی کھائیں گے۔"

لیکن اب ان دونوں کو وہاں ٹھہرے رہنے میں زیادہ دلچسپی نہیں تھی اس لیے انھوں نے ایک بہانہ ڈھونڈ لیا اور بوڑھے نادر علی نے کہا۔ "آپ کا بہت بہت شکریہ میر صاحب ہمارے ساتھ آئے ہوئے مسافر ہماری راہ دیکھ رہے ہوں گے۔" اتنا کہہ کر وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ امیر کے دل کا سارا خوف اب دور ہو چکا تھا اس لیے اس نے سوچا کہ رسم کے طور پر اُسے ان لوگوں کو رخصت کرتے وقت کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی چاہیے یہی سوچ کر وہ بولا۔ "شیخ صاحب کے بیوی بچوں کو میری جانب سے تسلی دیجیے گا۔ شیخ صاحب نہایت عمدہ انسان تھے۔ ویسے تو مجھے جالان آتے ہی اس بات کا پتا چل گیا تھا کہ شیوا پوری کے راجا کے بیٹے کی شادی کی بات سراسر جھوٹی ہے۔"

●

نادر علی اور اجمل خان جب تک سرائے میں واپس نہ آگئے اُس وقت تک امیر کے کہے ہوئے الفاظ ان کے دماغ میں گونجتے رہے امیر کی ساری باتیں ان کے گلے سے نیچے اتر چکی ہیں۔ یہاں آتے ہی انھوں نے امیر کی شرافت کا ذکر سنا تھا اسی وقت سے ان کا شبہہ کچھ کم ہو گیا تھا۔ پھر اس سے مل آنے کے بعد تو رہا سہا شک بھی دور ہو گیا تھا۔ انھیں لگ رہا تھا کہ وہ شرمندہ ہو کر واپس آئے ہیں۔ مگر پھر بھی جالان سے جاتے وقت انھوں نے ایک کاروباری شخص سے پوچھا۔ "آپ کے راجا کی بیٹی کی شادی ہونے والی تھی کیا وہ شادی ہو گئی؟"

سوال سن کر وہ بیوپاری بے ساختہ ہنس پڑا اور بولا۔ "ارے جناب آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟" بیوپاری بہ مشکل اپنی ہنسی روک کر آگے بولا۔ "ہمارے راجا کی تو کوئی بیٹی ہی نہیں ہے اور بڑھاپے میں اُس کے باپ بننے کی اُمید بھی نہیں ہے۔"

"کیا؟" وہ دونوں ایک جھٹکے سے چونک پڑے دونوں کے دماغ میں یہ سوال دوڑ رہا تھا کہ تو پھر امیر نے جھوٹ بول کر شیخ نصیر الدین کو جالان آنے پر کیوں رضامند کیا تھا؟ تو کیا وہ خود بھی ایک ٹھگ ہے؟

یہ ساری باتیں سوچنے کے بعد انھوں نے پوری معلومات حاصل کیے بغیر جالان سے جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

●

امیر اپنی دو سالہ بچی کو ہاتھوں سے اُچھال اُچھال رہا تھا۔ بچی جب اپنے باپ کے ہاتھوں سے اُچھل کر ماں کی طرف جاتی تو خوف سے اس کا دل دھڑکنے لگتا تھا جیسے ہی وہ دوبارہ باپ کے ہاتھوں میں آجاتی تو کھل کھلا کر ہنس پڑتی تھی۔ امیر اس کے گالوں پر بوسے دیتا اور مسکراتی نظروں سے اس کی جانب دیکھنے لگتی مگر جب اس کی مونچھیں اس کے گالوں سے ٹکرا جاتیں تو وہ مُنہ پھیر لیتی اس کی یہ حرکت دیکھ کر امیر کو خیال آجاتا کہ عظیمہ بھی اسی طرح اُس کی مونچھوں سے چڑتی تھی اور مُنہ پھیر کر کہا کرتی "تمھاری ان مونچھوں سے ڈر لگتا ہے۔"

"تو پھر صاف کروا دوں؟" امیر مذاق میں پوچھتا۔

"مجھے تو تمھاری یہ داڑھی بھی چُبھتی ہے۔" عظیمہ اُسے چھیڑتی۔ "کیا اُسے بھی صاف کروا دو گے؟"

"اگر تم اسی طرح بار بار مُنہ پھیر لیا کرو گی تو مجھے داڑھی بھی صاف کرانی پڑیں گی۔" یہ سن کر عظیمہ کھل کھلا کر ہنس پڑتی وہ ہنس ہنس کر دوہری ہو جاتی تو امیر اس کا کان پکڑ کر اُسے روکتا اور کہتا۔ "ارے اتنا ہنس کیوں رہی ہو! بتاؤ تو سہی میں بھی تمھارا ساتھ دوں۔"

"پہلے میرا کان چھوڑ دو۔"

"لو چھوڑ دیا اب بتاؤ۔"

"میں تو اس خیال سے ہنس رہی تھی کہ داڑھی مونچھیں کرانے کے بعد تم کیسے لگو گے؟" عظیمہ اپنی ہنسی کو روکنے کی کوشش کرتی ہوئی بولی

"تم ہی بتاؤ کیسا لگوں گا؟"

"خوبصورت عورت جیسے۔" یہ کہہ کر عظیمہ پھر زور زور سے ہنسنے لگی۔

بچی سے کھیلتے وقت امیر کو یہ ساری باتیں کیسے یاد آئیں اچانک ایک خیال تیزی سے اس کے ذہن میں اُبھرا کہ اگر یہ بچی بڑی ہو جائے گی اور اس کی شادی ہو گی تو دونوں میاں بیوی کے درمیان داڑھی اور مونچھوں پر تکرار ہوا کرے گی۔ اس سے شادی کے بعد وہ اکثر سوچتا رہتا تھا کہ کاش یہ جوانی

یہ دن ہمیشہ ایسے ہی رہیں تو کتنا اچھا ہو لیکن اب اپنی بیٹی سے کھیلتے وقت وہ یہ سوچ رہا تھا کہ کاش یہ جلدی سے بڑی ہو جائے تو کتنا اچھا ہو۔

یکایک اس کی سماعت سے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز ٹکرا گئی۔ امیر نے باہر کی جانب دیکھا تو راجا کا قاصد صحن میں داخل ہوتا دکھائی دیا۔ قاصد کو دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ راجا صاحب کا بُلاوا آگیا ہے۔ پچھلے آٹھ دس دنوں سے وہ چونکہ محل میں گیا نہیں ہے اس لیے راجا نے اُسے یاد کیا ہو گا۔ راجا نے دو ایک بار طنز کرتے ہوئے کہا تھا۔ "امیر میاں تم محصول تو اچھا وصول کرلاتے ہو لیکن باقی کے چھ مہینے گھر میں کس طرح بیٹھے رہتے ہو سفر پر جاتے رہو تو۔۔۔"

امیر اُس کی اس اُدھوری بات کا مطلب سمجھ جاتا۔ سفر سے واپس آکر وہ راجا کو قیمتی نذرانے پیش کرتا تھا اور اب اس کے سفر پر نہ جانے کی وجہ سے وہ تحائف اور نذرانے بند ہو گئے تھے اور یہ بات لالچی راجا کو اب کھٹکتی تھی۔ پچھلے سفر سے واپس آکر امیر نے اس کی خدمت میں دو ہزار کا نذرانہ پیش کیا تھا مگر راجا نے اس پر خوشی کا اظہار نہیں کیا تھا بلکہ بے دلی سے نذرانہ قبول کرتے ہوئے اس نے کہا تھا۔ "امیر علی تمھارا شمار جالان کے بڑے سوداگروں میں ہوتا ہے اور ہمیں تم سے اتنے حقیر نذرانے کی توقع نہیں ہے۔ اب آیندہ سے یہ بات یاد رکھنا۔"

"اَن داتا۔ اس بار دھندہ ٹھیک نہیں رہا۔" امیر کو اپنے اس تخاطب پر ہنسی آرہی تھی۔ بھلا رعایا کا خون چوسنے والے راجا کو اَن داتا کیسے کہا جا سکتا تھا؟ پھر اس نے فوراً ہی آگے کہا۔ "اب تو میں سفر پر جانے کا ارادہ ہی نہیں رکھتا میں اب آپ کی خدمت میں رہ کر ہی بقیہ زندگی گزار دینا چاہتا ہوں اس وقت راجا نے ہنس کر اس بات کو ٹالنے کی کوشش کی تھی۔

"آپ کو مہاراج نے یاد کیا ہے۔" قاصد نے قریب آکر ادب سے کہا۔ "انھوں نے اسی وقت آپ کو بلایا ہے۔"

"اسی وقت۔" امیر بڑبڑایا۔ اس کے جی میں آیا کہ وہ قاصد سے پوچھ لے کہ ایسا کون سا اہم کام ہے؟ لیکن ایک ادنیٰ خادم سے یہ سوال کرنا اُسے مناسب نہیں لگا مگر اس نے یہ ضرور پوچھ لیا۔ "مہاراج صاحب کا مزاج تو ٹھیک ہے؟"

راجا کے پاس جانے سے پہلے ہمیشہ امیر اس کا مزاج پوچھ لیا کرتا تھا۔

"آج ان کے مزاج کا اندازہ نہیں ہو سکا۔" فاصد نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ "وہ بہت جلدی میں دکھائی دے رہے تھے۔"

"ٹھیک ہے میں ابھی پہنچ رہا ہوں۔" کہہ کر امیر نے اُسے رخصت کر دیا پھر خدمت گار کو آواز دے کر بولا۔ "میرا گھوڑا تیار کرو۔"

عظیمہ باورچی خانے میں بیٹھی کام میں مصروف تھی۔ امیر نے بچی کو اُس کے کاندھوں پر بیٹھا دیا اور بولا۔ "اب سنبھالو اپنی لاڈلی کو... مجھے دربار میں جانا ہے۔"

عظیمہ نے بچی کو کندھے سے نیچے اتارتے ہوئے پوچھا۔ "اس وقت؟"

"ہاں راجا کا بُلاوا آیا ہے۔" امیر نے مذاق میں کہا۔ "کیوں آپ کی اجازت تو ہے نا دربار جانے کی؟"

"پوچھ تو ایسے رہے ہو جیسے ہر کام میری اجازت ہی سے تو کرتے ہو؟" عظیمہ نے بھی مذاق میں جواب دیا۔ "اگر میرا حکم چلتا تو میں تمھیں سخت سے سخت سزا کا حکم سناتی۔"

"کس بات کی سزا عظیمہ؟" امیر نے گھبرا کر پوچھا تو عظیمہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ "چوبیس گھنٹے گھر میں رہ کر تم مجھے تنگ کرتے رہتے ہو اس کے لیے تمھیں چھ ماہ کی سزا ہونی چاہیے۔"

"بس صرف چھ مہینے کی سزا؟" امیر مسکرا کر بولا۔ "تم کہو گی تو میں راجا صاحب سے عمر قید کی سزا مانگ لوں گا۔"

مذاق میں کہے ہوئے ان لفظوں نے بھی عظیمہ کو ایک شدید جھٹکا پہنچایا اُس نے گردن اٹھا کر امیر کی طرف دیکھا۔ "ایسی باتیں کرتے ہوئے تمھیں شرم نہیں آتی۔" اتنا کہہ کر وہ پیار بھرے لہجے میں آگے بولی۔ "زندگی بھر کے لیے تو میں نے تمھیں قید کر ہی لیا ہے۔ اب میں تمھیں کسی اور قید خانے میں نہیں جانے دوں گی۔" بولتے بولتے عظیمہ کا چہرہ جذبات سے سُرخ ہو گیا۔ اس کے چہرے کی لالی دیکھ کر امیر نیچے جھکا لیکن عظیمہ نے پھرتی سے اپنا مُنہ دوسری جانب پھیر لیا اور بولی۔ "تم ہو بھی اس کام کے علاوہ تمھارے پاس کوئی اور کام نہیں ہے کیا؟"

"یہ بات ہے۔" امیر دروازے کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے بولا۔ "رات کو تم سے نپٹ لوں گا۔"

عظیمہ کے دل پر ایک کپکپاہٹ سی دوڑ گئی سہاگ رات والے دن امیر نے یہی جملہ اس سے کہا تھا۔ "رات کو تم سے نپٹ لوں گا۔"

لیکن بے چاری عظیمہ کو یہ بات کب معلوم تھی کہ اس کی زندگی میں اب کوئی ایسی رات آنے والی ہی نہیں ہے۔

●

راجا کے کمرہ خاص میں داخل ہو کر امیر نے ادب سے جُھک کر سلام کیا معاملہ اگر بہت ہی اہم ہو تب ہی راجا اپنے خاص کمرے میں کسی سے ملاقات کرتا تھا۔ اس کے چہرے سے امیر نے اس کے مزاج کا حال جاننے کی کوشش کی لیکن خوشی یا ناراضگی کے کسی تاثر کا وہ اندازہ نہیں لگا سکا۔ جب تک راجا نے اُسے بیٹھنے کا اشارہ نہیں کیا اُس وقت تک وہ اپنی جگہ پر کھڑا ہی رہا پھر جب راجا نے اپنے خدمت گار کو آنکھ کے اشارے سے باہر بھیج دیا تو امیر کو حیرت کا ایک جھٹکا محسوس ہوا۔ کیوں کہ یہ خدمت گار گونگا اور بہرہ تھا اور اِسی لیے کمرہ خاص کی صفائی کی ذمے داری اس کو سونپی گئی تھی تاکہ اس کمرہ خاص میں ہونے والی گفتگو کسی اور کے کانوں تک نہ پہنچ سکے اور امیر کو اسی بات پر حیرت ہو رہی تھی کہ ایسے بے ضرر آدمی کو کمرے سے باہر بھیجنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟

"بیٹھو امیر میاں۔" راجا نے نیچے بچھے قالین کی طرف اشارہ کر کے اُسے اپنے سامنے بیٹھنے کے لیے کہا۔

"فرمائیے اَن داتا۔" امیر نے چاپلوسی سے کہا۔ "خادم کو کس لیے یاد کیا گیا ہے؟"

"ایک کام آپڑا تھا۔" راجا نے حقّے کی نلی کو ہونٹوں سے ہٹائے بغیر ہی کہا اور تھوڑی دیر تک امیر کے چہرے کو دیکھتا ہوا خاموش رہا۔ امیر اس کی عادت سے واقف تھا۔ وہ کوئی بات جلدی کہہ دینے کا عادی نہیں تھا وہ دھیرے دھیرے اور رُک رُک کر باتیں کرنے میں ہی شاید اپنی شان سمجھتا تھا۔ "تمھاری ضرورت اس لیے پڑ گئی کہ" اتنا کہہ کر راجا نے حقّے کے کش لگانا شروع کر دیے۔ نہ جانے کیوں راجا کا یہ انداز آج امیر کو کچھ مختلف محسوس ہو رہا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ راجا اُس کے چہرے کو بار بار باریک بینی سے گھورتے ہوئے ایک ایک لفظ کہہ رہا تھا جو امیر نے اس سے پہلے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔

"ایک راج کماری کی شادی کے لیے مجھے زیورات پسند کرنے ہیں۔" راجا اُسے ترچھی نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔ "موتیوں کی تو تمھیں اچھی پہچان ہے نا؟"

"اس کی کوئی خاص پہچان تو نہیں ہے مہاراج۔" امیر کو کچھ اطمینان سا محسوس ہوا۔ "ویسے تھوڑا بہت پرکھنا جانتا ہوں۔"

بوڑھے راجا نے ہنس کر اپنی سفید داڑھی کو کھجایا پھر حقّے کی نے سے اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "سامنے تھال میں کچھ زیورات اور موتی رکھے ہیں اُسے ذرا سامنے لے آؤ۔"

حکم کی تعمیل کرنے کے لیے امیر اپنی جگہ سے خوشی خوشی اٹھا ایک کونے میں ململ سے ڈھکا ہوا ایک تھال پڑا تھا اُسے اٹھا کر راجا کے سامنے رکھنے کے بعد امیر نے اُس پر ڈھکا ہوا کپڑا ہٹایا تو اس کے روئیں روئیں میں ایک برقی لہر سی دوڑ گئی۔ موتی کی ایک مالا کو اس نے ہاتھ لگایا ہی تھا کہ اُسے یوں لگا جیسے اس نے آگ پر ہاتھ رکھ دیا ہو اُس نے ایک جھٹکے سے گردن اُٹھا کر راجا کی طرف دیکھا تو اُسے بوڑھے راجا کی اندر کو دھنسی ہوئی آنکھوں میں نفرت کے سائے ابھرتے دکھائی دیے۔ اچانک نفرتوں کے ان سایوں میں امیر کو اپنی موت بھی لپٹی ہوئی دکھائی دینے لگی۔

لیکن کچھ بھی ہو آخر تو وہ ایک ماہر ٹھگ تھا۔ اس نے اپنے چہرے سے کسی خوف کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ ابھی ایک لمحے قبل خوف کی جو شدید لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں لہرائی تھی اُسے بھول کر وہ دھیرے سے ہنسا اور بولا۔ "ان موتیوں نے تو مجھے چونکا ہی دیا تھا۔"

"کیوں؟" راجا کے ہونٹوں پر بھی طنزیہ مسکراہٹ تھی۔ "اس میں کوئی خاص خوبی ہے کیا؟"

جواب میں امیر یہ کہنا چاہتا تھا کہ ان موتیوں کو میں نے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے لیکن یہ کہہ کر وہ کسی مصیبت میں پڑ سکتا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی اُس نے اپنا یہ ارادہ بدل دیا اور بھالا پن سے بولا۔ "مہاراج آپ کو تو یہ معلوم ہی ہو گا کہ کچھ عرصے میں باغی چھتیو کے لشکر میں رہ چکا ہوں؟"

راجا کے چہرے سے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ امیر کی بات دلچسپی سے سن رہا ہو اُسے اپنی جانب متوجہ پا کر امیر نے آگے کہنا شروع کیا۔ "چھتیو کے ساتھ ایک سردار تھا جس کا نام تو میں بھول گیا ہوں لیکن وہ بہت ہی مکّار اور خطرناک آدمی تھا۔ اسے زیورات لوٹنے کا بہت شوق تھا اور مجھے یاد آ رہا ہے یہ چمکدار موتی کی مالا میں نے اُسی کے پاس دیکھی تھی۔"

"تب تو شاید یہ لوٹ کا مال ہے۔" راجا پھر آدھی بات کہہ کر رُک گیا اور دھار دار نظروں سے امیر کی طرف دیکھنے لگا امیر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر یہ بوڑھا راجا چاہتا کیا ہے؟ تھوڑی دیر تک تو وہ راجا کے ارادے کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا پھر پوچھ بیٹھا۔ "مگر مہاراج آپ نے یہ تو بتایا نہیں کہ کس راجا کی راجکماری کی شادی کے لیے آپ سوغات دینا چاہتے ہیں؟"

یہ سنتے ہی بوڑھے راجا کے چہرے پر بکھری ہوئی سلوٹیں تنگ ہو گئیں اور وہ سخت لہجے میں بولا۔ "کہوں؟ ہماری اپنی راجکماری کی شادی ہے۔ یہ بات کیا تمھارے علم میں نہیں ہے؟"

امیر کپکپا کر رہ گیا اُسے لگا کہ دو دھاری تلوار نے اُوپر سے نیچے تک اُسے دو حصّوں میں تقسیم کر دیا ہو۔ "آپ کی راجکماری؟" بے یقینی کے انداز میں وہ بڑبڑایا لیکن بوڑھے راجا نے اُسے آگے بولنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ "کیوں اس بات پر تمھیں حیرت ہو رہی ہے کیا؟"

"لیکن آپ کی تو کوئی بیٹی نہیں ہے۔"

"کس نے کہا؟" راجا سے اب ضبط نہیں ہوا۔ "میری ریاست میں تم اتنے برسوں سے رہ رہے ہو اور تمھیں اتنا بھی ہوش نہیں ہے؟"

امیر پسینے پسینے ہو گیا اور ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتے ہوئے وہ بُری طرح ہانپنے لگا۔ وہ سمجھ گیا کہ جس طرح بِلّی زخمی چوہے کو کھلاتی ہے بالکل اُسی طرح راجا بھی اُس سے کھیل رہا ہے۔ اب اس میں کچھ بولنے کی ہمت نہیں تھی مگر اس نے اپنے ہوش و حواس نہیں کھوئے تھے۔ چند لمحے سوچنے کے بعد اس نے ہمت کر کے زبان کھولی۔ "ہاں اب یاد آ گیا۔" اس نے اپنی اکھڑی ہوئی سانس پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے آگے کہا۔ "بیڑی کے ایک جوہری سے میں نے کہا تھا آپ کی راجکماری کی شادی ہونے والی ہے۔"

یہ سُن کر راجا کے چہرے پر خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی لیکن خوشی کی یہ لہر زیادہ دیر تک اُس کے چہرے پر قائم نہ رہ سکی۔ یکایک اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ "لیکن وہ بے چارہ جوہری جالان تک پہنچا ہی نہیں۔ راستے میں ہی تم نے اس کی جان لے لی۔"

"مہاراج۔" امیر ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھا اور غصّے سے لال پیلا ہوتا ہوا چیخ کر بولا۔ "مجھ پر اتنا بڑا الزام؟" امیر

نے جان بوجھ کر ہی اپنے غصّے کا اظہار کیا تھا، وہ راجا پر یہ بات ثابت کر دینا چاہتا تھا کہ وہ چونکہ بے قصور ہے اس لیے یہ بے عزتی برداشت نہیں کر سکا ہے اور اسی لیے آپے سے باہر ہو گیا ہے۔ اس نے فوراً ہی سنبھل جانے کی اداکاری کی اور عاجزانہ لہجے میں بولا "بے ادبی کی معافی چاہتا ہوں مہاراج آپ تو ہمارے اَن داتا ہیں آپ کو حق ہے آپ جو چاہے الزام لگا دیں۔ میری بدتمیزی کو معاف کر دیں۔"

امیر اپنے آخری جملے میں اپنی بدتمیزی کی معافی مانگ رہا تھا یا اپنے جرم کا اقرار کر رہا تھا؟ راجا اپنی سفید داڑھی پر انگلیاں پھیرتے ہوئے سوچ رہا تھا۔

"امیر تمھیں دربار میں حاضر ہونا پڑے گا۔" تھوڑی دیر بعد راجا نے کہا۔

"لیکن مہاراج آپ نے جو مجھے عزت اور مرتبہ عطا کیا ہے اس کا تو خیال کریں۔" امیر کانپتی آواز میں بولا۔

"اب بہت دیر ہو چکی ہے۔" راجا کا لہجہ سخت ہو گیا۔ ہماری راجکماری کی شادی کا بہانہ بنا کر تم نے ہیرے کے جوہری سے اس کے قیمتی زیورات اور موتی ہتھیا لیے اور معمولی نذرانہ دے کر مجھے بے وقوف بنایا ہے۔" راجا نے حقّے کی نلی ایک طرف رکھ دی اور آگے بولا "ہر بار تم مجھے بے وقوف بناتے ہوئے کہتے تھے کہ مہاراج اس بار سفر میں کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا ہے۔ جس نے تمھیں آسرا دیا تم نے اسی کو دھوکہ دیا بدمعاش۔"

راجا کا بڑھتا ہوا غصّہ امیر کے حوصلے پست کرتا جا رہا تھا لیکن پھر بھی اس نے بچ نکلنے کی کوشش جاری رکھی۔ "مہاراج لگتا ہے کسی نے میرے خلاف آپ سے شکایت کی ہے۔" امیر روہانسی آواز میں بولا۔ "میں اپنی تمام ملکیت آپ کے قدموں میں ڈال دینے کے لیے تیار ہوں لیکن آپ مجھے دربار میں کھڑا نہ کریں۔"

"ہا... ہا... ہا۔" راجا نے ایک بھیانک قہقہہ لگایا اور اس طرح بولا جیسے امیر کی حالت دیکھ کر اُسے خوشی ہو رہی ہو "اب تمھاری ساری جائیداد میری ہونے ہی والی ہے لیکن اس سے پہلے مجھے فریادی کو انصاف فراہم کرنا ہے تاکہ کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ جالان کا راجا انصاف کرتا نہیں جانتا۔"

"فریادی کون ہے مہاراج؟"

"اس کا پتا تمھیں دربار میں چل جائے گا۔"

"کیا انصاف کا یہ ڈرامہ کھیلنا ضروری ہے؟" امیر کے مُنہ سے یہ الفاظ نکلے ہی تھے کہ راجا کے غصّے کا پارہ اور زیادہ چڑھ گیا۔

"نمک حرام، بدمعاش، کتّے۔" راجا اپنی جگہ سے اُچھل کر بہت زور سے چیخا۔

"میرے انصاف کو ڈرامہ کہہ رہا ہے تیری یہ مجال؟" اتنا کہہ کر اس نے تالی بجائی اور آگے بولا "اب دیکھنا میں تمھاری کیا دُرگت بناتا ہوں؟"

امیر بھیجے پھر چکا تھا دربار میں کھڑے ہو کر مجرم نہ ہونے کی بجائے اُسے موت بہتر لگ رہی تھی۔ اسی لیے اس نے ایک آخری کوشش کی۔ "مہاراج میری بُری حالت کرنے سے پہلے ایک بات یاد رکھیے گا۔ میں بھرے دربار میں چیخ چیخ کر کہوں گا کہ میرے تمام جرم میں آپ برابر کے شریک ہیں میرے اصلی دھندے سے آپ واقف تھے اور ہمیشہ آپ نے نذرانے کے بہانے اپنا حصّہ وصول کر لیا ہے۔"

امیر کی یہ بات راجا سے برداشت نہیں ہوئی۔ وہ جوش میں آکر نیام سے اپنی تلوار نکالنا ہی چاہتا تھا کہ اچانک اُسے خیال آیا کہ امیر ابھی آزاد ہے اور وہ چاہے تو چھلانگ لگا کر اس کے وار کو روک کر خود اس پر وار کر سکتا ہے۔ ٹھیک اسی وقت چار چھ سپاہی ہتھیاروں سے لیس اس کمرے میں داخل ہوئے راجا انھیں دیکھتے ہی چلایا۔ "گرفتار کر لو اس بدمعاش کو۔"

امیر کے پاؤں میں اب کھڑے رہنے کی طاقت بھی نہیں تھی اور اس کے پاس ہتھیار بھی نہیں تھا۔ دستور کے مطابق راج محل میں داخل ہونے سے قبل ہتھیار وغیرہ کو باہر ہی چھوڑ آنا پڑتا تھا۔ یہ ہی وجہ تھی کہ اُسے بھی اپنی تلوار باہر چھوڑ کر نہتے اندر آنا پڑا تھا۔ اس نے وحشت دار نظروں سے سپاہیوں کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ خبردار مجھے ہاتھ مت لگانا...

سپاہیوں کو جیسے ہمیشہ جُھک جُھک کر سلام کرنے کی عادت سی پڑ چکی تھی جس سے ہر تہوار کے موقعے پر انھیں اچھی خاصی بخشش ملتی رہتی تھی اس امیر علی کی جانب بڑھتے ہوئے خود سپاہیوں کے قدم بھی لڑکھڑا رہے تھے۔

"تم لوگ کھڑے کیوں ہو؟" راجا نے چیخ کر کہا۔ "میں کہتا ہوں اس ٹھگ کے بچے کو گرفتار کر لو۔"

دوسرے ہی لمحے امیر چار مضبوط سپاہیوں کے شکنجے میں جکڑ گیا۔

"لے جاؤ اِسے" میری نظروں کے سامنے سے۔" راجا نے انگلی اٹھا کر سپاہیوں کو حکم دیا۔ "اِسے زنجیروں سے باندھ کر دربار میں حاضر کرو اِس کے جُرم کا حساب وہیں چکتا ہو جائے گا۔"

سپاہی امیر کو گھسیٹ کر باہر لے جانے لگے اور امیر اتنی خونخوار نظروں سے راجا کو دیکھنے لگا کہ اس کے گرفتار ہو جانے کے باوجود راجا کو اس کی نظروں سے خوف آنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ امیر سر جھکا دے گا اور گڑگڑا کر اس سے رحم کی بھیک مانگے گا اور آنسو بہا کر اس سے عاجزی کرے گا لیکن اس کی بجائے امیر تو اُسے غصّے سے دیکھ رہا ہے۔ آخر کس طاقت پر اُسے اتنا بھروسا ہے؟

"سن لو امیر۔" سپاہی جب امیر کو دروازے تک لے گئے تو راجا نے اپنی آواز میں نرمی پیدا کرتے ہوئے اُسے آواز دی۔ "جو کچھ تم نے یہاں کہا ہے اگر اس کا ایک لفظ بھی تم نے دربار میں کہا تو تمھارے ساتھ تمھارے بیوی بچوں کی بھی بُری حالت ہو جائے گی۔" اور اس ایک دھمکی میں ہی امیر کی ساری طاقت اور ساری ہمت پگھل کر رہ گئی۔ اُس نے سر جھکا کر اپنی شکست تسلیم کر لی پلکیں جُھکا کر اس نے راجا کی دھمکی کو قبول کر لیا اور ایک مجرم کی طرح روتی صورت بنا کر وہ سپاہیوں کے ساتھ باہر نکل گیا۔

●

ایک انتہائی اہم فیصلے کے لیے دربار کی کارروائی فوری طور پر شروع ہو چکی تھی اور دربار لوگوں سے کھچا کھچ بھر چکا تھا۔ اپنے تخت پر بیٹھنے کے بعد مہاراجا نے درباریوں پر ایک اُچٹتی نظر ڈالی اور پھر اپنی گرجدار آواز میں بولا۔

"میری داہنی جانب بیٹھے ہوئے یہ لوگ فریادی ہیں اور ملزم۔" اتنا کہہ کر راجا اپنی عادت کے مطابق تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔ ملزم کا نام سننے کے لیے دربار میں موجود ہر شخص تجسّس بھری نظروں سے راجا کی طرف دیکھ رہا تھا، لیکن راجا نے اس کا نام ظاہر کیے بغیر کہا۔ "ملزم کو ابھی دربار میں حاضر کر دیا جائے گا اور تب آپ لوگ اُسے پہچان لیں گے۔"

درباریوں کی بے چینی اور بڑھ گئی تھی۔ وہ سب ان دونوں فریادی کو گھور گھور کر دیکھنے لگے تھے جو راجا کی داہنی جانب بیٹھے ہوئے تھے۔ عام سے دکھائی دینے والے دونوں فریادی نے جب سب لوگوں کو اپنی جانب گھورتے ہوئے پایا تو انھوں نے اپنی نگاہیں جُھکا لیں۔ دربار میں موجود ہر شخص کے ذہن میں ایک ہی سوال ابھر رہا تھا کہ ملزم کون ہے؟

دربار کا ماحول خاصا گمبھیر بنا ہوا تھا، انصاف کا دارومدار راجا کے مزاج پر تھا۔ اس کے چہرے پر اس وقت غصّے کی سُرخی دوڑ رہی تھی۔ جس سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ ملزم جو کوئی بھی ہو اس کا سزا سے بچنا محال ہے۔

"اسے حاضر کیا جائے۔" حکم سنتے ہی دربار میں سناٹا سا چھا گیا۔ ہر آنکھ دربار کے داخلی دروازے پر جمی ہوئی تھی اور لوہے کی زنجیروں کی کھڑکھڑاہٹ سننے کے لیے ہر شخص کے کان کھڑے ہو چکے تھے۔ تھوڑی دیر کی اس تاخیر نے لوگوں کو اپنی سانسیں روکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ آگے دو اور پیچھے دو سپاہیوں کے درمیان سر جھکا کر دربار میں داخل ہونے والے مُلزم کو پہچاننے میں لوگوں کو چند لمحوں کی دیر لگی لیکن جب آگے بیٹھے سپاہی ہٹ گئے اور راجا کے قریب جانے کے لیے مُلزم نے اپنی گردن اونچی کی تو تمام لوگوں کی رُکی ہوئی سانسیں ایک ساتھ سسکاری میں بدل گئیں۔ "ارے... یہ تو امیر علی ہے!"

یوں لگ رہا تھا جیسے کسی کو یقین ہی نہ آ رہا ہو کہ مُلزم کی حیثیت سے دربار میں کھڑا ہوا شخص امیر علی ہو سکتا ہے؟ امیر علی جو ریاست کا ایک عزت دار اور شریف شہری تھا اور راجا کا سب سے پسندیدہ درباری۔ ایسا ہر دل عزیز شخص بھلا کسی جُرم کا ارتکاب کر سکتا ہے؟ دربار میں بیٹھے ہوئے لوگوں کے درمیان چہ مگوئیاں شروع ہو گئیں۔ ہر کوئی امیر علی کے جُرم کے بارے میں اندازے لگانے لگا۔ امیر علی کے خلاف جن دونوں اجنبی سوداگروں نے فریاد کی تھی اُن کی طرف تو بے شمار نفرت بھری نگاہیں اٹھی ہوئی تھیں۔

لیکن جب امیر کی نظریں اُن دونوں پر پڑیں تو اس کا دل دھک سے رہ گیا انھیں ایک نظر دیکھنے کے بعد اس نے دل ہی دل میں دانت پیستے ہوئے اپنے آپ سے کہا۔ "تو نادر علی اور اجمل خان یہاں پہنچ ہی گئے؟ ان دونوں نے ہی میرے خلاف راجا سے شکایت کی ہے؟ کاش میں نے اُسی دن ان دونوں کو ختم کر دیا ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا جب وہ صبح ہی صبح

میرے گھر آئے تھے۔"

امیر دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا جس کا ان دونوں پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ نادر علی تو اپنی سفید داڑھی پر ہاتھ پھیرتا ہوا امیر کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا اور اجمل خان نفرت بھری نظروں سے اُسے گھور رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو "سالے ٹھگ"

"یہ شخص" اچانک مہاراجا نے انگلی سے امیر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا "جسے ہم لوگ بہت ہی شریف آدمی سمجھتے تھے اور جسے ہم نے عُصول کی وصُولیابی کا کام سونپا تھا اس شخص نے ہماری ریاست میں آکر بھرپور عزت اور دولت حاصل کی ہے" راجا ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہہ رہا تھا "مجھے بھی پہلے یہ یقین نہیں آیا تھا کہ انتہائی شریف نظر آنے والا یہ شخص ایک انتہائی مکار شخص بھی ہو سکتا ہے" راجا کے یہ الفاظ سُن کر ہر درباری ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھنے لگا۔ راجا اپنی عادت کے مطابق تھوڑی دیر کے لیے چپ ہو گیا تھا اور امیر راجا کے کہے ہوئے ایک ایک لفظ کو ہضم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ اس کی آخری کوشش ہے اس جگہ جو فیصلہ ہونے والا ہے اسی فیصلے پر اس کی بقیہ زندگی کا دارومدار ہے وہ اپنے دل اور دماغ کو سمجھا رہا تھا۔ اے دل تو ذرا بھی بے چین نہ ہونا اور اے دماغ تو بھی قابو سے باہر نہ ہو جانا... ممکن ہے آخری گھڑی بازی پلٹ جائے۔

"آپ لوگ امیر علی کے خلاف کی جانے والی شکایت سن لیں" راجا نے اشارہ کیا تو دربار کا محرّر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لمبا کاغذ تھا جسے کھول کر وہ پڑھنے لگا۔ اس کاغذ پر لکھی ہوئی ایک ایک بات بالکل درست تھی یہ امیر اچھی طرح جانتا تھا لیکن اس کے باوجود وہ انجان بن کر حیرت سے یہ سب سُن رہا تھا۔ ہٹیری کے نصیر الدین شیخ جوہری سے ہونے والی امیر کی ملاقات کا ذکر بعد میں امیر نے انھیں بتایا تھا کہ وہ جالان کے راجا کے کہنے کے مطابق دولت راؤ سندھیا کے پاس ایک معاملے کی صلاح کرانے گیا تھا جو سراسر جھوٹ تھا۔ پھر شیخ نصیر الدین سے اس نے زیورات خریدنے کا بہانہ بنایا۔ جالان کے راجا کی بیٹی کی شادی کا بہانہ بنا کر اس نے نصیر الدین شیخ سے یہ کہا کہ جالان کے راج دربار میں تمھارے سارے زیورات اور موتی فروخت ہو جائیں گے یہ لالچ دے کر اس نے شیخ کو اپنے ساتھ جالان پہنچنے سے قبل ہی اس نے بے چارے شیخ کو ختم کر دیا اور اس کے سارے زیورات ہتھیا لیے۔

"غلط... غلط" امیر چیخ کر بولا "یہ سراسر جھوٹا الزام ہے میری شان اور شوکت دیکھ کر لوگ مجھ سے جلنے لگے تھے" راجا نے جب چیخ چیخ کر یہ بات کہی تو سارے دربار میں سناٹا چھا گیا۔ دو سپاہیوں نے آگے بڑھ کر امیر کو فوراً ہی بازوؤں سے پکڑ نہ لیا ہوتا تو شاید وہ جُنون میں ان دونوں پر حملہ کر بیٹھتا۔ اس کا غیض و غضب دیکھ کر نادر علی اور اجمل خان بھی کانپنے لگے تھے۔

"امیر" راجا نے غصّے سے چیخ کر کہا "تم بھول رہے ہو کہ یہ ہمارا دربار ہے۔ یہاں چیخ چیخ کر انصاف کے کام میں رکاوٹ ڈالنے والے کو اور زیادہ سخت سزا دی جاتی ہے"

"بے ادبی کی معافی چاہتا ہوں مہاراج" امیر نے جالان سے کام لیتے ہوئے اپنے جُرم پر پردہ ڈالنے کی ایک کوشش کی "لیکن مہاراج کوئی بھی شریف آدمی اس طرح کے الزامات سُن کر اپنے ہوش و حواس کھو سکتا ہے۔ میری اس حرکت سے دربار کی اور آپ کی بے عزتی ہوئی ہو تو ناچیز گردن جھکا کر آپ سے معافی چاہتا ہے" اتنا کہہ کر امیر نے ادب سے اپنا سر جھکا دیا۔ یہ دیکھ کر درباریوں نے دل ہی دل میں سوچا امیر واقعی ایک شریف آدمی ہے اور وہ ایسا کوئی جرم کر ہی نہیں سکتا اور دربار کی کارروائی ایک بار پھر آگے بڑھی فریادی نادر علی اپنا بیان دینے کے لیے اپنی جگہ سے اُٹھا۔ شروع شروع میں تو اس نے وہی کچھ کہا جو آگے بیان کیا جا چکا ہے لیکن اس کے بعد کی باتوں میں لوگوں کی دلچسپی بڑھنے لگی نادر علی کہہ رہا تھا "سال بھر بعد بھی جب ہمارا دوست شیخ نصیر الدین جالان سے واپس نہیں لوٹا تو سب لوگ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ ضرور اس کے ساتھ دھوکہ ہوا ہے اس کی بیوی اور بیٹے کی حالت ہم سے دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ اسی لیے ہم اس کی تلاش میں نکل پڑے۔ یہاں آنے کے بعد ہم دونوں اس بدمعاش آدمی کے گھر گئے شہر میں اس کی جو عزت ہے اور جس شان سے وہ رہتا تھا اُسے دیکھتے ہوئے ہمیں اس پر شک نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس نے میٹھی میٹھی باتیں کر کے ہمیں بہلا دیا اور خود ہی ہم سے شیخ نصیر الدین کی خیر خیریت پوچھنے لگا

ہمیں جب ہم نے اسے بتایا کہ شیخ ابھی تک گھر واپس نہیں پہنچا ہے تو اس نے اپنا چہرہ ایسا بنا لیا جیسے اُسے بہت دکھ ہوا ہو پھر ہمیں بھٹکانے کے لیے اس نے ایک بات ہمارے دل میں بٹھانے کی کوشش کی اور ہم سے کہا کہ راستے میں کچھ بیوپاری قسم کے لوگ مل گئے تھے جنھوں نے شیخ نصیر الدین سے کہا کہ شیوا پوری کے راجا کے لڑکے کی شادی ہے ہم لوگ وہاں قیمتی کپڑے لے کر جا رہے ہیں۔ تم بھی ہمارے ساتھ چلو تمھارے سارے زیورات اور موتی وہاں بک جائیں گے اس طرح وہ لوگ شیخ کو اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ اُس کی اس بات کو بھی ہم نے سچ سمجھ لیا اور ہمیں یقین ہو گیا کہ اس نے جو بتایا ہے ویسا ہی ہوا ہوگا اور شیخ کو بھلا پھُسلا کر لے جانے والوں نے ہی اس کے ساتھ دغا کیا ہوگا۔ ٹھگ لوگ اپنے شکار کو ختم کرنے کے بعد انھیں گڑھا کھود کر دفن کر دیتے ہیں۔ اس شخص کی باتیں سن کر ہمارا رہا سہا شک بھی دور ہو گیا لیکن شاید خدا کو یہ منظور نہیں تھا۔ جب ہم اس کے گھر سے واپس آنے لگے تھے تو اس نے ایک بات کہی تھی" نادر علی بولتے بولتے ہانپنے لگا اور اس کا جسم پسینے پسینے ہو رہا تھا۔ امیر لاپرواہی سے اس کی بات سن رہا تھا لیکن درباریوں کا تجسس بڑھتا جا رہا تھا۔

"اس نے آخر کون سی ایسی بات کہہ دی تھی؟" راجا نے پوچھا۔

"مہاراج اس نے کہا تھا کہ شیوا پوری کے راجا کا تو کوئی بیٹا ہی نہیں ہے اس لیے شادی کی بات ہی اُن لوگوں کے ذہن کی پیداوار ہے اور بے چارہ شیخ اُن لوگوں کے جال میں پھنس گیا ہوگا"

"پھر؟" راجا نے بے چینی سے پوچھا۔

"ہمیں اس کی یہ بات بھی سچی لگی۔ پھر ہم شیخ کی تلاش کا ارادہ ملتوی کر کے جالان سے واپس جانے کی تیاری کر ہی رہے تھے کہ اچانک ایک سوال ہمارے ذہن میں اُبھرا کہ کیا جالان کے مہاراج کے محل میں کوئی راجکماری شادی کے لائق ہے؟ اس سوال کے ذہن میں آتے ہی ہم نے پوچھ گچھ شروع کر دی اور تب ہمیں معلوم ہوا کہ یہ بھی ایک جھوٹ تھا"

"پھر؟"

"پھر ہم جالان کے ایک بڑے جوہری کے پاس گئے اُسے ہم نے بتایا کہ ہم قیمتی موتی خریدنے آئے ہیں۔ ہمیں یقین تھا کہ اگر امیر نے یہ جُرم کیا ہے تو اس نے شیخ کے لوٹے ہوئے زیورات اور موتی اسی جوہری کے ہاتھ فروخت کیے ہوں گے کیوں کہ ہٹیری اور جالان کے درمیان اتنا بڑا کوئی جوہری ہے ہی نہیں جو اتنے قیمتی موتی خرید سکے"

یہ سن کر امیر چونک پڑا اپنی بے وقوفی اور نادر علی کی چالاکی پر وہ دل ہی دل میں دانت پیسنے لگا۔

"آگے بولو" چپ ہو جانے والے نادر علی کو راجا نے حکم دیا۔

"اُس جوہری کے یہاں ہمیں نصیر الدین شیخ کے موتی دکھائی دے گئے ان موتیوں کو پہچانتے ہی ہمارے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ پھر بھی صبر سے کام لیتے ہوئے ہم نے پوچھ گچھ شروع کی کہ اتنے قیمتی موتی آپ کے پاس کہاں سے آئے؟ لیکن اس جوہری نے ہمیں سچا جواب نہیں دیا اور تب ہم نے مجبوراً آپ سے شکایت کی تھی" نادر علی نے اپنا بیان ختم کرنے کے بعد راجا کو سلام کیا اور اپنی جگہ پر ادب سے بیٹھ گیا۔

"اُن موتیوں اور زیورات کو ہمارے سامنے پیش کیا جائے" امیر نے راج محل کے کمرے میں زیورات کے جس تھال کو دیکھا تھا۔ اُسے راجا کے سامنے لا کر رکھ دیا گیا "امیر کیا یہ سچ ہے کہ ان موتیوں کو تم نے اُس جوہری کے ہاتھ فروخت کیے تھے؟" راجا نے پوچھا۔

تو ایک پل کے لیے امیر کے جی میں آیا کہ وہ صاف انکار کر دے لیکن دوسری بار بے وقوفی کرنا اسے مناسب نہیں لگا کیوں کہ جوہری بھرے دربار میں آکر اپنے حلفیہ بیان میں یہ کہہ سکتا تھا کہ اُس نے یہ موتی اور یہ زیورات امیر سے ہی خریدے ہیں۔

"ہاں مہاراج یہ موتی اور یہ زیورات میں نے ہی فروخت کیے ہیں" امیر نے انکار نہیں کیا تھا اس لیے تمام درباری دنگ رہ گئے لیکن امیر نے چند لمحوں بعد آگے کہا "مہاراج یہ بات تو ہر کوئی جانتا ہے کہ کپڑوں اور زیورات کی خرید و فروخت کے لیے ہی میں سفر پر جاتا رہتا ہوں"

"مگر یہ موتی اور زیورات تم نے شیخ نصیر الدین سے خریدے نہیں تھے بلکہ تم نے اُسے قتل کر کے یہ چیزیں حاصل کی تھیں" راجہ نے کڑک دار آواز میں کہا۔

"نہیں مہاراج یہ موتی اور زیورات شیخ نصیر الدین کے ہیں

ہی نہیں؟ یہ کہہ کر امیر نے سبھوں کو چونکا دیا۔ "یہ تو سفر کے دوران میں نے ایک لٹیرے سے خریدے تھے۔ برسوں پہلے کے لوٹے ہوئے یہ زیورات اس نے سنبھال کر رکھے ہوئے تھے۔ آپ یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں پہلے چیتو کے لشکر میں بھی رہ چکا ہوں۔"

امیر کی اس چال سے راجا گھبرا گیا۔ اس کا خیال تھا کہ ان موتیوں اور زیورات کو دیکھ کر امیر کہے گا کہ میں اس معاملے میں کچھ نہیں جانتا اور نہ ہی ان موتیوں کو کبھی میں نے دیکھا ہے لیکن جب میں جوہری کو بلواؤں گا تو اُس کی بات جھوٹی ثابت ہو جائے گی اور اس طرح امیر مجرم ثابت ہو جائے گا لیکن اُس نے تو بازی ہی پلٹ کر رکھ دی تھی۔

"مہاراج لٹیرے کی بات اس شخص کے اپنے ذہن کی پیداوار ہے۔" اجمل خان پرجوش لہجے میں بولا۔ "یہ ساری چیزیں ہمارے دوست نصیر الدین شیخ کی ہی ہیں۔"

اجمل خان کا اس طرح درمیان میں بولنا راجا کو بہت ہی ناگوار گزرا اس لیے وہ اُسے ڈانٹتے ہوئے بولا۔ "آپ چپ رہیں پردیسی ہمیں سچ اور جھوٹ کو ثابت کرنا آتا ہے۔" اتنا کہہ کر اُس نے کھنکار کر اپنا گلا صاف کیا اور دھاردار آواز سے امیر کو گھورتے ہوئے بولا۔ "امیر تم ایک جھوٹ کو چھپانے کے لیے سو جھوٹ بول سکتے ہو لیکن اس کے باوجود تم سزا سے نہیں بچ سکتے۔"

"انصاف کا ترازو آپ کے ہاتھ میں ہے مہاراج۔" امیر نے بہت ہی ادب سے جواب دیا۔ "مجھے یقین ہے کہ آپ مجھ جیسے بے قصور سے ناانصافی نہیں کریں گے۔"

یہ سن کر راجا کشمکش و پیچ میں پڑ گیا۔ کیوں کہ راج محل کے کمرہ خاص میں امیر اس بات کا اقرار کر چکا تھا کہ یہ زیورات شیخ نصیر الدین کے ہی ہیں اور معافی کے لیے اُس نے اُس کے آگے ہاتھ پاؤں بھی جوڑے تھے اور معافی کے بدلے اپنی ہر چیز دینے کے لیے بھی تیار ہو گیا تھا۔ مگر اب وہ اپنے اس اقرار سے صاف مکر رہا تھا۔ راجا سوچ رہا تھا کہ ایسی کون سی طاقت ہے جس کے بھروسے پر امیر اتنی ہمت کر رہا ہے؟ اس کا جی تو چاہا کہ راج محل کے کمرہ خاص میں ہونے والی بات کو وہ سب پر ظاہر کر دے لیکن اُسے خوف تھا کہ یہ بات سن کر امیر بہت زیادہ بپھر جائے گا اور دربار میں جو چاہے بول دے گا۔ ممکن ہے کہ وہ غصّے کی حالت میں یہ بھی کہہ دے کہ چونکہ مہاراجا کو نے حصّہ کم دیا تھا اس لیے انتقاماً اُس نے اس کے خلاف یہ کارروائی کی ہے۔ راجا یہ بھی جانتا تھا کہ موت کے بھنور میں پھنسا ہوا آدمی خود کو بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں ضرور مارتا ہے۔ ایسے موقعے پر وہ عزت اور احترام سب کو بھول جاتا ہے۔ یہی سب باتیں سوچنے کے بعد اُس نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ اُس کے پاس ابھی ایک ہتھیار اور باقی تھا اس لیے وہ پھر گرجدار آواز میں بولا۔ "تو سُن لو امیر۔ تم کے اقرار کے بعد رحم کی جو تھوڑی سی گنجائش ہوتی ہے تم اُس گنجائش کو بھی کھو چکے ہو۔"

"میں سمجھا نہیں مہاراج۔" امیر چونک کر ہوشیار ہوا۔ اُسے لگا کہ راجا کے پاس کوئی نہ کوئی ٹھوس ثبوت ضرور ہے اور وہ اگر اس میں نہیں پھنسا تو اپنی جان بچا سکتا ہے اپنے دماغ پر قابو رکھ کر وہ سکون سے راجا کی بات سننے لگا۔

راجا حسبِ عادت تھوڑی دیر رُکنے کے بعد اُسے بولا۔ "جب تم یہ زیورات جوہری کو فروخت کرنے گئے تھے اُس وقت تنہا نہیں تھے۔" یہ سنتے ہی امیر کے پاؤں تھرتھرا گئے۔ اُسے رامو یاد آ گیا۔ اس کا بدن ڈھیلا ہو کر کانپنے لگا تھا لیکن اس کے چہرے کے تاثرات اس کی کمزوری کی چغلی نہ کھا جائیں اس لیے وہ دھیرے سے ہنس کر بولا۔ "مہاراج مجھے یاد نہیں ہے مگر شاید میں اکیلا ہی وہاں گیا تھا۔"

"جھوٹ۔" راجا اپنے تخت پر ہاتھ مار کر بولا۔ "تم اکیلے نہیں گئے تھے یاد کرو... تمہارے ساتھ رام لال عرف رامو تھا یا نہیں؟"

امیر کو اپنے پیروں تلے سے زمین سرکتی ہوئی محسوس ہونے لگی اور اُس کی خاموشی یہ ثابت کرنے لگی کہ جوہری کی دکان پر رامو بھی اُس کے ساتھ گیا تھا۔ اور رامو اس وقت جیل میں بند ہے۔ راجا کے اس ایک جملے نے ہی امیر کے سارے کس بل ڈھیلے کر دیے۔ وہ زبردستی اپنی ہمت کو مجتمع کرنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ اس کی سماعت سے پھر راجا کی آواز ٹکرائی۔ "اُس نے یہاں سب کچھ قبول کر لیا ہے۔"

"اوں۔" بے اختیار امیر کے مُنہ سے نکلا اور درباری بھی حیرت کی تصویر بنے ہوئے امیر کو تکنے لگے۔ راجا چند لمحوں تک تو امیر کو گھورتا رہا پھر آگے بولا۔ "اس وقت وہ اپنے

پیروں سے چل کر دربار تک بھی نہیں آ سکتا پھر بھی اگر تم اپنا جرم قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہو تو میں اُسے اٹھوا کر یہاں منگوا سکتا ہوں لیکن اس کے بعد تمہارے لیے موت کی سزا کے سوا اور کچھ باقی نہیں رہے گا۔ اب بولو کیا کرنا ہے؟"

امیر کیا جواب دیتا؟ اس کی بھینچی ہوئی مٹھیوں کا پسینا پانی بن کر بہنے لگا تھا اور وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ اگر رامو نے سب کچھ اگل ہی دیا ہے تو اب بچاؤ کی ہر کوشش بے کار ہے۔ وہ جتنی بھی مخالفت کرے گا اتنا ہی زیادہ بے نقاب ہوتا جائے گا اور اس کے سینکڑوں قصّے منظرِ عام پر آ جائیں گے تب ہر کوئی نفرت بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگے گا اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے بے شمار ساتھی بھی بے نقاب ہو جائیں گے۔ اس طرح اُن سب کی موت کا ذمہ دار وہ خود ہی ہو جائے گا۔ دربار میں موجود ہر شخص بڑی بے چینی سے امیر کا جواب سننے کا منتظر تھا لیکن امیر نے کچھ کہے بغیر اپنی گردن جھکا کر جواب دے ہی دیا تھا۔ اُس کی بند پلکوں میں سے آنسو چلنے لگے تھے۔

"یہ شخص۔" راجا کی مغرور آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ "ابھی تک چیخ چیخ کر اپنی شرافت کا ڈھنڈورا پیٹ رہا تھا لیکن اب اس عیّار نے موت سے ڈر کر اپنا سر جھکا دیا ہے۔ یہ اگر جور ہوتا تو مجھے اتنا دکھ نہ ہوتا لٹیرا ہوتا پھر بھی میرے دل میں اس کے لیے اتنی نفرت نہ ہوتی لیکن..." راجا ایک پل کے لیے رکا پھر اپنے غصّے کو دباتا ہوا بولا۔ "یہ تو درندہ ہے شاید اسے موت کی سزا بھلے ہی نہ دوں مگر موت سے زیادہ بھیانک سزا میں اسے ضرور دوں گا۔" یہ سننے کے باوجود امیر نے اپنا سر نہیں اٹھایا۔

اس دربار میں ہمیشہ ہر ایک کی فریاد سنی جاتی ہے۔ میں انصاف کی کرسی پر بیٹھا ہوں، امیر غریب اور چھوٹے بڑے کا کوئی فرق میں اپنے نزدیک نہیں رکھتا۔ ان فریادیوں نے اپنا ایک دوست کھویا ہے اور ایک بیوی نے اپنا شوہر اور ایک بچے نے اپنا باپ کھویا ہے جسے ہم واپس نہیں دے سکتے لیکن یہ زیورات اور یہ موتی وغیرہ میں مرحوم کے گھر والوں کو واپس کرنے کا حکم دیتا ہوں۔"

یہ سُن کر امیر ایک جھٹکے سے اس کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو گیا۔ راجا اب ایک اور ڈرامہ کھیل رہا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی اس کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی اور اس کی یہ مسکراہٹ راجا کی نگاہوں سے پوشیدہ نہ رہ سکی تھی۔

"اور اس ٹھگ کو۔" راجا نے نفرت اور غصّے سے امیر کی جانب انگلی اٹھائی۔ "اپنے گناہوں پر پچھتانے کے لیے میں زندہ رکھ رہا ہوں میں اسے عمر قید کی سزا سنا رہا ہوں۔"

"ہا...ہا...ہا۔" ایک بھیانک قہقہہ لگاتا ہوا امیر دربار میں چاروں طرف دیکھنے لگا۔ جب اس کا قہقہہ دربار میں گونجنے کے بعد تھم گیا تو اس نے اپنی گردن کی نسیں پھلا کر انتہائی بھاری آواز میں کہا۔ "یہ انصاف نہیں بلکہ ایک ناٹک ہے جس کا بدلہ راجا کو لوٹ پر بیٹھے ہوئے بھگوان کی طرف سے بہت جلد ملے گا... یاد رکھنا بڈھے..." امیر کے ان لفظوں نے تمام لوگوں کو اپنی جگہ سے آدھا کھڑا ہونے پر مجبور کر دیا۔ مہاراجا کی یہ بے عزتی؟ چند سپاہیوں سے یہ برداشت نہیں ہوا وہ امیر کو کھینچ کر دربار سے باہر لے جانے لگے لیکن تب ہی راجا کی آواز امیر کی سماعت سے ٹکرائی۔ "اس شیطان کو سب سے پہلے تو کتّوں کے پنجرے میں بند کر کے سارے شہر میں گھماؤ۔ اس کے بھیانک جرم کا پورے شہر میں ڈھنڈورا پیٹو اور لوگوں سے کہو کہ وہ اس پر تھوکیں اور کتّے کی طرح اس پر پتھر برسائیں اور کوئی اسے پانی کا ایک قطرہ بھی پینے کے لیے نہ دے۔"

اور دوسرے ہی پل انصاف پرور راجا کی جے جے کار سے پورا دربار گونج اٹھا پھر جب راجا نے نادر علی اور اجمل خان کو نصیر الدین شیخ کے زیورات دیے تو اُن دونوں نے احسان مند نظروں سے راجا کی جانب دیکھ کر اپنا سر جھکا دیا اور چند لمحوں بعد نادر علی نے کہا۔ "مہاراج اپنے شہر میں جا کر ہم آپ کے انصاف کی تعریف کرنے سے نہیں تھکے گیں۔"

"یہ سب تو ٹھیک ہے۔" راجا اس طرح بولا جیسے اُسے اپنی نیک نامی کی کوئی پرواہ ہی نہ ہو۔ "میں اپنے دو محافظوں کو تم لوگوں کی حفاظت کے لیے سرحد تک بھیج رہا ہوں۔ ہیڑی پہنچ کر شیخ کے بیوی بچوں کو ہماری طرف سے تسلّی دینا لیکن دربار کے برخواست ہونے سے قبل ہی راجا نے اپنے خاص آدمیوں کے کان میں یہ بات کہہ دی تھی۔ "ان دونوں کو ہماری سرحد کے اندر ہی ختم کر دینا ہے کیوں کہ ایسے قیمتی موتی تو ہمارے خزانے میں ہی اچھے لگیں گے۔"

اس کے بعد جالان کا انصاف پرور راجا اپنے تخت پر سے اٹھ گیا۔

●

امیر ابھی تک کیوں نہیں آیا؟ عظیمہ بار بار کھڑکی میں سے جھانک کر اپنی بے قراری کا اظہار کر رہی تھی۔ کبھی اُسے اتنی دیر تو نہیں ہوئی؟ کھانے کا وقت بھی گزر چکا ہے اگر کسی خاص کام کی وجہ سے اُسے دیر بھی ہو جاتی تھی تو کسی سپاہی کے ہاتھ وہ اطلاع تو ضرور ہی بھیج دیتا تھا۔ شوہر کو گھر واپس آ جانے میں اگر دیر ہو جاتی ہے تو بیوی بہت سارے شگوک میں گھر جاتی ہے۔ گھر سے رخصت ہوتے وقت امیر کے ساتھ اس کی جو بات چیت ہوئی تھی اُسے یاد کر کے عظیمہ خدا سے دُعا کرنے لگی۔

"اے خدا میں نے اس سے یہ کیا کہہ دیا تھا؟ کہ راجا صاحب تمھیں چھ ماہ قید کی سزا دے دیں گے۔ بھلا مذاق میں بھی اپنے شوہر سے یہ کہا جا سکتا ہے؟" اس کے بعد وہ اپنے آپ کو سمجھانے لگی "ارے پگلی ایسا کہنے سے سچ مچ ایسا تھوڑے ہی ہو جاتا ہے؟ امیر جیسا شریف عزت دار اور لائق آدمی کو راجا تو کیا کبھی خدا بھی سزا نہیں دے سکتا۔" دل کو بہلانے کی کوشش میں عظیمہ اپنی خوش نصیبی پر مسکرانے لگی اور امیر کے ساتھ ہونے والی اپنی پہلی ملاقات کو وہ یاد کرنے لگی۔ وہ ایک جہنم میں جی رہی تھی، جہاں سے چھٹکارا پانے کے لیے اس نے زہر پی لینے کی تیاری کر رکھی تھی اور تب اچانک امیر اس کی نظروں میں سما گیا اور دھیرے دھیرے اُس کے دل میں بس گیا۔ پھر اس نے ہمت کر کے امیر کا ساتھ مانگ لیا لیکن اس وقت وہ یہ کہاں جانتی تھی کہ امیر اس قدر شریف اتنا نیک نام اور اتنا بہادر ثابت ہو گا یہ خدا کی کرم نوازی ہی تو ہے کہ اُسے اتنا اچھا شوہر ملا ہے بھلا ایسا سُکھ کس کے نصیب میں ہو گا؟ بڑے بڑے درباریوں کی بیویاں تک کہا کرتی ہیں کہ عظیمہ بانو میاں بیوی تو ہم نے بہت دیکھے ہیں لیکن تم دونوں کی محبت کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ تمھارے مذہب میں مرد کو چار چار شادیوں کی اجازت ہے لیکن اس کے باوجود تمھارا میاں دوسری طرف آنکھ بھی اٹھا کر نہیں دیکھتا۔ یہ سب باتیں یاد کرتے وقت عظیمہ کو ہنسی آ گئی لیکن ہنستے ہنستے اچانک اُسے اپنے پیٹ میں کسی چیز کے اُچھلنے کا احساس ہوا اور اس احساس کے ساتھ ہی اس کے پورے بدن میں ایک کپکپاہٹ سی دوڑ گئی اُسے لگا کہ جب وہ پہلی بار ماں بننے والی تھی تب اسی طرح کا احساس اُسے ہوا تھا تو کیا وہ ایک بار پھر؟ اس خیال کے آتے ہی اُس کا ہاتھ ایک جھٹکے سے اپنی گردن پر پڑے تعویذ پر پڑا۔ تعویذ کے ساتھ بندھے ہوئے سکے کے کنارے کو انگلی پھیرتے ہوئے وہ اپنے من پسند خیالوں میں کھو گئی۔ اگر تب تو اس بار اُسے بیٹا ہی ہو گا پھر کوئی کمی باقی نہیں رہے گی۔ امیر آ جائے تو اس سے لپٹ کر میں اُسے یہ خوش خبری دوں گی لیکن نہیں... ایسی جلد بازی بھی اچھی نہیں ہے اگلی تاریخ مہینہ اور چند روز ہی ہوئے ہیں ممکن ہے میں جھوٹی بھی ہو جاؤں اور بھی پندرہ بیس روز گزر جائیں تب ہی کہوں گی۔ اگر وہ خوشی سے بے قابو ہو جائے گا پھر وہ یقیناً یہی کہے گا عظیمہ یہ سب اِسی تعویذ کی برکت ہے۔ اب بتاؤ اپنے کا ہم کیا نام رکھیں گے؟"

ٹھیک اُسی وقت اُسے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی اس نے چونک کر خود کو ان حسین خیالوں سے چھڑانے کی کوشش کی اور لپک کر کھڑکی کے باہر دیکھنے لگی۔ لیکن نہیں گھوڑے کی پیٹھ پر امیر نہیں بلکہ دربار کا کوئی سپاہی ہی بیٹھا تھا شاید وہ کوئی پیغام لایا ہو گا۔ شاید اب وہ دیر سے ہی گھر آئے گا۔ یہ کیا؟ وہ بُری طرح چونک اُٹھی ایک سپاہی کے بجائے یہ آٹھ دس سپاہی آگے پیچھے کیوں آ رہے ہیں؟ ان کے چہروں پر غصے کے آثار کیوں ہیں؟ ضرور کوئی نہ ہونے والی بات ہو گئی ہے۔

سیڑھیاں چڑھتے وقت سپاہیوں کے قدموں میں جو بے چینی بازی عظیمہ کو محسوس ہوئی اس سے وہ بُری طرح گھبرا گئی اور اس نے جلدی سے اپنا برقع پہن لیا اس کے باوجود اُسے یقین تھا کہ سپاہی اس کی اجازت کے بغیر اُس کے کمرے میں قدم نہیں رکھیں گے مگر اُس کا یہ اندازہ غلط ثابت ہوا۔ اُس نے برقع کی جالی میں سے دیکھا کہ جمعدار دو سپاہیوں کے ساتھ کسی چیز کی پروا کیے بغیر اُس کے کمرے میں داخل ہو چکا ہے۔ امیر کا خادم گوپتا کانپتا کانپتا جمعدار کے پیچھے کمرے میں داخل ہوا اور جمعدار کے آگے کھڑا ہو کر بولا "گستاخی معاف جناب یہ زنانہ کمرہ ہے۔"

مالک کی خبر موجودگی میں...."

لیکن اس سے پہلے کہ وہ اپنی بات پوری کرتا جمعدار کا زناٹے دار پنجہ اس کے مُنہ پر پڑا "بے وقوف تیری یہ مجال؟ بہت بات بنانے سے۔"

غلام تھپڑ کھا کر سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ دو سپاہیوں نے اُسے پکڑ کر کمرے سے باہر دھکیل دیا۔ عظیمہ برقعے کے اندر سمٹی ہوئی ایک جانب کھڑی تھی جمعدار چند لمحوں تک اُسے تکتا رہا یہ وہی جمعدار تھا جو امیر کی بہت عزت کرتا تھا اور اس کی جی حضوری کرتے نہیں تھکتا تھا۔ اس گھر میں وہ دو ایک بار کھانا بھی کھا چکا تھا۔

"یہ سب کیا ہنگامہ ہے؟" عظیمہ نے بہ مشکل ہمت کر کے پوچھا "وہ تو ابھی تک دربار سے واپس نہیں آئے ہیں؟"

یہ سُن کر جمعدار اس طرح ہنسنے لگا جیسے وہ ایسے ہی موقعے کی راہ دیکھ رہا ہو اس کا قہقہہ سن کر جھولے میں سوئی ہوئی امیر کی بچی ڈر کر چیخنے لگی لیکن عظیمہ اپنی جگہ سے نہیں ہلی اُسے جمعدار کی نیت کچھ خراب لگ رہی تھی۔

"بدنصیب عورت" دانتوں تلے الفاظ کو چبا کر جمعدار کہہ رہا تھا "تم اُس کے واپس آنے کی راہ دیکھ رہی ہو؟ وہ بدمعاش اب کبھی واپس نہیں آئے گا۔"

"خبردار" عظیمہ چیخ پڑی "آپ اپنی زبان سنبھالیں جناب اُن کو بدمعاش کہنے والے کو میں اس گھر میں قدم بھی رکھنے نہیں دوں گی۔"

"بدمعاش... بدمعاش...." جمعدار جوش جوش میں آگے بڑھا "ایک بار نہیں سو بار بدمعاش... مکار... قاتل... ٹھگ۔"

اُس کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ عظیمہ کے دل کو چیرتا جا رہا تھا۔ غصّے کی حالت میں اپنا ہوش کھو کر اس نے اپنے چہرے کا نقاب ہٹا دیا اور دو گز کی دوری پر کھڑے ہوئے جمعدار کو شعلہ بار نگاہوں سے گھورنے لگی لیکن اس کی ان نگاہوں کا جمعدار پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ لاپرواہی سے اُس کی خوبصورتی کو دیکھ دیکھ کر مُسکرا رہا تھا یہ دیکھ کر عظیمہ نے اپنے چہرے پر پھر نقاب گرا لیا۔ جھولے میں پڑی ہوئی اس کی بچی ابھی تک بلک بلک کر چلا رہی تھی۔ وہ اُسے گود میں اٹھانے کے لیے آگے بڑھی۔

"بچی کو لے کر گھر سے باہر نکل جاؤ" جمعدار کی کرخت آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی سپاہیوں نے گھر کی چیزوں کو اِدھر اُدھر کرنا شروع کر دیا۔

"ہم لوگوں کو کیا چاہیے؟" عظیمہ نے جمعدار کی جانب پلٹ کر پوچھا "آخر مجھے کچھ تو بتاؤ۔"

"سُننا ہے؟" جمعدار اُس کی حالت سے لُطف اندوز ہوتے ہوئے بولا "سن سکو گی؟" عظیمہ نے گردن ہلا کر ہاں میں جواب دیا اور اپنی مٹھیاں بھینچ کر اس کی بات سننے کے لیے تیار ہو گئی۔ جمعدار چند لمحوں تک اُسے گھورتا رہا پھر اچانک بولا۔

"تمھارا شوہر ایک قاتل ٹھگ ثابت ہوا ہے۔"

یہ سُنتے ہی عظیمہ کی کمر اس طرح جُھک گئی جیسے کوئی درخت جڑ سے اُکھڑ کر جُھک گیا ہو۔ "شہر کا یہ شریف آدمی دوسرے شہروں کے سفر کے بہانے لوگوں کی جان لے لیا کرتا تھا" جمعدار نے جب آگے بتایا تو عظیمہ جُھکتی ہوئی گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔

"یہ شان و شوکت، یہ رونق، یہ عیش و آرام یہ سب بے ایمانی سے کمائی ہوئی تھی۔ اُس کی عزت بناوٹی تھی اس کی شرافت ایک ڈھونگ تھی اور اس کی رحمدلی ایک دھوکہ تھی۔"

"بس کرو" عظیمہ نے دروازے کی چوکھٹ پر سر رکھ دیا۔

"خدا کے لیے اب بس کرو" ٹھیک اسی وقت گھر کی نوکرانی امیر کی روتی ہوئی بچی کو گود میں اٹھا کر وہاں سے لے آئی اور سر پٹکتی ہوئی عظیمہ کو روکتے ہوئے بولی "یہ میں کیا سن رہی ہوں، بی بی جی؟"

اس سے پہلے کہ عظیمہ کوئی جواب دیتی باہر سے آتی ہوئی شور و غُل کی آواز اُن کی سماعت سے ٹکرائی۔ اچانک ڈھول کی آواز اُبھری تو کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ جمعدار کی آنکھوں میں اب ایک عجیب سی چمک لہرانے لگی۔

"لوگو ایک اعلان سنو... لوگو ایک اعلان سنو" دو تین بار باہر سے منادی کرنے والے کی آواز سنائی دی اور پھر ڈھول دور زور سے بجنے لگا۔ تھوڑی دیر تک ڈھول کی آواز گونجتی رہی اس کے بعد ایک بار پھر منادی کرنے والی کی آواز سنائی دی۔

"یہ امیر علی ولد ابراہیم سیٹھ ہے" یہ نام سنتے ہی عظیمہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ "جالان کا یہ عزت دار شخص ایک بھیانک ٹھگ ثابت ہوا ہے۔ اس نے خود ہی دربار میں اپنے اس جُرم کا اقبال کیا ہے اسی لیے مہاراج نے اسے موت کی سزا دینے کی بجائے عمر قید کی سزا دی ہے۔ اس ریاست میں گناہ گاروں کی کیا دُرگت بنتی ہے یہ دکھانے کے لیے اسے پنجرے میں بند کر کے شہر کی گلیوں گلیوں میں گھمائے جانے کا حکم دیا گیا ہے۔"

عظیمہ نے دونوں ہاتھ اپنے کانوں پر رکھ لیے لیکن اس

کے باوجود وہ نیچے سڑک پر ہونے والے شور و غل کی آوازوں کو کانوں تک آنے سے نہ روک سکی، دل دہلانے والی یہ آوازیں اب بھی اس کی سماعت سے ٹکرا رہی تھیں۔ مارو اس بدمعاش کو... تھوکو اس قاتل پر۔ پھر عظیمہ کو یوں لگا جیسے پنجرے کی سلاخوں سے پتھر ٹکرا رہے ہوں۔

"امیر علی ٹھگ کی بیگم۔" جمعدار دھیمی مگر قاتل آواز میں بولا۔ "اپنی جگہ سے اٹھو اور کھڑکی میں سے اپنے پیارے شوہر کی حالت کا تماشا دیکھو۔ شہر کے لوگ اس کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہیں۔" لیکن جمعدار کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی عظیمہ جس جگہ بیٹھی تھی وہیں گر کر بے ہوش ہو چکی تھی۔

●

جانور کی طرح پنجرے میں بند ہو کر گلیوں گلیوں گھومنا امیر کو پھانسی کی حد سے بھی زیادہ بُرا لگ رہا تھا۔ صرف ایک ہی رات میں اس کی قسمت کی بازی اُلٹ چکی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے آسمان کی بلندیوں سے گر کر وہ زمین کے اندر دھنس گیا ہے۔

جب اس کے ہاتھ پاؤں میں زنجیریں ڈال کر سپاہی اُسے کتوں کے پنجرے میں بند کرنے کے لیے لے جا رہے تھے تو اس نے مخالفت میں کافی زور آزمایا تھا۔ جتنا بھی ممکن ہو سکتا تھا اس نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی تھی اس نے چیخ چیخ کر سپاہیوں سے کہا تھا۔ "مجھے عمر قید کی سزا نہیں چاہیے مجھے تم لوگ پھانسی دے دو، چاہے تو میرے جسم کو ہاتھی کے پیروں تلے کچل دو لیکن یہ ظلم نہ کرو۔ مجھے کتوں کے اس پنجرے میں نہیں جانا ہے۔"

لیکن اس کی فریاد سننے والا وہاں کون تھا؟ جب چار سپاہی مل کر بھی اُسے پنجرے میں نہ ڈال سکے تو جمعدار غصّے سے بولا۔ "اب تو اسے کتّے کی طرح ہی اٹھا کر پنجرے میں ڈالنا ہوگا۔" اس نے امیر کو ایک لات رسید کرتے ہوئے سپاہیوں کو حکم دیا۔ "جاؤ کتّے پکڑنے والا شکنجہ لے آؤ۔"

شکنجے کا نام سن کر امیر کو ایک جھٹکا لگا تو کیا یہ بے رحم لوگ اور شکنجے سے جکڑ کر پنجرے میں ڈالنا چاہتے ہیں؟ جب شہر میں آوارہ کتّوں کی تعداد بڑھ جاتی تو ریاست کے سپاہیوں کی گاڑیاں کتّے پکڑنے نکل پڑتی تھیں اور بپھرے ہوئے کتّوں کے گلے میں جب لوہے کا شکنجہ پڑتا تو وہ بے بس ہو کر چپ چاپ سلاخوں دار پنجرے میں داخل ہو کر بیٹھ جاتے۔ منظر اس وقت امیر کی نگاہوں میں گھومنے لگے تھے اور اپنی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھاتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

"ٹھہرو۔" اچانک وہ چلّایا۔ "شکنجہ منگوانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود ہی پنجرے میں جانے کے لیے تیار ہوں۔"

پھر جب وہ پنجرے میں بند ہو گیا تو سب سے پہلے اُسے جمعدار نے ہی دھتکارا تھا۔ "تھو" کی آواز کے ساتھ اس نے اس کے منہ پر تھوک دیا تھا۔ دھتکار اور نفرت کے پہلے وار کو امیر خاموشی سے برداشت نہیں کر سکا۔ اس نے پنجرے کے اندر سے جمعدار پر تھوکتے ہوئے اُسے گالی ڈالی تھی۔ "کمینے... کتّے..." لیکن امیر کتنے لوگوں کو گالیاں دے سکتا تھا؟

گھوڑے کے ساتھ بندھی ہوئی پنجرہ گاڑی محلّے محلّے گھوم رہی تھی۔ چاروں طرف سے بُری بُری گالیاں اس کی سماعت سے ٹکراتیں اور تب اُسے اپنے جرم یاد آ جاتے۔ اس کی عزت کا پردہ چاک ہو چکا تھا۔ لوگ نفرت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ پنجرے کے اندر دونوں کانوں پر ہاتھ دبائے گھٹنوں کے بل سر چھپا کر بیٹھ جاتا۔ مگر تماشا دیکھنے کے لیے جمع ہونے والے لوگ اُسے بیٹھنے ہی کیوں دیتے۔ لوگ اس کے پنجرے پر پتھر برسانے لگتے اور چیخ چیخ کر کہتے۔ "بدمعاش اپنا سیاہ چہرہ تو ہمیں دکھاؤ۔"

شروع شروع میں تو اپنا مُنہ چھپانے کے لیے اس نے پتھروں کی مار بھی برداشت کر لی تھی لیکن اس سے تو لوگ اور بھی زیادہ غصّے میں آ گئے تھے اور پنجرے کے نزدیک آ کر کوئی سلاخوں میں ہاتھ ڈال کر اس کے کپڑے کھینچنے لگتا تو کوئی لکڑی اندر ڈال کر اس کی پسلیوں میں ٹھوکے مارتا اور جب امیر پھر کراہ کے سامنے آنکھیں نکالتا مگر لوگ "ہی... ہی... ہی..." کر کے ہنستے جس سے امیر کے تن بدن میں اور آگ لگ جاتی۔

آج تک جھک جھک کر کورنش بجا لانے والے اور ادب سے سلام کر کے عزت کرنے والے۔ اس کی تعریفیں کر کے اس سے مدد لے جانے والے لوگ ہی آج اس کی جان کے دشمن بنے ہوئے ہیں۔ یہ دیکھ دیکھ امیر کا خون کھول اٹھتا تھا لیکن وہ کر ہی کیا سکتا تھا؟

اُسے احساس تھا کہ کھڑکیوں اور جھروکوں کے پیچھے سے عورتیں بھی اُسے جھانک جھانک کر دیکھ رہی ہوں گی لیکن اُسے اپنی نگاہیں اوپر اٹھانے کی ہمت نہیں ہوتی۔ وہ سوچ رہا تھا اُن عورتوں کی آنکھوں میں اس کے لیے کتنی نفرت اُمڈی ہوئی ہوگی؟ اس خیال سے ہی وہ کانپ جایا کرتا تھا پھر کسی عورت کی آواز اس کے کانوں میں گونجتی جو اپنے بیٹے کو آواز دے کر کہتی۔ "ارے بیٹا ایسے پاپی آدمی کا مُنہ کیوں دیکھنے جا رہے ہو، خراب آدمی کی نظروں کا زہر تو زندگی برباد کر دیتا ہے۔" یہ الفاظ امیر کا کلیجہ چیر دیتے تھے۔

جب پنجرہ گاڑی خود اُس کے مکان کے آگے آ کر رکی تو امیر کو خدا یاد آ گیا۔ "یا پروردگار خدا تو رحم کیا ہوتا۔ امیر کے گھر کے سامنے اور میری ہی بیوی بچے کی موجودگی میں میرا یہ حال؟" امیر کو اُس کے اپنے محلّے والے ہی شہر کے تمام لوگوں سے زیادہ خراب لگ رہے تھے۔ انھیں تو آنکھ کی شرم کا لحاظ بھی نہیں تھا وہ تو اتنی زور زور سے گالیاں بک رہے تھے کہ گھر کے اندر بیٹھی ہوئی عظیمہ بھی اُن کی آوازوں کو سن سکتی تھی۔ امیر نے اپنے اُوپر برستے ہوئے پتھروں کی پرواہ کیے بغیر ہمت کر کے ایک بار کھڑکی کی طرف دیکھ ہی لیا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا ایک بار عظیمہ کا چہرہ دیکھ لے پھر خدا جانے کبھی ملاقات ہو گی یا نہیں؟ لیکن دماغ کہہ رہا تھا نہیں۔ امیر اس حالت میں تو اپنی بیوی کو دیکھ نہیں سکے گا اور نہ ہی عظیمہ تیری حالت کی تاب لا سکے گی۔

یہ ایک ایک خیال امیر کے رونگٹے سلگاتا جا رہا تھا۔ کافی دیر تک جب کھڑکی میں سے کسی نے جھانک کر نہیں دیکھا اور اس کی پنجرہ گاڑی آہستہ آہستہ رینگنے لگی تو اس نے سکون کا ایک گہرا سانس لیا پھر جب اس نے اپنے گھر کی طرف آخری نگاہ ڈالی تو اُسے حیرت کا ایک شدید جھٹکا محسوس ہوا۔ جمعدار سامنے کھڑا بڑے ہی بھیانک انداز سے ہنس رہا تھا اور امیر اُسے دیکھ کر سوچنے لگا کہ کیا یہ جمعدار اُس کی بیوی کی بھی بے عزتی کرنے یہاں آیا ہے؟

●

سورج غروب ہو چکا تھا اور دھیرے دھیرے رات اُترتی جا رہی تھی۔ امیر نے کچھ راحت سی محسوس کی۔ شہر کے بیچ چوک میں پنجرہ گاڑی کو کھڑا رکھ دیا گیا تھا۔ امیر کے ہاتھ پاؤں بیڑیوں میں بندھے ہوئے تھے اور وہ پنجرے میں بند تھا مگر اس کے باوجود ہتھیاروں سے لیس چار سپاہی ایک جانب بیٹھے اس کی نگرانی کر رہے تھے۔ جوں جوں اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا توں توں لوگوں کا ہجوم کم ہو کر بکھرتا جاتا تھا۔ امیر اپنی بے عزتی کے زخموں کو پونچھتا ہوا پنجرے کی سلاخوں سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ پنجرہ اتنا چھوٹا تھا کہ وہ نہ تو لمبا لیٹ سکتا تھا اور نہ ہی سیدھا کھڑا ہو سکتا لیکن پھر بھی دن بھر کی ذلّت کے بعد اس وقت وہ قدرے راحت محسوس کر رہا تھا جو کچھ ہو چکا تھا اُسے یاد کرنا اب اچھا نہیں لگ رہا تھا مگر دل میں اس کے سوا کوئی اور خیال بھی تو نہیں آتا تھا۔ اُس کے پیشانی پر اُبھر آنے والے گومڑ سے اب ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں اور دن بھر کی تپش سے سر بھاری ہو رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں میں کھنچاؤ کی سی کیفیت محسوس ہو رہی تھی اور اب اُسے یاد آیا کہ گھر سے نکلنے کے بعد اب تک اس نے کچھ کھایا پیا بھی نہیں تھا۔ پتھروں کی مار کھانے اور بے عزتی اور رسوائی کے آنسو پینے کے بعد اب اس کے پیٹ میں ایک آگ سی دہکنے لگی تھی۔

"سالے ظالم راجا نے پانی تک پلانے کے لیے منع کر رکھا ہے۔" امیر ہونٹوں ہی ہونٹوں میں بڑبڑایا۔ "کل کا دن بھی اسی طرح گزارنا پڑے گا۔" اچانک اندھیرے میں ایک ٹہلتے ہوئے سپاہی کو دیکھ کر اسے خیال آیا کہ کیوں نہ وہ اس سے کہے شاید اُسے رحم آ جائے اور وہ پانی کے دو گھونٹ اُسے پلا دے۔ آخر وہ بھی تو انسان ہی ہے۔ اس خیال کے آتے ہی اُس نے اپنے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیری پھر دو چار بار کھانس کر اُس نے اپنی سوکھی سی آواز میں اُس سپاہی کو پکارا۔ "بھائی صاحب... جناب۔" اُس کی آواز سن کر ایک سپاہی اُس کی جانب متوجہ ہوا تو امیر نے کہا۔ "بھائی صاحب مجھے پینے کے لیے تھوڑا پانی دے دو۔"

"پانی۔" ایک بھاری آواز سنائی دی اس لفظ میں نہ جانے کیا جادو تھا کہ امیر کی پیاس اور بھی بڑھ گئی اندھیرے میں سپاہی کے چہرے کے تاثرات اُسے نظر نہیں آ رہے تھے مگر پھر بھی اُس کی امید زور کرنے لگی تھی۔ اُسے لگ رہا تھا کہ ابھی سپاہی چھپ چھپا کر اُس کے لیے پانی لے آئے گا۔

چند ہی لمحوں میں سپاہی اُس کے پنجرے کے بالکل قریب آگیا اور دھیمی آواز میں پوچھنے لگا۔ "تمھیں پانی پینا ہے؟" اتنا کہہ کر اُس نے "تھو" کرکے امیر کے مُنہ پر تھوک دیا اور حقارت سے بولا۔ "لو پانی کے بدلے تھوک پیو۔۔۔ اور زیادہ پینا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے ایک بار پھر اُس کے مُنہ پر تھوکا۔

"شیطان۔" امیر غضب ناک چہرہ بنا کر چیخا اور دونوں مٹھیوں میں پنجرے کی سلاخوں کو تھام کر ہلانے لگا۔ پھر سلاخوں سے دونوں ہاتھ باہر نکال کر سپاہی کا گلا دبانے کی ناکام کوشش کی لیکن زنجیروں سے بندھے ہوئے دونوں ہاتھ سلاخوں سے باہر ہی نہ نکل سکے وہ جواب میں سپاہی کے مُنہ پر تھوکے بغیر اور کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا مگر یہ بھی نہ ہو سکا کیوں کہ اُس کے سُوکھے ہوئے مُنہ میں تھوک بھی نہیں رہا تھا۔ اُس نے لاچاری سے ایک گہرا سانس لیا اور خاموش ہو کر ایک طرف بیٹھ گیا۔ پانی کی پیاس کو بھول کر اُس نے سو جانے کی کوشش کی تو اندر کی گھبراہٹ اور بھی بڑھ گئی۔ رونے کی خواہش ہوئی تو اُسے لگا کہ اُس کی آنکھ کے آنسو بھی خشک ہو چکے ہیں۔ اُسے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ صبح تک اگر پانی نہ ملا تو اُس کا وجود مٹ جائے گا۔ سوچتے سوچتے اسے ڈر لگنے لگا کہ کہیں وہ پاگل ہی نہ ہو جائے۔

"پا... نی..." سُوکھے ہوئے گلے سے آواز نکلی اور پھر وہ متواتر "پانی، پانی چلّاتا رہا" لیکن اپنی ہر پکار کے جواب میں اُسے سپاہیوں کے ہنسنے کی آواز کے سوا کچھ اور سنائی نہیں دیا۔ مگر تھوڑی دیر بعد ایک سپاہی نے اس سے کہا۔ "تم اگر سر پٹک کر مر بھی جاؤ تو بھی تمھیں پانی پلانے یہاں کوئی نہیں آئے گا کیوں دوسروں کی نیند خراب کر رہے ہو؟"

آخر کار تھک ہار کر اُس نے خود کو خدا کے حوالے کر دیا اور پھر وہ بے ہوشی کی گہری نیند میں ڈوبتا چلا گیا

●

"کون؟" امیر بہت زور سے چیخنا چاہتا تھا لیکن اُس کے خشک گلے سے چیخ بھی نہ نکل سکی۔ اُسے یوں محسوس ہوا کہ کسی نے اُس کے پیر کا انگوٹھا ہلایا ہو۔ اُسے کوئی بھی نظر نہیں آیا گہرا اندھیرا پھیلا ہوا تھا اور چاروں طرف ایک وحشت ناک سناٹا طاری تھا۔ آسمان پر چمکتے ہوئے ستارے اُسے کانٹوں کی طرح آنکھوں میں چبھتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ پانی کی پیاس اُسے ستانے کے لیے پھر سے جاگ پڑی تھی۔ اُس نے آنکھیں مُوند کر سو جانے کی کوشش کی لیکن پھر اس کے دوسرے پاؤں کے انگوٹھے کو کسی نے ہلایا اچانک اُسے لگا کہ کہیں اُس کے کسی دشمن نے پنجرے میں سانپ تو نہیں چھوڑ دیا! اس خیال کے آتے ہی اُس نے ایک جھٹکے سے اپنے دونوں پیر اندر کھینچ لیے۔ وہ اس طرح ایک کونے میں سمٹ کر بیٹھ گیا جیسے سانپ کے خوف سے اس میں پاؤں پسار کر لیٹنے کی ہمت ہی نہ ہو۔

"ما... لک..." ایک دھیمی اور خوف زدہ سی آواز اُبھری۔ سماعت سے ٹکرائی تو امیر کا سارا بدن کپکپا کر رہ گیا۔ یہ آواز اُس کی جانی پہچانی سی تھی مگر یہ کہیں اس کا وہم ہی نہ ہو! اچانک پنجرے کے پیچھے سے ایک انسانی سایا دھیرے دھیرے اُوپر ہوتا دکھائی دیا۔ اس سائے کو دیکھ کر امیر ایک لمحے کے لیے تو کانپ گیا کہ کہیں شیطان اُس کی جان لینے تو نہیں آگیا!

"میں غلام ہوں۔" خوف سے کانپتے ہوئے اس کے خدمت گار نے پانی کا لوٹا اس کی جانب بڑھا دیا اور امیر کے ہاتھ پاؤں میں بندھی ہوئی بیڑیاں کھڑکھڑا اٹھیں اور اُس نے بے تابی سے لوٹا لینے کے لیے اپنے ہاتھ سلاخوں سے باہر نکالنے کی کوشش کی۔

"مالک۔ ذرا بھی آواز نہ ہو۔" غلام کے ہاتھ کے ساتھ اُس کی آواز بھی کانپ رہی تھی۔ جیسے ہی امیر کی انگلیاں پانی کے لوٹے سے ٹکرائی اُس کے روئیں روئیں میں بے صبری سی دوڑنے لگی لیکن وہ سلاخوں کے درمیان سے پانی کے لوٹے کو اندر نہیں لے جا سکا یہ دیکھ کر غلام نے دھیرے سے اس سے کہا۔ "مالک۔ آپ دونوں ہاتھ پھیلائیں۔" غلام نے پانی کے لوٹے کو ذرا ترچھا کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن مہربانی کرکے پانی کو نیچے گرنے مت دیجیے گا اگر سپاہی جاگ گئے تو..."

اتنی دیر میں امیر ہاتھوں کا چلو بنا کر تیار ہو چکا تھا اور بے چارگی نظروں سے غلام کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو۔ "تم فکر نہ کرو غلام میں اس پانی کا ایک قطرہ بھی گرنے نہیں دوں گا۔ مجھے بہت پیاس لگی ہے غلام۔"

غلام نے لوٹے سے پانی انڈیلنا شروع کیا۔ پانی کے گھونٹ امیر کے گلے سے اترتے جا رہے تھے اور اس کی آنکھوں سے آنسو بھی بہتے جا رہے تھے اور پانی کے ساتھ ساتھ امیر اپنے آنسو بھی پیتا جا رہا تھا۔ لوٹے کا پانی ختم ہو چکا تھا لیکن اس کے باوجود امیر ہاتھ پھیلائے غلام کی طرف دیکھ رہا تھا اور تب اپنے مالک کی قابلِ رحم حالت کو دیکھ کر غلام کی آنکھیں بھی بہنے لگیں۔

"رو ڈمت غلام۔" امیر نے ایک ہاتھ سلاخوں سے باہر نکال کر اُس کے آنسو پونچھ دیے۔ "میں تمھارا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔" امیر گلوگیر آواز میں آگے بولا۔ "اب تم جاؤ کوئی دیکھ لے گا تو تمھاری بھی شامت آجائے گی۔"

غلام سر جھکا کر خاموش کھڑا رہا۔ ہر کوئی جب اُسے نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگا تھا تو یہ ایک نوکر ہی ایسا تھا جس کی نگاہوں میں اب بھی اُس کے لیے محبت کے آنسو چمک رہے تھے۔

"غلام گھر والوں کی کیا خبر ہے؟" دھڑکتے دل سے امیر نے پوچھا تو اُس کا سوال سُن کر غلام کا رواں رواں کانپ اٹھا "بولو غلام۔" امیر بے صبری سے بولا۔ "کچھ مت چھپاؤ تمھیں اپنے مالک کی قسم ہے۔"

"مالک۔" غلام نے ایک ہچکی لی اور وہ سپاہیوں کی موجودگی کو بھی بھول گیا۔ "سُن کر آپ کا دل بیٹھ جائے گا مالک۔"

لیکن امیر کوئی جواب دیے بغیر سوالیہ نظروں سے اُسے گھور رہا تھا۔

"سب کچھ ختم ہو گیا مالک۔" غلام کہتے کہتے سسکیاں بھرنے لگا۔ "بی بی جی اور آپ کی بچی کو ان لوگوں نے بے گھر کر دیا اور سپاہیوں نے سب کچھ لوٹ لیا۔ پھر انھوں نے گھر کو بھی جلا دیا۔"

"یا خدا۔" امیر نے گھبرا کر سانس لیا۔ "غلام اس وقت عظیمہ اور میری بیٹی کہاں ہیں؟"

"مالک۔" غلام اپنی ہچکیاں روکتے ہوئے بولا۔ "ان دونوں کو ہمارے مولوی صاحب اپنے گھر لے گئے تھے۔"

"خدا اُس رحم دل بندے کا بھلا کرے۔" امیر کی نگاہوں میں مولوی صاحب کا چہرہ گھومنے لگا۔ "تین چار سال پہلے جب مولوی صاحب کی بیٹی کی شادی تھی تو امیر نے اس وقت اُس کی مدد کی تھی جس کے بدلے مولوی نے آج اُس کی بیوی اور بچی کو اُسرا دیا تھا جب ساری دنیا دشمن ہو جائے اور ایسی حالت میں کوئی ساتھ دے تو اس سے بڑا دوست کون ہو سکتا ہے؟"

"غلام عظیمہ کی حالت کیسی ہے؟" امیر نے کسی مجرم کی طرح سوال پوچھا لیکن غلام اس کے سوال کا جواب نہیں دے سکا امیر نے دیکھا کہ بوڑھا ملازم اس کے ساتھ نظریں نہیں ملا رہا ہے۔ یہ دیکھ کر اس نے سوچا کیا کوئی نہ ہونے والی بات ہو چکی ہے؟

"بتاؤ غلام۔ میں نے اس دل کو پتھر بنا لیا ہے۔ اب میں ہر صدمہ برداشت کر سکتا ہوں۔" امیر نے دھیمی آواز میں کہا۔

"لیکن مالک..." غلام کی آواز لڑکھڑا گئی۔ "بی بی جی سے یہ صدمہ برداشت نہیں ہوا لوگوں کے لعن طعن نے اُن کا سینہ چھلنی کر دیا۔ وہ ابھی دو گھنٹے قبل ہی خدا کو پیاری ہو گئیں ہیں۔"

"آہ۔" امیر کے ہونٹوں سے نکلی ہوئی اِس آہ نے خاموش رات میں ہلچل سی مچا دی۔ ایک سپاہی کی آنکھ کھل گئی اور اُس نے دور سے ہی امیر کو گالیاں دینی شروع کر دیں تب امیر کو خیال آیا کہ اُسے اپنے آپ کو سنبھالنا چاہیے۔ وہ تو اپنی پیاری بیوی کی موت پر رو بھی نہیں سکا تھا۔ اپنے دھڑکتے دل پر ہاتھ رکھ کر اِس غم کو پی جانے میں اُسے تھوڑی دیر لگی پھر وہ اپنے آپ کو تسلی دیتے ہوئے دل ہی دل میں کہنے لگا "اچھا ہوا عظیمہ کے تمھیں نجات مل گئی۔ زندہ رہ کر تم یہ سب برداشت نہ کر پاتیں اور نہ ہی مجھے کبھی معاف کر سکتیں۔"

تھوڑی دیر تک وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھتا ہوا خاموش بیٹھا رہا۔ غلام ابھی تک سر جھکائے چپ چاپ کھڑا تھا اچانک امیر کو اس کا خیال آیا تو وہ بولا۔ "غلام تم میرا ایک کام کر دینا۔"

"حکم مالک۔"

"مولوی صاحب سے میرا سلام کہنا۔ میری طرف سے اُن سے گذارش کرنا لکھتے کہتے اس کی آواز رندھ گئی "کہ وہ میری بیٹی کو باپ بن کر پالیں اور... اور..." امیر جذبات کے طوفان میں بہہ گیا۔ "اُن سے کہنا کہ بچی کو اس بات کی کبھی خبر نہ ہو کہ وہ امیر علی ٹھگ کی بیٹی ہے۔"

یہ سُن کر غلام نے ایک جھٹکے سے اپنی گردن اُٹھا کر پنجرے کے اندر بند اپنے مالک کی طرف دیکھا لیکن اب

امیر اپنے دونوں گھٹنوں میں اپنا سر چھپائے سسک سسک کر رو رہا تھا۔ غلام سے اپنے مالک کی یہ حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی اس لیے وہ آہستہ آہستہ سرکتا ہوا پنجرے سے دور چلا گیا۔

"کھن... کھن... کھن" لڑکھڑاتی چال سے امیر قید خانے کے صحن میں داخل ہوا، بیڑیوں کے کھڑکھڑانے کی آواز سن کر نئے آنے والے قیدی کو دیکھنے کے لیے کچھ پرانے قیدی اپنی کوٹھریوں سے جھانکنے لگے۔

"یہ تو کوئی بہت ہی مہنگا مہمان نظر آرہا ہے۔" ایک قیدی نے ہنستے ہوئے جملہ کس دیا۔ "آئیے جناب تشریف لائیے آپ کے آنے سے تو اس مہمان خانے کی رونق ہی بڑھ گئی ہے۔"

"اس سے تو ہم لوگ ہزار درجے بہتر ہیں۔" دوسرے قیدی نے اس کی پیٹھ پر نظریں جمائے ہوئے کہا۔ "چوری کا دھندہ ضرور کرتے ہیں لیکن شرافت کا دکھاوا تو نہیں کرتے۔"

پھر ہا... ہا... ہا... ہی... ہی کی آوازوں سے جیل کی دیواریں جھنجھنا اٹھیں اور امیر آگے بڑھتا چلا گیا۔ جیل کے داروغہ نے ایک کوٹھری کا دروازہ کھول کر اسے اندر دھکیل دیا۔ "زندگی بھر موج اڑانا" داروغہ نے اسے دھکا مارتے ہوئے کہا تو امیر کو ٹھری کی پتھریلی دیوار سے ٹکراتے ٹکراتے بچا ہاتھ پیر کی بیڑیاں کھنک اٹھیں۔ پھر کوٹھری کا دروازہ بند ہو گیا اور داروغہ سپاہیوں کے ساتھ ہنستا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

امیر کی پہلی نظر کوٹھری کے ایک کونے میں پڑے ہوئے پانی کے مٹکے پر بڑی پچھلی رات اسے ایک لوٹا پانی ملا تھا پھر آج کا سارا دن اسے پیاسا ہی رہنا پڑا تھا۔ اس نے پانی سے بھرے ہوئے مٹکے کو دونوں ہاتھوں سے اٹھایا اور غٹاغٹ پانی پینے لگا۔ یکایک کوٹھری کے ایک کونے سے کسی کی سسکیوں کی آواز سنائی دی۔ اس نے چونک کر مٹکا رکھ دیا اور پلٹ کر دیکھنے لگا۔ دوسرے کونے میں کوئی قیدی لیٹا ہوا تھا۔ امیر اسی کی جانب سرکنے لگا۔

"پا... نی..." کمبل اوڑھے ہوئے اس قیدی کی نقاہت بھری آواز امیر کی سماعت سے ٹکرائی تو امیر فوراً ہی پلٹ گیا پانی کا مٹکا اٹھا کر اس نے قیدی کے پاس رکھ دیا اور اس کے منہ پر سے کمبل ہٹا کر وہ پانی کے لیے اسے پوچھنے ہی والا تھا کہ اچانک اس کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی رام لال کو دیکھتے ہی اس کا جسم غصے کی آگ میں تپنے لگا۔ اسی حرام کی وجہ سے تو اس پر مصیبت آئی ہے، اسی کم بخت کی وجہ سے یہ ذلت ہوئی ہے، اس کی بیوی کو بے موت مرجانا پڑا اور بچی کو بے سہارا ہو جانا پڑا ہے۔

"بے ایمان۔" امیر نے دانت پیس کر اس کی گردن پکڑ لی "اب تو میں تمہارا خون پیوں گا۔" ایک جھٹکے سے امیر نے اس کے اوپر سے کمبل ہٹا دیا۔ پھر جب دوسرے ہاتھ سے اس نے اس کے بالوں کو پکڑنا چاہا تو اسے اپنی انگلیوں میں خون کی چکناہٹ سی محسوس ہوئی۔ اس نے غور سے دیکھا تو اسے رامو کے سر سے خون بہتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے چہرے پر تازہ زخم کا نشان نظر آرہا تھا۔ رامو کو زخمی دیکھ کر امیر کا دل اس پر ہاتھ اٹھانے کو نہیں چاہا۔

"چلو اٹھ کر بیٹھ جاؤ۔" امیر کے سخت لہجے میں بھی ہمدردی کی جھلک تھی۔

"پہلے اٹھ کر پانی پی لے۔" اس نے سہارا دے کر رامو کو بیٹھا دیا۔ رامو دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا تو امیر نے اس کے منہ کے قریب مٹکا لاتے ہوئے کہا۔ "لے پی بے ایمان!"

ابھی رامو کے گلے سے دو چار گھونٹ ہی اترے تھے کہ اس کی آنکھوں کا پانی بہہ نکلا۔ امیر کے چہرے پر نظر پڑتے ہی اسے ایک جھٹکا لگا۔ پھر وہ کچھ دیر تک کوٹھری کی پتھریلی دیوار کو دیکھتا رہا پھر بہ مشکل بولا۔ "سردار آپ یہاں؟"

امیر نے گھونسہ باندھ کر اس پر ہاتھ اٹھایا لیکن اس کا ہاتھ اوپر ہی اٹھا رہ گیا۔ رامو کی آنکھوں میں بے بسی اور لاچاری کی جھلک تھی کچھ بھی ہو ایک وقت میں رامو اس کا وفادار ساتھی رہ چکا تھا۔ اتنی مار پڑنے کے بعد تو آدمی جرم کا اقرار کر ہی لیتا ہے۔ اس کے لیے اس پر ظلم کرنا نامناسب ہی تو ہے لیکن اس کے باوجود امیر اسے معاف کرنا نہیں چاہتا تھا۔

"بولو رامو۔ اپنی جان بچانے کے لیے تم نے یہ غداری کیوں کی؟"

رامو بولو کھلا کر ایک ٹک اس کی طرف دیکھنے لگا۔

سر ہلا کر انکار کرنے لگا لیکن سر کی چوٹ کی وجہ سے وہ سر کو جنبش بھی نہ دے پا رہا تھا۔ اچانک اس کے زخمی چہرے پر امیر کا گھونسہ پڑا اور ساتھ ہی امیر کی غصے میں ڈوبی ہوئی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ "پھر جھوٹ بول رہا ہے؟"

رامو کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ "سردار۔ اقرار نہ کرنے کی سزا تو سپاہیوں نے بہت دی ہے اور جو باقی رہ گئی ہے وہ آپ دے دیں۔" اس کی آواز میں سچائی کی جھلک نمایاں تھی۔ "میں بھوانی ماتا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے ان لوگوں کو کچھ نہیں بتایا۔"

"ہوں۔" امیر کے رونگٹے سلگ اٹھے تھوڑی دیر تک رامو کی آنکھوں میں جھانک کر اس نے اطمینان کرنے کی کوشش کی پھر جیسے جیسے اسے یقین ہوتا گیا ویسے ویسے اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوتی چلی گئی اور پھر اچانک جذبات میں آکر اس نے رامو کو اپنے سینے سے لگا لیا اور بولا۔ "انھوں نے تمہارا نام لے کر مجھے پھنسایا ہے۔"

"کس نے؟"

"مطلبی راجا نے۔" امیر کے جبڑوں کی رگیں بھی تن گئیں۔ "مجھے ڈر تھا کہ اگر ہر بار میں تمہیں بلوا کر تم سے اقرار جرم کرایا گیا تو ہمارے دوسرے ساتھی بھی پھنس جائیں گے اس خیال کے آتے ہی میں نے خاموشی سے سارے الزامات برداشت کر لیے۔"

"تو کیا مجھ پر آپ کو بھروسا نہیں رہا تھا؟"

"نہیں رامو خود میری تقدیر ہی مجھے دھوکہ دینے پر تلی ہوئی تھی۔"

"آپ کو یاد ہے سردار؟" رامو نے نظریں جھکا کر کہا۔ "میں نے اس بات کی مخالفت کی تھی کہ ہیڑی کے شیخ نصیر الدین کو اس کے گھر جا کر سفر برباد جانے کے لیے رضامند کیا جائے کیوں کہ یہ ہمارے اصولوں کے خلاف ہے یہ اسی کی سزا ہے۔"

امیر ایک لفظ بھی نہ بول سکا اور اب امیر کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ بھوانی دیوی نے اس کی حفاظت کیوں نہیں کی تھی۔

"کچھ بھی ہو رامو... بے وقوف راجا نے اپنی رحم دلی کا دکھاوا کر کے مجھے چونکہ پھانسی پر نہیں لٹکایا ہے تو اس میں یقیناً بھوانی دیوی کا کوئی خفیہ اشارہ پوشیدہ ہے۔" اتنا کہہ کر امیر چپ ہو گیا اور اپنے من میں اٹھتے ہوئے خیالوں کو رامو سے چھپا گیا اور دل ہی دل میں اپنے آپ سے بولا۔ "مہاراجا نے مجھے دھوکہ دے کر قید خانے میں دھکیل دیا ہے لیکن اب میں اسے بتاؤں گا کہ امیر علی جیل توڑ کر بھی بھاگ سکتا ہے۔"

●

درگا سنگھ ٹھگ کی ٹولی کو گرفتار کرنے کے بعد ولیم سلومن ٹھگوں کی دوسری ٹولیوں کا سراغ لگانے میں مصروف ہو گیا۔ سوتے جاگتے اور کھاتے پیتے ہر دم اس کے دماغ میں یہی دھن سوار رہنے لگی تھی۔ اس نے موتی سنگھ سے ٹھگوں کی خفیہ رامسی زبان تھوڑی بہت سیکھ لی تھی لیکن چونکہ موتی ایک بالکل ہی نیا ٹھگ بنا تھا اور یہ ورثہ اسے اپنے باپ دادا کی طرف سے نہیں ملا تھا۔ اس لیے وہ ولیم سلومن کو بہت زیادہ معلومات نہیں فراہم کر سکا تھا۔ ولیم سلومن جانتا تھا کہ اس نے کتنے خطرناک کام کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ موتی کے کہے ہوئے الفاظ بار بار اس کے کانوں میں گونجتے رہتے تھے۔ "جناب ٹھگوں کو نیست و نابود کر دینے کے لیے آپ کو سات بار جنم لینا پڑے گا۔"

اس کے جواب میں اس نے موتی سے کہا تھا کہ وہ تو اپنے ادھورے جنم میں ہی اس کام کو انجام دے کر اپنی بقیہ زندگی اپنے ملک میں جا کر آرام سے بسر کرے گا یہ ساری باتیں اسے اکثر یاد آتی رہتی تھیں۔

درگا سنگھ کی ٹولی میں سے پھانسی کی سزا سے بچ جانے والے تین چار ٹھگوں کو اس نے اپنے بس میں تو کر لیا تھا اور ان سے یہ معلوم بھی کر لیا تھا کہ وہ کب سے ٹھگی کے پیشے سے منسلک ہیں؟ کس کس سردار کی ٹولی میں رہ چکے ہیں؟ اور اب تک کتنے مسافروں کو انھوں نے ختم کیا ہے؟

جیسے جیسے اس کی معلومات میں اضافہ ہوتا گیا ویسے ویسے اس پر یہ راز کھلتا گیا وہ حیرتوں کے سمندر میں غرق ہوتا جا رہا تھا اور وہ سوچنے لگتا کہ نہ جانے کتنی پشتوں سے لوٹ مار اور خون ریزی کا یہ سلسلہ جاری ہے؟ کتنی صدیوں سے اس کی جڑیں گہرائی میں اترتی چلی گئی ہوں گی؟ سوچتے سوچتے وہ ایک

سرد سی آہ بھر کر رہ جاتا۔ اگر وہ ایک شاخ کو ہی کاٹنے بیٹھتا تو موتی کے کہنے کے مطابق اُس کے کئی جنم بیت جاتے اس لیے اُسے تو اس زہریلے درخت کی جڑوں کو ہی صاف کرنا تھا۔ اگر وہ اِن کے سب سے بڑے سرغنہ کو ختم کرنے میں کامیاب ہو گیا تب ہی وہ اس ملک کو ٹھگوں سے پاک کرنے میں کامیاب ہو سکے گا۔

لیکن اچانک ہی ولیم سلومن کے اس ارادے کے آگے ایک دیوار سی کھڑی ہو گئی۔ "ویری بیڈ مسٹر سلومن۔" ادھیڑ عمر کے ڈاکٹر اسکاؤٹ کو پ نے اس کا معائنہ کرنے کے بعد کہا۔ "اپنے فرائض کی بجا آوری کے دُھن میں آپ اپنی صحت اور اپنے جسم سے بالکل ہی غافل ہو گئے ہیں۔ کتنے سالوں سے آپ نے اپنے جسم کو آرام کرنے نہیں دیا ہے؟"

"مجھے یاد نہیں ہے۔" ولیم سلومن نے ہنس کر کہا۔ "میں نے فیصلہ کیا ہے کہ جس کام کو پورا کرنے کا بیڑہ میں نے اٹھایا ہے اُسے پورا کرنے کے بعد ہی میں آرام کروں گا۔"

"تب تو آپ کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔"

"کیا مطلب؟" ولیم سلومن ڈاکٹر اسکاؤٹ کی کافی عزت کرتا تھا لیکن پھر بھی وہ اُونچی آواز میں پوچھ بیٹھا۔ "اب بھی میری حوصلہ شکنی کرنا چاہتے ہیں؟"

"نہیں میں تو آپ کو صحت مند بنانا چاہتا ہوں۔" ڈاکٹر اسکاؤٹ کے ہونٹوں پر ایک پُر خلوص مسکراہٹ پھیل گئی۔ "ایک سال تک آپ کو مکمل آرام کرنا ہو گا۔"

"یہ تو آپ مجھے سزا دے رہے ہیں ڈاکٹر۔" سلومن کا خیال تھا کہ ایک سال کی بات کہہ کر ڈاکٹر اسکاؤٹ اس سے مذاق کر رہا ہے۔ اس لیے وہ بولا۔ "آرام کے لیے تو مہینا دو مہینا ہی کافی ہوتا ہے۔"

"ڈاکٹر میں ہوں یا آپ؟" ڈاکٹر اسکاؤٹ کو سنجیدہ ہونا پڑا۔ "ایک تو اِس ملک کی آب و ہوا ہمیں راس نہیں آتی۔ آئے دن چھوٹی موٹی بیماریاں لگتی رہتی ہیں۔ یہاں کتنے انگریز بڑھاپے تک پہنچ سکتے ہیں اُن کی تعداد آپ کو جاننا ہے؟"

"نہیں۔" ولیم سلومن اِس طرح بولا جیسے پریشانی یا اُلجھن کی کوئی بات وہ سننا ہی نہ چاہتا ہو۔

"زیادہ تر انگریز نوجوانی میں ہی ختم ہو جاتے ہیں۔" ڈاکٹر اسکاؤٹ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "یہاں سے بیمار ہو کر جانے والے اپنی موت کو اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔"

یہ بات سن کر ولیم سلومن کو اس وقت ڈاکٹر اسکاؤٹ جیسا ہمدرد شخص بھی انتہائی زہریلا محسوس ہوا لیکن ڈاکٹر اسکاؤٹ کی بات کی مخالفت بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔ اُس کا جی چاہا کہ وہ مذاق مذاق میں ڈاکٹر سے کہہ دے کہ جناب ڈاکٹر صاحب آپ بھی تو اس وقت بڑھاپے کی منزل پر پہنچ چکے ہیں اور آپ کو کوئی بیماری بھی نہیں لگی ہے لیکن ڈاکٹر نے اُسے یہ بات کہنے کا موقع ہی نہیں۔

"مسٹر سلومن۔" ڈاکٹر اسکاؤٹ کے لہجے میں ہمدردی تھی۔ "آپ نے جس کام کا بیڑہ اٹھایا ہے اُسے میں قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ سے یہ کام پورا نہیں ہو سکے گا لیکن اِس وقت اگر آپ نے اپنی صحت کی پرواہ نہیں کی تو یہ کام کبھی بھی پورا نہیں ہو سکے گا بس میں تو اتنا ہی جانتا ہوں۔"

ڈاکٹر اسکاؤٹ تھوڑی دیر کے لیے رُکا تو ولیم سلومن نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں ہمدردی اور خلوص کی چمک لہرا رہی تھی۔ "میں چاہتا ہوں آپ کو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہو اِسی لیے میں آپ کو ایک سال تک تبدیلی آب و ہوا کے لیے جانے کو کہہ رہا ہوں۔" یہ کہہ کر ڈاکٹر اسکاؤٹ نے جلدی سے آگے کہا۔ "آپ اگر میری بات نہیں مانیں گے تو میری رپورٹ دیکھنے کے بعد خود گورنر جنرل آپ کو زبردستی رخصت پر بھیج دیں گے۔"

"لیکن مجھے ایسی کون سی بیماری ہے؟" ولیم سلومن کی آواز میں عجیب سی بے چینی تھی۔ "کیا مجھے کوئی خطرناک بیماری ہے؟"

اس وقت تک تو ایسی کوئی بیماری نہیں ہے لیکن اپنے جسم کی آپ نے جو حالت بنا رکھی ہے اُسے دیکھتے ہوئے میں یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ وہ کسی بھی بیماری کو برداشت نہیں کر سکے گا۔" ولیم سلومن کے گلے سے اُس کی بات اُترتی جا رہی تھی کیوں کہ پچھلے دو مہینے سے اُسے ٹھیک طرح نیند نہیں آتی تھی۔ آدھی رات کو اُس کی آنکھ کھل جاتی اور وہ ٹھگوں کی گرفتاری کے منصوبے بنانے بیٹھ جاتا۔ اور نیند نہ آنے کی وجہ سے اس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا تھا اس بات سے تو وہ انکار کر ہی نہیں سکتا تھا۔

"اچھی بات ہے ڈاکٹر صاحب۔ میں آپ کا مشورہ مان لیتا ہوں۔" تھوڑی بعد ولیم سلومن نے کہا۔ "اب بتائیں کہ آب و ہوا کے لیے مجھے کون سے ہل اسٹیشن کو پسند کرنا چاہیئے۔"

"گڈ۔" ڈاکٹر اسکاؤٹ اس کا کندھا دبا کر ہنسا اور پھر اُسے چونکاتے ہوئے بولا۔ "آب و ہوا کی تبدیلی کے لیے جگہ آپ کو پسند کرنی ہے لیکن اس ملک سے باہر۔"

"ڈاکٹر۔" بستر پر آدھا بیٹھ کر سلومن نے جوشیلے لہجے میں کہا۔ "آپ مجھے اس ملک سے باہر دھکیل دینا چاہتے ہیں؟" اتنا کہہ کر اُس نے اپنے چہرے کا پسینا پونچھا پھر آگے بولا۔ "ایک سال کی غیر حاضری میں تو میری برسوں کی محنت پر پانی پھر جائے گا۔ ہر سال تقریباً چالیس ہزار انسانوں کی جانیں ٹھگ لوگوں کے رومال کے پھندے میں پھنس کر ختم ہو جاتی ہیں اور آپ مجھے تبدیلی آب و ہوا کے لیے ایک سال تک باہر بھیجنا چاہتے ہیں؟"

"کتنے سالوں سے یہ ٹھگ لوگ یہ دھندہ کر رہے ہیں؟" ڈاکٹر نے انتہائی پُرسکون لہجے میں پوچھا تو ولیم سلومن کا جوش کچھ ٹھنڈا پڑ گیا ٹھگوں کے سلسلے میں اگر کوئی اُس سے بات کرتا تھا تو اُسے یہ اچھا لگتا تھا۔

"یہ برسوں کی بات نہیں ہے ڈاکٹر آپ یہ پوچھیے کہ کتنی صدیوں سے ٹھگ لوگ یہ کام کر رہے ہیں؟" ولیم سلومن سب کچھ بھول کر کہنے لگا۔ "اس بات کا ثبوت مل چکا ہے کہ تین سو سال سے کشت و خون کا یہ بازار گرم ہے۔"

"بس تو پھر ایک سال دیر نہ ہو اس لیے آپ اپنی عمر کم کرنا چاہتے ہیں؟" اس بار ڈاکٹر اسکاؤٹ سخت لہجے میں کہہ رہا تھا۔ "ہندوستان سے باہر جائے بغیر آپ کے دماغ سے ٹھگوں کا بھوت نہیں نکلے گا اور آپ کی طبیعت کبھی ٹھیک نہیں ہو گی۔"

"تو اس کا مطلب ہے مجھے ریٹائرمنٹ کی ضرورت ہے یہی نا؟"

"دیٹ از کیریکٹ۔" ڈاکٹر اسکاؤٹ خوش ہو کر بولا۔ "آسٹریلیا میں آپ کا کوئی رشتہ دار وغیرہ ہے؟"

ولیم سلومن سمجھ گیا کہ ڈاکٹر اُسے آسٹریلیا جا کر آرام کرنے کا مشورہ دینا چاہتا ہے۔ "بس ڈاکٹر میرا ایک بھائی وہاں ملٹری میں ہے اگر میں وہاں گیا تو ایک طویل عرصے کے بعد ہم دونوں کی ملاقات ہو گی۔"

"تب پھر آپ تیاری کر لیں۔" ڈاکٹر اسکاؤٹ اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے بولا۔ "چھٹی کی درخواست کے ساتھ میری رپورٹ بھی ہو گی تو فوراً ہی سارا کام ہو جائے گا۔"

"لیکن ڈاکٹر صاحب کیا واقعی ایک سال باہر رہنا ضروری ہے؟"

"واپس آ کر اگر آپ کو اپنا ادھورا کام پورا کرنا ہے تو پھر واقعی یہ بہت ضروری ہے۔" ڈاکٹر نے جواب دیا اور ہنستے ہنستے باہر چلا گیا۔

ولیم سلومن ایک سال کی لمبی چھٹی پر باہر جا رہا ہے یہ سن کر بہت سے لوگوں کو یقین ہو گیا کہ اب وہ کبھی ہندوستان واپس نہیں آئے گا اور اگر وہ آ بھی گیا تو بھی ٹھگوں کو پکڑنے کا خیال اُس کے دماغ سے نکل چکا ہو گا موتی نے تو ولیم سلومن کی بیماری کا اور ہی مطلب نکالا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ گورے صاحب پر آخر کار بھوانی دیوی کا قہر نازل ہو ہی گیا ہے اور پھر ولیم سلومن جب ہندوستان کی سرحد سے باہر نکل گیا تو موتی سنگھ نے دوبارہ ٹھگوں کی ٹولی میں شمولیت اختیار کر لی۔

آٹھ مہینے میں ہی امیر جیل خانے کی زندگی سے اُکتا گیا' اُن دونوں کو جیل خانے کی ایک الگ تھلگ کوٹھری میں رکھا گیا تھا۔ صبح ہی صبح انھیں گندگی اٹھانے والے مہتروں کی شکلیں ہی دیکھنے کو ملتی تھیں اور جب کوئی سپاہی چکر لگاتا ہوا وہاں نکل آتا تو وہ بلاوجہ دو چار گالیاں انھیں سناتا ہوا واپس چلا جاتا تھا۔ دو وقت کی روٹی بھی انھیں وقت سے نہیں ملتی تھی۔ پندرہ دنوں پر یا مہینے بھر بعد جمعدار زور آور سنگھ قیدیوں کی خبر گیری کے لیے جیل میں آتا تھا مگر ہر بار وہ امیر کی بے عزتی کرنا نہیں بھولتا تھا۔ وہ ہر بار امیر سے طنزیہ لہجے میں کہتا۔ "لگتا ہے کھانا اچھا نہیں ملتا ہے؟ اوڑھنے کے لیے کمبل چاہیے؟ یہاں گندے کپڑے پہننے پڑتے ہیں اتنے سال عیاشی میں رہنے والے کو یہ سب اچھا کیوں لگے گا؟ لیکن تم فکر مت کرو مہاراجا دھیرج سنگھ تمھارے لیے

ایک عالیشان محل بنوا رہے ہیں کچھ عرصے ٹھہر جاؤ پھر تمھیں وہیں پہنچا دیا جائے گا۔" اتنا کہہ کر وہ قہقہے لگاتا ہوا وہاں سے چلا جاتا اور تب امیر دل ہی دل میں یہ فیصلہ کرتا کہ جیل سے چھوٹنے کے بعد تو سب سے پہلے اسی کو وہ ختم کرے گا لیکن ہر بار اُس کا یہ فیصلہ اُس کی ایک بھاری بھرکم آہ کے نیچے کچل کر رہ جاتا تھا۔ جیل سے فرار ہونے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا اور نہ ہی کوئی ترکیب سمجھ میں آتی تھی۔

"رامو تجھے تو جیل کی روٹی راس آگئی ہے۔" امیر رامو کی لاپرواہی پر کبھی کبھی جھنجھلا جاتا۔ "باہر نکلنے کا کوئی ایک آدھ راستہ تو ڈھونڈو لگتا ہے تم جیل سے باہر نکلنا ہی نہیں چاہتے۔"

"امیر میاں ہماری مرضی سے کوئی کام ہونے والا نہیں ہے۔" رامو بھونڈی سی آواز میں جواب دیتا۔ "سب کچھ بھوانی دیوی کی مرضی سے ہوا ہے جب تک ہمیں اپنی بھول کی سزا پوری مل نہیں جاتی اُس وقت تک صبر کرنا پڑے گا۔"

رامو کا یہ جواب امیر کو تلملا کر رکھ دیتا، آخر ہر بات میں بھوانی دیوی کو آگے کر دینے کا کیا مطلب ہے؟ لیکن اب دیوی کے خلاف بولنے کی اس میں ہمت نہیں رہی تھی۔ بدری ناتھ اور اُس کے باپ ابراہیم نے اکثر اُسے سمجھایا تھا کہ شگون کی طرف سے لاپرواہی کرو گے تو تمھیں نقصان اُٹھانا پڑے گا۔ رامو نے بھی ہٹری کے شیخ نصیرالدین کو اُس کے گھر سے بلا کر سفر پر لے جانے کی مخالفت کی تھی اُس نے اُس وقت امیر سے کہا تھا کہ جو راستے میں مل جائے اُسے ہی شکار کر سکتے ہیں۔ اپنے اس اصول کو ہم توڑیں گے تو بھوانی دیوی ہم سے ناراض ہو جائے گی سوچتے سوچتے وہ خود سے کہتا۔ "ممکن ہے یہ سب سچ ہی ہو ورنہ میں اس طرح پکڑا کیوں جاتا؟"

"ٹھیک ہے رامو جب تک دیوی راستہ نہ دکھائے اُس وقت تک ہمیں انتظار کرنا ہی پڑے گا۔" جواب دے کر امیر پوچھتا۔ "لیکن پھر بھی ہمیں کوشش تو کرنی ہی چاہیے۔"

"میاں۔" رامو اپنے مخصوص انداز میں دلیل دیتا۔ "یہ جمعدار تم سے بہت ناراض رہتا ہے۔ سب سے پہلے تو تم اس سے کوئی شکایت کرنا ہی چھوڑ دو۔"

"وہ کیوں؟"

"تمھیں زیادہ سے زیادہ تکلیف میں دیکھ کر اُسے آتا ہے۔" رامو نے ایک چالاک شخص کی طرح اُسے سمجھایا۔ "دوسرے قیدیوں سے تو وہ مزدوری کروا لیتا ہے مگر ہمیں وہ کوٹھری سے باہر نکلنے بھی نہیں دیتا اس کی کیا وجہ ہے؟"

"شاید اس لیے کہ ہمیں کام کرنے کے لیے باہر نکالے گا تو ہم کہیں بھاگ نہ جائیں اس لیے۔" امیر نے کہا اور اس کے ساتھ اُس کے دماغ میں ایک بجلی سی کوند گئی۔ "رامو کی ہوشیاری پر خوش ہو کر وہ بول اٹھا۔" اب سمجھا شیخ بند کر کے ہمیں یہ دکھاوا کرنا ہے کہ ہم بہت خوش ہیں۔ سپاہیوں سے ہمیں یہ کہنا ہے کہ ہمیں تو یہاں بہت آرام ہے۔ دوسری قیدی تو مزدوری کرتے کرتے تھک جاتے ہیں جب کہ ہم دونوں بیٹھے بیٹھے موج اڑا رہے ہیں۔ جمعدار کے کانوں تک یہ بات پہنچے گی تو وہ جل جائے گا اور پھر وہ ہی دن وہ ہمیں کسی سخت کام پر لگا دے گا۔ اس طرح کوٹھری سے باہر نکل کر ہم فرار کا کوئی راستہ ڈھونڈ نکالیں گے۔"

امیر نے دو چار بار گردن ہلا کر اُس کی تائید کی وہ اس اُلجھن میں پڑنا نہیں چاہتا تھا کہ کس کی کیا مرضی ہے۔ اُسے جیل سے نکلنے سے مطلب تھا۔

●

تین مہینے اور گزر گئے امیر نے جمعدار سے اپنی تکالیف کی شکائتیں کرنا چھوڑ دی تھیں۔ وہ ہمیشہ خوش و خرم رہنے کا دکھاوا کرنے لگا تھا۔ سپاہیوں کے کانوں میں وہ اکثر اُس قسم کے جملے پٹکا تا رہتا تھا کہ اُسے مزدوری نہیں کرنی پڑتی اور بیٹھے بیٹھے آرام سے اُسے دو وقت کا کھانا مل جاتا ہے لیکن اس کی یہ ساری کوشش ناکام رہی۔ انھیں کوٹھری سے باہر نکالا ہی نہ گیا۔ ہفتے میں ایک دن باری باری انھیں کے لیے کوٹھری سے باہر نکالا جاتا اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکی تھی۔ یہ دیکھ کر امیر کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

"رامو تم گھوڑا بن جاؤ۔" ایک دن اچانک ہی امیر نے کہا تو رامو اُس کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔ امیر کی تلقین کو کوٹھری کی پچھلی دیوار پر بنے ہوئے سلاخوں والے

روشن دان پر جمی ہوئی تھیں اور وہ کہہ رہا تھا۔ "اس روشن دان سے جھانک کر باہر دیکھنے کو جی چاہتا ہے پورے گیارہ مہینے ہو گئے آسمان کو نہیں دیکھا ہے۔"

اس اندھیری کوٹھری میں روشنی کے لیے ایک ہی روشن دان تھا، جو اتنی اُونچائی پر تھا کہ اُس میں سے کوئی قیدی جھانک کر باہر نہ دیکھ سکے۔ اُس روشن دان میں لوہے کی دو موٹی موٹی سلاخیں بھی لگی ہوئی تھیں تاکہ کوئی اس روشن دان کے راستے بھاگ نہ سکے۔

امیر کو خوش کرنے کے لیے رامو سب کچھ کرنے کے لیے تیار تھا۔ اس لیے گھوڑا بننے سے قبل اُس نے چوکنا نظروں سے کوٹھری کے سلاخوں والے دروازے کے باہر جھانک کر دیکھ لیا، سنتری اور جیل کے دوسرے پہرے دار ایک جگہ بیٹھے ہوئے تاش کھیلنے میں مصروف تھے۔ اُن کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد وہ روشن دان کے ٹھیک نیچے آکر جھک گیا اور امیر سے بولا "لو اب جلدی سے میری پیٹھ پر کھڑے ہو جاؤ اور آسمان کو دیکھنے میں زیادہ دیر نہ لگانا، خیال رہے بیڑیوں کی آواز نہ ہو سنتریوں نے اگر دیکھ لیا تو ہوا کے لیے جو یہ ایک روشندان ہے اُسے بھی یہ لوگ بند کر دیں گے۔"

امیر نے احتیاط سے رامو کی پیٹھ پر باری باری دونوں پیر رکھ دیے اور دیوار کے سہارے ہاتھ بڑھا کر اس نے روشن دان کی سلاخوں کو تھام لیا مگر باہر جھانکنے کے لیے اُسے پیر کی ایڑیاں اور گردن بھی اُونچی کرنی پڑی، باہر چاندنی پھیلی ہوئی تھی جس کی روشنی میں باہر کا نظارہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ دیوار کے ساتھ جو میدان تھا اُس پر سبزہ چمک رہا تھا اور اس میدان کے سرے پر ایک مندر کا کلس چمک رہا تھا۔ نظر بھر کر ان سب چیزوں کو دیکھنے میں جب امیر نے دیر لگا دی تو رامو نے اپنی پیٹھ ہلا کر اُسے جلدی سے اتر آنے کا اشارہ کیا۔

نیچے اترتے وقت امیر کے پیروں میں پڑی ہوئی بیڑیاں کھنک اٹھیں۔ اُن کی آواز جب باہر بیٹھے ہوئے سنتری کے کانوں میں پڑی تو وہ وہیں سے چلا کر بولا۔ "اب تیری خیر نہیں ہے۔"

امیر سانس روکے رامو کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن رامو کے چہرے پر خوف کے کوئی آثار نہیں تھے۔ وہ مسکرا کر امیر سے بولا۔ "حرام خور تاش کھیل رہے ہیں اور اگلی بازی جیتنے کے لیے ایک دوسرے کو دھمکیاں دے رہے ہیں۔"

یہ سن کر امیر نے اطمینان کا سانس لیا اور ہاتھ سلاخوں سے لگی ہوئی دھول کو صاف کرتے ہوئے بولا۔ "رامو اب تمھاری باری ہے۔ باہر جھانکنے سے دل کو کیسی تسلی ہوتی ہے۔" اتنا کہہ کر امیر نیچے جھک گیا لیکن رامو اپنی جگہ سے نہیں اٹھا۔ "نہیں۔ میں تمھاری پیٹھ پر کھڑا نہیں رہ سکتا کچھ بھی ہو مگر تم میرے سردار ہی تو ہو۔"

امیر کو اس کی یہ بات اچھی نہیں لگی لیکن اُس نے ضد نہیں کی ان سب معاملوں میں رامو بہت ہوشیار رہتا تھا جیل کے اندر بھی وہ امیر کی عزت کرتا تھا اور اُسی احترام سے پیش آتا تھا اب تک صرف اتنا فرق ہوا تھا کہ امیر کے کہنے پر ہی اُس نے اُسے "آپ" کی بجائے "تم" کہنا شروع کر دیا تھا تاکہ جیل کے سپاہیوں پر یہ بات ظاہر نہ ہو کہ امیر اُس کا سردار ہے۔ جب رامو اُس کی پیٹھ پر کھڑا نہیں ہوا تو خود امیر نے اُسے بتا دیا کہ اُس نے باہر کیا کیا دیکھا ہے۔"

"رامو ایک ترکیب سمجھ میں آرہی ہے۔" کہہ کر امیر تھوڑی دیر تک روشن دان کی طرف دیکھتا رہا۔ "اس روشن دان کی اگر دو سلاخوں کو ہٹا دیا جائے تو اس میں سے نکلا جا سکتا ہے۔"

"ہر قیدی کو ایسا خیال آتا رہتا ہے۔" نہ جانے کیوں جیل سے بھاگ نکلنے کا خیال بھی رامو کے حلق سے نیچے نہیں اترتا تھا اُسے ڈر تھا کہ بھاگ نکلنے کی کوشش میں اگر دوبارہ پکڑے گئے تو اُن کی جو دُرگت بنے گی اُس کے خوف سے اس کے رونگٹے کھڑے ہونے لگتے تھے اسی لیے وہ بولا۔ "ان سلاخوں کو توڑنا ہی مشکل ہے۔"

"تیز دھار والی آری اگر مل جائے تو ٹھوس سے ٹھوس لوہے کو بھی کاٹا جا سکتا ہے۔" امیر کا دماغ کام کرنے لگا تھا۔ "ان بیڑیوں کو بھی کاٹا جا سکتا ہے۔" امیر کی آنکھوں میں اس وقت جو چمک لہرا رہی تھی اُسے دیکھ کر رامو کی ہمت تو بندھی لیکن پھر بھی اس نے دلیل پیش کرتے ہوئے کہا۔ "فرض کرو کہ اگر ہم اس کوٹھری سے نکل بھی گئے تو جیل کی دیواروں کو کیسے پار کر سکیں گے؟"

"دیواریں بہت زیادہ اُونچی نہیں ہیں۔" امیر پرجوش

لہجے میں ذرا اُونچی آواز میں بول گیا تو رامُو نے جلدی سے اُس کا بازو دباتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ "میاں ذرا آہستہ بولو دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔"

امیر تھوڑی دیر تک خاموش رہا اس کے دماغ میں ایک عجیب سی جھنجھناہٹ طاری ہونے لگی اور وہ سوچنے لگا کہ لوہے کو کاٹنے والی آری کو کس طرح حاصل کیا جائے؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ کسی سپاہی کو توڑ لیا جائے؟ آخر کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔ سوچتے سوچتے کافی دیر ہو گئی اور رامُو بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگا تھا۔ امیر کو رامُو پر پورا بھروسا تھا اُسے یقین تھا کہ اگر اُس کی بات رامُو کے دل کو لگ گئی تو اُس کا ساتھ دینے سے پیچھے نہیں ہٹے گا۔

"رامُو۔" اُس نے اونگھتے ہوئے رامُو کو کندھے سے پکڑ کر ہلایا اور آگے بولا۔ "ذرا میری بات تو سنو ان سپاہیوں میں سے کیا کوئی ایسا سپاہی نہیں ہے جسے ہم توڑ سکیں؟"

"ہوں۔" رامُو اس طرح چونک کر آنکھیں ملنے لگا جیسے گہری نیند سے اُسے جگا دیا گیا ہو۔ پھر جب امیر نے اپنا سوال دہرایا تو اُس کے ہونٹ دھیرے دھیرے پھڑپھڑائے ان سپاہیوں میں ایک کالُو نام کا سپاہی ہے جو نیا نیا یہاں آیا ہے جو ایک بار مجھے تمہارا کو دے گیا تھا لیکن دوسری بار اسی کم بخت نے میرا جبڑا توڑ دیا تھا اور کہا تھا کہ تم تو ساری زندگی جیل میں رہو گے اور میں تمھیں تمہارا کو اُس وقت لا کر دوں گا جب مجھے بھی تم سے کچھ فائدہ حاصل ہو گا۔"

"تب تو وہ ہمارے لیے کام کا آدمی ثابت ہو سکتا ہے۔" امیر اپنی دونوں مٹھیاں بھینچ کر بولا۔ "شاید ہم اُسے لالچا سکیں گے۔"

"لیکن دولت کی چمک کے سوائے اُسے کوئی بھی چیز للچا نہیں سکے گی۔" رامُو امیر کی بات سُن کر بولا۔ "اور یہاں ہمارے پاس ایک پائی بھی نہیں ہے۔ ایسے کاموں میں کوئی اُدھار بھی تو نہیں رکھتا۔"

تھوڑی دیر تک خاموش رہ کر امیر کو سوچنا پڑا کہ سپاہی کو لالچ دینے کے لیے روپے کا انتظام کیسے کیا جائے؟ سوائے اپنے واحد وفادار ملازم غلام کے کسی اور پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ امیر جانتا تھا کہ اُس کے نام پر تو اب کوئی پھوٹی کوڑی بھی دینے کے لیے تیار نہیں ہو گا اور بے چارہ غلام بیس پچیس روپے کا بندوبست بھی نہیں کر سکے گا کیونکہ ان دنوں اُس پر بھی فاقے ہی گزر رہے ہوں گے امیر سوچ رہا تھا اور رامُو پھر سے اونگھنے لگا تھا۔ اُسے بیٹھے بیٹھے اونگھنے کی عادت سی پڑ گئی تھی لیکن اس کے باوجود وہ جتنی بھی گہری نیند میں کیوں نہ ہو وہ خود سے پوچھے گئے سوال کا جواب ٹھیک ٹھیک دے دیا کرتا تھا۔

"رامُو ایک اور خیال ذہن میں اُبھر آیا ہے۔" امیر نے ایک بار پھر اُسے جگاتے ہوئے کہا۔ "مجھے یقین تھا کہ کسی وقت میں نے جو دولت دفن کر رکھی ہے وہ کبھی نہ کبھی ضرور کام آئے گی اُن لوگوں نے میرا گھر جلا دیا ہے اور میری جائیداد لوٹ لی ہے لیکن زمین میں دفن کی ہوئی دولت تو سلامت ہی ہو گی۔"

"مگر کہاں ہے وہ دولت؟" رامُو نے چونک کر پوچھا۔

"ٹھہرو... مجھے ذرا یاد کرنے دو۔" امیر چٹکی بجا کر اپنے دماغ پر زور دینے لگا یکایک چٹکی بجاتی ہوئی اُس کی انگلیاں تھم گئیں اور وہ بولا۔ "ایک نہیں ایسی دو جگہ ہیں اور دونوں میرے گھر سے قریب، میں نے وہاں نشانیاں بھی رکھ چھوڑی تھیں۔"

"کتنی دولت ہو گی؟" رامُو نے پوچھا۔

"یہ بھی مجھے یاد ہے۔" امیر کا جوش و خروش بڑھتا جا رہا تھا۔ "ایک جگہ میں نے سونے کی کچھ مُہریں ایک تھیلی میں رکھ کر دفن کی تھیں اور دوسری جگہ..."

امیر کہتے کہتے رُک گیا تو رامُو کو اُس کے چہرے کے تاثرات بدلتے ہوئے دکھائی دیے۔ "دوسری جگہ پر میں نے عظیمہ کے کچھ زیورات ایک تھیلی میں بند کر کے زمین میں دفنا دیے تھے۔ یہ بات میں غلام کو بتانا بھول گیا تھا۔ اگر اُس نے اُن زیورات کو مولوی صاحب کے پاس پہنچا دیا ہو تاکہ وہ میری بیٹی کے لیے وہ انھیں سنبھال کر رکھ لیتے۔"

"میاں یہ دولت تو اب بیٹی کی ہی ہو گئی اور ہم اسے ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے لیکن سونے کی مُہریں کتنی ہوں گی؟" رامُو نے کہا۔

"شاید پانچ ہوں گی۔" امیر بڑبڑایا۔ "کالُو سپاہی نے اپنی زندگی میں سونے کی پانچ مُہروں کو اکٹھے نہیں دیکھا ہو گا۔ مجھے یقین ہے وہ مان جائے گا۔"

"لیکن لالچی آدمی بے ایمانی بھی کر سکتا ہے۔" رامُو نے

شک کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "فرض کر لو کہ سونے کی مُہریں حاصل کر لینے کے بعد اُس نے ہمارا کام کرنے سے انکار کر دیا تو؟"

"اتنا رسک تو لینا ہی پڑے گا۔" امیر جوشیلے لہجے میں بول کر اپنی ہمت بندھا رہا تھا۔ "سونے کی پانچ مُہروں کے بدلے میں لوہا کاٹنے کی دو چھوٹی سی آریاں ہی تو دینی ہیں اور یہ سودا کوئی بھی قبول کر سکتا ہے۔"

●

چار پانچ دنوں کے بعد امیر کو دانا دبانے کا موقع مل گیا۔ رات کو جب حسبِ معمول دوسرے سپاہی تاش کی بازیوں سے دل بہلا رہے تھے، کالُو جیل کی کوٹھڑیوں کے قریب گشت لگا رہا تھا۔ امیر اُس کے قدموں کی آہٹ سُن کے کوٹھڑی کے دروازے کے پاس آ کر بیٹھ گیا لیکن رامُو بدستور کوٹھڑی کی دیوار سے ٹیک لگائے اُونگھ رہا تھا۔

"کیوں میاں نیند نہیں آ رہی ہے کیا؟" کالُو نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔ "غزل کہہ کر رات گزارنے کا ارادہ لگتا ہے۔"

"اور کیا ہی کیا جا سکتا ہے؟" امیر ایک اداس آہ بھر کر بولا۔ "آپ لوگوں کی طرح ہمیں تاش کھیلنے کی اجازت تھوڑی ہے؟"

کالُو کوٹھڑی کے دروازے پر اس طرح کھڑا رہا جیسے وہ اور بھی باتیں کرنا چاہتا ہو۔ وہ امیر کی بات کا جواب دیتے ہوئے بولا۔ "تاش کھیلنے کی تو ہمیں بھی اجازت نہیں ہے لیکن اس کے باوجود بھی ہم کھیلتے ہیں۔"

"لیکن آج تم کیوں نہیں کھیل رہے ہو؟" امیر نے پوچھا۔ اور کالُو کے ہاتھ میں جو لالٹین تھا اُس کی روشنی میں اُس نے کالُو کے چہرے کو بغور دیکھا تو اُسے کالُو کا چہرہ افسردہ اور اُترا ہوا سا محسوس ہوا مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ پوچھتا کالُو نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ "وہ سالے مجھے کھلانے سے انکار کر رہے ہیں۔ سارے مہینے کی تنخواہ میں دس روز میں ہار گیا اور اب وہ لوگ کہتے ہیں تمھیں اُدھار کھیلنے نہیں دیں گے۔"

یہ سُن کر امیر کی آنکھوں میں ایک چمک سی لہرا گئی اُسے لگا کہ قدرت خود اس پر مہربان ہے۔ اب یہ شخص اُس کا غلام بن جائے گا، صرف پانسہ پھینکنے کی دیر ہے۔ کالُو نے امیر کی کوٹھڑی کے قریب سے جانے کے لیے قدم اٹھایا ہی تھا کہ تب ہی امیر نے ہوشیاری سے اپنا جال پھینکا "روپے کی ضرورت ہو تو اس سلسلے میں مَیں تمھاری مدد کر سکتا ہوں۔"

امیر کی اس بات کو کالُو نے پہلے تو مذاق سمجھا لیکن پھر بھی وہ اپنے قدم اس جگہ سے ہٹا نہیں سکا اور امیر کی طرف چُپ چاپ دیکھنے لگا۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔" امیر انتہائی رازدارانہ لہجے میں بولا "ایک جگہ میں نے سونے کی چند مُہریں چھپا رکھی ہیں۔"

سونے کی مُہروں کا نام سُنتے ہی کالُو کی لالچی آنکھیں چمکنے لگیں اور وہ امیر کی طرف دیکھ کر مُسکرانے لگا۔ امیر نے اُس کی مُسکراہٹ سے اندازہ لگا لیا کہ کالُو کو شاید اُس کی بات پر یقین نہیں آ رہا ہے اس لیے وہ بولا۔ "میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ تم اگر میری مدد کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ تو وہ سونے کی مُہریں تمھاری ہو سکتی ہیں۔"

کالُو سپاہی کا نپ اٹھا اُس کے چہرے پر خوف کے سائے منڈلانے لگے تھے اور وہ سوچ رہا تھا کہ سونے کی مُہروں کے بدلے میں امیر اُس سے کس قسم کی مدد مانگے گا؟ امیر کا مطلب تو وہ سمجھ چکا تھا لیکن پھر بھی سونے کی مُہروں کی لالچ اُس کے دل سے نہ جا سکی۔ اسی لیے وہ دھڑکتے دل سے پوچھ بیٹھا۔ "سونے کی مُہروں کے بدلے میں مجھے کیا دینا ہو گا؟"

امیر نے اُس کی نظروں سے نظریں ملائیں پھر دھیمے لہجے میں اس طرح بولا جیسے وہ اس کے کان میں کہہ رہا ہو۔ "لوہا کاٹنے کی دو دھار دار آریاں۔"

یہ سُن کر کالُو اس طرح اُچھل پڑا جیسے بچھو نے اُس کے پیر میں ڈنک مار دیا ہو وہ نیچے سے اُوپر تک کپکپا کر رہ گیا اور اس کے جسم سے پسینا پھوٹنے لگا۔ امیر اپنی سانس روکے اُس کی صورت تکتا رہا۔ اُسے لگ رہا تھا کہ کالُو ابھی انکار کر کے چلتا بنے گا۔ اس خیال کے آتے ہی اُس نے کالُو کی ہمت بندھاتے ہوئے کہا۔ "سونے کی پوری پانچ مُہریں ہیں۔ وہ مل گئیں تو تمھیں جیل کی اس نوکری کی ضرورت نہیں رہے گی۔"

کالُو کے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی اُس کی

نظروں کے سامنے سونے کی مُہریں ناچنے لگی تھیں۔ "کہاں چھپا کر رکھی ہیں؟" اس نے بہ مشکل پوچھا۔

"یہ میں بعد میں بتاؤں گا۔" امیر نے اتنا ہی کہا تھا کہ کالو کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اُسے لگا کہ امیر جھوٹ بول رہا ہے لیکن امیر اپنی کوشش جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "پہلے قسم کھا کر یہ وعدہ کرو کہ سونے کی مُہریں مل جانے کے بعد دوسرے ہی دن تم آریاں مجھے دے جاؤ گے۔"

کالو نے دو تین بار زور زور سے سر ہلایا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ سونے کی مُہروں کے خیال کو اپنے دماغ سے جھٹک دینا چاہتا ہو۔ اچانک اُس کے ہونٹ پھڑپھڑائے "مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" اتنا کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا لیکن امیر کو اس کی آواز کچھ پھسپھسی سی لگی۔ اُسے یقین سا ہونے لگا کہ دو چار دنوں میں ہی یہ شخص اُس کے قابو میں آجائے گا اور ہوا بھی یہی۔ ٹھیک چوتھے دن کالو سپاہی نے دو دھار دار آریاں امیر کی کوٹھڑی میں سرکا دیں اور ایسا کرتے وقت اُس نے امیر کو یاد دلاتے ہوئے کہا تھا۔ "تم نے بھوانی دیوی کی قسم کھا کر کہا ہے کہ میرا نام نہیں آئے گا... یہ بات تم یاد رکھنا۔"

"ایسا وقت ہی نہیں آئے گا کالو۔" امیر آری کی دھار پر انگلی پھیرتے ہوئے بولا۔ "جیل خانے کو میرا یہ آخری سلام ہو گا۔"

ان دونوں میں جب یہ باتیں ہو رہی تھیں اس وقت بھی رامو کوٹھڑی کے فرش پر گھٹنے موڑ کر گہری نیند میں ہونے کا بہانہ بنائے لیٹا ہوا تھا۔

●

لوہے کی بیڑی پر جب امیر نے پہلی بار آری کی دھار گھسی تو سنسناتی ہوئی ایک عجیب سی آواز کوٹھڑی کے اندر گونج گئی۔ رات کی خاموشی تھوڑی دیر کے لیے کانپ گئی۔ توقع سے کچھ زیادہ آواز پیدا ہو گئی تھی۔ اس لیے امیر نے آری کو فوراً ہی کمبل کے نیچے چھپا دیا۔ رامو بھی کچھ خوف زدہ سا نظر آ رہا تھا۔ تھوڑی دیر تک دونوں چپ چاپ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ جب امیر کو یہ یقین ہو گیا کہ آری چلنے کی آواز کسی کے کان میں نہیں پڑی ہے تو اُس نے اپنا داہنا پاؤں رامو کی جانب بڑھاتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔ "ذرا دیکھو تو سہی تھوڑا سا گھسنے پر ہی لوہے کی بیڑی میں گہرا گڑھا سا پڑ گیا ہے۔"

لیکن رامو کا خوف ابھی دور نہیں ہوا تھا۔ "میاں! اس آری کی آواز ہمارے ارادے کو بے نقاب کر دے گی۔ ذرا سی آری گونگی ہے اور نہ ہی یہ سارے سپاہی بہرے ہیں۔" رکتے رکتے رامو کو یکے بعد دیگرے دو چار بار کھانسی آ گئی۔ امیر کو اُس کی کھانسی ریتی کی طرح تیز دھار والی محسوس ہوئی ایک خیال تیزی سے اس کے ذہن میں ابھرا اور اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "رامو تمہاری اس کھانسی کی آواز میں اس ریتی کی آواز دب سکتی ہے... چلو شروع ہو جاؤ آزمائش کر لیں۔"

رامو کو بڑا عجیب سا لگا لیکن وہ انکار نہ کر سکا۔ امیر نے آری نکال کر بیڑی پر رکھ دی اور رامو کو اشارہ کیا۔ امیر کا اشارہ پاتے ہی رامو کھانسنے لگا، نقلی کھانسی کے شروع ہوتے ہی اچانک اصلی کھانسی شروع ہو گئی۔

امیر نے آری پر زور آزمایا ابھی اُس نے چار چھ ہی ہاتھ چلایا تھا کہ کھانستے کھانستے رامو کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر امیر کی کلائی تھام لی۔ "بس کرو۔"

امیر کا ہاتھ رُک گیا تو رامو تیز تیز سانس لیتا ہوا بولا۔ "تو دم نکل جائے گا۔"

لیکن امیر کی نظریں تو لوہے کی بیڑی پر جمی ہوئی تھیں۔ "ذرا دیکھو تو سہی کتنا بڑا گڑھا ہو چکا ہے۔" اُس نے رامو کا ہاتھ پکڑ کر اس کی انگلی ادھ کٹی ہوئی بیڑی پر رکھ دی اور کہا۔ بولا۔ "پھر سے کھانسی شروع کر دو رامو۔ سپاہی تاش کھیلنے میں مشغول ہیں، ہمیں اُن کی غفلت سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔"

رامو نے پھر کھانسنا شروع کیا اور اس درمیان ایک بیڑی کٹ بھی گئی۔

"ابے اتنی زور زور سے کھانس کر ہمیں خلل کیوں پہنچا رہا ہے؟" اچانک ایک سپاہی نے تاش کھیلتے ہوئے دور سے ہی رعب جھاڑا۔ "یہاں ہماری بازی جمی ہوئی ہے تھوڑی دیر تو چپ رہو۔"

رامو نے امیر کی طرف دیکھا تب ہی دوسرے سپاہی کی آواز سنائی دی۔ "آج کل تو چوروں کو بھی شاہی بیماری ہونے لگی ہے۔"

اس کے ساتھ ہی چار چھ سپاہیوں کے ہنسنے کی آوازیں جیل کے احاطے میں گونج کر دم توڑ گئیں اور تب امیر کو مجبوراً آری رکھ کر سو جانے کی کوشش کرنی پڑی۔ صبح شام امیر کے ذہن پر آری چلانے کی دھن سوار رہنے لگی تھی۔ اس نے رامو کے ایک پیر کی بھی دو بیڑیاں کاٹ ڈالی تھیں۔ رامو کا خوف اب بہت کم ہو چکا تھا۔ بھاگ نکلنے کی اُمید بڑھتی جا رہی تھی۔ امیر نے پورا منصوبہ بنا رکھا تھا۔ اس کے اندازے کے مطابق پندرہ دنوں میں یہ کام ہو جانا چاہیے تھا تاکہ اماوس کی گہری کالی رات کا فائدہ اٹھا کر آسانی سے بھاگ جایا جائے اور اس درمیان روشن دان کی بھی دو سلاخیں کٹ جانی چاہئیں لیکن یہ کام ذرا مشکل تھا۔ روشن دان تک پہنچنے کے لیے رامو کو گھوڑا بننا پڑے گا پھر اس کی پیٹھ پر کھڑے ہو کر اُسے سلاخوں پر آری چلانی پڑے گی اور رامو کے لیے اس کا بوجھ پیٹھ پر اٹھا کر کھانسنا کافی دشوار ہو جائے گا۔

"امیر میاں یہ ترکیب ہمارے لیے انتہائی مشکل ہے۔" رامو ناامیدی سے کہتا۔ "رامو اب صرف یہی ایک کام باقی رہ گیا ہے۔ بیڑیاں تو اب گھس چلی ہیں۔ سپاہی کی نظروں سے بچنے کے لیے ہمیں بہت ہوشیار رہنا پڑتا ہے جب وہ نہانے کے لیے لے جاتے ہیں تو دو آدمی ساتھ ہوتے ہیں۔ ان حالات میں مزید تاخیر کرنے سے فائدہ؟ پکڑے گئے تو بہت مار پڑے گی۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ قدرت کے بھروسے یہ بازی کھیل لی جاتی چاہیے پھر جو نصیب میں ہو گا وہ دیکھا جائے گا۔"

رامو جواب میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ جیل کے برابر والے شنکر مندر کا گھنٹہ بج اٹھا۔ اس گھنٹے کی آواز سن کر امیر جلدی سے بولا۔ "دیکھ لینا نا تمہارا بھگوان بھی ہمارا ساتھ دینے کے لیے تیار ہے اب ہمیں یقیناً کامیابی ہو گی۔"

"میرے ذہن میں بھی ایک ترکیب آئی ہے۔" رامو کی آواز میں پہلی بار ایک عجیب سا جوش تھا۔ "مندر میں روزانہ رات کو کافی دیر تک بھجن اور کیرتن گائے جاتے ہیں۔ اگر اس کے شور و غل میں ہم روشن دان کی سلاخوں پر آری چلاتے رہیں تو کیسا رہے گا؟"

رامو کی یہ ترکیب امیر کے دل کو لگ گئی اور وہ خوش ہو کر بولا۔ "رامو تمہارا دماغ تو چل پڑا ہے۔ ہم آج ہی سے یہ کام شروع کر دیں گے۔" اور رامو کی یہ ترکیب سو فیصد کامیاب ثابت ہوئی۔ بھانجہ، گھنٹیوں اور بھجن کے گانے کی ملی جلی آوازوں میں آری چلنے کی آواز دب گئی اور وہ جلدی جلدی چلنے لگی۔ رامو جب تک امیر کا بوجھ اپنی پیٹھ پر اٹھائے تھک نہیں جاتا تھا اُس وقت تک امیر آری چلاتا رہتا تھا ایک جانب جیل کے سپاہی تاش کی بازی لگائے بیٹھے تھے اور دوسری طرف امیر اور رامو اپنی قسمت کی بازی کھیلنے کی تیاریوں میں مصروف تھے، ہار جیت کی گھڑی قریب آتی جا رہی تھی راتوں کا اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا اور فرار ہونے کی اُمید روز بروز زور کرتی جا رہی تھی۔

●

"اب آپ اِن کا موزانہ خود ہی کر لیں۔" ولیم سلومن پٹیل کو سمجھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "میں نے وہاں سے جو گنے بھجوائے ہیں وہ رس اور مٹھاس کے معاملے میں اعلیٰ کوالٹی کے ہیں یا نہیں؟"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں ٹاٹی کے گنے بہت ہی اچھے ہیں۔" پٹیل نے کہا۔ "آنے والی فصل میں ہمارے آس پاس والوں نے بھی اس سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا ہے۔"

یہ سن کر ولیم سلومن کے چہرے پر اطمینان کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ آسٹریلیا میں آرام کرنے کے ساتھ ساتھ اُس کے دماغ میں ہندوستان کے گنّوں کی کوالٹی کو بہتر بنانے کا خیال سما گیا تھا۔ ہندوستان سے جانے کے بعد اُس نے ہندوستان کے ٹھگوں کا خیال اپنے ذہن سے نکال دینے کی کوشش کی تھی اور اسی لیے اُس نے اپنی ساری توجہ کھیتی باڑی پر مرکوز کر رکھی تھی۔ ٹاٹی کے گنّوں کا نمونہ اسٹیمر کے ذریعہ بھجوانے کے بعد وہ اس کی فصل لینے کے لیے ہندوستان آیا تھا۔ اُس نے اپنے بھتیجے جیمس کو خاص تاکید کی تھی اور نرسنگ پور پہنچتے ہی وہ سیدھا کھیتوں میں دوڑا آیا تھا

شام کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں اور ولیم سلومن لہراتے ہوئے کھیت پر نظریں جمائے ایک طرف بیٹھا ہوا تھا۔ اچانک اس کی نگاہ ایک عورت پر پڑی جو ایک ٹٹو پر سوار اُسی طرف آ رہی تھی بارش کی ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی جس کے ننھے ننھے قطرے اس کے گالوں پر دور

سے چمکتے دکھائی دے رہے تھے۔" پہلے تو اسے کبھی نہیں دیکھا ہے آخر یہ کون ہو سکتی ہے؟" ولیم سلومن اُس پر نظریں جمائے دل ہی دل میں سوچ رہا تھا۔ "یہ عورت انگریز تو نہیں لگتی۔"

نزدیک آکر اُس عورت نے ٹٹو کی لگام کھینچی اور نیچے کود گئی اور بچہ اسکیوزمی" کہہ کر اپنے کھلے ہوئے بالوں سے پانی کے قطرے جھٹکنے لگی اور آگے بولی۔ "کیا میں دو منٹ یہاں ٹھہر سکتی ہوں؟"

اُس کی ٹوٹی پھوٹی انگریزی سن کر ولیم سلومن سمجھ گیا کہ یہ عورت فرنچ ہو سکتی ہے اسی لیے اُس نے فرنچ زبان میں ہی اُسے جواب دیا۔ "آپ خوشی سے یہاں بیٹھ سکتی ہیں۔ یہاں کھیت میں کُرسی تو نہیں ہو گی لیکن تھوڑی دیر کے لیے اس تختے پر کوئی تکلیف بھی نہیں ہو گی۔"

دھیمی اور میٹھی آواز میں ولیم سلومن کو فرنچ بولتے دیکھ کر وہ عورت بہت خوش ہوئی اور بولی۔ "ارے واہ آپ تو بہت اچھی فرنچ بول لیتے ہیں۔ میرا نام ایملی ہے۔"

"تشریف رکھیے نا۔" چالیس سالہ ولیم سلومن نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "میرا نام ولیم سلومن ہے۔"

عورت بیٹھتے بیٹھتے اچانک اُس کا نام سن کر چونک پڑی۔ "آپ کا نام تو میں نے بہت سُنا ہے۔" پھر بارش کی پھوار کی طرف دیکھ کر بولی۔ "اس اچانک ہونے والی بارش نے اچانک ہی آپ سے آج ملاقات بھی کرا دی۔" اور دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ہنس پڑے۔ ولیم سلومن کو آج تک کسی عورت کی جانب دیکھنے کی فرصت ہی نہیں مل سکی تھی۔ چالیس سال کی عمر تک پہنچنے کے باوجود شادی کرنے کا خیال تک اُس کے ذہن میں نہیں آیا تھا۔ بہت سے لوگوں کو تو وہ ایک شرمیلا سا آدمی لگتا تھا اور کئی لوگ تو اُسے ایک لاابالی آدمی سمجھتے تھے۔

"آپ کے متعلق جو کچھ میں نے سُنا ہے وہ سب سچ نہیں لگتا۔" فرنچ عورت ایملی نے ولیم سلومن کو چونکا دیا۔ "فرنچ بولنے والے شخص کو یقیناً دلچسپ ہونا چاہیے۔"

"آپ سے کس نے کہا کہ میں غیر دلچسپ شخص ہوں؟" ولیم سلومن نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "میں تو آپ کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا جب کہ میرے متعلق آپ تو بہت کچھ جانتی ہیں۔"

ایملی جواب دینے کی بجائے دھیرے سے مسکرا دی اور ولیم سلومن اُس کی بھوری آنکھوں میں جھانکنے لگا۔

"لیجیے جناب دونوں گنّوں کا رس نکلوا کر لایا ہوں۔" پنیل گنّوں کے رس سے بھرے ہوئے دو جگ لے کر آگیا تو ولیم سلومن ذرا گھبرا سا گیا۔ پنیل بھی ایک اجنبی عورت کو اچانک اُس کے قریب بیٹھا دیکھ کر چونک پڑا اور بولا۔ "ذرا ٹھہریے میں اندر سے گلاس لے آؤں۔" یہ کہہ کر پنیل اندر چلا گیا۔

"آپ نے دیکھا وہ بے چارہ آپ کو دیکھ کر کس قدر گھبرا گیا تھا۔" سلومن نے ہنس کر کہا۔

"پہلے تو آپ بھی مجھے دیکھ کر گھبرا گئے تھے۔" ایملی نے یہ کہنا چاہا تھا لیکن کچھ سوچ کر اُس نے بات بدل دی اور کہا "اس میں اُس کا بھی قصور نہیں ہے۔ دراصل میں یہاں بیٹھی ہوں اور آپ میرے قریب کھڑے ہیں یہ دیکھ کر بھی اُسے حیرت ہوئی ہو گی۔" اتنا کہہ کر ایملی کھل کھلا کر ہنس پڑی اور تب ولیم سلومن کو خیال آیا کہ جس تخت پر ایملی بیٹھی ہوئی ہے اُس میں کافی جگہ موجود ہے اس لیے اُسے تخت پر بیٹھ جانا چاہیے۔

"میں تبدیلی آب و ہوا کی خاطر آسٹریلیا گیا تھا وہاں سے میں نے گنّوں کے کچھ پودے بھیجے تھے۔" ولیم سلومن نے بات بدلنے کی غرض سے جگ میں سے گنّے کا رس انڈیلتے ہوئے کہا۔ "ٹانگی کے گنّے یہاں سے زیادہ مشہور اور بہتر ہیں لیجیے چکھ کر اپنی رائے سے آگاہ کریں۔"

ایملی کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ "آپ نے تو میرا پسندیدہ موضوع چھیڑ دیا ہے موسیو سلومن میں چکھے بغیر ہی کہہ سکتی ہوں کہ سب سے اچھے گنّے موریس کے ہی ہوتے ہیں۔"

"آپ تو اتنے اعتماد سے یہ بات کہہ رہی ہیں جیسے آپ بہت کچھ جانتی ہیں!"

"جی ہاں اس معاملے میں تو میں آپ کو بھی نیچا دکھا سکتی ہوں، موریس کے گنّے کے کھیتوں کے درمیان ہی میں پلی بڑھی ہوں۔ یہ تو ہمارے باپ دادا کے زمانے کا پیشہ ہے۔ میرے ڈیڈی نے مجھے ہندوستان اسی لیے تو بھیجا ہے کہ یہاں کی آب و ہوا راس آجائے تو زمین خرید کر کھیتی باڑی شروع کی جائے۔"

ولیم سلومن اس بات سے سمجھ گیا کہ لڑکی بارش سے بچنے کے لیے آسرا لینے نہیں بلکہ گنّے کے کھیت کو دیکھ کر یہاں تک آئی ہے۔ پنیل ایک کونے میں چُپ چاپ کھڑا تھا وہ ان کی باتیں نہیں سُن رہا تھا اُس کا خیال آتے ہی ولیم سلومن نے اُسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "تب تو پنیل تمھیں آئندہ فصل میں گنّوں کی اچھی ذات بونے کو ملے گی کیوں کہ موریس کے گنّے بہت لمبے اور میٹھے ہوتے ہیں۔"

"آپ نے اس سے کیا کہا؟" ایملی چونکہ ہندوستانی نہیں سمجھتی تھی اس لیے اُس نے پوچھا۔

"میں نے اس سے کہا تھا۔" ولیم سلومن نے مذاق کے ارادے سے بات میں کچھ پھیر پھار کر دی۔ "میں نے کہا کہ موریس کے گنّے تمھاری زبان کی طرح میٹھے ہوتے ہیں۔"

"اوہ مائی گاڈ۔" ایملی کے چہرے پر سُرخی چھوٹ پڑی "آپ تو توقع سے زیادہ دلچسپ آدمی ہیں۔"

گنّے کا رس پیتے ہوئے ولیم سلومن نے یہ بات سنی تو ایملی کے الفاظ اُسے گنّے کے رس سے زیادہ میٹھے محسوس ہوئے۔ اس فرنچ لڑکی نے چونکہ اُسے ایک دلچسپ آدمی کہا تھا اس لیے اُس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے اس نے ایملی پر ایک پیار بھری نظر ڈالی۔ تب چار آنکھوں کے اس ٹکراؤ میں اُن دونوں کی عمروں کا فاصلہ گھٹتا چلا گیا۔ دیس اور زبان کا فرق مٹ کر رہ گیا۔

●

"بس اب آج کی رات ہی آخری رات ہے۔" امیر آری کو چومتا ہوا روشن دان کی طرف دیکھ کر بولا۔ "درمیان کی ایک سلاخ کو تھوڑا گھسنا ہے۔ پھر یہ پنچھی اُڑن چھو ہو جائیں گے۔"

"مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔" رامو خوف زدہ آواز میں بولا۔ "کالو آخری وقت میں بدل جائے گا... کم بخت اُس دن سے مجھے غصّے بھری نظروں سے دیکھتا رہتا ہے۔"

"کالو سے ڈرنا بے کار ہے۔" امیر نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "اگر وہ شکایت کرے گا تو خود اُسی کی شامت آجائے گی، وہ بے چارہ تو اِسی انتظار میں بیٹھا ہے کہ ہم کب یہاں سے فرار ہوتے ہیں۔ اُس وقت تک تو وہ چین سے سو بھی نہیں سکتا۔"

"ہم اس کوٹھڑی سے بھاگ نکلے ہیں اس کی خبر بھی تو سب سے پہلے اُس کو ہوگی۔" رامُو نے رُک رُک کر کہا۔ "آدھی رات کے بعد گشت لگانے وہی تو آتا ہے۔"

"لیکن وہ یہ بات کسی سے کہنے کی ہمت نہیں کرے گا۔" امیر خود اپنا اور اپنے ساتھی کا دل بہلانے کے لیے کہہ رہا تھا۔ "وہ تو اس طرح اپنی آنکھیں بند کرلے گا جیسے اُسے کچھ معلوم ہی نہیں ہے۔ صبح تک تو ہم بہت دُور نکل چکے ہوں گے۔"

ٹھیک اُسی وقت جیل کے پچھواڑے والے مندر کی گھنٹیاں بج اٹھیں اور بھجن کی آواز آہستہ آہستہ اُونچی ہونے لگی۔ امیر اسی وقت کا منتظر تھا۔ اُس نے رامُو کی طرف دیکھا اور دھیمی آواز میں بولا۔ "چلو رامُو اب جلدی سے گھوڑا بن جاؤ۔"

اتنا کہہ کر اُس نے کوٹھڑی کے دروازے سے احتیاطاً باہر جھانک لیا اور پھر رامُو کی جانب پلٹ کر بولا۔ "آج آخری بار تمھیں میرا بوجھ اٹھانا ہے۔"

رامُو کی پیٹھ پر کھڑے ہو کر امیر نے احتیاطاً روشندان کے باہر ایک نظر ڈال لی، چاروں طرف گہرا اندھیرا اور سناٹا چھایا ہوا تھا اُوپر سے بارش بھی برس رہی تھی۔ کھلے آسمان کے نیچے اس سبز گھاس پر کل جب وہ قدم رکھے گا تو اُسے کتنی خوشی ہوگی؟ روشن دان کی سلاخ پر آری چلاتے چلاتے اُسے اپنی بیٹی یاد آگئی۔ پھر جالان کی حد چھوڑنے سے پہلے ایک بار اپنی بیٹی کو دیکھ لینے کی خواہش اس کے اندر زور کرنے لگی لیکن اپنی اس خواہش پر اُس نے فوراً ہی پردہ ڈال دیا اور اپنے آپ کو سمجھانے لگا۔ نہیں، نہیں آدھی رات کے وقت مولوی صاحب کے دروازے پر دستک دے کر مصیبت نہیں کھڑی کرنی ہے۔ پھر اچانک اُسے یاد آیا کہ وہ بچی اب امیر علی ٹھگ کی بیٹی نہیں ہے۔ اب کس مُنہ سے وہ اُسے دیکھنے کے لیے جائے؟ بیٹی کا خیال اب اپنے دل سے نکال دے امیر اب دنیا میں تیرا کوئی بھی نہیں ہے۔

اچانک آری چلاتے چلاتے امیر کو ایک جھٹکا سا لگا اور گھوڑا بنا ہوا رامُو ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ تلملا گیا۔ اس کی پیٹھ پر سے امیر بھی لڑھک کر نیچے آگرا اس کے ہاتھ سے آری چھوٹ کر دور جا گری اور کوٹھڑی کے اندر ایک ہلچل سی مچ گئی۔ رامُو کی چیخ امیر کے فرش پر گرنے کا دھماکا اور آری کے زمین پر گرنے کی کھنکھناہٹ نے تاش کھیلتے ہوئے سپاہیوں کو چوکنا کر دیا تھا وہ تاش کے پتّوں کو پھینک کر "کیا ہوا... کیا ہوا؟" کا شور مچاتے ہوئے کوٹھڑی کی دوڑتے ہوئے آگئے۔ لالٹین کی روشنی میں انھوں نے اندر نگاہ ڈالی تو رامُو ایک جانب دوہرا پڑا ہوا تھا اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے پاؤں کا انگوٹھا دبا رکھا تھا اور امیر اس پر جھکا ہوا اس سے پوچھ رہا تھا۔ "کیا ہوا رامُو؟ کس نے کاٹ لیا؟"

"بچھو۔" ایک سپاہی نے کوٹھڑی کے ایک کونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اِسے بچھو نے کاٹ لیا ہے... جلدی باہر نکالو اِسے۔"

"ٹھہرو۔" دوسرا سپاہی خوف زدہ آواز میں بولا۔ "وہ کیا چیز پڑی ہے... آری۔" یہ سنتے ہی امیر نے ایک جھٹکے سے رامُو پر سے اپنی نظر ہٹائی لیکن جس سپاہی کی آنکھیں کوٹھڑی کے دروازے کے قریب پڑی ہوئی آری پر جمی ہوئی تھیں وہ آنکھیں اب امیر کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ "یہ بدمعاش جیل سے بھاگنے کی کوشش کر رہے تھے۔" اچانک اُس سپاہی نے چیخ کر کہا اور پھر چیخ کر بولا۔ "جلدی سے گھنٹہ بجاؤ اور سب کو خبر کردو۔"

امیر کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ رامُو بھی ایک پل کے لیے بچھو کے ڈنک کی تکلیف کو بھول کر سپاہیوں کی طرف دیکھنے لگا۔

"تم لوگ پہلے اِس کا علاج تو کرو کہیں اِسے بچھو کا زہر نہ چڑھ جائے۔" امیر نے التجا آمیز لہجے میں کہا لیکن اس کی آواز جیل کی کوٹھڑی کی دیواروں سے ٹکرا کر رہ گئی۔

"بتاؤ تمھیں کس نے یہ آری لاکر دی تھی؟" امیر کے ننگے جسم پر کوڑے پڑتے جاتے تھے اور جمعدار زور آور سنگھ کی زبان چلتی جاتی تھی۔ "بتاؤ تم نے کس کو ملا رکھا ہے؟"

"تم ظلم کرکے مجھ سے جھوٹ بلوانا چاہتے ہو؟ کسی بے قصور کو سزا دینا چاہتے ہو؟" امیر ایک ہی جواب سے چمٹا رہا۔ "جب میں جیل میں آیا تھا تب سے آری اپنے ساتھ لیتا آیا تھا۔" امیر جانتا تھا کہ اُس کی یہ بات کوئی تسلیم نہیں کرے گا۔ جب وہ کتّوں کے پنجرے میں بند تھا اُس وقت بھی یہ ممکن نہیں تھا کہ کوئی اُسے آری دے جاتا اور جیل میں آنے کے بعد تو قیدیوں کی تلاشی لی جاتی ہے۔ ایسی حالت میں یہ آری چھپو کیسے رہ سکتی تھی؟

"تم اب بھی میری آنکھوں میں دھول جھونکنا چاہتے ہو جمعدار! آگ بگولا ہوگیا۔ "اگر تم آری اپنے ساتھ لاتے ہوئے تھے تو کیا سال بھر تک اس کی پوجا کرتے رہے تھے؟" اپنے ہاتھ کی تھپلی مٹانے اور دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے اُس نے امیر کے مُنہ پر پے در پے دو گھونسے مارے تو امیر کے مُنہ سے خون نکلنے لگا۔

"لے جاؤ اِسے جیل خانے میں اور اس کا جسم داغنے کے لیے سلاخیں گرم کرو۔" زور آور سنگھ نے دانت پیس کر سپاہیوں کو حکم دیا۔ "پھر دیکھوں گا یہ قبول کرتا ہے یا نہیں؟" زور آور سنگھ کی طرف قہر آلود نگاہوں سے دیکھتا ہوا امیر سپاہیوں کے ساتھ جیل کے ٹارچر روم کی طرف بڑھ گیا اس نے پکا ارادہ کرلیا تھا کہ وہ کالو کا نام ہرگز ہرگز زبان پر نہیں لائے گا۔ اُس کا نام ظاہر کرنے سے بھی اُسے کوئی فائدہ ہونے والا نہیں تھا۔ الٹا وہ غریب سپاہی جیل کی سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا جاتا اور ایسا وہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ جیل سے بھاگنے کی کوشش میں اُسے کامیابی نہیں ہوئی تھی اس لیے وہ افسردہ نہیں ہوا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ زندگی بھر کے لیے جیل میں نہیں رہے گا برس دو برس بعد پھر کوئی موقع مل ہی جائے گا اور اس وقت شاید یہ کالو ہی اس کی مدد کرے گا۔ اسی اُمید کے زور پر اس وقت وہ سب کچھ برداشت کرلینے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔

جیل کے بیچو بیچ ایک سرنگ سی بنی ہوئی تھی جب کسی سرکش قیدی کو سزا دینی ہوتی تو اُسے اس سرنگ میں لے جایا جاتا اور وہاں جانے والا قیدی ادھ مُوا ہو کر ہی واپس آتا تھا۔ اس کی حالت دیکھ لینے کے بعد کوئی قیدی سر اٹھانے کی ہمت بھی نہیں کرتا تھا۔ اس اذیت گھر کا نام سن کر ہی قیدیوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔

پاؤں اور گردن میں زنجیریں ڈال کر امیر کو ایک ستون کے ساتھ جکڑ دیا گیا اور ستون کے دونوں طرف لگے ہوئے لوہے کے کڑوں میں اُس کی دونوں کلائیوں کو خوب کس کر پھنسا دیا گیا تھا۔ اُس کے بعد رامُو کو بھی سُرنگ میں لے آیا گیا۔ امیر نے ہنس کر اُس کی ہمت بندھاتے ہوئے رامسی زبان میں دھیرے سے کہا۔ "مجھ پر چاہے جتنا ہی ظلم کیوں نہ ہو لیکن تم اپنی ہمت نہ ہارنا۔ اگر یہ ظلم نہ دیکھ سکو تو آنکھیں مُوند لینا اور انھیں کچھ نہ بتانا۔"

امیر کے بالکل سامنے آگ کی بھٹی جل رہی تھی اُس پر لوہے کی ایک بڑی سلاخ رکھی ہوئی تھی جو خود بھی کوئلوں کی طرح سُرخ ہو چکی تھی۔ جمعدار زور آور سنگھ نے انگارے برساتی آنکھوں سے امیر کی طرف دیکھا۔ "بولو قبول کرتے ہو یا اپنی دونوں آنکھیں کھونا چاہتے ہو؟"

امیر قہر نظر اکر رہ گیا گھڑی بھر کے لیے اُسے اپنی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا محسوس ہوا شاید وہ سوچ رہا تھا کہ آنکھوں سے محروم رہ کر زندہ رہنے سے کیا حاصل ہے؟ اندھا ہو جانے کے بعد تو وہ کبھی جیل سے باہر نہیں نکل سکے گا اور زندگی بھر اسی دوزخ میں سڑنا پڑے گا اُس کے چہرے پر اُبھری ہوئی خوف کی لکیروں کو دیکھ کر جمعدار خوش ہوگیا اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے امیر سب کچھ قبول کرلے گا۔

امیر کی زبان بھی تملانے لگی تھی وہ آنکھیں بند کرکے سب کچھ قبول کرنے ہی والا تھا کہ اچانک ایک خیال بڑی تیزی سے اس کے ذہن میں اُبھرا کہ اگر جمعدار اُس کو دونوں آنکھوں سے محروم کرنا چاہتا ہے تو پھر بھٹی میں ایک کی بجائے دو سلاخیں ہونی چاہییں تھیں پھر اُسے اچانک یاد آگیا کہ جمعدار نے اُس کا جسم داغنے کا حکم دے کر اُسے اِس سُرنگ میں بھیجا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی اُس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ نہیں۔ نہیں وہ اپنے جسم پر ہر

زخم برداشت کرلے گا لیکن اقرار ہرگز نہیں کرے گا۔

"آنکھیں پھوٹ گئیں تو مجھے تمھارا چہرہ دیکھنے کو نہیں ملے گا۔" امیر نے ابھی اتنا کہا ہی تھا کہ جمعدار کی آنکھیں آگ برسانے لگیں اور وہ غصے سے پاگل ہو کر چیخ پڑا۔ "بدبخت تیری یہ مجال؟" اتنا کہہ کر اُس نے ایک جھٹکے سے آگ کی بھٹی کے قریب کھڑے ہوئے لیم شمیم جلاّد کی طرف دیکھا۔ "سلاخ اٹھاؤ اور جلادو اس کی پیشانی۔"

"ہا...." امیر نے اطمینان کا سانس لیا اس کا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ جمعدار اُسے اندھا کرنا نہیں چاہتا تھا شاید آنکھیں پھوڑنے کی اُسے اجازت نہیں تھی۔ اچانک آگ سی چمکتی ہوئی سُرخ سلاخ اٹھا کر جلاّد اُس کی طرف بڑھنے لگا اور امیر ایک بار پھر رامُو کی جانب دیکھ کر مسکرایا شاید وہ اُسے یاد دلانا چاہتا تھا کہ تم اٹل رہنا میں یہ ظلم سہہ لوں گا۔

جیسے جیسے سُرخ سلاخ اُس کے چہرے کے قریب آتی گئی ویسے ویسے امیر کی پیشانی کی نسیں اُبھرنے لگیں، اس کے جبڑے تنگ ہونے لگے اور آنکھیں جلنے لگیں اور جسم بُری طرح کانپنے لگا۔ تپتا ہوا آگ کا شعلہ اب اُس کی پیشانی سے صرف چار انگلیوں کے فاصلے پر تھا۔ جمعدار اپنی سانس روکے امیر کی طرف دیکھ رہا تھا اب اُسے پورا پورا یقین ہو چکا تھا کہ ابھی امیر چیخ کر یہ کہنے ہی والا ہے کہ ہٹاؤ اس سلاخ کو میں اقرار کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن اُس کا یہ یقین چُور چُور ہو گیا جب امیر نے اپنی رضامندی کی بجائے یہ کہا۔ "جلدی کرو ظالم نہیں تو یہ سلاخ ٹھنڈی ہو جائے گی۔"

"داغ دو۔" جمعدار آنکھیں بند کر کے چلایا اور آگ سے سرخ سلاخ امیر کی پیشانی پر جم کر رہ گئی۔

"یا خدا۔" ایک بھیانک چیخ سُرنگ کے اندر گونج گئی امیر نے دو ایک بار اپنا جسم ہلایا پھر اس کی گردن اُس کے دائیں کندھے پر ڈھلک گئی، بے ہوشی میں ڈوب جانے سے قبل اُس کے مُنہ سے جھاگ نکل پڑا تھا۔

"لے جاؤ اِسے اور کال کوٹھڑی میں ڈال دو۔" اپنی شکست پر تلملاتا ہوا جمعدار اپنے پیر پٹختا ہوا سُرنگ سے باہر نکل گیا۔

●

"میں آپ دونوں کو ایک نئی زندگی شروع کرنے پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔" جبل پور کے گرجا کے پادری نے ولیم سلومن اور ایملی کی شادی کی رسومات ادا کرنے کے بعد کہا تو بہت سے افسر اور نوجوانوں کو یہ بات کھٹکی۔ بیس سال کی خوبصورت فرنچ لڑکی جالیس سالہ ادھیڑ عمر ولیم سلومن بیاہ کر لے جائے یہ بات ان کی سمجھ میں ابھی نہیں لگ رہی تھی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہندوستان میں اتنے خوبصورت اور نوجوان انگریزوں کے ہوتے ہوئے اس لڑکی نے اتنے عمر رسیدہ آدمی کو کیونکر پسند کر لیا۔ آخر اس کو ولیم سلومن میں کیا خوبی نظر آ گئی ہے؟

لیکن ولیم سلومن ان سب باتوں سے بے خبر اپنی نوبیاہتا بیوی کا ہاتھ تھامے مسکراتا ہوا آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ لوگوں کی مبارک باد وصول کرتا ہوا دھیرے دھیرے باغیچے سے گذر کر ایک سجے سجائے تانگے پر بیٹھ کر اپنے بنگلے کی طرف روانہ ہو گیا۔ ان کے جانے کے بعد کچھ انگریز نوجوان آپس میں مل کر پُسر کرتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ "ولیم سلومن شائد تھوڑے ہی دن مزے اڑا سکے گا کیونکہ نوجوان ایملی سے اس کی زیادہ نہیں نبھ سکے گی۔ اس نے ایک ایسا شوہر پسند کیا ہے جو بار ٹیوں میں نہیں سیر و تفریح سے اسے دلچسپی نہیں ہے، اور نہ ہی وہ کبھی شکار وغیرہ کے لیے جاتا ہے۔ مگر ہاں ٹھگوں کی گرفتاری کے لیے وہ دن رات بھٹکتا رہتا ہے۔ ایملی تھوڑے ہی دنوں میں ایسے خشک آدمی سے تنگ آ جائے گی۔ اُسے اپنی پسند پر پچھتانا پڑے گا۔ پھر وہ ہم جیسے کسی نوجوان کا ہاتھ تھام کر ولیم سلومن کو گڈ بائی کہہ دے گی۔"

لیکن حسد میں ڈوبی ہوئی یہ باتیں وقت گذرنے کے ساتھ جھوٹی ثابت ہوتی گئیں۔ پچھتاوے کی بجائے ایملی تو اپنی پسند پر فخر کرنے لگی تھی۔ کیونکہ اس نے ایک ایسے شخص کو پسند کیا تھا جو ہنگامہ عشرت میں زندگی گذارنے کی بجائے دیس کے لاکھوں انسانوں کی زندگی سدھارنے کی جدوجہد کر رہا تھا۔

"ایملی اگر تم نہ ملی ہوتیں تو شائد میں زندگی بھر کنوارا ہی رہتا۔" ولیم سلومن نے سہاگ رات کے موقع پر ایملی سے کہا۔ "تم نے واقعی مجھ سے شادی کی ہے۔ اس کا مجھے اب تک یقین نہیں آ رہا ہے۔"

"کیا کہا؟" ایملی نے فرنچ زبان میں جواب دیا۔ "کہیں رات کے ساتھ رہنے کے بعد جناب کا ارادہ تو نہیں بدل رہا ہے؟"

"سچ سچ کہتا ایملی۔" سلومن پیار بھری سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ "شادی سے پہلے کیا تمھارے ذہن میں یہ خیال ابھرا تھا کہ اس ارادے کو ترک کر دیا جائے؟"

"ہاں یہ خیال میرے ذہن میں آیا تھا۔" ایملی پر مذاق لہجے میں بولی۔ "کب آیا تھا یہ بھی بتا دوں؟" اس کی یہ بات سن کر ولیم سلومن بیچ پیچ سنجیدہ ہو گیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ "اگر کوئی اعتراض نہ ہو تو کہہ دو۔"

"تو یاد کیجئے وہ دن جب ہم کھیت سے اپنے گھوڑوں پر واپس آ رہے تھے۔ میرا گھر آ گیا تو میں نے گھوڑے پر سے اترنے کے لیے آپ کے ہاتھ کا سہارا مانگا تھا اور آپ نے کافی ہچکچاہٹ کے بعد اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تھا۔ یوں تو میں ہمیشہ ہی اپنے گھوڑے پر سے کود کر نیچے اتر جاتی تھی لیکن اس دن کی یہ بات شائد آپ کو کچھ عجیب سی محسوس ہوئی ہو گی پھر میں نے آپ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر گھوڑے کی پیٹھ پر سے اترنے کی کوشش کی تھی۔ اس وقت میرے دل میں ایک عجیب سی ہلچل مچی ہوئی تھی شرم سے میرا چہرہ سرخ ہو چکا تھا اور مجھے یوں لگنے لگا کہ میری طرح آپ بھی کچھ ایسا ہی محسوس کر رہے ہیں لیکن پھر بھی ایک جھٹکے سے آپ نے میرا ہاتھ ہٹا دیا اور میری طرف دیکھے بغیر گڈ نائٹ" کہہ کر چلے گئے۔ یاد ہے نا وہ دن؟"

ایملی کی ان باتوں میں ولیم سلومن کو اپنے لئے بے پناہ پیار محسوس ہوا لیکن پھر بھی اس کی گھبراہٹ دور نہیں ہوئی۔ وہ اسی سنجیدہ لہجے میں بولا۔ "میں تمھاری طرف دیکھے بغیر گڈ نائٹ کہہ کر چلا گیا تھا۔ شائد یہ بات تمھیں بہت بُری لگی ہو ایملی! اور شائد تمھیں مجھ پر غصہ بھی آیا ہو؟"

"ہاں میں تو غصے سے تلملانے لگی تھی۔" ایملی نے بھی سنجیدگی سے کہا اور مجھے لگا کہ یہ آدمی کبھی کسی سے محبت نہیں کر سکتا۔"

"تمھارے اس سلوک میں تمھیں پیار کی کمی محسوس ہوئی تھی؟" اس بار ولیم سلومن کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ اپنے سوال کا جواب سننے کے لئے ایملی کی طرف دیکھنے لگا۔

"مجھے اگر پیار میں کمی محسوس ہوئی ہوتی تو میں گڈ نائٹ کے جواب میں گڈ بائی کہہ دیتی مسٹر!" ایملی ہنستے ہوئے کہنے لگی۔ "آپ کی ہچکچاہٹ سے مجھے برابر جھلک رہا تھا۔ لیکن پھر بھی آپ نے اس کو چھلکنے نہیں دیا مگر باکر میں نے اس پر کافی غور کیا۔ آپ کی جگہ کوئی اور مرد ہوتا تو وہ میرا ہاتھ دبوچ لیتا اور مجھے اپنے قریب کھینچ لیتا۔ لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا تھا۔" ایملی ذرا دیر کے لئے رکی تو ولیم سلومن نے پوچھا۔ "پھر؟"

"پھر کیا؟" ایملی اس کے اور زیادہ قریب آ کر بولی۔ "میرا غصہ زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکا۔ اور میں آپ کی محبت میں پگھلتی چلی گئی۔"

ایملی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آہستہ آہستہ گہری ہوتی گئی اور ولیم سلومن محبت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

●

شادی کے دو سال بعد اچانک ایک رات ولیم سلومن کے گھر کے دروازے پر دستک ہوئی۔ گہری نیند میں ہونے کے باوجود ولیم سلومن کی عادت تھی کہ وہ اپنے دروازے پر دستک سنتے ہی اٹھ کھڑا ہوتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ جب آدھی رات کو دروازے پر دستک ہو تو ایک فرض شناس شخص کو سوتا نہیں رہنا چاہیئے۔ اس نے اپنے نوکر کو بھی یہ ہدایت دے رکھی تھی کہ اگر کوئی ضروری کام ہو تو اسے آدھی رات کو بھی جگا دیا جائے۔

"ایک منٹ" دستک کی آواز سن کر وہ اپنے بستر سے اٹھا اور پھر ایک منٹ کے اندر ہی اندر اس نے دروازہ کھول دیا۔ اس کے سامنے اس وقت اس کا خدمت گار گوپال سنگھ کھڑا تھا۔ "کیا بات ہے گوپال سنگھ؟"

"حضور۔" گوپال سنگھ ادب سے سر جھٹکا کر بولا۔ "خان صاحب آپ سے ملنے کے لیے آئے ہیں۔"

"رستم خان۔" ولیم سلومن کی آنکھیں چمکنے لگیں اور اس کی رہی سہی نیند بھی غائب ہو گئی۔ وہ دل ہی دل میں اندازے لگانے لگا کہ رستم خان یقیناً اسے کسی ٹھگ کے بارے میں کچھ بتانے آیا ہو گا۔ اپنے نائب پولیس افسر رستم خان کے سامنے اسے نائٹ سوٹ میں جانے سے ذرا ہچکچاہٹ سی محسوس ہوئی تھی لیکن اس وقت وہ اس کی پرواہ کئے بغیر سیدھا دیوان خانے کی جانب بڑھتا چلا گیا۔ رستم خان اسے دیکھتے ہی کرسی پر سے کھڑا ہو گیا پھر اس سے پہلے کہ رستم خان اسے نیند سے جگانے پر افسوس کا اظہار کرتا، ولیم سلومن نے پوچھ لیا۔ "یس مسٹر رستم خان! اینی ہوٹ نیوز؟"

"یس سر۔ ویری ہوٹ نیوز۔" سر رستم خان کا جوش و خروش اسکے لفظ لفظ سے ظاہر ہو رہا تھا۔ "فرنگیا ہمارے علاقے میں داخل ہو چکا ہے۔"

"فرنگیا...؟" ولیم سلومن ایک جھٹکے سے اپنی کرسی سے کھڑا ہو گیا۔ "ہمارے علاقے میں؟" اس کے لہجے سے یوں لگ رہا تھا جیسے اسے اس خبر پر یقین ہی نہ آ رہا ہو۔ "شیر خود ہی چل کر ہماری شکار گاہ میں آ گیا ہے۔ کس نے تمھیں یہ اطلاع دی ہے؟"

ولیم سلومن کے ساتھ ساتھ رستم خان بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا اسے اندازہ تھا کہ ولیم سلومن اس خبر کو سن کر ضرور حیران ہو گا۔ فرنگیا کو گرفتار کرنے کے لئے پچھلے ایک سال سے وہ اس گورے صاحب کے ساتھ

بھاگ دوڑ کر تار ہا تھا۔ گرفتار کیے جانے والے ٹھگ سرداروں سے انھوں نے بار بار یہ نام سنا تھا۔ سارے ٹھگوں پر اس کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی اور ان کا کہنا تھا کہ فرنگیا تو ٹھگوں کا بھی ٹھگ ہے۔ وہ بہت چالاک اور ہوشیار سردار ہے۔ اسے آپ لوگ نہیں گرفتار کر سکتے۔ وہ زندگی بھر آپ کے ہاتھ نہیں آئے گا۔۔۔

"یہ اطلاع کون لے کر آیا ہے؟" تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد ولیم سلومن نے رستم خان سے پوچھا۔ "کیا وہ ہمارا بااعتماد آدمی ہے؟"

"صاحب یہ اطلاع دھن سنگھ لے آیا ہے۔" لمبے تڑنگے رستم خان نے تالی بجا کر دھن سنگھ کو اندر آنے کا اشارہ کیا اور آگے بولا۔ "میں اسے ساتھ لے کر آیا ہوں۔"

دھن سنگھ کا نام سن کر ولیم سلومن کی آنکھیں پھر چمکنے لگیں کیونکہ اس کی لائی ہوئی اطلاعیں زیادہ تر درست ہی ثابت ہوتی تھیں۔ اس کی گرفتاری ایک ٹھگ کی حیثیت سے عمل میں آئی تھی مگر اسے اس شرط پر معافی دی گئی تھی کہ اسے ٹھگوں کے خلاف جاسوسی کرنی ہوگی۔ اور دھن سنگھ یہ کام بڑی وفاداری سے انجام دے رہا تھا۔ برسوں تک ٹھگوں کی مختلف ٹولیوں میں شامل رہنے کے باوجود اسے کوئی اچھا عہدہ نہیں مل سکا تھا۔ اسی لیے وہ سخت ناراض تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ ٹھگوں کے خلاف ولیم سلومن کے لیے جاسوسی کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکال رہا تھا۔

پستہ قد اور موٹے جسم والا دھن سنگھ ولیم سلومن کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ ولیم سلومن نے ایک بار اسے نیچے سے اوپر تک دیکھا پھر بولا "کیا واقعی فرنگیا یہاں آیا ہے؟"

"جی ہاں جناب! یہاں سے تیس میل کے فاصلے پر مردھی گاؤں کے قریب اس نے اپنا پڑاؤ ڈال رکھا ہے۔" دھن سنگھ نے سر جھکا کر ادب سے جواب دیا۔

"صرف تیس میل کے فاصلے پر؟" ولیم سلومن اپنے دونوں ہاتھ مسلتے ہوئے بولا۔ "تب تو ہمیں اسے گھیر لینا چاہیے۔"

تیس سمر رستم خان ایک دوسری خبر سناتے ہوئے بولا۔ "دھن سنگھ کی اطلاع کے مطابق فرنگیا نے اپنے گھر والوں کو جھانسی میں رکھا ہوا ہے۔"

"اچھا۔" ولیم سلومن اپنے داہنے ہاتھ کی مٹھی بھینچ کر بولا۔ "تب تو سپاہیوں کا ایک دستہ وہاں بھی بھیج دینا چاہیے۔ اس کے اہل خانہ کے تمام افراد کو گرفتار کر کے یہاں حاضر کرنے کا حکم دے دیا جائے۔ جھانسی یہاں سے تقریباً دو سو میل کے فاصلے پر ہے۔ اس لیے گھوڑ سوار سپاہیوں کو ہی وہاں بھیجنا۔" اتنا کہہ کر وہ تھوڑی دیر کے لیے رکا اور اچانک ہی بولا۔ "اور فرنگیا کی ٹولی کو پکڑنے کے لیے ہم ساتھ چلیں گے۔"

"بہتر ہے جناب!" صوبیدار رستم خان نے ابھی یہ کہا ہی تھا کہ اس سے ایک نازک سی آواز آئی۔ "مجھے بھی آپ لوگوں کو اپنے ساتھ لے چلنا ہے۔"

ولیم سلومن نے پلٹ کر دیکھا۔ ایملی پیچھے کھڑی مسکراتی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ "ایملی تم جاگ گئیں؟"

"تو کیا آپ مجھے سوتا چھوڑ کر ہی چلے جانے والے تھے؟" دونوں میاں بیوی فرنچ زبان میں باتیں کر رہے تھے کیونکہ ایملی انگریزی سمجھ لیتی تھی مگر بول نہیں سکتی تھی۔ اور ولیم سلومن اسے انگریزی بولنے کا موقع نہیں دیا کرتا تھا۔

"ایملی یہ سفر خطرناک ہے۔ ہم لوگ فرنگیا کو گرفتار کرنے جا رہے ہیں۔" ولیم سلومن کی اس بات کا جواب ایملی کے پاس تیار ہی تھا۔ "اسی لیے مجھے بھی ساتھ چلنا ہے تاکہ میں دیکھوں تو سہی کہ جس فرنگیا کو گرفتار کرنے کے لیے آپ دن رات بے چین رہتے ہیں وہ آخر ہے کیسا؟"

"اس کی گرفتاری کے بعد بھی تم اسے دیکھ سکتی ہو۔" ولیم سلومن نے جواب دیا۔

"تو کیا وہ زندہ گرفتار ہو جائے گا؟" ایملی کے اس سوال پر ولیم سلومن کو چوکنا کر دیا۔ اور وہ سوچنے لگا کہ اب تک اس کے ذہن میں یہ خیال کیوں نہیں آیا تھا؟ فرنگیا کے بارے میں جو کچھ اس نے سن رکھا تھا اس کے پیش نظر ایملی کی بات سچ ثابت ہو سکتی تھی۔ کیونکہ فرنگیا اپنے ساتھ تلوار کے علاوہ پستول بھی رکھتا تھا۔ وہ نشانے باز بھی ماہر تھا۔ آس پاس کے گاؤں اور دور دراز کے علاقوں میں اس کے مخبر موجود تھے۔ زمیندار اور ٹھاکر تک اسے آسرا دیتے رہتے تھے۔

"رستم خان!" ولیم سلومن نے صوبیدار کی طرف دیکھا۔ "میں نے ارادہ بدل دیا ہے۔ میں اب تمھارے ساتھ نہیں آؤں گا۔" ولیم سلومن کے ان الفاظ نے رستم خان کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ اور تب ولیم سلومن کو اس کی حیرت دور کرنے کے لیے کہنا پڑا۔ "تم اس کا کوئی غلط مطلب نہ نکال لینا۔ جان کا خطرہ ہوتا تو میں سب سے آگے ہوتا۔ لیکن مجھے ڈر بات کا خطرہ لگتا ہے کہ کہیں فرنگیا ہوشیار نہ ہو جائے۔ میں اگر ساتھ ہوں تو اس کے کانوں تک بات جلدی پہنچ جائے گی۔ ہمیں تو اسے رنگے ہاتھوں گرفتار کرنا ہے۔ بالکل اچانک ہی اس پر ہاتھ ڈال دینا ہے۔"

"میں سمجھ گیا جناب!" رستم خان خوش ہو کر بولا۔ "فرنگیا کی گرفتاری کا کام آپ میرے سپرد کرنا چاہتے ہیں۔ اس سے مجھے بے حد خوشی ہوگی۔"

"رستم خان! ترقی اور عزت تمھیں ملے گی۔ اور پانچ سو روپے کا انعام۔" اس دھن سنگھ کو ملے گا۔" ولیم سلومن نے دھن سنگھ کی جانب دیکھتے ہوئے آگے کہا۔ "اگر اس کی دی ہوئی اطلاع درست ثابت ہوئی تو۔"

پھر پندرہ منٹ کے بعد رستم خان اور دھن سنگھ نے ولیم سلومن کے ساتھ صبح کی چائے پی۔ اور اس کے ساتھ فرنگیا کی گرفتاری کے لیے روانہ ہو گئے۔ اس وقت ولیم سلومن یہ سوچ رہا تھا کہ اب اس کی منزل بہت قریب ہی نظر آ رہی ہے۔

●

"فرنگیا۔۔۔ تم نے چڑیا کے بولنے کی آواز سنی؟" خوشیا نے گھبراہٹ بھری آواز میں ندی میں نہاتے ہوئے سردار سے کہا۔ "تیسری دوپہر میں چڑیا کے بچے کی یہ آواز اب تو بدشگونی کی انتہا ہو گئی ہے۔"

خوشیا ذرا دھیرے بولو۔" فرنگیا اپنے لمبے لمبے ہاتھوں سے پانی کو چیرتا ہوا کنارے کی طرف آ گیا۔ "چڑیا کی آواز اس نے بھی سنی تھی۔ اور اس آواز کو سن کر پہلے تو وہ خود ہی گھبرا گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ خوشیا نے یہ آواز نہیں سنی ہوگی۔ اس سفر کی ابتدا ہی سے بدشگونی پیدا کرنے والے یہ تمام اشارے اس کا پیچھا کر رہے تھے۔ لیکن اسکے باوجود وہ اپنی ٹولی کے ساتھ آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ لیکن اب اسے خوشیا کو سمجھانا مشکل نظر آ رہا تھا۔

"لیکن یہ بات ساتھیوں کو بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے ایک کپڑے سے اپنا بدن پونچھتے ہوئے کہا۔ "ہمیں واپس نہیں جانا ہے کیونکہ ابھی تک ہمیں کوئی قابل ذکر شکار نہیں ملا ہے۔ اور فرنگیا کبھی خالی ہاتھ ادھر سے سفر پر نہیں نکلتا۔"

لیکن بدشگونی کا تو یہ واضح اشارہ تھا۔" خوشیا کے چہرے پر خوف کی جھلک نمایاں نظر آ رہی تھی۔ "تم دیوی کے اشارے کو نظر انداز کر کے آفت بلانا چاہتے ہو؟"

"سردار تم ہو یا میں؟" فرنگیا کی آنکھیں سرخ ہو گئیں لیکن فوراً ہی اسے خیال آ گیا کہ خوشیا سے سخت لہجے میں باتیں کرنا اس وقت مناسب نہیں ہے بلکہ اسے تو بہلا پھسلا کر ہی اپنا کام نکالنا ہوگا۔ یہ سب باتیں سوچ کر اس نے اپنے لہجے میں نرمی پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "دیکھو خوشیا بدشگونی سے اس قدر گھبرانا نہیں چاہیے۔ اگر ساتھیوں کا جوش و خروش سرد پڑ گیا تو واپسی میں بھی دشواری ہو جائے گی۔" لیکن خوشیا کے دماغ میں بہت گہری سمائی اس کے چہرے پر اب بھی خوف کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ اس کا یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر فرنگیا نے اس کی ہمت بندھائی اور آگے بولا۔ "ہم لوگ ہوشیاری سے کام لیں گے۔ پہلے ہم بھیلسا گاؤں جائیں گے۔ وہاں کا مکھیا ہمارا اپنا آدمی ہے۔ پہلے اس سے پوچھ گچھ کر لیں گے پھر آگے کا فیصلہ کریں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" بوڑھے خوشیا نے گردن ہلا کر جواب دیا اور نوجوان فرنگیا کے پیچھے پیچھے اپنے پڑاؤ کی جانب بڑھنے لگا۔ لیکن قدم قدم پر اس کے دل میں یہ کھٹکا بڑھتا جا رہا تھا کہ جب سے سفر ہوا تھا تب سے لیکر اب تک کتنی بدشگونیاں ہو چکی ہیں۔ وہ دل ہی دل میں ان کا شمار کرتا جا رہا تھا۔

●

فرنگیا ہمیشہ ایک کالے بکرے کی بھینٹ چڑھا کر اپنے سفر پر روانہ ہوتا تھا۔ بھینٹ کا وہ بکرا کسی مسلمان ٹھگ کے ہاتھوں سے ذبح ہوتا اور ہندو ٹھگ کے ہاتھوں اس کی بھینٹ چڑھائی جاتی۔ اس بار تو محمد بخش نے چھری کے ایک ہی جھٹکے میں بکرے کو ذبح تو کر دیا تھا لیکن فرنگیا کے سوتیلے بھائی جاہرو کی کلہاڑی کا وار ذرا ترچھا پڑا تھا۔ اور دستور کے مطابق پہلے ہی وار میں جو بھینٹ ہو جانے والی تھی وہ نہیں ہو سکی تھی تو اس وقت خوشیا نے کہا تھا۔ "یہ تو بدشگونی ہو گئی ہے۔"

شگون دیکھنے کا کام خوشیا کا تھا۔ اس لیے اس کی اس بات نے ٹولی کے چاروں نائب سرداروں کو بھی چونکا دیا۔ لیکن فرنگیا سفر ملتوی کر دینے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ "پہلے ہم دیوی کے اشارے کا انتظار کرتے ہیں پھر کوئی فیصلہ کرتے ہیں۔"

اپنی ٹولی پر اس کی اتنی دھاک بیٹھی ہوئی تھی کہ کوئی بھی ایک لفظ نہیں بول سکا تھا۔ کافی دیر بعد انھیں ایک مینا کے بولنے کی آواز سنائی دی اور فرنگیا ہاتھ اٹھا کر چلانے لگا۔ "جے کالی کا جے بھوانی۔" پھر اپنے ساتھیوں کو جوش دلاتے ہوئے وہ آگے بولا۔ "دیوی ہم لوگوں سے خوش ہے۔ آگے بڑھنے کے لیے اشارہ مل چکا ہے۔"

لیکن ایک ہفتے کے سفر کے بعد بھی جب انھیں کوئی شکار نہیں ملا تو خوشیا کا شک یقین میں بدلنے لگا۔ بیسنی گاؤں میں چند مسافروں کو انھوں نے اپنے جال میں پھانس لیا تھا لیکن ان کے ایک ساتھی نے اسی زبان کی بجائے ہندوستانی میں جب یہ بات کہی کہ اگر یہ سارے مسافر خالی ہاتھ ہی سفر پر جائیں گے تو ہمارے بیوی بچوں کا کیا ہوگا؟ اس کی اس بات نے ہاتھ آئے ہوئے شکار کو ہوشیار کر دیا اور وہ شام ہوتے ہی ان کے قافلے سے الگ ہو کر دوسرے راستے پر چل پڑے تھے۔

اور مونیا گاؤں میں بھلا اس عورت کو مارنے کی کیا ضرورت تھی؟

خوشیا ہونٹوں ہی ہونٹوں میں بڑبڑایا۔ ایک اکیلی عورت کو ختم کر کے فرنگیا نے اور زیادہ بدشگونی کر دی تھی۔ اس پر مصیبت یہ ہوئی کہ ان کے ایک ساتھی اور دیس خان کی گھوڑی نے راستے میں ایک بچے کو جنم دے دیا اور فرنگیا نے اس بدشگونی کی بھی پرواہ نہیں کی تھی۔ الّو کی آواز سننے کے بعد تو خوشیا بہت زیادہ پریشان ہو گیا تھا۔ لیکن فرنگیا ٹھگوں کا ایک ایسا سردار تھا جو گھبرا کر واپس پلٹ جانے پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ وہ ٹھنڈے دل سے ہر بات پر غور کر کے حالات کا مقابلہ کرنے کا عادی تھا اور آج تک وہ ہر مشکل میں ثابت قدم رہ کر کامیاب ہی ہوتا آیا تھا۔

پڑاؤ پر آ کر ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر اس نے کسی گھبراہٹ کے بغیر اپنے ساتھیوں سے کہا "ہمیں بھیسلا گاؤں میں جا کر ہی اپنا پڑاؤ ڈالنا ہے۔ مجھے اطلاع ملی ہے کہ وہاں بہت زیادہ مال بردار مسافروں کی آمد و رفت ہوتی رہتی ہے۔"

فرنگیا کے اس جھوٹ نے بوڑھے خوشیا کو خوف سے کپکپا کر رکھ دیا لیکن فرنگیا کی تیز نگاہوں نے اسے ایک لفظ بھی کہنے نہیں دیا جو جس طرح شکاری کی بُو پا کر بھوکے شیر یا گل ہو جاتے ہیں۔ بالکل اسی طرح وہ تمام ٹھگ پھرتی سے اپنے خیمے اکھاڑنے میں مصروف ہو گئے۔

●

بھیسلا کے مکھیا کے کھیتوں سے پچاس گز دور اپنے ساتھیوں کو انتظار کرنے کی ہدایت دے کر فرنگیا خود مکھیا سے پوچھ گچھ کرنے کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس وقت مکھیا کے پاس چونکہ گاؤں کے تین چار آدمی اور بیٹھے ہوئے تھے اس لیے وہ کھل کر مکھیا سے باتیں نہیں کر سکا۔ اس نے ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد ایک سوال چھیڑا۔ "بھائی صاحب آج کل سفر میں تو قدم قدم پر خطرات منہ کھولے کھڑے رہتے ہیں۔ ٹھگ لوگ تو اب انگریز لشکر سے بھی نہیں ڈرتے۔" وہ اس طرح کہہ رہا تھا جیسے وہ خود ایک شریف آدمی ہو۔ اسے جو کچھ معلوم کرنا تھا وہ اِدھر اُدھر کی آڑی ترچھی باتوں سے ہی معلوم ہو سکتا تھا اسی لیے وہ ایک پل کے بعد آگے بولا "کیا اس طرف انگریزوں کے لشکر کا کوئی پڑاؤ ہے؟ اگر کوئی ایسا پڑاؤ ہے تو ہم لوگ انھیں کے ساتھ اپنے سفر پر آگے روانہ ہوں گے۔"

فرنگیا کی اس بات کا اصل مقصد تو مکھیا سمجھ گیا تھا لیکن وہ اسے صاف صاف جواب نہیں دے سکتا تھا۔ وہ اسے اشارے میں یہ بات سمجھانا چاہ رہا تھا کہ انگریزوں نے تمھارے خلاف جال بچھا دیا ہے۔ تم یہاں سے فوراً بھاگ جاؤ۔ لیکن مکھیا کو یہ اشارہ کرنے کا بھی موقع نہیں ملا۔ تارو... بھاگو... پکڑو کے شور نے فرنگیا کو چونکا دیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو اسے اپنے ساتھی سپاہیوں کے ہاتھوں گرفتار نظر آئے۔ اس نے ساتھیوں کو بھاگتے ہوئے بھی دیکھا اور کچھ کو زخمی ہو کر گرتے بھی۔ سپاہی تمام ٹھگوں کو گھیرے میں لے کر گرفتار کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ ٹھگوں کی مزاحمت جاری تھی۔ اچانک فرنگیا کو خیال آیا کہ اس افراتفری میں ابھی تک اس پر کسی کی نگاہ نہیں پڑی ہے۔ اس لیے اسے فوراً یہاں سے نکلنا چاہیے۔ لیکن اس کا گھوڑا اسے کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ اپنے گھوڑے کو ایک درخت سے باندھ کر مکھیا سے ملنے آیا تھا لیکن شاید گھبراہٹ میں وہ ڈر اور افراتفری میں گھوڑا رسی تڑا کر کہیں بھاگ چکا تھا۔

"فرنگیا کہاں ہے؟" صوبیدار رستم خان اپنی کرخت آواز میں اپنے ماتحتوں سے پوچھ رہا تھا۔ اس کی آواز جب فرنگیا کی سماعت سے ٹکرائی تو وہ اپنی جگہ کھڑا نہ رہ سکا۔ پیدل فرار ہونا ممکن نہ تھا یہ جاننے کے باوجود اس نے جان بچانے کے لیے مکھیا کے گھر کی جانب دوڑ لگا دی۔ مگر ابھی اس نے پچاس گز کا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ اسے اپنا گھوڑا ایک جگہ گھاس چرتا نظر آ گیا۔ گھوڑے کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی لہرا گئی۔ پھر وہ بے آواز قدموں سے گھوڑے کی جانب سرکتا چلا گیا۔ پھر دوسرے لمحے وہ اچھلا اور چھلانگ لگا کر اس کی پیٹھ پر سوار ہو چکا تھا۔ گھوڑا اپنے مالک کا اشارہ پاتے ہی گھنی جھاڑیوں کے درمیان سے ہوتا ہوا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

فرنگیا اپنے گھوڑے کو کہیں آرام دیے بغیر دن رات بھگاتا رہا۔ وہ ڈیڑھ دو سو کوس کا فاصلہ طے کر کے جلد سے جلد اپنے گھر پہنچنا چاہتا تھا۔ اسے اپنے بیوی بچوں کا خیال ستانے لگا تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے اپنے ساتھیوں کو سپاہیوں کے نرغے میں گھرے ہوئے دیکھا تھا اور اسی وقت سے اس کے دل میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی کہ اس کا یقیناً مسلمان صوبیدار رستم خان اس کے ساتھیوں کو گرفتار کر کے صاحب ولیم سلومن کے سامنے پیش کرے گا۔ اور وہ دلاسی اسے بہت چالاک ہے۔ دھمکی اور لالچ دے کر وہ اس کے دو چار ساتھیوں کو اپنا ہی تو لے گا۔ پھر ان میں سے کوئی اس کے گھر کا پتا بتا ہی دے گا۔ پھر اس طرح پہلے بھی کئی ٹھگوں کے گھر والوں کو گرفتار کر کے جیل میں بند کر دیا گیا۔ سوچتے سوچتے فرنگیا نے دانت پیستے ہوئے دل ہی دل میں یہ عہد کیا کہ ولیم سلومن کو اس کے مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دے گا اور اپنے بیوی بچوں کو لے کر کہیں دور نکل جائے گا۔ اس سفر میں وہ تمام ٹھگوں کو دھوکے سے ولیم سلومن کے خوف کو نکال پھینکنا چاہتا تھا۔ اسی لیے تو اس نے بدشگونی کی پرواہ کیے بغیر اپنا سفر جاری رکھا تھا۔ لیکن قسمت نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔ اور ولیم سلومن کو گھیرے میں لینے کی بجائے خود اس کے گھر والے ہی ولیم سلومن کے گھیرے میں پھنس چکے تھے۔ اسے اپنے بھائی جابر پر سب سے زیادہ افسوس ہو رہا تھا۔ کیونکہ اس کے خیال کے مطابق ولیم سلومن اسے ضرور پھانسی پر چڑھا دے گا۔ جیسے جیسے اس کا گھر قریب آتا جا رہا تھا ویسے ویسے ولیم سلومن پر اس کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ اس بات کا فیصلہ کر چکا تھا کہ گھر والوں کو کسی محفوظ ٹھکانے پر پہنچا دینے کے بعد وہ ولیم سلومن سے ضرور نپٹ لے گا۔

جب گوہراگاؤں کا مندر سے دکھائی دینے لگا تو شام کا سورج اپنے سفر کا آخری مرحلہ طے کر رہا تھا۔ فرنگیا نے گاؤں والوں کی نظروں سے بچنے کیلیے ایک سنسان پگڈنڈی کا راستہ اختیار کیا تھا۔ شام کے دھندلکے میں گھر کے دروازے پر اس نے گھوڑے کی لگام اپنے خادم کے حوالے کی اور چپ چاپ گھر کے اندر داخل ہو گیا۔ اسے اس طرح اچانک اپنے سامنے دیکھ کر اس کی ماں اور بیوی دونوں حیرت زدہ رہ گئیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ فرنگیا نے جاتے وقت تین چار دن بعد واپس آنے کے لیے کہا تھا لیکن اب وہ اتنی جلدی کیوں واپس آ گیا ہے۔

جب فرنگیا نے آگے بڑھ کر اس کے پاؤں چھوئے تو اس کی بیوہ ماں نے یہ سوال پوچھ ہی لیا۔ لیکن پھر فوراً ہی اسے خیال آیا کہ اس کے بیٹے کو اس قسم کے سوال بالکل پسند نہیں ہیں اسی لیے وہ بات بدل کر بولی۔ "کیا بات بیٹے؟ تم کچھ پریشان لگ رہے ہو۔" اس سوال نے فرنگیا کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ کچھ بھی ہو ماں آخر ماں ہوتی ہے۔ اس سے اولاد کی کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی۔ اس نے مسکرا کر اپنی پریشانی کو چھپانے کی پوری پوری کوشش کی تھی لیکن پھر بھی اس کی ماں اس کے چہرے کو دیکھ کر ہی تاڑ گئی۔ "پہلے مجھے کھانا دو ماں" کہہ کر اس نے وقتی طور پر بات ٹوٹ دی تھی لیکن صبح ہونے سے پہلے اسے گھر اور گاؤں دونوں کو چھوڑنا تھا اس لیے اسے کہنا پڑا۔ "تمام ضروری چیزوں کو باندھ لو ہمیں اس گاؤں سے چلے جانا ہے۔"

ماں کے سوال و جواب سے بچنے کے لیے وہ چادر اوڑھ کر چارپائی پر لیٹ گیا تاکہ چار راتوں کی نیند کا بوجھ تھوڑا سا ہلکا ہو جائے۔ لیکن آنکھیں بند ہونے سے قبل اس نے اپنے با اعتماد ملازم کو بلا کر کہہ دیا۔ "راتوں رات چار اونٹوں کا بندوبست کر لو اور کوئی میرے بارے میں پوچھے تو بتانا مت کہ میں گھر واپس آیا ہوں۔"

پھر چڑھی ہوئی نیند کا حساب چکانے کے لیے فرنگیا خراٹے بھرنے لگا اسے معلوم نہیں تھا کہ گورے صاحب ولیم سلومن کا بھیجا ہوا پولیس کا دستہ نندکے اس کے گاؤں کی طرف بڑھا چلا آ رہا ہے۔

●

ولیم سلومن کچہری میں بیٹھا بیٹھا بار بار کھڑکی کے باہر دیکھ لیا کرتا تھا وہ رستم خان کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا جو اپنے دستے کے ساتھ فرنگیا کو گرفتار کرنے گیا ہوا تھا۔ اسے اس بات کا بھی افسوس ہو رہا تھا کہ وہ رستم خان کے ساتھ کیوں نہیں گیا؟ کہیں رستم خان خالی ہاتھ ہی واپس نہ آ جائے؟ اس خیال نے اسے رات بھر سونے نہیں دیا تھا۔ کچہری میں آنے کے بعد بھی اس کا کسی کام میں جی نہیں لگ رہا تھا۔ سردیوں کے دن ہونے کے باوجود وہ چھت پر لگے ہوئے پکھڑے کے پنکھے کی ڈوری کو مسلسل کھینچ رہا تھا۔ لیکن یہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا بھی اس کے اندر کی گھبراہٹ کو دور نہیں کر سکی۔

گھڑی گھڑی جیسی گھڑی کو دیکھ کر موجود لوگوں کی توجہ اپنی بیقراری کی جانب مبذول کرانا نہیں چاہتا تھا۔ اسی لیے اس نے گھڑی نکال کر وقت دیکھنے کا ارادہ ہی ملتوی کر دیا تھا اور اس طرح انتظار کا ایک اور گھنٹہ اس نے گذار دیا تھا۔ پھر اچانک ہی باہر برآمدے میں اسے کسی کے بھاری جوتوں کی آواز سنائی دی...

"ان سب کو ایک طرف لائن سے کھڑا کر دو۔" چند لمحوں بعد ولیم سلومن کی سماعت سے رستم خان کی آواز ٹکرائی تو وہ بُری طرح چونک پڑا۔ اس نے ایک جھٹکے سے گردن گھمائی تو اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی لہرا گئی۔ سپاہی پچیس تیس آدمیوں کو ہوکر رسیوں سے بندھے ہوئے تھے ایک جانب قطار میں کھڑا کرتے دکھائی دے رہے تھے۔

ولیم سلومن کے دل میں ایک عجیب سی ہلچل مچ گئی اور اس کی نظریں ہر ایک قیدی کے چہرے پر پھسلنے لگیں اس کی تیز نگاہیں فرنگیا کو ڈھونڈ رہی تھیں لحیم شحیم اونچا قد چمک دار بڑی بڑی آنکھیں اور نوکیلے ناک والا فرنگیا اُسے نظر کیوں نہیں آتا؟

فرنگیا کے بارے میں اُس نے اب تک بہت سے لوگوں سے بہت سی باتیں سن رکھی تھیں۔ اُس کا جو حلیہ اُسے بتایا گیا تھا اُس کے تصوراتی نقوش ایک عرصے سے اُس کی آنکھوں میں گھوم رہے تھے۔

پٹھان صوبیدار رستم خان سلام کرتا ہوا کمرے میں داخل ہوا تو ولیم سلومن نے کھڑکی پر سے اپنی نظریں ہٹا لیں اور "ویل ڈن مسٹر خان" کہہ کر اُس نے رستم خان کو خوش آمدید کہا لیکن رستم خان کا چہرہ اپنی کامیابی کی خوشی سے چمک نہیں رہا تھا اسی لیے وہ پوچھ بیٹھا "کیا فرنگیا فرار ہو گیا؟"

"ویری سوری سر" کہہ کر رستم خان نے اپنی گردن ذرا

جھکا دی۔

"بنور مائینڈ خان۔" ولیم سلومن نے اس صدمے کو اپنی مسکراہٹ کی آڑ میں چھپاتے ہوئے رستم خان کی ہمت بندھائی "آپ تو اتنے سارے ٹھگوں کو پکڑ کر لے آئے ہیں اور یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ ڈونٹ بی سوری آپ نے اپنی ذمے داری پوری کر دی ہے۔"

ولیم سلومن میں سب سے بڑی خوبی یہ بھی تھی کہ وہ اپنے آدمیوں کی دل شکنی کبھی نہیں کرتا تھا۔ حالانکہ اس وقت اس کی سب سے بڑی خواہش یہی تھی کہ فرنگیا کسی طرح گرفتار ہو جائے۔ رستم خان کو اس کام پر روانہ کرتے وقت اس نے صرف دو ہی باتوں کو مدنظر رکھا تھا کہ یا تو دھن سنگھ کی دی ہوئی اطلاع جھوٹی ثابت ہوگی یا فرنگیا گرفتار کر لیا جائے گا لیکن اس کے فرار ہو جانے کی خبر نے تو اس کے تن بدن میں ایک آگ سی لگا دی تھی مگر اس کے باوجود رستم خان کا دل رکھنے کے لیے اس نے بڑی آسانی سے بات کو ٹالتے ہوئے کہا۔ "مجھے تو اس بات کا پہلے ہی سے اندازہ تھا کہ یہ ٹھگ سرواسی آسانی سے ہمارے ہاتھ نہیں آئے گا۔"

یہ سن کر صوبیدار رستم خان نے اطمینان کا سانس لیا اور پھر اپنی رپورٹ پیش کرتے ہوئے بولا۔ "چالیس میں سے اٹھائیس ٹھگ گرفتار ہو چکے ہیں ہمیں اس بات کا علم نہیں تھا کہ فرنگیا اسی وقت گاؤں کے مکھیا سے ملنے گیا ہوا ہے نہیں تو وہ اسی وقت دھر لیا جاتا۔ ہم نے جب چھاپہ مارا تو اسے پتا چل گیا اور وہ فرار ہو گیا۔" رستم خان کہتے کہتے ایک پل کے لیے ٹھہر گیا جیسے کوئی اہم بات یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ "لیکن پھر بھی فرنگیا کا بھائی ہمارے قبضے میں آ گیا ہے۔" آخر چند لمحوں کے بعد اس نے کہہ دیا۔

"فرنگیا کا بھائی؟" ولیم سلومن چونک پڑا مگر پھر فوراً ہی وہ سمجھ گیا۔ "یو مین اس کا سوتیلا بھائی؟"

"یس سر۔" رستم خان ذرا ڈھیلا پڑ گیا "وہ جانتا تھا کہ ایک ایک بات کی خبر رہتی ہے۔ فرنگیا کا کوئی سگا بھائی نہیں ہے یہ بات ولیم سلومن کو معلوم تھی۔ فرنگیا کے پورے خاندان کے بارے میں اس نے چھوٹی سے چھوٹی باتیں بھی نوٹ کر رکھی تھیں۔ پہلے پہل جب اس نے فرنگیا کا نام سنا تھا تو وہ اچنبھے میں پڑ گیا تھا اور اس وقت اس نے رستم خان سے پوچھا تھا۔ "باقی سب تو ٹھیک ہے لیکن ایک براہمن کا نام فرنگیا کیسے ہو سکتا ہے؟" رستم خان کو اس بات کا خیال کبھی نہیں آیا تھا' اسے ولیم سلومن کو مطمئن کرنے کے لیے بہت زیادہ پوچھ گچھ کرنی پڑی تھی آخر دو ایک بڑے بوڑھوں سے اسے جو معلومات حاصل ہوئی تھیں وہ کچھ اس طرح تھیں کہ فرنگیا کی پیدائش کے وقت فرنگیا کی ماں اپنے میکے کے ایک رشتے دار رائے سنگھ کے یہاں رہتی تھی۔ رائے سنگھ ایک انتہائی بدوضع اور ضدی آدمی تھا۔ اس پر کافی سرکاری قرض چڑھا ہوا تھا جو وہ ادا کرنے کا نام بھی نہیں لیتا تھا۔ اپنے قرض کی وصولیابی کے لیے ایک دن کمپنی سرکار نے نوٹس کے ساتھ چند سپاہیوں کو اس کے گھر کی کرکی کے لیے بھیج دیا۔ تب رائے سنگھ نے گاؤں کے بہت سارے لوگوں کے ساتھ کمپنی افسر کو للکارتے ہوئے کہا تھا۔ "مجھے دیکھنا ہے کہ تم لوگ میرے گھر میں کس طرح داخل ہوتے ہو؟"

لیکن سرکاری طاقت کے آگے وہ زیادہ دیر تک نہ ٹک سکا اس کش مکش میں دو چار آدمی شدید زخمی بھی ہوئے رائے سنگھ کو سبق سکھانے کے لیے کمپنی سرکار کے سپاہیوں نے اس کے گھر کو آگ لگا دی۔ اس افراتفری کے عالم میں فرنگیا کی ماں فرنگیا کو اپنے پیٹ میں نہ رکھ سکی اور وہ مقررہ وقت سے دس دن قبل ہی پیدا ہو گیا۔ اس زمانے میں انگریز قوم فرنگی کہلاتی تھی اور اس طرح اس کی ماں نے اس کا نام فرنگیا رکھ دیا۔

نام کے پیچھے چھپے ہوئے راز سے واقف ہونے کے بعد ولیم سلومن نے جو پیش گوئی کی تھی وہ بھی رستم خان کو یاد آ گئی تھی۔ اس وقت ولیم سلومن نے کہا تھا کہ فرنگیا کی پیدائش میں اگر انگریزوں کا ہاتھ ہے تو اس کی موت بھی انگریزوں کے ہی ہاتھوں سے ہوگی۔

"کس سوچ میں پڑ گئے ہو رستم خان؟" ولیم سلومن نے صوبیدار کو چونکاتے ہوئے کہا۔ "فرنگیا کے سوتیلے بھائی سے ہمیں کچھ نہ کچھ تو ضرور ہی معلوم ہوگا۔"

"میرا بھی یہی خیال تھا جناب۔" رستم خان نے سر اٹھا کر جواب دیا۔ "تیس میل کے سفر کے دوران میں نے اسے سب لوگوں سے الگ رکھ کر سمجھایا بھی اور دھمکایا بھی لیکن وہ بھی بہت زیادہ ضدی نکلا میرے ہر سوال کا اس کے پاس ایک ہی جواب ہے "سوتیلا بھائی ہوں تو کیا ہوا بغر فرنگیا کے خلاف آپ ایک بھی لفظ میری زبان سے نہیں سن سکے گیں۔ آپ چاہیں تو میری زبان کاٹ لیں اور چاہیں تو مجھے پھانسی پر لٹکا دیں۔"

"اچھا۔" ولیم سلومن کو حیرت سی ہوئی کیوں کہ اب تک بہت سارے ٹھگ اس کے آگے اپنا سر جھکا چکے تھے اور زندہ رہنے کے لیے اپنے ٹھگ بھائیوں کو گرفتار کرانے پر بھی آمادہ ہو گئے تھے۔ ممکن ہے فرنگیا کا بھائی ایسا نہ کرے۔

"رستم خان۔ کیا فرنگیا کو اس بات کا علم ہے کہ ہم نے پولیس کا دستہ اس کے گھر روانہ کیا ہے؟" اچانک اس نے رستم خان سے پوچھا۔

"نہیں جناب یہ بات اسے کیسے بتائی جاتی؟" رستم خان کی سمجھ میں ولیم سلومن کی بات نہیں آئی تھی۔ "وہ تو اس خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ اس کے گھر والوں کے بارے میں ہمیں کوئی علم ہی نہیں ہے۔"

"گڈ۔" ولیم سلومن اب اپنے اصل مقصد پر آ گیا "تو پھر یہ اندازہ بہ آسانی لگایا جا سکتا ہے کہ فرنگیا بھاگ کر کہاں گیا ہوگا؟"

"فرنگیا بھاگ کر اپنے گھر ہی جائے گا۔" رستم خان کی آنکھوں میں ایک چمک سی لہرا گئی۔

"بس تو پھر۔" ولیم سلومن نے پرجوش انداز میں میز پر گھونسہ مارتے ہوئے کہا "یہاں سے بچ نکلنے والا ہمارے آدمیوں کے ہاتھوں وہیں گرفتار ہو جائے گا۔"

"ہوں۔" رستم خان کا منہ کھلا رہ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ شائد ولیم سلومن عود کو تسلی دینے کے لیے ایسا کہہ رہا ہے یا پھر ممکن ہے کہ تقدیر ہی فرنگیا سے روٹھ گئی ہو لیکن قبل از وقت کچھ کہنا مشکل تھا کہ کیا ہوگا؟

ولیم سلومن اپنے کام میں مصروف ہو گیا گرفتار کیے جانے والے اٹھائیس ٹھگوں سے پوچھ گچھ شروع ہو گئی اس نے خاص طور پر یہ جاننے کی کوشش کی تھی کہ ان میں سے کتنے ایسے ٹھگ ہیں جو آسانی سے اس سے تعاون کرنے پر آمادہ ہو سکتے ہیں کیوں کہ جب ٹھگوں کا مقدمہ عدالت میں پیش ہوتا تھا تو اسے کئی گواہوں کی ضرورت پڑتی تھی۔ ان گواہوں کے بغیر ٹھگوں کے خلاف کوئی ثبوت مہیا کرنا تقریباً ناممکن تھا اور ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے بے شمار ٹھگ قانون کی گرفت سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ یوں تو ولیم سلومن نے گورنر جنرل سے کافی اختیارات حاصل کر لیے تھے لیکن پھر بھی ثبوت کے بغیر کسی کو سزا دلوانے کا اختیار اسے نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ آدمی ہمیشہ اپنی موت سے ڈرتا ہے اسی لیے وہ ہمیشہ اسی بات کا سہارا لے کر چھوٹے موٹے ٹھگوں کو ڈرایا کرتا تھا۔ "تمھیں موت پسند ہے یا زندہ رہنا ہے؟ زندہ رہو گے تو کبھی نہ کبھی جیل سے رہا ہو جاؤ گے۔" اتنا کہنے کے بعد وہ ان کی دوسری کمزوری پر ہاتھ رکھ کر آگے کہتا "سرکار سے تعاون کرو گے تو سرکار تمھارے بال بچوں کی حفاظت کرے گی، ان کی پرورش کرے گی اور انھیں ہر جگہ جانے آنے کی آزادی فراہم کرے گی۔"

ولیم سلومن کی یہ ترکیب بڑی حد تک کامیاب ثابت ہوئی تھی۔ ٹھگ لوگ اسے اپنا جانی دشمن سمجھتے تھے لیکن اس کے باوجود وہ اس پر بھروسا کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے لیکن فرنگیا کا سوتیلا بھائی جائیرو گورے صاحب کی لالچ اور دھمکیوں سے متاثر ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا ولیم سلومن نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔ "اگر تم نے فرنگیا کی گرفتاری میں ہماری مدد کی تو ہم تمھیں پھانسی سے بچا لیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ مگر مجھے پھانسی نہیں ہوگی تو میرے بھائی کو آپ لوگ پھانسی دے دے گیں اس میں فرق ہی کیا ہے؟" جائیرو نے جواب دیا تھا۔

"تمھارے بھائی کو تو پھانسی ہو گی ہی۔" ولیم سلومن نے دلیل دیتے ہوئے کہا۔ "ممکن ہے اس وقت تک وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ گرفتار بھی ہو چکا ہو، ہمیں اس کے گھر کا پتا چل چکا تھا اور دو سو سپاہی اس کے گھر بھیجے جا چکے ہیں۔" ولیم سلومن کا خیال تھا کہ اس کی یہ بات سن کر جائیرو

بوکھلا جائے گا اور ٹوٹ کر سب کچھ اُگل دے گا لیکن اُس کا یہ اندازہ غلط ثابت ہوا کیوں کہ اُس نے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر جواب دیتے ہوئے کہا تھا" تو پھر جناب اُس کی گرفتاری کے لیے آپ مجھے کیوں لالچ دے رہے ہیں ؟ جب تک آپ کے سپاہی خالی ہاتھ واپس نہیں آجاتے اُس وقت تک تو آپ کو انتظار کرنا ہی چاہیے۔"

اُس کی اِس بات نے سلومن کے دل میں غصّے کی آگ اور زیادہ بھڑکا دی اور وہ غضب ناک لہجے میں بولا" بے وقوف اگر تمھیں مرنا ہی ہے تو مجھے تم سے ہمدردی کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔" اتنا کہہ کر وہ پلٹا اور جاتے جاتے بولا" لیکن یہ بات یاد رکھنا کہ اگر تمھیں ایک بار عدالت سے سزا مل گئی تو پھر تم کچھ بھی نہیں کر سکو گے۔"

جواب میں فرنگیا کا بھائی جاہرو ایک زہریلی ہنسی ہنسا یوں لگ رہا تھا کہ اپنی موت کی سزا سننے کے بعد بھی وہ اسی طرح ہنستا رہے گا۔

● بھانسی جانے والا پولیس کا دستہ بھانسی سے واپس آگیا ہے یہ اطلاع جب ولیم سلومن کو ملی تو وہ فوراً ہی کچہری تک دوڑا آگیا۔ رسیوں میں جکڑے ہوئے فرنگیا کو دیکھنے کے لیے اُس کی آنکھیں بے چین ہو رہی تھیں۔ فرنگیا کی گرفتاری کے جس منظر کو وہ دیکھنا چاہتا تھا اُس کا تصوّر وہ گھر سے لے کر کچہری تک کے راستے میں کرتا رہا تھا لیکن کچہری کے اُس میں داخل ہوتے ہی اُسے دو پالکیوں کے قریب کھڑے ہوئے حوالدار کی روتی صورت دیکھنے کو ملی اس روتی صورت پر نظر پڑتے ہی اُس کے تصوّر کا آئینہ ریزہ ریزہ ہو گیا۔ وہ جب اپنے کمرے میں آکر بیٹھ گیا تو حوالدار آہستہ سے اُس کے کمرے میں داخل ہوا۔

" کام ہو گیا نا؟" ولیم سلومن زبردستی ہنستے ہوئے بولا" میں تو پالکیاں دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا کہ فرنگیا کے گھر والے گرفتار ہو چکے ہیں۔"

" لیکن جناب!" حوالدار لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولا" فرنگیا ایک ذرا سی غلطی کی وجہ سے ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔"

" ذرا سی غلطی" ولیم سلومن نے حیرت سے پوچھا" اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب آپ لوگ وہاں پہنچے تو وہ اپنے گھر میں موجود تھا۔"

" ہاں جناب!" مجرم کی طرح حوالدار نے اس سے نظر ملا کر اپنا سر جھکا دیا۔" فرنگیا اسی شام کو اچانک ہی پہنچ گیا تھا۔ شائد اسے پہلے ہی سے اطلاع مل چکی تھی۔ ہمارے ہوشیار رہتے۔ ہمارے دو سو سپاہیوں کے دستے کو دیکھ کر آدھی رات کو ہی سارا گاؤں جاگ گیا۔ ہم نے اس کے دروازے پر دستک دی لیکن جب دروازہ کھلنے میں دیر ہوئی تو ہمارے دو سپاہی دیوار پھاند کر اندر کود گئے مگر انھیں دیر ہو چکی تھی۔ گھر کی تلاشی لی گئی تو انھیں بتایا گیا کہ فرنگیا کا بستر ابھی تک گرم ہے۔ اس کا پستول اور اس کی بندوق بستر کے قریب ہی پڑی تھیں۔ ہمارے آنے کی اطلاع ملتے ہی وہ ہتھیار چھوڑ کر پچھلے دروازے سے نکل بھاگا۔" آخری الفاظ بولتے وقت حوالدار کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ ولیم سلومن نے خود کو قابو میں رکھنے کی بہت کوشش کی لیکن فرنگیا کو دوسری بار کھو دینے کے صدمے کو وہ زیادہ دیر تک دبانے میں کامیاب نہیں ہوا۔ کھڑکی سے باہر نظر ڈال کر اس نے صحن میں رکھی ہوئی دونوں پالکیوں کو دیکھا۔ اب ان دونوں عورتوں پر ہی فرنگیا کی گرفتاری کا دارومدار تھا۔ وہ سوچ رہا تھا جب تک یہ عورتیں اس کے قبضے میں ہیں۔ اس وقت تک فرنگیا چین سے جی نہیں سکے گا جس شخص نے اب تک سینکڑوں مردوں اور عورتوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہو۔ اس کے خاندان سے بھی سب لوگ نفرت کرنے لگتے ہیں لیکن ولیم سلومن کے اندر ایسے کوئی جذبات نہیں تھے۔ کیا خبر یہ بے چاری فرنگیا کی اصلیت سے واقف بھی ہیں یا نہیں؟

اپنے خیالات کو سمیٹنے کے لیے ولیم سلومن نے کھڑکی کے باہر سے اپنی نظریں ہٹا لیں۔ حوالدار کی آنکھوں کے آنسو ابھی خشک نہیں ہوئے تھے۔ یہ دیکھ کر ولیم سلومن کو یاد آیا کہ اس نے رستم خان کو دلاسا دینے کی ابھی تک کوشش نہیں کی ہے۔ اس خیال کے آتے ہی وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور آگے بڑھ کر حوالدار کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دھیرے سے بولا" اس میں افسوس کرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ رنجیت سنگھ تمھارے سپرد جو کام کیا گیا ہے اسے تم نے خوش اسلوبی سے پورا کیا ہے۔"

حوالدار کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ سی دوڑ گئی جیسے ولیم سلومن کے ان الفاظ نے اسے بڑی تقویت پہنچائی ہو لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، ولیم سلومن کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔" جاؤ اب ان عورتوں کو جیل خانے تک پہنچا دو۔ لیکن دیکھنا انھیں کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ ہو اور نہ ہی ان سے ظالمانہ سلوک روا رکھا جائے۔"

" جو آپ کا حکم جناب!" حوالدار نے سر جھکا کر کہا اور پھر سلام کرتا ہوا باہر نکل گیا۔

● دوسرے ہی دن فرنگیا کے سوتیلے بھائی جاہرو کو پھانسی کے تختے پر لٹکایا جانے والا تھا۔ ولیم سلومن کے دل میں رہ رہ کر یہ امید پیدا ہوتی جا رہی تھی کہ آخری وقت میں شائد جاہرو کی ہمت جواب دے جائے گی اور وہ رو رو کر اپنی زندگی کی بھیک مانگنے لگے گا۔ جب جاہرو کو پتا چلا کہ اس کی سوتیلی ماں اور فرنگیا کی بیوی کو ولیم سلومن صاحب نے گرفتار کر لیا ہے تو وہ ایک دم اداس ہو گیا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر رستم خان نے ولیم سلومن کو اطلاع دی۔ اس اطلاع کی روشنی میں ولیم سلومن کو ایک ترکیب سجھائی دے گئی۔ اس نے رستم خان سے کہا" اب جا کر اس سے پوچھیے کہ کیا اسے اپنی سوتیلی ماں سے ملنا ہے؟" جاہرو یہ بات سن کر پہلے تو خوش ہوا پھر اچانک ہی اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں اور وہ گلوگیر آواز سے بولا" ہاں میں مرنے سے قبل ایک بار ان کے قدموں کو چھونا چاہتا ہوں۔"

جیل کے اندر ہی سوتیلی ماں اور سوتیلے بیٹے کی ملاقات کا انتظام کیا گیا تھا۔ اس ملاپ کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے اور ان دونوں کی گفتگو کو اپنے کانوں سے سننے کے لیے ولیم سلومن نے خاص انتظام کیا تھا۔ اس نے پہریداروں سے کہہ دیا تھا کہ اس کی موجودگی کا ان دونوں کو علم نہ ہونے پائے اور وہی ماں بیٹے کی ملاقات کے وقت کوئی ان کے قریب موجود ہو وہ خود بھی وقت سے بہت پہلے ایک جگہ چھپ کر بیٹھ گیا تھا۔

" ماں!" ایک روہانسی آواز کے ساتھ اس نے لوہے کی بیڑیوں کی کھڑکھڑاہٹ کی آواز سن کر دیوار کے سوراخ پر آنکھ چپکا دی۔ فرنگیا کی ماں اسے بہت زیادہ بوڑھی نہیں لگی۔ اس کا چہرہ اب بھی پیتل کی طرح دمک رہا تھا۔ جوانی میں وہ کتنی خوبصورت ہو گی، اس کا اندازہ اب بھی اس کے چہرے کو دیکھ کر لگایا جا سکتا تھا۔ فرنگیا کی ماں کو دیکھ کر ولیم سلومن فرنگیا کے تصوّر میں کھو گیا۔ کیا وہ بھی اتنا ہی خوبصورت ہو گا؟ بیڑیوں میں جکڑے ہوئے اپنے سوتیلے بیٹے کو دیکھ کر ماں کے چہرے کی شکنیں اُبھر آئیں۔ لیکن اس نے ابھی تک بڑے ضبط اور تحمل کا ثبوت دیا تھا۔ جاہرو دوڑ کر ماں کے قدموں میں گر پڑا۔ ماں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے دھیرے سے اٹھایا۔ اور دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام کر دیکھنے لگی کہ بیٹے کی آنکھوں میں آنسو تو نہیں نا؟ لیکن جاہرو کی آنکھیں بالکل سوکھی ہوئی تھیں۔

" ماں!" مرد کی آواز میں بچے جیسی آواز کی مٹھاس تھی " بچپن سے ہی تم نے میری پرورش کی، مجھے پال پوس کر بڑا کیا لیکن میں تمھیں اس احسان کا بدلہ نہ دے سکا۔" سوتیلے بیٹے کے سر پر سوتیلی ماں کا ہاتھ پھر رہا تھا اور جاہرو سسکیوں کے درمیان کہہ رہا تھا۔" اب مرنے سے پہلے مجھ پر ایک اور احسان بھی کر دو ماں، تم مجھے اس جرم کی معافی دو ماں۔"

جاہرو کی آہ و زاری سن کر دیوار کے پیچھے کھڑے ہوئے ولیم سلومن کی آنکھیں بھی نم ہو چکی تھیں۔ ایک خطرناک قاتل اور بے رحم ٹھگ اپنے جرم کی اپنی سوتیلی ماں سے معافی مانگ رہا تھا۔

" بیٹے اچانک یہ آفت کیسے نازل ہو گئی؟ میں تو کچھ جانتی بھی نہیں۔" ماں کی یہ بات سن کر ولیم سلومن کی آنکھوں میں امید کی ایک کرن سی لہرائی گئی کہ شاید اب کچھ چھپی باتیں سننے کو ملیں گی لیکن فرنگیا کی ماں کے اگلے جملے نے اس کی اس امید پر بھی پانی پھیر دیا۔ وہ کہہ رہی تھی۔" بیٹے! ماں اور بیٹے کے درمیان پردہ کیسا؟ بھگوان نے اگر تمھارے لئے موت بھیجی ہے تو ہنستے ہنستے موت کو گلے سے لگا لو۔"

ولیم سلومن کو اپنی سانس رکتی ہوئی محسوس ہوئی تھوڑی دیر دوسری جانب سناٹا چھایا رہا۔ اس نے دیوار کے سوراخ سے جھانکا تو جاہرو دوسری بار ماں کے قدموں کو چھو کر ماتھے پر اپنا ہاتھ لگا رہا تھا۔ پھر اچانک ہی اس نے دیکھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے الگ ہو گئے ہیں۔ اب ان دونوں

کی پیٹھ ہی اسے نظر آرہی تھی۔ لیکن اتنا تو اسے معلوم ہی ہو چکا تھا کہ اُن دونوں کی ہی آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے۔ ماں بیٹے سے اپنے آنسو چھپانے کے لیے ہی شائد اپنا منھ پھیرے ہوئے تھی۔ یہ منظر دیکھ کر ولیم سلومن ایک سرد آہ بھر کر رہ گیا۔

●

"تو اس نے میرے بھائی کو پھانسی پر چڑھا دیا؟" فرنگیا غصّے سے کانپ رہا تھا۔ میری بوڑھی ماں، میری بیوی اور معصوم بچّی کو اس نے جیل میں دھکیل دیا۔ کیا وہ یہ سمجھتا ہے کہ میں خود کو اس کے حوالے کر دوں گا۔ لیکن یہ اس کی بھول ہے۔ یہ فرنگیا تو اس کی زندگی اجیرن کر کے رکھ دے گا۔"

فرنگیا انتقام لینے کے لیے بے چین ہو رہا تھا آج تک اس نے بدلہ لے کر کسی کو قتل نہیں کیا تھا۔ مگر اب وہ گھڑی آن پہنچی تھی۔ لیکن وہ سوچ رہا تھا کہ ولیم سلومن سے بدلہ کس طرح لیا جائے؟ یہ سوال اسے بہت ستانے لگا تھا۔ ماں بیوی اور بچی پر کوئی آنچ نہیں آنی چاہیئے۔ سب سے پہلے تو اسے ان سب کو جیل سے رہائی دلانے کی ضرورت ہے۔ لیکن کس طرح؟

اس کے گھر والوں کو گورے صاحب نے ساگر جیل میں قید کر رکھا ہے۔ یہ معلومات حاصل کرنے کے بعد وہ بھیس بدل کر ساگر کے آس پاس والے گاؤں میں گھومنا شروع کر دیا تھا۔ جیل میں آنے جانے والوں سے گٹھ جوڑ کر کے اس نے اپنی ماں، بیوی اور بچی کی خیریت معلوم کر لی تھی۔ اسے یہ جان کر قدرے اطمینان ہوا تھا کہ جیل میں ان لوگوں پر کوئی ظلم نہیں ہوتا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اسے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ جب تک ولیم سلومن فرنگیا کو گرفتار نہیں کر لے گا، اس وقت تک وہ اس کے گھر والوں کو رہا نہیں کرے گا۔

اور یہ بات فرنگیا کے دل میں چبھ رہی تھی۔ پہلے تو اس نے ولیم سلومن کو ہی ختم کر دینے کا فیصلہ کیا۔ لیکن ایسا کرنے سے تو اس کے گھر والوں پر اور زیادہ مصیبت نازل ہونے کا خطرہ تھا۔ اس خیال سے اس نے سلومن کے قتل کا ارادہ منسوخ کر دیا۔ سوچتے سوچتے اچانک ایک ترکیب اس کی سمجھ میں آ ہی گئی۔ اسے یاد آیا کہ ولیم سلومن آج کل ساگر شہر میں رہ رہا ہے جبکہ اس کی میڈم جبل پور میں تنہا مقیم ہے تو کیوں نہ وہ اس کی میڈم ہی کو اغوا کر کے لے جائے۔ اگر ایسا ہو گیا تو گورے صاحب ولیم سلومن کو پتا چل جائے گا کہ مردوں کی لڑائی میں گھر کی عورتوں کو درمیان میں لانے کا کیا نتیجہ نکلتا ہے!

جیسے جیسے فرنگیا اس ترکیب پر غور کرتا گیا ویسے ویسے اس کا ارادہ مضبوط سے مضبوط تر ہو گیا۔ پھر اس نے فیصلہ کر لیا کہ میڈم کے بدلے میں وہ اپنی ماں، بیوی اور بچی کی رہائی کا مطالبہ کرے گا۔ وہ ولیم سلومن سے کہے گا کہ اس کے گھر والوں کو بہ حفاظت راجپوتانہ پہنچا دیا جائے تو اس کی بیوی صحیح سلامت اسے واپس مل جائے گی۔ اگر یہ کام خوش اسلوبی اور کامیابی سے انجام پا گیا تو پورے ہندوستان میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل جائے گی اور ولیم سلومن زندگی میں پھر کبھی کسی ٹھگ کا نام نہیں لے گا۔ ممکن ہے کہ وہ یہ ملک چھوڑ کر ولایت بھاگ جائے۔ یہ سب باتیں سوچ لینے کے بعد فرنگیا کافی دنوں بعد دانت پیس کر مسکرانے لگا تھا۔

●

ولیم سلومن کی نوجوان بیوی کو اغوا کرنے کی ترکیب تو فرنگیا نے بہت جلدی سوچ لی تھی لیکن اس میں اس کا ساتھ دینے والے کسی باہمت آدمی کا ملنا اسے مشکل نظر آ رہا تھا جب اس نے اپنے کئی ساتھیوں کے سامنے اپنی یہ تجویز رکھی تو اسے کسی طرف سے کوئی داد نہیں ملی۔ جو ٹھگ اپنے سردار کا ہر حکم کچھ سوچے سمجھے بغیر مان لیا کرتے تھے وہی اب اس کی اس تجویز کو ہنسی میں اڑا دینے کی کوشش کر رہے تھے ان میں سے ایک ٹھگ نے تو کہا تھا۔ "ہنسی مذاق کے لیے یہ کھیل تو دلچسپ ہے۔ ویسے ہم لوگ تو ٹھگ ہیں سفر میں نکلتے ہیں تو مسافروں کو ختم کرنا ہمارا دھرم بن جاتا ہے۔ ہم کسی کی بیوی کو اس کے گھر سے کیسے اٹھا سکتے ہیں! اور گوری میڈم کو تو ہم ہاتھ بھی نہیں لگائیں گے۔"

ٹھگ، ڈاکو، اور لٹیروں کے خوف کے درمیان بھی انگریز عورتیں اپنے بال بچوں کے ساتھ لمبے لمبے سفر پر جایا کرتی تھیں اور کوئی ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا۔ کیپٹن مانسل کے سوا آج تک کسی انگریز مرد کو کسی نے قتل بھی نہیں کیا تھا۔ کیونکہ انگریز سرکار کی دھاک رعایا

پر پوری طرح بیٹھی ہوئی تھی۔ ٹھگ اور لٹیرے اس بات کا خاص خیال رکھتے تھے کہ انگریز مسافروں کو ذرا سی بھی آنچ نہ آنے پائے۔ وہ سب یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ انگریز سرکار کو دیسی رعایا کی اتنی پرواہ نہیں ہے۔ لیکن اپنے ایک گوری چمڑی والے کے لیے وہ زمین آسمان ایک کر سکتی ہے۔

لیکن فرنگیا پیچھے ہٹنا نہیں چاہتا تھا۔ جیسے بھی ہو وہ یہ کام ہر قیمت پر پورا کرنا چاہتا تھا۔ اس کے دماغ پر یہ کام ایک جنون کی طرح سوار ہو چکا تھا۔ کسی کا ساتھ نہ ملے تب بھی وہ یہ کام انجام دے دینا چاہتا تھا مگر یہ ممکن نہیں تھا۔ گوری عورت کو گھوڑے کی پیٹھ پر بٹھا کر وہ اگر بھاگ بھی جاتا ہے تو بھی زیادہ دور تک بھاگ نہیں سکتا۔ کم از کم چار ایسے آدمیوں کی ضرورت تو تھی ہی جو پالکی اٹھا سکیں۔ ایک بار اگر میڈم کو پالکی میں ڈال دیا گیا تو پھر کسی کو بھی شک نہیں ہوگا اور ایک آدھ دن تک تو کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا کہ میڈم کا اغوا ہوا ہے۔ اس کا تو کسی کو خیال بھی نہیں آئے گا کہ میڈم کے غائب ہو جانے میں اس کا ہاتھ بھی ہو سکتا ہے۔

فرنگیا نے اپنے مخبر کے ذریعہ ولیم سلومن کی نوجوان بیوی کے متعلق بہت ساری معلومات اکٹھی کر لی تھیں۔ اس کی اطلاع کے مطابق ولیم سلومن کی بیوی گھوڑے پر اکیلے سیر و تفریح کے لیے جاتی ہے۔ اکثر وہ گنّوں کے کھیتوں میں گھنٹوں بیٹھی رہتی ہے۔ اور کبھی کبھی کسی انگریز کے گھر جانے وغیرہ پینے کے لیے چلی جاتی ہے۔ کبھی کبھی تو اسے گھوڑا دوڑانے کی دُھن بھی سوار ہو جاتی ہے اور اس دھن میں وہ پورے گاؤں کا چکر بھی لگا لیتی ہے۔ کسی کو اپنی حفاظت کے لیے اپنے ساتھ رکھنا اسے پسند نہیں ہے لیکن اپنی کمر میں ریوالور ضرور رکھتی ہے۔ لیکن خیر یہ تو جنگلی جانوروں سے حفاظت کے لیے ہے۔ ویسے کوئی جنونی آدمی اس کھلونے سے نہیں ڈرتا۔ ان ساری معلومات نے ہی فرنگیا کی ہمت بڑھا رکھی تھی۔ ولیم سلومن کی بیوی کو گلاب کے پھول بہت ہی پسند ہیں۔ یہ بات فرنگیا نے خاص طور پر یاد رکھی ہوئی تھی۔ اس نے سارا منصوبہ سوچ رکھا تھا۔ جو کچھ اس طرح تھا کہ جب شام کے وقت میڈم سنسان سڑک پر نکلے گی تو وہ بھیس بدل کر ایک جگہ چھپ جائے گا اور یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ آس پاس کوئی موجود تو نہیں ہے وہ اپنی جگہ سے نکل کر گلاب کے پھولوں کا ایک خوبصورت گلدستہ دکھا کر میڈم کو روکے گا اور زبردستی پھولوں کا گلدستہ دکھا کر لینے پر مجبور کر دے گا۔ کسی بھی شخص کو پھول دیا جائے تو وہ سب سے پہلے اسے سونگھتا ضرور ہے۔ ولیم سلومن کی بیوی بھی پھول سونگھے گی تو سونگھتے ہی اس کی کھوپڑی گھومنے لگے گی پھر تھوڑی ہی دیر میں وہ گھوڑے کی پیٹھ پر جھومنے لگے گی اور تب وہ اسے آرام سے نیچے اتار لے گا۔ وہاں پالکی والے تیار ہی کھڑے ہوں گے۔ ان کی مدد سے میڈم کے ہاتھ پاؤں اور منھ باندھ کر وہ اسے پالکی میں سُلا دے گا۔ پھر کوئی خطرہ باقی نہیں رہے گا۔ جب اسے ہوش آئے گا تو وہ بہت دور نکل چکے ہوں گے۔

●

ایک چھوٹے سے گاؤں کے جاگیردار نے اپنے چار آدمیوں کے ساتھ پالکی دینے کی حامی بھر لی تو فرنگیا کی ساری الجھن دور ہو گئی۔ اس نے جاگیردار کو اصل بات نہیں بتائی تھی بلکہ اس نے جاگیردار کو صرف اتنا بتایا تھا کہ مجھے ایک خوبصورت عورت کو بھگا کر لے جانا ہے۔ مجھے چار آدمی اور ایک پالکی کی ضرورت پڑے گی۔ اس جاگیردار کو اکثر فرنگیا کی طرف سے قیمتی تحفے ملتے رہتے تھے اس لیے اس نے حامی بھر لی تھی۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے ایک راجپوت کا بھیس بدل لیا۔ اور پالکی والوں کے ساتھ جبل پور کے راستے پر چل پڑا۔

●

"آیئے رستم خان تشریف رکھیے۔" اپنے مخبر کو روانہ کرنے کے بعد ولیم سلومن نے صوبیدار رستم خان کو بیٹھنے کا اشارہ کیا آٹھ دس روز کے طویل انتظار کے بعد اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا اس لیے پہلی بار اس نے ذرا سخت لہجے میں پوچھا۔ "کیا بات ہے صوبیدار صاحب! فرنگیا تو ہماری ہر چال کو مسلسل مات دے رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ ساگر سے بہت دور نہیں گیا ہے۔ اس جیسا خطرناک آدمی ایک لمبے عرصے تک نزدیک رہ کر بھی آزاد رہے یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔"

اتنا کہہ کر وہ تھوڑی دیر کے لیے رکا اور قلم سے کاغذ پر الٹی سیدھی لکیریں کھینچتا رہا پھر بولا: "کہیں وہ اپنے گھر والوں کی رہائی کے لیے کوئی چال تو نہیں سوچ رہا ہوگا؟"

رستم خان کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ سخت پہرے کے ہوتے ہوئے کسی کو جیل کے اندر سے نکال کر لیجانا بہت آسان نہیں تھا۔ فرنگیا اگر کوئی حماقت کرنے کی کوشش کرتا ہے تو خود اس کے پھنس جانے کے امکانات پیدا ہو جاتے ہیں۔ رستم خاں خود بھی اتنے دنوں سے کسی ایسے ہی موقع کی تلاش میں تھا لیکن اب اس کی یہ امید بھی دم توڑنے لگی تھی جب کافی دنوں تک فرنگیا کی جانب سے کوئی پیش قدمی نہیں ہوئی تو اسے یقین ہو گیا کہ فرنگیا اس علاقے سے کہیں دور نکل گیا ہے۔ وہ شائد یہ بات سمجھ گیا ہوگا کہ سرکار اس کے گھر والوں کو آسانی سے چھوڑنے والی نہیں ہے اور نہ ہی وہ ان کی رہائی کے لیے کوئی اقدام کر سکتا ہے۔ اُسے شائد اس بات کا بھی یقین ہوگا کہ سلومن صاحب اس کے گھر والوں کو کوئی تکلیف نہیں دے گا۔ اس اطمینان کو مدِ نظر رکھ کر وہ اپنی جان بچانے کے لیے کہیں چھپ کر بیٹھ گیا ہوگا۔ رستم خان اپنے ان خیالات کا اظہار ولیم سلومن سے کر چکا تھا۔ لیکن ولیم سلومن کے گلے سے اس کے خیالات نہیں اترے۔ اس کا تو یہی کہنا تھا کہ فرنگیا اسی علاقے کے آس پاس کہیں موجود ہے اور ہماری ایک ایک حرکت پر نظریں جمائے بیٹھا ہے۔

صوبیدار رستم خان کو یہ بات بڑی ہی خطرناک لگ رہی تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ کیا فرنگیا بدلہ لینے کی تیاریاں کر رہا ہے؟ اگر ایسی بات ہے تو انھیں بہت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ جنون میں آ کر سلومن صاحب پر ہی وار کر بیٹھے۔

میز پر نقشہ پھیلا کر ولیم سلومن جگہ جگہ سرخ پنسل سے نشانات لگاتا جا رہا تھا۔ ہر ایک سرخ نشان والی جگہ پر ہمیں اپنے پانچ دس سپاہی بیٹھا دینے چاہئیں۔ اگر انھیں کسی بات کا کوئی علم ہو جائے تو وہاں سے ایک آدمی آ کر ہمیں اطلاع کر دے اور بقیہ آدمی اپنی جگہ سے نہ ہٹیں۔ یہ ہدایت دینے کے بعد ولیم سلومن ایک پل کے لیے رُکا پھر کچھ سوچتے ہوئے آگے بولا۔ "ہمیں آٹھ دس گھنٹوں کے اندر ہی اندر فرنگیا کو گرفتار کر لینا چاہیے۔" اس نے نقشہ رستم خان کی طرف بڑھا دیا اور اٹھ کھڑا ہو گیا لیکن ابھی وہ کچہری کے باہر نکلنے بھی نہ پایا تھا کہ ایک شخص اندر داخل ہوتا دکھائی دیا۔

"ارے گوپال تم؟" اپنے جبل پور والے گھر کے ملازم کو دیکھ کر ولیم سلومن بُری طرح چونک پڑا۔ "میم صاحب تو خیریت سے ہیں نا؟"

"ہاں صاحب سب خیریت ہے۔" گوپال نے ایک خط نکال کر سلومن صاحب کی طرف بڑھا دیا۔ "میں یہ خط آپ تک پہنچانے کے لیے آیا ہوں۔" ولیم سلومن جلدی جلدی کاغذ کھولنے لگا تو رستم خان بھی نقشے پر سے اپنی توجہ ہٹا کر ولیم سلومن اور گوپال کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ ولیم سلومن خط پڑھنے کے بعد ایک لمحے کے لیے اداس ہو گیا مگر دوسرے ہی پل وہ مسکراتا ہوا بولا: "گوپال اتنی ذرا سی بات کے لیے میم صاحب نے تمھیں یہاں تک دوڑا دیا؟"

لیکن گوپال چپ چاپ کھڑا رہا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ میڈم کا کوئی انتہائی اہم کام انجام دینے آیا ہے۔ لیکن ولیم سلومن کے چہرے پر اس قسم کے کوئی تاثرات دکھائی نہیں دیے۔

"رستم خان" خط کے کاغذ کو جیب میں رکھتے ہوئے ولیم سلومن نے صوبیدار رستم خان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "آج مجھے یہاں کوئی خاص کام نہیں ہے۔ اس لیے ایک دن کے لیے میں جبل پور جانا چاہتا ہوں۔" پھر تھوڑی دیر رک کر آگے بولا: "دیر ہو گئی تو دوسرے دن آ جاؤں گا۔"

رستم خان کو حیرت سی ہو رہی تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ ولیم سلومن ضرور کچھ چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔ کچھ نہ کچھ تو ضرور ہی ہوا ہے۔ نہیں تو میڈم کے پاس جانے کی بجائے وہ خود اُسے یہاں بلوا لیتا۔ رستم خان تھوڑی دیر تک اندازے لگاتا رہا پھر دل ہی دل میں یہ سوچ کر مسکرانے لگا کہ شائد یہ گورا صاحب اپنی جوان میڈم کی تنہائی دور کرنے کے لیے اس کے پاس جا رہا ہو۔ اس خیال کے آتے ہی وہ دوبارہ نقشے کی جانب متوجہ ہو گیا۔

●

"ٹھاکر یہاں پانی وانی پی کر ذرا دیر آرام کر لینا چاہیے۔" پالکی اٹھا کر چلنے والوں میں سے ایک نے کہا۔ "جبل پور اب

یہاں سے صرف چار کوس کے فاصلے پر ہے۔"

راجپوتی لباس میں ملبوس گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھا ہوا فرنگیا نہیں چاہتا تھا کہ اب کہیں رُک کر وقت ضائع کیا جائے۔ لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکا۔ وہ اس طرح خالی پالکی کے ساتھ سفر کر رہا تھا جیسے وہ بھری ہوئی ہو۔ جبل پور پہنچنے تک وہ کسی کو اس بات کا علم نہیں ہونے دینا چاہتا تھا کہ پالکی میں کوئی سواری موجود نہیں ہے اور اسی لیے اس نے پالکی کے اندر چاول کی بوری رکھوا دی تھی تاکہ دیکھنے والوں کو اس کے وزنی ہونے کا احساس ہو سکے۔ پالکی اٹھانے والوں نے تھوڑی دیر آرام کر لیا تو فرنگیا نے انھیں آواز دیتے ہوئے کہا: "چلو اب جبل پور چل ہی پیٹ پوجا کریں گے۔ وہاں پہنچ کر تم لوگ جی بھر کر آرام کر لینا۔" لیکن ابھی وہ اپنے گھوڑے پر چڑھنے ہی والا تھا کہ اسے دور سے کچھ گھوڑ سوار آتے دکھائی دیئے۔ فرنگیا نے سر پر آئی ہوئی دھوپ سے بچنے کے لیے اپنی آنکھوں پر ہاتھ کا سایا کر لیا۔ فرنگیا نے غور سے دیکھا تو آنے والے اسے سپاہی جیسے دکھائی دیئے۔ اُن سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ لیکن اس کے باوجود اس کا وہ ہاتھ کانپنے لگا جس سے اس نے گھوڑے کی لگام تھام رکھی تھی۔ اس نے اپنی نقلی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہاروں کو ڈولی اٹھانے سے روک دیا اور کہا: "تھوڑی دیر ٹھہر جاؤ سامنے سے جو آ رہے ہیں وہ کچھ شناسا سے لگ رہے ہیں۔"

کہاروں کو فرنگیا کی کارستانیوں کا علم نہیں تھا۔ خالی پالکی میں چاول کی بوری دیکھ کر انھیں تجسس تو ہوا تھا لیکن چونکہ وہ لوگ جاگیردار کے وفادار آدمی تھے اس لیے انھوں نے کُریدنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ وہ سب اپنے جاگیردار کی رنگیلی طبیعت سے اچھی طرح واقف تھے۔ دوسرے گاؤں سے جاگیردار کے لیے لڑکیاں اُٹھا لانے کا کام وہ اس سے پہلے بھی انجام دے چکے تھے۔ وہ اس بات سے بھی بے خبر نہیں تھے کہ ان کے ساتھ ساتھ چلنے والے شخص نے ایک راجپوت کا بھیس بدل رکھا ہے۔ مگر وہ اس کی اصلیت سے ضرور ناواقف تھے۔

"ان سپاہیوں سے مجھے ہی باتیں کرنے دینا۔" سپاہی جب نزدیک آنے لگے تو فرنگیا کہاروں سے مخاطب ہو کر بولا: "وہ اگر کچھ پوچھیں تو ایسی کوئی بات نہ کرنا کہ ان لوگوں کو کچھ شک ہو جائے۔"

"ٹھیک ہے ٹھاکر" کہہ کر وہ چاروں کہار ایک شجر کے سائے میں لیٹ گئے۔ اس بہانے انھیں تھوڑی دیر آرام کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ سامنے سے آنے والے بار بار اپنے پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ اُن کی اس حرکت سے فرنگیا نے اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ شاید سپاہیوں کا ایک دوسرا دستہ بھی ان کے پیچھے آ رہا ہے۔ اس نے دل ہی دل میں یہ فیصلہ کر لیا کہ سپاہیوں کے دونوں دستے جب یہاں سے گذر جائیں گے تو وہ اُٹھوا کر جبل پور کی طرف روانہ ہو جائے گا۔ وہ جانتا تھا کہ آج کل سپاہی بہت زیادہ پوچھ گچھ کرتے ہیں۔ زنانہ ساتھ ہوں پھر بھی وہ قافلوں کو اس وقت تک روکے رکھتے ہیں جب تک انھیں تسلی نہ ہو جائے۔ ابھی کچھ دن قبل ہی یہ خبر پھیلی تھی کہ فرنگیا پولیس کی نظروں سے بچنے کے لیے عورت کا لباس پہن کر پالکیوں میں سفر کر رہا ہے۔ اس نے جب یہ افواہ سُنی تھی تو اسے سخت غصہ آیا تھا۔

"رام۔ رام" دونوں سپاہی جب قریب آ گئے تو فرنگیا نے اپنی مونچھوں پر تاؤ دے کر آگے آتا ہوا بولا۔

"رام۔ رام" سپاہیوں نے گھوڑوں کی لگام کھینچ لی۔

"کہاں جانا ہے ٹھاکر؟"

"ناگپور" سپاہی کے سوال میں تفتیش کی کوئی جھلک نہ دیکھ کر فرنگیا کو اطمینان محسوس ہوا: "ٹھکرائن کو چھوڑنے جا رہا ہوں۔ ویسے جبل پور اب کتنی دور رہے؟"

باتیں کرتے ہوئے بھی دونوں سپاہی بار بار پیچھے کی جانب دیکھ لیتے تھے۔ ایک سپاہی جواب دینے ہی والا تھا کہ دوسرے سپاہی نے اس کی توجہ پیچھے کی جانب مبذول کرائی:

"وہ دیکھو صاحب نظر آ رہے ہیں۔"

فرنگیا کی نظر بھی ان دونوں کے سر پر سے گذرتی ہوئی پیچھے کی طرف اٹھ گئی۔ دو گھوڑے سوار اسی طرف آ رہے تھے لیکن وہ سپاہی نہیں تھے۔ ان میں سے ایک کوئی افسر دکھائی دے رہا تھا۔ فرنگیا نے چونک کر پوچھا: "یہ کون صاحب ہیں؟"

"ولایتی صاحب ہیں۔" ایک سپاہی نے جواب دیا۔

"ولیم سلومن صاحب۔"

"ولیم سلومن صاحب؟" فرنگیا کو ایک جھٹکا سا محسوس ہوا۔ اس کی آواز میں سے بناوٹی بڑھاپا یکایک ہی غائب ہو گیا لیکن ان دونوں سپاہیوں کی توجہ اس کی جانب نہیں تھی۔ فرنگیا الجھن میں پڑ گیا کہ ولیم سلومن اچانک اوپر کیسے آ نکلا ہے۔ اس کا ہاتھ خود بخود تلوار کے دستے پر جم گیا۔ وہ کمر سے بندھی ہوئی تلوار کے دستے پر مضبوطی سے ہاتھ رکھ کر تازہ صورت حال پر غور کرنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کیا جائے؟

"یہ صاحب کہاں سے آ رہے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں؟" فرنگیا اپنی آواز پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے پُرتجسس لہجے میں بولا: "کیا یہ وہی انگریز صاحب ہیں جن سے ٹھگ لوگ بہت ڈرتے ہیں؟"

"ہاں۔ ہاں" فرنگیا کے آخری سوال کا جواب ہی اسے ملا تھا اور یہ جواب بھی سپاہیوں نے اسکی طرف دیکھے بغیر دیا تھا۔ فرنگیا اب نزدیک آنے والے صاحب کو گھور گھور کر دیکھنے لگا تھا۔ اچانک اسے خیال آیا کہ گورے صاحب کے ساتھ دوسرے گھوڑے پر تو کوئی عورت بیٹھی ہوئی ہے۔ یہ تو کوئی لیڈی لگتی ہے۔

میڈم پر نظر پڑتے ہی فرنگیا کو لگا کہ شاید ولیم سلومن کو میرے منصوبے کا علم ہو گیا ہے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے سپاہیوں سے پوچھا: "صاحب کے ساتھ کیا یہ اُن کی میڈم ہیں؟"

دونوں سپاہیوں نے اقرار میں صرف سر ہلا دیا۔ اور اس وقت تک صاحب اور میڈم ان کے قریب آ گئے۔ انھیں دیکھتے ہی دونوں سپاہی اپنے گھوڑے سے نیچے اتر آئے اور ادب سے کھڑے ہو گئے۔ فرنگیا چور نگاہوں سے صاحب اور میڈم کی طرف دیکھنے لگا۔ جس آدمی سے ہندوستان کے خطرناک ٹھگ خوف کھاتے تھے۔ اس انگریز صاحب کا چہرہ اسے بہت ہی نرم دکھائی دے رہا تھا۔ رُعب، اور غصے کی جھلک ولیم سلومن کے چہرے پر نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس نے ہمت کر کے سامنا کرنے کی تیاری کر لی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا پالکی کے قریب پہنچ گیا۔ پالکی کے اندر کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ پالکی کے اندر جھانک کر جان بوجھ کر باتیں کرنے کی اداکاری کرنے لگا۔ وہ پالکی کے قریب کھڑا ہو کر کہہ رہا تھا: "ٹھکرائن ذرا اندر سے جھانک کر دیکھو۔ گورے صاحب اور ولایتی میم کی سواری جا رہی ہے۔"

پالکی اٹھانے والے کہار ایک جانب کھڑے تھے۔ ولیم سلومن کے نام کی دھاک اُن کے چہرے پر نمایاں نظر آ رہی تھی۔ پہلی بار انھیں ڈر لگ رہا تھا کہ اگر پالکی کی تلاشی لی گئی تو اس نقلی راجپوت کے ساتھ وہ بھی پکڑے جائیں گے۔ یکایک ایلی نے پالکی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ولیم سلومن سے کہا۔

"اتنی شدید گرمی میں پالکی کے اندر بیٹھی ہوئی عورت کا کیا حال ہو رہا ہو گا؟"

فرنگیا نے دور سے محسوس کر لیا تھا کہ صاحب اور میڈم میں پالکی کے متعلق ہی باتیں ہو رہی ہیں۔ اس نے غصے سے دانت پیس کر ترچھی نظروں سے میڈم کی طرف دیکھا۔ ایلی اسے بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ اس کی نازک گردن کو دیکھ کر تو اسے یوں لگ رہا تھا کہ رومال کا ایک ہی جھٹکا اس نازک گردن کے لیے کافی ثابت ہو سکتا ہے۔

"مسافر" اچانک ولیم سلومن نے فرنگیا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو فرنگیا چونک پڑا لیکن پھر زبردستی مسکراتے ہوئے بولا: "فرمایئے جناب!"

"کس طرف جا رہے ہو؟"

"ناگپور کی طرف" فرنگیا ولیم سلومن سے آنکھیں ملائے بغیر بولا۔ اس نے سُن رکھا تھا کہ انگریز افسر ولیم سلومن بیحد چالاک اور ہوشیار آدمی ہے۔ وہ اپنے سامنے والے کی آنکھ میں جھانک کر اس کے دل کی کیفیت جان لیتا ہے۔ اسی لیے وہ آنکھیں جھکا کر آگے بولا: "بیوی کو اس کے میکے چھوڑنے جا رہا ہوں۔"

ولیم سلومن کی بھوری آنکھیں پالکی پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے ایلی سے فرنچ زبان میں کچھ کہا تو ایلی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ سی دوڑ گئی۔ فرنگیا کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔ وہ اب پالکی کے پاس سے ہٹ کر اپنے گھوڑے کے نزدیک پہنچ گیا تھا۔

تاکہ اگر ولیم سلومن نے اپنے سپاہیوں کو پالکی کی تلاشی کا حکم دیا تو وہ گھوڑے پر بیٹھ کر فرار ہو سکے۔

"مسافر" ولیم سلومن نے ایک بار پھر اسے چونکا دیا "تاگپور تک جانا ہے تو کسی قافلے کے ساتھ کیوں نہیں جا رہے ہو؟"

ولیم سلومن کے اس سوال میں فرنگیا کو شک کی جھلک دکھائی دی مگر پھر بھی اس نے ہمت سے جواب دے ہی دیا۔ "جناب آج کل کسی پر بھی بھروسا کرنا خطرے سے خالی نہیں ہے کیا خبر جس کا سہارا لیا جائے وہی ٹھگ نکل پڑے" فرنگیا کی آواز میں خوف کی جھلک نمایاں تھی۔

"میں بھی تم سے یہی کہنے والا تھا" ولیم سلومن جلدی سے بول گیا "لوگ انجانے میں ہی ٹھگ لوگوں کا شکار بن جاتے ہیں" اتنا کہہ کر اس نے سپاہیوں کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ اور پھر اپنے گھوڑے کو بھی آگے بڑھا دیا۔ لیکن اگر اس نے ایک بار بھی پیچھے پلٹ کر دیکھ لیا ہوتا تو شائد فرنگیا اسی وقت گرفتار کر لیا جاتا۔ کیونکہ گھبرائے ہوئے چاروں کہار نے جب جلدی جلدی پالکی کو کندھے پر اٹھانے کی کوشش کی تو پالکی کے اندر رکھی ہوئی چاول کی بوری ایک جانب لڑھک گئی تھی جس کی وجہ سے پالکی ایک طرف کو جھک گئی۔ اور چاول کی بوری پالکی سے پھسل کر زمین پر آ گری تھی۔

●

"سر فرنگیا کا پتہ چل گیا ہے" صوبیدار رستم خان جو تھے دن ولیم سلومن کی کچہری میں آ کر ہانپتے ہانپتے بولا "پانچا گاؤں کے اندر وہ کہیں چھپا ہوا ہے۔ سادھورا ابھی خبر لے آیا ہے"

"یہ سادھورا کون ہے؟" یہ پوچھنے کے لیے ولیم سلومن نے نظریں اٹھائیں تو رستم خان کے پیچھے کمرے کے دروازے کے قریب دھن سنگھ کے ساتھ ایک سیاہ رنگ کے آدمی کو دیکھ کر وہ چپ ہو گیا۔ یہ سادھورا فرنگیا کی ہی ٹولی کا ایک ٹھگ تھا جس نے سزائے موت سے بچنے کے لیے اپنے سردار فرنگیا کی گرفتاری میں سرکار کی مدد کا وعدہ کر لیا تھا۔

"جناب اس بار ہماری محنت رائیگاں نہیں جائیگی" ولیم سلومن کو گہری سوچ میں ڈوبا ہوا دیکھ کر صوبیدار رستم خان نے بات آگے بڑھائی "سادھورا نے اپنی آنکھوں سے فرنگیا کو وہاں دیکھا ہے اور بیس گاؤں سے بھاگ کر یہاں آیا ہے"

"وہ کس کے گھر میں چھپا ہوا ہے؟" ولیم سلومن نے پوچھا

"پانچا گاؤں ایک چھوٹی سی بستی ہے جہاں چالیس پچاس گھر ہی ہوں گے۔ وہاں کے مکھیا سے فرنگیا کی اچھی خاصی بنتی ہے۔ اس سادھورا کا کہنا ہے وہ مکھیا کے گھر میں ہی چھپا ہوا ہے"

"ہوں" ولیم سلومن میز پر پھیلے ہوئے نقشے پر انگلی پھیرتا ہوا بولا "رستم خان آٹھ دس سپاہیوں کو ساتھ لے کر تم فوراً چلے جاؤ۔ دھن سنگھ اور سادھورا کو اپنے ساتھ رکھنا اور رات کے اندھیرے میں ہی چھاپہ مارنا"

"بہتر ہے جناب" کہہ کر رستم خان اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا شام ہونے کو آئی تھی اور رات تک اسے پچاس گاؤں کی مسافت طے کر لینی تھی۔

"اور دوسری بات" سلومن نے اسے روکتے ہوئے کہا۔ "اس بات کا خیال رکھنا کہ تم لوگوں کو دیکھ کر کوئی شخص آگے جا کر فرنگیا کو خبر نہ کر دے"

"آل رائٹ سر" کہتا ہوا رستم خان تیزی سے کمرے کے باہر نکل گیا۔ ولیم سلومن دیر تک اس کے قدموں کی دور ہوتی ہوئی آواز کو سنتا رہا۔ اسے اس وقت رستم خان کے قدموں کی آواز میں کامیابی کی جھنکار سنائی دے رہی تھی۔

●

ایک دو، تین اور پھر چار گاؤں کے گھروں کی تلاشی لے لی گئی۔ لیکن فرنگیا کا کہیں پتا نہیں لگا۔ ہر گاؤں کا مکھیا دوسرے گاؤں کے مکھیا کا نام لے لیتا اور رستم خان پہلے مکھیا کو رسیوں سے جکڑ کر دو سپاہیوں کو اس کی نگرانی کے لیے چھوڑ کر دوسرے گاؤں کے مکھیا کی طرف بڑھ جاتا۔ چوہے بلی کا یہ کھیل اب ختم ہونے کو آ چکا تھا۔ اب ایک آخری گاؤں کی بستی باقی رہ گئی تھی۔ وہاں سے اگر فرنگیا نکل بھاگا تو جلدی ہاتھ نہیں آئے گا۔ پھر گاؤں میں دو دو سپاہیوں کو چھوڑنے کی وجہ سے رستم خان کے دستے کے سپاہی بھی کم ہوتے جا رہے تھے۔ جب وہ پانچویں گاؤں یعنی پانچا گاؤں کی آخری بستی میں پہنچا تو اس کے ساتھ دھن سنگھ اور،

سادھورا کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ اس کے دل میں اب یہ وسوسہ پیدا ہونے لگا تھا کہ فرنگیا شاید اس بستی میں بھی نہ ملے۔

"وہ رہا مکھیا کا گھر" سادھورا نے دور سے ایک مکان کی طرف اشارہ کیا اور رستم خان کے سانسوں کی رفتار تیز ہو گئی۔ مکان کا دروازہ بند تھا۔ صبح کا اجالا ابھی پوری طرح نہیں پھیلا تھا اور صوبیدار سوچ رہا تھا کہ اس اندھیرے میں وہ دروازے کی جھریوں سے جھانک کر اندر کا منظر تو دیکھ ہی نہیں سکتا۔ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد وہ سانس روک کر آگے بڑھنے لگا۔ دروازے کے قریب آ کر اس نے سادھورا کو دروازے پر دستک دینے کا اشارہ کیا۔ فرنگیا کا سامنا کرنے کے لئے سادھورا اپنے کپکپاتے ہاتھوں پر قابو پا نا تھا۔ اس نے دستک دینے میں تھوڑی تاخیر کی اور اسی درمیان رستم خان نے کمر میں سے اپنا پستول نکال لیا۔

سادھورا نے دروازے پر دستک دی۔ آس پاس کا سناٹا تھوڑی دیر کے لیے ٹوٹ گیا اور پھر وہی خاموشی چھا گئی۔ تھوڑی دیر تک جب اندر سے کوئی آواز نہیں سنائی دی تو ان تینوں کے چہرے پھیکے پڑ گئے اور رستم خان کی رہی سہی امید بھی خاک میں مل گئی۔ وہ اپنا پستول اپنی کمر کی پیٹی میں ڈالنے ہی والا تھا کہ سادھورا نے دوبارہ دروازے پر دستک دی۔ جس کے جواب میں اندر سے ایک کرخت آواز سنائی دی "کون ہے؟"

آواز سن کر وہ تینوں ایک ساتھ چونک پڑے۔ اندر سے آنے والی کرخت آواز میں خوف کی جھلک بھی محسوس ہوئی تھی۔ یقیناً اندر فرنگیا موجود ہو گا یہ سوچ کر رستم خان نے اپنے دانت پیسے اور دیوار کی اوٹ میں چھپ کر اس نے ایک بار پھر سادھورا کو دستک دینے کا اشارہ کیا۔

اس تیسری دستک کے بعد اچانک دروازہ اندر سے کھول دیا گیا۔

"کون ہے؟" دروازہ کھول کر فرنگیا نے سوال کیا لیکن دھن سنگھ اور سادھورا کو دیکھتے ہی اسے اپنے سوال کا جواب مل گیا۔ فرنگیا چند لمحوں تک ان دونوں کی طرف دیکھتا رہا جیسے سوچ رہا ہو کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے؟ لیکن رستم خان نے اسے زیادہ سوچنے کی مہلت نہیں دی۔ وہ اچانک پستول تانے ہوئے دیوار کی اوٹ سے باہر نکل آیا۔

"فرنگیا اب اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دو" دراز قد پٹھان صوبیدار رستم خان اس کے سامنے پستول تانے ہوئے کہہ رہا تھا "ذرا سی بھی حرکت کی تو اسی جگہ ڈھیر کر دیئے جاؤ گے" فرنگیا نے ہونٹ بھینچ لیے۔ اس کی خواہش تو ہوئی کہ وہ اپنی کمر میں اڑسی ہوئی کٹاری نکال لے مگر اس کی یہ خواہش خود بخود ہی دم توڑ گئی۔ اس کے دماغ میں تیزی سے ایک خیال رینگ گیا کہ یہ صوبیدار یہاں اکیلا نہیں آیا ہو گا بلکہ اپنا پورا لشکر لے کر آیا ہو گا۔ اسے الجھن میں دیکھ کر صوبیدار رستم خان نے رعب دار آواز میں کہا "سارا گاؤں گھیرے میں لیا جا چکا ہے۔ تم اگر بھاگنا بھی چاہو تو نہیں بھاگ سکتے۔ یہ مت بھولنا کہ تمہارے گھر والے ہمارے قبضے میں ہیں"

"آہ" فرنگیا کی ہمت جواب دے گئی۔ شیر کی طرح چنگھاڑنے والا یہ ٹھگ ایک بھیگی بلی بن کر رہ گیا۔ ذرا سی دیر کے لیے اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ سی نمودار ہوئی۔ پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھ آگے بڑھا دیئے۔

فرنگیا کی مشکیں کس دینے کے باوجود کافی دیر تک، صوبیدار رستم خان کو اس بات کا یقین ہی نہیں آیا کہ وہ جس کو گرفتار کر کے لے جا رہا ہے وہ خطرناک ٹھگ فرنگیا ہی ہے؟

●

یہ خوشخبری سن کر ولیم سلومن خوشی سے اچھل پڑا۔ اس وقت اگر رستم خان اس کے سامنے نہ ہوتا تو شائد وہ اکیلی کو اپنی باہوں میں سمیٹ کر ناچنے لگتا۔ لیکن رستم خان کی موجودگی میں اس نے فوراً ہی اپنے جذبات کو اپنے قابو میں کر لیا اور فرنگیا کو دیکھنے کی خواہش کو بھی اس نے وقتی طور پر دبا لیا۔ اس نے سوچا کہ اسے فرنگیا کو اتنی اہمیت نہیں دینی چاہیے۔ جب تک وہ موم کی طرح پگھل کر اور ہاتھ جوڑ کر اس کے سامنے نہیں آتا اس وقت تک اس سے بات کرنا بھی مناسب نہیں ہے۔

ولیم سلومن کی سوچی ہوئی یہ بات چوتھے روز ہی سچ

ثابت ہوگئی۔" صاحب! فرنگیا نے آپ سے ملنے کی گذارش کی ہے۔" رستم خان نے آکر اسے بتایا۔ "وہ اپنے گھر والوں کے سلسلے میں آپ سے ملنا چاہتا ہے۔"

یہ سن کر ولیم سلومن کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ سی ناچنے لگی۔ وہ کچہری میں بیٹھا ہوا کوئی فائل دیکھ رہا تھا۔ کہ اس کی سماعت سے بیڑیوں کے کھنکنے کی آواز ٹکرائی اور رستم خان کے بھاری جوتوں کی آواز بھی سنائی دی۔ یہ جاننے کے باوجود کہ فرنگیا اُس کے کمرے میں آپہنچا ہے وہ فائل پڑھنے کی اداکاری کرتا رہا۔ چار پانچ منٹ تک تو اُس نے نظریں اُٹھانے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی۔ یہ دیکھ کر فرنگیا نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے کے لیے اپنی بیڑیاں کھنکائیں۔ اس بار ولیم سلومن نے ایک جھٹکے سے اپنی گردن اُٹھائی۔ اس نے اپنی آنکھوں میں غیظ و غضب کی جھلک پیدا کرنے کی کوشش کی لیکن جب اسے فرنگیا اپنے سامنے مسکراتا ہوا دکھائی دیا تو اس کا غصہ خود بخود دم توڑ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ فرنگیا رونی صورت بنا کر اس کے سامنے کھڑا ہوا ہوگا مگر کچھ بھی ہو فرنگیا بھی ایک ٹھگ سردار تھا۔ اس نے ولیم سلومن کے کچھ کہنے سے قبل ہی بولنا شروع کر دیا۔

"حضور مجھے جھوٹے الزام میں گرفتار کیا گیا ہے۔ میرے بیوی، بچی اور ماں کو بلا وجہ اور بے قصور جیل میں بند کر کے میرے ساتھ ناانصافی کی گئی ہے۔ میں آپ سے انصاف مانگنے آیا ہوں۔"

"انصاف" ولیم سلومن دانت پیس کر بولا اور بہت دیر تک فرنگیا کو گھورتا رہا۔ اُس کی تیز نظریں فرنگیا کے دل میں اترتی جا رہی تھیں اور اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے ولیم سلومن کی بھوری آنکھیں اس کے اندر اتر کر اس کے تمام گناہوں کو صاف دیکھ رہی ہیں۔

"سب لوگ باہر چلے جاؤ۔" اچانک ولیم سلومن نے رستم خان کی طرف دیکھ کر حکم دیا۔ رستم خان نے سٹپٹا کر ولیم سلومن کی طرف دیکھا۔ اس کا خیال تھا کہ صاحب کا یہ حکم اس کے لیے نہیں ہے۔ لیکن جب ولیم سلومن نے اُسے بھی باہر جانے کا اشارہ کیا تو وہ بھی سپاہیوں کے پیچھے کمرے سے باہر نکل گیا۔

فرنگیا کو یہ ولایتی صاحب کچھ عجیب سا لگنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ تنہائی میں یہ افسر اُس پر کونسا جادو کرنا چاہتا ہے؟

"سنو" ولیم سلومن اسے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ "تمھارے بھیانک گناہوں کا حساب میری نظروں کے سامنے موجود ہے۔ لیکن میں ان کاغذی جھمیلوں میں پڑنا نہیں چاہتا اور نہ ہی مجھے تمھاری بے گناہی کا بیان سننا ہے۔" اتنا کہہ کر وہ تھوڑی دیر کے لیے رُکا۔ اس کی آواز میں آہستہ آہستہ سختی آتی جا رہی تھی۔ اُس نے اپنے کوٹ کی جیب میں سے اپنی جیبی گھڑی نکالی اور اسے غور سے دیکھنے لگا۔ فرنگیا اس کی ایک ایک حرکت کو غور سے دیکھتا ہوا حیران ہو رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ گورا صاحب آخر اس سے کہنا کیا چاہتا ہے؟

یکایک ولیم سلومن نے اپنی جیبی گھڑی کو اپنی ہتھیلی پر رکھ کر اسے دکھاتے ہوئے کہا۔ "میرے قریب آکر دیکھو اس گھڑی میں ایک بڑی سی سوئی ہے جو بہت تیزی سے گھومتی رہتی ہے۔" فرنگیا جھک کر گھڑی کی طرف دیکھنے لگا۔ اب بھی اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

"جب تک یہ سوئی ایک چکر مکمل کر لے اس وقت تک کی میں تمھیں مہلت دیتا ہوں۔ تمھاری تقدیر کا چکر کس طرف گھومتا ہے اس کا دارومدار تمھارے جواب پر ہوگا۔" اتنا کہہ کر اس نے اپنی جیبی گھڑی کو میز پر فرنگیا کے اور نزدیک کر کے رکھ دیا اور پھر آگے بولا۔ "تم اپنے تمام جرائم کا اقرار کر کے میرا ساتھ دینا چاہتے ہو یا پھانسی پر چڑھنا چاہتے ہو؟ صرف ایک منٹ میں ہی تم 'ہاں' یا 'نا' میں جواب دیدو۔"

فرنگیا کو اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وہ گھڑی پر سے اپنی نظریں ہٹا بھی نہ سکا۔ اس نے تو یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ یہ ولایتی صاحب صرف چند لمحوں کی ہی مدت میں اس کی قسمت کا فیصلہ کرنا چاہتا ہے۔

مگر ولیم سلومن نے بھی یہ کب سوچا تھا کہ اس کے سامنے کھڑا ہوا خطرناک ٹھگ گھڑی کی سوئی کے چکر سے پہلے ہی بول پڑے گا۔ اور ہوا بھی یہی۔ "مجھے آپ کی شرط

منظور ہے۔" میں اپنے ہر جرم کا اقرار کر لینا چاہتا ہوں۔" یہ کہہ کر ہی فرنگیا کی آواز بھاری ہوگئی اور پھر آخری جملہ تو وہ بہ مشکل ہی ادا کر سکا۔ لیکن جناب اس کے بدلے آپ کو میرے گھر والوں پر رحم کرنا ہوگا۔"

"ٹھیک ہے۔" ولیم سلومن انتہائی سنجیدہ لہجے میں بولا۔ "میں تمھارے گھر والوں کو چھوڑ دوں گا۔" اتنا کہہ کر اُس نے اپنی گھڑی اٹھائی اور اُسے اپنے کوٹ کی جیب میں ڈال کر اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس کے ہونٹوں پر اس وقت ایک عجیب سی مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔

فرنگیا کی گرفتاری نے ولیم سلومن کو اور زیادہ شہرت دے دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہندوستان کے تمام علاقوں میں یہ خبر پھیل گئی اور ٹھگوں میں اس خبر سے ایک سراسیمگی پھیل گئی۔ ان کے ذہنوں میں صرف یہ ہی ایک سوال گردش کر رہا تھا کہ کیا یہ گورا صاحب ٹھگوں کی اس تنظیم کو جو کہ صدیوں سے قائم ہے جڑ سے اکھاڑ پھینکے گا؟ فرنگیا نے خود کو قانون کے حوالے کر دیا تھا۔ اس خبر نے انھیں بہت صدمہ پہنچایا تھا۔ وہ سب یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ ہو نہ ہو ولیم سلومن کے پاس ضرور کوئی جادوئی چراغ ہے ورنہ فرنگیا جیسا بہادر اور طاقتور ٹھگ اتنی آسانی سے ہتھیار نہ ڈالتا۔ فرنگیا نے پہلی ہی ملاقات میں اپنے آپ کو ولیم سلومن کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ اس بات پر خود ولیم سلومن کو بھی حیرت ہو رہی تھی اور وہ یہ سوچنے لگا تھا کہ کہیں اس میں بھی فرنگیا کی کوئی چال تو نہیں ہے؟ سینکڑوں بے گناہ مسافروں کو دھوکے سے قتل کر دینے والے اس خطرناک قاتل کو سزائے موت سے بچانے کا وعدہ کر کے اس نے کہیں کوئی غلطی تو نہیں کی ہے؟ گورنر جنرل کے سامنے بھی فرنگیا کے لیے سفارش کی درخواست پیش کرتے وقت اسے کافی بحث کرنا پڑی تھی۔ اس نے اپنی دلیل میں کہا تھا: "میں جانتا ہوں کہ اس جیسے خطرناک قاتل کے لیے موت کی سزا بھی کم ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو اس جیسے خوفناک ٹھگ کو زندہ رکھ کر ہم بہت سے بے گناہ مسافروں کو موت کے منہ میں جانے سے بچا سکتے ہیں۔ مجھے یقین ہے ہمارا یہ اقدام غلط ثابت نہیں ہوگا۔ فرنگیا دوسرے ٹھگوں کی گرفتاری اور انھیں پہچاننے میں ہی ہمارا ساتھ دیتا رہے تو اس سودے میں ہماری رعایا کی ہی بھلائی ہے۔ میری اس سفارش پر آپ بھی منظوری منظوری کی مُہر ثبت کر دیں تو میرا کام آسان ہو جائے گا۔"

اور پھر چار دن بعد ولیم سلومن نے فرنگیا کو کچہری کے کمرے میں بُلایا۔ وہ اسے گورنر جنرل کے جواب کے بارے میں بتانے سے قبل دو تین سوالات اس سے پوچھ لینا چاہتا تھا۔

"فرنگیا سچ سچ بتاؤ کہ جب تمھیں صوبیدار رستم خان گرفتار کرنے کے لیے آیا تھا تو تم نے کسی مزاحمت کے بغیر خود کو گرفتاری کے لیے کیوں پیش کر دیا تھا؟" یہ سوال سُن کر فرنگیا پہلے تو مسکرایا لیکن جواب دینے میں اس نے کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا۔ "صاحب یہ تو میری مجبوری تھی اور کچھ غلط فہمی بھی ہوگئی تھی۔ میں اگر چاہتا تو دھن سنگھ اور سادھورا کو اپنی کٹاری کے ایک وار سے ہی ڈھیر کر سکتا تھا۔ لیکن آپ کی چالاکی نے مجھے مجبور کر دیا تھا۔ میری ماں، بیوی اور بچی آپ کے قبضے میں تھے۔ اگر میں کوئی حرکت کرتا تو اس کی سزا میرے گھر والوں کو بھگتنی پڑتی۔ یہ ہی سوچ کر میرا ہاتھ کٹاری تک نہ جا سکا۔"

فرنگیا کی صاف گوئی ولیم سلومن کو پسند آئی لیکن جس غلط فہمی کا ذکر اس نے کیا تھا وہ کیا تھی؟ جب اس نے اس کے بارے میں پوچھا تو فرنگیا نے کہا: "اس میں آپ کے صوبیدار صاحب کی چالاکی کام کر گئی۔ مجھے گرفتار کرنے کے لیے وہ اکیلے ہی آئے ہوں گے یہ تو میں سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ میں تو یہی سمجھا تھا کہ سو پچاس سپاہی پوری بستی کو گھیرے ہوئے ہوں گے اور صوبیدار صاحب کی دھمکی میں بھی کچھ ایسی ہی بات تھی کہ بھاگنا بیکار ہے۔ میری سمجھ میں جب بھاگنے کی ترکیب نہیں آئی تو مجبوراً میں نے خود کو ان کے حوالے کر دیا۔"

ولیم سلومن نے اپنی بھوری آنکھوں سے اس کے چہرے کے تاثرات پڑھنے کی کوشش کی اور پھر پوچھا: "اپنے جن گھر والوں کی خاطر تم نے خود کو قانون کے حوالے کیا ہے کیا اُن

لوگوں کو اس بات کا علم ہے کہ تم ایک ٹھگ ہو؟" اس سوال کے سنتے ہی فرنگیا کے ہونٹ کانپنے لگے۔ "نہیں جناب ان لوگوں کو میری اصلیت کا علم نہیں ہے۔ شائد ہی کسی ٹھگ کے گھر والے اُس کی اصلیت سے واقف ہوتے ہیں میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔"

اگلا سوال پوچھنے سے پہلے ولیم سلومن کچھ دیر تک سوچتا رہا کہ اُس کے اِس سوال کا جواب اُسے نہیں ملے گا لیکن پھر بھی وہ اپنی تجسس کی خاطر پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔ "تو اب یہ بتاؤ کہ اپنے گھر والوں کو جیل سے چھڑانے کے لیے کیا تم نے کچھ بھی نہیں کیا تھا؟"

یہ سوال سن کر فرنگیا کو خیال آیا کہ ولیم سلومن باتوں باتوں میں اُس سے بہت کچھ جان لینے کی کوشش کر رہا ہے وہ ہوشیار ہو گیا اور مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "اگر میں انھیں جیل سے نکال کر لے جا سکتا تو بڑے سے بڑا خطرہ بھی مول لیتا۔ میں نے آپ کو سبق دینے کی کوشش کی تھی لیکن مجھے کامیابی نہیں ہوئی۔" شاید وہ جوش ہی جوش میں یہ کہہ دیتا کہ وہ اس کی میڈم کو ہی اٹھا کر لے جانے والا تھا لیکن آخری لمحے میں بازی اُلٹ گئی۔ مگر یہ بات کہہ کر وہ ولیم سلومن کے غصّے کو تیز کرنا نہیں چاہتا تھا اسی لیے چُپ ہو گیا۔ اُس کی اِسی کشمکش کے دوران ولیم سلومن نے جیب سے ایک کاغذ نکال کر میز پر رکھ دیا تھا جسے فرنگیا نہیں دیکھ سکا تھا۔

"گورنر جنرل نے تمھیں پھانسی نہ دینے کی درخواست منظور کر لی ہے۔" ولیم سلومن کے ہونٹوں سے نکلے ہوئے ان الفاظ کو سن کر فرنگیا مسکرایا۔ لیکن ولیم سلومن کی بات ابھی ادھوری تھی۔ وہ چند لمحوں کے بعد آگے بولا۔ "لیکن اس معافی کے لیے انھوں نے ایک کڑی شرط رکھی ہے۔"

"کیا؟" فرنگیا چونک پڑا۔ "میں تو ہر طرح سے قانون کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوں۔ کیا اس کے علاوہ بھی کوئی شرط ہے؟"

"شرط یہ ہی ہے لیکن اس میں ذرا سختی کی گئی ہے۔" ولیم سلومن کاغذ پر لکھی ہوئی دو چار سطریں پڑھ کر بولا۔ "جب بھی ہمیں یہ محسوس ہوا کہ تم ساتھ دینے میں دلچسپی نہیں لے رہے ہو اور ٹھگوں کو پکڑنے کی کوشش کر رہے ہو تو یہ معافی نامہ واپس لیا جا سکتا ہے۔"

ولیم سلومن کا خیال تھا کہ یہ سُن کر فرنگیا چونک اٹھے گا لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ وہ تو اس طرح مسکرا رہا تھا جیسے گورنر جنرل صاحب کی یہ شرط اُسے ایک مذاق لگ رہی ہو۔

"صاحب" فرنگیا اپنی ہنسی کو روکتے ہوئے بولا۔ "تمہارے درمیان ہونے والی لڑائی ختم ہو چکی ہے۔ میں ہارا اور آپ جیت چکے ہیں۔ اور زندہ رہنے کے لیے میں نے شرط بھی مان لی ہے۔ اب کسی مذاق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سچا ٹھگ کبھی اپنے وعدے سے نہیں پھرتا۔ وہ مسافروں کو ختم کرنے سے پہلے ان کی چیزوں کو ہاتھ بھی نہیں لگاتا۔ میں آپ کا قیدی ضرور بن گیا ہوں لیکن یہ مت بھولیے کہ میں درحقیقت ایک ٹھگ ہوں۔"

اُس کی باتوں میں سچائی کی جھلک محسوس ہوئی تو ولیم سلومن نے مزید سوالات پوچھنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ مگر فرنگیا ابھی کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا۔ "سچ پوچھیے تو اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کی مجھے خود جلدی ہو رہی ہے۔ آپ چاہیں تو میں کل ہی آپ کے ساتھ چل کر آپ کو اپنے گناہوں کے ثبوت مہیا کر سکتا ہوں تاکہ میری زندگی کا ہر راز آپ کے سامنے بے نقاب ہو جائے۔"

"ہمیں جانا کہاں ہوگا؟" ولیم سلومن نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔

"سفر پر۔" فرنگیا بڑے ہی سکون سے بولا۔ "آپ کو بہت دور نہیں جانا پڑے گا۔ سرو جنا کے راستے میں ہی گاؤں آتا ہے جہاں میرے کیے ہوئے شکار کو آپ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں گے۔" فرنگیا اس طرح بول رہا تھا جیسے کوئی بہادر شخص اپنے کارنامے سنا رہا ہو۔ لیکن ولیم سلومن کو یہ بات بڑی عجیب سی لگ رہی تھی کہ آخر فرنگیا کو اپنے کیے ہوئے جرم کے ثبوت دکھانے کی اتنی جلدی کیوں ہے؟ کہیں اس بہانے وہ کوئی چال چلنے کی کوشش تو نہیں کر رہا ہے؟ یہ سوچ کر ولیم سلومن تھوڑی دیر تک فرنگیا کا چہرہ دیکھتا رہا پھر تھوڑی ہی دیر بعد وہ ایک فیصلے پر پہنچ کر بولا۔ "ٹھیک ہے ہم کل صبح روانہ ہو جائیں گے۔ یوں بھی مجھے اس طرف جانا ہے۔"

سُن کر فرنگیا ہونٹوں ہی ہونٹوں میں مسکرانے لگا۔ اس کی یہ مسکراہٹ ولیم سلومن کو اس وقت بڑی ہی پُراسرار لگ رہی تھی۔

●

سارگرے دوگاؤں کا فاصلہ طے کر لینے کے بعد ولیم سلومن کے قافلے نے سلاد نامی گاؤں میں پڑاؤ ڈال دیا تھا۔ ولیم سلومن جب بھی مہینے دو مہینے بعد اس علاقے میں چکر لگانے نکلتا تو ایملی ہمیشہ اس کے ساتھ ہوتی۔ کچّے ناہموار راستے اور گرمی و سردی کے موسم میں ایملی اپنے شوہر کے ساتھ رہنے میں خوشی محسوس کرتی تھی اور ایسے دشوار گذار سفر میں اپنے شوہر کا ساتھ دیتی رہتی۔

فرنگیا کے ہاتھ پاؤں میں بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اور اسے اسی حالت میں ساتھ لیا گیا تھا۔ اُس کی نگرانی کے لیے چار سپاہی ہتھیاروں سے لیس موجود تھے۔ ولیم سلومن نے انھیں تاکید کر رکھی تھی کہ دورانِ سفر کسی شخص کو بھی یہ معلوم نہ ہونے پائے کہ یہ قیدی مشہور ٹھگ سردار فرنگیا ہے۔

صبح سے شام تک کے سفر میں فرنگیا بڑے موڈ میں نظر آتا رہا تھا۔ وہ کبھی سپاہیوں سے ہنس ہنس کر باتیں کرتا، اور کبھی زور سے الاپنے لگتا۔ وہ خوشی خوشی یہ سارا راستہ طے کر رہا تھا۔ اس کے تاثرات سے یہ ظاہر نہیں ہو رہا تھا کہ وہ ایک قیدی ہے اور اپنے جرم کا ثبوت خود پولیس کو دکھانے جا رہا ہے۔ سلاد گاؤں کے باہر رات گذارنے کے لیے جب پڑاؤ ڈالا گیا تب بھی اس نے ولیم سلومن پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ اسی زمین کے نیچے اس کے گناہوں کے ثبوت دفن ہیں۔

"ویلی! تم لوگوں پر بہت جلدی بھروسا کر لیتے ہو۔" خیمے میں تنہائی پاتے ہی ایملی نے ولیم سلومن سے کہا۔ "مجھے اس فرنگیا کی ایک ایک حرکت بڑی پُراسرار لگ رہی ہے۔"

"وہ کس طرح؟" فرش پر بچھی دری پر لیٹے لیٹے ولیم سلومن نے پوچھا۔

"میری طرف دیکھ کر وہ کئی بار ہنسا تھا۔" بیوی کے لہجے میں ناگواری کے تاثرات نہیں تھے لیکن تجسس کی جھلک ضرور نمایاں تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "صورت شکل سے وہ اتنا خطرناک آدمی نہیں لگتا ہے۔"

"اسی لیے تو وہ ٹھگ ہے ایملی!" ولیم سلومن نے اُسے سمجھایا۔ "اس پر بھروسہ کرنے کی بات تو تم جانتی ہو۔ اکثر ایسے لوگ شریف آدمیوں سے زیادہ قابلِ اعتماد ثابت ہوتے ہیں۔"

"اس کا ثبوت تو آپ کو صبح ہی مل جائے گا۔"

"صبح کو؟" سلومن نے چونک کر پوچھا۔ "صبح کو کیا ہوگا؟"

"جب تم سو کر اٹھو گے تو فرنگیا یہاں نہیں ہوگا۔" ایملی پُرمذاق لہجے میں بول رہی تھی۔ "وہ تمھارے سپاہیوں کی آنکھوں میں دُھول جھونک کر راتوں رات غائب ہو جائیگا۔"

"لگ گئی شرط؟" ولیم سلومن نے ہاتھ بڑھا کر کہا۔

"کیسی شرط؟" ایملی نے پوچھا۔

"یہ تو میں تمھارے کان میں کہوں گا۔" کہہ کر ولیم سلومن سرک کر اس کے قریب آ گیا۔ لیکن ایملی اب اُس کی شرط سننے والی کہاں تھی۔ وہ کھسک کر اس سے دور چلی گئی۔

●

صبح کا اُجالا ابھی پوری طرح پھیلا بھی نہیں تھا کہ ولیم سلومن بڑی بے چینی سے خیمے کے باہر نکل آیا۔ چڑیوں کی چہچہاہٹ میں بھی اسے ایملی کے کہے ہوئے الفاظ کی گونج سنائی دے رہی تھی۔ "صبح تک یہ فرنگیا تمھارے سپاہیوں کی آنکھوں میں دُھول جھونک کر فرار ہو چکا ہوگا۔"

اگر ایسی کوئی بات ہوئی ہوتی تو رات کو ہی شور مچ جاتا۔ لیکن اس کے باوجود اپنے خیمے سے نکل کر ولیم سلومن نے سب سے پہلے فرنگیا کے خیمے کی جانب ہی نظر ڈالی تھی چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ مشرق کی جانب آسمان پر ابھی تک سورج نکلنے کی کوئی آگاہی نظر نہیں آ رہی تھی پرندے بھی پَر پھڑپھڑا کر پھر سے سو جاتے تھے۔ اونچے اونچے درختوں کی ڈالیاں بھی ابھی تک اپنی سُستی دور نہیں کر سکی تھیں اس نے واپس خیمے میں جا کر سو جانے کے ارادے سے قدم اٹھایا ہی تھا کہ ایک آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ "رام رام صاحب" ولیم سلومن اس طرح چونک پڑا جیسے کوئی پیچھے سے اس پر حملہ آور ہوا ہو۔ اس نے گردن گھما کر دیکھا تو فرنگیا

کے خیمے کے دروازے پر ایک انسانی سایا کھڑا ہوا تھا۔
"آپ بھی میری طرح صبح ہی صبح اٹھ گئے جناب؟"
ولیم سلومن کے پاؤں اس جانب اُٹھنے چلے گئے۔ خیمے کے دروازے پر فرنگیا کھڑا تھا جس کے نزدیک جاتے وقت اس وقت ولیم سلومن کو کچھ ہچکچاہٹ سی محسوس ہو رہی تھی۔ چوکیدار اور سپاہی وغیرہ کیوں نظر نہیں آرہے ہیں؟ یہ سوال اس کے دماغ میں اُبھرا تھا لیکن اس کے باوجود وہ آگے بڑھتا چلا گیا۔ وہ فرنگیا پر یہ ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتا تھا کہ وہ خود اس سے ڈر رہا ہے۔ جب پانچ دس قدموں کا فاصلہ رہ گیا تو اس کے پاؤں آپ ہی آپ تھم گئے۔ فرنگیا کے ہاتھ پاؤں میں بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اور اُس کی کمر سے جو رسّہ بندھا ہوا تھا اس کا دوسرا سرا ایک سپاہی اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے خیمے کے اندر پڑا پڑا سو رہا تھا۔ فرنگیا کی بیڑیوں میں پڑی ہوئی زنجیر کا ایک سرا زمین میں دھنسے ہوئے ایک کھونٹے کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ ولیم سلومن اور فرنگیا دونوں آمنے سامنے کچھ دیر تک کھڑے رہے۔ پھر ولیم سلومن نے ہی اس خاموشی کو توڑا: "چوکیدار سو رہے ہیں اور تم جاگ رہے ہو؟"
"یہ تو عجیب سی بات ہے؟" فرنگیا کے الفاظ ولیم سلومن کے کانوں سے ٹکرائے: "میں تو رات بھر خراٹے لیتا رہا ہوں لیکن عادت کے مطابق صبح سویرے ہی آنکھ کھل گئی۔ میں نے ان لوگوں سے کہا تھا کہ تھوڑی دیر اور آرام کر لو۔ ابھی صبح نہیں ہوئی ہے۔"
ولیم سلومن کو یہ ٹھگ سردار اس وقت بھی کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ وہ ابھی فرنگیا کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ فرنگیا کی آواز ایک بار پھر اس کی سماعت سے ٹکرا گئی: "اس جگہ پر ہم لوگ پہلے بھی دو ایک بار پڑاؤ ڈال چکے ہیں۔ مجھے وہ دن یاد آنے لگے تھے۔ اور رات کو میں نے جان بوجھ کر آپ کو کچھ نہیں بتایا تھا۔"
"کیا؟" ولیم سلومن دو قدم آگے بڑھ کر بولا۔ فرنگیا کا چہرہ اب اُسے کچھ کچھ نظر آنے لگا تھا: "رات تم نے کیا نہیں بتایا تھا؟"
"یہی کہ جس جگہ آپ نے اپنے اور میڈم کے لئے خیمہ لگوایا ہے ٹھیک اسی جگہ ہم نے اپنے شکار کو دفن کیا ہے۔"
"کیا؟" ولیم سلومن کو ایک زبردست جھٹکا لگا لیکن وہ فوراً ہی سمجھ گیا: "لیکن یہ بات رات کو بتانے میں کیا حرج تھا؟"
"میں نے اگر رات کو ہی بتا دیا ہوتا تو میڈم اس وقت آرام سے نہ سوئی ہوئی ہوتیں۔" فرنگیا بڑے ہی پُرسکون لہجے میں بول رہا تھا: "کچھ بھی ہو آخر وہ ایک عورت ہی تو ہیں۔ انھیں اگر یہ معلوم ہو جاتا کہ جس جگہ وہ سو رہی ہیں اس جگہ کے ٹھیک نیچے ایک عورت اور چار مردوں کی لاشیں چھپائی گئی ہیں تو خوف سے ان کا سینہ پھٹ جاتا۔"
"لیکن ایلی اتنے کمزور دل کی عورت نہیں ہے۔" ولیم سلومن نے دلیل پیش کرتے ہوئے کہا: "وہ تو تمھاری بات کو بھی سچ نہیں مانتی۔"
یہ سن کر فرنگیا دھیرے سے ہنس دیا اور پھر بولا: "وہ سامنے جہاں آپ کا گھوڑا کھڑے کھڑے سو رہا ہے نا؟" وہ اندھیرے میں انگلی کا اشارہ کرتے ہوئے آگے بولا: "وہاں ایک حوالدار اور چار سپاہیوں کو ہم نے دفن کیا ہے۔"
ولیم سلومن کانپ اُٹھا۔ مگر پھر بھی وہ اِس طرح بولا جیسے اسے فرنگیا کی بات کا یقین نہ ہو رہا ہو: "ٹھیک ہے صبح کو دیکھ لیں گے۔" اتنا کہہ کر اس نے واپسی کے لیے قدم بڑھائے ہی تھے کہ فرنگیا نے کہا: "اور جناب آپ کے خیمے کے پچھلے حصے میں جہاں خیمے کی رسّی باندھی گئی ہے ٹھیک اُسی جگہ ہم نے ایک جعلی ساڈھو اور اس کے چھ چیلوں کو دفن کیا تھا۔"
ولیم سلومن نے پلٹ کر فرنگیا کی طرف دیکھا لیکن فرنگیا پر اس کی تیز چمکتی ہوئی آنکھوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ بدستور اسی پُرسکون لہجے میں کہہ رہا تھا: "آپ کو میرے کیے ہوئے جُرموں کا ثبوت چاہیئے نا؟" اتنا کہنے کے بعد وہ ہنستا ہوا اور ولیم سلومن کچھ کہے بغیر اپنے خیمے میں واپس آگیا۔
صبح ہوتے ہی کھدائی کا کام شروع ہو گیا۔ آس پاس کے گاؤں سے دو تین مزدوروں کو بُلوا کر فرنگیا کی بتائی ہوئی جگہوں پر کھُدائی ہو رہی تھی۔ علاقے کا تھانیدار اسپاہی اور ولیم سلومن وغیرہ گھیراؤ ڈالے کھڑے تھے۔ لیکن ایلی ابھی تک اپنے خیمے میں سو رہی تھی۔
چائے پیتے پیتے اچانک ولیم سلومن نے فرنگیا کو اپنی جانب آنے کا اشارہ کیا اور اس سے بولا: "کیا تمھیں پورا یقین ہے کہ جس جگہ کی تم نے نشان دہی کی ہے وہیں فنا

لوگوں کی لاشیں دفنائی ہیں؟"
"جناب جھوٹ بول کر آپ کا وقت برباد کرنے سے مجھے کیا فائدہ ہوگا؟" فرنگیا انتہائی سنجیدہ لہجے میں بولا۔
"فرنگیا" ولیم سلومن کو ذرا سخت انداز اختیار کرنا پڑا۔ "کھُدائی کے لیے میں نے باہر سے مزدور بلوائے ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ اُن کی محنت اور میرا وقت برباد ہو۔"
یہ سن کر فرنگیا تھوڑی دیر تک کسی سوچ میں ڈوب گیا۔ سلومن کو لگا کہ فرنگیا کچھ گھبرا سا گیا ہے۔ کہیں اس کا یقین اندازے میں نہ بدل جائے؟
"صاحب ایک چکر لگا کر میں ذرا نزدیک سے اس جگہ کو دیکھ لوں۔" فرنگیا نے کہا تو ولیم سلومن نے آنکھ کے اشارے سے اُسے اجازت دے دی۔ فرنگیا چاروں طرف کا ایک چکر لگانے کے بعد واپس آگیا۔ اس کے چہرے پر اطمینان اور یقین کی جھلک تھی۔ وہ ولیم سلومن کے قریب آکر بولا: "آپ کھُدائی شروع کرا دیں۔ اگر گڑھے میں سے کچھ نہ برآمد ہو تو آپ کو اختیار ہے آپ مجھے ہی اس گڑھے میں دفنا دیں۔"
ولیم سلومن دیر تک فرنگیا کو گھورتا رہا۔ فرنگیا ابھی تک اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ کس قسم کا آدمی ہے؟
جب ایک گز گہرا گڑھا کھود لیا گیا اور اس کے اندر سے کسی دفنائی ہوئی لاش کی نشانی نہیں ملی تو ولیم سلومن پھر فرنگیا کو گھُورنے لگا۔ مزدوروں اور سپاہیوں کو بھی بیڑیوں میں جکڑے فرنگیا کو دیکھ کر یہی لگ رہا تھا کہ یہ شخص پاگل ہو چکا ہے۔
"گڑھے کو اور گہرا کھدوائیں صاحب۔" فرنگیا نے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر کہا: "ایک لاش کا سر اور دوسری لاش کے پیر اس طرح اوپر نیچے پانچ لاشیں اس جگہ دفنائی گئی ہیں۔ زمین بہت نرم ہوتی ہے تو ہمیں گہرا گڑھا کھودنا پڑتا ہے۔"
"ٹھیک ہے اور کھودو۔" ولیم سلومن مزدوروں کی طرف دیکھ کر بولا تو مزدور پھر سے اپنے کام میں لگ گئے۔ تقریباً آدھے گھنٹے کی کھُدائی کے بعد فرنگیا نے مزدوروں کو روکتے ہوئے کہا: "بس اب رُک جاؤ۔ اب کُدال چلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہاتھ سے مٹی ہٹاؤ تو تمھیں لاشیں دکھائی دیں گی۔"
سب چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ فرنگیا کا چہرہ ہلکے پسینے ہو رہا تھا۔ مزدوروں نے ہاتھوں سے مٹی ہٹائی تو انھیں انسانی ہڈیاں دکھائی دیں۔ سب کی آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ گئیں۔ لیکن فرنگیا کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔
"ایک، دو، تین، چار اور پانچ ڈھانچے ایک دوسرے پر رکھے ہوئے ہیں۔" فرنگیا نے کہا اور پھر تھوڑی دیر بعد ہی اس کی سچائی ثابت ہو گئی۔ کسی کو ایک لفظ بولنے کی بھی ہمت نہیں تھی اور بولنے کے لیے اب رہ ہی کیا گیا تھا؟ تھوڑی دیر تک پورے ماحول پر ایک وحشتناک خاموشی چھائی رہی پھر اس خاموشی کو فرنگیا کی آواز نے ہی توڑا: "آج سے چھ سال قبل شکار ہونے والے حوالدار اور اس کے چار سپاہیوں کی یہ لاشیں ہیں۔" اس کی آواز میں پچھتاوے اور ندامت کی کوئی جھلک نہیں تھی۔ ولیم سلومن کو اس پتھر دل شخص پر تھوڑی دیر تک بہت غصہ آیا لیکن وہ کچھ بولا نہیں۔
دوسرا گڑھا کھودا گیا تو وہاں فرنگیا کے کہنے کے مطابق سات لاشوں کے ڈھانچے نکالے گئے جو بقول فرنگیا کے ایک ساڈھو اور اس کے چھ چیلوں کی لاشیں تھیں۔ ولیم سلومن کو یہ سب بڑا عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔ اُس وقت ایلی اس کے قریب موجود نہیں تھی بلکہ وہ خیمے میں بیٹھی چائے پی رہی تھی ولیم سلومن اس بات سے خوش تھا کہ ایلی اِس وقت یہاں موجود نہیں ہے۔ اگر وہ یہ دہشتناک منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتی تو شائد غش کھا کر بے ہوش ہو جاتی۔
"اب تیسرا گڑھا کھودنے کی ضرورت نہیں ہے۔" یکایک ولیم سلومن نے مزدوروں کو کام کرنے سے روک دیا۔ شائد وہ یہ سوچ رہا تھا کہ فرنگیا کے گناہوں کے ایسے کتنے ثبوت وہ دیکھ سکے گا؟ اس طرح کی سینکڑوں لاشوں کو زمین کے اندر سے نکال کر دیکھنے سے آخر فائدہ ہی کیا ہوگا؟

●

ولیم سلومن نے اب فرنگیا سے دوسری طرح سے کام نکلوانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ شک کی بنیاد پر پکڑے جانے والے ٹھگوں سے جیلیں بھرتی جا رہی تھیں۔ ولیم سلومن ایک ایک قیدی کو فرنگیا کے سامنے لا کر اس کی شناخت کرواتا رہا۔ اس طرح اسے مختلف ٹولیوں کا علم ہوتا گیا۔ کافی دنوں تک یہ کام چلتا رہا اور فرنگیا اس کام میں برابر اس کی مدد کرتا رہا۔

"فرنگیا تمہاری نظر میں کیا کوئی ایسا ٹھگ ہے جس کو گرفتار کرنے سے اُتنی ہی معلومات حاصل ہوں جتنی کہ تم سے ہوئی ہیں؟" ولیم سلومن نے ایک دن فرنگیا سے جب یہ سوال پوچھا تو فرنگیا ایک لمحے کے لیے کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر تھوڑی دیر بعد وہ بولا۔ "جناب پورے ملک میں ٹھگوں کی تنظیم کام کر رہی ہے آپ ان میں سے کتنوں کو گرفتار کریں گے؟" اتنا کہہ کر وہ ایک بار پھر رُک گیا اور کچھ سوچتے ہوئے آگے بولا۔ "میری طرح ایک اور ٹھگ سردار ہے۔ لیکن اِس وقت تو وہ جالان کے جیل میں بند ہے۔"

"کون ہے وہ؟" ولیم سلومن نے بے قراری سے پوچھا "کیا نام ہے اس سردار کا؟"

"امیر علی" فرنگیا دھیرے دھیرے مسکراتے ہوئے بولا "لیکن اس کی گرفتاری کا سہرا آپ کے سر نہیں بندھ سکتا کیونکہ وہ تو پہلے ہی سے گرفتار ہے۔ ویسے اس نے اتنے بڑے بڑے اور اتنے زیادہ شکار کیے ہیں کہ مجھے خود اس سے حسد ہو گئی تھی۔"

"امیر علی" ولیم سلومن بڑبڑایا۔ یہ نام تو میرے ذہن کے پردے پر بہت عرصے سے چپکا ہوا ہے مگر مجھے آج تک اس کا خیال کیوں نہیں آیا؟" دھیرے دھیرے ولیم سلومن کے ہونٹ بھینچتے چلے گئے۔ اس کے دماغ پر اب فرنگیا کی جگہ امیر علی کا نام قدم جمانے لگا تھا۔

●

ولیم سلومن نے گورنر جنرل کا بھیجا ہوا خط پڑھنا شروع کیا۔ گورنر جنرل نے لکھا تھا "ٹھگ فرنگیا کے متعلق آپ نے جو رپورٹ بھیجی تھی اُس کا میں نے بغور مطالعہ کیا ہے۔ آپ نے جس ہمت اور صبر سے یہ کارنامہ انجام دیا ہے اس کے لیے آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ سرکار کو اب یہ یقین ہو چکا ہے کہ اس قدر مشکل کام کو آپ اب بہ خوبی پورا کر سکتے ہیں اور پورے ملک سے ٹھگوں کے نام و نشان کو مٹا دینے میں آپ پوری طرح کامیاب ہو جائیں گے۔ آپ کی خدمت اور کام کی لگن کو سراہتے ہوئے سرکار نے اِس سال آپ کو کرنل کے خطاب سے نوازنے کا فیصلہ کیا ہے۔"

ولیم سلومن اتنا پڑھ کر مسکرایا لیکن وہ رُکا نہیں خط کا اگلا حصہ اسے اور زیادہ دلچسپ محسوس ہو رہا تھا آگے لکھا تھا۔ "جالان کے علاقے کے قیدی امیر علی کو اپنے قبضے میں لینا چاہتے ہیں۔ اس کا اظہار آپ نے اپنے خط میں کیا تھا۔ لیکن یہ کام اتنا آسان نظر نہیں آ رہا ہے آپ تو جانتے ہیں کہ جالان کا بوڑھا راجا ان دنوں ہم سے کچھ کھنچا کھنچا سا رہتا ہے۔ بڑھاپے میں اُس کی عقل مار گئی ہے۔ اُسے تو خود اپنے نوجوان بیٹے پر بھی بھروسا نہیں رہا ہے۔ اُسے ہر وقت یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں اُس کا تخت پر قبضہ کرنے کے لیے اُس کا بیٹا اُس کے کھانے پینے کی چیزوں میں زہر نہ ملا دے۔ اِسی لیے وہ کوئی چیز کھانے پینے سے قبل اپنی رانی کو وہ چیزیں کھلاتا پلاتا۔ اُسے یقین تھا کہ اس کا بیٹا اپنی ماں کو بہت چاہتا ہے اس لیے وہ کھانے پینے کی چیزوں میں زہر ملانے کی ہمت نہیں کرے گا۔ اُس کے دل میں ایک اور شک بھی جم کر بیٹھ گیا تھا کہ کہیں سرکار راج کمار کو گدی پر بٹھانے کے لیے بے چین ہے۔ بہرحال تھی کہ اس نے سرکار سے بات چیت بالکل ہی بند کر دی۔"

ولیم سلومن کو حیرت ہو رہی تھی کہ آخر گورنر جنرل کو جالان کے راجا کے بارے میں اتنی تفصیل بتانے کی کیا ضرورت پیش آ گئی؟ کیا امیر علی پر قبضہ اسے نہیں مل سکتا اس کے لیے اتنی صفائی پیش کی جا رہی ہے؟ وہ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا لیکن خط کی اگلی تحریر نے اُسے ایک بار پھر چونکا دیا۔ گورنر جنرل نے آگے لکھا تھا۔ "اِن حالات میں راجا اپنا قبضہ ہمیں سونپنے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہوتا لیکن اب قدرت نے خود ہی حالات پیدا کر دیئے ہیں۔ گذشتہ کل ہی بوڑھے راجا کا انتقال ہوا ہے۔ اور اس کے بیٹے نے گدی سنبھالنے کے موقع پر مجھے بھی جالان آنے کی دعوت دی ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ اگر کسی وجہ سے میں اس کی تاجپوشی کی رسم میں شریک نہ ہو سکوں تو اس نے درخواست کی ہے کہ میں اپنے پیشکار افسر کو سرکاری مہمان کی حیثیت سے بھیج دوں۔"

اتنا پڑھتے ہی ولیم سلومن کی آنکھوں میں ایک چمک سی لہرا گئی۔ اس کے بعد کی تحریر اس کے اندازے کے مطابق ہی تھی۔ "اور میں نے سرکار کی طرف سے مسٹر اور مسز ولیم سلومن کو اپنا نمائندہ بنا کر جالان بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اپنی تاجپوشی کی خوشی میں نیا راجا آپ کی ایک معمولی سی خواہش کو نہیں ٹھکرائے گا اور اپنے قیدی امیر علی کو آپ کے حوالے کر دے گا۔ مجھے امید ہے آپ کے وہاں جانے سے آپ کا یہ کام بہ آسانی ہو جائے گا۔ یہ خط ملتے ہی آپ دونوں جالان جانے کی تیاری شروع کر دیں۔"

خط کے آخری جملے کو دوبارہ پڑھنے کے بعد ولیم سلومن جوش جوش میں اُچھل پڑا۔ اس کے لیے اب اپنے دفتر میں بیٹھنا دشوار ہو رہا تھا۔ گھر پہنچ کر وہ جلد سے جلد ایملی کو یہ خوشخبری سنانا چاہتا تھا۔

●

جالان کے نئے راجا فتح سنگھ کی رسم تاجپوشی بڑے دھوم دھام سے منانے کی تیاریاں ہو چکی تھیں۔ ولیم سلومن اور میڈم سلومن کو سب سے اہم مہمانوں کی حیثیت سے عزت دی گئی تھی ایملی کو تاجپوشی کی یہ تقریب بہت دلچسپ لگ رہی تھی راج محل کی عورتوں کے جھرمٹ میں راجا کی سواری ہاتھی پر دھوم دھام سے نکلی تو سڑکوں پر جالان کے عوام خوشی سے رقص کرنے لگے۔ سارا شہر دُلہن بنا ہوا تھا۔ ایملی ان نظاروں میں اس قدر کھو گئی تھی کہ اسے وقت کے گذرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ لیکن ولیم سلومن کا جی تو کہیں لگ ہی نہیں رہا تھا ان ہنگاموں میں بھی اس کا دل بار بار امیر علی ٹھگ کی طرف چلا جاتا تھا۔ وہ اپنی عادت کے مطابق اپنے تصور میں امیر علی کے چہرے کو دیکھنے کی کوشش کرتا اور پھر ان اُبھرے ہوئے نقوش کو مٹا دیتا۔ نہ جانے اسے یہ کیوں محسوس ہو رہا تھا کہ امیر علی ٹھگ بھی فرنگیا کی طرح اس کے لیے بہت فائدہ مند ثابت ہو سکتا ہے۔ مگر اسے اس بات کا خدشہ بھی تھا کہ کیا فرنگیا کی طرح امیر علی اتنی جلدی اس کا ساتھ دینے کے لیے رضامند ہو جائے گا؟ فرنگیا نے اور کئی دوسرے ٹھگوں نے اسے بتایا تھا کہ وہ بہت ضدی ہے۔ جان جائے لیکن وہ اپنی ضد نہیں چھوڑتا۔ اب تو وہ اسے پھانسی کی دھمکی بھی نہیں دے سکتا تھا۔ جالان کے راجا کے اس مانگے ہوئے قیدی پر وہ اپنی عدالت میں کیسے کوئی مقدمہ چلا سکتا تھا؟ فرنگیا کی طرح اس کا کوئی عزیز یا رشتہ دار بھی تو زندہ نہیں رہا جس کو گرفتار کر کے امیر علی پر دباؤ ڈالا جا سکے۔

شام کے وقت ولیم سلومن راجا کے پاس پہنچا تو اُسے اپنی معمولی سی خواہش کا اظہار کرنے کا موقع مل گیا۔ رات کو ناچ گانے کی خاص محفل جمنے والی تھی جہاں بھنگ اور شراب کا دَور چلنے والا تھا۔ اِن حالات میں یہ ممکن تھا کہ راجا نشے کی حالت میں اُس کی بات سُنی اَن سُنی کر دیتا۔ اس لیے رات سے پہلے ہی اُسے اپنی بات راجا کے کان میں ڈال دینی تھی اُس نے موقع پا کر بات شروع کی۔ "ہمارا ارادہ کل واپس جانے کا ارادہ ہے۔"

"ارے آپ صاحب لوگ بھلا ہمارے پاس کب آتے ہیں؟" نوجوان راجا نے خوش دلی سے کہا۔ "دو تین دن اور رہیں مہمان نوازی کا موقع دیں۔ ہمارے علاقے میں شیر اور چیتے جیسے شکار ملتے ہیں۔"

"شکار سے تو مجھے زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔" ولیم سلومن کہنے کو تو کہہ گیا مگر پھر فوراً ہی اسے خیال آیا کہ اسے تو اس نوجوان راجا سے اپنا کام بھی نکالنا ہے۔ یہ ہی سوچ کر وہ آگے بولا۔ "جناب مجھے تو صرف ایک ہی شکار سے دلچسپی ہے"

"تو پھر فرمایئے۔" راجا نے بے چینی سے کہا۔ "آپ بتائیں گے تو ہم اس شکار کا بھی بندوبست کر دیں گے۔"

"میں ٹھگوں کا شکاری ہوں مہاراجا۔" ولیم سلومن نے مسکرا کر کہا۔ "بتائیں کیا آپ اس کا بندوبست کر سکتے ہیں؟"

"آپ بھی کمال کے آدمی ہیں۔" نوجوان راجا نے شاید یہ سمجھا کہ ولیم سلومن اس سے مذاق کر رہا ہے۔ "بھلا یہاں ہماری جاگیر میں ٹھگ کہاں ہیں؟"

"ٹھگ لوگ تو ملک کے ہر علاقے میں پائے جاتے ہیں صرف اُنھیں ڈھونڈ نکالنے کی تکلیف کرنا پڑتی ہے۔" ولیم سلومن کی یہ بات راجا کی سمجھ میں نہیں آئی تو ولیم سلومن کو ذرا کھُل کر کہنا پڑا۔ "ایک بہت ہی مشہور ٹھگ امیر علی آپ کی ہی جاگیر میں تھا جس کو آپ کے والد نے گرفتار کرا کے جیل میں ڈال دیا تھا۔"

"ہاں۔ ہاں۔" نوجوان راجا کو یاد آ گیا اور وہ خوش ہو کر بولا لیکن پھر اچانک ہی وہ سنجیدہ ہو گیا اور کسی مجرم کی طرح سر جھکا کر کہنے لگا۔ "آپ دُرست کہہ رہے ہیں جناب! امیر علی نام کا ایک ٹھگ یہاں ضرور تھا۔" اتنا کہہ کر وہ ایک پل کے لیے رُکا پھر آگے بولا۔ "لیکن یہ تو بہت پرانی بات

ہو چکی ہے۔ اس کے بعد ہمارے علاقے میں کبھی کوئی ٹھگ گرفتار نہیں ہوا ہے۔"

ولیم سلومن کا جی چاہا کہ وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑے لیکن وہ صرف مسکرا کر رہ گیا اور بولا: "ٹھگ لوگ اتنی آسانی سے پہچانے نہیں جاتے۔ وہ تو شریف انسانوں کے لباس میں ہمارے آس پاس ہی موجود ہوتے ہیں لیکن پھر بھی انکی اصلیت سے کوئی واقف نہیں ہوتا۔" ولیم سلومن اس سے زیادہ کچھ نہیں بولا۔ دراصل وہ راجا سے زیادہ بحث کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اُسے تو اپنے مطلب سے ہی کام تھا۔ اس لیے اس بات کو زیادہ طول دینے کی بجائے اُس نے صاف صاف لفظوں میں کہا: "امیر علی ٹھگ آپ کی جیل میں قید ہے اور میں آپ کے سر سے اس کا بوجھ کم کرنا چاہتا ہوں۔ اب وہ آپ کے کسی کام کا نہیں ہے۔ لیکن مجھے اس سے کام ہے۔ اِس تاجپوشی کی خوشی میں آپ کمپنی سرکار کو اس کا تحفہ دے کر آپ مجھے شکریہ کا موقع دیں۔ تاکہ میں اسے اپنے ساتھ لیجا سکوں۔"

یہ سن کر راجا کھِل کھِلا کر ہنس پڑا۔ ولیم سلومن اسے ایک بہت ہی عجیب افسر لگ رہا تھا۔ وہ ولیم سلومن کو گھور گھور کر دیکھنے لگا۔ اس نے تو اپنے اس معزز مہمان کو بہت ہی قیمتی تحفے دے کر رخصت کرنے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ وہ میڈم ایلی کو بھی ہیروں کا ایک قیمتی ہار دینے کا ارادہ کر چکا تھا۔ لیکن اس کی بجائے یہ گورا صاحب تو اس کے سر پر سے ایک قیدی کا بوجھ کم کرنے کی بات کر رہا ہے۔ وہ سوچ رہا تھا چلو یہ اچھا ہوا۔ اس بہانے اس کے قیمتی تحائف بچ جائینگے بھلا بیوقوف لوگوں کو قیمتی چیزوں کی پہچان اور ان کی قدر ہی کب ہوتی ہے؟

"آپ تو بے حد گہری سوچ میں پڑ گئے مہاراج؟" ولیم سلومن نے اسے خاموش دیکھ کر یہ ہی سمجھا کہ شائد وہ امیر علی کو اس کے حوالے کرنے سے کترا رہا ہے۔ "کہیں آپ کو یہ ڈر تو نہیں کہ چونکہ امیر علی آپ کے والد کا ایک خاص آدمی تھا اس لیے ہم اس سے آپ کی جاگیر کی نجی باتیں معلوم کر لیں گے؟"

"کیا مطلب؟" راجا فتح سنگھ کو یہ سوال کچھ عجیب سا لگا اور وہ چونک کر بولا: "ہماری جاگیر اور ہماری حکومت کے راز وہ بھی ایک ٹھگ سے؟"

"جی ہاں مہاراج! ٹھگوں کے گروہ کو اکثر راجا اور مہاراجا کا سہارا ہوتا ہے تاکہ دوسرے شہروں میں جا کر وہ کما کر لائیں اور اس میں سے راجا کو نذرانے ملتے رہیں۔" ولیم سلومن نے اب پردہ ہٹا دیا: "امیر علی بھی آپ کے والد کا ایک بااعتماد آدمی تھا۔ ممکن ہے امیر علی کے جُرموں میں آپ کے والد کی اعانت ہو۔ اور ہم اگر یہ جان لیں تو۔"

"کیا کیا؟" راجا فتح سنگھ جلدی جلدی بولا: "نہیں نہیں آپ ایسا کوئی اندازہ نہ لگائیں۔ میرے والد کی راز کی باتیں اگر کھُل جاتی ہیں تو ضرور کھُل جائیں مجھے اس سے کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ دراصل مجھے تو کبھی اپنے والد کے انصاف پر یقین ہی نہیں تھا۔ خود انھیں بھی اپنے سگے بیٹے پر کب یقین تھا؟"

"بس تو پھر۔" ولیم سلومن پُرسکون لہجے میں بولا: "آپ امیر علی کو میرے حوالے کر دیں۔ اپنے افسر سے کہہ دیں کہ مجھے جیل دکھا دے تاکہ جب صبح ہم لوگ یہاں سے جانے لگیں تو وہ اسے ہمارے ساتھ بھیجنے کا بندوبست کر دے۔"

"ضرور۔ ضرور۔" راجا فتح سنگھ نے کہا اور پھر اپنے وزیر کو حکم دیتا ہوا بولا: "ہمارے محترم مہمان کو جیل دکھانے لیجاؤ۔ یہ امیر علی ٹھگ سے کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔"

لیکن کچھ فاصلے پر بیٹھے ہوئے وزیر کا چہرہ تو یہ حکم سنتے ہی اتر گیا تھا۔ اس نے تو یہ بھی نہیں سنا تھا کہ مہاراجا نے آگے کیا کہا تھا؟

"آپ بیٹھے کیوں ہیں؟" یکایک اس نے مہاراجا کی ذرا سخت آواز سنی تو ایک جھٹکے سے اٹھ کر وہ قریب آگیا۔ اور مہاراجا کو ایک طرف لیجا کر دھیرے سے اس کے کان میں بولا: "مہاراج آپ کو ایک بات یاد دلانی ہے۔"

ولیم سلومن ان دونوں کو بغور دیکھ رہا تھا۔ مہاراجا نے اپنے کان میں کہی ہوئی بات کو سن کر وزیر کی طرف غصّے سے دیکھا تو وزیر کا سر جھک گیا۔

"محترم مہمان ایک زبردست گڑبڑ ہو گئی ہے۔" ولیم سلومن کے نزدیک آکر راجا بڑی بے بسی سے ہاتھ ملتے ہوئے بولا: "مجھے یہ بات یاد ہی نہیں رہی تھی کہ تاجپوشی کی خوشی میں ہم نے بہت سارے قیدیوں کو رہائی کا حکم دے دیا تھا۔"

"رہائی کا حکم؟" ولیم سلومن چونک پڑا: "تو کیا اس قاتل ٹھگ کی سزا بھی معاف کر دی گئی تھی؟"

"ہاں جناب۔" راجا اب خود مجرم بنا ہوا تھا: "خوشی کی ترنگ میں آکر میں نے حکم دے دیا تھا کہ تمام قیدیوں کو آزاد کر دیا جائے۔ تاکہ وہ اپنے بال بچوں سے مل کر ہماری خوشیوں میں شامل ہو سکیں۔"

ولیم سلومن کا چہرہ غصّے سے سرخ ہو گیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کسی خطرناک قیدی کے جیل سے بھاگ جانے کی اطلاع اسے دی گئی ہو۔

"تو آپ اپنے کسی افسر سے کہہ دیں کہ وہ مجھے اس کے گھر لے جائے۔ مجھے اسے دوبارہ گرفتار کرنا ہوگا۔ جلدی کریں۔" ولیم سلومن نے چند لمحوں کے بعد کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ لیکن وزیر اپنی جگہ پر بے حس و حرکت کھڑا ہی رہا۔ وہ تھوڑی دیر تک ولیم سلومن اور مہاراجا کی طرف دیکھتا رہا پھر دھیمی آواز میں بولا۔ لیکن اسے تو ہم لوگ اپنی نگرانی میں سرحد کے پار بھجوا چکے ہیں۔"

"سرحد کے پار؟" ولیم سلومن راجا کی موجودگی کا لحاظ کیے بغیر پاؤں پٹخ کر بولا: "کب؟"

"آج صبح" وزیر نے جواب دیا: "ایسے خطرناک مجرم کو اپنی جاگیر میں رکھ کر ہم کوئی خطرہ کیسے مول لیتے؟"

یہ سن کر ولیم سلومن غصّے سے اور زیادہ سُرخ ہو گیا۔ "اور آپ لوگوں کو اس بات کا خیال نہیں آیا کہ ایسے خطرناک مجرم کو آزاد کر کے آپ لوگوں نے نہ جانے کتنے لوگوں کی جان خطرے میں ڈال دیا ہے؟"

مہاراجا اور وزیر دونوں دم سادھے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کمپنی سرکار کے ایک اعلیٰ افسر کو کوئی معمولی سی بات پر ناراض کر دینا انھیں اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ لیکن اب کوئی علاج نہیں تھا۔ اس لیے راجا کو کہنا پڑا: "مہمان اس میں کسی کا کوئی قصور نہیں ہے۔ وہ پچھلے کئی برسوں سے جیل میں سڑ رہا تھا لیکن اس وقت تک اس کی کسی کو ضرورت نہیں پڑی۔ اور جب آج آپ اسے مانگ رہے ہیں تو آج ہی اسے معافی دے کر ہم نے رہا کر دیا۔"

"کیسی عجیب سی بات ہوئی ہے۔"

ولیم سلومن کے دل کو یہ بات لگ گئی اور اس کا غصّہ کچھ ٹھنڈا پڑ گیا۔ ہونی ہو چکی تھی۔ اب غصّے سے فائدہ بھی کیا تھا؟ اس لیے وہ اپنے غصّے کو دباتے ہوئے بولا: "خیر کوئی بات نہیں اسے تو میں کبھی بھی پکڑ لوں گا۔ لیکن اگر وہ آپ کی جاگیر میں کہیں نظر آجائے تو مجھے ضرور اطلاع کیجیے گا۔"

"ضرور، ضرور" راجا نے اس کے غصّے کو ٹھنڈا ہوتے دیکھ کر کہا: "وہ اب دوبارہ کبھی یہاں آئے گا اس کی توقع تو نہیں ہے۔ کیونکہ سرحد پار دھکیل دیئے جانے والے قیدی کبھی دوبارہ واپس آنے کی ہمت نہیں کرتے۔"

ولیم سلومن نے اس بات کا کوئی جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی اس لیے وہ خاموش رہا۔

○

جالان کی حد میں پاؤں رکھتے ہی امیر علی نے خوشی کی تھرتھراہٹ سی محسوس کی۔ کتنی بے چینی سے وہ سورج کے غروب ہونے کی راہ دیکھ رہا تھا۔ جالان کی سرحد کے باہر اس نے سارا دن کس بے چینی کی حالت میں گذارا تھا۔ قید سے رہائی کا جو معجزہ اچانک رُونما ہوا تھا اس کی سنسناہٹ ابھی تک اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ کال کوٹھری کا دروازہ کھول کر جیل کے داروغہ نے اس سے کہا تھا: "جاؤ آج سے تم آزاد ہو۔" اس وقت امیر اور داروغہ کو یہ بات مذاق محسوس ہوئی تھی۔ جیل سے فرار ہونے کی ناکام کوشش کے بعد انھیں تین برسوں میں پہلی بار اپنے علاوہ کسی تیسرے انسان کا چہرہ دیکھنے کو ملا تھا۔ اس کال کوٹھری میں تو انھیں ایک دوسرے کا چہرہ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ دو بار مٹی کے برتن میں کھانا اندر سرکانے کی آواز سنائی دیتی اور ایک بار پانی کی مٹکی کی آواز آتی۔ گشت پر نکلے ہوئے سپاہی کے جوتوں کی آواز اور اپنے پیروں میں پڑی ہوئی بیڑیوں کی آوازوں کے سوا کوئی اور آواز سنائی دیتی تھی۔ لیکن تین برسوں کے بعد جب انھوں نے داروغہ کی یہ آواز سُنی تو انھیں یہ احساس ہوا کہ اس دنیا سے باہر بھی ایک دنیا ہے جسے وہ اس کال کوٹھری کے اندر رہ کر بھول چکے تھے۔

جالان کے درختوں کو آخری سلام کرنے سے پہلے امیر نے یہ ضد کی۔ "رامو میں ایک بار شہر کے اندر جانا چاہتا ہوں۔ مولوی کے گھر جا کر اپنی بیٹی کا منھ دیکھ لینا چاہتا ہوں۔"

لیکن رامو نے اسے سمجھایا کہ ہمیں کوئی ایسا خطرہ نہیں مول لینا چاہیئے۔

سپاہیوں نے جب انھیں جالان کی سرحد کے باہر لا کر چھوڑ دیا تھا تو اس وقت اُنھوں نے جو الفاظ کہے تھے وہ رامو کے کان میں ابھی تک گونج رہے تھے۔ سپاہیوں نے کہا تھا "اب اگر تم لوگوں نے جالان کی سرزمین پر قدم رکھا تو پھانسی پر چڑھا دیئے جاؤ گے۔"

"نہیں امیر میاں اس وقت بیٹی کا منھ دیکھنے کی ضد مت کرو۔ قدرت نے ہمیں ایک بار پھر دنیا دیکھنے کا موقع دیا ہے۔ پھر کبھی ہم اس طرف آئیں گے تو تم اپنی بیٹی کا منھ دیکھ لینا۔ اس وقت کسی نے دیکھ لیا تو نئے راجا کی خوشیاں غصّے میں بدل جائیں گی۔ تھوڑے دن اور گذر جانے دو۔ اس وقت تک لوگ ہمارے چہرے بھول چکے ہوں گے اور ہماری داستان بھی کسی کو یاد نہیں ہوگی۔"

"نہیں رامو۔ بیٹی کا چہرہ دیکھے بغیر تو مجھ سے ایک قدم بھی نہیں چلا جائے گا۔" امیر علی گھٹی گھٹی سی آواز میں بولا۔ "اس دنیا میں اس کے سوا اب کچھ نہیں رہا ہے۔ میں اس کے بارے میں مولوی سے خود کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ جی بھر کر اپنی بیٹی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں پھر اس کے بعد میں اس چہرے کو ساری زندگی کے لیے اپنی آنکھوں میں چھپا لوں گا۔ اور آئندہ کبھی بھی اس کے پاس جانے کا نام نہیں لوں گا۔ اور نہ ہی کبھی اس کی خیر خیریت جاننے کی کوشش کروں گا۔ میں کبھی کسی پر یہ ظاہر نہیں کروں گا کہ میری ایک بیٹی بھی ہے۔"

آخری جملہ ادا کرتے وقت امیر کی آنکھیں نم ہو چکی تھیں۔ ان آنسوؤں میں رامو کو ایک باپ کی محبت کا عکس دکھائی دے رہا تھا۔ لیکن اس کے باوجود بھی اس نے امیر کو جالان جانے سے روکنے کی کوشش جاری رکھی۔

"دن کے اُجالے میں کوئی بھی تمھیں پہچان سکتا ہے۔ اور محلّے میں فوراً ہی یہ بات پھیل سکتی ہے۔ لوگ بے عزتی کریں گے تو سپاہیوں کی توجہ بھی تمھاری طرف مبذول ہو جائے گی۔"

"لیکن میں تو شام کے اندھیرے میں ہی وہاں جاؤں گا۔" امیر نے غروب ہوتے ہوئے سورج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے یقین ہے شان و شوکت میں زندہ امیر علی کو دیکھنے والے لوگ اب اس بھیس میں امیر علی کو نہیں پہچان سکیں گے۔ اندھیرے سے نکل کر جب روشنی میں میں نے تمھارا چہرہ پہلی بار دیکھا تو مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ تم ہی رامو ہو۔ تم تو بہت ہی بدلے ہوئے دکھائی دے رہے ہو۔ تمھاری طرح میں بھی بدل چکا ہوں گا۔ بوڑھا ہو چکا ہوں گا۔"

"تو پھر تمھیں مولوی پہچان سکے گا؟" رامو نے کہا۔ "تمھاری بیٹی تمھیں پہچان سکے گی؟"

رامو کی یہ دلیل سن کر امیر نے ایک سرد آہ بھری اور پھر کہا۔ "مگر میں اپنی پہچان کرانے کہاں جا رہا ہوں رامو! مجھے تو صرف اپنی بیٹی کو ہی دور سے دیکھ لینا ہے۔ مولوی کو تاکید کرنی ہے کہ اگر ہو سکے تو۔۔۔"

"ہو سکے تو کیا؟"

"یاد ہے رامو! میں نے تم سے کہا تھا۔" امیر آنکھیں بند کر کے اس طرح کہہ رہا تھا جیسے پُرانی یادیں تازہ کر رہا ہو۔ "اپنے مکان کے باغیچے میں ایک جگہ میں نے کچھ زیورات دفن کر دیئے تھے۔ تمھیں یاد ہے؟ میں نے ایک بار تمھیں بتایا تھا کہ اپنی بیٹی کے لیے میں نے زیورات رکھ چھوڑے ہیں۔ تو اس وقت تم نے کہا تھا کہ یہ تو لڑکی کے زیورات ہیں۔ ہمیں تو اس کو ہاتھ بھی نہیں لگانا چاہیئے۔ اور اب میں سوچ رہا ہوں کہ بیٹی کی یہ امانت بیٹی کے پالک باپ کے سپرد کر دوں۔ نہیں تو مولوی کو بھیک مانگ مانگ کر میری بیٹی کی شادی کرنا پڑے گی۔"

اس بات سے رامو پگھل گیا۔ وہ اب سمجھ چکا تھا کہ جب تک امیر کی یہ خواہش پوری نہیں ہوگی اُس کا اور کسی کام میں جی نہیں لگے گا۔ اس کا دل ہمیشہ اپنی بیٹی کی طرف لگا رہے گا اور اگر اس کی یہی حالت رہی تو پہلے رومال کی

گانٹھ پر امیر علی کے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑ جائے گی۔ لیکن رامو کے پاس اب کوئی چارہ نہیں تھا اس لئے اسے امیر کی ضد کے آگے اپنے ہتھیار ڈال دینے پڑے اور امیر نے اندھیرا ہوتے ہی جالان کی سرزمین پر قدم رکھ دیئے۔

● شہر میں دُھوم دھام سے خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔ آتش بازی دیکھنے کے لیے لوگ محل کی جانب اُمنڈے چلے آ رہے تھے۔ چاروں طرف نئے راجا کی جے جے کار مچی ہوئی تھی۔ امیر کو لگا کہ اگر وہ بے نقاب نہ ہو گیا ہوتا تو اس وقت محل میں بیٹھا راجا کے ساتھ موج اڑا رہا ہوتا۔ لیکن اب اس کی بجائے وہ اپنے ہی گھر کی طرف اندھیری گلیوں میں منھ چھپائے لوگوں سے بچتا بچاتا جا رہا ہے۔ اچانک چلتے چلتے اس کے پاؤں تھم گئے اور اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ گھر جہاں وہ کبھی ایک بادشاہ کی طرح رہتا تھا، اپنی بیوی اور بچی کے ساتھ سکھ چین کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ جہاں کئی نوکر چاکر دن رات اس کی خدمت میں کھڑے رہتے تھے وہ گھر اب اسے کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کہاں گیا وہ گھر؟ خود اس کی طرح اس کا گھر بھی مسمار حالت میں پڑا تھا۔ وہ گھر اب گھر نہیں رہا تھا۔ وہ تو کھنڈر کا ڈھیر بن چکا تھا۔ چاروں طرف سے سنسان اور خوفناک کھنڈر۔۔۔

امیر بہ مشکل آٹھ دس قدم اور آگے بڑھ سکا پھر اسے ایک پتھر پر بیٹھ جانا پڑا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے پیروں میں اتنی طاقت بھی نہ ہو کہ وہ اس کے جسم کا بوجھ اٹھا سکیں۔ گہرے اندھیرے اور دم گھٹتے ہوئے سناٹے میں وہ بڑی دیر تک اپنے مکان کے کھنڈر کو گھورتا رہا اور پتھر پر بیٹھا بیٹھا سوچتا رہا۔ کتنی شاندار تھی وہ زندگی، کتنی خوبصورت تھی عظیمہ اور کتنا پیارا دوست تھا افلاطون؟ اِسی گھر کو چھوڑ کر افلاطون چلا گیا تھا سامنے جو کمرہ تھا اُسی کمرے میں اس کی بیٹی پیدا ہوئی تھی۔ اور اس طرف ایک باغ تھا جس میں وہ اپنی بیٹی کے ساتھ کھیلا کرتا تھا اور اسے دونوں ہاتھوں میں اُچھالتے وقت وہ اس کی شادی کے سپنے دیکھا کرتا تھا۔ اس وقت اسے یہ امید تھی کہ وہ اپنی بیٹی کے لیے کوئی شہزادہ ڈھونڈ لائے گا اور پھر دُھوم دھام سے اپنی بیٹی کی شادی رچائے گا۔ لیکن پھر اچانک ہی سب کچھ بکھر گیا۔ سارے سپنے ادھورے رہ گئے۔

اچانک ایک پرندے نے اپنے پر پھڑپھڑا کر اُسے چونکا دیا۔ اور تب اُسے احساس ہوا کہ وہ بہت زیادہ دیر اس جگہ بیٹھا رہ گیا ہے۔ جس کام کے لیے وہ یہاں آیا ہے وہ کام تو گھر کی حالت دیکھتے ہی اس کے ذہن سے نکل گیا تھا۔ ابھی تو اسے زمین میں دفن کی ہوئی دولت نکالنی تھی۔ وہ تیزی سے اُٹھا لیکن پھر اس کے قدم اس خیال سے رک گئے کہ کیا وہ دولت اب بھی وہاں ہوگی؟ اسے خوب اچھی طرح یاد تھا کہ اِسی نیم سے چار قدم مشرق کی جانب گڑھا کھود کر اس نے عظیمہ کے زیورات چھپا دیئے تھے۔ اُس وقت اسے معلوم نہیں تھا کہ خود اپنی چیز لینے کے لیے اُسے ایک دن چوروں کی طرح یہاں آنا پڑے گا ایک نوکیلے پتھر سے اس نے نرم زمین کو جلدی جلدی کھودنا شروع کیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اس کے مٹی والے ہاتھ کسی دھات کے برتن سے ٹکرا گئے۔ برتن کا احساس ہوتے ہی اس کا رواں رواں خوشی سے ناچ اٹھا۔ اس نے پیتل کا لوٹا باہر نکال کر اس پر سے مٹی ہٹائی تو اسے یاد آیا کہ پیتل کے لوٹے پر اس نے ایک کپڑا بھی باندھ دیا تھا۔ کپڑے کا خیال آتے ہی اس کے جسم میں خوف کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ اسے یاد آیا کہ اس وقت اس نے اپنا پیلا رومال اس لوٹے کے منھ پر باندھ دیا تھا۔ اور اپنی بیٹی کو یہ زیورات دینے اس کے لیے جتنے ضروری تھے، اُتنا ہی ضروری اس کے لیے وہ رُومال بھی تھا۔ کیونکہ وہ اس کا بے حد پسندیدہ رُومال تھا جس کے ذریعے اس نے ان گنت لوگوں کی جان لی تھی۔ اور اسی رُومال نے اسے اتنی کامیابی عطا کی تھی۔ اس نے بڑی بے چینی سے لوٹے پر سے رُومال ہٹایا اور لوٹے کے اندر ہاتھ ڈال دیا۔ زیورات سے اس کا ہاتھ ٹکرایا تو ایک بار پھر خوشی کی ایک لہر اس کے جسم میں دوڑتی چلی گئی۔ سونے کے کنگن، موتیوں کا ہار ہیرے جڑی ہوئی چوڑیاں، کانوں کے بالے اور دوسری دو چار چیزیں موجود تھیں۔ ان چیزوں کو پانے کے بعد وہ اب

جلد سے جلد مولوی کے گھر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ اس نے جلدی جلدی وہ تمام چیزیں اپنی گردن سے لٹکتے ہوئے جھولے میں ڈال دیں۔ پھر گھر کے کھنڈر کی طرف ایک نظر ڈالنے کے بعد وہ واپسی کے لیے مڑ گیا۔ اس جلد بازی میں وہ یہ بھی بھول گیا کہ اسے قدم قدم پر ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔

● مسجد کے برابر ایک چھوٹا سا ایک منزلہ مکان تھا جس کے دروازے پر دستک دیتے وقت امیر کا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ دروازہ کھولنے کے لیے ایک سات آٹھ سالہ لڑکی ہی آئے گی اور وہ گھور گھور کر اس لڑکی کو دیکھے گا۔ لیکن اس کا اندازہ غلط نکلا کیونکہ دروازہ خود مولوی نے ہی آکر کھولا تھا۔

"کون؟" بوڑھا مولوی حیرت اور تجسس سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ امیر کا حلیہ ہی کچھ ایسا تھا کہ اسے دیکھ کر ہر کسی کو حیرانی ہو سکتی تھی۔ لیکن چونکہ مولوی کے گھر کا دروازہ ہر شخص کے لیے کھلا رہتا تھا اس لیے امیر کو اندر آنے کی اجازت مل گئی تھی۔

اندر آکر امیر نے بڑی بے قراری سے چاروں طرف دیکھا لیکن ناامید ہو کر اس کی نظریں واپس مولوی کے چہرے پر آکر جم گئیں۔ "مولوی صاحب آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟"

مولوی اب گھور گھور کر اسے دیکھنے لگا۔ اسے امیر کا چہرہ شناسا لگا لیکن وہ اسے پہچان نہیں سکا۔

"میں امیر علی ہوں مولوی صاحب!"

یہ نام سن کر مولوی چونک پڑا اور اس کے بوڑھے چہرے پر پڑی ہوئی شکنیں تھوڑی دیر تک کانپتی رہیں جب وہ چند لمحوں تک کچھ نہیں بولا تو امیر نے خود ہی کہا۔ "کیا آپ نے یہ نہیں سنا تھا کہ آج سارے قیدیوں کی سزا معاف کر دی گئی ہے؟"

اچانک مولوی کو خیال آیا کہ اسے کسی مجرم سے بھی نفرت نہیں کرنی چاہیے۔ اِس طرح تو اُس کی عمر بھر کی بندگی اکارت چلی جائے گی۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ پھر اس نے امیر کو بیٹھنے کا کہا کیا اور بولا۔ "مگر تم یہاں کیوں آئے ہو؟"

یہ سوال سن کر امیر کو ایک جھٹکا سا لگا۔ مولوی اچھی طرح یہ بات جانتا تھا کہ اس کی بیٹی اس کے گھر پر ہے پھر بھی یہ پوچھ رہا ہے کہ یہاں کیوں آئے ہو؟ کیا ایک باپ اپنی بیٹی کو دیکھنے بھی نہیں آسکتا؟ کیا کسی ٹھگ کو اپنی اولاد سے محبت نہیں ہوتی؟

"میں اپنی بیٹی کو دیکھنے آیا ہوں۔" وہ درد بھری آواز میں بولا۔

"کس کی بیٹی؟" مولوی اپنی سفید داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ "امیر تم نے ہی تو کہلوایا تھا کہ اسے یہ معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ وہ ایک ٹھگ کی بیٹی ہے۔"

"آہ" امیر نے ایک سرد سی آہ بھر کر تھوک اپنے گلے سے نیچے اتارا اور پھر رُک رُک کر بولا۔ "مجھے یہ اچھی طرح یاد ہے مولوی صاحب! میں تو صرف ایک بار اسے دیکھنے آیا ہوں۔ میری آنکھیں اسے آخری بار دیکھنے کے لیے ترس رہی ہیں۔ جائیں اور جا کر اسے لے آئیں۔" اتنا کہہ کر اس نے اندر کی جانب نظر دوڑائی۔ "کہاں ہے وہ؟"

مولوی بالکل خاموش بیٹھا رہا۔ اس کے چہرے پر کسی قسم کے کوئی تاثرات دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ شائد وہ یہ فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ اسے ان دونوں باپ بیٹی کا ملاپ کرانا چاہیے یا نہیں؟

"امیر میاں وہ یہاں سکھی ہے۔ مولوی کے گھر میں تمھاری طرح ٹھاٹ باٹ تو نہیں ہیں۔ اس کے لیے نوکر چاکر بھی نہیں ہیں اور نہ ہی ریشمی لباس ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بھی وہ اس گھر میں دُکھی نہیں ہے۔"

"مجھے اس کا یقین تو کر لینے دیجیے مولوی صاحب" امیر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "بیٹی سے ملنے کی خوشی میں تو آپ کا شکریہ ادا کرنا بھی بھول گیا۔ کسی کا بھی سہارا نہیں تھا تو میری معصومہ کو آپ نے سہارا دیا۔ اس وقت میں نے یہ سوچ لیا تھا کہ اسے آپ کا پیار ملے گا اور اس چھوٹے سے گھر میں وہ ضرور خوش رہے گی۔"

"لیکن اس کے باوجود تم اس کے شکھ میں پتھر پھینکنے آئے ہو؟"

"پتھر پھینکنے؟" امیر بے حد سنجیدہ لہجے میں بولا۔ "مولوی صاحب کیا کوئی باپ اپنی بیٹی کے شکھ میں پتھر پھینکنا پسند کر سکتا ہے؟"

"تم اس کے باپ ہو۔ اسی لیے میں یہ بات کہہ رہا ہوں۔" مولوی نرمی سے بولا۔ "ایک باپ کو اپنی بیٹی کو دور سے دیکھ لینے پر تسلی نہیں ہو سکتی۔ وہ اسے اپنے قریب بلائے گا، اس کے سر پر ہاتھ پھیرے گا اور جذبات میں آکر بیٹی کہہ کر گلے سے لگا لے گا اور تب اس معصوم بچی کے دل میں الجھن سی پیدا ہو جائے گی۔ ایک سوال اس کے چھوٹے سے دماغ میں ہلچل سی مچا دے گا کہ اسے بیٹی کہہ کر پکارنے والا اور باپ کی طرح پیار کرنے والا شخص آخر کون تھا؟ اس سوال کا میں اسے کوئی جواب نہیں دے سکوں گا لیکن اس کے باوجود وہ کہیں نہ کہیں سے اس کا جواب حاصل کر لے گی اور تب..." مولوی ایک سانس میں بولتا چلا جا رہا تھا کہ اچانک امیر نے اس کے پیر پکڑ لیے اور گڑگڑاتے ہوئے بولا۔ "نہیں مولوی صاحب میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں میں اسے بیٹی کہہ کر نہیں پکاروں گا بس ایک بار اسے یہاں بلوا دیں۔ مجھے آخری بار اپنی اولاد کو دیکھ لینے دیں۔"

مولوی کے پاؤں امیر کے گرم آنسوؤں سے بھیگ گئے اور اس کا دل بھی پگھل گیا۔ پھر وہ محبت بھرے لہجے میں بولا۔ "پہلے تو اپنے آنسو پونچھ لو۔" امیر نے اپنی قمیص کی آستین سے جلدی جلدی اپنے آنسو، پونچھے اور مولوی کی طرف دیکھنے لگا۔

"معصومہ" مولوی نے آواز دی لیکن جب تھوڑی دیر تک کوئی جواب نہیں ملا تو وہ خود ہی امیر سے بولا۔ "پچھلے حصے میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ شائد آتش بازی دیکھ رہی ہوگی۔" کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ امیر کا بھی جی چاہا کہ وہ اس کے پیچھے جائے۔ لیکن مولوی سے کیا ہوا وعدہ یاد آتے ہی اسے خود کو قابو میں رکھنا پڑا۔

"بیٹی معصومہ" مولوی نے پھر آواز دی۔

"آئی ابا جان!" جواب میں ایک سُریلی سی آواز سنائی دی جس نے امیر کو بے چین بنا دیا اور وہ آواز کی مٹھاس میں کھو گیا۔

"بیٹی ایک پیاسا فقیر آیا ہے۔ اسے ذرا پانی پلا دو۔" کہہ کر مولوی لالٹین کی روشنی میں قرآن پاک کی تلاوت کرنے بیٹھ گیا۔

پانی کے مٹکے میں پیالہ ڈبونے کی آواز امیر کی سماعت سے ٹکرائی اور اس کی پیاسی آنکھوں کی پُتلیاں گردش کرنے لگیں۔ لکڑی کے ادھ کھلے دروازے میں سے ننھی معصومہ اپنے دونوں ہاتھوں میں پانی کا پیالا اٹھائے آتی دکھائی دی تو امیر ایک جھٹکے سے گھٹنوں کے بل فرش پر بیٹھ گیا۔ دھیرے دھیرے ہنستی مُسکراتی ہوئی بچی بے خوف و خطر امیر کی طرف بڑھتی چلی آ رہی تھی اور امیر کا دل آہستہ آہستہ اتنی تیزی سے دھڑکنے لگا تھا جیسے وہ اُچھل کر اس کے حلق میں آجائے گا۔ بوڑھا مولوی اگر باپ بیٹی کے ملن کو بیٹھا نہ دیکھ رہا ہوتا تو شائد امیر خود آگے بڑھ کر معصومہ اور خود کے درمیان کا فاصلہ ایک جھٹکے میں مٹا دیتا۔

"کتنی بڑی ہو گئی ہے میری بچی۔ بالکل عظیم کی طرح ہی دکھائی دے رہی ہے۔ اِس کی مسکراہٹ کتنی دلکش ہے، کتنی دھیمی دھیمی چال ہے اس کی؟" امیر دل ہی دل میں سوچ رہا تھا۔

"آؤ بیٹی آؤ۔" اس کا دل پُکار اٹھا۔ لیکن اس نے ان الفاظ کو زبان پر نہیں آنے دیا۔ اُس کے بالکل قریب آکر معصومہ نے پانی کا پیالہ آگے بڑھا دیا اور اس طرح ایک ٹک اِس اجنبی فقیر کو دیکھنے لگی جیسے اس کی آنکھوں میں اُمنڈتی ہوئی محبت نے اس کے اندر ایک سنسناہٹ سی پیدا کر دی ہو۔ امیر بھی پیالہ لینے کے لیے ہاتھ بڑھائے بغیر ایک ٹک اپنی بچی کو گھورتا رہا۔ اور اگر مولوی نے کھنکار کر اسے چونکا نہ دیا ہوتا تو ممکن تھا کہ اس کے کانپتے ہوئے ہونٹوں سے لفظ "بیٹی" نکل پڑتا۔

امیر نے بہ مشکل اپنے کانپتے ہاتھ پانی کا پیالہ لینے کے لیے بڑھائے تو پیالے سے تھوڑا پانی چھلک پڑا اور پھر جب بیٹی کے چہرے پر نظریں جمائے وہ پانی

پینے لگا تو پانی اس کی داڑھی کو بھی سیراب کرنے لگا۔ یہ دیکھ کر ننھی معصومہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ اچانک امیر کا دوسرا ہاتھ اس کے سر سے ٹکرایا اور اس دو گھڑی کے ملمس نے امیر کے دل کو گدگدا دیا۔

"پیالہ لے کر اندر جاؤ بیٹی!" مولوی کی کرخت آواز نے امیر کے دل کو جھنجھوڑ دیا۔ "جب تک میں تلاوت کرلوں اس وقت تک کھیل لو۔"

اور معصومہ دو چار بار پیچھے مڑ مڑ کر اس اجنبی فقیر کو دیکھتی ہوئی اندر چلی گئی۔ امیر کی نظریں اس کے قدموں سے لپٹی ہوئی دروازے تک چلی گئیں۔ اس کا ایک ہاتھ بھی تک اُوپر ہی اُٹھا ہوا تھا۔ اور داڑھی پر پھیلتے ہوئے پانی کو پونچھنے کے لیے اس نے دوسرے ہاتھ سے کمر میں اڑسا ہوا پیلا رُومال نکال لیا۔ یہ عمل بے اختیار ہی اس سے سرزد ہو گیا تھا۔ اسے تو دھیان بھی نہیں تھا کہ اس نے جلدی میں اپنی کمر سے اپنا قاتل رومال کھینچ نکالا ہے۔

"اب تمھاری پیاس بجھ گئی؟" مولوی کے اس سوال نے امیر کو چونکا دیا۔ اس نے اپنے پیلے رُومال کو مولوی کی نظروں سے چھپانے کی کوشش کی اور اُسے جلدی سے اپنے گھٹنوں کے نیچے سرکا دیا۔

"شکریہ مولوی صاحب!" امیر اپنی نم پلکوں کو جھپکاتے ہوئے بولا۔ "بھلا من کی پیاس کیسے بجھ سکتی ہے؟ لیکن پیاسے کو دو گھونٹ پانی مل گیا۔"

"تو اس سے قبل کہ کوئی یہاں آجائے..." مولوی کے اس ادھورے جملے میں ہی امیر سمجھ گیا کہ اس کی موجودگی اب مولوی کو کھٹکنے لگی ہے۔ ایک طرح سے تو اس کا بھی زیادہ دیر یہاں ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں تھا لیکن جانے سے پہلے وہ اپنی بیٹی کی امانت مولوی کو سونپ جانا چاہتا تھا۔

"آپ سے میری ایک گذارش ہے" کہہ کر امیر تھیلے میں سے زیورات نکالنے لگا۔ مولوی خاموش ہی رہا۔ امیر دونوں ہاتھوں میں زیورات کی پوٹلی اٹھائے اس کے قریب آگیا اور بولا۔

"میں یہ امانت آپ کو سونپ رہا ہوں۔"

"کیا ہے یہ؟" مولوی پوٹلی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "یہ کس کی امانت ہے؟"

"بیٹی کے لیے زیورات ہیں۔" امیر کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ "اس کی شادی کے وقت کام آئیں گے۔"

"نہیں نہیں۔" مولوی کی داڑھی تھرتھرانے لگی۔ "لوگوں سے لوٹی ہوئی دولت کو میں ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا اور نہ ہی اس معصوم بچی کو میں یہ زیورات پہناؤں گا۔"

امیر کے پھیلے ہوئے ہاتھوں کی کلائیوں میں ایک جھٹکا سا لگا اور وہ مولوی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ "مولوی صاحب یہ پاپ کی کمائی نہیں ہے۔ میں سچ کہہ رہا ہوں کہ یہ زیورات معصومہ کی ماں اپنی شادی کے وقت پہن کر میرے گھر آئی تھی۔"

مولوی اُسے ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے وہ اس کے اندر جھانکنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اسے امیر کی اس بات میں سچائی کی جھلک نظر آرہی تھی لیکن اس کے باوجود وہ اپنا اطمینان کیے بغیر ان زیورات کو لینا نہیں چاہتا تھا۔ اسی لیے اس نے امیر سے کہا۔ "اگر یہ سچ ہے تو اس قرآن پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاؤ کہ یہ زیورات پاپ کی کمائی کے نہیں ہیں۔"

ایک پل کے لیے امیر کا ہاتھ کانپ گیا۔ قسم اور قرآن کا نام سن کر وہ کچھ گھبرا سا گیا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے یہ گھبراہٹ خود پر سے اتار پھینکی۔ اور زیورات کی پوٹلی ایک طرف رکھ کر اس نے اپنے دونوں ہاتھ قرآن پاک پر رکھ دیئے۔ "میں قسم کھاتا ہوں مولوی صاحب کہ اس پوٹلی کی ایک بھی چیز میری ناجائز کمائی سے خریدی ہوئی نہیں ہے۔" یہ کہتے ہی اُسے نہ جانے کیا ہوا کہ مولوی صاحب سے اجازت لیے بغیر وہ زیورات کی پوٹلی وہیں چھوڑ کر وہ اُٹھ گیا۔ اور سلام دُعا کیے بغیر ہی تیزی سے باہر نکل گیا۔

لیکن جالان شہر کی سرحد پار کرنے تک اُسے اس بات کا خیال ہی نہیں آیا کہ وہ اپنا پیلا رُومال تو مولوی کے گھر ہی بھول آیا ہے۔

منزل بغیر کے مسافروں کی طرح امیر اور رامُو راستہ طے کرتے چلے جا رہے تھے۔ جالان سے دور نکل جانے کی خواہش میں اُنھوں نے کہیں آرام بھی نہیں کیا تھا۔ چلتے چلتے وہ کوئی جنگلی پھل وغیرہ کھا کر پانی پی لیتے تھے۔ اُن کے پاس ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ انھوں نے جو کپڑے پہن رکھے تھے اس کے سوا کوئی مال سامان اُن کے پاس نہیں تھا اور راستے میں ابھی تک انھیں کوئی مسافر بھی نہیں ملا تھا برسات کے اس موسم میں لوگ کم ہی سفر پر نکلتے تھے۔

"کوئی مسافر اگر مل بھی جائے تو بھی وہ ہمارا لباس اور حلیہ دیکھ کر بدک جائے گا۔" رامُو چلتے چلتے بڑبڑایا لیکن امیر نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔ اس کے دماغ میں تو ابھی تک جالان میں گذاری ہوئی پُرتعیش زندگی کی پرچھائیاں ناچ رہی تھیں اور بیٹی کا خیال دل کے اندر چکرا رہا تھا۔ وہ اس طرح پیچھے مڑ مڑ کر دیکھ لیا کرتا تھا جیسے وہ اُن چیزوں کو دوبارہ حاصل کرلے گا جنھیں وہ چھوڑ کر جا رہا ہے۔

"ہمارے پاس تو کلہاڑی بھی نہیں ہے۔ لاش کے دفنانے کے لیے گڑھا کس سے کھودیں گے؟" لیکن جب امیر نے اُس کی اس بات کا بھی جواب نہیں دیا تو رامُو ذرا غصّے بھرے لہجے میں بولا۔ "میاں اب یہ تو بتا دو کہ جانا کہاں ہے؟"

"یہ راستہ کس طرف کو جاتا ہے؟" امیر نے اُسکی طرف دیکھے بغیر یونہی پوچھ لیا تو رامُو اُلجھن میں پڑ گیا پھر جواب دیتے ہوئے بولا۔ "ابھی تو یہ راستہ ایک ہی طرف کو جا رہا ہے لیکن آگے جا کر یہ دو حصّوں میں بٹ جائے گا۔ ایک شیوا پوری کی جانب اور دوسرا..."

"بس تو ہمیں شیوا پوری ہی جانا ہے۔" امیر اُسکی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول پڑا پھر پیچھے کی جانب مڑ کر دیکھتے ہوئے آگے بولا۔ "وہیں اپنے پرانے ساتھیوں کو تلاش کرنے کے بعد دسہرے کے موقع پر ہم سفر پر روانہ ہو جائیں گے۔"

"میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔" رامُو اس کا ارادہ تاڑ گیا تھا۔ جیل میں اکثر امیر یہ بڑبڑاتا رہتا تھا کہ وہ اپنی بقیہ زندگی خدا کی عبادت میں گذار دے گا۔ اُس وقت رامُو کو اس کی یہ بڑبڑاہٹ کھٹکنے لگی تھی۔ پچھلے دو سال سے تو امیر نے جیل سے فرار ہونے کی ترکیبیں بھی سوچنا چھوڑ دی تھیں۔ لیکن اب رہائی کے بعد خود امیر نے سفر پر جانے کی بات کہی تو اسے بڑی حیرت سی ہوئی اور وہ سوچنے لگا کہ اگر ایک بار امیر کے دل میں پہلے جیسا جوش اور ولولہ جاگ گیا تو امیر ایک بار پھر اپنے قدم جما سکتا ہے۔ اسی لیے تو اس نے امیر کا ساتھ نہیں چھوڑا تھا اور نہ ہی وہ یہ چاہتا تھا کہ امیر ٹھگی کے سوا کسی اور راستے پر چل پڑے دو سمتوں میں جانے والے راستوں کے موڑ پر آکر امیر نے شیوا پوری جانے والی سڑک پر قدم رکھنے سے پیشتر ایک بار پلٹ کر جالان کی جانب دیکھ لیا۔ پھر ایک گہرا سانس لے کر اس نے اپنی گذری ہوئی زندگی کو آخری سلام کر دیا۔

دوپہر ڈھلتے ہی اس کے چہرے پر تھکن کے آثار دکھائی دینے لگے اور بھوک کی شدّت بھی تیز ہو گئی۔ اب شام ہونے سے قبل ان کے لیے ایک آدھ شکار کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ رامُو کی بے چینی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ لیکن امیر تھکن، بھوک اور ماضی کی ہر یاد کو بھلانے کی کوشش کرتا ہوا مسلسل آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ چلتے چلتے یکایک اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی لہرانے لگی۔

"وہ دیکھو رامُو اس کنویں کے قریب کوئی مسافر آرام کرتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔" اس نے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے رامُو سے کہا۔ اور رامُو اس کی یہ بات سن کر تقریباً اچھل پڑا۔

"کہاں ہے؟" دھوپ سے بچنے کے لیے رامُو اپنی آنکھوں پر ہاتھ سے سایہ کرتے ہوئے بولا۔ "اکیلا ہی نظر آرہا ہے۔"

"ہاں" امیر کی آنکھوں میں ایک عجیب سی سُرخی دوڑ گئی۔ "اکیلا ہی لگتا ہے۔ کسی قریبی گاؤں کے سفر کے لیے نکلا ہے۔ تم اس سے زیادہ مت بولنا۔ مجھے ہی اس معاملے سے نپٹ لینے دینا۔"

پورے پانچ برس بعد انھوں نے کسی شکار کو اپنے

قریب پایا تھا۔ اُس شکار کو دیکھ کر ان دونوں کے اندر چھپا ہوا ٹھگ شیطان جاگ پڑا تھا۔ وہ دراصل شکار کے مقصد سے سفر پر نہیں نکلے تھے اور نہ ہی انھوں نے دیوی کی پوجا کی تھی اور نہ ہی شگون وغیرہ دیکھا تھا لیکن پھر بھی انھوں نے یہ کہہ کر خود کو تسلی دے لی تھی کہ جن حالات سے وہ دوچار ہیں اُن حالات میں انھیں شکار کرنے کی پوری پوری اجازت ہے۔

"کوئی مسلمان مسافر ہی لگتا ہے۔" قریب آتے ہی امیر نے اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔ "شائد ظہر کی نماز پڑھنے کے لیے ٹھہر گیا ہوگا۔"

جیل میں امیر خود بھی پانچ وقت کی نماز پڑھنے لگا تھا "السلام علیکم" اس نے مسافر کے قریب آکر مسکراتے ہوئے کہا۔ "خدا اپنے بندوں کی مُرادیں پوری کرنے میں ضرور مددگار ثابت ہوتا ہے۔"

رسّی کے ذریعے کنویں سے پانی کھینچتا ہوا مسافر اچانک ہی چونک پڑا۔ "وعلیکم سلام" کہہ کر اس نے پلٹ کر امیر کی طرف دیکھا تو امیر کو لگا کہ اس کے ہونٹوں کی مُسکراہٹ یکایک ہی بجھنے لگی ہے۔ وہ سمجھ گیا کہ شاید اس کے لباس کو اور اس کے حلیے کو دیکھ کر مسافر نے کوئی اچھا اثر نہیں لیا ہے۔ اسی لیے وہ اس کے پوچھنے سے قبل ہی بول پڑا۔ "جناب جالان کے راجا نے یہ کپڑے نہیں اتارے ہیں۔ یہی اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔" امیر کی یہ بات سن کر رامُو کو لگا کہ کہیں امیر کا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا ہے کہ وہ جیل سے چھوٹنے کی باتیں کرنے لگا ہے! لیکن اس کے استاد کی چالاکی تو اگلے جملے سے ہی ظاہر ہوگئی۔ امیر آگے کہہ رہا تھا "آپ کو تو معلوم ہی ہوگا کہ جالان کے مرحوم راجا کا بیٹا آج گدی نشین ہوا ہے۔ ان باپ بیٹے میں کیسی دشمنی تھی اِس کا بھی آپ کو علم ہوگا۔ صبح وہ گدی پر بیٹھا لیکن شام ہوتے ہوتے اس نے اپنے باپ کے اس وفادار ساتھی کی تمام جائیداد ضبط کرلی۔ ظالم نے ایک جوڑی کپڑا اور ایک وقت کی روٹی بھی ساتھ لینے نہیں دی اور اسی حالت میں مجھے سرحد کے باہر دھکیل دیا گیا۔"

رامُو نے دیکھا کہ اتنی ہی دیر میں اجنبی مسافر کی آنکھوں سے ہمدردی کا اظہار ہونے لگا تھا اور امیر اُسے سمجھنے کا موقع دیئے بغیر کہہ رہا تھا۔ "گذشتہ کل تک کہاں کہاں اور خدمت گاروں کی سلامی لینے والا اور گھوڑے کے بغیر ایک قدم بھی نہ چلنے والا امیر آدمی آج ننگے پاؤں خالی پیٹ راستہ ناپ رہا ہے۔"

"لیکن اس کے باوجود آپ کی اصلیت چھپی ہوئی نہیں رہتی۔" مسافر کے ان الفاظ نے رامُو کو چونکا دیا۔ امیر کو یہ ایک جھٹکا سا لگا تھا لیکن اس نے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا اور مسافر کو آگے کہنے دیا۔ "آپ نے جس تہذیب سے اسلام وعلیکم کہا تھا اُسی سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ آپ یقیناً کوئی خاندانی آدمی ہیں۔"

یہ سن کر امیر ہنسا اور سمجھ گیا کہ یہ شخص کہنا کچھ اور چاہتا تھا لیکن کہہ کچھ اور رہا ہے۔ مگر رامُو نے اطمینان کا سانس لیا اور دل ہی دل میں اپنے آپ سے بولا۔ اب یہ مسافر امیر کے جال میں پھنس چکا ہے۔

"میں نماز کے لیے وضو کرلوں۔ اس وقت تک آپ کو دم لے لیں۔" مسافر نے کہا۔ "اس کے بعد ہم ساتھ ہی بیٹھ کر کھائیں گے۔" اتنا کہہ کر اس نے لوٹا اُٹھایا اور جاتے جاتے رامُو کی طرف دیکھ کر امیر سے بولا۔ "شائد آپ کا یہ ساتھی جالان سے ہی آرہا ہے؟"

"ہاں یہ میرا وفادار ملازم ہے۔" امیر نے درد بھری آواز میں کہا۔ "میں نے اسے بہت سمجھایا کہ میرے ساتھ تم کیوں پریشان ہو رہے ہو۔ لیکن یہ ضد کرنے لگا کہ میں نے آپ کا نمک کھایا ہے اس لیے زندگی بھر آپ کو نہیں چھوڑوں گا۔"

یہ سن کر مسافر نے تعریفی نظروں سے رامُو کی طرف دیکھا اور پھر بولا۔ "شریف لوگوں کو ملازم بھی وفادار ملتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ لوٹا لے کر چل پڑا۔ اس کے جاتے ہی رامُو نے آنکھ دبا کر دھیرے سے کہا۔ "مان گئے استاد! نو برس جیل میں رہنے کے باوجود تمھارے دماغ نے کام کرنا نہیں چھوڑا۔ تم نے تو دو گھڑی میں ہی اسے رام کرلیا۔"

جھاڑیوں کی طرف جاتے ہوئے مسافر کی پیٹھ کو چند لمحوں تک تاکنے کے بعد امیر کنویں کے اندر جھانکنے لگا۔

بولا۔ "ارے واہ تو گڑھا کھودنے کی بھی ضرورت نہیں پڑیگی۔ دو پتھر باندھ کر ہم لاش کو اس کنویں میں پھینک دیں گے۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔ جب وہ نماز پڑھ رہا ہوگا تب ہم اس کے گلے میں رُومال ڈال دیں گے۔" رامُو نے جلد بازی دکھائی تو امیر کا ہاتھ خود بخود اپنی کمر پر رینگ گیا مگر دوسرے ہی پل وہ چونک پڑا۔ "ارے میرا رُومال! مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ معصومہ کے زیورات کے ساتھ میں نے رومال بھی لوٹے کے اندر سے نکالا تھا اور چلتے وقت اسے اپنی کمر میں ہی رکھا تھا!"

ٹھیک اسی وقت وہ مسافر پانی کا لوٹا خالی کر کے اُٹھتا ہوا دکھائی دیا تو امیر جلدی سے آگے سوچتا ہوا بولا۔ "رامُو نماز کے وقت بھلا میرا ہاتھ اس پر کیسے اٹھ سکے گا! ہمیں اتنی جلدی بھی نہیں کرنا چاہیئے۔"

رامُو کو یہ بات کچھ عجیب سی لگی لیکن اس سے پہلے کہ مسافر ان کے قریب آجائے اس نے دھیمی آواز میں کہا "لیکن اس نے ساتھ کھانا کھانے کی بات کہی تھی۔ کیا اس کے ساتھ کھانا کھا لینے کے بعد تمھارا ہاتھ اس پر اٹھ سکے گا؟"

لیکن اب امیر کے پاس جواب دینے کا وقت نہیں تھا وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس مسافر کو اُن پر کوئی شک ہوجائے اسی لیے وہ جلدی سے بات بدل کر بولا۔ "رامُو میں بھی وضو کر کے نماز پڑھ لوں۔ اس وقت تک تم بھی ذرا ہاتھ منھ دھو کر آرام کرلو۔"

امیر کی یہ بات سن کر مسافر نے لوٹا اس کے آگے کر دیا اور بولا۔ "مجھے یقین تھا کہ آپ جیسا شریف آدمی نماز تو چھوڑ ہی نہیں سکتا۔"

رامُو کی نظریں مسافر کی سونے کی انگوٹھی پر جمی ہوئی تھیں جو اس کے داہنے ہاتھ کی اُنگلی میں چمک رہی تھی۔ امیر نے اس کی اس حرکت کو تاڑ لیا تھا۔ اس لیے وہ اس کی توجہ ہٹاتے ہوئے بولا۔ "یہ لو لوٹا اور کنویں میں سے پانی بھر لاؤ۔"

ٹھیک اسی وقت مسافر نے امیر سے پوچھا۔ "جناب میں آپ کا نام تو پوچھنا ہی بھول گیا۔"

امیر کی ایک خاصیت تھی کہ جہاں تک ہوسکے اپنا نام کسی سے نہ چھپاتا۔ کیونکہ اکثر غلط نام بتانے سے پریشانیاں پیدا ہوجاتی ہیں اور پھر یہ مسافر اب زیادہ دیر تک زندہ رہنے والا ہی کب ہے؟ اس خیال کے آتے ہی وہ بولا۔ "میرا نام امیر علی ہے اور میں ذات کا سیّد ہوں۔"

مسافر پر جب اس کا نام سن کر بھی کوئی اثر نہیں ہوا تو اس نے خود ہی مسافر سے پوچھ لیا۔ "اور آپ کی تعریف؟"

"مجھے حسن علی کہتے ہیں۔" جواب دینے کے بعد اس نے پوچھا۔ "امیر علی آپ کہاں جانے کا ارادہ رکھتے ہیں؟"

"شیوا پوری۔" امیر نے بے دھڑک کہہ دیا۔ "اور شیوا پوری کا نام سنکر مسافر کی آنکھیں بھی چمکنے لگیں۔" "وہ تب تو ہم دونوں کی ایک ہی منزل ہے۔" پھر اس سے پہلے کہ وہ امیر سے یہ پوچھتا کہ شیوا پوری میں کس کے گھر قیام ہوگا! امیر یہ کہہ کر آگے بڑھ گیا کہ نماز کے لیے دیر ہو رہی ہے۔

لیکن دیر سویر یہ سوال تو اٹھنا ہی تھا۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد جب وہ لوگ کھانا کھانے بیٹھے تو رامُو بھوکے بھیڑیے کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ امیر کو بھی سخت بھوک لگی ہوئی تھی۔ لیکن اس کے باوجود اس نے بے صبری کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ وہ بیٹھے بیٹھے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے مسافر کے بارے میں اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہ شخص اس کے رُومال کا زور کتنی دیر تک برداشت کرسکے گا؟ مسافر اس سے عمر میں چار پانچ سال بڑا دکھائی دے رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں سمجھداری کی چمک دکھائی دے رہی تھی۔ امیر نے اندازہ لگایا کہ بہت زیادہ دولت مند نہیں ہے لیکن بہت معمولی آدمی بھی نہیں ہے۔ اس کے پاس سے اتنی رقم تو ضرور حاصل ہو جائے گی کہ دسہرے تک ان کا گذر ہوسکتا تھا۔

"شیوا پوری میں آپ کس کے مہمان ہوں گے؟" حسن علی نے امیر کو خیالوں سے چونکا دیا۔ "آپ کے تو بہت سے رشتہ دار وہاں ہوں گے؟"

"ہاں" امیر نے جواب میں ایک گہرا سانس لیا۔ "رشتہ داروں کی تو کمی نہیں ہے۔ لیکن دولت ہاتھ سے نکل جاتی ہے تو سب رشتہ دار بھی مُنھ پھیر لیتے ہیں اس لیے یہ فیصلہ تو وہاں پہنچ کر ہی ہوگا کہ کس کا مہمان بنا جائے؟"

"ٹھیک بالکل ٹھیک" حسن علی روٹی کا نوالہ چباتے ہوئے بولا۔ "اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میرے مہمان بن جائیں۔"

امیر کا ہاتھ ایک جھٹکے سے اس کے مُنھ تک جاتے جاتے رک گیا اور وہ سوچنے لگا کہ جس آدمی کو وہ کھانا کھانے کے بعد ختم کر دینے کی سوچ رہا ہے وہی آدمی اسے جانے پہچانے بغیر اپنا مہمان بننے کی پیشکش کر رہا ہے۔ رامُو کو بھی یہ بات کھٹک رہی تھی کہ کہیں امیر پھسل نہ جائے۔ امیر کو خاموش دیکھ کر حسن علی نے اور زیادہ زور دیتے ہوئے کہا۔ "شیوا پوری کے مرحوم ٹکھیا مائی دین کا نام تو آپ نے سنا ہی ہوگا؟"

اتنا سننا تھا کہ امیر کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

●

مائی دین ٹکھیا ایک زمانے میں اس کے باپ ابراہیم کا گہرا دوست تھا۔ پھر بعد میں اس نے اس کے باپ سے دھوکہ کیا اور اسے ہاتھی کے پیروں تلے کچلوا دیا۔ امیر نے دیکھا کہ حسن علی اس کی خاموشی کو دیکھ کر خود ہی چپ ہو گیا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے فوراً ہی خود پر قابو پا لیا اور بولا۔ "ہاں تو کیا کہہ رہے تھے آپ؟"

"یہی کہ میں ان کا داماد ہوں۔" حسن علی نے کہا۔

امیر کو یہ دوسرا جھٹکا لگا تھا۔ حسن علی ٹکھیا چاچا مائی دین کا داماد اور اُس روشن کا شوہر تھا جو امیر علی سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ اس نے اپنے ماتھے پر آئے ہوئے پسینے کو بائیں ہاتھ سے پونچھا اور سوچنے لگا کہ جس شخص کو وہ پرایا اور اجنبی سمجھ رہا تھا وہ تو بہت ہی نزدیک کا جاننے والا نکلا تھا۔

"مائی دین چاچا کے انتقال کے بعد اُن کی بیٹی سے میری شادی ہوئی تھی۔" حسن علی کہہ رہا تھا۔ "اُن کی زمین جائیداد وغیرہ سنبھالنے والا چونکہ کوئی نہیں تھا اس لیے مجھے گھر داماد بننا پڑا۔"

"اوہ تو یہ بات ہے؟" امیر کو مُسکرانا پڑا۔ "آپ تو واقعی قسمت والے ہیں۔ ٹکھیا چاچا کی بیٹی جیسی بیوی ملی۔ گھر ملا، عزت اور دولت ملی۔ اور کیا چاہیے۔"

حسن علی نے اس طرح نظریں جھکا لیں جیسے اس بہت شرم آ رہی ہو۔ "پھر تو لگتا ہے آپ نے میری کو دیکھا ہے؟"

"ارے میاں آپ تو صرف دیکھنے کی ہی بات کر ہیں؟" امیر جوش میں آ گیا لیکن بولتے بولتے پھر فوراً سنبھل گیا کہ روشن کے شوہر کے سامنے کوئی ایسی بات اس کے منھ سے نہ نکل جائے۔ "بات دراصل ہے کہ ٹکھیا چاچا سے میرے والد کی پرانی دوستی تھی جب بھی وہ شیوا پوری جاتے تھے تو انھیں کے یہاں ٹھہرا کرتے تھے۔ روشن کی مہمان نوازی ہم اب بھی بھول نہیں ہیں۔ اب تو اس بات کو برسوں بیت چکے ہیں۔"

رامُو جو اب تک کھانے میں مصروف تھا سخت اُلجھن سی محسوس کرنے لگا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ امیر کے آخری جملے میں رشتہ داری کی جو جھلک ہے وہ اصلی ہے یا نقلی؟

"اب تو آپ کو ہمارا ہی مہمان بننا ہے۔" حسن علی مُسکراتے ہوئے بولا۔ "اتنا بڑا گھر آپ جیسے مہمان سے بھرا بھرا سا لگے گا۔"

امیر اُس کی ہمدردی سے بہت زیادہ ہی متاثر نظر آنے لگا تھا۔ اسی لیے وہ جذباتی لہجے میں بولا۔ "اس کے سوا اور کوئی علاج بھی تو نہیں ہے۔ روشن کہیں یہ نہ سمجھے کہ میں اب اس کے گھر آنا ہی نہیں چاہتا۔"

یہ ساری باتیں کرنے کے بعد انھوں نے ہاتھ دھوئے اور پانی بھی پی لیا گیا۔ حسن علی اپنے مختصر سے سامان کو سمیٹنے لگا تھا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر رامُو نے امیر کو آنکھ ماری جیسے پوچھ رہا ہو۔ تیار

امیر کو اس کا یہ اشارہ بہت ہی بُرا لگا۔ اسے رامُو اس وقت بہت ہی چھچھورا آدمی لگ رہا تھا۔ اتنی باتیں ہونے کے باوجود رامُو یہ کیوں نہیں سمجھ رہا ہے کہ روشن کا شوہر بھلا اس کے ہاتھوں سے قتل کس طرح ہو سکتا ہے؟ اور یہ بات وہ رامُو کو اشارے سے کس طرح سمجھائے؟ چند لمحوں تک سوچتے رہنے کے بعد اچانک اس نے رامُو سے کہا۔ "رامُو اب میں

نے ارادہ بدل لیا ہے۔"

"کیا ارادہ؟" حسن علی نے یہ سن کر امیر کی طرف دیکھا۔

"اب آپ سے کیا چھپاؤں۔" امیر جلدی سے بولا "میرا ارادہ تو کسی مسافر خانے میں ٹھہرنے کا تھا لیکن اب میں آپ کا مہمان بنوں گا اور رامو اپنا انتظام کر لے گا۔"

"تھوڑی دیر بعد وہ تینوں شیوا پوری کے راستے پر آگے بڑھنے لگے۔ امیر اب روشن کے خیالوں میں گم تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ اس کے دل میں پرانے زخم کی یاد اب بھی شائد تازہ ہوگی۔ کیا وہ اسے عزت دے گی؟ کیا یہ حسن علی اس کے معیار پر پورا اتر رہا ہوگا؟ کیا وہ سُکھی ہوگی؟ کتنے بچوں کی ماں بن چکی ہوگی؟ وہ سوچتا جاتا تھا اور چپ چاپ آگے بڑھتا جاتا تھا۔

"آپ چپ کیوں ہو گئے امیر میاں؟ حسن علی نے اچانک پوچھا۔ "کیا سوچ رہے ہیں آپ؟"

"میں سوچ رہا تھا۔" امیر نے جواب ڈھونڈ نکالا "کہ اتنے برسوں کے بعد روشن کے گھر جا رہا ہوں۔ لیکن اس کے بچوں کو دینے کے لیے تو میرے پاس مٹھائی جیسی چیز بھی نہیں ہے۔"

"اس افسوس کی کوئی ضرورت نہیں ہے امیر میاں" حسن علی گمبھیر لہجے میں بولا "ہم نے ابھی تک اولاد کا منھ نہیں دیکھا ہے۔"

"ہوں" امیر علی چونک پڑا۔ "اتنے سالوں بعد بھی اولاد کا سُکھ نہیں دیکھ سکے؟" امیر نے اتنی تیز نگاہوں سے حسن علی کو گھورا جیسے وہ کوئی مجرم ہو۔ "آپ نے کوئی منت ونت مانی کہ نہیں؟" اُس کے اس سوال میں روشن سے محبت کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ لیکن اس کے باوجود حسن علی نے اطمینان سے جواب دیا۔ "اسی لیے تو جناب میں پچیس میل دور کے سفر پر گیا تھا۔ میں درگاہ پر حاضری دے کر ہی واپس آ رہا ہوں۔ ویسے ساری بات تقدیر کی ہے۔"

"ہاں سب تقدیر کی ہی باتیں ہیں۔" امیر نے ایک سرد آہ بھری۔ اسے اپنی حالت کا خیال آ گیا تھا۔ کتنے سالوں بعد خود اُسے اولاد کا منھ دیکھنا نصیب ہوا تھا۔ لیکن مجبوری آج وہ اپنی اولاد کا باپ نہیں ہے۔ تقدیر میں یہ نہیں لکھا کہ وہ اپنی بیٹی کو بیٹی کہہ کر بلا سکتا۔"

چلتے چلتے اچانک ہی امیر کی چال کچھ تیز ہوتی چلی گئی۔ اس کی سمجھ میں خود بھی یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ اسے شیوا پوری پہنچنے کی اس قدر جلدی کیوں ہو رہی ہے؟ کیا یہ روشن سے ملنے کی بے چینی تھی یا وہ یہ جاننے کے لیے بے قرار تھا کہ اولاد کے بغیر وہ کس قدر دُکھی ہے؟

جب شیوا پوری شہر کا دروازہ بند ہو رہا تھا تب وہ تینوں شہر میں داخل ہوئے۔ امیر نے رامو سے جُدا ہوتے وقت اسے ایک جانب لے جا کر سمجھا دیا۔ "تم اپنے پُرانے ساتھیوں کا کھوج لگا کر مجھے خبر دو اور یہ معلوم کرو کہ دھرم کے وقت سفر پر جانے کے لیے کتنے لوگ تیار ہیں؟ اور ان دنوں کس سردار کا زور سب سے زیادہ ہے۔ دو چار دنوں کے بعد نکھی کے گھر آ کر مجھے آگاہ کرتے رہنا۔"

مرحوم مائی دین نکھی کے گھر پر آ کر حسن علی نے گھر کے بند دروازے پر دستک دی۔ اس وقت اس کی آنکھیں روشن کو دیکھنے کے لیے ترس رہی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا روشن اب کیسی دکھائی دیتی ہوگی؟ روشن کے خیال میں وہ یہ بات بالکل ہی بھول گیا تھا کہ وہ خود اب کیسا نظر آ رہا ہے!

اچانک بند دروازے کی زنجیر کھُل گئی۔ اور پھر گیٹ پر لگی ہوئی چھوٹی سی کھڑکی کا پٹ بھی کھُل گیا۔ لالٹین کی دھیمی روشنی میں ایک عورت کا چہرہ دکھائی دیا۔ یہ روشن تھی جو اپنے شوہر کو دیکھ کر "آ گئے آپ" کہتی ہوئی دروازے سے باہر آ گئی۔ پھر اس کی نظر اپنے شوہر کے پیچھے کھڑے ہوئے امیر پر پڑی تو اس کی آنکھیں اس طرح گردش کرنے لگیں جیسے وہ ایک اجنبی کو پہچاننے کی کوشش کر رہی ہوں اچانک امیر کھِل کھلا کر ہنس پڑا اور اس کی اس ہنسی نے اس کی شناخت کروا دی۔

"تم نے مہمان کو پہچانا یا نہیں؟" حسن علی اندر قدم رکھتے ہوئے بولا۔ "یہ امیر علی ہیں۔"

لیکن روشن کی آنکھیں تو اس کا نام سننے سے پہلے ہی چمکنے لگی تھیں۔ اُس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا لالٹین خود بخود ہاتھ کے ساتھ کانپنے لگا تھا۔ اس کے چہرے پر خوشی اور

اُداسی کے عجیب سے تاثرات گردش کرنے لگے تھے۔

"اب انھیں اندر بلاؤ گی یا پہچاننے میں ہی صبح کر دو گی؟" حسن علی کی آواز میں خوشی جھلک رہی تھی "سفر میں ان سے ملاقات ہو گئی اور میں انھیں زبردستی اپنے ساتھ لے آیا ہوں۔"

"بہت اچھا کیا ہے آپ نے" اچانک روشن خیالوں سے چونک کر پیچھے ہٹ گئی اور امیر کو اندر آنے کا راستہ دیتے ہوئے بولی۔ "آ جائیے۔۔ آ جائیے بھائی جان"

"بھائی جان" کا لفظ سن کر امیر کے اُٹھتے ہوئے قدم میں ایک جھٹکا لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ اُس کا استقبال تھا کہ طنز؟ اسے یاد آیا کہ جب آخری بار اُس نے اس حویلی میں قدم رکھا تھا تو اس کے سامنے نکھی مائی دین کا جنازہ پڑا ہوا تھا اور تب اس نے برادری کے لوگوں کے سامنے روشن کو بہن کہہ کر پکارا تھا۔ اُس وقت روشن بری طرح چونک پڑی تھی۔ اس بات کے یاد آتے ہی اسے لگا کہ شائد روشن بھی اسے بھائی جان کہہ کر اُسے وہ پرانی بات یاد دلانا چاہتی ہے۔

اسی اُلجھن میں اُلجھا ہوا امیر دھیرے دھیرے اندر داخل ہو گیا۔

●

چار چھ دنوں کے اندر ہی امیر کے چہرے پر رونق سی نظر آنے لگی تھی۔ روشن کو اپنی خدمت کرتے دیکھ کر اُسے اکثر حیرت سی ہونے لگتی۔ گھر میں اس کے شوہر اور ساس کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ بڑھاپے کی وجہ سے روشن کی ساس کی آنکھوں میں روشنی نہیں رہی تھی اور حسن علی دن بھر کھیتوں میں ہی مصروف رہتا تھا۔ اسی لیے روشن اور امیر کا بار بار آمنا سامنا ہو جاتا تھا۔ کبھی کبھی تو صرف ان کی نظریں ملتیں اور ایک دوسرے کی نظروں میں جب وہ ماضی کی پرچھائیاں رقص کرتے ہوئے دیکھتے تو خود بخود محتاط ہو جاتے۔ امیر کی کہانی ٹکڑوں ٹکڑوں میں سن کر روشن کی آنکھیں بھر آتی تھیں۔ لیکن امیر کو روشن سے سچی بات چھپانی پڑی تھی۔ اس نے روشن کو بتایا تھا کہ زچگی کے وقت ہی عظیمہ کا انتقال ہو گیا تھا اور وہ بھری دنیا میں تنہا رہ گیا۔ اتنا کہنے کے بعد اس نے ایک سرد آہ بھر کر آگے کہا۔ طویل عرصے تک کوئی عورت میرے ساتھ رہنے یہ میرے نصیب میں نہیں ہے۔"

یہ سن کر روشن کی آنکھوں میں ایک چمک سی لہرا گئی اور اس نے امیر سے پوچھ لیا۔ "عظیمہ بہن کے علاوہ تمھیں اور کتنی عورتوں کا تجربہ ہوا ہے؟"

امیر نے اس کا سوال سن کر اس کی طرف غور سے دیکھا اور دل ہی دل میں سوچنے لگا۔ "نہیں۔۔ روشن اس پر طنز نہیں کر رہی ہے بلکہ اس کی آنکھوں سے تو ہمدردی کا اظہار ہو رہا ہے۔ یہ اندازہ لگا لینے کے بعد وہ دھیرے سے بولا۔ "روشن گُل کی بات تو تم جانتی ہی تھیں۔ میں نے اسے اپنی بیوی بنانے کا خواب دیکھا تھا لیکن وہ اللہ کو پیاری ہو گئی۔"

"پھر؟" روشن کا خیال تھا کہ اب امیر شائد اس کا ہی نام لے گا۔ لیکن امیر نے اس کے متعلق کچھ نہیں کہا اور وہ بدستور اسی گمبھیر لہجے میں آگے بولا۔ "اس کے بعد میں یہاں آیا اور اسی جگہ سے سفر پر روانہ ہو گیا۔" کہتے کہتے امیر اس اُلجھن میں اٹک گیا کہ وہ زہرہ کے بارے میں روشن کو بتائے یا نہ بتائے؟ اسے خاموش دیکھ کر روشن بول اٹھی۔ "اور سفر میں ہی عظیمہ بہن سے ملاقات ہو گئی؟"

"نہیں۔ تم سے اب کیا چھپاؤں؟" روشن کو امیر کی یہ بات بہت ہی اچھی لگی۔ اسے خوشی ہو رہی تھی کہ وہ امیر کے اس قدر قریب ہے۔ امیر نظریں جھکائے کہہ رہا تھا "عظیمہ سے قبل مجھے زہرہ ملی تھی۔ سچ پوچھو تو اسی زہرہ نے میری جوانی کو جگایا تھا۔ میں اس پر مر مٹا تھا۔ اس کے قریب رہ کر مجھے ہر سُکھ مل رہا تھا۔ میں نے اسے اپنی شریکِ حیات بنانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ اچانک ہی ایک روز غائب ہو گئی اور پھر کبھی نہیں ملی۔"

"گُل اور زہرہ دو ہوئیں۔" روشن امیر کو ٹٹولنے کی کوشش میں پوچھ بیٹھی۔ "اور تیسری؟"

تیسری عظیمہ تھی جس کے بارے میں تم سب کچھ جانتی ہو روشن" امیر نے محبت اور ہمدردی سے اُس کی طرف

دیکھا۔ ان تینتوں میں سے کوئی بھی میرے ساتھ زیادہ عرصے تک نہ رہ سکی اور زندگی کا سکھ بار بار مجھے دغا دیتا رہا ہے تسکھ۔" روشن نے یہ ایک لفظ کہہ کر ایک گہرا سانس لیا اور پھر چپ ہو گئی۔ اسے اس طرح خاموش ہوتے دیکھ کر امیر نے کہا۔

"روشن میں تو ہر وقت اپنا ہی دُکھڑا روتا رہتا ہوں۔ تم تو اپنے بارے میں کچھ بتاتی ہی نہیں۔" امیر بہت دنوں سے جو سوال پوچھنا چاہتا تھا وہ اس وقت اس کی زبان پر آ ہی گیا۔ "سچ بتانا تم تو سُکھی ہو نا؟" امیر نے بڑی ہمدردی سے یہ سوال پوچھا تھا اور روشن کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی کپکپاہٹ آ گئی۔ اس کی پیشانی کی نسیں اُبھرنے لگی تھیں اور پھر گلے سے تھوک اتار کر اس نے اتنا ہی کہا "تمھارے آنے کے بعد کچھ سُکھ سا محسوس ہونے لگا ہے۔"

اتنا سنتے ہی امیر کی آنکھوں سے ہمدردی کے سوتے پھوٹنے لگے۔ یہ دیکھ کر روشن نے فوراً ہی کہا "میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ تمھارا دکھ جاننے کے بعد میں اپنے آپ کو سُکھی سمجھنے لگی ہوں۔"

امیر کو اس کی یہ بات کچھ عجیب سی لگی۔ کیونکہ اس کا تو خیال تھا کہ اس کے آنے کے بعد سے ہی روشن خوش رہنے لگی ہے اور شاید اب بھی اسے چاہتی ہے۔ اس کے دل میں اب بھی اس کی تمنا ہے۔ لیکن پھر بھی امیر کو لگ رہا تھا کہ روشن نے یہ بات اپنے دل سے نہیں کہی ہے کہ اس کا دُکھ جان لینے کے بعد وہ اپنے آپ کو سُکھی سمجھنے لگی ہے۔ وہ تو اس کے اندر تک پہنچنا چاہتا تھا۔

"روشن سچ بتاؤ تم اپنا غم چھپا کر اوپر سے ہنسنے کی کوشش کر رہی ہو نا؟" امیر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ "اولاد سے خالی گود تمھیں ڈس رہی ہے نا؟"

روشن عجیب انداز سے اسے دیکھنے لگی۔ اس کے سابقہ محبوب امیر نے اس کی دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ مگر کیوں؟ وہ اندر ہی اندر تڑپنے لگی اور پھر اچانک اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی "میرا دُکھ جان کر تم کیا کرو گے؟ کیا میرا دُکھ تم کم کر سکو گے؟" اتنا کہہ کر وہ تیز تیز قدموں سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ اور امیر جاتی ہوئی روشن کو دیکھ کر دل ہی دل میں سوچتا رہا کہ روشن یہ کیا کہہ گئی ہے؟ کیا اپنے خاوند سے وہ خوش نہیں ہے؟ لیکن اب اس کا علاج ہی کیا ہے؟ گھڑی بھر کے لیے امیر کو لگا کہ کاش اگر حسن علی کو وہ انجانے میں ختم کرنے کے بعد روشن سے ملا ہوتا تو؟ پھر فوراً ہی اس نے اس شیطانی خیال کو اپنے دل سے نکال دیا۔

●

"کیا خبر ہے رامو؟" پورے ایک ہفتے بعد رامو نے اپنا منھ دکھایا تھا۔ اسی لیے امیر نے پوچھا "کہاں غائب ہو گئے تھے تم؟"

"خبر تو بہت زیادہ اچھی نہیں ہے۔" رامو نے کندھے اُچکاتے ہوئے کہا "اس انگریز افسر نے تو پورے ملک میں اپنی دھاک بٹھا رکھی ہے۔ بڑے بڑے ٹھگ سردار لوگ کو اُس نے گرفتار کر لیا ہے۔ فرنگیا جیسے شیر کو اس نے بکری بنا دیا ہے جس کی وجہ سے بچے کھچے ٹھگ سفر پر جانے سے ڈرتے ہیں۔ ابھی تک صرف ایک گنیش سردار ہی ایسا ہے جو محفوظ ہے۔ وہی اکیلا بہادر ہے جو ولیم سرکار سے خوفزدہ نہیں ہے۔"

"صرف پانچ برسوں میں ہی ٹھگ بھائیوں کی یہ حالت ہو گئی؟" امیر دانت پیستے ہوئے بولا "شاید گورے صاحب کو ابھی کسی سر پھرے ٹھگ سے پالا نہیں پڑا ہے کیا گنیش کی تم سے ملاقات ہوئی ہے؟"

"نہیں گنیش سے تو میری ملاقات نہیں ہوئی لیکن اپنے ایک ساتھی کے ذریعہ اس نے پیغام بھیجا ہے۔" رامو نے کہا۔

"اس نے کہلوایا ہے کہ اگر امیر کو میرے ساتھ سفر میں شامل ہونا ہے تو اُسے میری مرضی کے مطابق کام کرنا ہو گا اور میرا کہنا ماننا پڑے گا۔"

"اچھا۔ اس کی یہ ہمت؟" امیر غرایا۔ "تب تو میں اپنا الگ گروہ بناؤں گا۔ اور اسے دکھا دوں گا کہ..."

"نہیں امیر میاں! اب یہ کام بہت ہی مشکل ہے۔" رامو نے امیر کو سمجھایا۔ "پانچ سال کی غیر حاضری نے تمھارے نام کا اثر مٹا دیا ہے۔ تمھیں پھر سے اپنا مقام بنانے کے

لیے گنیش کا سہارا لینا ہی پڑے گا۔ یہ بہت ہی ضروری ہے اور اس معاملے میں ضد کرنا بالکل ہی بیکار ہے۔"

رامو کی یہ دلیل سن کر امیر تھوڑی دیر تک تو کچھ سوچتا رہا۔ آخر کافی دیر بعد اس نے فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے رامو! گنیش کی شرط مجھے منظور ہے۔ اسکے ساتھ میری ملاقات کا بندوبست کر دو۔"

"بہتر ہے۔" کہہ کر رامو خوشی خوشی وہاں سے چلا گیا۔

◆

امیر جب گنیش سے ملنے گیا تو گنیش ایک چارپائی پر تر چھا لیٹا ہوا حقہ پی رہا تھا۔ امیر کو دیکھتے ہی وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ "آؤ امیر علی" کہہ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ مگر امیر کو اپنے قریب چارپائی پر بیٹھانے کی بجائے اس نے ایک جانب رکھے ہوئے اسٹول کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "بیٹھو۔"

ایک زمانے میں امیر جس کا سردار رہ چکا تھا اسی گنیش نے آج اُسے عزت نہیں دی تھی۔ اور یہ بات امیر کے دھیان سے باہر نہیں رہ سکی۔ یوں تو گنیش اسے پہلے ہی سے بد اخلاق اور بد تمیز آدمی لگتا تھا مگر کیا کیا جائے وقت بدل چکا تھا اور اس وقت گنیش کا ہی بول بالا تھا۔ ان حالات میں اگر وہ من مانی کرتا ہے تو اس میں حیرت کی بات ہی کیا ہے؟

تھوڑی دیر تک وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ گنیش اب بہت بوڑھا ہو چکا تھا۔ اس کی پوری داڑھی اور سر کے بال سفید ہو چکے تھے۔ اس کے خوفناک اور بدصورت چہرے کی شکنیں جو کبھی حد درجہ نکھری ہوا کرتی تھیں اب کچلی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ لیکن اس کے باوجود اس کی آنکھوں سے اب بھی شیطانیت جھانک رہی تھی۔ اس نے امیر کی جانب حقہ بڑھانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ اور بولنا شروع کر دیا "جیل میں رہ کر تو تم نے اپنے آدھے بال سفید کر لیے ہیں۔" ہمدردی کی بجائے اس کے لہجے میں طنز کی جو جھلک تھی وہ امیر سے چھپی ہوئی نہیں تھی۔ "اچانک کامیابی مل جانے سے لوگوں کو اچانک ہی ایسا جھٹکا لگتا ہے اور وہ بہت جلد ٹوٹ جاتے ہیں۔"

"مجھے اپنے آپ پر اور اپنی تقدیر پر پورا بھروسا ہے گنیش!" امیر نے اُسے پہلے کی طرح "تم" کہہ کر ہی مخاطب کیا۔ "تم ہی کہو اگر تقدیر بلند نہ ہوتی تو اس طرح اچانک جیل سے رہائی کیسے مل جاتی؟"

"تقدیر" گنیش بہت زور سے ہنسا۔ "آدمی یہ الفاظ اپنے آپ کو دھوکہ دینے کے لئے استعمال کرتا ہے مگر میں تو طاقت پر بھروسا کرنے والا آدمی ہوں۔" کہتے کہتے شاید اسے اپنے بڑھاپے کا خیال آ گیا تھا اسی لیے وہ اپنے لہجے میں نرمی پیدا کرتے ہوئے آگے بولا "اصل طاقت تو دل میں ہونی چاہیے۔ اس طاقت کے بغیر فرنگیا یا امیر علی بننے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔"

امیر کو اس کا یہ طنز بھی سخت ناگوار لگا تھا لیکن پھر بھی وہ اس تلخ گھونٹ کو پی جانے کے لیے مجبور تھا۔ وہ ہر قسم کے حالات سے نپٹنے کی تیاری کر کے ہی آیا تھا۔ وہ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں مُسکراتا رہا۔ اور گنیش اپنی دُھن میں کہہ رہا تھا "فرنگیا کو یہ گمان تھا کہ مجھ جیسا ٹھگ کوئی اور پیدا نہیں ہوا ہے۔ مگر جب طاقت دکھانے کا وقت آیا تو وہ اس گورے صاحب کے قدموں میں گر گیا۔ اور خود کو زندہ رکھنے کے لیے اس نے اپنے ٹھگ ساتھیوں سے غداری کرنا شروع کر دی۔ لعنت ہے اسکی زندگی پر۔"

امیر کو اس کی اس بات پر اعتراض کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ کیونکہ گنیش کی طرح وہ خود بھی فرنگیا پر دل ہی دل میں لعنت بھیجتا رہا تھا۔ گرفتار ہو جانے کے بعد اس نے اپنے دوسرے ٹھگ بھائیوں کی جانب اُنگلی اٹھانا شروع کر دی تھی۔ آخر اسے گورے صاحب کا غلام بن جانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ پہلے تو اسے یقین ہی نہیں آیا تھا کہ فرنگیا جیسا آدمی دل کا اتنا کمزور ثابت ہو گا۔

"اور امیر تم اچھی طرح سوچ لو" گنیش حقہ گڑگڑاتے ہوئے آگے بولا "ایک زمانہ میں ابراہیم سردار کا بول بالا تھا۔ مجھ پر بھی وہ رُعب ڈالتا رہتا تھا۔ اور کسی سے نہ دبنے والے اس گنیش کو وہ ہمیشہ دبانے کی کوشش

میں مصروف رہتا۔ لیکن اس کا کیا حال ہوا۔ ہاتھی کے پیروں تلے کچل کر مرنا ہی پڑا نا؟"

اب امیر سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ اپنے باپ کی بے عزتی کرنے والے گنیش کی داڑھی کھینچ کر وہ اس کے منھ پر ایک تھپڑ رسید کر دے لیکن پھر فوراً ہی اُسے خیال آ گیا کہ وہ ابراہیم سردار کا بیٹا ہے۔ اس کی خبر گنیش کو نہیں ہونی چاہیئے۔ اِسی لئے غصہ کا گھونٹ پی کر وہ خاموش رہ گیا۔

"بدری ناتھ، ابراہیم سردار کو بہت عزیز تھا۔ وہ جلد سے جلد سرداری حاصل کرنا چاہتا تھا۔" گنیش غصے سے، تھوک کر بولا۔ "اور اُس کا کیا حال ہوا؟ اپنی نئی ٹولی کا سردار بن کر وہ پہلی بار سفر پر روانہ ہوا۔ لیکن اس سفر سے وہ واپس ہی نہ آسکا۔"

"لیکن اب ان سب باتوں کو یاد کر کے ہمیں اپنے ٹھگ بھائیوں کی بُرائی کرنے سے کیا فائدہ ہے گنیش؟" امیر اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا۔ "تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ ابراہیم سردار اور بدری ناتھ بہادروں کی موت مرے تھے۔"

یہ سن کر گنیش کے چہرے کی شکنیں تنگ ہو گئیں۔ "امیر میں تمھیں یہ یاد دلانا چاہتا ہوں کہ جن لوگوں نے مجھ سے آگے بڑھ جانے کی کوشش کی ہے وہ لوگ آدھے راستے میں ہی ختم ہو گئے۔ مجھے اپنی ٹولیوں میں سے نکالنے والے لوگ خود ٹولی سے تو کیا دنیا سے ہی نکل گئے۔ تمھیں اگر میرے ساتھ سفر کرنا ہے تو تمھیں اپنی سابقہ سرداری کو بھول جانا پڑے گا۔ وقت اب میرے ہاتھ میں ہے۔ اور امیر علی کو اب گنیش کے ہاتھ کے نیچے ہی رہنا پڑے گا۔"

اس کے منھ سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ خنجر کی نوک کی طرح امیر کے دل میں چبھ رہا تھا۔ ایسے مغرور شخص کی تابعداری اس سے کیسے ہو سکتی تھی؟ اس کا جی چاہا کہ وہ وہاں سے اُٹھ کر چلا جائے۔ وہ یہ سوچ کر آیا تھا کہ گنیش کو اپنی غرض نہیں دکھائے گا۔ لیکن اس کی بجائے وہ گنیش کی بکواس سننے کے لیے کیوں بیٹھا رہ گیا ہے؟ مرتے وقت اس کے باپ نے بھی اس سے کہا تھا کہ گنیش سے ہوشیار رہنا مگر پھر بھی وہ خود چل کر گنیش کے پاس کیوں آ گیا ہے؟

اُسے تو اپنا کھویا مقام پھر سے حاصل کرنا تھا۔ ٹھگ سردار کی حیثیت سے اُسے ایک بار پھر اپنا نام جمانا تھا۔ اسے تو پہلے سے زیادہ مجنونی انداز میں اپنے سفر پر نکلنا تھا۔ اسے تو ٹھگوں کو نیست و نابود کرنے والے گورے صاحب کو سبق سکھانا تھا اور اپنے ماں کی بہت ساری باتوں اور بہت ساری یادوں کو پورا دینا تھا۔ عظیمہ کی محبت، افلاطون کی جدائی، بیٹی کا پیار اور کلیجے پر پڑے ہوئے ایسے بے شمار زخموں کو بھلا پڑے گا۔ اور ایسا کرنے کے لیے اُسے اس وقت گنیش جیسے شخص کی داد گیری کو برداشت کرنا ہی پڑے گا۔ ایک بار سفر پر نکل جانے کے بعد وہ اپنی الگ ٹولی میں ضرور کامیاب ہو جائے گا۔ اور پھر وہ گنیش کو ختم کر دے گا۔ اس کے بعد گنیش خود اس کے قدموں پر آ گرے گا۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ امیر وقت کی نزاکت کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ اور حالات سے سمجھوتہ کر لو۔ یہ ساری باتیں سوچ لینے کے بعد وہ اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ لا کر بولا۔ "گنیش کتنے ساتھیوں کے ساتھ سفر پر نکلنے کا ارادہ ہے؟ ٹولی بڑی ہوگی یا نہیں؟"

یہ سن کر گنیش ہنس پڑا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ امیر اس کی ٹولی میں شامل ہونے کی حامی تو بھر لی ہے لیکن سیدھی طرح اب بھی اپنا سر اُس نے نہیں جھکایا ہے۔ اسے اتنا ہی تو چاہیئے تھا۔ امیر پر اپنی سرداری کا رُعب ڈالنے کی جو خواہش اس کے دل میں تھی اُس خواہش کے پورا ہونے کا وقت اب آ چکا تھا۔ یوں بھی اُسے امیر جیسے ساتھیوں کی ضرورت تھی۔ اُسے اس بات کا تجربہ ہو چکا تھا کہ تیز دماغ والا امیر آڑے وقت میں ٹولی کے بچاؤ کی ترکیبیں ڈھونڈ سکتا ہے۔ اُسے اِس بات کا بھی احساس تھا کہ چونکہ وہ خود بدزبان اور بے حد جذباتی ہے مگر امیر میں یہ خاصیت تھی کہ وہ ہر موقع پر خود کو قابو میں رکھ کر اپنا کام نکال لیتا تھا۔

مسافروں کو میٹھی میٹھی باتوں میں الجھائے رکھنے میں بھی وہ خاصا ماہر تھا۔ وہ امیر کی شخصیت اور اس کی خوبصورتی سے بھی متاثر تھا۔ عمر ڈھل جانے کے باوجود اس میں جو کشش تھی وہ کم نہیں ہوئی تھی۔ وہ یہ بات بھی جانتا تھا کہ عورت پہلی نظر میں ہی آس پر لٹو ہو سکتی تھی۔ اِن سب باتوں کو سوچنے کے بعد وہ امیر سے بولا "میرا خیال ہے کہ تقریباً پچھتر ٹھگ اِس ٹولی میں ضرور شامل ہوں گے۔ لیکن ہمیں بڑی احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ ایک ایک ٹھگ کے بارے میں ہمیں اپنی تسلی کرنا پڑے گی۔ کیونکہ بہت سے پرانے ٹھگ بھی اس گورے صاحب سے مل چکے ہیں اور وہ اس کے مخبر بن کر ہماری ٹولی میں شامل ہو سکتے ہیں۔"

امیر نے اُس کی اِس بات پر کوئی توجہ نہیں دی۔ اور اپنے مقصد کی طرف آتے ہوئے بولا۔ "کمائی میں میرا کیا حصہ ہوگا؟"

گنیش نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ پھر اپنے مخصوص انداز میں ہنستے ہوئے بولا۔ "آج اُسے یہ سوال پوچھنا پڑ رہا ہے جو ایک زمانے میں اپنا حصہ دوسرے ٹھگوں کو بن مانگے دے دیا کرتا تھا۔"

گنیش کی یہ بات امیر کو بہت بُری لگی۔ اِس لیے وہ ذرا تُرش لہجے میں بولا۔ "گنیش اِس وقت اُن باتوں کو یاد کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ روٹھی ہوئی دولت جب واپس آئے گی تو یہ امیر علی پھر پہلے جیسا امیر علی ہی بن جائے گا۔"

"یہ تو بھگوان ہی جانے۔" گنیش نے درمیان میں ہی اُس کی بات کاٹ دی۔ "ویسے میں تمھیں بتا دیتا ہوں جتنا حصہ مجھے ملے گا اُس سے آدھا حصہ تمھارا ہوگا۔"

"ٹھیک ہے۔" امیر نے سوچے سمجھے بغیر ہی کہہ دیا اور دوپہر سے پہلے کی شام کو ملنے کا وعدہ کر کے وہاں سے چلا آیا۔

●

"پھر کب ملاقات ہوگی؟" روشن نے محبت بھرے لہجے میں یہ سوال پوچھا تو امیر تھوڑی دیر تک کوئی جواب ہی نہ دے سکا۔ پھر کبھی نہ مل سکیں گے۔ یہ کہنے کے لیے اُس کی زبان اُس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ کیا معلوم تقدیر دوبارہ اُن کی ملاقات کرا ہی دے۔ روشن کا کہا ہوا ایک ہی جملہ بار بار اسے جھنجھوڑتا رہتا تھا۔ "میرا دکھ تم کیا کم کر سکتے ہو؟"

روشن نے یہ بات کس مقصد سے کہی تھی؟ اُس کی اُلجھن اتنے دنوں بعد بھی وہ سلجھانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ اولاد کی تمنا بھی آدمی کو کتنا پاگل کر دیتی ہے اِس کا تجربہ اسے خود بھی ہو چکا تھا۔ روشن تو ایک عورت تھی۔ اگر وہ ماں نہیں بنے گی تو اس کی زندگی ہمیشہ ہی ویران رہے گی۔ لیکن اس میں وہ کر ہی کیا سکتا تھا؟

اچانک ایک خیال تیزی سے اس کے دماغ میں گھوم گیا۔ جیسے جیسے یہ خیال مضبوط ہوتا گیا ویسے ویسے اُس کے دل کا بوجھ ہلکا ہوتا چلا گیا۔ اُس نے سوچا اگر میں اپنی بیٹی کو ہی روشن کے حوالے کر دوں تو؟ روشن کے اندھیرے دل میں ممتا کی روشنی پھوٹے گی۔ میری بیٹی اس گھر میں زیادہ سُکھ سے رہ سکے گی اور میں بھی اکثر اُس سے ملنے کے لیے آ سکتا ہوں۔ اِس خیال کے آتے ہی اس نے روشن سے کہا۔ "روشن میری ایک بات کا ٹھیک ٹھیک جواب دینا۔ کیا اولاد کو جنم دیئے بغیر عورت اپنی گود نہیں بھر سکتی؟"

"کیا مطلب؟" روشن چونک پڑی۔

"کسی دوسرے بچے کو تم..."

"سمجھ گئی۔" روشن درمیان میں ہی بول اُٹھی۔ "کسی کو گود لینے کی بات تو خود اُنھوں نے بھی دو ایک بار مجھ سے کہی تھی۔ لیکن..."

"لیکن کیا؟" امیر نے پوچھا۔

"مجھے امید تھی کہ کبھی نہ کبھی تو میری گود بھر ہی گی۔"

"اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ عورت اگر کسی کے بچے کو گود لے لے تو قدرت اس کی اولاد سے اس کی گود بھر دیتی ہے۔" امیر نے اسے تسلی دینے کے لیے یہ بات کہی تھی۔ "جب ہمارا پہلا بچہ زندہ نہ رہ سکا تو عظیمہ نے بھی یہی سوچا تھا۔"

روشن تھوڑی دیر تک سوچ میں ڈوب گئی تو امیر

کو امید پیدا ہو گئی کہ شاید وہ اُس کی بات مان لے گی۔ اسی لیے وہ جلدی سے بول پڑا: "تم اگر گمان لو تو میری نظر میں ایک سچی ہے جسے اپنی ماں اور اپنے باپ کے بارے میں کوئی علم نہیں ہے۔ وہ ایک مولوی کے گھر میں پرورش پا رہی ہے اور بہت ہی اچھے خاندان کی اولاد ہے۔"

"کہاں ہے وہ؟" روشن نے بے چینی سے پوچھا تو امیر کو اس کی رضامندی کا احساس ہوا۔ لیکن "کہاں ہے وہ؟" کا جواب دینے سے پہلے وہ جان لینا چاہتا تھا کہ روشن واقعی ایک لڑکی کو گود لینے کے لیے رضامند ہو جائے گی؟ اُسے اب اِس بات کا احساس ہو رہا تھا کہ بات چھیڑنے سے پہلے اُسے روشن کو ساری تفصیل بتا دینی چاہیے تھی۔

"بتاؤ روشن! تمھیں بیٹی اچھی لگتی ہے یا بیٹا؟" اچانک اُس نے پوچھ لیا تو روشن ذرا شرما سی گئی۔ پھر امیر کے چہرے پر نظریں جما کر وہ مسکرا اٹھی۔ مگر تھوڑی ہی دیر بعد نظریں جھکا کر اس نے کہا: "خدا اگر دینا چاہے تو بیٹی ہو یا بیٹا مجھے منظور ہے۔" اتنا کہہ کر وہ ایک پل کے لیے رُکی پھر بولی: "لیکن گود لینے کی بات ہو تو پھر بیٹا ہی پسند ہوگا مجھے۔"

روشن کا یہ جواب سُن کر امیر دم بخود رہ گیا۔ اس کا ایک خواب ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اس کے سامنے بکھر گیا تھا۔ اب اُسے روشن سے بات کرنے کی کوئی خواہش نہیں تھی۔ وہ اُس کی جانب سے منھ پھیر کر جانے ہی والا تھا کہ یکایک روشن نے اُسے روکتے ہوئے کہا "تم نے میرے دل کی بات تو جان لی لیکن اپنے دل کی بات تم چھپا رہے ہو امیر"

یہ سن کر امیر نے فوراً ہی اپنے چہرے کے تاثرات چھپا لیے اور روشن کی طرف دیکھے بغیر دھیرے سے ہنس کر بولا: "تم سے میں کیا چھپا رہا ہوں روشن؟"

"کیوں ابھی تو تم نے کہا تھا کہ ایک مولوی کے گھر میں ایک خاندانی لڑکا ہے؟" روشن نے جلدی سے کہا

"ہوں۔ ہوں" امیر چونک پڑا کیونکہ مولوی کے یہاں لڑکا ہے۔ ایسی کوئی بات اس نے نہیں کہی تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ روشن کو سننے میں غلطی ہوئی ہے۔ لیکن چونکہ اُسے روشن کی مرضی معلوم ہو چکی تھی اس لیے وہ بہت زیادہ پُر امید ہونا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے اسے کہنا پڑا: "ہاں روشن میں اس بار سفر پر جا رہا ہوں اور کوشش کروں گا کہ مولوی کو سمجھا کر اُسے اپنے ساتھ لیتا آؤں۔"

یہ سُن کر روشن کی آنکھوں میں احسانمندی کے تاثرات ابھر آئے اور وہ بولی: "لیکن ایک بات یاد رکھنا۔ لڑکا کسی شہزادے کی طرح ہو یعنی بالکل تمھاری طرح۔"

"میری طرح" امیر بوکھلا گیا اور روشن اُسکی بوکھلاہٹ سے لطف اندوز ہوتی ہوئی ہنستی ہوئی وہاں سے چلی گئی تھی۔ اور اب جُدا ہوتے وقت روشن اس سے جواب مانگ رہی تھی۔

"پھر کب ملاقات ہوگی؟" امیر اُس کا یہ سوال ہی کر جواب ڈھونڈنے لگتا ہے۔ اگر یہ کوئی مذاق کا وقت ہوتا تو جواب دیتے ہوئے کہہ دیتا: "تم کہو تو میں ہمیشہ کے لیے تمھارا مہمان بن کر اس گھر میں رہ جاؤں۔ اِس دنیا میں اب کہیں بھی کوئی ایسا گھر نہیں ہے جہاں میرا کوئی انتظار کرے اور مجھے دیکھ کر اب کسی کے دل میں ذرا سی بھی ہلچل پیدا نہیں ہوگی۔ اب دنیا میں میرا کوئی ایسا نہیں ہے جو مجھے پیار بھری باہوں میں جکڑ کر یہ کہہ دے کہ تمھیں اب کہیں جانے نہیں دُوں گی۔ میرا تو اب کوئی بھی نہیں ہے۔" امیر نے ایک گہرا سانس لیا پھر آگے بولا: "مگر تمھاری مہمان نوازی کا لطف اُٹھانے کے لیے کبھی کبھی آ جایا کروں گا۔" اتنا کہہ کر اُس نے روشن کی طرف دیکھا۔ لیکن جب اُسے محسوس ہوا کہ اُس کے جواب سے روشن کو تسلی نہیں ہوئی ہے تو وہ اس طرح بولا جیسے اُسے اچانک ہی کوئی بات یاد آ گئی ہو: "اور ہاں اگر تمھارے لیے شہزادے جیسا کوئی سچّا مجھے مل گیا تو جلد ہی واپس آ جاؤں گا۔"

جب اُن دونوں میں یہ باتیں ہو رہی تھیں تو ٹھیک اُسی وقت روشن کا خاوند حسن علی کمرے میں داخل ہوا اِس لیے اُن کی گفتگو جاری نہ رہ سکی۔ امیر نے اپنی مہمان نوازی کے لیے سچّے دل سے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے

کہا: "اگر آپ راستے میں نہ مل گئے ہوتے تو نہ جانے میرے یہ دن کن پریشانیوں میں گذرتے؟ جب دولت انسان کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے تو رشتہ دار بھی اُس سے منھ پھیر لیا کرتے ہیں۔ لیکن آپ۔ آپ نے تو۔۔۔" امیر کی آواز جذبات سے کانپنے لگی۔

"میاں میں تو اب بھی کہہ رہا ہوں۔" حسن علی جو بات دو چار بار پہلے کہہ چکا تھا اُسی بات کو دہراتے ہوئے بولا: "چند مہینے یہیں رہ کر آرام کر لیں اور جب دل کا غم ہلکا ہو جائے تو کاروبار کی سوچیے گا۔"

"نہیں حسن میاں! کھوئی ہوئی شان و شوکت کو حاصل کیے بغیر دل کو کہیں چین نہیں آئے گا۔" امیر ایک پل کے لیے رُکا پھر آگے بولا: "برسوں پہلے میں نے اپنے والد کے ساتھ کاروبار کے سلسلے میں اِسی جگہ سے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا اور کامیابی کے ساتھ واپس آیا تھا۔"

"صرف کامیابی کے ساتھ ہی نہیں بلکہ" روشن نے مسکراتے ہوئے کہا: "آپ تو عظیم بہن کو بھی اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ اِس لیے اِس بار بھی آپ کسی کو اپنے ساتھ لیتے آئیے گا۔"

حسن علی تو روشن کی بات سُن کر کھل کھلا کر ہنس پڑا لیکن امیر ہنس نہیں سکا۔ وہ تو ایک بار پھر اُلجھن میں پڑ گیا تھا کہ روشن نے یہ اُس پر طنز کیا تھا یا اس کا دل بہلانے کے لیے اُس سے مذاق کیا تھا؟ وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ اِس سوال کا جواب شائد سفر سے واپسی کے بعد ہی اُسے مل سکے گا۔ اس نے ترچھی نگاہوں سے روشن کی طرف دیکھا۔ لیکن روشن کی آنکھیں تو بھیگ چکی تھیں اس کی آنکھوں سے جھانکتے ہوئے آنسو جیسے اُس سے کہہ رہے ہوں: "امیر اب آئندہ کبھی بھی ہماری ملاقات نہیں ہو سکے گی۔"

●

شگون بہت ہی اچھا ملا تھا اور ٹولی بھی توقع سے زیادہ ہی بڑی بن گئی تھی۔ گنیش اور امیر علی کے علاوہ پورے اٹھاسی ٹھگ اِس ٹولی میں شامل تھے۔ ان اٹھاسی ٹھگوں میں سے بیس پچیس ٹھگ تو امیر کے پرانے ساتھی تھے۔ اپنے اِستاد رُوپ سنگھ کو اتنی مدّت کے بعد دیکھ کر امیر کو بہت خوشی محسوس ہوئی تھی۔ اسی رُوپ سنگھ نے اُسے رومال استعمال کرنے کا فن سکھایا تھا۔ امیر نے رُوپ سنگھ کو دیکھ کر کہا تھا "میرا تو خیال تھا کہ آپ اس عمر میں رومال کو چھوڑ کر گھر میں بیٹھے ہوئے ہوں گے۔"

"تین سال تک تو گھر میں ہی بیٹھا ہوا تھا۔" بوڑھا راجپوت رُوپ سنگھ اپنے شاگرد سے دل کھول کر باتیں کر رہا تھا: "یہ سال تو محظ زندہ سال کی طرح گذر رہا تھا۔ پچھلے سال میں فرنگیا کی ٹولی میں شامل تھا۔ لیکن اس نے میری عمر کو دیکھتے ہوئے مجھے اپنی ٹولی سے نکال دیا۔ ویسے یہ اچھا ہی ہوا ورنہ اس وقت تو میں بھی اُس کے ساتھ جیل میں ہوتا۔"

"خدا وہ دن آپ کو کبھی نہ دکھائے۔" امیر نے ایک گہرا سانس چھوڑتے ہوئے کہا: "پانچ سال کی قید میں میں نے اپنی جوانی گذار دی ہے۔"

"پھر بھی تم خوش قسمت ہو کہ فرنگیا کی طرح ولیم سلومن کے ہاتھ میں نہیں آئے۔" بوڑھے رُوپ سنگھ نے سفید داڑھی کھجاتے ہوئے کہا: "میں نے سنا تھا کہ یہ گورا صاحب تمھیں اپنے قبضے میں لینے کے لیے جیل تک بھی جا پہنچا تھا۔"

"ہوں" امیر چونک پڑا: "یہ بات آپ کو کس نے بتائی؟"

"یہ بات اڑتے اڑتے میرے کانوں تک پہنچی تھی۔" رُوپ سنگھ کے چہرے پر بکھری ہوئی شکنیں اور زیادہ گہری ہو گئیں: "سنا ہے جب نیا راجا گدّی پر بیٹھا تو ولیم سلومن اُسے مبارک باد دینے اور تاج پوشی کی رسم میں شرکت کرنے کے لیے جالان گیا تھا۔ اس نے راجا سے تمھارا قبضہ مانگا تھا۔ لیکن اس سے پہلے ہی تم جالان کی سرحد پار کر چکے تھے۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں چاچا؟" امیر کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا پھر بھی اُسے اپنی خوش قسمتی پر تعجب تو ہو ہی رہا تھا "وہ گورا صاحب مجھے اپنے قبضے میں کیوں لینا چاہتا تھا؟ مجھ سے اسے کیا مل جانے والا تھا؟"

"میں نے جو سُنا تھا وہی کہہ دیا ہے۔" رُوپ سنگھ کو بھی شائد یہ بات اب بے وزن لگنے لگی تھی: "ویسے

میں تو اس سفر میں صرف تمھارا نام سن کر ہی شامل ہونے کے لیے آگیا تھا۔ لیکن یہاں آنے کے بعد مجھے پتا چلا کہ اس ٹولی کی سرداری تو گنیش کے ہاتھ میں ہے۔"

"آج اُس کا وقت ہے چاچا۔" امیر نے اُسے تسلی دی "کل ہمارا وقت ہوگا۔" امیر کا یہ اپنا پن ہی اپنے ساتھیوں کا دل جیت لیتا تھا اور ایک ہفتے میں ہی اُسے لگنے لگا تھا کہ بہت سارے ٹھگ مجبوری کی حالت میں ہی گنیش کی ٹولی میں شامل ہوئے تھے۔ کیونکہ اِن دنوں انھیں کوئی اور ٹھگ سردار دکھائی نہیں دے رہا تھا اور گھر بیٹھے رہنا بھی مناسب نہیں تھا۔ پھر سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ گنیش گورے صاحب کی دھاک کی پرواہ کیے بغیر مسلسل کئی مہینوں سے اپنی کارروائی جاری رکھے ہوئے تھا۔

آٹھ دن کے اندر اندر اُس نے یہ بھی محسوس کر لیا کہ گنیش کچھ کچھ ڈرپوک بھی ہے۔ وہ جنونی ضرور تھا لیکن چالاک نہیں تھا۔ وہ اس بات سے ضرور پریشان رہتا تھا کہ ولیم سلومن کے مخبر ٹھگ کے بھیس میں اُس کی ٹولی میں شامل ہو کر اس سے دغا کر سکتے ہیں۔ لیکن وہ اپنے چہرے سے اِس کا اظہار نہیں ہونے دیتا تھا۔ بلکہ اپنی اِس پریشانی کو دور کرنے کے لیے وہ اپنے ساتھیوں کو ماضی کے قصے سُنانے لگ جاتا تھا۔ اِن قصوں میں زیادہ تر اُس کی اپنی بہادری کی داستانیں ہوتی تھیں مثلاً کس ٹھگ سردار کے سامنے اُس نے سرکشی کی تھی؛ اور کس کا کیا حال ہوا؛ وہ مثال پیش کرتے ہوئے کہتا۔ ٹھگ بازی میں رحمدلی اور ہمدردی کے کوئی جذبات نہیں ہونے چاہئیں۔ مسافروں کے کسی ننھے بچے کو دیکھ کر اُسے اپنے پاس رکھ لینے والے سردار کو بھی بُزدل سمجھتا ہوں۔ ابراہیم نامی ایک سردار سے میں اسی لیے تو جھگڑ بیٹھا تھا۔ اُس نے سب ساتھیوں کی مخالفت کے باوجود ایک پٹھان بچے کو اپنے پاس رکھ لیا تھا اور آگے کا سفر ملتوی کر کے اپنے گھر لوٹ گیا تھا۔"

امیر اپنے باپ کا نام سُن کر چونک پڑا تھا لیکن وہ یہ سوچ کر چپ رہ گیا تھا کہ گنیش کو شیخی بگھارنے کی عادت ہے۔ لیکن پھر بھی اُس قصے کے ساتھ کچھ باتیں ایسی منسوب تھیں جنھوں نے اُس کے دل میں ایک ہلچل سی مچا دی۔ حیدر آباد میں اُسے زہرہ نے ایک پٹھان لڑکی کے بارے میں بتایا تھا جو اپنے بھائی کی بُزدلی میں مر مر کر جی رہی تھی۔ اور پھر محرم کے جلوس کے وقت اُس کے باپ کا کسی پٹھان نے تعاقب بھی کیا تھا۔ اور اُس نے زہرہ کے گھر کی کھڑکی میں سے یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اُس وقت اپنے باپ پر اُسے غصہ بھی آیا تھا۔ لیکن جب اُس کے باپ نے اُسے اُس واقعہ کی تفصیل بتائی تو اسے پتا چلا کہ اُس کا باپ اُس بچے کو مارنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر گنیش نے اُس کی جان لے لی تھی اور آج گنیش سب سے یہ کہتا پھر رہا ہے کہ ابراہیم فرار کو اُس بچے کی خاطر اپنی ٹولی کو چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا تھا۔

"وہ دیکھو سامنے چار پانچ مسافر دکھائی دے رہے ہیں۔" قافلے کے آگے آگے چلتا ہوا گنیش بول اٹھا۔ "شاید وہ لوگ آرام کر رہے ہیں۔ ہمیں اِسی جگہ ان لوگوں کو ختم کر دینا چاہیے۔"

اِس سفر کے دوران اپنے سب سے پہلے شکار کو دیکھتے ہی سب کے چہروں پر رونق سی دوڑ گئی لیکن امیر بہت زیادہ پُرجوش نظر نہیں آرہا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ گنیش کو بتا دے کہ ایسی کھلی جگہ میں شکار کھیلنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ لیکن پہلے قدم پر ہی اُسے گنیش سے اُلجھنا مناسب نہیں لگا۔ اس لیے وہ خاموش رہ گیا۔

"امیر ان لوگوں سے تمھیں بات چیت کرنا ہوگی۔" گنیش سردار کی حیثیت سے اُسے حکم دیتا ہوا بولا۔ "اور یاد رکھنا ان کے سامنے مجھے عزت اور احترام سے مخاطب کرنا۔ میرے بارے میں دو چار اچھی باتیں انھیں بتانا۔ اُن سے کہنا کہ میں ایک بڑا سردار ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" امیر نے اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا اور شکار کو پھانسنے کی ترکیب سوچنے لگا۔

○

گنیش کا لگایا ہوا پہلا ہی اندازہ غلط ثابت ہوا۔ کیونکہ

ان چاروں مسافروں نے اُن کے قافلے کو دیکھتے ہی اپنا سامان سمیٹنا شروع کر دیا تھا۔ اُن میں سے ایک نے اُن سے کہا تھا: "بھائی ہم لوگ تو صرف دس کوس کے فاصلے پر ایک گاؤں میں جا رہے ہیں۔ ہمارا سفر بہت زیادہ طویل نہیں ہے۔ ہم تو ذرا دیر آرام کرنے کے لیے اِس جگہ بیٹھ گئے تھے۔" اتنا کہنے کے بعد وہ چاروں مسافر پیدل ہی وہاں سے چل پڑے تھے۔ اُن کے ساتھ صرف ایک ٹٹو تھا جس پر اُن کا مختصر سا سامان لدا ہوا تھا۔ دیکھنے میں وہ بالدار لوگ نظر نہیں آرہے تھے۔ اُن کو ختم کر کے ان سے بہت زیادہ دولت ملنے کی اُمید بھی نہیں تھی۔ لیکن ٹھگ لوگوں کا یہ دستور ہے کہ اگر وہ ایک بار کسی کو اپنا شکار مان لیتے ہیں تو اُنھیں ہر حال میں اُنھیں ختم کرنا ہی پڑتا ہے چاہے مرنے والوں کے پاس سے انھیں کچھ ملے یا نہ ملے۔

"اگر کوئی گاؤں یہاں سے صرف دس میل کے فاصلے پر ہی ہے تو پھر ہم بھی یہاں پڑاؤ نہیں ڈالیں گے۔" امیر نے اُن چاروں کو روکتے ہوئے کہا: "میں ابھی اپنے سردار کو بتاتا ہوں۔ آپ لوگ ذرا دیر ٹھہر جائیں پھر ہم سب ساتھ ہی چلیں گے۔"

گنیش کے ساتھ امیر نے راسی زبان میں کہا: "مجھے نہیں لگتا کہ اس جگہ ہمارا کام ہو سکے گا۔ کیونکہ وہ لوگ جلدی جانے کے لیے بے چین ہیں۔"

"لگتا ہے تمھاری زبان کے جادو نے بھی کام نہیں دکھایا۔" گنیش طنزیہ لہجے میں بولا: "تم انھیں آدھے گھنٹے کے لیے بھی نہیں روک سکتے؟"

"آدھے گھنٹے میں ہوگا بھی کیا؟" امیر اُس کے طنز کو برداشت کرتے ہوئے بولا: "ابھی تو دن ڈھلنے میں کافی دیر ہے اور دن کے اُجالے میں اس جگہ شکار کرنا بھی خطرناک ہے۔ اچانک کوئی اِدھر آنکلا تو ہمارا راز فاش ہو جائے گا۔"

یہ سُن کر گنیش کی آنکھوں میں سُرخی سی دوڑ گئی: "تم بھول گئے ہو امیر کہ سردار میں ہوں اور اِن لوگوں کو شکار بنانے کا فیصلہ بھی میں نے ہی کیا ہے۔ تمھارا کام مجھے مشورے دینا نہیں ہے بلکہ مسافروں کو اس جگہ روکے رکھنا ہے اور اگر یہ کام تم سے نہیں ہو سکتا تو تم منع کر دو۔"

"ٹھیک ہے میں اپنا فرض پورا کر رہا ہوں۔" امیر کو یہ غم بھی پی جانا پڑا۔ "باقی کا کام خود ہی سنبھال لینا۔" آخری جملہ لاپرواہی سے اُچھال کر امیر اُن چاروں کی جانب بڑھ گیا پھر دو قدم چل کر اُس نے ترکیب سوچ لی اور ان سے مخاطب ہو کر بولا۔ "ہمارا سردار بھی بے حد شکی اور وہمی ہے ایک ایک قدم سوچ سوچ کر آگے بڑھانے کا عادی ہے اِسی لیے تو اس نے ایک جوتشی کو بھی سفر میں ساتھ رکھا ہوا ہے۔" اتنا کہہ کر امیر نے رامُو کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا: "اِس کا کہنا ہے کہ سفر کے لیے یہ تین گھنٹے انتہائی منحوس ہیں۔ ہم جیسے مسافروں کے لیے اِس کا مشورہ ہے کہ ہم اِس وقت جہاں ہیں وہیں رُک جائیں۔"

"ہا۔ ہا۔ ہا۔" قہقہہ لگا کر ان چاروں میں سے دو آدمی ہنس پڑے۔ پھر اُن میں سے ایک نے کہا: "یہ بات تو ہم نے آج ہی سُنی ہے۔ آدمی جب گھر سے نکلتا ہے تو تب ہی وہ نیک شگون اور اچھی گھڑی دیکھ کر نکلتا ہے۔ طویل سفر کے دوران ہر قدم پر وہ اگر جوتشی سے مشورہ لیتا رہے گا تو اُس کی زندگی ایک ہی سفر میں پوری ہو جائے گی۔"

"مجھے تو لگتا ہے کہ یہ جوتشی آپ کے سردار کو بے وقوف بنا کر اُس سے پیسے بٹورتا رہتا ہے۔" تیسرے مسافر نے اپنے شک کا اظہار کیا تو چوتھے نے ایک گہرا سانس لے کر کہا: "اب اِس زمانے میں اِن سب باتوں پر بھروسا ہی کون کرتا ہے جناب؟"

"مہربان پہلے میں بھی آپ لوگوں کی طرح اِس جوتشی کو ڈھونگی سمجھتا تھا۔" امیر نے بے دھڑک کہنا شروع کیا "لیکن سچی بات کو تو قبول کرنا ہی پڑتا ہے۔"

"کیا؟" ان میں سے دو نے ایک ساتھ پوچھا۔

"ابھی دو دن قبل کی ہی بات ہے۔ میں اپنی بیٹی کی شادی کے بارے میں فکرمند بیٹھا تھا کہ اچانک یہ جوتشی میرے پاس آکر کہنے لگا۔ میاں! بیٹی کی شادی آئندہ سردیوں میں ہو جائے گی۔ تمھارے گاؤں میں ایک سپاہی ہے۔ جس کا نام جان محمد ہے وہ تمھاری بیٹی کے لائق ہے۔ وہاں اگر بات چلائی گئی تو منظور بھی ہو جائے گی۔ یہ سُن کر میں

توحیران رہ گیا کہ یہ شخص تو بڑا ہی باکمال لگتا ہے، مجھے جانتا بھی نہیں ہے۔ پھر بھی میرے دل کی حالت کا اسے اندازہ ہو گیا ہے۔ میں اس سوداگر کے یہاں نیا نیا ملازم ہوا ہوں پھر بھی میری بیٹی کی شادی کا اسے علم کیونکر ہو گیا! اور اسے یہ بات بھی کیسے معلوم ہو گئی کہ میں اُسی سپاہی جان محمد کو اپنا داماد بنانا چاہتا ہوں؟"

یہ سُن کر وہ چاروں مسافر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر امیر کو دیکھنے لگے۔ ان کے چہروں پر تجسس کی جھلک دیکھ کر امیر نے پوری طرح اپنا جال بچھاتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "ہم مسلمان ہیں اور علم نجوم وغیرہ پر اعتقاد نہیں رکھتے لیکن پھر بھی میں اس جوتشی کے علم سے بہت متاثر ہوا ہوں اور ہر وقت اسے خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

"لیکن یہ بات تو ابھی تک میرے گلے سے نیچے نہیں اتری ہے۔" ان میں سے ایک نے بھونڈی آواز میں کہا تو امیر کو اس کی کڑوی بات ضبط کرتے ہوئے کہنا پڑا "آپ کو اگر آزما کر دیکھنا ہے تو میں اُس جوتشی کو منانے کی کوشش کرتا ہوں۔ وہ اگر موڈ میں ہو گا تو اپنی قابلیت کا ثبوت فراہم کر دے گا۔"

"تو ہو جائے۔" وہ مسافر جلدی سے بولا مگر پھر سوچ کر کہنے لگا۔ "لیکن زیادہ دیر نہ لگے۔"

امیر اُٹھتے اُٹھتے رہ گیا۔ "بھائی صاحب اس قدر جلد بازی کریں گے تو اُس کا موڈ اور خراب ہو جائے گا پہلے وہ جاپ وغیرہ کرتا ہے پھر کسی کام کو کرتا ہے پھر بھی میں جلدی کی کوشش کروں گا۔" پھر جاتے جاتے وہ بولا "مگر پہلے مجھے اپنے سوداگر مالک سے اجازت لینی پڑے گی۔"

اس کے بعد سب کچھ امیر کے پروگرام کے مطابق ہی ہوتا چلا گیا۔ رامو نے جوتشی کا ڈھونگ رچایا۔ اور ان چاروں مسافروں کو اپنے بنائے ہوئے دائرے میں اپنے سامنے بٹھا لیا۔ اور ان میں سے ہر ایک کے پیچھے دو دو ٹھگ تماشا دیکھنے کے بہانے بیٹھ گئے۔ دس پندرہ منٹ تک ہر کوئی آنکھیں بند کر کے چُپ چاپ بیٹھا رہے۔ میں جاپ شروع کر رہا ہوں۔" رامو نے گمبھیر لہجے میں کہا

"لیکن اس سے پہلے میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ تم میں سے کسی ایک کو اچانک ہی بے پناہ دولت ملنے والی ہے۔ جاپ ختم کرنے کے بعد میں تم میں سے جس کا نام پکڑ لوں گا اس پر لکشمی دیوی اپنی رحمت کی بارش کرے گی۔" رامو کی بات سُن کر کچھ دوری پر کھڑے ہوئے گنیش نے امیر کی طرف دیکھا اور دھیرے دھیرے مسکرانے لگا۔ کچھ فاصلے پر دو چار ٹھگ گنیش کے حکم سے اُن مسافروں کی لاشوں کو دفنانے کے لیے گڑھا کھودنے میں مصروف تھے۔

"جئے بھوانی" اچانک گنیش کے منہ سے نکلا اور اس اشارے کے ساتھ ہی چاروں مسافروں کے پیچھے بیٹھے ہوئے ٹھگوں نے پھرتی سے اپنے رومال اُن کے گلوں میں ڈال دیئے۔ چار ٹھگوں نے ان کی ٹانگیں پکڑ کر انھیں مزاحمت کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ اُن چاروں میں سے ایک مسافر ذرا ہوشیار ہو چکا تھا۔ اُس نے اپنی گردن سے رومال کا پھندہ ہٹانے کی کوشش کی تھی لیکن سامنے بیٹھے ہوئے رامو نے اُس کا سر اتنی زور سے دبا دیا کہ وہ بالکل ہی ڈھیلا پڑ گیا پھر جب اس کی جان نکل ہی رہی تھی کہ اچانک "یہ کیا کر رہے ہو" کی آواز اُن سبھوں کی سماعت سے ٹکرا گئی۔ انھوں نے پلٹ کر دیکھا تو دو گھوڑے سوار، گھوڑے دوڑاتے ہوئے ان کے قریب پہنچ چکے تھے۔ ان میں سے ایک کا چہرہ غصّے سے سرخ دکھائی دے رہا تھا۔ شائد مسافروں کا قتل ہوتے دیکھ کر اُس کے چہرے پر غصّے کی جھلک دکھائی دینے لگی تھی۔ اس اچانک آنے والی مُصیبت کو دیکھ کر امیر پھرتی سے جھپٹا۔ پھر اس سے پہلے کہ گھوڑے سوار اپنی تلوار نکال کر اُس پر وار کرتا۔ امیر نے پھرتی سے اس کی کلائی تھام لی اور اُس کا ہاتھ مروڑ کر بہت زور سے چیخا۔ گنیش جلدی سے اِس کی گردن میں رومال ڈال دو۔" اُس کی آواز سُن کر گنیش بھاگتا ہوا وہاں پہنچ گیا اور گھوڑے سوار کا دوسرا ہاتھ مروڑ کر اُسے نیچے گرانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس اثنا میں دوسرا گھوڑے سوار بھی اُن کے قریب پہنچ گیا۔ اُس نے تلوار ہوا میں لہرائی اور چیخ کر بولا۔

"خبردار اگر کسی نے میرے بڑے بھائی پر ہاتھ اٹھایا تو ایک ایک کی گردن اڑا دوں گا۔" اس کی راجپوتی آواز اور چمکتی ہوئی ننگی تلوار نے تو چند لمحوں کے لئے اُن سبھوں کو بوکھلا دیا۔ اُس کی آواز میں ایک عجیب سا جنون تھا۔ لیکن امیر کی چوکنا نظروں نے یہ بات نوٹ کر لی تھی کہ یہ راجپوت نوجوان بھی کچھ بوکھلا سا گیا ہے۔ وہ اپنے بڑے بھائی کو چھڑانے کے لیے نہ تو اپنے گھوڑے پر سے کودا تھا اور نہ ہی مقابلے کے لیے ان کے سامنے آیا تھا۔ یا تو اُس کی ہمت ٹوٹ گئی تھی یا وہ کوئی ترکیب سوچ رہا تھا۔ کچھ بھی ہو لیکن امیر نے اس موقع کا فائدہ ضرور اٹھایا۔ رامو اِس کی گردن میں جلدی سے رومال ڈال دو" اُس نے گھوڑے سوار کا ہاتھ زور سے مروڑ کر ایک جھٹکا دیا۔ اِس جھٹکے سے گھوڑ سوار کی گردن ذرا نیچی ہوئی اور اسی وقت بھاگ کر آتے ہوئے رامو نے اُس کے گلے میں رومال ڈال دیا۔ راجپوت نے اپنی کمر میں اڑسی، ہوئی تلوار کو نیام سے باہر نکالنے کی کوشش کی لیکن گنیش اور امیر علی کی مضبوط گرفت نے اُسے ہاتھ ہلانے کا بھی موقع نہیں دیا۔ اور وہ غوطہ کھاتے ہوئے گھوڑے کی پیٹھ پر سے نیچے آ گیا۔

"اِسے تم لوگ ختم کر دو۔" کہہ کر امیر نے اُسی راجپوت کی تلوار کھینچ لی۔ پھر اِس سے پہلے کہ اُس راجپوت کا چھوٹا بھائی اُن پر حملہ کرتا وہ خود تلوار لے کر اس کے سامنے آ گیا لیکن اب اس نوجوان راجپوت کے چہرے کا رنگ کچھ بدل گیا تھا۔ اپنے بڑے بھائی کو ٹھگوں کے شکنجے میں تڑپتا دیکھ کر اُس کا چہرہ اِس طرح لال ہو گیا تھا جیسے اُس کا خون اُس کی رگوں میں کھول رہا ہو۔ اچانک وہ اُن سب کو للکارتا ہوا چیخ کر بولا۔ "اگر تم لوگ مرد کی اولاد ہو تو ایک ایک کر کے مجھ سے مقابلہ کرو۔ میں اس وقت تک تم لوگوں سے لڑوں گا جب تک میرے بدن میں خون کا ایک قطرہ بھی موجود رہے۔"

"گھوڑے سے نیچے اترو۔" امیر نے اُس کی للکار کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ "راجپوت ہو کر صرف دور ہی دور سے کیوں چیخ رہے ہو؟"

"نہیں امیر" یکایک گنیش نے آگے بڑھ کر امیر کے تلوار والے ہاتھ کو تھام لیا اور بولا۔ "یہ بے وقوف بھی اب اپنے بھائی جیسی موت ہی مرے گا۔ تمھیں بہادری دکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

گنیش کی یہ بات امیر کو بہت ہی بُری لگی کہ ایسے نازک وقت میں بھی گنیش اس کی بے عزتی کرنے سے بعض نہیں رہا تھا۔ گنیش کی بات سن کر اُس نے آنکھیں نکال کر گنیش کی طرف دیکھا اور کرخت لہجے میں بولا "اِس میں بہادری دکھانے کی تو بات نہیں ہے گنیش اگر ذرا سی بھی ڈھیل دی گئی تو یہ راجپوت نوجوان ہمیں دھوکہ دے کر نکل جائے گا اور جو کچھ بھی اس نے یہاں دیکھا ہے وہ دوسروں کو بتا دے گا پھر..."

"پکڑ لو اِسے" گنیش نے امیر کی پوری بات سُنے بغیر اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔ اور گھوڑے سے نیچے اُتار کر اس کا گلا گھونٹ دو۔"

اتنے سارے ٹھگوں سے تنِ تنہا لڑنے کی ہمت اس نوجوان راجپوت میں نہیں تھی۔ جب تین طرف سے اُسے گھیرنے کے لیے ٹھگ آگے بڑھتے دکھائی دیئے تو اُس نے اپنے گھوڑے کی لگام کھینچی۔ اشارہ پاتے ہی چاق و چوبند گھوڑے نے اپنی دونوں اگلی ٹانگیں اوپر اٹھائیں۔ "خبردار اگر کسی نے آگے بڑھنے کی کوشش کی تو..." نوجوان راجپوت نے تلوار سر سے بلند کرتے ہوئے انھیں للکارا۔ اور گھوڑے کو پیچھے ہٹانے لگا۔ امیر اس کی چالاکی کو سمجھ گیا کہ اگر ٹھگ اس کو پکڑنے کی کوشش کریں گے تو وہ پیچھے سے نکل بھاگے گا۔

"نہیں نہیں" اچانک امیر نے گنیش کی پرواہ کیے بغیر دونوں ہاتھ اٹھا کر اپنے ساتھیوں کو روکتے ہوئے کہا۔ "یہ لڑنا چاہتا ہے اور مجھے اس سے لڑنے دو۔ تم لوگ کوئی آگے مت بڑھنا۔"

یہ سُن کر گنیش کا چہرہ غصّے سے سُرخ ہو گیا۔ امیر کا اس کے معاملے میں دخل اندازی کرنا اور حکم دینا ذرا بھی پسند نہیں آیا تو اُس نے اپنی کمر میں سے اپنی کٹاری نکال لی اور راجپوت نوجوان کے سینے کا نشانہ لے کر اُس نے کٹاری اُس کی جانب پھینک دی۔ گنیش کا نشانہ شائد ہی کبھی خطا ہوتا تھا۔ وہ کافی فاصلے سے بھی کٹاری کا وار کر سکتا تھا۔ لیکن اِس وقت نوجوان راجپوت

نے کمال ہوشیاری سے اُس کا نشانہ خطا کرا دیا تھا۔ گنیش کی پھینکی ہوئی کٹاری اُس کے سینے پر لگنے کی بجائے اُس کے کندھے کو چھوتی ہوئی دور جا گری تھی۔ یہ دیکھ کر گنیش چلایا۔ "پکڑ لو اسے۔"

گھبرائے ہوئے راجپوت نوجوان نے ٹھگوں کے گھیرے سے نکلنے کی کوشش کی اور اس نے پھرتی سے اپنے گھوڑے کا رُخ موڑ دیا اور چلّا کر بولا۔ "حرام زادو! تم لوگ اِسی جگہ میرا انتظار کرنا۔ میں اپنے ذات بھائیوں کو لے کر ابھی واپس آتا ہوں۔" اتنا کہہ کر اس نے گھوڑے کو ایڑ لگانے کی کوشش کی لیکن اس میں اُسے ذرا دیر ہو گئی۔ ہاتھ میں آئی ہوئی بازی کو ہاتھ سے نکلتے دیکھ کر امیر تلوار اٹھائے اس کی جانب بڑھا۔ پھر اس سے پہلے کہ نوجوان راجپوت کا گھوڑا جھٹکے سے آگے بڑھتا امیر نے ترچھی دوڑ لگا کر اس کو جا لیا۔ مگر نیچے رہ کر وہ راجپوت نوجوان پر کاری وار نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے اُس نے نوجوان راجپوت کے گھوڑے پر تلوار کا وار کر دیا۔ کھچاک کی آواز کے ساتھ اُس کی تلوار گھوڑے کی پچھلی ران میں گھس گئی۔ زخم کھا کر گھوڑا بہت زور سے ہنہنایا اور پچھلے پیروں پر کھڑے ہونے کی کوشش میں اُس کا پاؤں امیر کے سینے سے لگا لیکن امیر پھرتی سے پیچھے ہٹ گیا اور زخمی گھوڑا زمین پر لڑھک گیا۔ اُس کے زمین پر گرتے ہی نوجوان راجپوت بھی اس کی پیٹھ سے لڑھک کر نیچے آ گیا۔

امیر نے اُسے اٹھنے کا موقع ہی نہیں دیا اور پے در پے تین چار وار کر کے اُس کی گردن ہی کاٹ دی۔ امیر کا یہ جنون دیکھ کر اُس کے دوسرے ساتھی بڑی حیرت سے اُس کو دیکھنے لگے۔ رامو نے آگے بڑھ کر جب امیر کا ہاتھ پکڑا تب ہی اُسے احساس ہوا کہ نوجوان راجپوت کی گردن کٹ چکی ہے۔ اور اب وہ اپنی زندگی کی آخری سانس لے رہا ہے۔ "لے جاؤ اِس کی لاش کو۔" امیر اپنی خون آلود تلوار کی طرف دیکھتے ہوئے ہانپتے ہانپتے بولا۔ "اور جلد سے جلد دفنا دو۔" اتنا کہہ کر اُس نے مڑ کر دیکھا تو گنیش دھیرے دھیرے اُس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ امیر ایک گہرا سانس لے کر اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ اُسے گنیش کی آنکھوں میں ابھی تک غصّے کی سُرخی دکھائی دے رہی تھی۔ اچانک وہ گنیش کے غصّے کا سامنا کرنے کے لیے اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ گنیش اس سے چار قدموں کے فاصلے پر آ کر رُک گیا پھر اس کے بھینچے ہوئے ہونٹ دھیرے دھیرے مسکرانے لگے۔ مگر اُس نے امیر سے کچھ نہیں کہا اُس کے چہرے پر اب کسی قسم کے کوئی تاثرات نہیں تھے۔ اُس نے امیر کو شاباشی دینے کی بھی کوشش نہیں کی۔

"شائد اب تم سمجھ گئے ہو گے گنیش کہ یہ بھاگ جانے کی کوشش میں تھا۔" تھوڑی دیر بعد امیر نے کہا۔ "میں اپنی بہادری دکھانا نہیں چاہتا تھا بلکہ میں تو صرف یہ چاہتا تھا کہ وہ ہمارے ہاتھوں سے بچ کر نہ جانے پائے۔"

"اور میں اُسے رومال سے قتل کرنا چاہتا تھا تلوار سے نہیں۔" گنیش نے دلیل پیش کی۔ "ہم ٹھگ لوگ خون بہانے کو گناہ سمجھتے ہیں۔"

"اور اگر گھوڑے پر سوار اُس کی تلوار سے ہمارے دو چار آدمیوں کا خون بہہ جاتا تو؟" امیر کے اِس جواب نے گنیش کی بولتی بند کر دی۔ امیر نے بگڑی ہوئی بازی سنبھال دی تھی۔ اِس کے لیے اسے شاباش دینے کے سوا گنیش کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا یہی سوچ کر اُسے مجبوراً کہنا پڑا۔ "جو ہُوا اچھا ہی ہُوا امیر۔" یہ کہہ کر اس نے امیر کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور آگے بولا۔ "تمھاری بات اب مجھے سچ ہی لگتی ہے۔"

امیر نے اُس کی داد پا کر ایک گہرا سانس لیا اور بولا "لیکن پھر بھی مجھے ایک بات کا افسوس ہوا ہے کہ اُس نوجوان کو میں نے لڑنے کا موقع دیئے بغیر ہی وار کر دیا جس کی وجہ سے وہ بہادروں کی موت نہ مر سکا۔"

●

سفر کا موسم شروع ہوا تو ولیم سلومن بھی چوکنا ہو گیا اُس کا خیال تھا کہ اس موسم میں امیر بھی کسی سفر کی تیاری کر رہا ہو گا۔ اُس کے اِس اندازے کی فرنگیا نے بھی تائید کی تھی۔ اُس نے ولیم سلومن سے کہا تھا۔ "صاحب کوئی ٹھگ کتنے ہی برسوں جیل میں کیوں نہ رہے لیکن وہ اپنے پیشے کو نہیں چھوڑ سکتا۔ موقع ملتے ہی وہ رومال لے کر پھر سے سفر پر روانہ ہو جاتا ہے۔" یہ سُن کر ولیم سلومن نے غور سے فرنگیا کی طرف دیکھا اور پھر پوچھ بیٹھا۔ "فرض کرو کہ امیر علی کی جگہ پر اگر تم ہوتے اور تمھیں جیل سے اچانک رہائی مل جاتی تو کیا تم بھی ...؟" ولیم سلومن کا خیال تھا کہ فرنگیا جواب دینے سے ہچکچائے گا لیکن اس کا یہ اندازہ غلط ثابت ہوا کیونکہ فرنگیا نے اُس کے سوال کا فوری جواب دیا تھا۔ "ہاں صاحب اگر آپ کی قید میں سے میں چھوٹ گیا تو دوبارہ یہ ہی کروں گا۔"

ولیم سلومن کو ایک جھٹکا سا لگا کیونکہ فرنگیا نے یہ جواب دے کر یہ ثابت کر دیا تھا کہ اُس کے اندر کا ٹھگ ابھی ختم نہیں ہوا ہے اور نہ ہی کبھی ختم ہو گا۔

"فرنگیا کیا تمھیں اپنے گناہوں پر ذرا بھی افسوس نہیں ہوتا؟" ولیم سلومن کی آواز میں ناگواری کا عنصر نمایاں ہو گیا تھا۔ "یہ کہہ کر تم خود اپنے پیروں پر کلہاڑی مار رہے ہو اس کا تمھیں پتا ہے؟ تمھارے اس جواب کے بعد تو شائد میں تمھیں آزاد کر دینے کے بارے میں کبھی بھی نہ سوچوں۔"

"تب تو میں یہ ہی سمجھوں گا یہ میرے سچ بولنے کی سزا ہے۔" فرنگیا نے بے دھڑک کہہ دیا تو ولیم سلومن کے پاس بھی اس کی بات کا جواب موجود تھا۔ "یہ سزا سچ بولنے کی نہیں بلکہ مکّاری کی کہلائے گی۔ جس کے دل میں رحم کا جذبہ نہ ہو اُس پر رحم کون کرے گا؟" اتنا کہہ کر وہ اپنے اصل مقصد کی طرف آتے ہوئے بولا۔ "فرنگیا کیا تمھیں معلوم ہے کہ امیر علی کا وہ خاص مقام کہاں ہے جہاں سے وہ اپنے سفر کا آغاز کرتا ہے؟"

"ہاں جناب" فرنگیا جلدی سے بولا۔ "وہ سلومن صاحب کو معلومات فراہم کرنے سے کبھی پیچھے نہیں ہٹتا تھا۔ "پہلے تو وہ شیوا پوری سے اپنے سفر کا آغاز کرتا تھا۔"

ولیم سلومن نے میز پر پڑے ہوئے نقشے کو کھولا۔ پھر اس کی نظر دھیرے دھیرے شیوا پوری پر آ کر رُک گئی۔ شائد وہ یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ساگر سے شیوا پوری جانے کے لیے اُسے کتنے میل کا سفر طے کرنا پڑے گا۔ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ فرنگیا بول پڑا۔ "لیکن جناب اب وہاں جانے کا کوئی فائدہ

نامور مصنف محمود احمد مودی

وہی تحریر اور وہی انداز

کے ساتھ 'اپنے چاہنے والوں

کے لئے ایک نئی سوغات لئے

تلاش

دو جلدیں جلد اول =/150

جلد دوئم =/150

خوبصورت سرورق ' بہترین

طباعت و کتابت ' سفید کاغذ

مکتبہ القریش

سرکلر روڈ اردو بازار لاہور

7668958

نہیں ہے۔ وہاں سے دس روز قبل ہی اُس کا قافلہ چل پڑا ہوگا۔"

اس کی بات سن کر ولیم سلومن ہنس پڑا اور بولا۔ "فرنگیا اتنے برسوں کے بعد مجھے اس بات کا علم ہے کہ تم ٹھگ لوگوں کا سفر کب شروع ہوتا ہے۔"

"تب پھر شیوا پوری جانے سے کیا فائدہ؟" فرنگیا بے دھڑک ہو کر بول رہا تھا۔ "اب تو آپ کو دوسرے سفر تک انتظار کرنا پڑے گا۔"

ولیم سلومن نے اُس کی اِس بات کا جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ وہ نقشے کو سمیٹ کر فرنگیا کو رُخصت کر دینے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک فرنگیا نے اُس کے سامنے ایک تجویز پیش کرتے ہوئے کہا۔ "اگر امیر علی کو گرفتار کرنا ہے تو آپ کو ایک خطرے سے کھیلنا پڑے گا۔" ولیم سلومن نے ایک جھٹکے سے گردن اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ فرنگیا کہہ رہا تھا۔ "آپ مجھے اُس کے پیچھے روانہ کر دیں۔ میں کہیں سے بھی اُس کا پتا نکال لاؤں گا۔"

ولیم سلومن کی پیشانی پر سوچ کی لکیریں گہری ہوتی چلی گئیں۔ "اور پھر میں تمھیں کہاں تلاش کرتا پھروں؟" کہتے کہتے ولیم سلومن ہنس پڑا پھر آگے بولا۔ "امیر علی کو پانے کے لیے مجھے فرنگیا کو کھونا پڑے یہ خطرہ تو میں اٹھا ہی نہیں سکتا۔" اس کا خیال تھا کہ یہ سُن کر فرنگیا شرمندہ ہو کر اپنا سر جُھکا دے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ فرنگیا اُس کی طرف مُسکراتی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "آپ کو مجھ پر اتنا زیادہ بھروسا تو ہونا بھی نہیں چاہیئے مگر آپ کو آزمائش تو کرنی ہی چاہیئے۔ آپ اپنے بااعتماد آدمی میرے ساتھ بھیج سکتے ہیں تاکہ وہ ہر وقت میری نگرانی کر سکیں۔"

لیکن ولیم سلومن نے ہاتھ ہلا کر اس کی تجویز پر غور کرنے تک سے انکار کر دیا۔ اچانک اُسے لگا کہ فرنگیا اُس کا وقت برباد کر رہا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے محافظ سے کہا۔ "جاؤ اِسے لے جاؤ۔"

فرنگیا نے بھی کوئی بحث نہیں کی اور چُپ چاپ پاؤں میں پڑی ہوئی بیڑیوں کو کھڑکھڑاتا ہوا واپسی کے لیے مُڑ گیا۔ لیکن ابھی دو چار قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ اُس کی سماعت سے ولیم سلومن کی آواز ٹکرائی۔ "ذرا ٹھہرو۔" فرنگیا رُک گیا پھر پلٹ کر اُس نے ولیم سلومن کی طرف دیکھا۔ ولیم سلومن اُسی کی جانب دیکھتا ہوا کہہ رہا تھا۔ "میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ ایک ٹھگ سردار ہو کر تم دوسرے ٹھگ سردار کو گرفتار کرا دینے کے لیے اِس قدر بے چین کیوں ہو؟"

"صاحب" جواب دینے سے پیشتر فرنگیا ولیم سلومن کے لحاظ میں ادب سے کھڑا رہ کر بولا۔ "اس کی وجہ تو میری سمجھ میں بھی نہیں آتی۔" اتنا کہہ کر وہ دھیرے دھیرے مُسکرانے لگا۔

کیا فرنگیا اُس کے سوال کا جواب جان بوجھ کر گول کر گیا تھا؟ فرنگیا کے جانے کے بعد وہ نہ جانے کتنی دیر تک اِس بات پر غور کرتا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ ٹھگوں کے درمیان بھی آپس میں گہری دشمنی ہوتی ہے۔ عداوت کی بنا پر وہ بھی ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ اِنھیں سب باتوں پر غور کرنے کے بعد اُسے فرنگیا کا جواب کچھ عجیب سا لگنے لگا تھا۔ اور پھر امیر علی کو گرفتار کرنے کے لیے اس نے زبردست کوشش شروع کر دی۔

●

حیدر آباد تک کے سفر میں گنیش اور امیر کی ٹولی کو کامیابی ہی ملتی رہی تھی جس کی وجہ سے خود امیر کا بھی اعتماد مضبوط ہو گیا تھا اور اُسے ساتھیوں کی بھی حمایت حاصل ہوتی جا رہی تھی۔ گنیش کا برتاؤ بھی اب کچھ نرم پڑ گیا تھا اور وہ بھی امیر کا خیال کرنے لگا تھا۔ انھوں نے سفر کا راستہ ایسا اختیار کیا تھا کہ انگریزوں کی حد سے جتنا ممکن ہو سکے دور ہی رہا جائے۔ اور جب سے رُوپ سنگھ نے امیر کو یہ بتایا تھا کہ ولیم سلومن اس کی گرفتاری کے لیے جالان کی جیل تک پہنچ گیا تھا۔ اس وقت سے امیر اور زیادہ چوکنا ہو گیا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ گورے صاحب کی نظر چونکہ اب اُس پر لگی ہوئی

ہے اس لیے جب تک وہ اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہو جاتا اُس وقت تک اُسے اُس کی نظروں سے بچنا ہی چاہیئے۔ اس کے بعد تو ولیم سلومن اُس کی گرد کو بھی نہیں پا سکے گا۔

انھوں نے لُوٹ کے مال کو حیدر آباد میں اچھے داموں فروخت کر دیا تھا۔ حصّے کی رقم کو سب لوگوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ امیر کے حصّے میں جو رقم آئی تھی وہ گنیش کو ملنے والے حصّے بھی آدھی تھی۔ اس معاملے میں گنیش نے بھی دریا دلی کا ثبوت نہیں دیا تھا اور نہ ہی امیر نے بحث و تکرار کی تھی۔ حالات کے تقاضے کے تحت ہی وہ گنیش کی ٹولی میں رہ کر اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ حیدر آباد سے واپسی سے قبل امیر کا ارادہ تھا کہ وہ چار پانچ روز تک حیدر آباد میں قیام کر کے سیر و تفریح کرے گا لیکن اس کے ساتھ اُس کے دل میں پرانی یادوں نے بھی سر اُبھارنا شروع کر دیا تھا۔ اِن یادوں کا خیال آتے ہی وہ ایک عجیب سی بے چینی اپنے اندر محسوس کرنے لگا۔ زہرہ کے مکان کے قریب سے گذرتے وقت اُس کی زندگی میں اچانک داخل ہو جانے والی پہلی عورت اُس کے دل میں ایک ہلچل سی مچا گئی تھی۔ اُس کے دل میں یہ خواہش زور پکڑنے لگی تھی کہ وہ ایک بار زہرہ کی موٹی ماں اور اس کی مغرور بہن سے مل لے۔ اس خواہش کے پیچھے دراصل زہرہ کی خیر خیریت معلوم کرنے کی تمنا ہی اُس کے دل میں تھی۔ لیکن اس مکان میں اب کچھ دوسرے لوگ ہی رہنے آ گئے تھے۔ یہ جان کر اُسے ایک شدید جھٹکا لگا تھا۔

آگے بڑھتے وقت اس کے قدم ایک اور مکان کے قریب ہی آپ ہی آپ تھم گئے تھے۔ اِسی جگہ اس کی ملاقات عظیمہ سے ہوئی تھی۔ عظیمہ اِسی جگہ سے اُس کے دل اور اس کی زندگی میں داخل ہوئی تھی۔ لیکن اب وہ عظیمہ بھی اس کی زندگی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جا چکی تھی۔ چار مینار سے گذرتے وقت اُسے اُس پٹھان لڑکی کی یاد ستانے لگی تھی جو برسوں سے اپنے بچھڑے ہوئے بھائی کے انتظار میں جی رہی تھی۔ جس کے ماں باپ ٹھگوں کے شکار ہو کر مارے جا چکے تھے۔ لیکن پھر بھی اُس لڑکی کو یقین تھا کہ اُس کا بھائی زندہ ہے اور کسی ٹھگ کے گھر میں پرورش پا رہا ہے۔ بے چاری۔ اُس کی یاد آتے ہی امیر ایک سرد آہ بھر کر رہ جاتا اور سوچنے لگتا آخر کس اُمید پر وہ لڑکی اپنے بھائی کی راہ دیکھ رہی تھی؟ اُس کو کیا معلوم کہ گنیش کے ہاتھوں اُس کا بھائی بھی اپنے ماں باپ کے ساتھ دفن کیا جا چکا تھا۔۔۔ امیر کا جی چاہا کہ اُسے اُس لڑکی سے مِل کر اُسے سچی بات بتا دینی چاہیئے لیکن جتنی دیر تک اس نے سر اٹھا کر پٹھان کے مکان کی کھڑکی کی طرف دیکھا۔ اتنی دیر تک اُسے وہ کھڑکی بند ہی دکھائی دی۔ ممکن ہے شائد وہ لڑکی بھی اب یہاں سے چلی گئی ہو؟

رائو نے دو چار بار اسے اشاروں اشاروں میں سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ امیر میاں اس رنگین شہر کی گلیوں میں یونہی خالی خالی پھرنے کی بجائے کہیں دل بہلانے کی محفلوں میں چلا جائے کہتے ہیں یہاں کی ناچنے اور گانے والیاں اُداس سے اُداس دلوں کو بھی خوشی سے مالا مال کر دینے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ ابھی ہم لوگوں کے پاس پیسے بھی ہیں اور برسوں سے ہم نے موج شوق بھی نہیں اُڑایا۔ غم بھلانے کے لیے اس سے بہتر شہر اور کون سا ہوگا۔

لیکن امیر کے دل میں ایسی کوئی خواہش ہی نہیں تھی حیدر آباد شہر کی رنگینیوں کے ساتھ اس کی زندگی کی بہت سی یادیں جُڑی ہوئی تھیں جو اب اُس کی آہوں اور آنسوؤں میں گھل کر رہ گئی تھیں۔ ناچنے والی کسی رقاصہ کا ذکر سن کر اس کی آنکھوں میں زہرہ کی تصویر ناچنے لگتی اور وہ اپنے ہونٹ بھینچ کر بول اٹھتا۔ "ہر رقاصہ زہرہ کا ہی روپ ہوتی ہے۔ مطلب سے محبت کرنے والی، جسم بیچ کر کام نکالنے والی اور موقع ملتے ہی دھوکہ دے جانے والی۔"

ساتویں روز جب انھیں حیدر آباد سے واپس جانا تھا تو امیر نے بہ مشکل بے چینی کے بوجھ کو اپنے دل پر سے اتار پھینکا۔ اُس نے اپنے دل میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اب آئندہ کبھی بھی اس شہر میں نہیں آئے گا۔ کیونکہ اس جگہ اُسے کسی قیمت پر بھی چین نہیں مل سکتا۔ اور ہمیشہ اِس شہر کی گلیاں اسے تڑپاتی رہیں گی۔ لیکن اس فیصلے کے باوجود بھی حیدر آباد سے رخصت ہوتے وقت اُس کے قدم وزنی ہو گئے

تھے۔ پھر اُسے اپنے دل کو سمجھانا پڑا تھا کہ اِس شہر سے اُس کا جو ناتا ہے اُسے توڑنا اب اُس کے لیے آسان نہیں ہے ابھی بھی نہ جانے کون اُسے اپنی جانب کھینچ رہا ہے؟ مرنے سے قبل تو ایک بار میں ضرور یہاں آؤں گا اور اگر ہو سکا تو باقی زندگی اِسی جگہ گزار دوں گا۔

●

واپسی کے سفر کی آدھی منزل طے ہو چکی تھی مگر اُس وقت تک جب اُنھیں کوئی مالدار شکار ہاتھ نہیں لگا تو وہ سب ایک بے چینی سی محسوس کرنے لگے تھے۔ حیدر آباد میں قیام کے دوران اُنھوں نے اپنے ہاتھ ذرا کھلے رکھے تھے جس کی وجہ سے اُن کی آدھی کمائی ختم ہو چکی تھی۔ گھر لے جانے کی پونجی اب گھٹتی جا رہی تھی۔ بہت سے ٹھگ تو اپنے پچھلے قرض چُکانے کی فکر لے کر اس سفر پر آئے تھے اور کسی کسی کو تو اپنی بیٹی اور بیٹے کی شادی کے اخراجات بھی پورے کرنے تھے جب وہ لوگ ایک ندی کے کنارے پہنچے تو راستہ بدلنے کے لیے اُنھیں شگون دیکھنے کی ضرورت پیش آ گئی۔

"امیر ہمیں سورت اور بڑودہ جانے کی بجائے ناگپور کے راستے ہو کر جانا چاہیے۔" گنیش نے تجویز پیش کی تو امیر چونک پڑا۔ اُسے گنیش کی یہ تجویز اور سفر کی یہ تبدیلی کچھ عجیب سی لگی۔ لیکن اس نے اعتراض کرنے کی بجائے صرف سوال پوچھنا ہی مناسب سمجھا۔ "پھر ناگپور سے آگے کیسے جائیں گے؟"

"وہاں سے بھوپال ہو کر نکل جائیں گے۔" گنیش نے کہا

"مگر اس سے کیا فرق پڑے گا؟"

"بہت فرق پڑے گا۔" گنیش کے لہجے میں ضد کی جھلک تھی۔ "جہاں جہاں بھی ہم پڑاؤ ڈالتے ہیں وہاں وہاں ہم یہی سنتے آ رہے ہیں کہ اگر خیریت سے اپنی منزل پر پہنچنا چاہتے ہیں تو جبل پور کے قریب کے راستے سے ہی سفر کریں۔"

"آخر اس کی کیا وجہ ہے گنیش؟" امیر نے پوچھا۔

"اس کی وجہ یہ ہے کہ اس طرف مسافروں کے لُٹ جانے کا خوف نہیں ہے۔"

"لیکن کیوں خوف نہیں ہے؟"

امیر کے سوالات پوچھنے کا یہ انداز گنیش کو پسند نہیں آیا۔ اس لیے وہ ذرا اکتاہٹ کا اظہار کرتے ہوئے بولا: "میں تمھارے ہر سوال کا جواب دینے کا پابند نہیں ہوں۔ تم یہ مت بھولو کہ میں اس ٹولی کا سردار ہوں۔"

گنیش جب بحث کر کے کوئی بات سمجھا نہیں پاتا تھا تو وہ اپنی سرداری کی بات کر کے امیر کو چُپ کرا دیتا۔ لیکن اس بار تو چُپ رہنے کی بجائے امیر نے بولنا ہی شروع کر دیا۔

"میں بتاتا ہوں گنیش! مسافر لوگ جبل پور کے راستے سفر پر جانا اس لیے پسند کرتے ہیں کہ وہاں اُنھیں اپنے محفوظ رہنے کی امید ہوتی ہے۔ اور اس کی وجہ وہ انگریز افسر ولیم سلومن ہے۔" بولتے بولتے امیر جوش میں آ گیا۔ "اور اگر ہم نے شکار کی لالچ میں وہ راستہ اختیار کیا تو ہم خود شکار بن جائیں گے۔"

یہ سُن کر گنیش کو موقع مل گیا۔ وہ ہنس کر بولا۔ "اب میں سمجھا کہ تم ایسے سوالات کیوں کر رہے تھے؟ تم یہ صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ گورے صاحب سے ڈر کر تم دس گاؤں دور رہنا چاہتے ہو؟"

"گورا صاحب مجھ اکیلے کا دشمن نہیں ہے۔ اُسے ٹھگوں کی پوری برادری سے دشمنی ہے۔" امیر سنجیدہ لہجے میں بولا۔ "میں اس سے صرف دس گاؤں ہی نہیں بلکہ سو گاؤں دور رہنا پسند کروں گا۔"

"اس کا مطلب ہے تم جبل پور کے راستے سے ہمارے ساتھ نہیں چلو گے؟" گنیش آنکھیں نکال کر کرخت لہجے میں بولا۔ "اور اِسی جگہ سے الگ ہو جانا چاہتے ہو؟"

"نہیں۔" امیر کے ہونٹوں پر پُراعتماد مسکراہٹ تھی۔ "تمھارے ساتھ تو میں اس سفر کے پورا ہو جانے تک رہوں گا۔ میں اپنے اکیلے کے بارے میں نہیں سوچ رہا ہوں بلکہ ٹولی کا مفاد بھی میری نظر میں ہے۔ اِس کی سلامتی کے بارے میں بھی ہمیں ہی سوچنا ہے۔"

"اِس کے بارے میں سوچنا میرا کام ہے۔" یہ بات کہنے کو تو گنیش کہہ گیا مگر پھر فوراً ہی سنبھل کر بولا۔ "ہماری سلامتی بھوانی دیوی کے ہاتھ میں ہے۔ اس کی طرف سے ہمیں جس راستے سے جانے کا اشارہ ملے گا ہم اُسی راستے سے جائیں گے۔"

اس نے شگون دیکھنے کی بات کہی تو امیر ڈھیلا پڑ گیا۔ اس

طرح گویا اُس نے ایک طرح سے گنیش کی بات تسلیم کر لی تھی۔ "ٹھیک ہے شگون دیکھنے کے بعد ہی فیصلہ کریں گے۔" وہ پُرسکون لہجے میں بولا۔

"تو پھر تم لوگ شگون کی رسم پوری کرو تب تک میں شہر کا ایک چکر لگا آتا ہوں۔" گنیش اپنی عادت کے مطابق اپنے سر کا ایک بال توڑتے ہوئے بولا۔ "اگر ہو سکا تو مسافروں کے بارے میں بھی معلومات کرتا آؤں گا۔" جاتے جاتے اُس نے کترائی ہوئی نظروں سے امیر کی طرف دیکھا۔ لیکن امیر نے اُس پر کوئی توجہ نہیں دی۔

●

شگون دیکھ لینے کے بعد فیصلہ کرنے میں سخت اُلجھن ہو رہی تھی۔ دونوں طرف کے راستوں کے لیے یکساں ہی اشارہ موصول ہوا تھا۔ ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا تھا لیکن جب بھی ایسے حالات ہوتے تو اُنھیں سردار کے صوابدید پر چھوڑ دیا جاتا تھا۔

"شائد گنیش واپس آ رہا ہے۔" رامو نے امیر کی توجہ مبذول کراتے ہوئے کہا۔ "وہ دیکھو دو اور آدمی بھی اس کے ساتھ ہیں۔"

"لگتا ہے وہ شکار کو ساتھ لیتا آیا ہے۔" ایک ٹھگ ساتھی نے کہا تو امیر نے اُس جانب نظریں اٹھا کر دیکھا اور اُس کی تجربہ کار نگاہوں نے یہ فوراً ہی تاڑ لیا کہ گنیش کے ساتھ آنے والے دونوں آدمی مسافر نہیں لگتے۔ اُن کے ساتھ کوئی مال سامان بھی نہیں تھا۔ گنیش کے دائیں جانب والا آدمی دُبلا پتلا دراز قد اور پھرتیلا دکھائی دے رہا تھا اور بائیں طرف والا پستہ قد، فربہ اور سُست قسم کا آدمی نظر آ رہا تھا اور گنیش ان دونوں کے درمیان بڑے رعب سے چلتا آ رہا تھا۔ اُس کی اِسی چال سے امیر کو یہ اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی تھی کہ گنیش یقیناً کوئی اہم معلومات لے کر ہی آ رہا ہے۔

"دونوں طرف کے راستوں کے بارے میں ہمیں اچھا شگون ملا ہے۔" گنیش کے ایک خاص ٹھگ ساتھی نے اسے دیکھ کر راسمی زبان میں کہا۔ "اب فیصلہ آپ کو ہی کرنا ہے۔"

"فیصلہ تو میں راستے میں ہی کرتا آیا ہوں۔" گنیش راسمی زبان میں جواب دینے کی بجائے چالو زبان میں بولا تاکہ سب اُس کی بات سمجھ سکیں۔ اور امیر حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ گنیش اُن دونوں کا تعارف کراتے ہوئے آگے کہہ رہا تھا۔ "یہ دیوی سنگھ ہے اور اس کا نام شمبھو سنگھ ہے اِنھوں نے مجھے جو معلومات فراہم کی ہیں وہ میری اپنی سوچ سے ملتی جُلتی ہیں۔ ابھی چند روز قبل ہی یہاں کے دو ساہوکار قیمتی مال سامان لے کر ناگپور کی جانب گئے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق ان کے پاس کم سے کم پچیس ہزار روپے کا مال تو ہو گا ہی۔"

پچیس ہزار کی رقم کا سُن کر سب کی آنکھوں میں ایک چمک سی لہرانے لگی لیکن امیر کی نگاہیں تو ابھی تک ان دونوں کو تولنے میں لگی ہوئی تھیں۔ اچانک اُس نے گنیش سے پوچھا۔ "گنیش یہ دونوں مُخبر ہیں کہ۔۔۔" امیر جان بوجھ کر اس ادھورے جملے پر رُک گیا۔ لیکن اس کا یہ سوال گنیش کو بُری طرح کھٹکنے لگا مگر وہ بات ٹالنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "اِس سلسلے میں فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ لوگ ایک بار میری ٹولی میں رہ چکے ہیں اور فرنگیا کے ساتھ بھی ایک سفر کر چکے ہیں۔ یہ لوگ ہمارے ساتھ ناگپور تک جائیں گے اور اُن دونوں ساہوکار کے شکار کے بعد واپس چلے آئیں گے۔"

اُس کی یہ وضاحت امیر کے دل کو نہیں لگی۔ دُبلا پتلا دراز قد دیوی سنگھ ترچھی نظروں سے امیر کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ امیر کے دل میں بہت سے سوالات اٹھ رہے تھے لیکن گنیش نے اُسے مزید کچھ پوچھنے کا موقع ہی نہیں دیا۔

"چلو اب جلدی کرو۔ اُن ساہوکار کو پکڑنے کے لیے ہمیں پھرتی سے کام لینا ہو گا۔" گنیش نے کہا تو دوسرے ٹھگ جلدی جلدی پڑاؤ اٹھانے کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ اُن میں سے کتنے تو مارے خوشی کے گیت الاپنے لگے تھے اور کئی ٹھگ تو گنیش کی ہوشیاری کی تعریفیں کرنے لگے۔ لیکن امیر کے چہرے پر خوشی کے کوئی تاثرات نہیں تھے۔ اُس کا دل نہ جانے کیوں اُس راستے پر آگے بڑھنے کے لیے تیار نہیں ہو رہا تھا۔ اُسے دیوی سنگھ اور شمبھو سنگھ پر بھی بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ وہ سب کے ساتھ جانے کے لیے بوجھل دل سے اپنے گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ تو گیا تھا مگر گھوڑے کو آگے بڑھانے سے قبل اُس نے رامو کے کان میں دھیرے سے پھونک ماردی تھی۔

"رامُو تم چونکہ پیدل چل رہے ہو۔ اِس لیے اُن دونوں کے ساتھ گھل مل جاؤ۔ مجھے اِن دونوں پر شک ہو رہا ہے۔"

"کیسا شک پیدا ہو گیا؟" رامُو نے بے چینی سے پوچھا لیکن امیر اُس کی وضاحت نہیں کر سکا۔

"مجھے کیوں ان دونوں پر شک ہونے لگا ہے اِس کا تو مجھے خود بھی علم نہیں ہے۔ لیکن ہوشیار رہنا تو اچھا ہی ہے۔" کہہ کر اس نے گنیش کے ساتھ ساتھ چلنے کے لیے اپنا گھوڑا دوڑا دیا۔ اور ٹھیک اُسی وقت دیوی سنگھ اپنے ساتھی شمبھو سنگھ کو آنکھ مارتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "مجھے یقین ہے یہ لوگ پوری طرح ہماری باتوں میں پھنس چکے ہیں۔"

"لیکن ہمیں بہت زیادہ خوش فہمی میں بھی مبتلا نہیں رہنا چاہیئے۔" شمبھو سنگھ امیر کی پیٹھ پر نظریں جمائے ہوئے بولا۔ "یہ امیر علی بہت ہی پہنچا ہوا اور چالاک ٹھگ ہے۔ اس نے ابھی تک ہم پر اعتماد نہیں کیا ہے۔" انھیں اپنی گفتگو یہیں روک دینی پڑی۔ کیوں کہ رامُو ہنستا ہنستا سامنے سے چلا آ رہا تھا۔

●

امیر کا خیال تھا کہ ایک دو منزل کے سفر کے بعد دیوی سنگھ اور شمبھو سنگھ کی اصلیت ظاہر ہو جائے گی۔ اسی لیے تو وہ ہر مقام پر آنے جانے والے لوگوں سے پوچھتا رہتا تھا کہ کیا ہمارے آگے ناگپور کے راستے پر دو مسافر جاتے ہوئے دکھائی دیئے ہیں؟ جب اُس کے اِس سوال کا جواب ہر جگہ سے ہاں میں ملا تو امیر اُلجھن میں پڑ گیا اور سوچنے لگا کہ اسے دیوی سنگھ اور شمبھو سنگھ پر بے جا شک تو نہیں ہونے لگا ہے؟

گنیش کا ارادہ تو ناگپور سے پہلے ہی ان ساہوکاروں کو پکڑ لینے کا تھا کیونکہ ناگپور پہنچنے کے بعد کیسے معلوم کہ وہ لوگ ان کے ہاتھ آتے بھی ہیں کہ نہیں؟ یہ ہی وجہ تھی کہ اُس نے اپنی رفتار دوگنی کر رکھی تھی۔ راستے میں کئی جگہ اُسے کچھ معمولی مسافر دکھائی دیئے تھے۔ لیکن اس نے انھیں شکار کرنے کی بھی کوشش نہیں کی۔ پھر جب ناگپور شہر بہت قریب رہ گیا اور دونوں ساہوکار نظر نہیں آئے تو اُسے اُلجھن سی ہونے لگی۔ لیکن دیوی سنگھ اور شمبھو سنگھ اُس کے کان میں برابر یہ بات ڈالتے رہے کہ وہ دونوں ہم سے بچ کر کہاں جا سکتے ہیں؟ وہ مال کا سودا کرنے کے لیے ناگپور میں ضرور رکیں گے پھر وہ جبل پور کی جانب روانہ ہوں گے۔ لیکن اس سے قبل ہم انھیں پکڑ لیں گے وہ ہر وقت گنیش کی لالچ بڑھاتے رہتے کہ مال سامان فروخت کر کے انھوں نے نقد رقم حاصل کر لی ہوگی۔ اِس لیے ہم لوگوں کو تو فائدہ ہی ہوگا۔

جبل پور کا نام آیا تو امیر خاموش نہ رہ سکا۔ اُس نے فوراً ہی گنیش کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "گنیش! ساہوکاروں کی لالچ میں ہمیں اس راستے پر نہیں جانا ہے اور نہ ہی ہمیں جبل پور کے علاقے میں پاؤں رکھنا ہے۔"

اُس کے یہ الفاظ سن کر دیوی سنگھ اور شمبھو سنگھ بُری طرح چونک پڑے۔ اور گنیش نے امیر کو گھورتے ہوئے کہا "میری سمجھ میں نہیں آتا امیر! کہ تم اِس سفر میں کوئی نہ کوئی رکاوٹ کیوں کھڑی کر رہے ہو؟ ناگپور پہنچنے سے پہلے ہی تمھارے پیروں کی طاقت ختم ہو گئی اور جبل پور کے علاقے میں قدم نہ رکھنے کی بات کبھی ابھی سے تم کرنے لگ گئے؟"

امیر کو ایک بار پھر غم کھا کر چپ ہو جانا پڑا۔ شمبھو اور دیوی سنگھ پر سے اس کا شک دور نہیں ہو رہا تھا۔ لیکن ان دونوں کی چالبازی کا کوئی ثبوت بھی اسے نہیں مل رہا تھا۔ رامُو نے امیر کی ہدایت کے مطابق اس سفر میں دونوں سے تھوڑی سی دوستی تو ضرور کر لی تھی۔ لیکن وہ بھی اُن کے خلاف کوئی ثبوت نہیں حاصل کر سکا تھا بلکہ وہ تو بار بار امیر سے یہی کہتا رہا تھا کہ شمبھو اور دیوی سنگھ تو تم سے بہت خوش ہیں اور ہر وقت تمھاری تعریف کرتے رہتے ہیں۔ اس سلسلے میں رامُو یہ بھی دلیل پیش کرتا کہ اگر وہ لوگ ہمیں دھوکہ ہی دینا چاہتے تو ہمارے ساتھ کیوں رہتے؟ وہ تو اشارہ کر کے بھی ہمیں غلط راستے پر ڈال سکتے تھے۔ ہاں انھیں شکار میں سے حصہ لینے کی لالچ ضرور ہے اور یہ حق تو ہر ٹھگ اور ہر مخبر کو ہوتا ہے۔ اور اسی لئے تو وہ لوگ سفر کے خطرے میں ہمارے ساتھ شامل ہوئے ہیں۔

یہ سُن کر امیر اور زیادہ اُلجھن میں پڑ جاتا تھا۔ کبھی کبھی تو اُسے اپنے آپ پر غصہ آنے لگتا اور اسی حالت

میں خود سے بحث کرنے لگتا کہ ایک زمانے میں وہ خود ہی آگے بڑھ کر خطروں کو گلے سے لگا لیا کرتا تھا۔ لیکن اب وہ خطرے کا نام سنتے ہی کیوں گھبرا جاتا ہے؟ کیا گورے صاحب ولیم سلومن کا خوف اُس کے دل میں اتنا بیٹھ گیا ہے کہ وہ اس کی حد میں قدم رکھنے کے نام سے بھی کانپنے لگا ہے؟ اب تو اس کے ساتھ بیوی بچے کی بھی محبت نہیں ہے۔ تو پھر وہ کیوں ولیم سلومن سے ڈرتا رہتا ہے؟ اُسے تو چاہیئے کہ وہ ایک بار ولیم سلومن کو یہ بتا دے کہ اس کا پالا ابھی تک امیر علی جیسے ٹھگ سے نہیں پڑا ہے...

یہ ساری باتیں سوچنے کے بعد وہ کچھ زیادہ ہی جوشیلا اور جذباتی ہو گیا۔ پھر ناگپور میں بھی جب انھیں وہ دونوں ساہوکار نہیں ملے تو گنیش نے پنچ گنی تک ان کا پیچھا کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ مگر امیر نے اس بار کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ اس نے تمام ٹھگ ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "اگر تم سب لوگ راضی ہو جاؤ تو ہم لوگ جبل پور تک ان کے تعاقب میں جانے کے لیے تیار ہیں۔ میرے دل میں بھی اس ولایتی افسر کا چہرہ دیکھنے کی تمنا ہے۔ اِس بہانے میری یہ تمنا پوری ہو جائے گی۔"

یہ سُن کر دوسرے ساتھیوں کے ساتھ دیوی سنگھ اور شمبھو بھی خوش ہو گئے۔ وہ ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے ہونٹوں ہی ہونٹوں میں مسکرانے لگے۔ امیر کی بات سن کر شمبھو نے دھیرے سے دیوی سنگھ کے کان میں کہا تھا: "اِس کی یہ تمنا تو ہم لوگ ہی پوری کریں گے۔"

جب ان دونوں میں یہ کانا پھوسی ہو رہی تھی تو ان سے دور بیٹھا ہوا رامُو اُن میں ہونے والی گفتگو تو نہ سُن سکا۔ لیکن اُن کے درمیان ہونے والی کانا پھوسی اور مسکراہٹ کا تبادلہ اُس کی نظروں سے اوجھل نہیں رہ سکے تھے۔

●

ناگپور اور پنچ گنی کے درمیان چار منزلوں کا فاصلہ تھا۔ اُن چار میں سے جب دو منزلوں کا فاصلہ انھوں نے طے کر لیا اور تب بھی جب انھیں ساہوکاروں کا پتہ نہیں چلا تو اُن کی پریشانیوں میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ مسلسل سفر کی وجہ سے بہت سارے ٹھگ تھکن سی محسوس کر کے اُکتاہٹ کا شکار ہو گئے تھے۔ مسلسل دن اور رات کے تعاقب کے بعد بھی شکار کا پتا نہ چلے ایسا تو اِس سے پہلے کبھی ہوا نہیں تھا۔ خود گنیش کو بھی اب یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ شمبھو اور دیوی سنگھ نے اُن لوگوں کو جان بوجھ کر غلط راستے پر ڈال رکھا ہے۔ لیکن وہ اپنے ساتھیوں پر یہ چھاپ بٹھانا نہیں چاہتا تھا کہ امیر اُس سے زیادہ چالاک، ہوشیار اور دور اندیش ہے۔ اسی لیے اُس نے جان بوجھ کر یہ راستہ اختیار کیا تھا۔ لیکن اُس کی یہ ضد اب جیت کی بجائے ہار میں بدلتی جا رہی تھی کیونکہ ایک جگہ اُس کے دوسرے ٹھگ ساتھی تھک ہار کر بیٹھ گئے اور ضد کرنے لگے کہ انھیں یہاں ایک رات آرام کرنے کا موقع دیا جائے۔ ایک رات اور ایک دن آرام سے پاؤں پھیلا کر پھر شگون دیکھا جائے گا اور یہ فیصلہ کیا جائیگا کہ آگے جایا جائے یا واپس۔

"لیکن تم لوگ اگر ایک رات اور ایک دن اِسی جگہ پڑے رہے تو وہ دونوں ساہوکار کبھی بھی ہمارے ہاتھ نہیں لگ سکیں گے۔" گنیش غصیلے لہجے میں بولا۔ "ہمت کر کے ہمیں پنچ گنی تک تو پہنچ ہی جانا چاہیئے۔" یہ کہنے کے بعد اس نے امیر کو بھی ٹٹولنے کی کوشش کی۔ "امیر کیا تمھیں نہیں لگتا کہ صرف دو منزل کے لیے ہمت توڑ کر ہم لوگ بے وقوفی کر رہے ہیں؟"

امیر گنیش کی لاچاری اور چالاکی سمجھ گیا۔ اسے یقین تھا کہ اگر اُس نے اُس کے خلاف کوئی بات کی تو گنیش سارا الزام اسی کے سر دھوپ دے گا۔ اِس لیے اُس نے تھوڑی دیر تک سوچنے کے بعد خود بھی چالاکی سے کام لینے کا فیصلہ کر لیا اور بولا: "میں تو دونوں ہی طرح سے تیار ہوں۔ آگے جانے میں بھی مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے کیونکہ میرے پاس چاک اور چوبند گھوڑا موجود ہے۔ لیکن جنھیں پیدل چلنا ہے ان کی ٹانگوں میں طاقت ہونی چاہیئے۔"

اپنی بات کا سیدھا جواب نہ پا کر گنیش بھنا گیا پھر پلٹ کر اُس نے شمبھو اور دیوی سنگھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تم دونوں کیوں خاموش ہو؟"

وہ دونوں اس کا سوال سن کر اس طرح ایک دوسرے کا منھ دیکھنے لگے جیسے وہ خود بھی سخت اُلجھن میں ہوں انھیں اِس بات کا خوف بھی تھا کہ اگر وہ زیادہ دیر تک اِسی طرح چُپ رہے تو یہ لوگ اُن پر اور زیادہ شک کرنے لگیں گے۔ اس خیال کے آتے ہی دیوی سنگھ نے جلدی سے کہا "ایک ترکیب میرے ذہن میں آتی ہے۔" اتنا کہہ کر وہ ایک لمحے کے لیے خاموش رہا پھر دھیرے سے بولا۔ "اگر آپ لوگوں کو اعتراض نہ ہو تو پہلے میں شمبھو سے مشورہ کرلوں پھر میں اپنا ارادہ آپ لوگوں پر ظاہر کر دوں گا۔"

امیر کو اُس کی یہ بات کچھ عجیب سی محسوس ہوئی لیکن گنیش نے اِس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ وہ دیوی سنگھ کو اجازت دیتے ہوئے بولا "ٹھیک ہے جو کرنا ہے جلدی کرو تاکہ جلد سے جلد کوئی فیصلہ ہو سکے۔"

دیوی سنگھ شمبھو کا ہاتھ پکڑ کر اسے ایک جانب لے گیا۔ تھوڑی دیر تک ان میں دھیرے دھیرے کچھ باتیں ہوتی رہیں۔ پھر وہ باتوں کے ساتھ ساتھ ہاتھ اور سر بھی ہلانے لگے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کسی بات پر وہ دونوں ایک دوسرے سے ناراضگی کا اظہار کر رہے ہوں۔ امیر دور سے ہی ان کی حرکتوں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ دونوں واپس آتے دکھائی دیے۔ دونوں کے چہروں پر مسکراہٹ ناچ رہی تھی جس سے یوں لگ رہا تھا کہ وہ دونوں کسی فیصلے پر پہنچ چکے ہیں۔ "ہمارا خیال ہے آپ سب لوگ اسی جگہ پڑاؤ ڈال کر آرام کر سکتے ہیں۔" قریب آکر دیوی سنگھ نے کہا۔

"سب لوگ سے کیا مراد ہے؟" امیر نے چونک کر پوچھا۔

"میرا مطلب ہے آپ لوگ یہاں آرام کریں تب تک میں خود ہی پنچ گنی جا کر ان ساہوکاروں کا پتا چلا کر واپس آتا ہوں۔" دیوی سنگھ کی اس تجویز کو سن کر وہ سب کے سب سوچ میں پڑ گئے اور تب گنیش نے صرف اتنا ہی پوچھا "مگر اس سے کیا فائدہ؟"

"سردار یہ شکار ہمارے ہاتھ سے نکل جائے ایسا تو کوئی بھی نہیں چاہتا۔ اس میں تو ہمارا دوہرا نقصان ہے۔ اوّل تو ہمیں پچیس ہزار میں سے اپنا حصّہ کھونا پڑیگا اور دوسرا آپ لوگوں کا اعتماد بھی گنوانا پڑے گا۔ ہم نے ہی آپ کو یہ شکار دکھایا ہے اور اب ہم ہی راستے میں رُک جائیں یہ تو کوئی مناسب بات نہیں ہے۔" دیوی سنگھ نے محسوس کر لیا تھا کہ بات اُن لوگوں کے گلے سے نیچے اترنے لگی ہے اِسی لیے وہ پہلے سے زیادہ پُرجوش نظر آنے لگا تھا۔ وہ آگے بولا "شمبھو ابھی یہاں سے پنچ گنی کی طرف روانہ ہو جائے گا اور ساری رات سفر کرنے کے بعد جب وہ کل صبح تک بھی واپس نہ آئے تو ہم یہ ہی سمجھیں گے کہ ان دونوں ساہوکاروں سے اس کی ملاقات ہو گئی ہے۔"

"اور اگر کل دوپہر تک میں واپس آگیا تو ہمیں اس شکار کی امید چھوڑ دینی ہوگی۔" شمبھو نے اس کی بات مکمل کرتے ہوئے کہا "اگر آپ کو منظور ہو تو پندرہ کوس کا یہ سفر کرنے کے لیے میں تیار ہوں۔ لیکن اِس کے لیے آپ کو میری تھوڑی مدد کرنا پڑے گی۔"

"کیا؟"

"ایک تیز رفتار گھوڑا عنایت کر دیں تو میں ہوا کی رفتار سے پہنچ سکتا ہوں۔" شمبھو نے کہا۔

"ٹھیک ہے تم میرا گھوڑا لے جاؤ۔" گنیش نے فوراً ہی اجازت دے دی۔ اُسے یہ ترکیب پسند آگئی تھی۔ اِس کی ایک خاص وجہ یہ تھی کہ اِس طرح اس کی مندقائم رہ سکتی تھی اور ساتھیوں کو آرام کا موقع بھی فراہم ہو جاتا تھا "شمبھو تم جلدی سے روانہ ہو جاؤ۔ اگر کل دوپہر تک تمھاری واپسی نہیں ہوئی تو ہم لوگ سمجھ جائیں گے کہ تم شکار تک پہنچ چکے ہو۔" گنیش نے چونکہ سوچے سمجھے بغیر ان کا مشورہ مان لیا تھا اس لیے دیوی سنگھ اور شمبھو دل ہی دل میں بے حد خوش ہو رہے تھے۔ لیکن امیر کو ابھی تک ان لوگوں پر شک تھا اس لیے وہ گنیش سے بولا "اگر شمبھو کی بجائے میں پنچ گنی چلا جاؤں تو؟"

یہ سن کر دیوی سنگھ نے چونک کر امیر کی طرف دیکھا شمبھو بھی کچھ چوکنا ہو گیا تھا اور گنیش بھی کچھ دیر کے لیے

سوچ میں پڑ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ امیر اتنا خطرہ مول لینے پر کیوں تیار ہو گیا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ وہ اپنی ہوشیاری دکھانے کا موقع تلاش کر رہا ہو؟ یہ ساری باتیں سوچنے کے بعد وہ بولا: "نہیں امیر! شمبھو کو یہی جانے دو۔ ہم انھیں مفت میں حصہ نہیں دیں گے۔"

یہ سن کر دیوی سنگھ نے فوراً ہی کہا: "اور امیر میاں آپ ان ساہوکاروں کو جانتے بھی تو نہیں ہیں۔ شمبھو تو کسی بہانے انھیں پنچ گنی میں روک بھی لے گا کیونکہ ان میں سے ایک سے تو اس کی جان پہچان ہے۔"

"تب تو مجھے بھی آرام کا موقع مل جائے گا۔" امیر نے ہوشیاری سے بات بدل دی۔ دراصل وہ پنچ گنی تو جانا ہی نہیں چاہتا تھا۔ وہ تو صرف دیوی سنگھ اور شمبھو کو تولنا چاہتا تھا۔ اسے تو جو کچھ بھی کرنا تھا وہ اسی جگہ بیٹھ کر کرنا تھا۔

تھوڑی دیر بعد شمبھو گنیش کا گھوڑا لے کر روانہ ہو گیا اور ٹھگوں کی یہ ٹولی یہ رات آرام سے گزارنے کی تیاریوں میں لگ گئی۔ ان میں سے جو عادی نشے باز تھے وہ گانجے وغیرہ کی تلاش میں شہر کی جانب روانہ ہو گئے۔ ان سب کے جانے کے بعد امیر نے رامو کو اشارے سے سمجھا دیا کہ اب دیوی سنگھ کو اکیلا مت چھوڑنا۔

●

صبح کا سورج ابھی پوری طرح طلوع نہیں ہوا تھا۔ تمام ٹھگ ابھی تک گہری نیند میں سوئے ہوئے تھے لیکن رامو جاگ چکا تھا۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا تیزی سے بھاگتا ہوا گنیش کے خیمے میں داخل ہوا۔ اور گنیش کو جھنجھوڑتے ہوئے بولا: "غضب ہو گیا سردار!"

"کیا ہوا؟" گنیش کروٹ بدل کر بڑبڑایا اور پھر سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

"امیر اپنے خیمے میں موجود نہیں ہے۔" رامو نے جلدی جلدی کہا۔

"تو اس میں کیا غضب ہو گیا؟" گنیش غصے سے بولا۔ "ممکن ہے صبح کی سیر کو نکل گیا ہو۔"

"نہیں سردار! رات وہ پنچ گنی جانے کی بات کر رہا تھا۔"

"پنچ گنی؟" گنیش چونک کر اٹھ بیٹھا۔ مجھ سے پوچھے بغیر؟"

گنیش کو غصے میں دیکھ کر رامو خوفزدہ ہو کر بڑبڑایا "اس کے دماغ میں جب کوئی دھن سوار ہو جاتی ہے تو وہ کسی سے پوچھنے اور کسی کے سننے کی پرواہ نہیں کرتا۔ شام کے وقت تو میں نے بہ مشکل اس کو روک رکھا تھا لیکن آدھی رات کو میں سو گیا اور تب کیا ہوا اس کا مجھے علم نہیں ہے۔ اس کا گھوڑا بھی نظر نہیں آتا۔"

"آخر وہ اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے؟" گنیش کی گرجدار آواز نے چند سوئے ہوئے ٹھگوں کو جگا دیا: "اب میں اس کی یہ عادت برداشت نہیں کروں گا کہ وہ مجھ سے اونچا جانے کی کوشش کرے۔ اب اس ٹولی میں اس کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔"

دیوی سنگھ کا خیال تھا کہ امیر شمبھو سنگھ کے پیچھے گیا ہو گا اسی لیے وہ اپنی ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے بولا: "گنیش اگر ہمیں پہلے سے یہ بات معلوم ہوتی کہ امیر ہم سے جلتا ہے تو ہم اس سفر میں کبھی شریک ہی نہ ہوتے۔ اپنے ہم پیشہ بھائیوں پر اس قدر شک و شبہ؟"

گنیش نے امیر کے خلاف ہونے والی ان باتوں کو جاری رہنے دیا۔ اسے اپنے ساتھیوں کو بھی امیر کے خلاف بھڑکانے کا اچھا موقع ہاتھ آ گیا تھا۔ اسی لیے وہ آگے بولا: "اب اس کے واپس آنے سے قبل ہی ہمیں فیصلہ کر لینا چاہیے۔"

"کیسا فیصلہ؟" رامو اور روپ سنگھ نے ایک ساتھ پوچھا۔

"ہم اسے سزا دیں گے۔" گنیش دانت پیس کر کہہ رہا تھا: "میں اسے اپنی ٹولی سے نکال دینے کی بات سوچ رہا تھا لیکن اب تو میں نے یہ سوچا ہے کہ اسے اس سے بھی کڑی سزا ملنی چاہیے۔" اتنا کہہ کر اس نے کمر میں سے اپنا رومال کھینچ نکالا اور آگے بولا: "بولو تم لوگ کیا کہتے ہو؟"

گنیش کا یہ سوال سن کر رامو دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ گنیش اپنے تمام ساتھیوں کو امیر کے خلاف اس حد تک اکسا رہا ہے۔ لیکن وہ چپ ہی رہا۔ تھوڑی دیر تک جب کسی نے کوئی جواب نہیں دیا تو گنیش پھر بولا: "تم سب لوگ خاموش کیوں ہو؟"

"ٹھہرو۔" اچانک رامو دور دیکھتا ہوا زور سے چلایا: "ادھر دیکھو شاید امیر ہی واپس آتا دکھائی دے رہا ہے۔"

سب کی نگاہیں اس جانب اٹھ گئیں۔ سامنے سے ایک گھوڑ سوار پوری رفتار سے گھوڑا دوڑاتا چلا آ رہا تھا اس کے ہاتھ میں دبی ہوئی تلوار صبح کی دھوپ میں چمک رہی تھی۔ سب ایک ٹک اسی طرف دیکھ رہے تھے۔ اڑتی ہوئی دھول کے درمیان سے امیر کا سراپا آہستہ آہستہ صاف دکھائی دینے لگا تو گنیش کی سانس زور زور سے چلنے لگی۔ دس گز کے فاصلے پر آ کر اچانک امیر نے گھوڑے کی لگام کھینچ لی۔ گھوڑے کے نتھنوں میں سے جھاگ نکل رہا تھا جیسے وہ بہت دور سے ایک ہی رفتار سے بھاگتا ہوا یہاں تک پہنچا ہو۔ ہانپتے ہوئے امیر نے جب گھوڑے کی پیٹھ پر سے نیچے چھلانگ لگائی تو سب کو خیال آیا کہ اس کی ننگی تلوار خون آلود ہے اور اس کا چہرہ بھی حد درجہ بھیانک نظر آ رہا ہے۔ ایک لمحے کے لیے تو خود گنیش بھی گھبرا گیا اور دیوی سنگھ کا تو پورا بدن کانپنے لگا تھا۔ وہ امیر کا بھیانک چہرہ دیکھ کر دھیرے دھیرے گنیش کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ تمام ٹھگ ساتھی حیرت سے دیکھ رہے تھے اور امیر سانس روکے ایک ایک قدم آگے بڑھ رہا تھا۔ ہاتھ میں ننگی تلوار اٹھائے وہ جیسے جیسے قریب آتا جا رہا تھا ویسے ویسے اس کا چہرہ بھیانک سے بھیانک تر ہوتا جا رہا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے دماغ پر شیطان سوار ہو گیا ہے۔

"امیر میاں!" اچانک رامو نے آگے بڑھ کر اس کا بازو تھام لیا۔

"تمھیں کیا ہو گیا ہے؟" کہہ کر رامو نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ لیکن امیر نے دھکا دے کر اسے دور دھکیل دیا اور چلا کر بولا: "گنیش! وہ غدار کہاں ہے؟"

اس کی زبان سے نکلے ہوئے ان الفاظ نے دیوی سنگھ کو لرزا دیا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے گنیش کی پیٹھ تھام لی۔

"کون غدار؟" گنیش نے پوچھا۔

"وہی جو تمھارے پیچھے چھپا ہوا ہے۔" امیر دانت پیس کر بولا تو ہر ایک کی آنکھ اس کی جانب اٹھ گئی۔ دیوی سنگھ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ پھر وہ بہ مشکل بول سکا: "نہیں... نہیں..."

امیر دو قدم اور آگے بڑھا تو گنیش نے اپنی کمر میں سے جھٹ اپنی کٹاری نکال لی اور امیر کو للکارتے ہوئے بولا: "خبردار قریب مت آنا۔ پاگلوں کی طرح یہ کیا حرکت کر رہے ہو تم؟"

"پاگل" امیر اپنی خون آلود تلوار کی طرف دیکھتا ہوا بولا: "یہ دیکھو یہ کس کا خون ہے؟"

"کس کا ہے؟" گنیش بولا۔

اور امیر قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ اس کا یہ قہقہہ بڑا ہی خوفناک تھا۔

"دیوی سنگھ کو معلوم ہے کہ یہ خون کس کا ہے؟" اتنا کہہ کر امیر نے تلوار کی نوک دیوی سنگھ کی آنکھوں کے سامنے نچائی اور چیخ کر بولا: "بول دغا باز راجپوت! بتا دے ان سب کو کہ یہ کس کا خون ہے؟"

لیکن دیوی سنگھ گنیش کی پیٹھ سے چپکا ہی رہا: "مجھے کچھ نہیں معلوم۔ میں کچھ بھی نہیں جانتا۔" کہہ کر وہ گنیش سے لپٹا ہوا زمین پر بیٹھ گیا۔

اے حمید کے ایڈونچر قلم سے

شیوسینا کے دہشت گرد

چار جلدوں میں مکمل سیٹ -/700 روپے

ناشر: مکتبہ القریش

اردو بازار لاہور

"بدمعاش! ابھی تک جھوٹ بول رہا ہے؟" امیر نے تلوار نیچی کر کے گنیش کے پیروں کے نیچے سے اس کے چہرے کے قریب لہرائی۔ "سونگھ کر دیکھو اس لہو سے غدّاری کی بو آتی ہے یا نہیں؟"

لیکن دیوی سنگھ نے جواب دینے کی بجائے دونوں ہاتھوں میں اپنا منہ چھپا لیا پھر تھوڑی دیر بعد بولا۔ "مجھے کچھ نہیں معلوم۔ میں کچھ بھی نہیں جانتا۔" اتنا کہہ کر وہ سسک سسک کر رونے لگا۔ تھوڑی دیر تک تو ماحول پر خاموشی چھائی رہی پھر گنیش اس طرح بولا جیسے اُس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا ہو۔ "امیر! ہم نے تمھیں سزا دینے کا فیصلہ کیا ہے۔"

"سزا" امیر نے ہونٹ بھینچ کر اپنے تمام ٹھگ ساتھیوں کی طرف دیکھا اور پھر گنیش کے چہرے پر نظریں جما کر بولا "اپنے ساتھیوں کی زندگیاں بچانے والے اور اپنی جان کو خطرے میں ڈالنے والے امیر علی کو تم سزا دینا چاہتے ہو؟ غدّاروں کو سزا دینے والے اپنے وفادار ساتھی کو اس طرح بدلہ دینا چاہتے ہو؟"

"غدّار۔ غدّار۔ غدّار۔" گنیش جھنجھلا کر چلّایا۔ "بار بار یہ ایک لفظ دہرا کر تم اپنی جان نہیں بچا سکو گے۔"

"تب پھر پہلے میرا بیان سن لو۔" امیر اپنے تمام ساتھیوں کی طرف دیکھ کر اس طرح بولا جیسے وہ گنیش سے نہیں بلکہ اُن لوگوں سے کہہ رہا ہو۔ "میری تلوار پر جما ہوا یہ لہو دیوی سنگھ کے دوست شمبھو سنگھ کا لہو ہے۔"

"شمبھو کا" کئی آوازیں ایک ساتھ سنائی دیں۔ اور دیوی سنگھ پر تو جیسے بجلی گر پڑی۔ امیر آگے کہہ رہا تھا "مجھے سازش کی بُو تو پہلے ہی آ چکی تھی۔ ہمیں ساہوکاروں کے پیچھے لگا کر یہ دونوں بدمعاش ہمیں اپنے جال میں پھانسنا چاہتے تھے۔ تم لوگوں کو پتا ہے اس دیوی سنگھ نے شمبھو کو پنچ گنی کیوں بھیجا تھا؟" ایک لمحے کے لیے رُک کر امیر نے سب لوگوں کی طرف دیکھا پھر آگے بولا۔ "تاکہ آگے جا کر وہ ہم لوگوں کی اطلاع اُنھیں پہنچا سکے۔"

"کس کو؟" گنیش نے پوچھا۔

"یہ میں ابھی نہیں بتاؤں گا۔" امیر نے ہونٹ چبا کر کہا "پہلے مجھے اس سے اقبال کرانا ہے۔" یہ کہہ کر امیر پھر دیوی سنگھ کی جانب مڑا اور بولا۔ "شمبھو کو میں نے آدھے راستے میں ہی پکڑ لیا تھا۔ تلوار کے دو زخم لگتے ہی اُس غدّار کی زبان کھل گئی۔ میں اُسے ختم کر کے ہی یہاں آیا ہوں۔ اب تیرا حساب بھی چکتا ہو جائے۔"

یہ سن کر دیوی سنگھ کی ہمت جواب دے گئی۔ جب اُسے اتنے سارے لوگوں کے درمیان سے بھاگ نکلنے کا کوئی راستہ سُجھائی نہیں دیا تو اُس نے لپک کر امیر کے دونوں پیر تھام لیے اور گڑگڑا کر بولا۔ "مجھے معاف کر دو امیر علی! مجھے معاف کر دو۔" یہ کہہ کر وہ زمین پر اپنا سر پٹکنے لگا۔ امیر نے ترچھی نظر سے گنیش کی طرف دیکھا۔ گنیش کا چہرہ بھی اب اُترا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اور دیوی سنگھ امیر کے پیروں میں لوٹ رہا تھا۔

"پہلے تم قبول کرو، معاف کرنے یا نہ کرنے کی بات بعد میں ہوگی۔" امیر نے دیوی سنگھ کے منھ پر ایک زناٹے دار تھپڑ رسید کر دیا اور پھر خون آلود تلوار اس کی آنکھ کے سامنے نچاتے ہوئے بولا۔ "جلدی بول اس سے پہلے کہ میرا صبر کا پیمانہ چھلک اٹھے مجھے سب سچ سچ بتا دے۔"

لیکن اس کے باوجود جب دیوی سنگھ نے کچھ نہیں بتایا تو امیر نے اپنی تلوار کی نوک اس کے داہنے بازو میں چُبھا دی۔ دیوی سنگھ کے منھ سے ایک ہلکی سی چیخ نکلی پھر اس سے پہلے کہ امیر تلوار اٹھا کر دیوی سنگھ پر وار کرتا دیوی سنگھ اچانک چلّا پڑا۔ "بتاتا ہوں... میں سب کچھ بتاتا ہوں۔"

ان الفاظ کے سنتے ہی امیر کا تلوار والا ہاتھ اوپر اٹھا رہ گیا۔ دوسرے ٹھگ ساتھی بھی ایک دو قدم آگے بڑھ کر ایک دائرے کی شکل میں وہاں کھڑے ہو گئے۔ دیوی سنگھ کی زبانی ساری حقیقت جاننے کے لیے بیقرار تھے۔ امیر کو روکنے کی ہمت اب گنیش میں بھی نہیں تھی اس لیے وہ بھی چُپ چاپ کھڑا رہ گیا تھا۔

"جلدی بولو... ایک... دو۔" امیر نے دیوی سنگھ سے کہا۔

"ہاں ہم نے غدّاری کی تھی۔" دیوی سنگھ روتے روتے بولا۔

"دراصل ہم دونوں فرنگیا کی ٹولی کے ساتھ گرفتار ہو چکے تھے۔ لیکن پھانسی کی سزا سے بچنے کے لیے ہم گورے صاحب ولیم سلومن کے لیے مُخبری کرنے لگے تھے۔" اتنا کہہ کر وہ رُک گیا۔ لیکن اب تمام ٹھگوں کی آنکھوں میں غصّے کی سرخی دوڑتی دکھائی دینے لگی تھی۔ ان میں سے کئی ایک نے تو اپنی کمر سے اپنا رومال بھی کھینچ نکالا تھا۔

"پھر؟" امیر نے تلوار دیوی سنگھ کے سامنے لہراتے ہوئے پوچھا۔

"ہم نے ساہوکاروں کی اطلاع آپ لوگوں کو بالکل دُرست دی تھی۔ لیکن ہم نے یہ جھوٹ بولا تھا کہ ان کے پاس پچیس ہزار روپے کا مال سامان ہے۔ میں نے جان بوجھ کر شمبھو کو آگے بھیجا تھا تاکہ وہ واپس نہ آئے تو ہم لوگ پنچ گنی کی جانب روانہ ہو جائیں۔"

"اور وہاں بیٹھا ہوا گورا صاحب ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیتا۔ ہے نا؟" امیر نے تلوار کی نوک اس کے سینے پر رکھ کر پوچھا تو نیچے بیٹھا ہوا دیوی سنگھ اثبات میں سر ہلانے لگا۔ اُس نے کچھ بولنے کی کوشش کی لیکن موت کو آنکھوں کے سامنے ناچتی دیکھ کر اُس کی زبان لڑکھڑا گئی۔

"تم نے سُن لیا گنیش؟" امیر نے گنیش کی جانب دیکھا اور پھر بولا۔ "تم مجھے سزا دینا چاہتے تھے؟ مجھے ڈرپوک کہہ کر میری بے عزتی کرتے تھے۔"

لیکن گنیش کا سر جھک گیا تھا۔ اس کی زبان اس کے منھ میں چپک کر رہ گئی تھی۔ اچانک امیر کا قہقہہ سن کر وہ سب لوگ حیرت زدہ رہ گئے۔ تھوڑی دیر تک ہنستے رہنے کے بعد اس نے ایک دھماکہ کیا۔ "دراصل میں شمبھو کے پیچھے گیا ہی نہیں تھا۔"

یہ سُن کر سب لوگوں کی طرح گنیش کی گردن بھی ایک جھٹکے سے اوپر اٹھ گئی۔ "تم شمبھو کے پیچھے گئے ہی نہیں تھے؟" وہ حیرت سے بولا۔

"نہیں۔ رات گئے تک میں اپنے خیمے میں ہی موجود تھا اور رامو یہ بات جانتا تھا۔" امیر دیوی سنگھ کی جانب دیکھ کر ہنسا پھر آگے بولا۔ "مجھے اس کی زبان سے اقرار کرانے کے لیے ہی یہ تماشا کرنا پڑا۔"

یہ سن کر دیوی سنگھ کی آنکھیں پھٹ پڑیں۔ امیر نے تلوار کی نوک سے دیوی سنگھ کے بائیں شانے کو کُریدا "آدھے کوس تک جا کر میں نے ایک بے قصور بکرے کی گردن کاٹ دی اور پھر وہاں سے گھوڑا دوڑاتا ہوا یہاں واپس آ گیا۔ اِس طرح خون آلود تلوار دِکھا کر مجھے اِس بے وقوف راجپوت کی زبان کھلوانی تھی۔" امیر ایک ایک لفظ پر تلوار کی نوک اُس کے جسم پر چُبھاتا جاتا تھا اور دیوی سنگھ تکلیف سے کراہتا ہوا زمین پر لوٹنے لگتا تھا۔

تمام ٹھگوں کو اُس کی غدّاری پر ایک ساتھ ہی غصّہ آ رہا تھا۔ امیر اس کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہتا ہے یہ کوئی بھی نہیں پوچھ رہا تھا۔ دیوی سنگھ کے جسم کا کوئی حصّہ اب ایسا نہیں رہ گیا تھا جہاں امیر کی تلوار نے اپنا نشان نہ چھوڑا ہو۔ اُس کی کراہ بڑھتی جا رہی تھی۔ پھر دھیرے دھیرے اس کی چیخیں کانوں کے پردے پھاڑنے لگیں۔

"بس امیر!" گنیش آخر کار بول پڑا۔ "کسی آتے جاتے مسافر نے اگر دیکھ لیا تو ہم لوگ مصیبت میں پڑ جائیں گے۔" اتنا کہہ کر اُس نے دونوں ہاتھوں میں اپنے رومال کے سرے کو پکڑ لیا اور امیر کے قریب آ کر بولا۔ "لاؤ میں اِسے ایک ہی جھٹکے میں ختم کر دیتا ہوں۔ ٹھگوں سے غدّاری کرنے والے کی یہ ہی سزا ہوتی ہے۔"

لیکن امیر کا ارادہ تو کچھ اور ہی تھا۔ وہ دیوی سنگھ کو رومال کی موت سے مارنا نہیں چاہتا تھا۔ اِسی لیے وہ گنیش کو روکتے ہوئے بولا۔ "نہیں گنیش! اِس کی موت میں نے طے کر لی ہے۔"

"کیا؟" گنیش کے پوچھنے سے پہلے ہی امیر کا ہاتھ اوپر اُٹھا پھر اس کی تلوار زمین پر اوندھے پڑے ہوئے دیوی سنگھ کی گردن پر پڑی۔ کھچا پچ سی ایک آواز ہوئی اور دیوی سنگھ کا سر اس کے دھڑ سے الگ ہو کر دو گز دور جا گرا۔

"باپ رے" کئی ایک کے منھ سے چیخیں نکل گئیں۔

دیوی سنگھ کا جسم تھوڑی دیر تک تڑپا اور سب لوگ اسے دیکھتے رہے۔ مگر امیر نے دھیرے دھیرے آگے بڑھ کر دیوی سنگھ کا کٹا ہوا سر اٹھا لیا اور اُسے ہاتھ میں بلند کرتے ہوئے بولا: "میں تمام لوگوں کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ غداری کی سزا کیا ہوتی ہے؟" امیر کی آواز غصے میں کانپ رہی تھی۔ "مجھے دیوی سنگھ کا سر گورے ولیم سلومن کو تحفے میں پیش کرنا ہے۔"

دیوی سنگھ کے کٹے ہوئے سر میں سے خون کی دھاریں بہہ رہی تھیں جس کی وجہ سے امیر کا ہاتھ بھی خون آلود ہو گیا تھا۔ "میں اس کٹے ہوئے سر کو لیکر پنچ گنی جا رہا ہوں اور تم لوگ ناگپور واپس چلے جاؤ۔"

"نہیں امیر میاں!" رامو بولا: "اس معاملے کو اب یہیں ختم کر دو۔ آگے جا کر خطرہ مول لینے کی کیا ضرورت ہے؟"

"ہاں امیر! ابھی شمبھو زندہ ہے۔" روپ سنگھ نے رامو کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا: "وہ تم سے پہلے وہاں پہنچ گیا ہوگا اور ہماری اطلاع گورے صاحب کو مل چکی ہوگی۔"

"میں سب سمجھتا ہوں۔" امیر کی آواز میں خود اعتمادی کی جھلک نمایاں تھی: "اگر میں نے شمبھو کو راستے میں پکڑ لیا تو اُس کا حشر بھی یہی کروں گا۔ میں گورے صاحب کو ایک بار آگاہ کر دینا چاہتا ہوں کہ وہ ہمارے راستے سے ہٹ جائے ورنہ اس کا انجام بھی یہ ہی ہوگا۔"

امیر کے جوش و خروش کے آگے کسی کی کوئی دلیل نہیں چلی۔ گنیش نے اب مکمل خاموشی اختیار کر لی تھی۔ شائد اس نے یہی سوچا تھا کہ بہادری کا بہت زیادہ غرور ہی امیر کے بڑے انجام کا سبب بن جائے گا اس لیے اب اسے وہ کیوں روکے؟ شائد اس طرح اس کی موت ہی اُسے بُلا رہی ہو۔

"رامو! تم کسی کا گھوڑا لے لو۔" امیر نے دیوی سنگھ کے کٹے ہوئے سر کو ایک کپڑے میں لپیٹ لیا اور آگے بولا: "تمھیں بھی میرے ساتھ چلنا ہے۔"

تھوڑی دیر بعد امیر اپنے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ روپ سنگھ کو اس نے اپنا سامان سمیٹ لینے کی ہدایت کی اور پھر گھوڑے کو آگے بڑھنے کا اشارہ کر دیا مگر جاتے جاتے وہ گنیش سے بولا: "گنیش اب تم لوگ یہاں زیادہ دیر تک مت ٹھہرنا۔ ناگپور تک ہم دونوں ہی تم لوگوں سے آملیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" گنیش طنزیہ ہنسی ہنس کر بولا۔ اس کے دل میں تو صرف ایک ہی سوال گردش کر رہا تھا: "اگر یہ زندہ رہا تب ہی تو ہم سے مل سکے گا۔۔۔؟"

●

ولیم سلومن بہت ہی مضطرب دکھائی دے رہا تھا۔ اُسے ابھی تک ٹھگوں کی کوئی ٹولی نظر نہیں آئی تھی۔ شمبھو جب اطلاع لے کر جبل پور پہنچا تھا تو اس نے فوراً ہی اپنے گھوڑے کو تیار کرنے کا حکم دے دیا تھا۔ رستم خان بھی اپنے بیس پچیس گھوڑ سوار سپاہیوں کے ساتھ وہاں حاضر ہو چکا تھا۔ نوّے ٹھگوں کی ٹولی کو گھیر لینے کے لیے گو ان سپاہیوں کی تعداد کم نظر آ رہی تھی لیکن پھر انھیں پنچ گنی تک بھیجنے کا فیصلہ کر لیا گیا اور روانہ ہونے کی ساری تیاریاں مکمل ہو گئیں۔ انھیں پنچ گنی پہنچنے میں تین دن لگنے تھے۔ اور ولیم سلومن رستم خان کے ساتھ دوسرے دن دوپہر تک وہاں پہنچ جانا چاہتا تھا۔ شمبھو نے درخشاں بار اس سے کہہ دیا تھا کہ اگر ہم لوگوں کو وہاں پہنچنے میں تاخیر ہو گئی تو ٹھگوں کی وہ ٹولی کسی اور راستے پر چل پڑے گی۔ کیونکہ امیر علی پہلے ہی سے اس جانب آنے کا مخالف تھا۔ اُسے کچھ شک ہو گیا تھا۔ لیکن گنیش کی بات اُسے ماننا ہی تھی اس لیے وہ پنچ گنی تک آ ہی گیا ہے۔ اب اس سے پہلے کہ بازی پلٹ جائے یہیں وہاں پہنچ جانا چاہیے۔

ولیم سلومن خود بھی ڈھیل دینا نہیں چاہتا تھا۔ شمبھو کی مخبری پر اسے پورا بھروسا تھا۔ امیر علی اتنی آسانی سے اگر اس کے بچھائے ہوئے جال میں پھنسنے کے لیے آ رہا ہو تو بھلا وہ صبر کیسے کر سکتا تھا؟ لیکن پھر بھی ایک الجھن کھڑی ہو چکی تھی اور وہ اُلجھن یہ تھی کہ ولیم سلومن کی بیوی ایمی پورے دنوں سے تھی۔ بچے کی ولادت کا دن قریب آتا جا رہا تھا۔ اور چونکہ یہ پہلی اولاد کی ولادت تھی

اس لیے ولیم سلومن ایمی کو تنہا چھوڑ کر جانے سے بھی فکرمند تھا کیونکہ واپس آنے میں پانچ چھ روز بھی لگ سکتے تھے۔ اور اس وقت تک ممکن ہے کہ ایمی ماں بن چکی ہو۔ اگر اس دوران ایمی کی طبیعت خراب ہو گئی تو؟ یہ سوال بار بار اسے پریشان کر رہا تھا۔ ان حالات میں ایمی کے پاس اس کی موجودگی زیادہ ضروری تھی اور اس کے لیے اُس نے ایمی سے وعدہ بھی کیا ہوا تھا کہ وہ اس کے پاس ہی رہے گا۔ اور اب جب کہ اپنا وعدہ پورا کرنے کا وقت آ گیا تو یہ نئی مصیبت کھڑی ہو گئی تھی۔

"ایمی" اپنی بیوی کے کمرے میں آ کر ولیم سلومن اس کے ماتھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہہ رہا تھا: "مجھے اطلاع ملی ہے کہ امیر علی کی ٹولی پنچ گنی تک آ رہی ہے۔"

یہ سُن کر ایمی کے زرد چہرے کی لکیریں ایک پل کے لیے تنگ ہوتی نظر آئیں لیکن پھر فوراً ہی اس نے خود کو سنبھال لیا اور ہونٹوں پر زبردستی مسکراہٹ لاتے ہوئے بولی: "ویلی یہ بات تو میں اسی وقت سمجھ گئی تھی جب ڈرائنگ روم سے تم لوگوں کی باتوں کی آوازیں آنے لگی تھیں۔"

"تم کہو تو میں رستم خان کو ہی اس کی گرفتاری کے لیے بھیج دوں۔" اس کی آواز میں چھپی ہوئی مجبوری کو ایمی فوراً ہی تاڑ گئی اور اس نے ولیم سلومن کا ہاتھ پیار سے تھام کر کہا: "ولادت کے وقت کسی عورت کو ڈاکٹر اور نرس کی ہی ضرورت ہوتی ہے شوہر کی نہیں۔"

"پھر بھی تمھیں اکیلا چھوڑ کر جانے کو دل نہیں چاہتا۔"

"اور اگر تم نہیں جاؤ گے تو یہ کوئی اچھی بات نہیں ہوگی۔" ایمی نے پیار سے اس کا ہاتھ اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا: "محبت سے زیادہ فرض قیمتی ہوتا ہے۔ تمھارے ساتھ رہ کر میں یہ بات سیکھ چکی ہوں۔" اُس کی بات سُن کر ولیم سلومن مسکرا دیا۔ پھر اس سے پہلے کہ اس کا چہرہ ایمی کے چہرے پر جھک جاتا ڈاکٹر کمرے میں داخل ہو گیا اور پھر ڈاکٹر کو ایمی کا خیال رکھنے کی تاکید کر کے ولیم سلومن کو کمرے سے باہر چلا جانا پڑا۔ پھر آرام کی پرواہ کیے بغیر وہ رستم خان کے ساتھ تیز رفتار گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ کر پنچ گنی پہنچ گیا۔ لیکن جب انھیں وہاں کوئی پڑاؤ نظر نہیں آیا تو انھوں نے شمبھو کی جانب گھورنا شروع کیا۔ شمبھو ان کی تیز اور چبھتی ہوئی نظروں کی تاب نہ لا سکا اور گھبرا کر بولا: "ممکن ہے وہ لوگ یہاں تک آنے کے بعد واپس چلے گئے ہوں۔" شمبھو کی آواز کانپ رہی تھی: "ہم نے گنیش کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ اگر میں واپس نہ آؤں تو تم لوگ اس جگہ تک ضرور پہنچ جانا۔"

شمبھو پر ناراضگی کی چونکہ کوئی وجہ نہیں تھی اس لیے ولیم سلومن کے حکم پر رستم خان نے گاؤں کے مکھیا سے پوچھ گچھ کی۔ اس نے مکھیا سے پوچھا: "کیا مسافروں کا کوئی قافلہ اس طرف آیا تھا؟" لیکن جواب انکار میں ملا تو ولیم سلومن کے چہرے پر بھی اُلجھن کے آثار دکھائی دینے لگے: "اب کیا کیا جائے؟" اس نے رستم خان کی طرف دیکھا۔

"سر میرا تو خیال ہے کہ ہمیں آگے بڑھنا چاہیے۔" رستم خان سوچتے ہوئے بولا: "ممکن ہے ان لوگوں نے پنچ گنی تک آنے کا ارادہ ملتوی کر دیا ہو۔ اور شائد آدھے راستے ہی سے واپس لوٹ گئے ہوں۔" یہ سن کر ولیم سلومن تھوڑی دیر تک گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اُسے انتظار کرنا چاہیے یا ٹھگوں کا تعاقب شروع کر دینا چاہیے؟ اس کے پاس کافی تعداد میں گھوڑ سوار سپاہی نہیں تھے۔ اور جو سپاہی پیدل آ رہے تھے انھیں پہنچنے میں بھی دیر لگنی تھی۔ جب وہ کوئی فیصلہ نہیں کر سکا تو اس نے رات وہیں گزارنے کا ارادہ کر لیا۔

گاؤں کے مکھیا کے گھر سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر اسے املی کے درختوں کی جھنڈ صاف دکھائی دے رہی تھی۔ رات کو جب اسے نیند نہیں آئی تو وہ بار بار کھڑکی سے درختوں کی اس جھنڈ کی طرف دیکھ لیتا تھا اچانک وہ چونک کر اُٹھ بیٹھا اور اسے یوں لگا جیسے وہاں کچھ ہلچل سی ہوئی ہے۔ اُس نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کر اُس طرف دیکھنے کی کوشش کی تو اُسے روشنی کا ایک

ننھا سا شعلہ دکھائی دیا۔ اُس نے اپنی آنکھوں کو ہاتھوں سے مل کر ایک بار پھر اُس طرف دیکھا مگر نہیں یہ اس کا وہم نہیں تھا۔ ایک کی بجائے اب وہاں دو ننھے ننھے شعلے سے حرکت کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ اُس نے اندھیرے میں نگاہیں جما دیں تو اُسے لگا کہ وہاں دو گھوڑے سواروں کے سائے ہیں جو دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہے ہیں۔ اچانک اس نے اپنے قریب سوئے ہوئے رستم خان کو جھنجھوڑا۔ "خان ذرا اُٹھ کر کھڑکی سے باہر دیکھو تو۔" اس کی آواز میں خوف کی جھلک نمایاں تھی۔

رستم خان فوراً ہی اُٹھ بیٹھا اور کھڑکی سے باہر نظر دوڑانے لگا۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔ ولیم سلومن جلدی جلدی اس سے کہہ رہا تھا: "دیکھو درختوں کی جھنڈ کے قریب دو گھوڑ سوار دکھائی دے رہے ہیں۔"

رستم خان نے ذرا اور باریکی سے دیکھا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ کوئی اندازہ لگاتا دونوں گھوڑ سواروں کے سائے اندھیرے میں غائب ہو چکے تھے۔

"سنو۔ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنائی دے رہی ہے۔ ہے نا؟" ولیم سلومن نے رستم خان کا کاندھا جھنجھوڑا۔ "آواز دور ہوتی محسوس ہو رہی ہے۔ یقیناً وہاں کوئی آیا تھا لیکن رستم خان کو کچھ اونچا سنائی دیتا تھا اس لیے ولیم سلومن کی یہ بات اسے وہم سے زیادہ نہ لگی۔ وہ ولیم سلومن کے اس وہم کو دور کرتے ہوئے بولا: "سر اس وقت درختوں کے اُس جھنڈ میں چوری چھپے بھلا کون آسکتا ہے اور اسے وہاں کیا کام ہو سکتا ہے؟" اُس کے اس سوال کا جواب دینے کی بجائے ولیم سلومن اپنی پھولی والی پیٹی اپنی کمر سے باندھنے لگا پھر وہ بڑبڑاہٹ جیسے لہجے میں بولا: "ہمیں ایک بار وہاں جا کر دیکھ لینا چاہیئے۔ مجھے کچھ شک سا ہو رہا ہے۔"

شک کا لفظ سُن کر رستم خان چونک پڑا اور پھر اچانک اسے لگنے لگا کہ کہیں ٹھگوں کا کوئی مخبر رات کے اندھیرے میں ولیم سلومن کی موجودگی کا پتا لگانے تو وہاں نہیں آیا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ گنیش اور امیر علی کو یہ علم ہو گیا ہو کہ ولیم سلومن اُسی جگہ رات گذار رہا ہے اور وہ اس موقع کا فائدہ اٹھا

اُسے ختم کرنے کی نیت سے یہاں آئے ہوں اور ان کے چلے جانے کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ جس طرح ولیم سلومن نے انھیں املی کے جُھنڈ کے قریب دیکھ لیا تھا بالکل اِسی طرح انھوں نے بھی ولیم سلومن کو جاگتا ہوا دیکھ لیا ہو اور واپس چلے گئے ہوں؛ امیر علی تو یوں بھی بہت چالاک ٹھگ ہے۔ گنیش کے ساتھ مل کر اس نے یقیناً کوئی جال بچھایا ہوگا۔

"تم کیا سوچ رہے ہو خان؟" ولیم سلومن نے رستم خان کو چونکا دیا۔ چلو املی کے جُھنڈ تک چکر لگا آئیں۔"

رستم خان یوں تو کافی ہمت والا افسر تھا۔ حالات کیسے بھی خطرناک کیوں نہ ہوں وہ گھبرانے والا نہیں تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں اس وقت ولیم سلومن کا ان درختوں کے پاس جانا اُسے مناسب نہیں لگ رہا تھا۔ اس اندھیرے گھُپ میں واقعی اگر درختوں کی جُھنڈ میں کوئی چُھپا بیٹھا ہو تو اچانک ہی کوئی حملہ ہوسکتا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی وہ ولیم سلومن کو روکتے ہوئے بولا: "ٹھہریے صاحب میں مُکھیا کو جگا کر یہاں لے آتا ہوں۔ اس کے بعد ہم لوگ چلیں گے۔"

اس کی یہ تجویز سن کر ولیم سلومن کو صبر کرنا پڑا۔ رستم خان مُکھیا کو جگانے کے لیے چلا گیا تو وہ پھر سے کھڑکی کے پاس آکر کھڑا ہوگیا۔ جُھنڈ کے آس پاس بالکل سناٹا چھایا ہوا تھا۔ وہاں کسی قسم کی کوئی ہلچل نہ دیکھ کر اُسے افسوس ہونے لگا کہ رستم خان کو جگانے کی بجائے اگر وہ خود وہاں چلا گیا ہوتا تو؟

"صاحب! کیا آپ نے وہاں کچھ دیکھا ہے؟" رستم خان کے ساتھ آئے ہوئے مُکھیا نے آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا۔ "کیا کوئی گھوڑسوار دکھائی دیا ہے آپ کو؟"

"لیکن اِس وقت تو اب کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا ہے۔" ولیم سلومن نے ایک گہرا سانس لیا: "جو کوئی بھی وہاں تھا وہ اب بھاگ گیا ہے۔ میری نظر کبھی دھوکہ نہیں کھاتی۔ پھر بھی مجھے وہاں جاکر اپنا اطمینان کرنا ہے کہ وہاں کوئی آیا تھا یا نہیں؟"

"آپ کی بات سچ ہے جناب!" گاؤں کے مُکھیا نے کہا: "ہر روز رات کے وقت وہ یہاں آتا ہے۔"

"کون؟" ولیم سلومن بُری طرح چونک کر پوچھ بیٹھا۔

"کون رات کے وقت یہاں آتا ہے؟"

مُکھیا تھوڑی دیر تک چپ رہا۔ اس کے چہرے کی جھریوں میں ہلکی ہلکی کپکپاہٹ دوڑنے لگی تھی۔ پھر وہ اس طرح بولنے لگا جیسے زبردستی بول رہا ہو: "وہ گھوڑسوار رندھیر تھا۔ رندھیر کا بھوت۔"

"بھوت؟" ولیم سلومن کی بھوری آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک لہرا گئی اور اس نے تیز نگاہوں سے مُکھیا کو گھورا۔ رستم خان کے ماتھے پر بھی پسینے کے قطرے چمکتے دکھائی دے رہے تھے۔ مُکھیا اپنا سر جُھکائے دھیرے دھیرے اور رک رک کر کہہ رہا تھا: "میں یہ جانتا ہوں کہ آپ لوگ بھوت پریت کو نہیں مانتے۔" پھر وہ رستم خان کی جانب دیکھ کر بولا: "لیکن خان صاحب بھوتوں کے وجود کو ضرور مانتے ہوں گے۔"

ولیم سلومن کے آنکھوں کی چمک دھیرے دھیرے کم ہوتی چلی گئی۔ وہ بھوت پریت کے وجود کا قائل نہیں تھا۔ لیکن دوسرے لوگوں کے عقیدے کی ہنسی اڑانا بھی اس کی عادت نہیں تھی۔ بدروحوں اور بھوتوں کے بہت سے قصّے اور کہانیاں اُس نے سُن رکھی تھیں۔ کئی ٹھگوں نے بھی اُسے ایسے کئی واقعات کا تذکرہ کیا تھا۔ انھوں نے کہا تھا کہ کبھی کبھی تو انھیں یہ صاف دکھائی دیتا ہے کہ ان کے ہاتھوں مرنے والوں کے بھوت ان کے سینے پر سوار ہوکر ان سے اپنی موت کا انتقام لینے کی کوشش کرتے رہتے ہیں اور اسے ہم لوگ بدشگونی سمجھتے ہیں۔ لیکن ولیم سلومن تو اِن سب باتوں کے پیچھے چھپے ہوئے راز کو ڈھونڈنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ٹھگ لوگ جب کسی کو قتل کرتے ہیں تو اِس قتل کے بعد اُن کا ضمیر انھیں ملامت کرتا رہتا ہے۔ جُرم کے بعد ان کا ضمیر چونکہ انھیں چین نہیں لینے دیتا اِس لیے وہ اپنی اس بے چینی کو مقتول کا بھوت سمجھنے لگتے ہیں۔

"صاحب کو اگر نیند نہ آتی ہو تو میں رندھیر کے بھوت کی بات بتا دوں؟" مُکھیا کی یہ بات سن کر ولیم سلومن نے

کھڑکی سے باہر نظریں جما دیں اور دھیمے لہجے میں بڑبڑایا: "اب وہاں جانے کا کوئی فائدہ نظر نہیں آتا اس لیے سونے کے لیے بھوت کی بات سننا ہی پڑے گی۔" اتنا کہہ کر وہ اپنی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ رستم خان نے بھی اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھ کر مُکھیا کی جانب دیکھا۔

"تقریباً نو دس سال پُرانی بات ہے۔" مُکھیا نے کہنا شروع کیا: "یہاں کے ایک جاگیردار کی ایک انتہائی حسین ترین بیٹی تھی۔ اس شہزادی کا نام تیجلی تھا۔ کہتے ہیں کہ وہ اتنی خوب صورت تھی کہ جب وہ پانی پیتی تھی تو پانی کے گھونٹ اس کے گلے سے نیچے اترتے ہوئے صاف دکھائی دیتے تھے۔ اس کی جلد شیشے کی طرح شفاف تھی۔"

ولیم سلومن اس کی بات سن کر ہنس پڑا۔ لیکن رستم خان کی دلچسپی بڑھ گئی تھی۔ وہ بدستور سنجیدگی سے مُکھیا کے چہرے کو تک رہا تھا۔

"اس تیجلی کی منگنی یہاں سے پچیس میل دور ایک جاگیردار کے راج کمار کے ساتھ بچپن میں ہی ہوچکی تھی۔ تیجلی تہوار اور بڑے دن کے موقع پر دو تین بار اپنے سُسرال بھی جاچکی تھی جب وہ آخری بار اپنے سُسرال گئی تو ایک واقعہ رونما ہوگیا۔ اس نے اپنے منگیتر کے ایک دوست کو دیکھ لیا اور اُس سے اُسے محبت ہوگئی۔ اس نوجوان کا نام رندھیر تھا۔" مُکھیا نے رُک کر ولیم اور رستم خان کی طرف دیکھا۔ اُسے ولیم سلومن کے چہرے پر دلچسپی کے کوئی آثار نظر نہیں آئے لیکن رستم خان کو ہمہ تن گوش دیکھ کر اس نے آگے کہنا شروع کیا۔ بات کچھ یوں ہوئی تھی کہ تیجلی کا منگیتر کئی بُری عادتوں کا شکار تھا۔ وہ پندرہ سال کی عمر سے ہی نشہ کرنے لگا تھا۔ تیجلی سے دو ایک بار کی ملاقاتوں میں جب اُس نے اس سے نازیبا حرکت کرنے کی کوشش کی تو تیجلی اُس پر سخت ناراض ہوئی اور بولی: "جب تک تم یہ نشہ کرنا چھوڑ دو گے نہیں اس وقت تک میں تم سے شادی نہیں کروں گی اور جب تک کنواری رہوں گی اس وقت تک تمھیں تنہائی میں خود سے ملنے کا موقعہ بھی نہیں دوں گی۔"

تیجلی کی یہ بات راج کمار کو بہت ہی ناگوار لگی۔ تیجلی مزاج کی تیز اور ضدّی طبیعت کی لڑکی تھی۔ سُسرال سے دو تین بار اُس کا بلاوا آیا لیکن اُس نے کوئی نہ کوئی بہانہ کرکے اُسے ٹال دیا۔ تھک ہار کر راج کمار نے اپنے دوست رندھیر کو اسے لینے کے لیے یہاں بھیج دیا۔ ان دونوں کے درمیان محبت کا بیج تو چھوٹ ہی پڑا تھا مگر اس ملاقات نے دونوں کے درمیان کا فاصلہ اور کم کر دیا۔" بات کرتے کرتے مُکھیا تھوڑی دیر تک رُکا تو رستم خان بول اٹھا: "یہ کوئی واقعہ ہے یا پریم کہانی ہے؟"

"دونوں" مُکھیا نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا: "تیجلی کو لانے کے لیے گئے ہوئے رندھیر نے پہلے تو اپنے دوست کی ہونے والی بیوی کو منانے کی کوشش کی۔ اُس نے تیجلی کو سمجھایا کہ تم ضد چھوڑ دو اور راج کمار سے شادی کرلو۔ مرد کی یہ چھوٹی چھوٹی خامیاں نہیں دیکھی جاتیں۔ کچھ نہ کچھ عیب تو ہر ایک میں ہوتا ہے۔" لیکن تیجلی کے پاس اِس کا جواب موجود تھا۔ اس نے رندھیر سے کہا: "اب تو میرا دل ہی اُس آدمی پر سے اٹھ گیا ہے۔" اتنا کہہ کر اس نے دھیرے سے کہا: "اب تو اُس کی بجائے کسی اور مرد پر میرا دل آگیا ہے۔"

یہ سُن کر رندھیر چونک پڑا: "کس پر؟" اُس نے گھبرا کر پوچھا تو تیجلی تھوڑی دیر تک اُسے محبت بھری نظروں سے دیکھتی رہی۔ پھر یکایک اس نے رندھیر کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی: "میرا دل تمھیں چاہنے لگا ہے رندھیر!"

"تیجلی!" رندھیر کو ایک شدید جھٹکا لگا مگر پھر بھی اُس نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہیں کی: "کیا تم پاگل ہوگئی ہو! ایک راج کمار کو چھوڑ کر مجھ جیسے معمولی آدمی کا ہاتھ پکڑنا چاہتی ہو؟"

"اب تو میں نے ہاتھ پکڑ ہی لیا ہے۔" تیجلی نے فوراً ہی جواب دے دیا: "ایک مرد کا ہاتھ تھام کر اب تو میں جھوٹی ہوچکی ہوں۔ اب اگر تم میں ہمت نہ ہو اور مجھ سے ہمدردی نہ ہو تو اپنا ہاتھ چھڑا کر تم جاسکتے ہو۔"

اتنا کہہ کر مُکھیا ایک بار پھر رُک گیا۔ لیکن اس بار ولیم سلومن کے منھ سے نکل ہی گیا: "پھر کیا ہوا!"

"پھر تو نہ ہونے والی بات ہوگئی۔" مُکھیا نے ایک گہرا سانس چھوڑتے ہوئے کہا: "تیجلی رات کے اندھیرے

میں رندھیر کے ساتھ بھاگ جانے کے لیے تیار ہوگئی۔ وہ بھیس بدل کر حویلی سے باہر بھی آگئی اور گھوڑے پر بیٹھ کر وہ دونوں املی کے درختوں کے اُس جھنڈ تک پہنچ گئے لیکن اچانک اُنھیں گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی جو ہر پل قریب ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔ رندھیر نے بیجلی کو چھپانے کے لیے اسے ایک درخت پر چڑھا دیا۔ لیکن قُدرت اُن دونوں سے رُوٹھی ہوئی تھی۔ بیجلی نے ہاتھ بڑھا کر ایک شاخ کو پکڑنا چاہا لیکن اس کا ہاتھ ایک بہت بڑے سانپ کے پھن پر پڑ گیا۔ پہلے ایک تیز سسکاری سنائی دی پھر بیجلی کی دل دوز چیخ نے رات کے سناٹے کو توڑ دیا۔ ٹھیک اسی وقت جاگیردار اور اس کے سپاہی گھوڑے دوڑاتے ہوئے وہاں پہنچ گئے لیکن رندھیر ان سے ڈر کر نہیں بھاگا۔ تنہا ہونے کے باوجود اس نے کافی دیر تک ان کا مقابلہ کیا مگر آخر کار جاگیردار کی تلوار نے اس کا سر تن سے جدا کر ہی دیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ گردن کے الگ ہو جانے کے باوجود بھی اس کا جسم گھوڑے کی پیٹھ پر سے زمین پر نہیں گرا اور گھوڑے کو دوڑاتا ہوا وہاں سے بھاگ گیا۔ بعد میں اس کا کوئی پتا نہیں چلا کہ رندھیر کا جسم کہاں غائب ہو گیا ہے؟

اُس دن کے بعد سے ہر روز آدھی رات کو رندھیر اور بیجلی کی روحیں اس جگہ آتی ہیں۔ دیکھنے والوں کو پہلے وہاں دو گھوڑے دکھائی دیتے ہیں جو املی کے درختوں کی جھنڈ کے قریب آکر رک جاتے ہیں۔ پھر دونوں میں سے ایک سایا درخت پر چڑھتا دکھائی دیتا ہے۔ اور اس کے بعد صرف ایک ہی گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنائی دیتی ہے شائد وہی آواز آپ نے سنی ہوگی۔" مکھیا اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔

"اوہ... ہاں... ہاں" ولیم سلومن چونکتے ہوئے بولا۔ "مکھیا! ایسی دردناک کہانی میں نے آج تک نہیں سنی تھی۔" پھر وہ جماہی لے کر آگے بولا۔ "اب شائد مجھے جلدی نیند آجائے گی۔"

رستم خان خاموش ہی بیٹھا رہا اور مکھیا بھی کوئی جواب دیئے بغیر واپس چلا گیا۔ لیکن صبح کے وقت ایک عجیب سا واقعہ رونما ہو گیا۔

●

"صاحب اُٹھیے تو۔" رستم خان کی گھبرائی ہوئی آواز سن کر ولیم سلومن بوکھلا کر بستر پر بیٹھ گیا۔ "کیا بات ہے؟"

"وہ... ہمارا... شمبھو۔" رستم خان کی آواز کانپ رہی تھی۔

"کیا ہوا شمبھو کو؟"

"سمجھ میں نہیں آتا کیا ہوا ہے؟" رستم خان رُک رُک کر بولا۔ "وہ درختوں کی اس جھنڈ کے پیچھے گیا تھا لیکن وہاں سے ہانپتا کانپتا دوڑتا ہوا واپس آیا۔ یہاں آنے کے بعد وہ خوفزدہ نظروں سے اس جھنڈ کی طرف دیکھتا ہوا اُنگلی سے اشارہ کرنے لگا۔ اب لگتا ہے وہ پاگل ہو گیا ہے۔"

"کہاں ہے وہ؟" کہہ کر ولیم سلومن نے اپنا کوٹ پہن لیا "کہیں ایسا تو نہیں کہ مکھیا نے اسے بھی بھوتوں کی کہانی سنائی ہو؟"

"سر! اُس کو دیکھ کر تو یہ ہی لگتا ہے کہ وہ بھوت دیکھ کر ہی ڈر گیا ہے۔" رستم خان نے کہا۔

"ہندوستان کے لوگوں کا یہ ہی تو دُکھ ہے۔" ولیم سلومن کسی قوم اور کسی ملک کے لوگوں کے خلاف کم ہی بولتا تھا مگر اس وقت وہ گمبھیر لہجے میں کہہ رہا تھا۔ "یہ لوگ وہم پر زندہ رہتے ہیں اور وہم کا شکار ہو کر ہی مر جاتے ہیں۔"

باہر آکر اس نے شمبھو کی حالت دیکھی تو اس کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ اُسے لگا کہ اگر اس نے شمبھو سے کچھ بھی کہا تو اس کا سینہ پھٹ جائے گا۔ لیکن پھر بھی اُسے اس وہم کو دور تو کرنا ہی تھا۔

"چلو میرے ساتھ" گھوڑے پر سوار ہو کر ولیم سلومن نے اس سے کہا۔ "چل کر دکھاؤ مجھے، تم نے کیا دیکھا تھا؟"

گورے صاحب کی آواز سن کر شمبھو اچانک اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس کے پیچھے چل پڑا۔ رستم خان کو بھی اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر ولیم سلومن کے ساتھ جانا پڑا اور مکھیا کو بھی مجبوراً ان کے پیچھے جانا ہی تھا۔

املی کے درختوں کی جھنڈ جوں جوں قریب آتی جا رہی تھی توں توں شمبھو کا خوف بڑھتا جاتا تھا۔ چلتے چلتے دو ایک بار وہ اس طرح لڑکھڑایا تھا کہ جیسے ابھی زمین پر

گر پڑے گا۔

"بتاؤ کیا ہے یہاں؟" جھنڈ کے قریب پہنچ کر ولیم سلومن اپنے گھوڑے پر سے اتر گیا اور شمبھو کی جانب دیکھ کر بولا "یہاں کس کے بھوت سے تمھاری ملاقات ہوئی تھی؟"

شمبھو ہانپتا کانپتا بہ مشکل دو چار قدم آگے بڑھا اور ولیم سلومن کی جانب دیکھنے کے بعد اچانک اس نے ایک درخت کی طرف اُنگلی اٹھائی۔ سب کی نگاہیں اس کی اُنگلی کے ساتھ ساتھ اُوپر کو اُٹھ گئیں اور وہاں کا منظر دیکھ کر سب کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"یہ کیا؟" ولیم سلومن کے مُنھ سے بے اختیار نکلا۔ "شمبھو یہ کس کا سر لٹک رہا ہے؟"

لیکن شمبھو کے پیروں میں کھڑے ہونے کی طاقت ہی کہاں تھی؟ وہ لرزتا ہوا زمین پر بیٹھ گیا اور اپنے گلے پر اس طرح ہاتھ پھیرنے لگا جیسے اسے جواب دینے میں سخت تکلیف ہو رہی ہو۔ پھر اچانک اس کی پھٹی پھٹی آواز سنائی دی۔

"یہ دیوی... سنگھ... کا..."

"ایں" ولیم سلومن بری طرح چونک پڑا۔ "مگر دیوی سنگھ کا سر یہاں کون لٹکا گیا ہے؟"

شمبھو اب دونوں ہاتھوں میں اپنا منھ چھپا کر سسک سسک کر رو رہا تھا اور مکھیا اس کی ہلتی ہوئی گردن کو غور سے دیکھ کر یہ سوچ رہا تھا کہ یہ سب یقیناً رندھیر کے بھوت نے ہی کیا ہے۔ رستم خان اس کٹے ہوئے سر کو پہچاننے کے لیے آگے بڑھنا ہی چاہتا تھا کہ اچانک ولیم سلومن نے اُس کی کمر میں سے اُس کی تلوار کھینچ نکالی اور ایک ہی جھٹکے میں درخت کی اس ڈال کو کاٹ دیا جس میں دیوی سنگھ کا سر لٹک رہا تھا۔ چرچراہٹ کی ایک آواز کے ساتھ وہ ڈال کٹے ہوئے سر کے ساتھ زمین پر آگری اچانک ولیم سلومن کی نظر کٹے ہوئے سر کے قریب زمین پر بنے ہوئے کسی کے پیروں کے نشان پڑ گئی اور چلا کر بولا "دیکھو یہ گھوڑے کی ٹاپوں کے ہی نشان ہیں۔" پھر اس نے اس طرح کے دو چار اور نشانات دیکھے۔ "یہ نشانات اس طرف سے آئے ہیں۔" تھوڑی دیر تک تو وہ چپ چاپ کچھ سوچتا رہا۔ پھر دھیمے لہجے میں بولا۔ "رات کو جو کچھ میں نے دیکھا تھا وہ میرا وہم نہیں تھا۔ اور وہ کوئی بھوت بھی نہیں تھا۔ دیوی سنگھ کے کٹے ہوئے سر کو لٹکانے کے لیے یہاں دو آدمی آئے تھے۔ دونوں میں سے ایک درخت پر چڑھا تھا اور پھر اس کے بعد مجھے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی تھی۔ آخر وہ دونوں آدمی کون تھے۔"

"شائد" رستم خان تھوڑی دیر تک رکنے کے بعد بولا "وہ گنیش اور امیر علی ہی ہوں گے۔ ممکن ہے انھیں ہم لوگوں کی چال کا پتا چل گیا ہو، اور انھوں نے دیوی سنگھ کو ختم کر دیا ہو۔"

"لیکن انھوں نے یہ سر یہاں لا کر کیوں لٹکایا تھا؟" ولیم سلومن نے جھنجھلا کر پوچھا۔

"شائد وہ ہم سے کہنا چاہتے ہوں..."

"کیا؟"

"کہ تمھارے مُخبروں کا ہم یہ حال بھی کر سکتے ہیں۔"

رستم خان نے کہا تو ولیم سلومن غصے سے سرخ ہو گیا۔ تھوڑی دیر تک وہ تیز تیز سانس لیتا رہا پھر بولا۔ "اُن بدمعاشوں کی ہمت" اس نے گھوڑے کی لگام کھینچی اور زمین پر بنے ہوئے نشانات کو دیکھتا ہوا تھوڑی دور تک چلتا چلا گیا مگر کچھ ہی دور جا کر اسے ٹھہر جانا پڑا۔ اسے خیال آیا کہ اب اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ کیونکہ جو لوگ یہاں آئے تھے وہ تو چھ سات گھنٹے قبل ہی یہاں سے جا چکے تھے اور اب تک وہ نہ جانے کہاں غائب ہو چکے ہوں گے۔ اور اب وہ انھیں ڈھونڈ بھی نہیں سکتا۔ یہ ہی سب سوچنے کے بعد واپس پلٹا اور مکھیا سے بولا۔ "اس سر کو ایک کپڑے میں لپیٹ کر اپنے گھر لے جاؤ اور اپنی رسم کے مطابق اس کے آخری رسومات ادا کر دو۔" یہ کہتے کہتے ولیم سلومن کی آواز بھاری ہو گئی۔

"شمبھو اب اٹھ جاؤ۔" رستم خان نے شمبھو کو آواز دی۔ "یہ کیا ایک راجپوت ہو کر تم اتنے کمزور دل کیسے بن گئے؟"

لیکن شمبھو تو زمین پر سر ٹکائے اوندھا پڑا ہی رہا۔ یہ دیکھ کر رستم خان کچھ غصے اور کچھ ہمدردی کے جذبات

کے ساتھ اپنے گھوڑے پر سے نیچے اترا اور شمبھو پر جھک کر اس کا کندھا ہلاتے ہوئے بولا۔ چلو اٹھ جاؤ۔"

لیکن اٹھنے کے بجائے شمبھو کا جسم لڑھک کر زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ رستم خان نے دیکھا اس کی آنکھیں خوف سے پھٹی ہوئی تھیں اور منہ آدھا کھلا ہوا تھا۔ اس کی سانس رک چکی تھی۔ اس کی موت کا یہ منظر دیکھ کر ولیم سلومن کو ایک دوسرا جھٹکا لگا۔ اور وہ کچھ بول ہی نہ سکا۔

● ولیم سلومن کے ستارے اب اپنی چال بدلنے لگے تھے اور امیر علی کی قسمت کے ستارے زوروں پر تھے پنچ گنی سے ناکام واپس آنے کا افسوس ولیم سلومن کو جبل پور پہنچنے تک رہا۔ جبل پور آ کر جو خوشخبری اس نے سنی اس نے اس کے غم کو تھوڑا بہت ہلکا کر دیا تھا۔ اس کی بیوی ایملی نے ایک بچے کو جنم دیا تھا۔ زچہ اور بچہ دونوں خیریت سے تھے اور کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ لیکن چھ مہینے میں خود ولیم سلومن کی طبیعت خراب ہو گئی۔ دیوی سنگھ کا کٹا ہوا سر اس کو تحفے میں بھیجنے والے امیر علی اور گنیش کو گرفتار کرنے کا جو جوش و خروش اس کے دل میں تھا اس جوش و خروش پر اس کے ڈاکٹر نے ہی پانی انڈیل دیا۔ ڈاکٹر نے اس کا معائنہ کرنے کے بعد کہا "تمھیں ایک بار پھر ایک سال آرام کرنا پڑے گا۔ تمھیں تبدیلی آب و ہوا کی سخت ضرورت ہے۔ تمھارے چھوٹے بیٹے جون کو بھی یہاں کی آب و ہوا راس نہیں آئی ہے۔ اگر اس وقت اس پر توجہ نہ دی گئی تو آئندہ اس کی صحت کے لیے زیادہ فکر مند ہونا پڑے گا۔"

ڈاکٹر کے اس مشورے اور ایملی کی ضد کے آگے ولیم سلومن کو اپنا سر جھکا دینا پڑا اور اس طرح ٹھگ لوگوں کو دوبارہ اپنا سر اٹھانے کا موقع مل گیا۔

پانچ سال تک جبل کی دیواروں کے پیچھے رہ کر امیر علی نے اپنی جو طاقت گنوائی تھی اسے اس نے صرف دو ہی سال میں دوبارہ حاصل کر لی اور ایک بار پھر وہ پہلے جیسی شان و شوکت حاصل کر کے گنیش اور اس کی ٹولی پر اپنی حکومت کا سکہ جما چکا تھا۔ ولیم سلومن کی غیر حاضری سے اسے صرف دو ہی سفر کے دوران بہت فائدہ ہوا۔ ان دونوں سفروں کے دوران اس کی ٹولی نے تقریباً ایک سو پچیس مسافروں کا گلا گھونٹ کر انھیں ختم کر دیا اور تقریباً ڈیڑھ لاکھ کی دولت اس نے اکٹھی کر لی۔ گنیش اب زخمی اور کینچلی بدلنے والے سانپ کی طرح بے زہر ہو کر رہ گیا تھا۔ امیر کوڑ سنے کا ارادہ بھول کر اب اس نے انھی کی سرداری کو تسلیم کر لیا تھا۔ مگر امیر علی پھر بھی اس سے ہوشیار رہتا تھا۔ اس نے کوشش کی تھی کہ دوسرے سفر میں وہ گنیش کو اپنے ساتھ نہ لے جائے لیکن پھر اس خیال سے اس نے اپنا ارادہ ترک کر دیا کہ ٹولی سے علیحدہ ہونے کے بعد گنیش اور زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ اگر وہ غداری پر آمادہ ہو گیا تو امیر اور اس کی ٹولی کسی جگہ پر بھی گرفتار ہو سکتی تھی۔ اس درمیان ایک بار پھر یہ خبر سنائی دینے لگی تھی کہ گورا صاحب ولیم سلومن ایک بار پھر میدان میں کود پڑا ہے۔ اس خبر کو سننے کے بعد تو امیر کو اسی میں اپنی بھلائی نظر آنے لگی کہ وہ گنیش کو اپنے ساتھ ہی رکھے۔

شگون دیکھنے کے بعد سفر شروع ہوا۔ لیکن اچھے شگون کے بعد بھی جب آدھی منزل تک بھی انھیں کوئی مال دار شکار نہیں ملا تو امیر کی گھبراہٹ بڑھ گئی۔ خود گنیش بھی فکر مند نظر آنے لگا تھا۔ اس نے امیر سے کہا۔ "امراوتی تک تو ہم لوگ پہنچ گئے ہیں۔ لیکن ابھی تک ہمارا تیر نشانے پر لگتا نظر نہیں آ رہا ہے۔"

امراوتی کا نام سن کر امیر کے دماغ میں ایک دھماکہ سا ہوا۔ ارے یہ نگری تو میرے لیے بڑی ہی بھاگوان ہے اسی شہر میں میں چیتو کے لشکر میں تھا۔ اور اس شہر کو میں نے ہی چیتو کے خوف سے نجات دلائی تھی۔ یہاں کے راجا نے مجھے بہت عزت دی تھی اور کہا تھا کہ اگر کبھی دوبارہ یہاں آنا ہو تو مجھے اپنی مہمان نوازی کا ضرور موقع دینا۔

امیر نے چیتو کے لشکر والی بات کو اپنے دل میں دفن رہنے دیا اور گنیش سے بولا "تم صبر کرو گنیش! جب ہم اس دولت مند شہر میں قدم رکھیں گے تو تم دیکھنا ہماری تقدیر کیسے چمکنے لگتی ہے۔"

امراوتی کے سرائے میں ٹھہرنے کا انتظام ہو چکا تھا

سرائے میں آنے کے بعد امیر نے اتنا شاہانہ لباس زیب تن کیا کہ اسے دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ جیسے کوئی بہت بڑا نواب اس شہر میں آیا ہو۔ اس نے رامو کو بھی سمجھا دیا تھا۔ "اب تمھیں میرے خدمت گار کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دینے ہوں گے۔ اور بات بات پر مجھے حضور کہہ کر مخاطب کرنا۔ میرا نام لے کر مخاطب کرنے کی کوشش مت کرنا۔"

"ٹھیک ہے حضور۔ جیسا آپ کا حکم۔" رامو نے اس طرح جھک کر کہا جیسے وہ ابھی سے اس کے حکم پر عمل کرنے کے لیے تیار ہو۔

"لیکن روانہ ہونے سے قبل میں حضور سے ایک بات پوچھ لینا چاہتا ہوں کہ آپ کی تعریف میں مجھے کیا کہنا ہے؟"

"کہنا کہ۔" امیر کو ایک لمحے کے لیے ٹھہر جانا پڑا۔ "کہنا کہ ہمارے مالک بہت بڑے سوداگر ہیں اور مال کی خریداری کے لیے حیدر آباد جا رہے ہیں۔" اتنا کہنے کے بعد امیر اپنے خوبصورت گھوڑے پر سوار ہو گیا اور رامو اس کے برابر چلتا ہوا آگے بڑھا۔ امراوتی کے بازار میں داخل ہو کر امیر نے گھوڑے کا رخ چوک کی طرف موڑ دیا۔ بازار کی رونق اور چہل پہل دیکھ کر امیر کو دس پندرہ سال قبل کا وہ دن یاد آ گیا جب باغی چیتو کے ہراول دستے کے ساتھ وہ اس جگہ آیا تھا اور اس وقت دن کے اجالے میں بھی یہ بازار کس قدر سونا ہو گیا تھا۔ دکانیں دھڑا دھڑ بند ہو چکی تھیں اور گھروں کے دروازے اور کھڑکیاں بھی بند تھیں۔ لوگ۔ دھڑکتے دل اور خوف زدہ چہرے لے کر اپنے گھروں میں بند ہو چکے تھے اور چوک میں بڑے بڑے مہاجن اور بیوپاری اپنے ہاتھ جوڑے اس کے سامنے کھڑے گڑگڑاتے ہوئے کہہ رہے تھے "جناب ہم اپنی حیثیت کے مطابق آپ کو خوش کرنے کی کوشش کریں گے۔ لیکن مہربانی کر کے آپ لوگ اس شہر کو لوٹنے کی کوشش نہ کریں۔"

اس وقت اسے ان لوگوں پر بڑا ترس آیا تھا اور پھر ہمدردی کے اسی جذبے نے لوگوں کے دل سے چیتو کا خوف ہٹا دیا تھا۔ خود راجا بھی اس کا احسان مند تھا کیونکہ جاتے جاتے امیر نے چیتو سے یہ وعدہ بھی کرا دیا تھا کہ آئندہ امراوتی کو چیتو کے لشکر سے کبھی کوئی خطرہ لاحق نہیں ہو گا۔

"حضور! لوگ آپ کی طرف حیرت سے تکتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔" رامو کی یہ بات سن کر امیر چونک کر ماضی کے خیالوں سے باہر نکل آیا اور پھر سنبھل کر رعب دار لہجے میں بولا "ذرا کسی سے پوچھ تو لو کہ آج سے پندرہ سال قبل جو یہاں کا سب سے بڑا مہاجن مارواڑی تھا اس کی دکان اب کہاں ہے؟"

لیکن رامو کو کسی سے پوچھنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ ایک دلال امیر کو بہت بڑا سوداگر سمجھ کر خود ہی دوڑتا ہوا وہاں آ گیا اور بولا "فرمائیے جناب! امراوتی میں سے اگر آپ کو کوئی بھی چیز خریدنی ہو تو اس کے لیے یہ دلجیت دلال آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ ہیرے جواہرات، موتی، کپڑے، مخمل اور کمخواب وغیرہ جو کچھ بھی آپ خریدنا چاہتے ہوں یہ بندہ آپ کی مدد کر سکتا ہے اچھی چیز مناسب دام اور معمولی دلالی میں آپ کا سارا کام ہو جائے گا۔"

دلال رٹے رٹائے جملے ایک ہی سانس میں بول گیا اور امیر مسکراتی نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ یکایک اسے مذاق سوجھ گیا۔ اس نے دونوں ہاتھ اپنے کانوں پر رکھ لیے اور منہ بنا کر دلال کو سمجھانے کی کوشش کی کہ میں بہرا ہوں۔

اس کا یہ اشارہ سمجھتے ہی دلال کا سارا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ اور وہ دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ اتنا بارعب اور مال دار گاہک لا لیکن یہ بھی بہرا نکلا۔ اب اس نے رامو کو مخاطب کرنے کی کوشش کی۔ "تم اپنے مالک کو سمجھاؤ کہ وہ خریداری کے وقت مجھے اپنے ساتھ رکھے۔" اتنا کہہ کر وہ رامو کے کان کے پاس منہ لے جا کر دھیرے سے بولا "دلالی میں میں تمھارا حصہ بھی رکھوں گا۔"

اس سے پہلے کہ رامو کوئی جواب دیتا امیر نے اپنی تلوار کے دستے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور غصے بھری آواز

میں بولا: "بے وقوف تو دلالی کرتا ہے یا دغابازی؟"

دلال امیر کو اس طرح بولتے دیکھ کر بوکھلا گیا اور امیر کا سُرخ چہرہ دیکھ کر تھر تھر کانپنے لگا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ دُم دبا کر وہاں سے بھاگ نکلتا امیر کے قہقہے کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ وہ بڑی حیرت سے امیر کو تکنے لگا۔ تھوڑی دیر تک ہنسنے کے بعد امیر رامُو سے بولا: "رامُو! اسے میں نے کیسا بے وقوف بنایا!" یہ سننا تھا کہ دلال سچ مچ ہی وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔

ہنستے ہنستے وہ دونوں ابھی کچھ ہی دور آگے بڑھے تھے کہ سامنے سے ایک دکاندار بھاگتا ہوا ان کے قریب آیا اور بولا: "آپ اس شہر میں اجنبی ہیں لیکن بہت ہی قیافہ شناس اور تجربہ کار نظر آتے ہیں۔ آپ نے اس بدمعاش دلال کو بھگا کر بہت ہی اچھا کیا۔" اتنا کہہ کر وہ اپنے مطلب کی بات پر آ گیا: "ہماری دُکان میں تشریف لے آئیں جہاں آپ کو بغیر کسی دلال کے اچھے سے اچھا مال مل جائے گا۔"

امیر کو اب وقت ضائع کرنا مناسب نہیں لگا۔ اس لیے وہ رامُو سے بولا: "اس سے کہو کہ مال وغیرہ کی بات بعد میں ہوگی۔ پہلے ہمیں ایک پتا بتا دے۔"

"فرمائیے جناب! کیا پوچھنا ہے؟" دکاندار خندہ پیشانی سے بولا۔ امیر نے اس کے سوال کا سیدھا جواب دینے کی بجائے رعب دار لہجے میں رامو سے ہی کہا: "اس سے پوچھو اس شہر کے بڑے سیٹھ ناگر مہاجن کی گدی کہاں ہے؟"

"ناگر مہاجن" دُکاندار چونک کر بولا: "آپ کو ان سے کیا کام پڑ گیا؟ ناگر مہاجن سے آپ کو کیا خریدنا ہے؟"

"مجھے کیا خریدنا ہے یہ تمھیں جاننا ضروری ہے کیا؟" امیر ذرا سخت لہجے میں بولا: "مجھے ناگر مہاجن سے تمھاری یہ امراوتی نگری خریدنی ہے۔"

"ایں" دکاندار بوکھلا گیا اور اس طرح بغلیں جھانکنے لگا جیسے اسے کچھ سمجھ ہی نہ آئی ہو۔ وہ چند لمحوں تک تو آنکھیں پھاڑے امیر کو دیکھتا رہا پھر سر جھکا کر اپنی دکان کی جانب چل پڑا۔

"آپ کو آج ہر ایک سے مذاق کرنے کا کیوں سوجھ رہا ہے؟" رامُو اس بار پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

"تمھیں نہیں معلوم رامُو! ایک بار چیتو کے سامنے میں اس چوک میں کھڑا تھا اور اس وقت یہاں کے سارے ساہوکار تھر تھر کانپتے ہوئے بھیگی بلی کی طرح ہمارے سامنے کھڑے تھے۔ اگر اس دُکاندار کو یہ معلوم ہو جائے کہ میں وہی امیر علی ہوں تو یہ اپنی دُکان بند کر کے بھاگ کھڑا ہوگا۔"

آدمی کبھی کبھی اس تصور سے خوش ہوتا ہے کہ لوگ اس سے ڈرتے ہیں۔ چیتو کے ساتھ جب امیر ایک لٹیرے کی حیثیت سے یہاں آیا تھا تو اُسے اپنے نقلی کے پیشے سے نفرت سی ہو گئی تھی اور اس وقت برسوں پرانی اُس بات کو یاد کر کے اسے مزہ آ رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد انھیں ناگر مہاجن کا پتا مل گیا اور آخر کار امیر علی ناگر مہاجن کی دو منزلہ حویلی پر پہنچ گیا۔ حویلی کے دروازے پر ایک شاندار پالکی دیکھ کر امیر کو ذرا حیرت سی ہوئی اور وہ سوچنے لگا۔ یہ تو کسی مسلمان عورت کی زنانہ سواری لگتی ہے۔ ممکن ہے ناگر مہاجن کے گھر کوئی مہمان آیا ہو۔

امیر علی کا رُعب اور شان و شوکت دیکھ کر حویلی میں اسے کافی عزت دی گئی۔ ناگر مہاجن کے پستہ قد منیم نے اُسے عزت اور احترام سے دیوان خانے میں بٹھایا اور پوچھ گچھ کرنے لگا: "جناب کہاں سے تشریف لائے ہیں؟ ناگر مہاجن سے کیا کام ہے؟"

لیکن جب امیر نے کوئی جواب نہیں دیا تو منیم نے شربت کا پیالہ اس کے سامنے رکھتے ہوئے پھر پوچھا: "کیا آپ بھی یہاں جواہرات خریدنے آئے ہیں؟"

یہ سوال سن کر امیر چونک پڑا اور اسے لگا کہ تب تو یقیناً پالکی میں بیٹھ کر آنے والی وہ عورت جواہرات کی خریداری کے لیے ہی ناگر مہاجن کے پاس آئی ہوئی ہے۔ اور شاید اسی لیے اسے یہاں بٹھایا گیا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی اُس نے سوچا کہ اب اسے منیم سے سیدھی طرح بات کرنا چاہیے۔ اسی لیے وہ مسکرا کر بولا: "منیم جی آپ کا اندازہ دُرست ہے۔ ناگر مہاجن سے مجھے کوئی ایسا ہی

کام ہے۔" یہ کہہ کر وہ ایک لمحے کے لیے رُکا اور پھر آگے بولا: "پیچھے کھڑی ہوئی پالکی دیکھ کر ہی میں سمجھ گیا تھا کہ ناگر مہاجن کا کوئی پرانا گاہک آیا ہوا ہے۔"

"اوہ... وہ تو بیگم صاحبہ ہیں۔" منیم نے کہا: "برسوں سے جواہرات ہمارے سیٹھ صاحب سے ہی خریدتی ہیں۔ سیٹھ صاحب آج کل کچھ بیمار رہتے ہیں۔ اس لیے بیگم صاحبہ خود ہی یہاں آ گئی ہیں۔" پھر اس سے پہلے کہ امیر بیگم صاحبہ کے بارے میں کچھ اور پوچھتا کمرے کا اندرونی دروازہ ایک جھٹکے سے کھل گیا۔ دروازہ کھلتے ہی خوشبو کی ایک تیز لہر کمرے میں دوڑ گئی اور ریشمی لبادے میں لپٹی ہوئی ایک عورت دروازے سے نکلتی ہوئی دکھائی دی۔ اس کے پیچھے اُس کی خادمہ جواہرات کی خوبصورت پیٹی اٹھائے ہوئے تھی۔ تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی اُس عورت نے اپنے نقاب کی جالی میں سے ایک اُچٹتی ہوئی نظر امیر پر ڈالی۔ پھر اچانک ہی اس کے قدم زمین پر چپک کر رہ گئے اور امیر بھی نقاب کے پیچھے چھپے ہوئے چہرے کو دیکھے بغیر مسکرا پڑا۔ اس وقت اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کی یہ مُسکراہٹ ریشمی لبادے میں لپٹی ہوئی اُس عورت کا جگر چھلنی کر دے گی۔

"سیٹھ صاحب اندر آپ کے منتظر ہیں۔" منیم کی آواز نے امیر کو اس پردہ نشین خاتون کے خیالوں سے چونکا دیا اور وہ سر جھٹک کر اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا: "چلو۔"

بیمار ناگر مہاجن پلنگ پر گاؤ تکیوں کے سہارے بیٹھا ہوا تھا۔ پندرہ سال قبل امیر نے جس ناگر مہاجن کو دیکھا تھا اُس میں اور اس وقت سامنے بیٹھے ہوئے ناگر مہاجن میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ناگر مہاجن اب بہت کمزور اور نڈھال دکھائی دے رہا تھا۔ امیر اس کے سامنے کی گدی پر بیٹھتے ہوئے بولا: "مجھے امراوتی آتا پڑا تو اچانک آپ کی یاد آ گئی اور ابھی ابھی مجھے معلوم ہوا کہ آپ بیمار رہنے لگے ہیں۔ کیا بیماری ہے آپ کو؟"

لیکن جواب دینے کی بجائے ناگر سیٹھ امیر کو گھور گھور کر دیکھنے لگا تو امیر کو خیال آیا کہ ناگر مہاجن نے ابھی تک اسے پہچانا نہیں ہے۔

"شاید آپ نے مجھے پہچانا نہیں ہے؟"

"لگتا تو ہے میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے۔"

"میں ابھی آپ کو یاد دلاتا ہوں۔" امیر مُسکراتی نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر بولا: "میرا نام امیر علی ہے۔"

"امیر علی۔" ناگر سیٹھ آنکھیں سکوڑ کر اس طرح بولا جیسے ابھی بھی اسے امیر علی کو پہچاننے میں دشواری ہو رہی ہو۔ امیر کو اس کی کمزور یادداشت پر غصہ آنے لگا۔ مگر وہ اپنے آپ کو سنبھال کر دھیمے لہجے میں بولا: "شاید آپ اس نام سے مجھے نہیں پہچانیں گے۔ لیکن میر صاحب کا نام آپ کو یاد آ جائے گا۔"

تعارُف کرانے کا یہ انداز دیکھ کر جہاندیدہ ناگر مہاجن سمجھ گیا کہ آنے والے مہمان کو مُنیم کی موجودگی کھٹک رہی ہے۔ اسی لیے وہ تعارُف کرانے سے ہچکچا رہا ہے اسی لیے وہ جلدی سے بولا: "میر صاحب ہاں ہاں اب یاد آ گیا۔" پھر وہ مُنیم کو مخاطب کر کے بولا: "اے منیم تم کھڑے کیوں ہو؟ جاؤ جا کر کچھ ناشتے وغیرہ کا انتظام کرو۔"

"اچھا سرکار۔" منیم سر جھکا کر چلا گیا۔

امیر نے منیم کے جانے کے بعد کچھ اطمینان سا محسوس کیا۔ لیکن ناگر مہاجن نے اسے پہچان لینے کے بعد بھی نہ تو اپنی جگہ سے اُٹھنے کی کوشش کی اور نہ ہی اسے اپنے قریب بیٹھنے کے لیے کہا۔ یہ دیکھ کر امیر کو کہنا پڑا: "میرا خیال ہے کہ آپ مجھے پہچاننا ہی نہیں چاہتے۔ اس دن کو یاد کیجیے جب لٹیرے آپ کے اس شہر کو راکھ کا ڈھیر بنا دینے کے لیے آئے تھے اور آپ دوسرے مہاجنوں کے ساتھ ہاتھ جوڑ کر اُن سے منت سماجت کر رہے تھے۔"

"ہاں۔" ناگر سیٹھ کے چہرے پر اچانک تبدیلی آ گئی۔ اس کے جسم میں بھی ہلکی ہلکی کپکپاہٹ دوڑ گئی اور وہ آنکھیں جھپکاتے ہوئے بولا: "معاف کیجیے گا میر صاحب! میں واقعی آپ کو پہچان نہیں سکا تھا۔ مجھے آنکھوں سے بھی کم نظر آتا ہے اور یادداشت بھی اب ساتھ نہیں دیتی۔" بولتے بولتے ناگر سیٹھ پلنگ کا سہارا لے کر اُٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن امیر نے آگے بڑھ کر اسے ایسا کرنے نہیں دیا۔ وہ خود ہی اٹھ کر اس کے قریب آ گیا اور دونوں

ہاتھوں سے ناگر مہاجن کے کندھے پکڑ کر بولا: "آپ کے منیم کی موجودگی میں میں اپنا تعارف کرانا مناسب نہیں سمجھ رہا تھا اسی لیے اتنی دیر ہو گئی۔"

ناگر سیٹھ نے امیر کی پیٹھ کی طرف تکیہ سرکاتے ہوئے کہا: "آپ کا احسان بھلا ہم کیسے بھول سکتے ہیں جناب! آپ ہی کی وجہ سے ہماری یہ نگری چیتو کے ظلم کا شکار ہونے سے بچ گئی تھی۔" اتنا کہہ کر وہ اچانک کچھ ایسے لہجے میں بولا جیسے اچانک ہی اُسے کچھ یاد آ گیا ہو: "اور ہاں چیتو تو واقعی انگریزوں کے سامنے بے بس ہو گیا تھا اُس جیسے بہادر کو جنگل میں بھٹک کر بے موت مرجانا پڑا۔"

یہ سن کر امیر کو لگا کہ شائد ناگر سیٹھ ابھی تک یہ ہی سمجھ رہا ہے کہ وہ آخر تک چیتو کے ساتھ ہی رہا ہے۔ اور اگر ایسی بات ہے تو اُسے سیٹھ کی یہ غلط فہمی فوراً ہی دور کر دینی چاہیے۔ اسی لیے وہ بولا: "سیٹھ جی یہاں سے جانے کے بعد میں نے چیتو کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ رعایا پر ظلم کرنے کا وہ انداز مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ بس میں نے اُسی دن سے لٹیرے کا لباس اپنے جسم پر سے اتار پھینکا تھا۔ شائد اسی لیے اللہ کی مجھ پر مہربانی رہی ہے کہ میں آج شریف لوگوں کی صحبت میں بیٹھ کر سکھ سے زندہ ہوں۔"

"میں نے تو ایک بار ہی آپ کو دیکھ کر یہ سمجھ لیا تھا کہ آپ شریف خاندان کے ایک فرد ہیں۔" ناگر مہاجن مسکراتے ہوئے بولا: "اور مجبوری کی حالت میں لٹیروں کے گروہ کا ساتھ دے رہے ہیں۔ آپ بہت ہی سمجھدار اور قابل آدمی ہیں۔ اگر کوئی کاروبار کریں تو آپ یقیناً ایک کامیاب بیوپاری ثابت ہوں گے۔"

"اب یہ ہی تو کر رہا ہوں۔" امیر ہنس کر بولا: "آپ لوگوں کے پاس سے مجھے جو دس ہزار روپے ملے تھے اسی رقم سے میں نے کاروبار شروع کیا تھا۔ اور آج اللہ کے فضل سے میں ڈیڑھ دو لاکھ کی آسامی سمجھا جاتا ہوں۔"

ناگر سیٹھ اب دلچسپی سے امیر کی طرف سے دیکھ رہا تھا: "میر صاحب! وہ دس ہزار روپے آپ کو راس آ گئے۔ اس کی وجہ آپ کو معلوم ہے؟"

امیر نے انکار میں سر ہلایا: "نہیں جناب! میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ لوٹ کی دولت آدمی کو ہضم نہیں ہوتی لیکن میرے کاروبار میں تو برکت ہی ہوتی جاتی ہے۔"

"اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ نے وہ رقم ہم سے لوٹی نہیں تھی۔" ناگر سیٹھ کی مونچھیں پھڑکنے لگی تھیں: "آپ نے ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ لیکن چیتو نے تو ہماری مدد کا بہت ہی غلط فائدہ اُٹھایا تھا۔ اس نے ہماری دولت حاصل کرنے کے بعد ہمیں بالکل ہی نظر انداز کر دیا اور آپ کو جو کچھ ہم نے اپنی خوشی سے دیا وہ آپ نے قبول کر لیا۔ اسی لیے وہ دولت آپ کے لیے خوش نصیبی کا پیغام لے کر آئی تھی۔"

"ہاں۔ اب مجھے بھی کچھ ایسا ہی لگتا ہے۔" امیر نے موقع مناسب دیکھ کر کہا: "آخر تو آدمی کو اپنی شرافت کا ہی پھل ملتا ہے۔ جب ہی تو آپ کی حویلی میں مجھے عزت مل رہی ہے۔ اور اس وقت آپ کے پاس بیٹھ کر میں سکھ دُکھ کی دو باتیں کر رہا ہوں۔"

امیر کی بات پوری ہوتے ہی منیم ناشتے کی چیزیں ایک ٹرے میں سجائے کمرے میں داخل ہوا۔ اُسے دیکھ کر امیر نے گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے کہا: "سیٹھ جی! آخر یہ تکلیف اٹھانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"ارے اس میں تکلیف کہاں ہوئی ہے۔" ناگر سیٹھ سمجھ گیا تھا کہ منیم کی موجودگی میں امیر چیتو اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں کوئی بات کرنا نہیں چاہتا: "یہ تو صرف ناشتہ ہے۔ ویسے آپ کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں؟ یہاں سے رخصت ہوتے وقت ایک بار آپ کو میرے ساتھ کھانا کھانا ہی پڑے گا۔"

"کھانا تو روزانہ ہی سیٹھ جی میں آپ ہی کا کھاتا ہوں۔" امیر کے منہ سے سیٹھ صاحب کی تعریفیں نکلنے لگیں: "اس شہر سے مجھے ایک محبت سی ہو گئی ہے۔ اور یہ سب آپ کے خلوص اور آپ کی محبت کی وجہ سے ہوا ہے۔ اگر حیدرآباد جانے کی جلدی نہ ہوتی تو دو چار دن اور یہاں رُک جاتا۔ اکثر میں سوچتا ہوں کہ خوش حال شہر میں ہی کوئی کاروبار کیوں نہ کر لوں؟ یوں تو ہم لوگ اسی راستے سے واپس جائیں گے

اسی لیے کچھ جواہرات خریدنے کے لیے آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں۔ آئندہ سال مجھے اپنی بیٹی کی شادی بھی کرنا ہے۔"

"ارے ہاں۔" ناگر سیٹھ کو اچانک کوئی بات یاد آ گئی اور وہ ایک سرد آہ بھر کر بولا: "میں تو یہ پوچھنا ہی بھول گیا کہ آپ کے کتنے بال بچے ہیں؟"

"اولاد کے روپ میں تو ایک بیٹی ہی ہے سیٹھ جی!" امیر حد درجہ سنجیدہ لہجے میں بولا: "لیکن اب وہ بھی پرائی ہو گئی ہے۔"

تھوڑی دیر خاموشی چھائی رہی پھر امیر کو لگا کہ اب اُسے اُٹھ جانا چاہیے۔ سیٹھ کی نظروں میں وہ ایک شریف انسان ثابت ہو چکا ہے۔ اس شہر کے کسی بھی مالدار شخص کو پھانسنے کے لیے اب ناگر سیٹھ کا حوالہ ہی کافی ہو گا۔ یہ سب باتیں سوچنے کے بعد وہ بولا: "اچھی بات ہے سیٹھ جی! اب مجھے اجازت دیں۔" وہ ہاتھ جوڑ کر اپنی جگہ سے اُٹھا: "میرے ساتھ دوسرے بہت سے لوگ ہیں جو سرائے میں میری راہ دیکھ رہے ہوں گے لیکن جانے سے قبل ضرور ملنے آؤں گا۔"

"ضرور تشریف لائیے گا۔" سیٹھ اپنے دونوں ہاتھوں میں امیر کا ہاتھ تھام کر محبت بھرے لہجے میں بولا: "اگر میں بیمار نہ ہوتا تو آپ کو رُخصت کرنے نیچے تک ضرور آتا مگر میرے لائق کوئی خدمت ہو تو ضرور بتائیے گا میر صاحب!"

"آپ کی مہربانی ہے سیٹھ صاحب!" اتنا کہہ کر امیر دھیرے دھیرے حویلی سے باہر نکل گیا۔

باہر رامو اُس کے گھوڑے کی لگام تھامے اس کی راہ دیکھ رہا تھا۔ امیر کو دیکھ کر اس نے منہ بگاڑا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا اُسے خیال آ گیا کہ اس وقت وہ امیر کا خدمت گار بنا ہوا ہے۔ اور یہاں اُسے کوئی ایسی ویسی بات نہیں کرنا چاہیے۔ وہ گھوڑے کی لگام امیر کے ہاتھ میں تھما کر اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

لیکن بازار سے گذر جانے کے بعد رامو سے صبر نہ ہو سکا اور وہ پوچھ بیٹھا: "میاں وہ پالکی والی عورت کون تھی؟"

یہ سن کر امیر کو چونک جانا پڑا اور وہ سوچنے لگا کہ وہ عورت اتنی جلدی اس کے دماغ کے اُفق پر سے غائب کیوں ہو گئی؟ اور رامو کو وہ عورت کیوں یاد رہ گئی؟

"منیم کہہ رہا تھا وہ کوئی بیگم ہے۔" امیر کا خیال تھا کہ شائد رامو نے اس کے متعلق کچھ اور معلومات حاصل کر لی ہوں گی: "کیا تمھیں اس کے بارے میں کچھ معلوم ہے؟"

"پالکی والوں کو میں نے کئی بار پوچھا لیکن وہ میرے سوالوں کو ٹالتے ہی رہے۔" یہ سنتے ہی امیر سوچنے لگا کہ وہ عورت اپنے نقاب کی جالی میں سے اُسے کیوں گھور رہی تھی؟ پھر اچانک رامو کی آواز نے اُسے چونکا دیا جو آگے کہہ رہا تھا: "لیکن میاں یوں لگ رہا تھا جیسے اس عورت کو تم سے دلچسپی ضرور ہے۔"

امیر نے ایک جھٹکے سے گردن موڑ کر پیچھے آنے والے رامو کی طرف دیکھا۔ وہ جانتا تھا کہ رامو کو مذاق کرنے کی عادت ہے۔ لیکن یہ بات اُسے اِس وقت بے موقع لگ رہی تھی۔ اسی لیے وہ ذرا ناراض لہجے میں بولا: "بکواس مت کرو رامو! ابھی ہم آتے جاتے لوگوں سے دور نہیں ہوئے ہیں۔"

"یہ مذاق نہیں ہے۔ میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔" رامو سنجیدگی سے بولا: "سیٹھ کی حویلی سے باہر آنے کے بعد وہ کچھ دیر تک تمھارے اس خوبصورت گھوڑے کو دیکھتی رہی تھی۔ پھر پالکی میں بیٹھتے وقت اس نے ایک ملازم کو میری طرف کچھ پوچھنے کے لیے بھیجا تھا۔"

"کیا؟" امیر بے چین سا ہو گیا: "جلدی بتاؤ کیا پوچھا تھا اس نے؟"

"اب شائد تمھیں میری باتیں بکواس نہیں لگ رہی ہیں؟" رامو نے مسکرا کر امیر کی طرف دیکھا: "اس کا ملازم مجھ سے پوچھنے لگا کہ تمھارا مالک کون ہے؟ کہاں رہتا ہے؟ اکیلا ہے یا بیوی بچے بھی ساتھ ہیں؟"

"پھر تم نے کیا جواب دیا؟" امیر پہلے سے زیادہ بے چین نظر آنے لگا: "تم نے ٹھیک ٹھیک جواب تو دیا ہے نا؟"

"جناب یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے۔ میں نے آپ کا نام میر صاحب بتایا ہے۔ اور آپ کو ایک بہت بڑا

سوداگر بتا رہا ہے۔ میں نے اسے بتا دیا کہ آپ کے بیوی بچے ساتھ نہیں ہیں اور آپ حیدر آباد جا رہے ہیں۔"

امیر نے اس کی بات سن کر کوئی جواب نہیں دیا۔ اب وہ خاموشی سے سوچنے لگا تھا کہ وہ بیگم آخر کون ہو سکتی ہے؟ اور اُسے اُس میں اِس قدر دلچسپی لینے کی کیا ضرورت ہے؟ وہ پورے آٹھ سال تک عورت کی قربت سے دور رہا تھا۔ اور اب اس کے دل میں ایک نہ سمجھ میں آنے والی کپکپاہٹ سی دوڑنے لگی تھی۔

●

امراؤتی کے ناگر سیٹھ سے ملاقات کے پیچھے امیر کا جو مقصد تھا وہ یہ ہی تھا کہ لوگوں کی نظروں میں وہ ایک دولت مند سوداگر کے طور پر خود کو پیش کر سکے کیونکہ مال دار مسافر لوگ اب کسی اجنبی سے ملنے جلنے میں بہت احتیاط برتنے لگے تھے۔ یہ ہی وجہ تھی کہ امیر امراؤتی کے ناگر سیٹھ کی آڑ لے کر شکار پھانسنا چاہتا تھا۔

سرائے میں واپس آ کر اس نے اپنے ساتھیوں سے اتنی زور زور سے باتیں کرنا شروع کر دیں کہ سرائے کے اور مسافر لوگ بھی اس کی باتیں سن سکیں۔ ناگر سیٹھ نے تو مجھے کھانے کی بھی دعوت دی تھی لیکن ان کی بیماری کا خیال کر کے میں نے ہی انکار کر دیا۔" لیکن ان سب باتوں کے باوجود بھی مسلسل تین روز کی کوشش اور امراؤتی میں ٹھہرنے کے بعد بھی کوئی اچھا اور مالدار شکار اُن لوگوں کے ہاتھ نہیں لگا تھا۔ اور تب امیر ایک عجیب سی بے چینی محسوس کرنے لگا۔ جب سے اُس نے اُس بُرقعے والی بیگم کو دیکھا تھا تب سے وہ اور بھی زیادہ بے چین سا رہنے لگا تھا۔ عظیمہ کے انتقال کے کئی برس بعد آج پہلی بار اُسے عورت سے جُدائی کا احساس ہونے لگا تھا۔ اُس نے اِس سے پہلے کبھی بھی یہ نہ سوچا تھا کہ بیوی کے بغیر اس کی بقیہ زندگی کس طرح گذرے گی؟ آج اُسے اپنی تنہائی کا شدّت سے احساس ہونے لگا تھا۔ بُرقعے والی عورت نے تو صرف پل دو پل تک ہی بُرقعے کی جالی میں سے اُسے دیکھا تھا لیکن پھر بھی اس کی صورت دیکھنے کے لیے اس کا دل کیوں بار بار مچل رہا تھا۔ کیا اُس کی نظر اُس کی جواہرات کی پیٹی پر للچائی تھی یا اس کے جوبن پر؟

اُس کے دل کی حالت تو اپنی جگہ پر تھی لیکن یہ بات اُس کی سمجھ سے باہر تھی کہ اس عورت کو کیا ضرورت تھی کہ اپنے ملازم کے ذریعہ وہ رامو سے اُس کے بارے میں پوچھتی؟ کیا واقعی وہ عورت اُس میں دلچسپی لے رہی ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ اُس کے ساتھ سفر پر جانا چاہتی ہو؟ مگر نہیں اگر ایسی بات ہوتی تو ان تین دنوں میں اس کی بالکی اسے ضرور دکھائی دیتی۔

اچانک اس کے دل میں یہ خیال تیزی سے اُبھرا کہ اگلا سفر اُسے ملتوی کر دینا چاہیئے۔ اس کے جی میں آیا کہ وہ گنیش سے کہہ دے کہ تمھیں ٹولی کو لے کر جدھر جانا ہے چلے جاؤ۔ میں اس جگہ سے واپس جا رہا ہوں۔ گنیش تو ایسے ہی کسی موقعے کی تلاش میں ہے۔ گنیش اور ٹولی کے چلے جانے کے بعد وہ کچھ روز امراؤتی میں ٹھہرے گا پھر شیوا پوری لوٹ جائے گا۔ کیونکہ روشن کی یاد اب بہت شدّت سے اسے ستانے لگی ہے۔ لیکن نہیں روشن سے تو اُس نے وعدہ کیا ہے کہ اُس کی سُونی گود کے لیے وہ ایک بچہ لے آئے گا۔ اور رمولوی سے بھی اس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ آئندہ کبھی اپنی بیٹی کا مُنھ دیکھنے جالان نہیں آئے گا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے؟ وہ اِسی اُلجھن میں بیٹھا تھا کہ اچانک اس کی سماعت سے ایک آواز ٹکرائی۔

"ارے میاں صاحب! اچھا ہوا آپ یہیں مل گئے۔" آواز کچھ جانی پہچانی تھی۔ امیر نے دھیرے سے سر اٹھا کر دیکھا اور نُمنیم جی کی طرف دیکھ کر بولا۔ "آیئے نُمنیم جی! کیا خبر ہے سیٹھ صاحب کی؟"

"انھوں نے فوراً ہی آپ کو بلایا ہے۔" نُمنیم مُسکراتے ہوئے بولا۔

"سیٹھ صاحب کو آپ سے ضروری کام ہے۔ حویلی میں دوسرے مہمان بھی آپ کی راہ دیکھ رہے ہیں۔"

"مہمان میری راہ دیکھ رہے ہیں؟" امیر اور زیادہ

ہو گیا اور زرکی سی آواز میں بولا۔ "مگر یہاں تو کوئی مجھ سے واقف نہیں ہے۔" اتنا کہہ کر وہ دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ ناگر سیٹھ اس کے ماضی سے واقف ہے۔ بُروں والی بات وہ جانتا ہے۔ کہیں گورا افسر ولیم سلومن اس کی تلاش میں سیٹھ صاحب کی حویلی تک تو نہیں پہنچ گیا؟ اس نے نُمنیم کے چہرے پر نظریں جما کر کچھ پڑھنے کی کوشش کی لیکن جب اُسے کوئی کامیابی نہیں ہوئی تو اس نے پوچھ ہی لیا۔ "یہ مہمان کون ہیں؟ اُن کے نام تو بتاؤ۔"

"وہ سیٹھ صاحب کے گاہک ہیں اور پٹھان ہیں۔" نُمنیم کا اتنا کہنا تھا کہ امیر پر ایک جنون سا سوار ہو گیا اور وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر نُمنیم کی طرف دیکھ کر ہنستے ہوئے بولا۔ "آپ چلیئے نُمنیم جی میں ابھی کپڑے تبدیل کر کے پہنچ رہا ہوں۔"

نُمنیم کے جانے کے بعد امیر کا چہرہ خوشی سے کھِل اٹھا تھا۔ چہرہ ہونٹ دانتوں سے دبا کر اپنے آپ سے بولا۔ "آخر پرانی نگڑا شکار تو ہاتھ آ ہی گیا۔"

●

"آیئے تشریف لایئے میر صاحب!" ناگر سیٹھ دیوان خانے میں بیٹھا ہوا تھا۔ "آپ کو زحمت تو ہوئی ہوگی۔"

امیر نے سلام کر کے سیٹھ کے بالکل سامنے والی گدّی پر بیٹھتے ہوئے آسامی پر نظریں گاڑ دیں پھر تھوڑی دیر بعد بولا۔ "اس میں مجھے کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔ یوں بھی میں نے آپ کی ملاقات کے لیے آنے ہی والا تھا۔ میں نے وعدہ کیا تھا کہ جانے سے قبل ایک بار ضرور حاضری دوں گا۔" کہتے کہتے امیر کی نظریں اُس پٹھان کے برابر میں بیٹھے ہوئے ایک انیس بیس سال کے نوجوان پر جم گئیں۔ "آپ ابھی تک کھڑے کیوں ہیں؟" ناگر سیٹھ نے کہا تو امیر چونک پڑا اور اسے خیال آیا کہ وہ اس نوجوان کو زیادہ ہی گھور گھور کر دیکھنے لگا ہے۔ اور اِسی خیال سے اسے کہنا پڑا۔ "واہ رے کیسا بانکا نوجوان ہے۔" وہ گدّی پر بیٹھتے ہوئے اُس کی تعریف کرتے ہوئے آگے بولا۔ "یقیناً یہ نوجوان اپنے باپ کا نام ضرور روشن کرے گا۔"

"بیٹا تو یہ خان صاحب کا ہی ہے۔" ناگر سیٹھ نے کہا تو امیر کو محسوس ہوا کہ اُس کے سامنے بیٹھا ہوا پٹھان بھی اُسے گھُور گھور کر دیکھ رہا ہے۔

"سبحان اللہ" اچانک امیر نے پٹھانی لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "اللہ تعالیٰ کا آپ پر بڑا کرم ہے خان صاحب! آپ کے بیٹے کو دیکھتے ہی دل مسرت سے جھوم اُٹھا تھا۔ ذرا دیکھیے تو سہی پٹھانی پانی اس کے چہرے پر کس قدر چمک رہا ہے۔"

امیر کی بات سن کر وہ نوعمر لڑکا تو شرما گیا اور اس کی نگاہیں خود بخود نیچے جُھک گئیں۔ لیکن اس کا پٹھان باپ خاموش نہ رہ سکا۔ اس نے فوراً ہی امیر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "میاں آپ کی پٹھانی زبان بھی کچھ کم تیز نہیں ہے۔ بغیر کسی تعارف کے آپ نے ڈیڑھ ایک پل میں ہی ہمارا دل جیت لیا ہے۔"

یہ باتیں سن کر یکایک ناگر سیٹھ کو لگا کہ اگر یہ دونوں اسی طرح ایک دوسرے کی تعریفیں کرنے لگ گئے تو پھر انھیں روکنا دشوار ہو جائے گا اس لیے انھیں فوراً ہی اصل بات کی طرف لے آنا چاہیئے۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے کہا "سنیئے میر صاحب! آپ کو جس کام کے لیے بلایا گیا ہے اُسے ذرا توجہ سے سن لیجیے۔"

"ضرور ضرور۔ فرمایئے۔" امیر ہمہ تن گوش ہو گیا۔

"بات یہ ہے کہ آپ کا قافلہ حیدر آباد جا رہا ہے۔" اتنا کہہ کر ناگر سیٹھ ایک پل کے لیے رکا۔ اور امیر بے چینی سے اُس کی اگلی بات کا منتظر تھا۔ "اور یہ خان صاحب بھی اسی راستے ساگر کی طرف جانا چاہتے ہیں۔" ناگر سیٹھ نے اپنی ادھوری بات مکمل کر دی تو امیر جلدی سے بولا۔ "اوہ تو یہ بات ہے۔ تب تو ہمیں بھی خان صاحب کی صحبت سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملے گا۔"

"لیکن اِس میں ایک اُلجھن ہے میر صاحب!" اچانک ناگر سیٹھ کی آواز نے ایک لمحے کے لیے امیر کی خوشیوں پر پانی پھیر دیا۔

"ان کے ساتھ زنانہ سواری بھی ہے۔"

"زنا... نہ" امیر کے منھ سے یہ لفظ کچھ اس طرح نکلا کہ جیسے اسے بولنے میں سخت تکلیف محسوس ہو رہی ہو۔ اِس کی کیا وجہ تھی یہ تو خود امیر کی بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

مگر اس نے فوراً ہی اپنے دل میں فیصلہ کر لیا کہ اسے زیادہ غرض دکھانا نہیں چاہیے۔ اسی لیے وہ ذرا پریشان سے لہجے میں بولا: "تب تو واقعی بڑی اُلجھن ہو جائے گی۔"

"میاں! اس میں اُلجھن کی کون سی بات ہے؟" ادھیڑ عمر پٹھان نے کہا: "ہمارے ساتھ پالکی اٹھانے والے مضبوط اور طاقت ور کہار موجود ہیں جو سفر کو دھیما نہیں پڑنے دیں گے۔"

پالکی کا لفظ سن کر امیر چونک پڑا اور اسے یوں لگنے لگا کہ کہیں یہ اسی بیگم کی پالکی ہی نہ ہو جسے اس نے ناگر سیٹھ کی حویلی کے باہر دیکھا تھا۔ اور کہیں یہ ادھیڑ عمر پٹھان اُس کا شوہر اور نوعمر لڑکا اس عورت کا بیٹا نہ ہو!

"آپ کیا سوچنے لگے میر صاحب؟" ناگر سیٹھ اس کی جانب تکتے ہوئے بولا: "میں نے تو خان صاحب سے وعدہ کر لیا ہے کہ میر صاحب کے ساتھ سفر کے دوران آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی اور آپ آرام اور اطمینان سے اپنی منزل پر پہنچ جائیں گے۔"

امیر اپنی تعریف کے جواب میں مُسکرا دیا۔ اب اُسے ہاں کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ شکار اس کے چُنگل میں پھنسنے کے لیے خود ہی بے تاب تھا اس لیے وہ کوئی غرض دکھائے بغیر بولا: "سیٹھ جی آپ تو جانتے ہی ہیں کہ طویل سفر میں اگر نہ سواری ساتھ ہو تو کس قدر چوکنا رہنا پڑتا ہے۔ پھر بھی میں آپ کی بات ٹوٹا لنے کی ہمت ہی نہیں کر سکتا۔ ہم کل صبح یہاں سے روانہ ہونے کی سوچ رہے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ پٹھان سے مخاطب ہوا: "کیا خیال ہے آپ کا؟"

"ارے جناب! اس میں پوچھنا ہی کیا ہے؟" پٹھان اپنی داڑھی پر انگلیاں پھیرتے ہوئے بولا: "ہم لوگ تو تیار ہی بیٹھے ہیں۔"

امیر لطیفی سوقی نظروں سے پٹھان کے بیٹے کو دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ اس کی شکل و صورت تو اپنے باپ سے قطعی مختلف ہے۔ تو کیا اس کی ماں اتنی حسین ہوگی؟ اس لڑکے کو دیکھ کر دل میں میٹھا میٹھا سا درد کیوں جاگ اٹھا ہے؟ اس کا ہیولا اگر زندہ ہوتا تو وہ ایسا ہی نظر آتا... وہ سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک پٹھان کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

"تو اب چلنا چاہیے۔" وہ اٹھ کر ناگر سیٹھ سے اجازت لینے کے بعد امیر سے بغل گیر ہو گیا اور اپنے بیٹے سے بولا: "بیٹے یوسف! چچا کو تسلیم کرو۔"

نوعمر لڑکا شرماتا ہوا اپنی جگہ سے اُٹھا اور نگاہیں نیچی کیے ہوئے امیر کو سلام کرنے کے لیے جھکا۔ لیکن پھر نہ جانے امیر کو کیا ہوا کہ اس نے لڑکے کے بازو تھام کر اسے اپنی جانب کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ اس کے دل میں دبی ہوئی محبت کی چنگاری دھیرے دھیرے پگھلنے لگی اور وہ بھرائی ہوئی آواز میں دعائیں دیتے ہوئے بولا: "خدا تمھیں بہت لمبی زندگی دے اور ہمیشہ خوش حال رکھے۔"

لڑکے سے اُس کی یہ محبت اور ہمدردی دیکھ کر پٹھان اور ناگر سیٹھ کو بڑی حیرت ہو رہی تھی۔ اور امیر کی نظروں سے ان کی یہ حیرت چھپی ہوئی نہ رہ سکی۔ اس لیے اُسے ہنس کر کہنا پڑا: "دراصل یوسف کو دیکھ کر مجھے اپنے مرحوم بیٹے کی یاد آ گئی تھی۔ اس لیے ذرا دل بھر آیا تھا۔"

"آپ اسے بھی اپنا بیٹا سمجھ لیں میر صاحب!" ناگر نے ہمدردی سے بولا۔ اور چند لمحوں تک خاموشی چھا گئی۔ پھر پٹھان نے اس گمبھیر خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا: "تو اب صبح کا سورج طلوع ہوتے ہی ہم سرائے پر پہنچ جائیں۔ خدا حافظ۔"

"خدا حافظ۔" امیر نے باپ بیٹے کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا اور تھوڑی ہی دیر بعد پٹھان اپنے بیٹے یوسف کے ساتھ حویلی سے باہر جا چکا تھا۔ لیکن اتنی دیر میں تو امیر نہ جانے کن خیالوں میں گہرائی تک اترتا چلا گیا تھا۔

●

امیر کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا اُس کا خیال تھا کہ پٹھان اس کے بہت سے ساتھیوں کو دیکھ کر کسی شک میں نہ پڑ جائے اور اسی لیے اُس نے اپنی آدھی ٹولی کو گنیش کی سربراہی میں اگلی شام کو ہی روانہ کر دیا تھا۔ اس نے گنیش کو سمجھاتے ہوئے کہا تھا: "جب تک جنگل کی سرحد آ جائے اُس وقت تک تم ہم لوگوں سے آگے ہی رہنا پھر اس طرح ہم سے ملنا جیسے اچانک ہی ہماری ملاقات ہوئی ہو۔ پٹھان کو اپنی بیوی اور بچے کے ہمراہ ساگر تک جانا ہے لیکن ہم جنگل میں ہی اس کھیل کو ختم کر دیں گے۔"

گنیش کے چلے جانے کے بعد اس نے اپنے بقایا ساتھیوں کو رات کے وقت ہی ضروری ہدایات دے دی تھیں اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا تھا کہ چونکہ زنانہ سواری ہمارے ساتھ ہے اس لیے کسی قسم کی کوئی بدتمیزی سفر کے دوران میں نہ ہو۔ اس کے بعد اس نے رامو سے علیحدگی میں کہا تھا: "ممکن ہے بیگم کے ساتھ اس کی کوئی کنیز وغیرہ بھی ہو۔ اور اس کو دیکھ کر تم مجنوں نہ بن جانا۔ اب ہم لوگ بوڑھے ہو چلے ہیں۔"

یہ ساری باتیں اپنے ساتھیوں کو سمجھانے کے بعد جب امیر اکیلا رہ گیا تو رہ رہ کر بیگم کا خیال اس کے دل و دماغ پر چھاتا رہا۔ پٹھان کے جانے کے بعد ناگر سیٹھ کی حویلی میں ناگر سیٹھ نے اُسے ہوشیار کرتے ہوئے کہا تھا: "میاں بُرا نہ ماننا اور اس بات کا خیال رکھنا کہ یہ پٹھانی بیگم مجھے کچھ اور ہی خیالات کی عورت لگتی ہے۔"

یہ سن کر امیر چونک پڑا تھا اور سانس روک کر اس کی بات سننے لگا تھا۔ ناگر سیٹھ نے آگے کہا تھا: "میں آپ سے کچھ چھپانا نہیں چاہتا۔ جب وہ بیگم میرے پاس زیورات کی خریداری کے لیے آئی تھی تو آپ پر اس کی نظر پڑ گئی تھی۔ پھر نہ جانے کیسے اُسے آپ کے سفر کا علم ہو گیا اور وہ دوسرے ہی روز زیورات میں کسی چیز کی کمی کا بہانہ کر کے پھر میری حویلی میں آ گئی۔ اور مجھ سے آپ کے متعلق پوچھ گچھ کرنے لگی۔ اُس نے مجھ سے آپ کی گھریلو زندگی کے بارے میں، آپ کے کاروبار کے بارے میں اور آپ کے بال بچوں کے بارے میں بہت سارے سوالات کُرید کُرید کر پوچھے تھے۔ اور پھر مجھ سے کہا تھا کہ آپ میرے خاوند کو سمجھائیں کہ سفر میں اگر جانا ہے تو میر صاحب کے ساتھ ہی جانا چاہیے۔" یہ سن کر میں گھبرا گیا تھا کیونکہ مجھے بیگم کے ارادے کچھ اچھے نہیں لگ رہے تھے۔ مجھے تو یہ بھی نہیں لگتا کہ وہ کسی خاندانی گھرانے کی لڑکی ہے۔ بلکہ میری سمجھ میں تو یہ بات آتی ہی نہیں ہے کہ اُس پٹھان نے کس طرح اس کو اپنی بیوی کی حیثیت سے قبول کیا ہے؟ مگر خیر جانے دیں ہمیں کسی کے ذاتی معاملات میں دلچسپی لینے کی ضرورت ہی کیا ہے؟"

ناگر سیٹھ کی یہ باتیں سُن کر اُس وقت وہ بہت اُلجھ گیا تھا اور ناگر سیٹھ سے پوچھ بیٹھا تھا: "لیکن سیٹھ جی! میرے بارے میں اس کے کیا ارادے ہو سکتے ہیں؟"

"یہ ہی تو میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔" ناگر سیٹھ عجیب سے لہجے میں بولا: "عورت کے پیٹ میں کیا پاپ ہوتا ہے اس کا علم تو کسی کو بھی نہیں ہو سکتا۔ مجھے تو آپ سے یہ ہی کہنا ہے کہ سفر کے دوران اس خوبصورت بلا کی طرف لالچی نظر سے دیکھنے کی ضرورت ہی مت محسوس کیجیے گا۔ ویسے بھی پٹھان مرد جذباتی اور غصے والے ہوتے ہیں۔ انھیں اگر ذرا بھی شک ہو جاتا ہے تو وہ خانہ خراب کر ڈالتے ہیں۔ بس آپ جیسے سمجھدار کے لیے اتنا ہی اشارہ کافی ہے۔"

"آپ بالکل بے فکر رہیں سیٹھ جی!" کہہ کر امیر نے اپنے دل میں دبا ہوا سوال پوچھ ہی لیا: "کیا وہ واقعی اتنی حسین ہے؟"

اُس کے اس سوال کا جواب ناگر سیٹھ نے ذرا تاخیر سے دیتے ہوئے کہا تھا: "ہاں میر صاحب! عمر میں تو وہ آپ سے چھوٹی نہیں ہوگی لیکن اس کے بول چال اور آواز میں ابھی بھی جوانی کا جوش محسوس ہوتا ہے۔"

"آپ اس پٹھان کو خان صاحب کہتے ہیں اور اس کی عورت کو بیگم کہتے ہیں۔ تو کیا یہ خان صاحب کوئی نواب نہیں ہیں؟"

"ارے نہیں بھائی! یہ خان کسی نواب کے دُور کا رشتہ دار ہوتا ہے۔" ناگر سیٹھ نے نرم لہجے میں کہا: "میں اس کی بیوی کو بیگم بلوانے کا شوق ہے۔ اور اپنے گاہکوں کو بیگم تو کیا مہارانی یا راجا کہنے میں بھی ہمیں کیا اعتراض ہے؟"

تب امیر نے اُٹھتے ہوئے ایک اور سوال پوچھ

ہی لیا۔" سیٹھ جی! اُس بیگم کا آپ نے کیا نام بتایا تھا؟"

"میں نے آپ کو اس کا نام بتایا ہی کب ہے؟" ناگر سیٹھ نے فوراً ہی کہا۔ "ویسے آپ جاننا چاہتے ہیں تو بتا دیتا ہوں کہ اس کا نام ہے ممتاز بیگم۔"

"ممتاز۔۔ بیگم" وہ اپنے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سوچنے لگا کہ یہ نام بھی کافی پُرکشش ہے۔۔

اور اس وقت رات کی تنہائی میں امیر کو بار بار یہ نام یاد آ رہا تھا۔ کوئی شخص جب کسی کو کسی سے ہوشیار رہنے کی تاکید کرتا ہے تو آدمی اُس کے بارے میں زیادہ سوچنے لگتا ہے کہ اُسے ایسی تاکید کیوں کی گئی ہے؟ اور اس وقت امیر کی بھی کچھ ایسی ہی حالت تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ سفر کے دوران ایک بار تو وہ اس عورت کی خوبصورتی کو دیکھ لینے کی کوشش تو ضرور ہی کرے گا۔ آخر کار اُسے مار ہی توڑ النا ہے۔

لیکن اُس نوعمر لڑکے یوسف کا کیا کیا جائے؟

یکا یک یہ سوال اس کے ذہن میں اُبھرا اور پھر اچانک ہی اس کے دماغ میں ایک جھماکہ سا ہوا۔ اُسے روشن کے کہے ہوئے الفاظ یاد آنے لگے۔ "اگر لڑکا لانا تو اپنے جیسا ہی خوبصورت لانا۔"

تو کیا قدرت نے روشن سے کیا ہوا وعدہ پورا کرنے کے لیے ہی اس کے لیے یہ حالات پیدا کیے ہیں؟ یوسف بالکل اسی کی طرح تو لگتا ہے۔ وہ ابھی نوعمر ہے۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ پہلی بار جب وہ خود روشن سے ملا تھا تو اس کی اپنی عمر بھی تو اتنی ہی تھی۔ گود لینے کے لیے اتنا نوعمر لڑکا اور کہاں ملے گا؟ لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ایک بار وہ پھر اُلجھ گیا۔ اس کے ماں باپ کو اس کی موجودگی میں اس کی نظروں کے سامنے قتل کر کے اسے بہلا پھسلا کر گھر کیسے لے جایا سکتا ہے؟ اس کے دل سے ماں باپ کی یاد اور اس کے ماضی کو کیسے بھلایا جا سکتا تھا؟ وہ تو کافی سمجھدار ہو چکا ہے۔ نہیں۔۔ نہیں۔۔ اتنے بڑے لڑکے کو زندہ رکھنا خود اُس کے لیے بھی خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔

وہ کروٹیں بدل بدل کر اسی اُلجھن کا حل تلاش کرتا رہا۔ اس کا دل اب ایک بھونرے کی طرح ایک ہی خیال کے گرد منڈلا رہا تھا کہ اسے کوئی نہ کوئی فیصلہ تو کرنا ہی پڑے گا۔ کچھ بھی ہو وہ اُس لڑکے کی جان تو ہرگز ہرگز نہیں لے گا۔ وہ کوشش کرے گا کہ یوسف کو اس بات کا علم ہی نہ ہونے دے کہ اس کے ماں باپ کا قاتل وہ خود ہے۔ سفر کے دوران وہ اس لڑکے کا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کرے گا اور اس کا پیار جیت لے گا۔

لیکن تب ہی ایک دوسرے خیال نے اسے گھیر لیا جس طرح روشن کو ایک بیٹے کی ضرورت ہے اسی طرح خود اسے اپنی بیٹی معصومہ کے لیے ایک نوجوان کی ضرورت ہے۔ چاہے اس کی بیٹی مولوی کی بیٹی ہی کیوں نہ کہلوائے لیکن وہ خون تو اُسی کا ہے۔ اور اپنے خون کا خیال کرنا اور اُس کے بھلے کی سوچنا تو اُس کا فرض ہے۔ روشن اگر یوسف کو اپنا بیٹا بنانے پر رضامند ہو گئی تو وہ اس کے سامنے ایک شرط رکھے گا کہ یوسف کی شادی اُسے جالان کے مولوی کی بیٹی معصومہ سے کرنا پڑے گی کیونکہ اس نے جالان کے مولوی سے وعدہ کیا ہوا ہے کہ اس کی بیٹی کے لیے وہ کوئی خاندانی نوجوان کا رشتہ لائے گا۔

اس طرح اگر روشن مان گئی تو اس کی بیٹی کا گھر آباد ہو جائے گا اور یوسف کے ساتھ وہ سُکھ چین کی زندگی گذار سکے گی۔ ایسا ہو گیا تو وہ یہ سمجھ لے گا کہ خدا نے اس کی ہر خواہش پوری کر دی ہے۔ امیر ایسے ہی منصوبے بناتا رہا اور پھر آدھی رات کے بعد وہ گہری نیند میں سو گیا۔

●

صبح آنکھ کھلتے ہی سب سے پہلے رامو کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ "امیر میاں! اٹھ جاؤ۔ میں نے اور رُوپ سنگھ نے شگون دیکھ لیا ہے۔ اشارہ کافی اچھا ملا ہے۔"

پھر وہ آنکھیں ملتا ہوا سرائے کے باہر آیا تو اسے پٹھان اپنی زنانہ سواری کے ساتھ آتا دکھائی دیا۔ پٹھان کا گھوڑا کافی برق رفتار اور چست دکھائی دے رہا تھا جس کی پیٹھ پر پٹھان بڑے رُعب دارانہ انداز میں بیٹھا

ہوا تھا۔ اس کے گھوڑے کے پیچھے ریشمی پردوں سے ڈھکی ہوئی ایک پالکی تھی اور ٹمٹو پر سوار یوسف پالکی کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا اپنی ماں سے باتیں کر رہا تھا۔

"السلام علیکم چچا جان!" یوسف نے دور سے ہاتھ اٹھا کر اسے سلام کیا تو اس کا جی چاہا کہ وہ آگے بڑھ کر اُسے اپنے سینے سے لگا لے۔ اِس نوجوان یوسف میں اب اُسے اپنا دا: دنظر آنے لگا تھا۔

"وعلیکم سلام" جواب دینے کے بعد امیر اپنا لباس تبدیل کرنے کے لیے جلدی سے سرائے کے اندر چلا گیا۔

"آج کی صبح کس قدر حسین ہے۔" امیر اپنے سر پر پگڑی باندھتے ہوئے بڑبڑایا۔ "آج دل خوشی سے اس طرح جھوم رہا ہے جیسے گھر میں بیٹی کی شادی ہو رہی ہو۔"

امیر کو دل ہی دل میں یہ یقین سا ہو گیا تھا کہ یہ سفر اس کی زندگی میں خوشیاں لے کر آئے گا۔ لیکن شاید وہ یہ بھول گیا تھا کہ انسان کی بدنصیبی کبھی کبھی خوشیوں کا بھیس بدل کر بھی اُس پر حملہ آور ہوتی ہے اور تب ساری خوشیاں خواب و خیال بن کر رہ جاتی ہیں۔

●

"میر صاحب! ہماری جان پہچان کو تو ابھی صرف ایک ہفتہ ہی ہوا ہے لیکن یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم برسوں سے ایک دوسرے کے دوست ہیں۔" پٹھان اپنی ہتھیلی سے اپنے چہرے کا پسینا پونچھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "آپ جیسا ہم سفر اگر ساتھ ہو تو سفر کی ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے۔"

"آپ نے تو میرے مُنھ کی بات چھین لی ہے خان صاحب" امیر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "زنانہ سواری کی وجہ سے پہلے تو میں آپ کو ہم سفر بنانے میں ہچکچا رہا تھا۔ کیونکہ بیوی بچوں کے ہمراہ سفر کرنے والے مسافر سفر کے دوران ان کی دیکھ بھال میں زیادہ اُلجھ جاتے ہیں۔ اس لیے ہم جیسے لوگوں کو ان کے ساتھ چلنے میں دشواری ہوتی ہے۔ لیکن آپ کو ہم سفر بنا کر تو مجھے ایک اور ہی تجربہ ہوا ہے۔ آپ تو مجھے اپنا ہی آدمی سمجھ کر ہر وقت میرے ساتھ ہی ساتھ رہے ہیں اور پچھلے چار دنوں سے تو میرا کھانا بھی آپ کے ساتھ پکتا ہے۔" اتنا کہہ کر امیر ایک پل کے لیے رُکا پھر اچانک ہی آگے بول پڑا۔ "میرا خیال ہے کہ میری وجہ سے بیگم بانو کو بڑی تکلیف ہو رہی ہے۔۔۔"

"ارے میاں! آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟" پٹھان نے پیچھے آتی ہوئی زنانہ سواری پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا "آپ نے تو مجھ سے زیادہ اس کا دل جیت لیا ہے۔"

"کس کا دل؟" امیر ایک جھٹکے سے چونک پڑا۔ "کیا آپ کو مجھ پر کسی قسم کا کوئی شک۔۔۔"

"ہا۔۔ ہا۔۔ ہا۔" پٹھان ایک قہقہہ لگا کر ہنس پڑا پھر گھوڑے کی گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ "آپ بھی کمال کے آدمی ہیں۔۔ ارے میں تو دل جیتنے کی بات کر رہا ہوں اس میں شک کی کیا بات ہے؟"

"شاید اپنے بیٹے کے بارے میں کچھ کہہ رہے تھے۔" امیر اپنی بھول سُدھارتے ہوئے بولا۔ "دراصل میرا خیال تھا کہ سفر میں عورت کی موجودگی کی وجہ سے فساد کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔"

"تو کیا آپ کو کوئی ایسا تجربہ ہو چکا ہے؟" پٹھان نے پُرمذاق لہجے میں یہ سوال پوچھا تھا۔ لیکن امیر کے دل میں تو یہ سوال تیر کی طرح آ لگا تھا۔ ناگر سیٹھ نے اسے تاکید کی تھی کہ پٹھان کی بیوی سے ہوشیار رہنا۔ وہ بہت ہی خطرناک عورت دکھائی دے رہی ہے۔

آٹھ دنوں کے اس سفر میں امیر نے کئی بار ترچھی نظروں سے اس پردہ نشین بیگم کی چال ڈھال دیکھی تھی۔ اس درمیان اُس نے اُس کے بیٹے یوسف کے بارے میں بھی کچھ جاننے کی کوشش کی تھی۔ خان صاحب کے ساتھ کھانا کھاتے وقت اکثر اس کی نگاہیں باریک پردے کے پیچھے بیٹھی ہوئی بیگم کی جانب اُٹھ جاتی تھیں۔ کنیز کھانا لگاتے ہوئے اُس کے آگے ایک ایک چیز سرکاتی جاتی تھی۔ اور یہ دیکھ کر اس نے یہ ہی سمجھا تھا کہ بیگم کی خاص تاکید کی وجہ سے ہی کنیز اس پر خاص توجہ دے رہی ہے۔

ابھی تین روز قبل کا واقعہ بھی اس کے ذہن میں تازہ تھا۔ اُس وقت خان صاحب اپنے بیٹے کو لے کر ندی میں نہانے کے لیے گئے ہوئے تھے۔ اور امیر سر کے درد کی وجہ

سے اپنے خیمے میں پڑا ہوا تھا۔ لیکن اصل بات یہ تھی کہ وہ سرور دکا بہانہ بنا کر ان کے ساتھ ندی پر نہیں گیا تھا۔ دراصل وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ خان صاحب کی موجودگی میں اُس کی بیگم کیا کرتی ہے؛ یا پھر شاید وہ خود ہی یہ چاہتا ہو کہ بیگم کی جانب سے کسی قسم کی کوئی ہلچل ہو۔

کچھ بھی ہو لیکن امیر اپنے خیمے میں بیٹھا بیٹھا کسی شے اور انوکھے واقعے کے ظہور پذیر ہونے کا منتظر تھا۔ ناگر سیٹھ نے اُسے جو تاکید کی تھی اسی تاکید نے اُس کے دل میں تجسس پیدا کر دیا تھا۔ آس پاس کے خیموں میں خان صاحب کے اور اس کے گنے چُنے آدمی موجود تھے کیونکہ بہت سے لوگ ندی پر نہانے چلے گئے تھے اور کئی ایک نزدیکی گاؤں میں خریداری کے لیے جا چکے تھے۔ اس طرح کچھ گنے چُنے لوگ ہی تھے جو اس وقت آرام کر رہے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ اگر واقعی بیگم رنگیلی مزاج کی عورت ہے تو وہ اس موقعے سے ضرور فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے گی۔

وہ اسی اُدھیڑ بُن میں بیٹھا تھا کہ اچانک اُسے انسانوں کے دل پر ہنسی آ گئی اور وہ سوچنے لگا کہ آخر وہ بیگم سے کس قسم کی توقع کر رہا ہے؛ کہیں وہ خود بیگم سے کوئی کھیل کھیلنے کی کوشش تو نہیں کر رہا ہے؛ بیگم چاہے جیسی بھی ہو لیکن اُسے ایسا کوئی موقع دینے کی ضرورت ہی کیا ہے؛ جس عورت کی صورت شکل بھی اس نے نہیں دیکھی ہے اس کے لیے وہ اس قدر بے چین کیوں ہو رہا ہے؟

اچانک چوڑیوں کے کھنکنے کی آواز سن کر وہ چونک کر اُٹھ بیٹھا اور پلٹ کر خیمے کے دروازے کی جانب دیکھا تو اس کی توقع کے خلاف اُسے وہاں بیگم کی بجائے اس کی کنیز کھڑی ہوئی دکھائی دی۔

"مالک میں آپ کے لیے شربت لائی ہوں۔"

"شربت؟" امیر نے اس طرح چونک کر کنیز کی طرف دیکھا جیسے یہ بات اُسے بڑی عجیب سی لگ رہی ہو۔

"جی ہاں۔ یہ بیگم صاحبہ نے بھیجا ہے۔" اتنا کہہ کر کنیز نے چوکنا نظروں سے چاروں طرف دیکھا اور اس کی یہ حرکت امیر سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔ چند لمحوں بعد کنیز نے دھیمی آواز میں کہا: "انھوں نے کہا ہے کہ آپ کے سر میں درد ہے یہ شربت پی لیں تو ذرا راحت محسوس ہو گی۔"

امیر کے ہونٹوں پر ایک میٹھی مُسکراہٹ دوڑ گئی۔ اور شربت کا پیالہ بھی اس نے مُسکراتے ہوئے کنیز کے ہاتھوں سے لے لیا۔ پھر پیالے کو ہونٹوں سے لگانے کے بعد وہ لطف لے لے کر اس طرح ایک ایک گھونٹ بھرنے لگا جیسے خود بیگم اس کے سامنے کھڑی ہو اور اپنی قسم دے کر اسے شربت پلا رہی ہو۔

"میری طرف سے بیگم کا شکریہ ادا کر دینا۔" کنیز کے ہاتھ پیالہ واپس کرتے وقت اُس کے مُنھ سے نکل گیا۔ "بغیر جان پہچان کے اس قدر مہمان نوازی پر میں ان کا احسان مند رہوں گا۔"

"لیکن آپ خان صاحب کے سامنے اس بات کا کوئی ذکر مت کیجیے گا۔" کنیز نے پھر اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد دھیمے لہجے میں کہا تو امیر نے ایک پُرکیف سرسراہٹ سی اپنے اندر محسوس کی اور پھر انجان بن کر پوچھ بیٹھا۔

"کس بات کا ذکر؟"

"یہ ہی کہ بیگم صاحبہ نے آپ کے لیے شربت بھیجا تھا۔" کنیز نے کہا: "عورت اگر کوئی بات اپنے شوہر سے چھپانے کے لیے کہے تو اس کا مطلب کیا ہوتا ہے؟" امیر کا جی چاہا کہ وہ کنیز سے یہ سوال پوچھ لے کہ اس میں چھپانے کی بھلا بات ہی کیا ہے، شربت کا ایک پیالہ بھیجنے میں آخر بیگم صاحبہ سے کون سا ایسا گناہ سرزد ہو گیا ہے؛ لیکن اس طرح کے سوال پوچھ کر وہ خود بیگم کی نظروں میں بے وقوف ثابت ہونا نہیں چاہتا تھا۔ اسی لیے اپنا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے اُس نے کہا: "اُن سے کہنا کہ ایسا خوشبودار شربت میں نے آج کافی سالوں کے بعد پیا ہے۔ اس کے پینے سے میرے سر کا درد تو ہلکا ہو گیا لیکن دل میں کسی کی یاد کا درد تازہ ہو گیا ہے۔"

یہ سن کر کنیز نے مسکراتے اور لچکتے ہوئے ایک بار پیچھے مڑ کر دیکھا۔ پھر لہک کر خیمے سے باہر نکلتی چلی گئی۔ اُس کے اس طرح اچانک چلے جانے سے امیر کو لگا کہ وہ اپنی بیگم سے اُس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے کچھ زیادہ ہی بے چین ہو گئی ہے۔ امیر کو جس کی توقع تھی وہ بات ہو چکی تھی۔ اور اب وہ یہ سوچ رہا تھا کہ کہیں اس نے جلد بازی کا مظاہرہ تو نہیں کر دیا؛ کنیز سے اس قسم کی بات کر کے اُس نے کوئی غلط فہمی تو پیدا نہیں کر دی؛ اس شربت کے پینے سے سر کا درد تو ہلکا ہو گیا ہے لیکن دل میں کسی کی یاد کا درد تازہ ہو گیا ہے۔ آخر اس طرح کی بات کا مطلب کیا تھا؛ کون سا درد تازہ ہو گیا ہے؛ اُسے یاد آ رہا تھا کہ ایسا ہی خوشبودار شربت اس نے پہلے بھی ایک دو بار پیا تھا۔ اچانک اُسے یاد آ گیا کہ اُسے یہ ہی شربت زہرہ نے پلایا تھا۔ بالکل ایسا ہی نشہ آور، کیف آور اور خوشبودار شربت... اس خیال کے آتے ہی امیر کے دل میں سچ مچ کوئی درد ٹیسیں مارنے لگا۔ اپنے پہلے پیار اور زندگی کی پہلی محبت کا درد...

"میاں! آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا؛" خان صاحب کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ "لگتا ہے کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے ہیں؟"

"ایں... ہاں ہاں۔" امیر نے گھبرا کر دوسری جانب مُنھ پھیر لیا اور یہ یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا کہ خان صاحب نے اس سے کیا پوچھا تھا؛ ہاں۔ اُسے یاد آ گیا کہ خان صاحب نے کسی عورت کے تجربے کے بارے میں ہی اُس سے پوچھا تھا۔

"آپ نے ایسا سوال پوچھ لیا ہے خان صاحب!" امیر اب خواب اور خیال کی دنیا سے لوٹ آیا تھا: "کہ پرانا درد تازہ ہو گیا۔"

"کیسا درد میاں؟"

"کسی عورت کی محبت کا درد خان صاحب!"

"ارے بھئی آپ تو مذاق کو بھی درد کہنے لگے ہیں۔" خان صاحب اس طرح بولے جیسے انھیں جلدی بڑی ہو۔ "آپ کی خوبصورتی نے تو جوانی میں بہت سی حسیناؤں کو گھائل کیا ہو گا۔"

امیر نے شرمانے کی اداکاری کی تو خان صاحب نے کہا: "دیکھیے اس وقت، آپ کا چہرہ اُن رنگین یادوں کی جگمگاہٹ کھا رہا ہے۔ اب اپنی زندگی کا ایک آدھ دلچسپ قصہ آپ سنا ہی دیں۔"

یہ سن کر امیر کو اُس پر تھوڑا غصہ تو آ ہی گیا مگر وہ کچھ کہنے کی بجائے سوچنے لگا کہ کیسے کیسے اتفاقات پیدا ہونے لگے ہیں۔ وہ اس وقت اس شخص کی بیوی کے خیالوں میں اُلجھنا چاہتا ہے اور یہ شخص اس وقت مجھ سے کسی عورت کی کوئی رومانی داستان سننا چاہتا ہے۔ ناگر سیٹھ کے کہنے کے مطابق اگر یہ شخص واقعی شکی مزاج ہے تو ضرور یہ اس سے کوئی چالاکی کر رہا ہے۔ ممکن ہے میری محبت کی رنگین داستان سن کر وہ یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا ہو کہ وہ بھروسے کے لائق آدمی ہے یا نہیں؟

اب امیر چوکنا ہو گیا اور بولا: "خان صاحب! میں آپ کو ایک رنگین داستان سنا سکتا ہوں لیکن ایک شرط پر۔" پھر اس نے پلکیں جھپکا کر شرط پیش کر دی: "آپ کو بھی کوئی ایسا ہی واقعہ سنانا پڑے گا کیونکہ پٹھانوں کی محبت تو مردوں کی محبت کہلاتی ہے۔"

"ہا... ہا... ہا۔" خان صاحب زور سے ہنس پڑے۔ "میاں آپ تو بے حد دلچسپ آدمی نکلے۔ مگر مجھے آپ کی شرط منظور ہے۔ میں نے جوانی بھرپور انداز میں گذاری ہے۔ میری داستان سن کر آپ خوش ہو جائیں گے۔"

یہ سن کر امیر نے بات کو آگے بڑھانے کی غرض سے کہا: "مگر خان صاحب آپ پر ابھی تک بڑھاپا کہاں آیا ہے؛ ویسے بھی ایک مرد آدمی کی طبیعت تو آخر تک رنگین ہی رہتی ہے۔"

"واہ میاں! بہت اچھے۔" خان صاحب خوش ہو کر بولے: "آپ تو بات بات میں شاعری کرنے لگتے ہیں۔" اتنا کہہ کر خان صاحب یکایک سنجیدہ ہو گئے پھر گھمبیر لہجے میں بولے: "لیکن ایک عورت نے ہمارا غرور اتار دیا ہے۔"

"کون عورت خان صاحب؟" امیر کو تجسس نے بے قرار کر دیا۔

اُس کے اس سوال کا جواب دینے کے لیے وہ امیر کے قریب کھسک کر اس کے کان میں بولنے لگے۔ اس پالکی والی

بیگم نے میرا پانی اتار رکھا ہے۔ اپنی بیوی کی بات پرائے آدمی سے نہیں کرنا چاہیئے لیکن اب آپ پرائے کہاں ہیں؛ میری بیوی اتنی خطرناک ہے کہ اب مجھے باہر نظر ڈالنے ہی نہیں دیتی۔ اس نے تو ہمارے پیروں میں زنجیر ڈال رکھی ہے۔"

بیوی کے لیے لفظ خطرناک کا لفظ سُن کر امیر چونک پڑا تو کیا خان صاحب اپنی بیگم سے ڈرتے ہیں؛ یا پھر کہیں ایسا تو نہیں کہ اسے بنانے کے لیے وہ اس قسم کی باتیں گھڑ رہے ہیں؛ عورت سے ڈرنے والا شخص اکثر باہر اس طرح کا دکھاوا کرتا ہے کہ وہ بہت رنگین مزاج آدمی ہے۔

"معاف کیجئے گا خان صاحب!" امیر نے سنبھل کر کہا "شوہر کو اپنی محبت میں جکڑ کر رکھنے والی بیوی کو تو خطرناک کہا ہی نہیں جاسکتا۔"

"واہ جناب واہ۔ آپ نے تو میری بیوی کی طرفداری شروع کردی۔" امیر نے محسوس کیا کہ خان صاحب کے لہجے میں کوئی بناوٹ نہیں تھی۔ میر صاحب! پیار و یار کی باتیں تو اب جانے دیں۔ میری شادی کو تو اب بیس برس ہوچکے ہیں۔ میں تو اس کی خوبصورتی میں جکڑا ہی ہوا ہوں۔ میں نے تو ایک ہی نظر میں اُسے دیکھ کر یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ اگر اس عورت کو قابو میں نہ کیا تو پٹھان کا بچہ نہیں۔"

"پھر؟"

"پھر کیا۔ میں نے اس کی خوبصورتی پر تو قبضہ کرلیا لیکن بعد میں وہ آگ نکلی۔"

"آگ سے مطلب؟"

"میاں! اب ناسمجھ بننے کی کوشش تو نہ کریں۔" خان صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اس کی آگ جیسی خوبصورتی جلاتی ہی رہتی ہے۔ دور رہتا ہوں تو تپش لگتی ہے۔ نزدیک رہوں تو اور بھی جلن ہوتی ہے۔" اتنا کہہ کر خان صاحب کو خیال آیا کہ وہ کچھ زیادہ ہی بول گئے ہیں۔ اس بات کا خیال آتے ہی انھوں نے امیر کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے ہنس کر کہا۔ "میاں! آپ بھی چالاکی سے کام لے رہے ہیں۔"

"کیسی چالاکی خان صاحب؟" امیر چونک کر بولا۔

"کیا میری ساری نجی باتیں آپ کو جان لینی ہیں؟" خان صاحب نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔ "اور اپنی داستان تو شائد آپ سنانا ہی نہیں چاہتے۔"

امیر کو اب یہ خان صاحب بہت بھولے لگنے لگے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ یہ شکار اتنا بے وقوف ہے کہ خود ہی اس کے جال میں پھنسنے کے لیے بے چین ہوا جا رہا ہے۔

"خان صاحب! اپنی پہلی محبت کی رنگین داستان میں آپ کو ضرور سناؤں گا۔" امیر نے چند لمحوں کی تاخیر کے بعد جواب دیا۔ "وہ عورت بھی آگ کی طرح گرم تھی لیکن افسوس۔" امیر نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے آگے کہا۔ "وہ بے وفا نکلی مجھے دھوکہ دے کر چلی گئی اور اس کی خوبصورتی کی آگ اب بھی مجھے جلا رہی ہے۔"

"لیکن اب وہ ہے کہاں؟"

"اسی کا تو علم نہیں ہے۔" امیر کی آواز میں درد کی جھلک نمایاں تھی۔ "جب جب حیدرآباد جاتا ہوں تب تب اس کو تلاش کرتا ہوں۔ ایک بار اگر وہ مل جائے تو اس سے بے وفائی کا بدلہ لے لوں۔ میں جب تک اس سے بدلہ نہیں لے لیتا اس وقت تک شائد میرے دل کو چین نہیں پڑ سکتا۔"

"ہائے ہائے یار!" خان صاحب پٹھانی لہجے میں بول اٹھے۔ "محبت کی رنگینی کی بجائے یہ آپ غم گینی کی داستان بول سنانے لگے ہیں؛ عورت تو زندگی کا کھلونا ہے۔ اور مرد کا کام اس سے کھیلنا اور کھلانا ہے۔ وفا اور بے وفائی کی بات بھول جائیں میر صاحب!"

"لیکن اس نے مجھ سے شادی کرنے کا وعدہ کیا تھا۔"

"شادی سے پہلے کی ہر بات معاف ہوتی ہے میاں!" ہنستے ہنستے خان صاحب یکایک سنجیدہ ہوگئے۔ "لیکن ہاں شوہر بن جانے کے بعد عورت اپنے شوہر سے بے وفائی کرے تو پٹھان لوگ ایسی عورت کے دو ٹکڑے کر دیتے ہیں۔"

خان صاحب نے یہ الفاظ کچھ اتنے غصے سے کہے تھے کہ امیر کے جسم میں کپکپاہٹ سی دوڑ گئی۔ لیکن وہ سوچ کر سنبھل گیا کہ یہ خان تو صرف چند دنوں کا ہی مہمان ہے اس لیے اس کے غصے سے ڈر جانے کی ضرورت ہی کیا ہے؛ وہ دن دور نہیں جب اُس کا قاتل رومال اس کا خاتمہ کر دے گا۔

"خان صاحب! اپنی اس محبت کی داستان میں آپ کو ضرور سناؤں گا لیکن اس کے لیے آپ کو تھوڑا صبر کرنا ہوگا اگلے پڑاؤ پر رات کو آرام کرتے وقت ہم یادوں کی محفل سجائیں گے۔"

ٹھیک اُسی وقت خان صاحب کا بیٹا یوسف گھوڑا دوڑاتا ہوا اُن کے قریب آگیا اور بولا۔ "ابا جان! امی نے پوچھا ہے کہ شربت پینے کے لیے کیا تھوڑی دیر رک سکیں گے؟"

"میاں آپ کا کیا خیال ہے؟" اپنے بیٹے کی بات سن کر خان صاحب نے امیر کی طرف دیکھا۔ "سفر میں تھوڑی دیر ٹھہرنے کی جب بھی بات ہوتی تھی تو وہ امیر سے ضرور پوچھ لیا کرتا تھا تاکہ امیر اسے یہ طعنہ نہ دے سکے کہ سفر اُس کی زنانہ سواری کی وجہ سے ہی سُست پڑ گیا ہے۔"

"آپ ایک بار میری بیگم کے ہاتھوں کا شربت پی کر تو دیکھیں۔" خان صاحب نے پیار سے کہا۔ "اس کی خوشبو میں آپ کو انوکھی تازگی کا احساس ہوگا۔ شربت پینے کے بعد ہم لوگ فوراً ہی آگے روانہ ہوجائیں گے۔"

"جیسی آپ کی مرضی۔" امیر نے مطمئن لہجے میں کہا۔

"اگر آپ کی بات سچ ہوئی تو پھر میں یہ شکایت ضرور کروں گا کہ اتنے دنوں تک آپ نے مجھے وہ شربت کیوں نہیں پلوایا؟"

"چاچا!" نوعمر یوسف درمیان میں بول اٹھا۔ "آپ کی شکایت میں امی تک ابھی پہنچا دیتا ہوں۔"

"ارے ارے۔ میں تو مذاق کر رہا تھا۔" امیر گھبرائی ہوئی آواز میں کہہ اٹھا۔ "شکایت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" لیکن یوسف تو اس کی بات سنے بغیر ہی اپنی ماں کی پالکی کی طرف گھوڑا دوڑا چکا تھا۔ اُس کی پھرتی اور چالاکی دیکھ کر امیر کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک لہرانے لگی۔

شربت پینے کے بہانے آدھے گھنٹے تک وہیں ٹھہرنا پڑ گیا تھا۔ اس لیے امیر نے اپنے آٹھ دس ساتھیوں کو آگے روانہ کر دیا۔ خان صاحب کو کوئی شک نہ ہو۔ اس لیے اس نے خان صاحب کے سامنے ان لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ تم لوگ پیدل آگے بڑھو جب کہ ہم تھوڑی ہی دیر میں تم لوگوں سے آملیں گے۔ لیکن رامو کو تو اس نے الگ سے سمجھا دیا تھا کہ آگے جا کر گنیش کو پکڑ لو اور اسے مزید آگے جانے سے روک دو۔ کیونکہ اگلے پڑاؤ میں ہی ہمیں خان کا خاتمہ کر دینا ہے۔

امیر کی بے قراری بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ شربت والی بات ہر قیمت پر خان صاحب سے پوشیدہ رہنی چاہیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بیگم کی کنیز کسی بات پر یہ راز کھول دے تو یہ شکی مزاج پٹھان دوران سفر ساتھ چھوڑ کر ہی الگ نہ ہو جائے اور اس طرح اس کی ساری محنت پر پانی پھر جانے کا خطرہ پیدا ہو سکتا تھا۔ خان صاحب کا بیٹا یوسف بھی بار بار اس سے پوچھ رہا تھا: "چاچا! آپ کے گھر والے کہاں ہیں؟ آپ ہمارے ساتھ ساگر تک تو چلیں گے نا؟ آپ تھوڑے دنوں ہمارے مہمان رہیں گے نا؟"

امیر کو یوسف کی باتیں اچھی لگتی تھیں۔ لیکن یہ سارے سوالات اسے پسند نہیں تھے۔ اس کا خیال تھا کہ شائد اس کی ماں نے ہی اسے ایسے سوالات سکھا کر اس کے پاس بھیجا تھا۔ شائد بیگم اسے ساگر تک کھینچ کر لے جانا چاہتی ہے۔ اور اسے اپنا مہمان بنانا چاہتی ہے۔ آخر اس کے پیچھے بیگم کا کیا مقصد ہو سکتا ہے؟

واقعی یہ بیگم اب اسے خطرناک لگنے لگی تھی۔ وہ اس کے حسن کے جال میں پھنس کر کسی قیمت پر بھی ساگر جانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ساگر کے نام سے ہی اسے ایک جھٹکا سا لگتا تھا۔ کیونکہ ساگر شہر ہی تو ولیم سلومن کی چھاؤنی ہے۔ اس کا نام سن کر تو امیر کے بدن میں کپکپاہٹ سی دوڑنے لگتی تھی اور اسے یوں محسوس ہونے لگتا کہ کہیں اس کے ساتھ کوئی سازش تو نہیں کی جا رہی ہے؟ یہ بھی ممکن ہو کہ خود ناگر سیٹھ بھی اس سازش میں شریک ہو۔ سوچتے سوچتے اسے خان صاحب پر بھی شک ہونے لگا۔ کیونکہ وہ اس سے بے حد دوستانہ انداز میں پیش آ رہا تھا۔ اپنے ساتھ کھلانا پلانا اور ہر طرح کا خیال رکھنا اور محبت کی داستان میں دلچسپی لینا کیا ان سب باتوں کے پیچھے بھی کوئی چال ہے؟

آدمی کا دل و دماغ جب غلط راہ پر چلنے لگے تو وہ گھبرا جاتا ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے امیر کی حالت بھی کچھ ایسی ہی ہو گئی تھی۔ خان صاحب، بیگم اور یوسف ان تینوں کو وہ شک کی نظروں سے دیکھنے لگا تھا۔ لیکن اس شک میں اسے اپنی ہی بے وقوفی دکھائی دے رہی تھی۔ نہیں نہیں۔۔ وہ غلط باتیں سوچ کر خود ہی اپنے لیے الجھن پیدا کر رہا ہے۔ ولیم سلومن کو اگر اس کے سفر کی اطلاع ہوتی تو اب تک وہ اپنے سپاہیوں کے ساتھ اس کی ٹولی کو گھیر چکا ہوتا۔ آخر اسے اس طرح کا ناٹک رچانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ بھلے ہی یہ علاقہ انگریزوں کے قبضے میں نہ ہو لیکن اگر ولیم سلومن چاہے تو اُن کی گرفتاری کا پروانہ لے کر یہاں پہنچ سکتا ہے۔ سوچتے سوچتے اسے یقین آنے لگا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے اور وہ خود ہی وہم کا شکار ہو کر غلط انداز سے سوچنے لگا ہے۔

"کیوں میاں! آپ خاموش کیوں ہو گئے؟" امیر کا جواب نہ سن کر خان صاحب نے پوچھا: "لگتا ہے آپ کو گھر کی یاد ستانے لگی ہے۔ شائد بیوی سے جدائی۔۔"

"نہیں نہیں خان صاحب!" امیر چونک پڑا: "اب تو ہمارا دو چار دنوں کا ہی ساتھ ہے۔ پھر ہمارے راستے الگ الگ ہو جائیں گے۔ آپ ساگر کی جانب چل پڑیں گے اور ہم حیدر آباد کی طرف۔"

"اس کا مطلب ہے آپ ہمارے مہمان نہیں بنیں گے؟"

"مہمان؟" امیر بلاوجہ ہی چونک پڑا: "اس بارے میں ہمارے درمیان کوئی بات ہی کہاں ہوئی ہے؟"

"لیکن یوسف نے تو کہا تھا کہ آپ ساگر ضرور آئیں گے اور ہمارے گھر چند روز مہمان رہیں گے۔" خان صاحب نے کہا۔

"نہیں نہیں خان صاحب!" امیر کچھ اور بوکھلایا۔ "میں نے تو ہاں نہیں کی تھی۔ ممکن ہے یوسف نے خود ہی سمجھ لیا ہو۔"

"آپ کو میری طرف سے دعوت نہیں ملی تھی شائد اسی لیے آپ نے ہاں نہیں کی تھی۔" خان صاحب دھیمے لہجے میں بولے: "میں سچ کہہ رہا ہوں آپ سے اب کیا چھپانا؟ میں آپ کو اب ساگر آنے کی دعوت دیتا ہوں کیونکہ اپنے گھر جا کر پھر مجھے فوراً ہی حیدر آباد کے لیے روانہ ہونا ہے۔ یوسف کی منگنی ہم نے وہیں کی ہوئی ہے شادی کی تاریخ پکی کر کے بہو کو زیورات وغیرہ دے آؤں گا۔ آپ اگر ساگر تک آنے کی حامی بھر لیں تو ہم ساتھ ہی حیدر آباد چلیں گے۔"

"اوہ تو یہ بات ہے؟" امیر نے ایک گہرا سانس لیا اسے لگا کہ جس جگہ وہ جانا نہیں چاہتا۔ اُسی جگہ یہ شخص اسے کھینچ کر لے جانا چاہتا ہے کس لیے؟ ایک بار پھر اسے سازش کی بو آنے لگی تھی لیکن اس نے کوئی گھبراہٹ محسوس نہیں کی۔ اس لیے اس نے کسی جھجھک کے بغیر کہہ دیا۔ "اگلے پڑاؤ پر ہم اس بات کا فیصلہ کر لیں گے۔ اپنے کچھ لوگوں کو میں وہیں سے حیدر آباد کے لیے روانہ کر دوں گا اور چند لوگوں کو اپنے ساتھ رکھ لوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" کہہ کر خان صاحب نے اپنی مسرت کا اظہار کیا۔ اور پھر اپنے بیٹے کو آواز دے کر بولا: "یوسف بیٹے! تمھارے امیر چاچا نے ہماری دعوت قبول کر لی ہے۔"

خان صاحب کی آواز کے ساتھ امیر کی نظر بھی پالکی کی جانب اُٹھ گئی اور اسے لگا تھا کہ پٹھان کی آواز کے گونجتے ہی پالکی میں ذرا جنبش سی ہوئی تھی۔ ممکن ہے پالکی کے اندر بیٹھی ہوئی بیگم کو اس بات سے خوشی محسوس ہوئی ہو۔ لیکن امیر کوئی رائے قائم نہیں کر سکا۔

"ارے یہ سامنے تو کسی اور کا بھی پڑاؤ نظر آ رہا ہے" ڈھلتی ہوئی شام میں پٹھان نے انگلی کے اشارے سے امیر کی توجہ ایک جانب مبذول کرائی: "لگتا ہے یہ مسافروں کے ہی خیمے ہیں۔"

"کہاں؟" امیر نے انجان بن کر آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر دور نظر ڈالتے ہوئے کہا: "ٹھیک کہتے ہیں آپ، کوئی بڑا قافلہ لگتا ہے۔ میرا خیال ہے ہمیں بھی اسی جگہ پڑاؤ ڈال دینا چاہیے۔"

اُس کی بات سن کر خان صاحب کسی اُلجھن میں پڑ گئے یہ دیکھ کر کہ فوراً ہی امیر کو موقعے کی نزاکت کا احساس ہوا اور وہ بات کو سنبھالتے ہوئے بولا: "گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے خان صاحب! اگر وہ لوگ اچھے آدمی نظر آئے تب ہی ہم ان کے ساتھ رہ کر رات گذاریں گے نہیں تو نماز پڑھنے تک ٹھہریں گے اور پھر آگے بڑھ جائیں گے۔"

لیکن اس کے باوجود بھی خان صاحب کی پریشانی کم ہوتی دکھائی نہیں دی تو امیر کو اور تسلی سے انھیں سمجھانا پڑا: "آپ سب کچھ مجھ پر چھوڑ دیں خان صاحب! وہ دیکھیے سامنے سے ہمارا آدمی رامو آتا ہوا دکھائی دے رہا ہے وہ ان مسافروں کے بارے میں کچھ ضرور بتائے گا تو ہمیں پتا چل جائے گا۔"

رامو کے قریب آنے تک خان صاحب کی گھبراہٹ جوں کی توں اپنی جگہ پر قائم تھی۔ رامو کے آتے ہی امیر نے اُسے آنکھ مارتے ہوئے پوچھا۔

"رامو! یہ کن لوگوں کا قافلہ ہے؟"

"مالک! یہ کوئی بہت بڑا سوداگر لگتا ہے جو اپنے قافلے کے ساتھ حیدر آباد جا رہا ہے۔ لیکن جنگل کے راستے آگے جانے سے پہلے کسی اور قافلے کے ساتھ شامل ہونے کے لیے دو دن سے یہاں پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے۔"

یہ سن کر امیر نے مسکراتے ہوئے خان کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو خان صاحب! اب پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ ہمارا یہ رامو آدمی کو پہچاننے کی بے حد صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ کسی کو دیکھ کر ایک ہی نظر میں بتا سکتا ہے کہ یہ ساہوکار ہے یا بدمعاش۔

اتنی دیر میں اُن دونوں کے گھوڑے اس چھاؤنی کے قریب آپہنچے۔ امیر کچھ اس لیے بھی پریشان تھا کہ گنیش خان صاحب پر کوئی اچھا تاثر چھوڑ سکے گا۔ یا نہیں؟ خان صاحب پر سے خوف اور گھبراہٹ کے سائے ہٹنے ضروری ہیں۔ اس کے دل میں کسی شک کا شائبہ تک نہیں ہونا چاہیئے۔

جیسے جیسے ان کے گھوڑے قریب آتے جا رہے تھے ویسے ویسے چھاؤنی کے قریب کھڑے ہوئے لوگوں میں سے ایک بوڑھا آدمی خان صاحب کی نظروں میں کھٹکتا جاتا تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ امیر سے اس شخص کے بارے میں کچھ کہتا امیر خود ہی بول اٹھا: "ارے یہ تو کوئی شناسا سوداگر لگتا ہے۔" اس نے مُسکراتے ہوئے خان کی طرف دیکھا: "ہمارے استقبال کے لیے خود ہی آگے آرہا ہے۔ لگتا ہے یہ مجھے پہچانتا ہے۔" پھر جب دو چار قدموں کا ہی فاصلہ رہ گیا تو اچانک امیر خوشی سے چلّایا۔ "ارے گنیش بابو!"

"واہ رے امیر میاں!" سامنے سے آتے ہوئے گنیش نے کہا: "آپ اور اس طرح اچانک؟" وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر آگے بڑھا تو امیر بھی اپنے گھوڑے پر سے اُتر پڑا اور پُرجوش انداز میں گنیش سے بغل گیر ہوتے ہوئے بولا۔ "گنیش بابو! خدا کا یہ کیسا کمال ہے؟" بغل گیر ہوتے وقت اس نے گنیش کے کان میں دھیرے سے یہ کہہ دیا تھا کہ وہ زیادہ تر اُسے ہی بولنے دے۔ خان ان دونوں کی پُرانی جان پہچان اور دونوں کی اس اچانک ملاقات کو بڑی حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔

"گنیش بابو!" امیر گنیش سے الگ ہوتا ہوا بولا: "ہم پورے پانچ سال بعد ملے ہیں اور وہ بھی اس حالت میں۔" کہتے کہتے امیر کو خیال آیا کہ اب گنیش کا تعارف خان صاحب سے کرا دینا چاہیئے۔ اس خیال کے آتے ہی وہ خان کی جانب متوجہ ہو کر بولا: "خان صاحب! یہ گنیش بابو ہیں گھوڑوں کے مشہور سوداگر۔" لیکن اس کی بات سن کر بھی خان کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ نمودار نہیں ہوئی۔ گنیش کا چہرہ ہی ایسا تھا کہ کوئی اُسے پہلی نظر میں پسند کر ہی نہیں سکتا تھا۔ اس لیے امیر کو اس کی پہلی نظر کا یہ اثر دور کرنے کی کوشش کرنا پڑی۔

"ان کو دیکھتے ہی آپ کو یہ خیال بھی نہیں آئے گا کہ یہ کتنے شریف اور کتنے امیر آدمی ہیں۔"

مجبوراً خان کو بھی اب اپنے گھوڑے سے نیچے اُترنا پڑا لیکن اُس نے گنیش سے بغل گیر ہونے کی خواہش کا اظہار نہیں کیا۔ تھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر امیر نے ہی اس خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا: "خان صاحب! ہم دونوں نے دو تین بار اکٹھے سفر کیا ہے۔ آپ شاید یقین نہ کریں۔ ایک بار لٹیروں نے ہمیں گھیر لیا تھا۔ اور گنیش بابو نے اپنی تلوار کے وہ جوہر دکھائے کہ اُن میں سے ایک بھی زندہ واپس نہیں جا سکا۔" پھر چالاکی سے کام لیتے ہوئے آگے بولا: "ان کے چہرے پر یہ جو لمبے لمبے داغ دکھائی دے رہے ہیں۔ یہ ان کی شجاعت اور بہادری کے نشان ہیں۔"

خان اب ذرا ڈھیلا پڑ گیا تھا لیکن امیر کی بات سُن کر گنیش چونک پڑا۔ اُسے اچانک یاد آگیا کہ آج سے کئی سال قبل ابراہیم سردار نے ایک بار ایک پٹھان کو شکار کرنے کے لیے اس کے چہرے کے نشانات کے بارے میں اسی قسم کے الفاظ کہے تھے۔

پھر اس سے پہلے کہ بات آگے بڑھتی خان صاحب کا بیٹا یوسف اپنی والدہ کی پالکی کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔ خان نے گھور گھور کر گنیش کو دیکھا کہ زنانہ سواری کو دیکھ کر اس بدصورت شخص کے چہرے پر کیا تاثرات اُبھرتے ہیں؟ لیکن گنیش نے تو اپنی پلکیں تک اوپر نہ اٹھائی تھیں۔ یہ دیکھ کر اسے امیر کی کہی ہوئی بات سچ لگی کہ یہ شخص ویسا نظر آتا ہے ویسا نہیں ہے۔

"گنیش بابو! اب ہم لوگ بھی اسی جگہ پڑاؤ ڈال رہے ہیں۔" امیر نے خان صاحب کی اجازت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے کہا: "خان صاحب! آپ خیمے کے لیے کچھ دور پر کوئی اچھی سی جگہ پسند کر لیں۔"

خان کو حیرت ہو رہی تھی کہ امیر کی بات سن کر بھی گنیش نے کچھ نہیں کہا تھا۔

"گنیش بابو! یہ خان صاحب ساگر جا رہے ہیں بہت ہی شریف آدمی ہیں۔ ان کے ساتھ اِن کا بیٹا اور بیگم بھی ہیں اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو۔۔۔" امیر نے گنیش سے کہا۔

"ارے میر صاحب! آپ یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟" گنیش درمیان میں بول پڑا: "اتنا تو میں جانتا ہی ہوں کہ کوئی شریف آدمی ہی آپ کا ہم سفر ہو سکتا ہے۔ ویسے تو ہم لوگ عورتوں کو ساتھ لے کر سفر کرنا پسند نہیں کرتے۔"

اتنا سنتے ہی خان صاحب کی گھبراہٹ دور ہو گئی اور وہ یہ کہہ کر چل پڑے: "اچھا تو میں جا کر خیمے کے لیے کوئی مناسب جگہ تلاش کرتا ہوں تب تک آپ دونوں باتیں کریں۔"

خان صاحب اور اس کے بیٹے یوسف کے گھوڑے آگے بڑھے اور چار کہاروں نے بیگم کی جس پالکی کو اٹھا رکھا تھا وہ بھی ان دونوں کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔ جب وہ تھوڑی دور تک چلے گئے تو امیر نے دیکھا کہ پالکی کے پردے کا ایک کونا ہٹا کر اندر بیٹھی ہوئی بیگم نے اس کی جانب گردن گھمائی تھی۔ اس میں اب کسی شک کی گنجائش نہیں تھی کہ بُرقعے کی جالی میں سے وہ اُسے ہی دیکھ رہی تھی۔

یہ بات گنیش بھی نہ محسوس کر لے اس لیے امیر نے فوراً اپنا رُخ موڑ کر گنیش کے سامنے کر لیا پھر چند ہی لمحوں بعد گنیش نے اس خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا: "انھیں آج رات کو ہی ختم کرنا ہے نا؟"

"نہیں" امیر نے ایک بار پھر چور نگاہوں سے دور جاتی ہوئی پالکی کی جانب دیکھ کر کہا: "یہ کام ہم کل رات کو کریں گے۔ میں نے سب کچھ سوچ رکھا ہے۔ کل صبح کو میں قبر کے لیے جگہ پسند کر لوں گا اور رات کو محفل جمانے کے بہانے خان کو اپنے خیمے میں بلا لوں گا۔"

"کیسی محفل؟" گنیش نے قدرے حیرانی سے پوچھا۔

"بیمار و محبت کی داستان سنانے کی محفل۔" امیر کو ہنسی کی آتی جا رہی تھی: "عورت کی محبت اور قربت کی رنگین داستان بیان کرنی ہے۔ ابتدا میں خود کروں گا۔ میں نے سارا منصوبہ بنا رکھا ہے۔"

عورت اور محبت کا نام سنتے ہی اچانک گنیش کا ہاتھ اپنے جبڑے پر رینگنے لگا۔ پھر اس کی اُنگلی گال کے لمبے اور گہرے زخم کے نشان پر پھسلنے لگی۔ اس وقت اس کا چہرہ اور زیادہ بھیانک نظر آنے لگا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اُسے اپنی پہلی محبت کی کڑوی یاد آگئی ہو۔

اور امیر خود بھی اپنی پہلی محبت کی یادوں میں اُلجھتا جا رہا تھا۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ وہ خان صاحب کو زہرہ سے محبت کی داستان ہی سنائے گا۔

لیکن اُسے یہ کہاں معلوم تھا کہ پالکی میں بیٹھی ہوئی عورت ممتاز بیگم دراصل زہرہ ہی تھی۔ وہ تو اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ پالکی کے ساتھ ساتھ چلنے والا نوجوان یوسف خان صاحب کا بیٹا نہیں بلکہ وہ زہرہ اور اس کی محبت کی یادگار ہے۔ وہ تو کبھی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یوسف اس کا سگا بیٹا ہے۔

●

صبح کو آنکھ کھلتے ہی امیر کی آنکھوں میں گذشتہ شام کا منظر تازہ ہو گیا جب پالکی کے اندر پردے کے پیچھے بیٹھی ہوئی بیگم پر وہ بیٹھا کر بہت دیر تک اُسے دیکھتی رہی تھی اور اب وہ یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ اُسے بیگم سے نفرت ہے یا اُس کا دل اُس کی محبت میں کھنچا جا رہا ہے؟ لیکن اس سے فرق بھی کیا پڑ سکتا ہے؟۔ آخر وہ اب ایک ہی دن کی تو مہمان ہے۔ رات کو اُس کے ہاتھوں ہی پردے میں پوشیدہ رہنے والا اس کا حُسن مُرجھا جائے گا اور اُس کی صُراحی دار گردن اینٹھ جائے گی لیکن پھر بھی اُسے موت کی نیند سُلا دینے سے پیشتر وہ اس خطرناک عورت کا چہرہ تو ایک بار ضرور ہی دیکھ لے گا۔ شاید اُس وقت وہ سوئی ہو گی اور اُبھرتی بیٹھتی سانسوں کی وجہ سے اُس کا حُسن تھرک رہا ہو گا۔ اُس کے چہرے پر اُس کا مغرور شباب چھلک رہا ہو گا۔ ممکن ہے نیند میں وہ اُس کے ہی سپنے دیکھ رہی ہو۔ ایسے میں وہ اُسے دھیرے سے چھو کر جگا دے گا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ آنکھیں کھول کر اُسے دیکھے اُس کا قاتل رُومال اُس کی خوبصورت گردن سے لپٹ جائے گا۔

مگر نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔۔۔ سوچتے سوچتے وہ بڑبڑانے لگا۔ سوئے ہوئے دشمن کا چہرہ بھی بعض اوقات قاتل کے دل میں ہمدردی جگا دیتا ہے۔ آخر اُسے بیگم کی صورت

دیکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ پہلے اُسے ختم کرنا ہی بہتر ہے۔ پھر اُسے گھسیٹ کر خیمے سے باہر لا کر چاند کی روشنی میں اُس کا چہرہ دیکھ لیا جائے گا۔ لیکن ہاں یہ کام انجام دینے سے قبل اُسے ایک بات یاد رکھنی ہوگی۔ یوسف کو بے ہوش کر دینے والی جڑی بوٹی سونگھا کر بے ہوش کر دینا پڑے گا۔ اُس جڑی بوٹی کا علم رامُو کو ہے۔ اُس کا کہنا ہے کہ یہاں کے جنگلوں میں ایک ایسی جڑی بوٹی بھی پائی جاتی ہے جسے اگر کسی سوتے ہوئے آدمی کو سونگھا دیا جائے تو سونے والا شخص دو چار گھنٹوں تک ہوش میں ہی نہیں آتا۔ سوچتے سوچتے امیر اچانک اُٹھ کر فرش پر بچھی ہوئی دری پر بیٹھ گیا۔ رامُو صبح سویرے ہی جنگل میں جا کر وہ بوٹی لانے کے لیے جانے والا تھا اور سورج طلوع ہونے سے قبل اُس نے لوٹ آنے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن وہ ابھی تک دکھائی کیوں نہیں دیتا؟

صبح کی نماز ادا کرتے وقت اُس نے اپنے دل سے ان تمام خیالوں کو دور دھکیل دیا اور خدا کی عبادت میں مشغول ہو گیا۔ مغرب کی جانب مُنھ کیے ہوئے امیر نے سلام پھیر کر جونہی آنکھیں کھولیں کہ اس کی نظر خیمے کے دروازے پر کھڑے ہوئے یوسف پر پڑ گئی۔ "کون یوسف؟" اس کی آواز میں حیرانی تھی۔ "تم اس وقت؟"

"ہاں چاچا" نوجوان یوسف نے اُسے جھک کر سلام کیا اور پھر مسکراتے ہوئے بولا۔ "میں تو آپ کو ناشتے کے لیے بُلانے آیا تھا لیکن آپ کو نماز پڑھتے دیکھ کر کھڑا رہ گیا۔ ابا جان کا کہنا ہے کہ آپ پکے سیّد ہیں اور نماز کے وقت کسی کی دخل اندازی آپ کو پسند نہیں ہے۔"

"بیٹے!" امیر نے پہلی مرتبہ یوسف کو بیٹا کہہ کر مخاطب کیا اور اِس وقت اُس کی آواز سے بے پناہ محبت ٹپک رہی تھی۔ "ہر سچے مسلمان کو نماز ادا کرتے وقت دنیاداری کو بھول جانا چاہیے۔ ہمارے اندر رہنے والا انسان دن بھر میں صرف تھوڑی دیر کے لیے ہی خدا کے رُوبرو حاضر ہوتا ہے۔ باقی کا سارا وقت تو وہ اِس مطلبی دنیا میں صرف اپنے مطلب کے لیے شیطان کی طرح ناچتا رہتا ہے۔"

یہ سُن کر نوجوان یوسف کو امیر ایک فرشتہ نظر آنے لگا۔ کافی دیر تک وہ اُسے عقیدت بھری نظروں سے دیکھتا رہا۔ اُسے اِس بات کا علم نہیں تھا کہ اس شخص کے لیے اُس کے دل میں محبت کے جذبات کیوں اُبھر اُٹھے ہیں؟ آخر اِس شخص کی شخصیت میں ایسا کون سا جادو ہے کہ اِس سے دور رہنے کو جی ہی نہیں چاہتا۔

"بیٹے میری بات تمھاری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے نا؟" یوسف اسے گھور گھور کر دیکھ رہا تھا اور یہ بات اُسے اچھی لگ رہی تھی لیکن اِس کے باوجود اسے کہنا پڑا۔ "تم ابھی دنیاداری میں نہیں پڑے ہو۔ عیاری اور مکاری ابھی تمھارے دل سے دور ہے۔" کہتے کہتے امیر آہستہ آہستہ اُس کے قریب آ گیا اور اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ "میری دعا ہے خدا تمھیں دنیاداری کے جھمیلوں سے دور رکھے۔" پھر اِس سے پہلے کہ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ جائیں اُس نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا اور بولا "چلو یوسف ناشتے کے لیے خان صاحب ہماری راہ دیکھ رہے ہوں گے۔"

امیر جب یوسف کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر چل رہا تھا تو اُس کے اندر ایک نہ سمجھ میں آنے والی سرسراہٹ سی دوڑنے لگی تھی اور دوسری طرف بُرقعہ پوش بیگم نے ان دونوں کو اِس طرح اپنے خیمے کی طرف آتا دیکھ کر خود اپنے اندر بھی ایک پُرمسرت جھنجھناہٹ محسوس کی تھی۔ باپ بیٹے کی جوڑی اِس وقت اُس کی آنکھوں کو بڑی بھلی لگ رہی تھی۔

●

صبح... دوپہر... اور پھر شام

دس بارہ گز کے فاصلے پر تنے ہوئے دونوں خیموں کے دونوں مسافروں کے دل میں ایک عجیب سی کشمکش چل رہی تھی۔ امیر رات کے انتظار میں بے چین ہوا جا رہا تھا۔ اِس سے پہلے کسی بھی شکار کے لیے اُس نے اتنی بے قراری کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ لیکن آج ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ اپنے دل میں تو اُس نے کئی بار خان

صاحب اور اُس کی بیگم کا گلا دبا دیا تھا۔ خیالوں ہی خیالوں میں نہ جانے کتنی بار اُس نے یوسف کو بے ہوش کیا تھا۔ پھر یہ سب ہو جانے کے بعد کا خیال اُس کے دل میں کوئی واضح تصویر نہیں پیش کر سکا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جب یوسف ہوش میں آئے گا اور اپنی امّی اور ابّا جان کو نہیں دیکھے گا، پالکی اور پالکی اٹھانے والے کہار جب اُسے نظر نہیں آئیں گے تو اُس پر کیا بیتے گی؟ ایک نوجوان لڑکے کے ذہن میں یہ بات کیسے بٹھائی جا سکتی ہے کہ اُس کے ماں باپ اُسے چھوڑ کر رات کو ہی کہیں چلے گئے ہیں۔ اور اگر اُس سے یہ کہا گیا کہ رات کو چور لٹیروں سے لڑتے لڑتے وہ کام آ گئے ہیں تو دوسرے سوالات اُٹھ کھڑے ہوں گے۔ یوسف یہ ضرور پوچھے گا کہ اتنا سب کچھ ہو جانے کے باوجود اُسے اِس کی خبر کیوں نہیں ہوئی؟ چور ڈاکو میری امّی اور ابّو کو ہلاک کر رہے تھے تو آپ لوگ دیکھتے کیوں رہ گئے؟ آپ لوگوں نے انھیں بچایا کیوں نہیں؟ کہاں ہیں میرے مرحوم ماں باپ کی لاشیں؟

امیر کو یہ اُلجھن ستاتی ہی رہی اور اِس اُلجھن کو سُلجھانے کی کوئی ترکیب اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ جیسے جیسے وہ اِس اُلجھن پر غور کرتا گیا ویسے ویسے یہ اُلجھن اور بھی پریشان کُن ہوتی گئی۔ ابھی اس نے گنیش سے بھی یوسف کے متعلق اپنے ارادے کا ذکر نہیں کیا تھا۔ یوسف کو زندہ رکھنے کی بات سوائے رامُو کے اور کوئی نہیں جانتا تھا۔ اُس نے تو اپنے دل میں یہ فیصلہ کر رکھا تھا کہ وہ آخری وقت تک اِس بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتائے گا۔

بالکل امیر ہی کی طرح سامنے والے خیمے میں ممتاز بیگم عُرف زہرہ بھی اُلجھن میں اُلجھی ہوئی تھی۔ صبح ناشتے کے وقت امیر نے خان صاحب کے ساتھ ساگر جانے کے لیے حامی نہیں بھری تھی۔ اُس نے خان سے کہا تھا کہ گنیش بابو کے ساتھ سیدھا حیدر آباد چلا جاؤں گا۔ لیکن اگر آپ کا بہت اصرار ہے تو میں واپسی پر ضرور ساگر آؤں گا۔ یہ ساری باتیں زہرہ نے پردے کے پیچھے سے سُن لی تھیں

ایم اے راحت
دو جلدیں
قیمت: ۲۰۰/۰۰ روپے
تاریک وادی

امیر کا اِسی جگہ سے الگ بڑ جانا اسے منظور نہ تھا۔ وہ ہر قیمت پر امیر کو ساگر لے جانا چاہتی تھی۔ مگر کس لیے؟ اِس سوال کا جواب اُس کے پاس نہیں تھا۔ اُس نے جب سے امیر کو امراوتی میں ناگر سیٹھ کی حویلی میں دیکھا تھا اُسی وقت سے اُس کا دل بے چین تھا۔ جسے اُس نے کبھی دل و جان سے چاہا تھا۔ جسے اُس نے دل سے اپنا خاوند سمجھ لیا تھا۔ اُس کے ساتھ قُدرت نے یوں اتفاقاً اُس کی ملاقات کرا دی تھی۔ آخر اِس اتفاق کے پیچھے قُدرت کا کیا ارادہ ہو سکتا ہے؟ کیا یہ ادھورے رمانوں کو پورا کرنے کے لیے موقع تھا؟ اُسے مجبوراً خان صاحب کی بیوی بننا پڑا تھا۔ لیکن پھر بھی اتنے سالوں کے بعد بھی وہ امیر کو بھلانے میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔

یوسف کا اصلی باپ امیر ہی ہے۔ اِس بات کو اپنے دل میں دفن رکھنے کے باوجود جوں جوں یوسف بڑا ہوتا گیا توں توں سچائی اور اصلیت ظاہر ہوتی جا رہی تھی۔ اِس وقت یوسف جیسا دکھائی دے رہا تھا ایسا ہی امیر بھی اُس وقت دکھائی دیتا تھا جب اُس سے امیر کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ رنگ رُوپ ناک اور آنکھیں سب کچھ امیر جیسی ہی تو ہیں۔ صاف دکھائی دے رہا ہے کہ یوسف امیر کی جوانی کا ہی عکس ہے۔

زہرہ نے اِن آٹھ دس دنوں میں اپنے دل کو دوسری جانب لگانے کی بہت کوشش کی۔ جس بات کو یاد کر کے اب کوئی فائدہ ہی نہ ہو اُس بات کو دل میں لگا کر رکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اس نے دل ہی دل میں اپنے آپ کو سمجھایا کہ زہرہ اب تمھاری عمر ڈھل چکی ہے۔ اب تمھارے جوان بیٹے کی شادی ہونے والی ہے۔ خان بھی اب تمھیں

خوش رکھنے کے لیے تمھارے ماضی کی طرف مُڑ کر نہیں دیکھتا یہ ضرور ہے کہ اس کا شکّی مزاج اُسے کبھی کبھی پریشان کر دیتا ہے۔ وہ اگر کسی غیر مرد کے سامنے اُسے بُرقعے میں بھی کھڑی دیکھ لیتا ہے تو اُس پر غصّہ سوار ہو جاتا ہے۔ اکثر اُس نے اُسے بھونڈی گالیاں بھی دی تھیں اور کئی بار اُس نے اُس پر ہاتھ بھی اُٹھایا تھا۔ اور یہ ہی وجہ تھی جو اُسے امیر کی طرف کھینچ رہی تھی۔

وہ جیسے جیسے دل کو سمجھاتی جاتی ویسے ویسے اُسکے اندر کی کشمکش اور زوروں پر آجاتی۔۔ اور اس کا جی چاہنے لگتا کہ وہ ایک بار امیر سے یہ کہہ دے کہ اُس نے اُس سے بے وفائی نہیں کی تھی۔ میری سوتیلی ماں نے زبردستی مجھے اِس خان کی بیوی بننے پر مجبور کر دیا ہے۔ وہ تو اب بھی اُسے چاہتی ہے۔ اور اگر اس کی مرضی ہو تو وہ اب بھی ۔۔۔ اب بھی اس کے ساتھ بھاگ نکلنے کے لئے تیار رہے۔

اِسی لیے تو وہ امیر کو اپنے ساتھ ساگر لے جانا چاہتی ہے کہ ایک بار اپنا نقاب ہٹا کر اُسے اپنا چہرہ دکھا دے اور یوسف کی اصلیت اُس پر ظاہر کر دے۔ اُس کے بعد جو امیر کے جی میں آئے فیصلہ کر لے۔ اُس کا جو بھی فیصلہ ہوگا اُسے وہ ہنسی خوشی قبول کرنے کے لیے تیار ہے اور اگر ضرورت پڑی تو۔۔ تو خان صاحب کو بھی اپنی زندگی سے دور کرنے کے لیے تیار ہے۔ ایک بار نواب کی قید سے امیر نے ہی اُسے رہائی دلوائی تھی اور آج اگر وہ اُسے اِس خان کی قید سے بھی آزاد کرا دے تو وہ اس کی ہر شرط ماننے کے لیے تیار ہے۔ امیر اتنا باہمت آدمی ہے کہ اگر وہ چاہے تو یہ کام کر سکتا ہے۔ وہ خود اُسے راستہ دکھائے گی۔ لیکن یوسف کا کیا کیا جائے؟ اُسے کس طرح ساتھ لیا جائے؟ اُسے وہ کس طرح سمجھائے گی کہ بیٹا تیرا اصلی باپ تو امیر ہے۔ کیا یوسف اِس بات کو قبول کریگا؟

نہیں نہیں۔۔ یہ کام اتنا آسان نہیں ہے۔ اُسے بہت سوچ سمجھ کر یہ کام کرنا ہوگا۔ اِس کے لیے پہلے یہ ضروری ہوگا کہ وہ امیر کے خیالات سے آگاہ ہو جائے کیا اتنے برسوں بعد اُس کے دل میں اُس کے لیے پہلے جیسی محبت جاگ سکتی ہے؟ وہ اُس سے نفرت تو نہیں کرنے لگا ہے؟

زُہرہ انھیں سب اُلجھنوں میں گھری ہوئی تھی۔ اِس طرح آمنے سامنے کے دو خیموں میں دو انسان اپنی اپنی اُلجھنوں کو سُلجھانے اور اپنے اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنانے کی منصوبہ بندی میں مصروف تھے۔ مگر قُدرت نے تو اپنا فیصلہ کر ہی لیا تھا اور قُدرت کے فیصلے کی گھڑی دھیرے دھیرے قریب آتی جا رہی تھی۔

● "گنیش تم نے ساتھیوں کو تو سمجھا دیا ہے نا؟" امیر نے خیمے سے باہر نکلنے سے قبل احتیاطاً گنیش سے پوچھا۔ "میرے اور تمھارے خیمے کے درمیان کھلی جگہ پر ہماری محفل جمے گی اور خان صاحب کے خیمے کی دوسری جانب ہمارے ساتھی اپنے گانے بجانے کی محفل جمائیں گے۔ پالکی اُٹھانے والے کہار اور خان صاحب کے دوسرے تمام آدمیوں کو گانے بجانے کی اُس محفل میں شریک ہونا چاہیے تاکہ وہ گیارہ گردنیں ہمارے ساتھ آدمیوں کے ہاتھوں پلک جھپکتے ہی ڈھلک جائیں اور جب گانے بجانے کی محفل شروع ہو جائے گی تو ہمارے قبر کھودنے والے ساتھی ایک بڑا گڑھا کھودنا شروع کر دیں گے۔ ہماری محفل میں میرے علاوہ تم، رامُو، روپ سنگھ اور دوسرے چار ساتھی گانے ہوں گے۔"

"اور خان کا بیٹا یوسف کہاں ہوگا؟" گنیش کا یہ سوال امیر کو بُری طرح کھٹکا۔ لیکن اُس نے اِس کا جواب غصّے سے دینا مناسب نہیں سمجھا۔ "اُس کے بارے میں بھی میں نے سوچ لیا ہے۔" وہ لاپروائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا "میں نے خان صاحب کو یہ بات پہلے ہی سمجھا دی ہے کہ محبت کی رنگین داستانیں سُنتے اور سُناتے وقت اپنے بیٹے کو اپنے ساتھ نہ بٹھائیں تو اچھا ہوگا کیونکہ اُس کی موجودگی میں زبان پر لگام رکھنی ہوگی۔ اور خان نے میری یہ تجویز منظور بھی کر لی ہے۔"

"لیکن اس کا بیٹا گانے بجانے کی محفل میں شریک رہے تو یہ ہمارے لیے اور اچھا ہوگا۔" گنیش کی یہ تجویز بھی بُری نہیں تھی لیکن اُسے امیر کے ارادے کی خبر ہی

نہیں؟
نہیں گنیش یوسف اپنی ماں کے ساتھ اپنے
میں ہی رہے گا۔" امیر نے کہا۔ "خان اپنی بیوی کو تنہا
میں چھوڑ کر محفل کے مزے لوٹنے نہیں آئے گا۔ میں
نے اُسے یہ مشورہ دیا تھا۔"
"اور اُس کی وہ کنیز اُس کا کیا ہوگا؟" گنیش نے دانت
دانت جما کر پوچھا۔
"اسے رامُو ختم کر دے گا۔" امیر نے سامنے بیٹھے
ہوئے رامُو کو پہلے سے یہ بات بتا دی تھی پھر بھی اُس نے
اسے یاد دلاتے ہوئے کہا۔ "رامُو وہ کنیز خان صاحب
کے لیے ہی سوتی ہے۔ وہ بُڑھیا ایک ہی جھٹکے کو
برداشت کر سکے گی۔"
گنیش تھوڑی دیر تک سوچ میں ڈوبا رہا پھر
اس نے پوچھا۔ "اور خان کی بیوی اور بیٹے کو کون ختم
کرے گا؟"
"میں" امیر نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔ "یہ کام

بغداد کی رات

قمر اجنالوی

الف لیلیٰ کی ایک ہزار راتوں سے زیادہ حسین و
رنگین رات، دجلہ اور نیل کے دامنوں میں لپٹی
ہوئی رات، جسے بے شمار کتابوں کے حوالوں سے
آراستہ کیا گیا ہے

1200 سے زائد صفحات | قیمت:-/600

مکتبہ القریش
اردو بازار لاہور

نامور مصنف محمود احمد مودی
وہی تحریر اور وہی انداز
کے ساتھ، اپنے چاہنے والوں
کے لئے ایک نئی سوغات لئے

نجات

خوبصورت سرورق، بہترین
طباعت و کتابت، سفید کاغذ

قیمت =/150 روپے

مکتبہ القریش
سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
7668958

مجھے خود ہی کرنا پڑے گا۔"

"تم اکیلے ان دونوں کو کیسے؟" گنیش نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ امیر نے اُسے درمیان میں ہی روک دیا۔ اور ہاتھ اُٹھا کر بولا۔ میرے بارے میں اور میرے کام کے متعلق تم زیادہ پوچھ گچھ مت کرو۔" اتنا کہہ کر وہ دھیمی آواز میں بولا۔ "گنیش اِس میں فکرمند ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔ رامُو تو میرے پاس ہی ہوگا۔ محفل میں میں اپنی رنگین داستان بہت تفصیل سے سناؤں گا اور اُس وقت تک ایک بڑا گڑھا کھودا جا چکا ہوگا۔ پھر میں کوئی بہانہ کر کے اپنے خیمے کی جانب چل پڑوں گا۔ اُس وقت تم سب لوگ بھی تیار ہو جانا۔ اپنے خیمے میں جانے کی بجائے میں سیدھا خان صاحب کے خیمے کی طرف جاؤں گا لیکن اچانک رُک کر میں وہیں سے رامُو کو آواز دوں گا کہ میرا خاص تمبا کو کہاں رکھا ہوا ہے؟ میری آواز سُن کر اُسے جواب دینے کے لیے میرے پاس آنا پڑے گا۔ میری اِس آواز سے ہمارے تمام دوسرے ساتھی بھی ہوشیار ہو جائیں گے۔ پھر خان کے خیمے میں گھس کر میں مخصوص اشارہ کروں گا تو تم سب لوگ اپنا اپنا کام شروع کر دینا۔ ٹھیک ہے نا؟" اتنا کہہ کر امیر نے گنیش کی طرف دیکھا۔ بوڑھے گنیش کے بدصورت چہرے کی شکنیں مشعل کی روشنی میں بہت زیادہ گہری اور بھیانک نظر آ رہی تھیں۔ امیر کو لگا کہ وہ اس کے منصوبے میں ہمیشہ کی طرح اب بھی کوئی خامی تلاش کر رہا ہے۔ مگر اس وقت وہ اُسے چھیڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ کام پورا ہو جانے کے بعد وہ گنیش کو یوسف کے بارے میں بتا دے گا اور اُسے کچھ رقم دے کر رضامند کر لے گا۔ اِسی بھروسے پر اُس نے بات کو ٹالنے کی غرض سے کہا۔ "اب تم جاؤ گنیش مگر یہ یاد رکھنا کہ خان کے شکار کے بعد تمھیں بھی میرے برابر ہی حصّہ ملے گا۔"

امیر کی یہ آخری بات سن کر گنیش اپنی سفید داڑھی کو کھجلاتا ہوا ہنستے ہنستے اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ "امیر میری طرف سے کوئی کوتاہی نہیں ہوگی تم اس کا اطمینان رکھنا۔"

تھوڑی دیر تک اُس کے یہ الفاظ خیمے کے اندر گونجتے رہے۔ رامُو کو گنیش پر بہت ہی غصہ آ رہا تھا اور اُسے یہ بات بھی پسند نہیں تھی کہ اُسے امیر کے برابر حصّہ ملے۔ اسی لیے گنیش کے جاتے ہی اُس نے امیر سے پوچھا۔ "کیا واقعی تم گنیش کو برابر حصہ دو گے؟"

"ہاں رامُو تم یہ اچھی طرح جانتے ہو کہ ساتھیوں سے وعدہ کرنے کے بعد میں اپنے وعدے سے نہیں پھرتا۔" امیر نے جواب دیا۔

"لیکن گنیش پر آخر اس قدر مہربانی کیوں ہے؟" رامُو نتھنے پھلا کر پوچھ بیٹھا۔ "جو سرکش ہو اُسی کو فائدہ؟"

امیر چونک کر رامُو کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آج سے پہلے تو رامُو جیسے وفادار ساتھی نے اس سے کبھی ایسی باتیں نہیں کی تھیں۔ لیکن آج وہ ایسی باتیں کیوں کر رہا ہے؟

"دیکھو رامُو میں تمھارے سامنے اپنے دل کے زخم رکھ دیتا ہوں۔" تھوڑی دیر بعد امیر نے اپنا گلا کھنکارتے ہوئے کہا۔ "اِس پیشے سے اب میرا دل اُکتا جا رہا ہے۔ کس لیے؟ یہ میری سمجھ میں نہیں آتا مگر۔"

"مگر کیا؟" رامُو نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"شائد میں اِسی جگہ سے واپس چلا جاؤں۔ حیدرآباد جانے کی خواہش نہیں ہوتی۔" یہ کہہ کر وہ جلدی سے آگے بولا۔ "سارا دارومدار یوسف پر ہے۔ اگر وہ ماں باپ کی جُدائی برداشت کر کے میرے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے تو میں اُسے لے کر شیواپوری واپس چلا جاؤں گا نہیں تو پھر۔"

"پھر کیا؟" رامُو کی آواز بدل گئی۔

"پھر خدا ہی جانے۔" امیر نے ایک گہرا سانس لیا اور ٹھیک اُسی وقت خیمے کے باہر کسی کے قدموں کی چاپ سُنائی دی۔ اِس لیے وہ دونوں چوکنا ہو گئے۔ "جا جا اندر" یوسف کی آواز اُن کی سماعت سے ٹکرائی۔ پھر اندر آ کر وہ کچھ کہنا چاہتا ہی تھا کہ رامُو کو دیکھ کر وہ کچھ کہہ نہ سکا۔

"آؤ آؤ یوسف!" امیر نے اٹھ کر اُس کا ہاتھ تھام لیا پھر رامُو سے بولا۔ "جاؤ تم جا کر باہر دری وغیرہ بچھاؤ

حقے وغیرہ کا انتظام کرو۔ میں خان صاحب کو ساتھ کر آ رہا ہوں۔"

امیر کا حکم سُن کر رامُو وہاں سے چلا گیا۔ اُس کے جاتے ہی یوسف نے اِس طرح دھیمے اور رازدارانہ لہجے میں کہا جیسے اُسے رامُو کے جانے کا ہی انتظار ہو۔ "ابا! کل صبح آپ مجھے گھوڑ سواری کے لیے جنگل کی طرف لے جائیں گے؟"

"ارے یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے بیٹا؟" امیر نے یہ بات کہہ تو دی لیکن پھر فوراً ہی اسے ایک جھٹکا سا لگا کہ کل صبح تو نہ جانے کیا سے کیا ہو جائے مگر بے چارے یوسف کو اس بات کی خبر ہی کہاں ہے؟

"آپ کیا سوچنے لگے ابا جان؟" یوسف نے اُسے خاموش دیکھ کر پوچھا۔ "اگر آپ کو کوئی کام وغیرہ ہو تو۔"

"نہیں نہیں بیٹے ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" یوسف کا کندھا دباتے ہوئے امیر نے کہا۔ "لیکن خان صاحب کیا صبح سویرے گھوڑ سواری کے لیے آ سکیں گے؟"

"نہیں ابا جان تو آنے والے ہی نہیں ہیں اِسی لیے میں آنا چاہتا ہوں۔" یوسف دھیرے سے آگے بڑھا۔ "مجھے آپ سے ایک بہت ہی خاص بات کہنا ہے۔"

"خاص بات؟" امیر چونک پڑا۔ "کیا بات ہے ابھی ہی بتا دو نا؟"

"نہیں امّی نے کہا ہے کہ صبح کو ہی بتانا۔" یہ کہہ کر وہ کمرے سے مُڑا اور خیمے سے باہر نکل گیا۔

یوسف کے جانے کے بعد بھی کافی دیر تک امیر کے کانوں میں اُس کے کہے ہوئے آخری الفاظ گونجتے رہے۔ "نہیں امّی نے کہا ہے کہ صبح کو ہی بتانا۔ اور اب امیر سوچ رہا تھا کہ یوسف کی امّی اپنے نوجوان بیٹے کی معرفت اُس سے کیا بات کہنا چاہتی ہے؟ یقیناً یہ صورت بہت ہی خطرناک ہے۔ یہ تو اچھا ہے کہ وہ رات کو ہی اُس کے ہاتھوں ختم ہو جانے والی ہے اور کل صبح کا سورج وہ دیکھ ہی نہیں سکے گی۔

خدا نے بھی عورت کے دل کو کس طرح بنایا ہے؟ وہ تھوڑی دیر تک کھڑا کھڑا سوچتا رہا پھر محفل جمانے کے جوش میں وہ تیزی سے خیمے کے باہر نکل گیا۔

●

صوبیدار رستم خان ایک شخص کو لے کر ولیم سلومن کے خیمے میں داخل ہوا۔ "سر یہ آدمی کوئی اطلاع دینے آیا ہے۔" رستم خان نے ولیم سلومن سے کہا۔ "اب کامیابی ہم سے زیادہ دور نہیں ہے۔"

ولیم سلومن آرام کرسی پر بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ رستم خان کی بات سُن کر اُس نے کتاب بند کر دی اور پھر تیز نظروں سے اُس ہانپتے ہوئے نووارد کو دیکھنے لگا۔ "ہری اپ.. جلدی سے کہہ ڈالو۔" اچانک اُس نے نووارد مُخبر سے کہا۔ "کونیک"

"صاحب! امیر علی کی ٹولی نے جنگل کی دوسری جانب پڑاؤ ڈال رکھا ہے۔" مُخبر نے کہنا شروع کیا۔ "میں نے اور ماڈھو نے اپنی آنکھوں سے اُس کی چھاؤنی کو دیکھا ہے۔"

یہ سن کر ولیم سلومن نے اپنی عادت کے مطابق اپنے جذبات کو دبائے رکھا اور انتہائی دھیمے لہجے میں بولا۔ "اس ٹولی میں کُل کتنے ٹھگ ہوں گے؟"

"اُن سب کی تعداد اسّی سے سو تک ہوگی۔"

"مگر یہ تم سے کس نے کہا کہ یہ امیر علی کی ہی ٹولی ہے؟"

"اُس کا ایک خاص آدمی رامُو جنگل سے پانچ کوس کے فاصلے پر گاؤں کے بازار میں کچھ خریداری کے لیے آیا تھا۔" مُخبر نے اتنا ہی بتایا تھا کہ ولیم سلومن کے کان کھڑے ہو گئے۔ پھر وہ اپنی دھار دار آواز میں بولا۔ "تو تمھیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ وہ کیا چیز خرید رہا تھا؟"

"جی ہاں بعد میں معلوم ہوا کہ اس نے بازار سے کچھ گولیاں وغیرہ خریدی تھیں۔"

"تب تو یقیناً وہ پستول اور بندوق کی ہی گولیاں ہوں گی۔ ممکن ہے اُن لوگوں نے کچھ مسافروں کو اپنے جال میں

پھانس لیا ہو اور آج رات ہی انھیں ختم کر دینے کا ارادہ رکھتے ہوں۔" ولیم سلومن نے اُٹھ کر پستول کی پیٹی کو اپنی کمر سے باندھتے ہوئے پوچھا: "اُن کی ٹولی میں کیا کوئی ایسا مسافر بھی نظر آیا ہے جسے تم پہچان سکے ہو؟"

"ہاں جناب! ایک پٹھان کے قافلے نے ان کے ساتھ پڑاؤ ڈال رکھا ہے۔ اُن کے ساتھ عورتیں بھی ہیں لیکن عورتوں کی تعداد کا مجھے علم نہیں ہے۔ مگر ایک پالکی ہم نے ضرور دیکھی ہے۔" مُخبر نے بتایا۔

"تمھارا دوسرا ساتھی ماڈھو اس وقت کہاں ہے؟"

"آپ کے حکم کے مطابق میں اُسے وہیں بٹھا آیا ہوں۔"

"اُسے کسی نے دیکھا تو نہیں ہے؟"

"نہیں جناب! میں نے اُسے چھپے رہنے کی تاکید کی ہے۔ اور مجھے بھی یہاں آتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا ہے۔"

"میرا گھوڑا نکالو۔" اچانک اس نے آواز لگائی۔ اور پھر رستم خان سے مُخاطب ہو کر بولا: "رستم خان ہمارے پاس صرف پچیس گھوڑ سوار سپاہی ہیں۔ لیکن یہ سو آدمیوں کو آسانی سے گھیر لیں گے۔ چلو میرے ساتھ۔۔ جلدی۔"

اتنا کہہ کر وہ باہر نکلا اور اپنے گھوڑے کی پیٹھ پر اچھل کر سوار ہو گیا۔ اور ہونٹوں ہی ہونٹوں میں بڑبڑاتا ہوا بولا: "امیر علی اب تم میری آنکھوں میں دُھول جھونک کر بھاگ نہیں سکو گے۔۔ ناؤ۔۔ نو مور چانس۔"

پھر ولیم سلومن کے گھوڑے کی لگام کھینچ گئی ساتھ ساتھ دوسرے گھوڑے بھی آگے بڑھے اور ستائیس گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز رات کے سناٹے کو توڑتی ہوئی گونجتی رہی۔

●

رات آہستہ آہستہ گہری ہوتی جا رہی تھی اور جنگل کا سنسان علاقہ ڈھول کی تھاپ اور گانے بجانے کے شور میں گونج رہا تھا۔ ڈھول کے ساتھ ساتھ پکھاوج سارنگی اور طبلے کی آوازوں نے اس علاقے کے سناٹے کو توڑ دیا تھا۔ گیت، غزلیں اور دوہے الاپے جا رہے تھے۔ ایک طرف تو یہ گانے بجانے کی محفل جمی ہوئی تھی اور دوسری طرف امیر زہرہ سے اپنی پہلی محبت کی داستان سُنا رہا تھا۔

ایک طرف گرمی کے لیے آگ کا الاؤ روشن تھا اور خوشبودار حقے کی نلی امیر اور خان صاحب کے درمیان بار بار اِدھر سے اُدھر ہو رہی تھی۔ گیتی اپنے نچلے ہونٹ میں تمباکو کی چٹکی دبائے بیٹھا تھا اور رامو نے گرم گرم قہوے کی پیالیاں بھرنے کا کام سنبھال رکھا تھا۔ ایک طرف بوڑھا روپ سنگھ بظاہر امیر کی داستان غور سے سُننے میں مشغول دکھائی دیتا تھا۔ لیکن درحقیقت وہ اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے چوکنا نظروں سے آس پاس کے ماحول کا جائزہ لے رہا تھا۔

"اس وقت میری عمر تقریباً اٹھارہ اُنیس سال کی ہوگی۔" امیر نے جلتی ہوئی آگ کے شعلوں پر نظریں جماتے ہوئے کہنا شروع کیا: "خان صاحب اُس وقت میں آپ کے بیٹے یوسف کے برابر ہی ہونگا اور پہلی بار ہی اپنے والد کے ساتھ سفر پر نکلا تھا اور اس وقت تک میں نے اپنے گاؤں سے باہر کی دنیا نہیں دیکھی تھی۔ میرے والد مجھے اپنے پیشے میں دلچسپی لینے کے لیے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ میرے دل کی کتاب میں اُس وقت لفظ "عورت" کا حروف نہیں چھپا تھا۔ یعنی یہ اس وقت کی بات ہے جب میری جوانی نے عورت کے جوبن کا نظارہ نہیں کیا تھا۔"

"بہت خوب امیر میاں" خان صاحب داد دیتے ہوئے بولے: "لگتا ہے آپ سوداگر نہیں بلکہ شاعر ہیں۔"

"شکریہ خان صاحب!" امیر ادب سے اُس کی داد قبول کرتے ہوئے بولا: "جس طرح پیار آدمی کو پاگل بنا دیتا ہے اُسی طرح پیار آدمی کو شاعر بھی بنا دیتا ہے۔ لیکن اُس عورت نے مجھے اُس وقت پاگل بنا دیا تھا۔"

"میاں! وہ کون عورت تھی؟" خان صاحب نے

دلچسپی کا اظہار کیا۔ "ذرا ہمیں اس کا نام تو بتا دیں۔"

"نام سے کوئی فرق نہیں پڑتا خان صاحب" امیر نے اُن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "بس اتنا ہی کافی ہے کہ اپنے پہلے پیار میں ہر نوجوان خود کو مجنوں سمجھنے لگتا ہے اور اپنی محبوبہ اُسے لیلیٰ جیسی لگتی ہے۔"

"ٹھیک ہے تو آپ اُسے لیلیٰ ہی کہیں۔ لیکن پھر بھی اصل نام کے بغیر قصّے کا مزہ نہیں آئے گا۔ کیوں گنیش بابو! کیا خیال ہے آپ کا؟"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں خان صاحب" گنیش نے آنکھ دبا کر امیر سے پوچھا۔ "میاں! آپ کی وہ لیلیٰ کیا بہت ہی خوبصورت تھی؟"

"واہ رے گنیش بابو" امیر نے گنیش کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔ "آپ جیسے بزرگ کو بھی لیلیٰ کا نام سُن کر جوش آگیا۔ ارے بابو جی! ہر لیلیٰ بہت خوبصورت ہی ہوتی ہے۔"

"میاں وہ خطرناک بھی ہوتی ہیں۔" یہ کہہ کر خان صاحب نے امیر کو چونکا دیا۔ اور امیر یہ سوچنے لگا کہ خان صاحب کا دھیان اچانک ہی اپنی بیگم کی طرف چلا گیا ہے اور اسی کو یاد کر کے وہ یہ بات کہہ رہے ہیں۔ تھوڑی دیر تک اُسے خاموش رہنا پڑا۔ یوں بھی اُسے اپنی داستان سُنانے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ اس کا ارادہ تو محفل کو رنگین بنانے کے بعد اپنی داستان سُنانے کا تھا۔

"ہاں تو اُس عورت سے اچانک ہی میری ملاقات ہوگئی۔ اُس وقت بھی ہم لوگ حیدر آباد ہی جا رہے تھے راستے میں عمر کھنڈ کے مقام پر ہم نے اسی طرح پڑاؤ ڈال رکھا تھا۔ خان صاحب میرے دوستوں اور یاروں کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے بڑی میٹھی زبان عطا کی ہے۔ یہ بات سچی ہے یا جھوٹی یہ تو آپ بہتر کہہ سکتے ہیں لیکن خدا کی مجھ پر اتنی مہربانی تو ضرور ہے کہ جو بھی کچھ دیر باتیں کرتا ہے میں اس کے دل و جگر میں سما جاتا ہوں۔"

"جس طرح ہم آپ کے دل جگر بن گئے ہیں۔" خان نے ہنس کر کہا۔

"لیکن خان صاحب اس وقت تو میری مونچھوں کے بال پھوٹ رہے تھے۔ لیکن اس کے باوجود اس سفر کی پانچویں منزل پر میں عمر کھنڈ کے نواب کے دربار میں جا بیٹھا۔ ایک طرف وہ بوڑھا بے وقوف نواب تھا اور دوسری طرف مجھ جیسا بے خبر نوجوان۔ کمرے کے بیچ بیچ طوائف کا مُجرا ہو رہا تھا۔ اُس وقت ناچتی اور تھرکتی ہوئی جوانی کو میں نے زندگی میں پہلی ہی بار دیکھا تھا۔ اچانک میں نے چونک کر محسوس کیا کہ کسی بلبل کی بے چین نگاہیں مجھے گھور رہی ہیں۔ نواب نے اُس حسینہ کو حیدر آباد سے اُٹھوایا تھا۔ اُس کا روپ اور جوبن مجھے اپنی جانب کھینچنے لگا تھا۔ لیکن پھر بھی میں اسے محبت نہیں مان رہا تھا۔ کیونکہ طوائف کسی بھی مرد کو بہکا سکتی ہے۔ اور میں نے یہی سوچا کہ بوڑھے نواب کے برابر مجھ جیسے نوجوان کو دیکھ کر شائد اُس حسینہ کی پیاس جاگ گئی ہو۔ لیکن۔۔"

"لیکن کیا؟" خان صاحب کی دلچسپی اب اپنے عُروج پر آچکی تھی۔ اُن سے اب چند لمحوں کی رکاوٹ بھی برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ "آپ کی داستان اب رنگ پکڑ رہی ہے۔ آگے کہیے میر صاحب۔"

امیر اب خود بھی زُہرہ کے خیالوں میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ برسوں پہلے کے اُس واقعے کو یاد کرنے میں اُس نے تھوڑا درد بھی محسوس کیا۔ اِس درد میں تکلیف تو تھی لیکن ایک عجیب سی لذّت کا احساس بھی تھا۔ دربار سے نکل کر جب میں باہر کی کھُلی فضا میں آیا تو اُس وقت میں اُس حسینہ کو بھُول چکا تھا۔ لیکن اچانک اُس کی بوڑھی ملازمہ نے بخشش مانگنے کے بہانے میرا راستہ روک لیا۔ پھر بہت جلدی میں اُس نے میرے کان میں پھُونک ماری۔ کہ میری بانو ایک بار آپ سے ملنا چاہتی ہے۔ آپ اگر کل بازار میں مجھ سے مل لیں تو آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ مجھے وہ بُوڑھی کچھ عجیب سی لگی۔ اُس کی باتوں سے مجھے لگا کہ کہیں نوجوانوں کو پھنسانے کے لیے یہ کوئی چال نہ کھیل رہی ہو۔ لیکن اِس کے باوجود میرا جی چاہا کہ آزما کر دیکھ لینے میں حرج

ہی کیا ہے؟ آپ نے کیا اندازہ لگایا؟ آپ کے خیال میں اُس بڑھیا نے مجھ سے کیا کہا ہوگا؟" امیر نے اپنی داستان سُناتے سُناتے خان صاحب سے پوچھا۔

"یہ ہی کہ اُس کی نوجوان رقّاصہ ناچتے ناچتے آپ پر عاشق ہوگئی ہے۔" خان صاحب نے حقّے کا ایک طویل کش لگا کر کہا۔ "اور اگر آپ اُس سے ملنے نہیں آئے تو وہ خودکشی کر لے گی ہے نا؟"

"جی نہیں خان صاحب! وہ بات اتنی بھی معمولی نہیں تھی۔" امیر نے خان صاحب کے ہاتھ سے حقّے کی نے لے کر دو کش لگائے اور آگے بولا۔ "وہ لیلیٰ نواب کی قید سے آزاد ہو کر بھاگ جانا چاہتی تھی اور اسی لیے وہ مجھ سے مدد کی طلبگار تھی۔ اِس کے لیے وہ زندگی بھر میری غلامی کے لیے بھی تیار تھی۔"

"سُبحان اللہ اِس داستان نے تو اب بہت زیادہ ہی دلچسپی پیدا کر دی ہے۔" خان صاحب نے اپنے رانوں پر ہاتھ مار کر امیر کو جوش دلایا۔ "واہ میر صاحب یہ عربستان کی رنگین راتوں جیسی داستان ہوتی جا رہی ہے۔"

کہتے کہتے امیر بھی اپنے آس پاس کے ماحول سے غافل ہوتا جا رہا تھا۔ اُس کے چہرے سے یوں لگنے لگا تھا کہ جیسے یہ واقعہ اُس کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہو۔ اور وہ پہلے سے زیادہ پُرجوش انداز میں بول رہا تھا کہ کس طرح اُس نے اُس حسینہ کو بھگا لے جانے کا منصوبہ بنایا۔ اور کتنے خطرات کا مقابلہ کر کے اُس نے کامیابی حاصل کی۔ باپ کی مخالفت کے باوجود وہ اُس حسینہ کی محبت میں کس طرح گرفتار ہوتا چلا گیا حیدر آباد تک کے سفر میں اُن دونوں کے درمیان کیا گفتگو ہوئی۔ شادی کا وعدہ کیا گیا۔ لیکن حیدر آباد تک پہنچ کر کس طرح سب کچھ پلٹ گیا۔ یہ ساری باتیں امیر نے ایک لفظ چھپائے بغیر جذبات میں کہہ دیں اور سُننے والے اُس کی باتوں کی شیرینی میں کھوتے چلے گئے۔ گذرتے ہوئے وقت کا کسی کو احساس ہی نہیں رہا۔ خان صاحب کا حقّہ کب کا سرد ہو چکا تھا قریب ہی گانے بجانے کی محفل جمی ہوئی تھی۔ لیکن اُس کے شور نے بھی اُن کی توجہ امیر کی باتوں سے نہیں ہٹائی ہر کوئی امیر کی زبان سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ کو توجہ سے سُن رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وقت ٹھہر گیا ہو۔

"خان صاحب اُس حسینہ نے مجھے محبت کا پہلا سبق سکھایا اور اس نے مجھے اپنا جوبن سونپ دیا۔ اُس نے اپنی سوتیلی ماں اور اپنی بہن کو چھوڑ کر میرے ساتھ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے اُسی کے گھر کی کھڑکی میں کھڑے ہو کر حیدر آباد کے چار مینار سے گذرتے ہوئے محرّم کے جُلوس کا نظارہ کیا تھا۔ اور اُسی کے گھر میں میں نے شادی سے پہلے ہی سہاگ رات منالی۔ اُس وقت اُس نے مجھ سے کہا تھا۔ میر صاحب اِس کا انجام کیا ہوگا یہ آپ جانتے ہیں؟ میں واقعی اِس بات سے بے خبر تھا۔ میں یہ نہیں جانتا تھا کہ صرف ایک ہی ملاقات میں کوئی عورت ماں بن سکتی ہے۔ لیکن وہ یہ بات اچھی طرح جانتی تھی مگر پھر بھی اُس نے مجھے نہیں روکا۔ اُس کے پیار میں مجھے کوئی بناوٹ بھی نظر نہیں آتی تھی۔ مجھے اُس کی باتوں سے اُس کے مطلبی ہونے کا احساس بھی نہیں ہوا تھا۔ پھر جب میں دوسرے دن اُس کے گھر جاتا ہوں تو اُس کی محبت کا نشہ اُتر گیا تھا۔ اور میری محبوبہ مجھ سے ملتی نہیں ہے۔ اُس کی موٹی بھدّی سوتیلی ماں میری بے عزتی کرتی ہے وہ کہتی ہے کہ میں اُس کی حسین بیٹی کے لائق نہیں ہوں اور اُس نے تو صرف نواب کی قید میں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے مجھ سے محبت کا ڈھونگ رچایا تھا۔ یہ سب کہہ کر وہ مجھے گھر سے دھکّا دے کر نکال دینا چاہتی ہے۔ اپنی محبت کے تاج محل کو پل بھر میں زمین بوس ہوتے دیکھ کر میں تڑپ جاتا ہوں۔ اُس عورت کی گندی گالیاں سُن کر میرا بدن غصّے کی آگ میں جلنے لگتا ہے۔ پھر عورت ذات پر کبھی ہاتھ نہ اُٹھانے والا میں اُسے بے تحاشا مارنے لگتا ہوں۔ پھر اُس کے نوکروں سے مقابلہ کرنے کے بعد میں گھر سے چلا آتا ہوں۔ پھر بھی میرے پیار کا پاگل پن تو دیکھیے

خان صاحب! کہ مجھے اس بات کا یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ میری محبوبہ مجھ سے دھوکہ کر رہی ہے۔ وہ کسی اور کی ہو سکتی ہے۔ اس کا خیال ہی مجھے نہیں آرہا تھا۔ میں حیدر آباد کی گلی گلی میں اس کی تلاش میں گھومتا رہا تھا۔ لیکن جس کی خاطر میں نے اپنے باپ کا ساتھ چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ عورت طوائف ہونے کے باوجود مجھے دوبارہ نہیں مل سکی۔" یہ آخری الفاظ بولتے وقت امیر کی آواز میں اتنا درد سما گیا کہ وہ بولتے بولتے ہانپنے لگا۔ اُس کی پیشانی کی لکیروں میں غصّے کی جھلک اُبھر آئی تھی۔ سننے والے پتھر کے مجسموں کی طرح بے حس و حرکت خاموش بیٹھے تھے۔ تھوڑی دیر بعد امیر ایک سرد آہ بھر کر بولا "خان صاحب وہ زُہرہ اگر مجھے ایک بار مل جائے تو میں اس سے بے وفائی کا بدلہ لیئے بغیر نہیں رہوں گا۔ خدا کی قسم میں اس تلوار سے اُس کے خوبصورت جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے سے بھی دریغ نہیں کروں گا۔"

"ا۔۔ میر۔۔ میاں" اچانک خان صاحب چیخ پڑے لیکن امیر اُس وقت اُن کی آواز کی اس تبدیلی کو محسوس نہیں کر سکا۔ خان کے چہرے کی سُرخی بھی کسی کو نظر نہیں آئی۔ جوشِ جوش میں خان نے پوچھ لیا "آپ نے ابھی اُس عورت کا نام زُہرہ ہی کہا ہے نا؟"

"ہاں" امیر نے خان صاحب کی جانب دیکھے بغیر آنکھیں بند کر کے جواب دیا "ہاں خان صاحب اب اس بے وفا کا نام مُنھ سے نکل ہی گیا ہے تو چھپانے سے کیا فائدہ؟ اُس ہرجائی عورت کا نام زُہرہ ہی تھا۔"

خان صاحب نے ایک گہرا سانس لیا "تب تو آپ کی داستان رنگین بننے کی بجائے غمگین بنتی جا رہی ہے۔"

"اوہ" امیر جلدی سے خود کو سنبھالتا ہوا بولا "میں بھی کتنا بے وقوف ہوں خان صاحب! ہم لوگ یہاں دو گھڑی دل لگی کے لیے بیٹھے تھے۔ اور میں نے آپ کو ایسی داستان سنا کر اُداس کر دیا۔ اب جانے دیجیے اس بات کو، زُہرہ گئی تو کیا ہو گیا۔ مجھے اُس سے زیادہ حسین عورت کا ساتھ نصیب ہو گیا جس نے مجھے اپنا پیار دینے میں کبھی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔"

"لیکن امیر میاں" خان صاحب نے دانت پیستے ہوئے کہا "آپ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ وہ بے وفا عورت آپ کو چھوڑ کر کسی اور کی ہو گئی ہو گی۔ اُس نے آپ کے گناہ کا پھل کسی اور کے گلے میں لٹکایا ہو گا اور اس طرح اُس نے اُس شخص کو آپ کی اولاد کا باپ بنا دیا ہو گا۔"

"مگر یہ کیسے معلوم ہے خان صاحب؟" امیر پھر سے ایک ٹھگ بن گیا تھا "یہ سوچ کر اب فائدہ بھی کیا ہے؟ کیا معلوم اُسے بھی کسی مجبوری کے تحت میری محبت کو ٹھکرانا پڑا ہو۔" اتنا کہہ کر امیر اُٹھنے کے لیے کوئی بہانہ ہی تلاش کر رہا تھا کہ خان صاحب نے پہل کرتے ہوئے کہا "امیر میاں! آپ ذرا بیٹھیے میں ابھی آتا ہوں۔" اُس کی یہ بات سُن کر گنیش نے اس طرح امیر کی طرف دیکھا جیسے نظروں ہی نظروں میں کہہ رہا ہو کہ خان کو اپنی جگہ سے اُٹھنے ہی مت دو۔ لیکن امیر کو ایسا کرنا مناسب نہیں لگا۔ خان کے چہرے پر اتنی سردی ہونے کے باوجود بھی پسینے کے قطرے چمکتے دیکھ کر اس نے صرف اتنا ہی پوچھا "خان صاحب! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

"ارے طبیعت کیوں خراب ہونے لگی؟" خان نے اٹھتے ہوئے کہا "میں ذرا خیمے میں چکر لگا آؤں پھر آکر میں آپ کو اپنی رنگین داستان سناتا ہوں۔"

پہلے دھیمی اور پھر تیز تیز چال سے جاتے ہوئے خان صاحب کی پیٹھ پر نظریں جمائے امیر چند لمحوں تک دیکھتا رہا پھر دانت کچکچا کر دھیمی آواز میں بولا "کتنا گھٹیا مرد ہے۔ عورت کی بے وفائی کی کہانی سُن کر اُسے یاد آگیا کہ اپنی بیگم کو بھی ایک نظر دیکھ آنا چاہیئے۔"

"لیکن امیر تم نے بھی کافی وقت ضائع کر دیا۔" گنیش نے اپنی ناراضگی کا اظہار کیا "ہمارے ساتھی گڑھا کھود کر کب سے فارغ ہو چکے ہوں گے۔۔ سالے خان کو بھی اسی وقت بیگم کی یاد آنی تھی۔"

"بے چارے کو آخری بار بیوی کا مُنھ تو دیکھ لینے دو۔"

امیر نے گنیش کا غصّہ ہلکا کرنے کی کوشش کی "ہمیں اب اس کی رنگین داستان سُننا ہی کب ہے؟ وہ جونہی آکر بیٹھے گا کہ میں کھڑا ہو جاؤں گا۔ رامو تم بھی تیار رہنا۔ میں اگر آواز دے کر پوچھوں کہ میرا تمبا کو کہاں رکھا ہے تو تم فوراً ہی آجانا۔ پھر دو چار گھڑی میں ہی معاملہ ختم ہو جائے گا۔"

مگر خان صاحب کو واپس آنے میں کافی دیر لگی اور گنیش کی بے چینی بھی بڑھنے لگی "میں وہاں جا کر دیکھ آتا ہوں کہیں بیگم سے پیار کرنے تو نہیں بیٹھ گیا؟"

"نہیں گنیش ہمیں اتنی جلد بازی بھی نہیں کرنا چاہیئے۔" امیر نے ذرا سخت لہجہ اختیار کیا "اس کی موت اُسے یہاں خود کھینچ لائے گی۔"

گانے بجانے کی محفل اپنے شباب پر تھی۔ سارے ہی ٹھگ امیر کے اشارے کے منتظر تھے۔ جب ان سب کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگا تو ٹھیک اُسی وقت خان اپنے خیمے سے باہر نکل کر اُس طرف آتا ہوا دکھائی دیا "وہ آرہا ہے۔" امیر دھیرے سے بڑبڑایا "پاجامہ اتار کر دھوتی باندھ آیا ہے۔"

خان کو قریب آتا دیکھ کر امیر نے اُٹھنے کی تیاری کرتے ہوئے کہا "بہت دیر لگا دی خان صاحب! ہم لوگ یہاں آپ کا قصّہ سننے کے لیے بے قرار بیٹھے ہیں۔"

"ایک کام ختم کرنے کے لیے رُک گیا تھا اسی لیے ذرا دیر ہو گئی۔" اتنا کہہ کر خان صاحب بیٹھنے کے لیے جُھکا تو امیر اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے بولا "میں ذرا اپنا خاص تمبا کو لے آؤں۔ بس ابھی فوراً ہی آیا۔" یہ کہہ کر امیر نے جیسے ہی قدم اُٹھائے تو خان کی آواز اس کی پیٹھ سے ٹکرائی "امیر میاں ذرا میرے خیمے کے اندر بھی نظر ڈالتے آنا۔"

امیر کے قدم یہ سُن کر دو چار لمحوں کے لیے ٹھہر گئے۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ خان اُسے اپنے خیمے کے اندر نظر ڈال آنے کے لیے کیوں کہہ رہا ہے؟ لیکن اُس نے پلٹ کر خان کی طرف نہیں دیکھا۔ اُس نے سوچا کہ ایک طرح سے یہ تو بہت اچھا ہوا۔ وہ خود بھی تو اُس خیمے میں ہی جانا چاہ رہا تھا۔

گنیش کو بھی خان کی یہ بات کچھ عجیب سی لگی تھی۔ اُس نے چاند کی روشنی میں خان کا چہرہ دیکھا تو اُس کا یہ چہرہ بھی اُسے عجیب لگ رہا تھا۔ اتنی دیر میں خان بہت بدل چکا تھا مگر کیوں؟ سب سے زیادہ عجیب بات تو اُسے یہ لگ رہی تھی کہ وہ ابھی تک امیر کی طرف ہی دیکھ رہا تھا جو اُس کے خیمے کی جانب بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

"کیا معاملہ ہے خان صاحب؟" وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

"امیر میاں واپس آئیں گے تو ساری بات آپ کی سمجھ میں آجائے گی گنیش بابو!" خان نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا اور ٹھیک اسی وقت امیر خان کے خیمے کی طرف مُڑتا ہوا دکھائی دیا۔

"ارے یہ کیا؟" امیر کے قدم خیمے میں داخل ہوتے ہی اٹک گئے۔ کسی گرم گرم رقیق مادّے سے اُس کے پاؤں کے تلوے چپکنے لگے تھے۔ اس نے گھبرا کر نیچے جھک کر دیکھا تو بُری طرح چونک پڑا "یہ تو خون ہے۔" اُس کے چہرے پر گھبراہٹ کی سلوٹیں اُبھر آئیں جس طرف سے خون کا دھارا بہتا ہوا آرہا تھا امیر نے اُس طرف نظر ڈالی تو اُس کے بدن میں ایک کپکپاہٹ سی دوڑ گئی۔ پردے کے پیچھے سے خون کی موٹی لکیر کو بہتے دیکھ کر اُس کا جی چاہا کہ وہ واپس پلٹ جائے لیکن ٹھیک اُسی وقت مشعل کی روشنی میں اُس نے دیکھا کہ باریک پردے کے پیچھے سے کسی نے ہاتھ اُٹھا کر اُسے اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اچانک امیر کے ذہن میں یہ خیال رینگنے لگا کہ کیا خان کو اس بات کا علم ہو چکا تھا کہ اُس کی بیگم نے اُس پر بُری نظر ڈالی ہے؟ اور کیا اسی شک کی بُنیاد پر اُس نے اپنی بیگم کو قتل کر دیا ہے؟ اب وہ اپنی جگہ پر کھڑا نہ رہ سکا۔ خیمے کے ایک کونے میں گڑی ہوئی مشعل کو اُس نے اُکھاڑ لیا اور تیزی سے

پردے کی جانب جھپٹا۔ ہاتھ سے ایک جھٹکا دے کر اس نے پردہ ایک طرف ہٹا دیا اور مشعل کی روشنی میں اندر نظر ڈالی تو اُسے ایک زبردست جھٹکے اور صدمے سے دوچار ہونا پڑا۔ ایک عورت فرش پر چت پڑی ہوئی تھی اور اس کی گردن سے خون بہہ رہا تھا۔ اُس کے مُنہ میں کپڑے کا گولا ٹھونسا ہوا تھا اور اُس کی پھٹی ہوئی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہو جانے کے لیے تڑپ رہی تھیں۔ اُسے دیکھ کر وہ دم توڑتی ہوئی عورت بے چینی سے اپنے ہاتھ پاؤں ہلانے لگی۔

امیر ہونٹ بھینچ کر آگے بڑھا۔ لیکن دو تین قدم آگے بڑھنے میں ہی اُسے ہزاروں میل کی مُسافت کی تھکن کا احساس ہونے لگا۔ زخمی پڑی ہوئی عورت کے قریب آ کر وہ رُک گیا۔ خون آلود زمین پر وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور بیگم کے چہرے پر جُھک کر اُسے دیکھنے لگا۔ پھر دو چار پلوں میں ہی امیر کا دل بیس سال پیچھے کی جانب سرکتا چلا گیا۔ اچانک وہ چلایا۔

"زُہرہ!" اُس کی آواز میں بلا کا درد سمٹ آیا تھا۔

اس نے مشعل کو ایک جانب رکھ کر تیزی سے زُہرہ کے مُنہ میں ٹھنسا ہوا کپڑا ہٹایا اور بولا "تو کیا۔ تم۔۔ ہی بیگم" اس کی آواز ٹوٹ گئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے زُہرہ کی گردن تھام کر اُسے اُٹھانے کی کوشش کی اِس وقت اُس کی کسی حرکت سے بھی نفرت کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔

"میر۔۔" زُہرہ کی آنکھیں آنسوؤں کا سیلاب بہا رہی تھیں "تم۔۔" وہ بہ مُشکل ایک ایک لفظ ادا کر پا رہی تھی "تم نے۔۔ اُسے سب کچھ۔۔ بتا دیا" اُس کے ہونٹ تھرتھرا رہے تھے اور سانس اُکھڑتی جا رہی تھی "وہ سب۔۔ کچھ۔۔ جان گیا۔"

یہ سنا تھا کہ امیر کی گردن کو ایک زبردست جھٹکا لگا اور اس کی آنکھوں میں سُرخ سُرخ ڈورے ناچنے لگے۔ جبڑے سخت ہو گئے اور وہ دانت پیس کر بولا "تو اُس نے تمھاری یہ حالت کر دی؟"

"میر۔۔" زُہرہ ہچکیوں کے درمیان بولی "تمھارے۔۔ ساتھ کی ہوئی بے وفائی کا بدلہ۔۔" بولنے میں اب زُہرہ کو کافی زور لگانا پڑ رہا تھا "خان۔۔ نے۔۔ مجھ سے۔۔ لیا ہے۔۔ اور۔۔"

"اور کیا زُہرہ؟" امیر بھی اب ٹوٹ رہا تھا "بتاؤ زُہرہ۔"

"اور خان کے ساتھ کی ہوئی بے وفائی۔۔ کا۔۔ بدلہ" کہہ کر زُہرہ بُری طرح ہانپنے لگی "اس نے ہمارے بیٹے سے لیا ہے۔" تڑپتے ہوئے زُہرہ نے پیچھے کی جانب ہاتھ سے اشارہ کیا "یو۔۔ یو۔۔ سف" بس یہ آخری الفاظ ادا کرتے ہی اُس کی گردن امیر کے ہاتھ میں ہی ڈھلک گئی۔ لیکن امیر کو ابھی اِس کا خیال ہی نہیں آیا تھا اُس کے کانوں میں تو ابھی تک زُہرہ کے کہے ہوئے الفاظ گونج رہے تھے۔

"ہمارا۔۔ بیٹا۔۔ یوسف"

"زُہرہ" اُس نے دونوں ہاتھوں میں زُہرہ کا چہرہ دبوچ لیا "تم خاموش کیوں ہو گئیں؟ ایک بار پھر مجھ سے کہہ دو کہ یوسف ہمارا بیٹا ہے۔ کہو زُہرہ کہو۔"

مگر زُہرہ کی چڑھی ہوئی آنکھوں سے اب روشنی کی چمک غائب ہو چکی تھی۔ اُس کا خوبصورت جسم اب ساکت دکھائی دے رہا تھا۔ امیر کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ پھر دھیرے دھیرے اس کا چہرہ نیچے کی طرف جُھکنے لگا۔ پھر اس نے اپنے کانپتے ہونٹ زُہرہ کی ٹھنڈی پیشانی پر رکھ دیئے اور اس کے گرم گرم آنسو زُہرہ کے چہرے پر گر کر پھسلنے لگے۔ دو چار ہچکیاں لے کر امیر نے بہت احتیاط سے زُہرہ کا سر زمین پر رکھ دیا۔ پھر اُس نے اُس کی کھلی ہوئی آنکھوں کو دھیرے سے بند کرنے کی کوشش کی۔ پھر اپنے خون میں ڈوبے ہوئے ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو کچھ دیر تک گھور گھور کر دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ اُٹھ کر کھڑا ہوا تو زُہرہ کے الفاظ ایک بار پھر اُس کے کانوں میں گونجنے لگے "ہمارا بیٹا یو۔۔ سف" یکایک ایک جھٹکے سے اس نے دوسرا پردہ ہٹایا اور پردے کے پیچھے کا

منظر دیکھ کر اُسے چکر آنے لگے۔ یوسف کا سر اس کے دھڑ سے الگ ہو کر ایک کونے میں پڑا ہوا تھا۔ اور کٹی ہوئی گردن سے خون نکل کر زمین پر بہہ رہا تھا۔

"یا خدا" امیر نے دونوں ہاتھوں سے اپنے سینے کو دبایا۔ باہر سے دھنا دھن ڈھول اور طبلے کی آوازیں آ رہی تھیں اور امیر کو اس وقت یہ شور بہت ناگوار گزر رہا تھا۔ اُس کے دل کے اندر تو ایک طوفان اٹھا ہوا تھا۔ یوسف کے چہرے پر سے نظریں ہٹانے کے لیے اُس نے ایک جھٹکے سے اپنی گردن گھمائی پھر وہ زیادہ دیر تک وہاں کھڑا نہ رہ سکا۔ آہستہ آہستہ لڑکھڑاتی چال سے وہ خیمے کے باہر نکل آیا۔ اُسکے قدم لڑکھڑا رہے تھے اور کمر یوں جھکی ہوئی نظر آ رہی تھی جیسے وہ اپنی محبوبہ اور اپنے بیٹے کی لاشوں کو اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے ہو۔

گنیش بہت زیادہ بے چین تھا کیونکہ امیر نے ممتا کو کے لیے رامو کو آواز نہیں دی تھی اور نہ ہی خان کے خیمے میں جا کر اُس نے کوئی آواز دی تھی۔ اس درمیان خان اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا دماغی توازن بگڑ گیا ہو۔ وہ بے سر پیر کی بڑبڑاہٹ کر رہا تھا۔

"بے وفائی کا بدلہ۔۔ اُس کی زہرہ ہی میری بیگم۔۔ اُس کے بیٹے کو میں نے اپنا بیٹا سمجھا۔۔ اتنے سالوں تک میں دھوکے کا شکار بنا رہا۔۔ کم بخت عورت۔۔"

"امیر آ رہا ہے" اچانک گنیش نے امیر کو قریب آتے دیکھ کر کہا۔ پھر وہ اُس کے خون آلود ہاتھوں اور اُداس چہرے کو دیکھ کر پوچھ بیٹھا "یہ تم کیا کر آئے ہو امیر؟"

"گنیش بابو گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے" خان نے انتہائی ٹھنڈے لہجے میں جواب دیا "امیر میاں نے کچھ بھی نہیں کیا ہے۔ اِن کا جو کام تھا وہ میں نے پورا کر دیا ہے" اتنا کہہ کر وہ زور سے قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا۔ ڈھول اور طبلے کی آوازیں اب قدرے دھیمی پڑ گئی تھیں۔ امیر بپھرے ہوئے شیر کی طرح آہستہ آہستہ بہت ہی قریب آ گیا۔ اُس کے بدلے ہوئے چہرے کا بھیانک روپ دیکھ کر گنیش رامو اور روپ سنگھ وغیرہ کو سخت حیرانی ہو رہی تھی۔ صرف وہاں خان ہی ایک ایسا شخص تھا جس کے

نامور مصنف ایم۔ الیاس۔ کے شہکار

قلم سے ایک اچھوتی کہانی

ذلیل

خوبصورت سرورق عمدہ پرنٹنگ کتابت

قیمت =/150 روپے

جاسوسی ڈائجسٹ کا مقبول سلسلہ

سرکش

محمود احمد مودی کے شہکار قلم سے

12 حصوں میں شائع ہو گیا ہے

قیمت فی حصہ =/50 روپے

مکمل سیٹ =/600 روپے

مکتبہ القریش

سرکلر روڈ اردو بازار لاہور

فون 7668958

چہرے پر کسی قسم کے کوئی تاثرات دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ وہ نظریں اٹھائے ہوئے ہنس ہنس کر امیر کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"کیوں میاں! اب تو تسلی ہو گئی نا؟" اُس کی آواز میں خوشی کی جھلک تھی۔ "آپ نے کہا تھا نا کہ اگر زہرہ مل جائے تو اس سے بے وفائی کا بدلہ لوں گا۔ آپ کی طرح مجھے بھی بدلہ لینا تھا۔ آپ کے رنگین قصے کا انجام بھی رنگین ہی ہو گیا۔"

ہر کوئی پتھر کی طرح بے حس و حرکت بیٹھا امیر کے چہرے کو تک رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بکھری ہوئی سنجیدگی کو دیکھ کر گنیش کی زبان بھی گنگ ہو کر رہ گئی تھی۔ اور وہ امیر سے یہ بھی نہ کہہ سکا کہ اب تو مدد ہو گئی امیر اب تو جلدی سے ساتھیوں کو اشارہ کرو۔

"ہاں خان صاحب آپ نے بدلہ لے لیا۔" پاگل کی طرح بڑبڑاتے ہوئے امیر نے دھیرے دھیرے قدم بڑھائے اور گنیش کے پیٹھ پیچھے آ کر خان کے بالکل سامنے آ گیا۔ پھر اس سے پہلے کہ خان گھبرا کر پلٹ کر دیکھنے کی کوشش کرتا امیر نے پھرتی سے اپنا پیلا رومال کھینچ نکالا اور چلا کر بولا "جے بھوانی"

دوسرے ہی پل امیر کا قاتل رومال خان کی گردن میں پھنس گیا اور ساتھ ساتھ خان کے دوسرے ساتھیوں کے گلوں پر بھی امیر کے ساتھیوں کے رومال لپٹتے چلے گئے۔ رامو نے فوراً ہی بوڑھی کنیز کے پاس پہنچنے کے لیے دوڑ لگا دی۔ ڈھول اور دف بجتے رہے اور غزل کے بول فضا میں لہراتے ہی رہے۔

خان کی پیٹھ پر گھٹنا ٹیک کر امیر نے زور لگانا شروع کر دیا۔ خان نے اُس کی گرفت سے نکلنے کے لیے پیٹھ پیچھے سے امیر کی ٹانگیں پکڑنے کی کوشش کی لیکن روپ سنگھ اور گنیش نے اس کا ایک ایک ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر اُسے بے بس کر دیا۔ دھیرے دھیرے خان کا دم گھٹنے لگا اور اس کا سینہ پھولنے اور پچکنے لگا۔ ماتھے کی رگیں اُبھرنے لگیں اور امیر کا جنون بڑھتا گیا۔

پھر کب خان کی گردن ڈھلک گئی اور کب گاجے بجانے کا سلسلہ ختم ہو گیا اور کب کوئی بھاگا کب کوئی آیا؟ امیر کو کسی بات کی خبر نہیں ہوئی۔ وہ تو بس خون میں لت پت زہرہ کو یاد کرتے ہوئے چپ چاپ ایک جانب کھڑا تھا۔ یوسف کا دھڑ سے الگ پڑا ہوا سر بار بار اُس کی نظروں میں گھوم جاتا تھا اچانک رامو نے قریب آ کر اُسے جھنجھوڑ دیا اور روپ سنگھ کی بات سن کر اُسے یہ خیال آیا کہ اُسے اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ اُس کی چھاؤنی کو چاروں سے گھیرے میں لیا جا چکا تھا اور اُس کے سامنے پستول تانے ہوئے انگریز افسر ولیم سلومن کھڑا تھا۔

"یو آر اے کیلر۔" ولیم سلومن نے غصے سے دانت پیستے ہوئے کہا۔ "ہری اپ۔۔ چلو ورنہ شوٹ کر دوں گا۔"

امیر نے ایک نظر اُس کی طرف دیکھا لیکن اس کے چہرے سے کسی گھبراہٹ کا اظہار نہیں ہو رہا تھا اُس نے مقابلہ کرنے کے لیے اپنی تلوار کے دستے پر بھی ہاتھ نہیں رکھا۔ وہ ولیم سلومن کی طرف چند لمحوں تک دیکھتا رہا پھر اس نے قدم آگے بڑھا دیئے ولیم سلومن نے اپنا پستول والا ہاتھ ذرا اور اُوپر اٹھا کر کہا۔ "امیر علی اب تمہارا کھیل ختم ہو چکا ہے۔ بھاگنے کی کوشش بھی کامیاب نہیں ہو گی۔"

یہ سن کر امیر دھیرے سے ہنسا پھر گردن اُٹھا کر اس نے آسمان کی طرف دیکھا اور دونوں ہاتھ اٹھا کر خدا کو یاد کرتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔ ٹھیک اُسی وقت پیچھے سے کسی نے اُس کی کلائی پکڑ لی۔ یہ صوبیدار رستم خان تھا۔ امیر نے کچھ کہے بغیر چپ چاپ اپنا سر جھکا دیا۔ امیر اور اس کے بیتالیس ساتھی گرفتار کر لیے گئے۔ باقی کے جو لوگ بھاگ جانے میں کامیاب ہوئے تھے ان میں گنیش بھی تھا۔ وہ امیر کا گھوڑا لے کر ہی بھاگا تھا

●

اچانک یہ سب کیسے ہو گیا؟

ساگر کے جیل میں زنجیروں سے جکڑے ہوئے امیر

کے دل میں بار بار یہ سوال اُٹھ رہا تھا۔ وہ بے خبری میں گرفتار ہوا ہے۔ یہ صدمہ تو ابھی اُسے لگا ہی نہ تھا ابھی تک تو وہ زُہرہ اور یوسف کی موت کے صدمے سے باہر نہیں نکل پایا تھا۔ ابھی تو گرفتاری کا صدمہ بھی اُسے برداشت کرنا تھا۔ اِس وقت کوئی اور خیال اُس کے دماغ میں آ ہی نہیں رہا تھا۔ خان کی بیگم ہی دراصل زُہرہ ہے۔ یہ بات اُسے ذرا پہلے معلوم ہو جاتی تو؟ یوسف اس کا اپنا ہی بیٹا ہے اِس کا علم اُسے پہلے ہی ہو جاتا تو؟ مرتے وقت زُہرہ کی باتوں میں محبت اور سچائی کی جھلک صاف دکھائی دے رہی تھی۔ نہیں۔۔ شائد اُس نے اُسے دھوکہ نہیں دیا تھا۔ وہ تو اُسے سب کچھ بتا دینا چاہتی تھی۔ اُس نے تو یوسف کی معرفت کہلوایا تھا کہ صبح کو ایک خاص بات کرنی ہے اور یہ صبح ہوئی ہی نہیں۔ خود اُس کے اندر چھپے ہوئے ٹھگ نے اُس کی اپنی دنیا ہی لوٹ لی۔ شکار کی پیاس بجھانے گیا تو خود اُس کی زندگی ہی پیاسی رہ گئی۔۔ لیکن اِس کی بجائے وہ اگر ساگر جا کر خان کا مہمان بن گیا ہوتا تو اُسے زُہرہ کی حقیقت کا علم ہو چکا ہوتا اور یوسف کی اصلیت سے بھی آگاہ ہو جاتا۔ پھر زُہرہ سے سارا معاملہ طے کر لینے کے بعد خان صاحب کے ساتھ حیدر آباد جانے کے لیے روانہ ہو جاتا اور راستے میں اُسے ختم کر دیتا اور پھر کسی بہانے سے واپس ساگر آ کر زُہرہ اور یوسف کو سمجھا بجھا کر اپنے ساتھ لے جا سکتا تھا۔ بس پھر تو زُہرہ کا پیار مل جاتا۔ بیٹے کی کمی بھی پوری ہو جاتی اور غروب ہوتی ہوئی زندگی میں ایک نیا سورج طلوع ہو جاتا۔

"امیر میاں!" دونوں گھٹنوں کے درمیان سر دبائے ہوئے امیر کو رامو کی آواز نے چونکا دیا۔ "دو وقت سے تم نے کچھ بھی نہیں کھایا۔ کب تک اپنی ضد پر قائم رہو گے؟"

امیر نے دھیرے دھیرے گردن اُٹھائی اور سُوجی ہوئی سُرخ سُرخ آنکھوں سے رامو کی طرف دیکھا۔ اپنے وفادار ساتھی کے دُکھی چہرے کو دیکھ کر اُس کی نظریں کانپنے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے ایک گہرا سانس اور بولا: "رامو! میری بھوک مر چکی ہے۔ کھانے خواہش ہی نہیں ہوتی۔" کہہ کر اُس نے گلے سے تھوک اتارا۔

"لیکن میاں اگر صرف بھوک مری ہوتی تو فکر نہ رامو اُس کی جانب دیکھے بغیر بول گیا۔ "مجھے تو اس بات کا دُکھ ہے کہ تمھاری ہمت ٹوٹ چکی ہے۔"

"ہاں رامو" امیر پھیکی ہنسی ہنس کر بولا: "یوں لگ ہے کہ اب تو سب کچھ ٹوٹ چکا ہے اور اس کے پر بیٹھ کر ہمیں مجبوراً جینا پڑ رہا ہے۔"

"مجھے تو یہ وزنی بیڑیاں پریشان کر رہی ہیں رامو نے ترچھی نظروں سے امیر کی طرف دیکھا۔ اس سے چھٹکارا پانے کی کوئی ترکیب سمجھ میں نہیں آتی امیر میاں!" رامو کی اس بات نے امیر کو چونکا دیا اور پہلی بار اُسے اپنے پاؤں میں پڑی ہوئی لوہے کی بیڑیوں کا احساس ہوا۔ ان بیڑیوں کو دیکھتے ہی اُسے محسوس ہوا کہ وہ سچ مچ گرفتار کیا جا چکا ہے۔ اُس نے گردن گھما کر دیکھا تو اُس کی نظر بوڑھے روپ سنگھ پر پڑی جو ایک کونے میں پڑا سو رہا تھا۔ گورے صاحب ولیم سلومن نے اُن تینوں کو ایک ہی کوٹھڑی میں بند کر دیا تھا جب کہ اُن کے دوسرے ٹھگ ساتھیوں کو اُن سے علیحدہ رکھا گیا تھا۔ اور اِس بات کا خیال بھی اُسے اِسی وقت آیا تھا۔

"رامو! یہ روپ سنگھ کہیں بیمار تو نہیں ہے؟"

"نہیں۔۔ بدن میں درد ہے اس لیے لیٹا پڑا ہے" رامو نے کہا: "ویسے کل شام اِس کا بدن ذرا تپ رہا تھا۔"

"اس نے کچھ کھایا تھا یا نہیں؟"

جواب میں رامو تھوڑی دیر تک امیر کو دیکھتا رہا پھر اُس نے ایک سرد سی آہ بھرتے ہوئے کہا: "تم بھوکے رہو تو پھر کھانا کیسے اچھا لگے گا؟"

امیر کو ایک جھٹکا سا لگا اور وہ ہمدردی بھرے غصّے سے بولا: "اور تم مجھے یہ بتاتے بھی نہیں ہو۔۔ کیا تم اُسے بھوکا مار دینا چاہتے ہو؟ لاؤ روٹی کہاں

؟" رامو کو اس کی محبت کا یہ انداز اچھا لگا۔ اس امیر کی اُداسی کو دور کرنے کے لیے ہی یہ بات کہی تاکہ وہ کھانے کے لیے بیٹھ جائے۔ اُس نے جلدی جلدی روٹی نکالنی شروع کر دی۔ روٹیوں کو دیکھ کر امیر کی بھوک یکایک کھل اٹھی۔ وہ سرک کر روپ سنگھ کے پاس پہنچا اور دھیرے دھیرے اُس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرنے لگا پھر تھوڑی دیر بعد وہ بولا: "چاچا اٹھ جاؤ ہم روٹی کھا لیں۔" روپ سنگھ کو وہ ہمیشہ "تم" کہہ کر ہی مخاطب کرتا آیا تھا لیکن اِس وقت وہ اُسے محبت سے چاچا کہہ بیٹھا تھا۔ "مجھے بھی بڑے زور کی بھوک لگ رہی ہے۔" بولتے بولتے وہ اپنے آنسوؤں کو اپنی پلکوں میں چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر کچھ ایسے آثار تھے جیسے وہ سوکھی روٹیوں کے ساتھ اپنا درد بھی چبا رہا ہو۔۔

"امیر!" خالی پیٹ میں روٹی جاتے ہی روپ سنگھ کی آواز نکلی: "ہمارے پاس بھاگ جانے کا موقعہ تو تھا لیکن پھر بھی۔۔"

"ہم نے تمھیں ہوشیار کرنے کی بہت کوشش کی۔" رامو نے روپ سنگھ کی ادھوری بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا: "لیکن خان کی بیٹھ سے تو تم چپک کر رہ گئے تھے۔ اس کے ختم ہو جانے بعد بھی تم نے اپنے رومال کا پھندہ ڈھیلا نہیں کیا۔ تمھارے چہرے پر جو جنون طاری تھا ایسا جنون تو ہم نے اس سے پہلے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا۔ میں نے اور روپ سنگھ نے تمھارے کندھوں کو پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا تھا تب کہیں جا کر تم ہوش میں آ سکے تھے۔ لیکن ہمیں دیر ہو چکی تھی کیونکہ ٹھیک اُسی وقت کم بخت گورا صاحب ہمیں گھیر چکا تھا۔"

رامو کے ایک ایک لفظ نے امیر کی نظروں میں اُس منظر کی یاد کو تازہ کر دیا تھا پھر چند لمحوں بعد وہ اِس طرح بولا جیسے اس کا دم گھٹ رہا ہو۔ "مجھے افسوس ہے دوستو! کہ میں اپنا ہوش کھو بیٹھا تھا اور میری وجہ سے تم لوگ بھی پھنس گئے۔ تم لوگ گنیش کی طرح بھاگ بھی تو نہیں سکے۔"

"گنیش وہاں سے کب نکل بھاگا تھا اِس کا تو ہمیں بھی خیال نہ تھا۔" روپ سنگھ نے رُکی رُکی سی آواز میں کہا: "جاتے جاتے اُس نے ہمیں ہوشیار تک نہیں کیا اور نہ ہی کچھ بتایا۔"

"سوکھی روٹی کا نوالہ گلے سے نیچے اتارنے کے لیے رامو پانی کا ایک لوٹا پی گیا پھر بولا: "ہمارے جو آدھے ساتھی فرار ہونے میں کامیاب ہوئے ہیں ان میں زیادہ تر گنیش ہی کے آدمی تھے۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہم سب کو بے خبر رکھ کر گنیش اپنے آدمیوں کے ساتھ بھاگ نکلا۔" امیر نے پانی کا گھونٹ اتارتے ہوئے اپنے غصّے کا اظہار کیا "آخر وہ اپنی ذات دکھا ہی گیا۔"

اچانک کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی تو وہ تینوں ہی خاموش ہو گئے۔ جیل کے داروغہ کے ساتھ انھیں کچہری کا ایک کارندہ کوٹھڑی کی طرف بڑھتے ہوئے دکھائی دیئے۔ کوٹھڑی کے باہر کھڑے ہوئے سنتری نے داروغہ کو سلام کیا۔ پھر داروغہ نے سنتری کو چابیوں کا گچھا دیتے ہوئے حکم دیا: "دروازہ کھول دو۔"

دروازہ کھل گیا تو تینوں قیدیوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"تم اور تم" دروازہ کھلتے ہی داروغہ نے رامو اور روپ سنگھ کی طرف باری باری اُنگلی اٹھائی: "تم دونوں اُس دیوار کی جانب مُنھ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔"

رامو اور روپ سنگھ کچھ کہے بغیر چپ چاپ اپنی جگہ سے اُٹھے اور کوٹھڑی کی دیوار کے پاس جا کر اپنا منھ پھیر کر کھڑے ہو گئے۔ داروغہ اندر آ گیا اور بولا: "امیر علی کھڑے ہو جاؤ تمھیں کچہری میں چلنا ہے صاحب نے تمھیں بُلایا ہے۔"

"کون صاحب نے؟" امیر نے اٹھنے سے پہلے پوچھا۔ داروغہ کو اُس کا یہ سوال پسند نہیں آیا لیکن اُسے جواب دینا پڑا: "بڑے گورے صاحب نے۔"

"اچھا" امیر ہنستے ہنستے اُٹھ کھڑا ہوا۔ "لیکن آپ نے ان دونوں کو دیوار سے مُنہ لگا کر کیوں کھڑا رکھ دیا ہے؟"

داروغہ کو امیر کا یہ سوال اور بھی ناگوار لگا تھا اِس لیے اُس نے اپنی بندوق کو کاندھے پر ٹھیک سے رکھا اور آنکھیں نکال کر امیر سے بولا۔ "یہ ہماری مرضی کی بات ہے۔ تم باہر نکلو صاحب راہ دیکھ رہے ہیں۔"

امیر پاؤں کی بیڑیوں کو سنبھالتے ہوئے اُٹھا اور کوٹھڑی کے دروازے پر جا کر چند لمحوں کے لیے کھڑا رہ گیا پھر رامُو اور روپ سنگھ کی طرف دیکھ کر ہلکے سے آنکھیں جھپکائیں جیسے کہہ رہا ہو۔ تم لوگ فکرمند نہ ہونا۔ میں کسی سے ڈرنے یا دبنے والا نہیں ہوں۔

امیر کے باہر آتے ہی سنتری نے لپک کر کوٹھڑی کا دروازہ بند کر کے تالا لگا دیا اور جاتے جاتے داروغہ رامُو اور رُوپ سنگھ سے کہتا گیا۔ "اب تم لوگ چاہو تو بیٹھ جاؤ اور چاہو تو سو جاؤ۔" امیر کو اس کی یہ بات سن کر ہنسی آگئی اور وہ آگے بڑھتے ہوئے داروغہ سے پوچھ بیٹھا۔ "داروغہ جی کیا آپ کا یہ خیال تھا کہ کوٹھڑی کا دروازہ کُھلا دیکھ کر یہ لوگ بھاگنے کی کوشش کریں گے؟"

"پھر وہی سوالات؟" داروغہ کی مونچھوں پر بل پڑ گئے۔ "تم لوگ کتنے خطرناک ہو۔ یہ سب جانتے ہیں لیکن ہم لوگ ہوشیار رہنا چاہتے ہیں۔"

"تب تو لگتا ہے ڈیڑھ دن میں آپ لوگ ہمارے بارے میں بہت کچھ جان چکے ہیں؟" امیر دھیمی ہنسی ہنس کر بولا تو داروغہ کا جی چاہا کہ وہ اس کی پسلی پر ایک گھونسہ رسید کر کے اُسے چُپ رہنے پر مجبور کر دے لیکن وہ ایسا نہیں کر سکا۔ بلکہ اس کی بجائے وہ دل ہی دل میں ولیم سلومن پر غصہ اتارنے لگا۔ اُس کے خیال میں اُس نے ہی اِن ٹھگوں کو سر پر بٹھا رکھا ہے۔ یہ ہی وجہ ہے قاتل ہونے کے باوجود بھی شریف آدمیوں کی طرح سوالات کر رہے ہیں۔

ولیم سلومن کی کچہری میں داخل ہو کر امیر نے سر پر ہاتھ اٹھا کر اُسے سلام کیا اور ایک جانب کھڑا ہو گیا بیڑیوں اور ہتھکڑی کی کھنا کھن سننے کے بعد ولیم سلومن نے نگاہیں اُوپر اٹھائیں تو اُسے سامنے کھڑا ہوا امیر علی مُسکراتا ہوا دکھائی دیا۔ ولیم سلومن کی بھوری آنکھیں تھوڑی دیر تک امیر کو گھورتی رہیں۔ اُسے حیرت ہو رہی تھی کہ گرفتار کرتے وقت اس مُسکراتے ہوئے آدمی کا چہرہ کس قدر غمزدہ اور اُداس دکھائی دے رہا تھا لیکن اِس وقت اُسے دیکھ کر ولیم سلومن کو یوں لگ رہا تھا جیسے جیل داروغہ بھول سے امیر علی کے بجائے کوئی اور قیدی کو اس کے سامنے لے آیا ہے۔

امیر سے سوالات کرنے سے قبل اس نے داروغہ اور کچہری کے کارندے کو کمرے سے باہر بھیج دیا۔ اس درمیان امیر بڑے دھیان سے ولیم سلومن کے چہرے پر بکھرے ہوئے تاثرات کو پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے انداز سے یوں لگ رہا تھا جیسے مُجرم وہ نہیں بلکہ اس کے سامنے بیٹھا ہوا انگریز افسر ہی مُجرم ہو۔

"ہاں امیر علی" ولیم سلومن نے کُرسی سے پُشت سے ٹیک لگا کر دھیمے لہجے میں ابتدا کی۔ "تم شاید نہیں جانتے ہو گے کہ تمھارے گرفتار ہو جانے پر مجھے کتنی خوشی ہوئی ہے۔"

"میں جانتا ہوں جناب!" امیر نے مُسکراتے ہوئے خود اعتمادی سے جواب دیا۔ "آپ پچھلے پانچ سالوں سے میری گرفتاری کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے اور پھر اتفاقاً آپ کامیاب ہو گئے۔"

"کمال کا آدمی ہے۔" ولیم سلومن دل ہی دل میں بولا۔ "میری کامیابی کو اتفاقی کامیابی کہہ کر یہ شاید مجھ پر ہنس رہا ہے۔"

"سُنا ہے دو وقت سے تم نے کچھ کھایا پیا نہیں ہے؟" اُس نے پوچھا۔

"لیکن اِس وقت کھا کر ہی آپ کے پاس آیا ہوں۔" امیر مُسکرایا۔ اُس کے اِس جواب میں غُرور کی جھلک تھی۔ باجاؤ کی یہ بات ولیم سلومن سمجھ نہیں سکا۔ اِسی لیے دوسرا سوال کرنے میں اُس نے جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ "کل رات اور آج صبح تم بہت اُداس اور چُپ چُپ تھے۔ کسی کی بات کا تم نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ تو کیا اپنی گرفتاری سے تم گھبرا گئے تھے؟" تھوڑی دیر بعد ولیم سلومن نے پوچھا۔

"اس وقت کیا میں آپ کو گھبرایا ہوا دکھائی دے رہا ہوں؟"

"امیر علی" ولیم سلومن کا لہجہ اس بار ذرا سخت ہو گیا۔ "یہاں تمھیں جواب دینے کے لیے کھڑا کیا گیا ہے سوالات پوچھنے کے لیے نہیں۔"

ولیم سلومن کے اِس سخت لہجے کا امیر پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ پھر بھی اُس نے ادب و لحاظ کا دامن نہیں چھوڑا۔ "میں سمجھ گیا اب کوئی سوال نہیں کروں گا جناب۔"

اُس کے اِس جواب نے ولیم سلومن کے غصّے کو پھر ٹھنڈا کر دیا۔ اُس نے میز پر پڑے ہوئے ایک خاکی ڈوری کھولی اور اندر سے ایک کاغذ نکال کر اُس پر نظریں جما کر کہتا گیا۔ "تم اور تمھارے جو ساتھی گرفتار ہوئے ہیں ان پر عدالت میں مقدمہ چلایا جائے گا۔ تم پر لگائے گئے الزامات اس کاغذ پر درج ہیں جو تمھیں پڑھ کر سنا رہا ہوں۔"

"جناب! آپ یہ سب مجھے زبانی ہی بتا دیں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔" امیر نے خندہ پیشانی سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" شاید ولیم سلومن بھی اس طویل تحریر کو پڑھ کر وقت برباد کرنا نہیں چاہتا تھا۔ "تو سنو" وہ کاغذ کو میز پر رکھتے ہوئے بولا۔ "تم پر خان صاحب، اس کی بیگم اور اُس کے نوجوان بیٹے کے علاوہ اُس کے دس ساتھیوں کے قتل کا تازہ الزام عائد کیا گیا ہے تم سب لوگ ٹھگ ہو۔ اور اِس جُرم کے لیے سب سے زیادہ تم کو ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے۔ کیونکہ تم اِس خطرناک گروہ کے سردار ہو۔ اور اس سے قبل بھی

نامور مصنف ایم۔ الیاس۔ کے شہکار

قلم سے ایک اچھوتی کہانی

ذلیل

خوبصورت سرورق عمدہ پرنٹنگ "کتابت

قیمت =/150 روپے

تمھارے ہاتھوں سینکڑوں قتل ہو چکے ہیں۔"

امیر کے چہرے پر یہ سُن کر بھی کوئی تاثرات نہیں اُبھرے۔ اس نے نہ تو شرم سے اپنی گردن جُھکائی۔ اور نہ ہی انکار کے لیے گردن ہلانے کی ضرورت محسوس کی۔ وہ اس طرح ولیم سلومن کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے اُس کے سوال کا منتظر ہو۔

"میں تمھیں ایک مشورہ دیتا ہوں۔" ولیم سلومن اچانک ہمدردانہ لہجے میں بولا۔ "عدالت میں تم سلطانی گواہ بن جاؤ اور اِن سارے گناہوں کا جو کب، کس وقت، کہاں اور کس کے ساتھ ہوئے، سب قبول کر لو۔" ولیم سلومن نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ ادب سے سینے پر ہاتھ باندھے کھڑے ہوئے امیر کے دونوں ہاتھ ایک جھٹکے سے نیچے آ گئے۔ پھر اس کے کھُلے ہوئے ہتھیلیوں کی مُٹھیاں بند ہونے لگیں اور وہ تیز تیز سانس لینے لگا۔ اُس کی پیشانی پر بکھری ہوئیں لکیریں گہری ہوتی دیکھ کر ولیم سلومن کو یوں لگنے لگا کہ بس چند ہی لمحوں میں اس خطرناک ٹھگ کی ساری گرمی پگھل جائے گی۔ لیکن نہیں امیر نے بند مُٹھی میں اپنے غصّے کو مسل دیا اور دھیرے دھیرے مُسکرانے لگا پھر بولا۔ "جناب! میرا خیال ہے آپ سلطانی گواہ بنا کر مجھ پر رحم کرنا چاہتے ہیں؟"

"رحم" اتنا کہہ کر ولیم سلومن نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے اور اس کی آنکھوں میں ناگواری کے سائے لہرانے لگے۔ "امیر علی جھوٹ بولنا مجھے پسند نہیں ہے سچ بات یہ ہے کہ مجھے تم پر ذرا بھی رحم نہیں آتا۔ تمھارے گناہ کسی رحم کے لائق ہی نہیں ہیں۔ قانون کی کتاب میں جو موت کی سزا ہے وہ بھی تمھارے کیے ہوئے جرموں کے لیے کافی نہیں ہے۔" کہتے کہتے ولیم سلومن تھوڑی دیر کے لیے رُکا پھر اپنی آواز میں تبدیلی لاتے ہوئے آگے بولا۔ "اگر تمھیں زندہ رکھ کر دوسرے سینکڑوں بے قصور لوگوں کی جانیں بچ سکتی ہوں تو میں تمھیں پھانسی پر چڑھانا پسند نہیں کروں گا۔"

"میں سمجھا نہیں جناب!" امیر نے ساری بات سمجھ جانے کے باوجود کہا تھا۔ یہ بات ولیم سلومن بھی جانتا تھا۔ لیکن پھر بھی اس نے امیر کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "دیکھو امیر علی! میں نے اس مُلک کی رعایا کو ٹھگوں کے شکنجے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہائی دلانے کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ گرفتار کیے جانے والے ٹھگوں کے ہر سردار کے سامنے میں اپنی یہ شرط رکھتا ہوں کہ وہ دوسرے ٹھگوں کی گرفتاری میں میرا ساتھ دیں گے تو اُن کی گردن میں پھانسی کا پھندہ نہیں پڑے گا۔ فرنگیا جیسے ٹھگ نے بھی میری یہ شرط مان لی ہے۔"

"آپ ہر ٹھگ کو فرنگیا کیوں سمجھتے ہیں؟" امیر اب اپنے غصّے کو ضبط نہیں کر سکا۔ "سچا ٹھگ زندہ رہنے کے لیے یہ نیچ کام کبھی بھی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اس نے دیوی کے سامنے قسم کھائی ہوئی ہے۔ ساتھیوں اور ہم پیشہ لوگوں سے دغا کرنے والے کی سات پشتوں پر دیوی کا قہر نازل ہوتا ہے۔"

یہ سُن کر ولیم سلومن کے ہونٹوں پر ایک درد بھری مسکراہٹ ناچنے لگی اور وہ بولا۔ "دیوی کا نام لے کر تم لوگ ایسے کام کرتے ہو؟ دیوی کا سہارا لے کر اپنے ہی لوگوں کی جانیں لیتے ہو۔ تمھیں یہ کہتے ہوئے کیا ذرا بھی شرم نہیں آتی؟"

"گستاخی معاف کیجیے گا جناب!" امیر جوش جوش میں ولیم سلومن کی میز پر گھونسہ مار بیٹھا۔ "آپ۔ آپ انگریز لوگوں نے ہمارے ساتھ بھی کچھ تو کیا ہے جس رعایا کا نام لے کر آپ لوگ ہمارے گناہوں کا حساب لگا رہے ہیں اُس رعایا سے آپ پوچھیں تو سہی کہ وہ آپ لوگوں کو بھی ٹھگ سمجھتی ہے یا نہیں؟ مذہب کی آڑ لے کر آپ لوگوں نے ہماری زمین پر پاؤں پھیلا دیئے۔ آپ لوگ یہاں کاروبار کرنے کی غرض سے آئے تھے لیکن اب کیا کر رہے ہیں آپ لوگ؟ زمین حاصل کرنے اور ملکوں کو جیتنے کے لیے آپ لڑائیاں لڑتے ہیں۔ اور آپ کا لشکر لوگوں کی جانیں لوٹتا ہے۔ راجے مہاراجوں کے تخت ہضم کر جاتا ہے۔ ہمارے جیتو جیسے بہادر باغی کو آپ لوگوں نے کتّے کی موت مار ڈالا ہے۔ ہمیں آپس میں لڑا کر آپ لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں اور اب میرے ساتھ بھی آپ یہی چال چلنا چاہتے ہیں۔ یعنی ایک ٹھگ کو پکڑ کر اُس کے ذریعہ دوسرے ٹھگوں کو پکڑنا اور اس کے بعد بھی رحم کا دکھاوا کرنا۔ مارے غصّے کے اُسے سُوجھ نہیں رہا تھا کہ وہ آگے کیا کہے؟ ہانپتے ہانپتے اُس نے ولیم سلومن کی طرف دیکھا۔ جواب بھی بہت ہی سکون سے بیٹھا تھا۔ اس کے انداز سے یوں لگ رہا تھا جیسے اس پر امیر کی بات کا کوئی اثر نہیں ہوا ہے۔ تھوڑی دیر تک وہ اپنی بھوری آنکھوں سے امیر کو گھورتا رہا پھر ایک طنزیہ ہنسی ہنس کر بولا۔ "تم نے اپنا غصّہ اُتار لیا۔ لیکن میں تمھاری باتوں کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھتا۔ جو آدمی اپنے ہی دیش بھائیوں کی گردنیں دبا دیتا ہو اُسے دیش سے محبت کے اظہار کا کوئی حق نہیں ہے۔ تم محض اپنے آپ کو دھوکہ دینے کے لیے ہی انگریزوں کے جُرم کو بے نقاب کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔ مگر اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔ میں نے فرنگیا کو صرف ایک منٹ کی مہلت دی تھی لیکن تمھیں میں پورے ایک دن کی مہلت دیتا ہوں۔"

"کس لیے؟"

"اپنے جرموں کا اقرار کرنے اور سرکار کا ساتھ دینے کا وعدہ کرنے کے لیے۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔" امیر نے خود اعتمادی سے جواب دیا۔

"تم سوچ سمجھ کر جواب دینا۔"

"میں جانتا ہوں جناب! آپ مجھے ایک دن کی مہلت کیوں دے رہے ہیں؟" امیر نے کہا۔

"کیوں؟" ولیم سلومن نے تجسس سے پوچھا۔ "بتاؤ امیر میں تمھیں ایک دن کی مہلت کیوں دے رہا ہوں؟"

"میری شخصیت میرے وجود کو دھوکہ دینے کے لیے" امیر نے بے دھڑک جواب دیتے ہوئے کہا۔ "آدمی اگر جنون میں ہو تو وہ اپنی جان کی بھی پرواہ نہیں کرتا لیکن غصّہ اُتر جانے کے بعد اس کے دل میں زندہ رہنے کی لالچ پیدا ہو جاتی ہے۔ موت کا خوف بڑھنے لگتا ہے لیکن جناب! آپ کیوں اپنا وقت برباد کر رہے ہیں؟ امیر علی کو ایسی کسی زندگی کی لالچ نہیں ہے۔ کیوں کہ مجھے تو پھر بھی آپ کی ان لوہے کی زنجیروں میں بندھ کر آپ کے جیل کی کسی کال کوٹھری میں ہی زندہ رہنا ہے۔ اس لیے اقرارِ جرم کی بات آپ بھول جائیں جناب!"

"تو تم یہ بھی یاد رکھو امیر کہ تمھارے اپنے ساتھیوں میں سے ایسے بہت سے لوگ ہمیں مل جائیں گے جو ہمارا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ دوسرے ٹھگوں کی جانب انگلی اُٹھانے والے لوگوں کو میں ڈھونڈ نکالوں گا۔ یاد رکھو تمھارے بغیر میرا یہ کام نہیں رُک سکتا۔ میں جب تک ٹھگوں کو اس دھرتی پر سے نیست و نابود نہیں کر دوں گا اُس وقت تک چین سے نہیں بیٹھوں گا۔"

یہ سُن کر امیر ہنس پڑا۔ "آپ کو اپنی طاقت پر شاید بہت غرور ہے۔ لیکن آپ کو اس بات کا علم نہیں ہے کہ ٹھگ کا بیٹا بھی ٹھگ ہی ہوتا ہے۔ اس مُلک کا کوئی گاؤں ایسا نہیں ہے جہاں ہمارے ہم پیشہ ٹھگ بھائی ہمارے اس کام کو آگے بڑھانے کی کوشش نہ کر رہے ہوں۔ آپ کے ہاتھ کہاں کہاں پہنچ سکتے ہیں؟ بنگال، مدراس، گجرات۔ کام پورا ہوتے ہوتے تو آپ کی عمر بھی تمام ہو جائے گی۔ کبھی یہ بھی سوچا ہے آپ نے؟"

"ڈونٹ ٹوک ٹان سنس" ولیم سلومن تیز لہجے میں بُڑبُڑایا لیکن امیر اس کا مطلب نہیں سمجھا تھا۔ مگر وہ یہ جان گیا تھا کہ ولیم سلومن شدید غصّے میں آ گیا ہے اس لیے وہ اُس وقت تک خاموش رہا جب تک ولیم سلومن نے ہندوستانی میں بولنا شروع نہیں کر دیا۔

"تم میری عمر کی فکر مت کرو امیر علی۔" ولیم سلومن اپنے کندھے جھٹک کر بولا۔ "جب تک تمھارے بھیجے میں دیوی کے اندھے اعتقاد کا بھُوسا بھرا ہوا ہے اس وقت تک تمھارا اوپر والا خدا بھی کچھ نہیں سمجھا سکتا۔ لیکن پھر بھی میں ایک بات کی وضاحت تم سے ضرور چاہوں گا۔"

"فرمائیے۔"

"فرض کرو کہ اِس وقت تمھارا کوئی جوان بیٹا ہو۔ اور۔۔"

اتنا سُننا تھا کہ امیر کو یوسف یاد آ گیا اور اُس کا دھیان اس طرف چلا گیا۔ اِس درمیان ولیم سلومن نے کیا کہا تھا یہ اُس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

"میں تم سے کہہ رہا ہوں امیر!" ولیم سلومن نے میز پر ہاتھ مار کر اُس کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے کی کوشش کی۔ "کیا تم اپنے جوان بیٹے کو بھی ٹھگ بنانے پر تیار ہو سکتے ہو؟"

"میرا کوئی بیٹا ہی کہاں ہے جناب؟" امیر گمبھیر لہجے میں بولا۔

"میں نے تم سے فرض کر لینے کے لیے کہا ہے۔" ولیم سلومن نے کہا۔

"اس میں فرض کر لینے کے لیے ہے ہی کیا؟" امیر پُرجوش لہجے میں بول پڑا۔ "کوئی بھی ٹھگ اپنے بیٹے کو بھی ٹھگ بنائے بغیر نہیں رہتا۔ اپنی اولاد کو اپنا وارث مقرر کرنے کا یہ دستور رشتوں سے چلا آ رہا ہے۔ میرا باپ ٹھگ تھا۔ اُس کا باپ اور پھر اُس کا باپ بھی ٹھگ تھا۔"

"بس۔ بس۔" ولیم سلومن نے ایک جھٹکے سے اُسے درمیان میں ہی روک دیا۔ "اِن سب سُنی سُنائی

باتوں کو دہرانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ تمھارا باپ ٹھگ تھا؟ اور اس کا باپ اور پھر اُس کا باپ یہ سب ٹھگ تھے۔"

امیر اس کی بات سُن کر کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ ولیم سلومن سے پوچھ لے کہ تو پھر اُس کے باپ دادا کون تھے؟ لیکن یہ سوال اُسے کچھ مناسب نہیں لگا اس لیے وہ تھوڑی دیر تک ہنستا رہا پھر بولا: "میرے باپ ہی نے مجھے ٹھگ کی دکشا دی تھی اور اسے میرے دادا نے ٹھگ بنایا تھا۔"

"اور اگر میں یہ کہوں کہ یہ سب جھوٹ ہے تو؟" ولیم سلومن نے کہا۔

"یہ کہنے سے کیا فائدہ؟" ولیم سلومن کی یہ بات امیر کو کچھ عجیب سی لگی۔ لیکن پھر بھی اُس نے اِس کی ہنسی نہیں اڑائی: "میرے باپ کے نام کا شائد آپ کو علم نہیں ہوگا۔ وہ اس ملک کے ٹھگوں میں ایک مشہور ٹھگ تھے۔ شیوا پوری کے راجا نے اُسے ہاتھی کے پیروں تلے کچلوا کر ہلاک کر دیا تھا۔ اور میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ مرتے مرتے میرے باپ نے جو بددُعا دی تھی اُس کے نتیجے میں راجا خون اُگلتے اُگلتے بے موت مارا گیا۔" امیر بڑے غرور سے یہ بات کہہ گیا تھا لیکن ولیم سلومن اُس کے خیالات کو کس جانب موڑ رہا تھا اِس کی اُسے خبر ہی نہیں ہوئی۔

"دیکھو امیر! ابراہیم سردار کیا تھا اور کون تھا اِس کی ساری خبر مجھے ہے۔ میں ہر ٹھگ کے بارے میں معلومات رکھتا ہوں اور اِس بارے میں شائد میں تم سے زیادہ ہی جانتا ہوں۔" امیر پُر مذاق انداز میں ہنسا لیکن ولیم سلومن کہتا رہا: "اور اپنے بارے میں جو تم خود نہیں جانتے وہ میں جانتا ہوں۔"

"میرے بارے میں؟" امیر چونک پڑا: "ایسی کیا بات ہے؟"

"یہ ہی کہ تم ٹھگ کے بیٹے نہیں ہو۔"

"ہا۔ ہا۔ ہا" امیر کے زوردار قہقہے سے پورا کمرہ گونج اٹھا۔ اُس کے قہقہے کی آواز کے ساتھ ساتھ اُس کے ہاتھ اور پیروں میں پڑی ہوئیں لوہے کی بیڑیاں بھی جھنجھنا اٹھیں۔

"ہنسو مت امیر!" ولیم سلومن چیخ کر بولا: "وہ ابراہیم تمھارا باپ نہیں تھا۔ تم اس کے سگے بیٹے نہیں ہو۔"

اچانک امیر کی ہنسی تھم گئی اور اس کا مُنھ کھلا رہ گیا۔ وہ ولیم سلومن کی جانب دیکھ کر پھر سے ہنسنے کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک ولیم سلومن اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا اور بولا: "اگر میری بات کا تمھیں یقین نہ آ رہا ہو تو اپنے باپ کے کسی پُرانے ساتھی سے پوچھ لو پھر تمھیں یقین آ جائے گا۔"

"نہیں۔ نہیں۔" امیر تیز آواز میں بولا: "یہ سب جھوٹ ہے۔ آپ مجھے اس طرح پھسلا نہیں سکتے آپ مجھ جیسے ٹھگ کو ٹھگ نہیں سکتے۔" امیر کا چہرہ سُرخ ہو گیا تھا۔ لیکن اُس کی یہ حالت دیکھنے کے لیے ولیم سلومن وہاں موجود نہیں تھا۔ امیر کے پیچھے آ کر جیل دارو غہ نے امیر کی کمر سے بندھی ہوئی رسّی کو پکڑ لیا: "چلو اب صاحب جا چکے ہیں۔"

"چلا گیا؟" امیر نے پہلی بار ولیم سلومن کے لیے اِس طرح کے الفاظ استعمال کیے: "وہ اپنے دل میں یہ سمجھتا ہے کہ میں ابراہیم سردار کا بیٹا نہیں ہوں۔ مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہا ہے وہ۔" پھر جاتے جاتے اُس نے ایک بار پھر زبردست قہقہہ لگایا جس سے کمرے کی دیواریں گونج کر رہ گئیں۔

"تمھارا باپ ٹھگ نہیں تھا۔ تم ابراہیم سردار کے بیٹے نہیں ہو۔" ولیم سلومن کے یہ الفاظ بچھو کی طرح امیر کے سینے میں ڈنک مار رہے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اُس نے اِس قسم کی باتیں کس طرح سُن لیں؟ ایسی باتیں سن کر تو اُسے گورے صاحب کے منھ پر تھوک دینا چاہیئے تھا۔ بیڑی والے ہاتھوں سے اُس کی کھوپڑی چور چور کر دینی چاہیئے تھی۔ آخر اُس نے اُسے چھوڑ کیوں دیا؟ قسم خدا کی اگر اُس سے پھر سامنا ہو گیا تو وہ اِس جھوٹ کا بدلہ لیے بغیر نہیں رہے گا۔

جیل کی کچہری سے اپنی کوٹھڑی تک آتے آتے

امیر نے اور بھی ایک فیصلہ کر لیا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں یہ سوچ لیا تھا کہ یہ بات وہ کسی سے بھی کہنے والا نہیں ہے۔ ولیم سلومن کی چال میں پھنس کر وہ اپنے مرحوم باپ کی بے عزتی نہیں ہونے دے گا۔ ممکن ہے ولیم سلومن نے اُس کے باپ کے کسی پُرانے ساتھی کو لالچ دے رکھی ہو؟ ابراہیم سردار میرا باپ نہیں ہے یہ کہہ کر وہ کمبخت انگریز میرے دل میں ٹھگوں سے نفرت پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہے؟ یہ کہہ کر وہ مجھے اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ انگریز فریب سے کام لینے میں ماہر ہوتے ہیں۔

سنتری نے کوٹھڑی کے دروازے کا تالا کھول دیا تو امیر دھیرے سے اندر داخل ہو گیا۔ رامُو اور روپ سنگھ دونوں ہی اس کی طرف دیکھ رہے تھے وہ یہ جاننے کے لیے بے تاب نظر آ رہے تھے کہ انگریز صاحب سے اس کی کیا بات چیت ہوئی ہے؟ امیر نے انھیں دیکھتے ہی اپنے چہرے کے تاثرات چھپا لیے اپنی پیٹھ پیچھے اس نے کوٹھڑی کے دروازے کے بند ہونے کی آواز سُنی۔ پھر اُسے ایک کرخت آواز سنائی دی: "آئندہ پھر کبھی بڑے صاحب کو گالی دینے کی کوشش کی تو زبان کاٹ کر پھینک دی جائے گی۔" امیر نے ایک جھٹکے سے گردن گھما کر کوٹھڑی کے سلاخ دار دروازے کی طرف دیکھا جس کی دوسری جانب کھڑا ہوا جیل دارو غہ کہہ رہا تھا: "اگر یہ صاحب اتنے بھلے آدمی نہ ہوتے تو تمھاری ہڈی پسلی کب کی ٹوٹ چکی ہوتی۔"

اُس کی یہ بات سُن کر امیر کی آنکھیں غصّے سے اُبل پڑیں۔ کم بخت! اسے سلاخوں کے پیچھے دھکیل کر اُسے دھمکی دے رہا ہے اُس نے دانت پیستے ہوئے دارو غہ کی طرف دیکھا اور چیخ کر بولا: "ابے جا جا۔ تیری اور تیرے صاحب کی ایسی تیسی۔" یہ کہہ کر اس نے سلاخوں کے باہر گویا دارو غہ کے مُنھ پر تھوک دیا۔ دارو غہ کا غصّہ بھڑک اُٹھا اور اس نے کندھے پر سے اپنی بندوق اُتار لی اور اس کی نال امیر کی جانب تان لی۔ یہ دیکھ کر رامُو، روپ سنگھ اور دروازے کے باہر کھڑے ہوئے دونوں سنتریوں نے

ایک بے بس نوجوان کی حیرت انگیز داستان
جسے اپنی موت کا وقت معلوم ہو گیا تھا

مظلوم

یعقوب جمیل کے ہوشربا قلم سے
جس کا قارئین کو برسوں سے انتظار تھا

مکتبہ القریش سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
فون 7668958

ایک ساتھ حیرت سے دارو غہ کی طرف دیکھا۔ لیکن امیر تو سینہ تان کر سلاخوں کو تھامے ہوئے دارو غہ کو تاک رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں موت کے خوف کے کوئی آثار نہیں تھے۔ دھیرے دھیرے دارو غہ کا جوش ٹھنڈا ہوتا گیا اور بندوق پر اُس کی گرفت ڈھیلی پڑتی چلی گئی "بعد میں دیکھ لوں گا۔" یہ دھمکی دینے کے بعد وہ پاؤں پٹختا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

اچانک پیچھے سے رامُو نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور دھیمی آواز میں بولا: "امیر میاں! یہ تمھیں کیا ہو گیا ہے؟" رامُو کے اِس سوال میں حیرت نمایاں تھی کیونکہ اتنے سالوں میں اُس نے امیر کا یہ انداز نہیں دیکھا تھا۔ امیر نے تو کبھی اپنے دشمنوں کو بھی گالیاں نہیں دی تھیں۔ لیکن آج کی حرکت نے تو اُسے حیران ہی کر دیا تھا: "کیا صاحب نے بھی تمھیں گالیاں دی تھیں؟" اُس نے پوچھا۔ لیکن جواب دینے سے پہلے ٹھنڈا ہونے کے لیے امیر نے پانی کا پورا لوٹا غٹ غٹا کر خالی کر دیا۔ پھر بولا: "اُس گورے صاحب نے مجھ سے کیا کہا تھا یہ تم جانتے ہو رامُو؟" کہتے کہتے وہ یکایک چپ ہو گیا جیسے اپنے آپ سے کیا ہوا عہد اُسے یاد آ گیا ہو کہ یہ

بات اُسے کسی کو بھی نہیں بتانی ہے۔ اِس خیال کے آتے ہی اُس نے فوراً ہی اپنے الفاظ بدل لیے اور آگے بولا "روپ سنگھ! گورا صاحب یہ چاہتا ہے کہ میں اپنی جان بچانے کے لیے سلطانی گواہ بن جاؤں۔ اپنے جُرم کا اقرار کرلوں اور اپنے ہی ساتھیوں کے ساتھ غدّاری پر تیار ہوجاؤں۔"

"لیکن اِس میں اُس نے تو کوئی گالی نہیں دی ہے تمھیں" رامُو نے جلدی سے کہا تو امیر اس پر خفا ہوگیا "ہاں۔ ہاں میں نے اُسے گالیاں دی ہیں۔ کیا وہ نہیں جانتا کہ سچا ٹھگ کبھی بے وفائی نہیں کرتا؟ وہ تو دیوی کا نام لے کر سولی پر بھی چڑھ جاتا ہے۔ لیکن اپنے ہم پیشہ ٹھگوں کی گرفتاری میں کبھی مدد نہیں کرتا۔" رامُو تھوڑی دیر تک اُسے دیکھتا رہا لیکن وہ زیادہ دیر تک چُپ نہ رہ سکا "صاحب نے کس کی گرفتاری کے لیے تم سے مدد طلب کی ہے۔ گنیش کے لیے؟"

"ہاں" امیر نے اس طرح جواب دیا جیسے وہ اِس موضوع پر بات کرنے کے لیے تیار نہیں ہے لیکن رامُو نے اُسے چُپ رہنے کا موقعہ ہی نہیں دیا "میاں! بے ادبی معاف کرنا ہمیں یہ موقعہ ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہیئے۔"

یہ سنتے ہی امیر نے ایک جھٹکے سے گردن اُٹھا کر رامُو کی طرف دیکھا اور غرّاہٹ بھری آواز میں بولا۔ "غدّاری کو تم موقعہ کہتے ہو رامُو؟" پھر دھیمے لہجے میں آگے کہنے لگا "گنیش سے مجھے چاہے جتنی بھی نفرت کیوں نہ ہو لیکن آخر تو وہ ہمارا ذات بھائی ہی تو ہے۔" رامُو کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو امیر کا یہ جواب سُن کر چُپ ہوجاتا لیکن رامُو چونکہ کئی برسوں سے اُس کے ساتھ تھا اس لیے وہ امیر کی عادت سے واقف تھا۔ اُس نے آنکھ سے اشارہ کرکے روپ سنگھ کو اپنے قریب بلایا اور امیر سے مخاطب ہوکر بولا "گنیش کی گرفتاری کے لیے یہ لوگ تمھیں جیل سے باہر تو ضرور ہی نکالیں گے۔"

امیر کے لیے اتنا ہی اشارہ کافی تھا۔ اُسے رامُو کی چالاکی پر حیرت سی ہونے لگی۔ اُس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مُسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ بول پڑا "رامُو تم نے اچھی ترکیب سُجھائی ہے۔ لیکن یہ سب مجھ سے نہیں ہوسکے گا۔ گنیش کو گرفتار کرانے کے لیے یہ لوگ مجھ اکیلے کو ہی جیل سے باہر لے جائیں گے۔ میں تو شائد بھاگ بھی جاؤں لیکن تم لوگوں کا کیا ہوگا؟" اتنا کہہ کر وہ انکار میں سر ہلاتے ہوئے آگے بولا "نہیں یہ ہرگز نہیں ہوگا۔"

رامُو کا چہرہ لٹک گیا وہ کوئی دلیل سوچ رہا تھا کہ اچانک روپ سنگھ نے کہا "امیر تم صرف ہم دونوں کے بارے میں سوچ رہے ہو۔ لیکن ایک سردار ہونے کی حیثیت سے تمھیں اپنے سارے لوگوں کی بھلائی سوچنی چاہیئے۔ گورا صاحب ہم لوگوں کو نیست و نابود کردینے کے لیے میدان میں اُترا ہے۔ ایک ایک کرکے ہماری ٹولیاں گرفتار ہوتی جارہی ہیں۔ اور کئی ٹولیاں تو بالکل ہی ختم ہوچکی ہیں۔ ایسی حالت میں ہمارے ہم پیشہ بھائیوں کو تمھاری ضرورت زیادہ ہے۔ ورنہ اس پیشے پر گذارا کرنے والے سینکڑوں گھرانے برباد ہوجائیں گے۔ تم جیسا سردار اگر ہمت ہارے ہوئے ٹھگوں کو مل گیا تو وہ پھر سرگرم ہوجائیں گے۔ اِس طرح ولیم سلومن کا مقابلہ بھی ہوتا رہے گا اور دیوی کا کام بھی جاری رہے گا۔ ابراہیم میاں کی روح جہاں بھی ہوگی اسے بھی سکون ملے گا۔" بوڑھا روپ سنگھ بہت ہی کم بولا کرتا تھا لیکن آج شائد پہلی بار وہ اتنا کچھ بول گیا تھا۔ امیر اپنے بوڑھے استاد کے شکن آلود چہرے کو دیکھ کر کسی گہری سوچ میں پڑ گیا۔

"تمھیں یاد ہے امیر!" روپ سنگھ سانس لینے کے بعد آگے بولا "رومال سے شکار کرنے کا فن میں نے تمھیں سکھایا تھا۔ لیکن اس وقت میں نے استاد کی حیثیت سے تم سے کچھ بھی نہیں مانگا تھا۔" روپ سنگھ کی بات سُن کر امیر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تو آج میں استاد کی حیثیت سے یہ کہہ رہا ہوں

کہ بھاگ جانے کا کوئی بھی موقعہ اگر تمھیں ملتا ہے تو اس موقعے کو ہاتھ سے مت جانے دو۔" اتنا کہتے کہتے روپ سنگھ کی آواز بھاری ہوگئی اور امیر نے ایک سرد آہ بھر کر اپنی آنکھیں موندلیں۔ ساتھیوں کی محبت نے اُسے اندر ہی اندر جھنجھوڑ دیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اُس کے بوڑھے استاد روپ سنگھ نے استاد ہونے کے ناتے اُس سے ایسی بات کہی ہے جس کو ٹھکرا دینا بھی اُس کے بس کی بات نہیں ہے۔

دھیرے دھیرے اُس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ پھر رامُو اور روپ سنگھ کے کندھوں پر اپنا ایک ایک ہاتھ رکھ کر بولا "میں اس موقع کو جانے نہیں دوں گا بس؟ لیکن یہ کام اتنا آسان بھی نہیں ہے۔ ولیم سلومن مجھ پر کڑی نگرانی رکھے گا اور شائد گنیش کو گرفتار کرنے کے لیے بھی وہ خود ہی ساتھ چلے گا۔ فیصلہ کرنے سے قبل مجھے آج کی رات اِس کے ایک ایک پہلو پر غور کرنا پڑے گا۔ اُس نے جواب دینے کے لیے مجھے ایک ہی دن کی مہلت دی ہے۔"

لیکن امیر تو اُس رات کسی اور خیال میں اُلجھا رہا "تم ٹھگ کے بیٹے نہیں ہو۔ ابراہیم سردار تمھارا باپ نہیں ہے۔" ولیم سلومن کے کہے ہوئے یہ الفاظ رات بھر اُس کے کانوں میں گونجتے رہے اور رات بھر اسے ستاتے رہے۔

فجر کی نماز پڑھتے وقت امیر کا انگ انگ دُکھ رہا تھا۔ ساری رات اُس نے کروٹیں لیتے لیتے ہی گذار دی تھی۔ جس بات کو وہ سچ نہیں سمجھتا تھا اُسی بات کو سوچ سوچ کر وہ پریشان ہوتا رہا تھا۔ اُس نے اپنے باپ کے ساتھ گذارے ہوئے لمحوں کو یاد کرنے کی کوشش کی۔ کئی واقعات اُس کے ذہن میں تازہ ہوئے لیکن کسی بھی بات اور کسی بھی واقعے نے اُسے یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ وہ ابراہیم کا سگا بیٹا نہیں ہے۔ ماں کی ممتا میں بھی اُسے پرائے پن کی جھلک کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ اگر یہ بات سچ بھی ہو کہ وہ ابراہیم کا بیٹا نہیں ہے تو کیا پڑوس کے لوگ بھی اِس بات سے بے خبر ہوں گے؟ کسی ایک کے مُنھ سے تو اُس نے یہ بات سُنی ہوتی؟ سوچتے سوچتے اُس نے کئی بار اپنے دل کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ کیوں بار بار اِس جھنجھٹ میں اُلجھ رہا ہے۔ وہ ابراہیم کا بیٹا تھا۔ ہے اور رہے گا۔ اُس انگریز صاحب کی باتوں میں وہ کیوں پھنستا جا رہا ہے؟ اُسے تو ولیم سلومن سے چیخ چیخ کر یہ کہہ دینا چاہیئے کہ وہ چاہے کسی کا بھی بیٹا کیوں نہ ہو اُس کی فکر آخر تمھیں کیوں ہے؟ وہ ایک ٹھگ ہے اور مرتے دم تک ٹھگ ہی رہے گا۔

"یا خدا تو مجھے اس امتحان سے گذرنے کی طاقت عطا کر" امیر نے نماز پڑھنے کے بعد دُعا مانگی "میں اگر تمھاری نگاہ میں گناہگار ہوں تو بے شک مجھے سزا دینا" دُعا مانگتے ہوئے امیر کو خیال نہیں رہا کہ کوٹھڑی کا دروازہ کھُل گیا تھا اور ایک بوڑھا قیدی اُس کی پُشت پر آکر کھڑا رہ گیا تھا۔

رامُو اور روپ سنگھ بھی اُس سفید داڑھی والے بُزرگ کو پہچاننے کی کوشش میں اُن کے قریب آکر چُپ چاپ بیٹھ گئے تھے۔ نماز پُوری کرکے امیر اُٹھ کھڑا ہوا سر پر بندھا ہوا کپڑا ہٹا کر اُس نے گردن گھُمائی تو اُس بُزرگ شخص پر اُس کی نظر پڑی۔ اُسے کمر سے جُھکے ہوئے اس بوڑھے آدمی کی چھوٹی چھوٹی اندر کو دھنسی ہوئی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک دکھائی دیتی ہے۔ پھر اُسے اُس کے ہونٹ بھی ایک عجب انداز سے تھرتھراتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد اس کی کانپتی ہوئی آواز امیر کی سماعت سے ٹکراتی ہے "امیر میاں!" اتنا کہہ کر اس بوڑھے قیدی نے اپنے ہڈیوں والے ہاتھ اُس کی جانب بڑھا دیئے لیکن اِس کے باوجود بھی امیر اُس شخص کو پہچان نہیں پایا۔ اِس درمیان رامُو اور روپ سنگھ نے بھی اُس کو دھیان سے دیکھ لیا تھا لیکن وہ دونوں بھی اُسے

پہچاننے میں ناکام رہے۔

"امیر میاں! کیا تم نے مجھے نہیں پہچانا؟" پھیلے ہوئے ہاتھ کے ساتھ اُس بوڑھے نے اپنا بیڑی والا پاؤں آگے بڑھایا۔ "میں حسن ہوں تمھارے باپ کا پُرانا ملازم۔"

"ارے۔ حسن۔۔ چاچا" امیر کی آواز میں محبت کی لہک تھی۔ وہ اُس کے پھیلے ہوئے ہاتھوں میں سما کر اُس سے لپٹ گیا۔ "چاچا۔۔ تم۔۔ اور یہاں؟"

اب روپ سنگھ بھی اٹھ کر قریب آگیا۔ "حسن علی اب میں بھی تمھیں پہچان گیا۔ میں روپ سنگھ ہوں۔ ابراہیم سردار کا پرانا ساتھی۔" یہ کہہ کر وہ بھی حسن سے بغل گیر ہوا۔ اُس کے بعد امیر نے رامُو کا تعارف اُس سے کراتے ہوئے کہا۔ "اور یہ میرا وفادار ساتھی رامُو ہے۔"

اتنی دیر میں حسن بُری طرح ہانپنے لگا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کھڑے کھڑے تھک گیا ہو۔ یہ دیکھ کر امیر نے اُسے سہارا دے کر نیچے بٹھا دیا۔

"اب یہ بتاؤ تم یہاں کس طرح آگئے؟" امیر نے پوچھا۔

"میں تو چار سال سے اس جیل میں پڑا پڑا سسک رہا ہوں۔" حسن علی نے رامسی زبان میں کہنا شروع کیا۔ "یوں تو میں نے پچھلے چھ سات برسوں سے سفر پر جانا چھوڑ دیا تھا۔ اور اپنے بیٹے کو بھی میں نے اِس دھندے سے دور رکھا ہوا تھا اور اسے میں نے کپڑے کی ایک دکان میں بٹھا دیا تھا۔ لیکن دیوی کے عتاب نے مجھے بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ایک دن گورے صاحب نے مُرنائی میں اپنے سپاہی بھیج کر مجھے گرفتار کر لیا۔"

"تو یہ گورا صاحب مُرنائی تک بھی پہنچ گیا؟" امیر اس طرح دانت پیس کر بولا جیسے اُسے شدید غصہ آیا ہو۔

"ہاں میاں! اُس نے تو مُرنائی میں بھی تمھاری گرفتاری کے لیے سپاہی بھیجے تھے۔ اُس کا خیال تھا کہ جالان کی جیل سے چھوٹ کر تم نے مُرنائی میں ہی پناہ لے رکھی ہوگی۔ اُس گورے صاحب کے پاس ابراہیم سردار کا نام و پتا لکھا ہوا ہے۔ اور یہ بات مجھ میں نہیں آتی کہ اُسے یہ سب کیسے معلوم ہو جاتا ہے؟ میرے بارے میں بھی اُسے علم تھا کہ میں ابراہیم سردار کا ساتھی رہ چکا ہوں۔ اُس سے مُرنائی کے مہاراجا نے بھی میری سفارش کی تھی۔ اور میں نے بھی اُسے سمجھانے کی کوشش کی کہ ابراہیم میاں بہت شریف آدمی تھے۔ لیکن اِس کے باوجود اُس نے مجھے گرفتار کر لیا۔ اور پھر یہ لوگ مجھے زبردستی یہاں لے آئے۔" حسن علی کے خاموش ہوتے ہی تھوڑی دیر تک کوٹھڑی میں سناٹا طاری ہو گیا پھر امیر کی آواز نے اِس گمبھیر خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔ "حسن چاچا کیا تم نے اپنے جُرم کا اقرار کر لیا ہے؟"

یہ سُن کر بوڑھے حسن علی نے اپنی ہلتی ہوئی گردن کو ایک جھٹکے سے انکار میں ہلایا۔ "نہیں۔ نہیں میں نے کوئی اقرار نہیں کیا ہے۔" اتنا کہہ کر حسن علی نے ایک گہرا سانس لیا اور پھر آگے بولا۔ "لیکن اس گورے صاحب کے پاس ہر ایک گناہ گار کا کھاتہ لکھا ہوا ہے۔ اُس کے پاس تو سب ٹھگوں کے بارے میں معلومات ہیں۔" اُس کے اِس آخری جملے نے امیر کو چونکا دیا۔ وہ تھوڑی دیر تک بوڑھے حسن کو گھورتا رہا پھر پوچھ بیٹھا۔ "چاچا تمھیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ میں گرفتار ہو کر یہاں آیا ہوں؟"

"یہ بات گورے صاحب نے ہی مجھے بتائی تھی۔"

"اور اُسی نے شائد تمھیں یہاں بھیجا ہے؟" امیر نے پوچھا۔ امیر کے اِس سوال سے بوڑھا حسن علی کچھ گھبرا سا گیا۔ امیر کے چہرے کے بدلتے ہوئے تاثرات نے اسے خوف زدہ سا کر دیا تھا۔ رامُو اور روپ سنگھ کو بھی امیر کی یہ تبدیلی بڑی پُراسرار لگ رہی تھی۔

"بتاؤ چاچا اس نے تمھیں میری اس کوٹھڑی میں صرف مجھ سے ملنے ہی بھیجا ہے یا۔۔"

"امیر میاں۔۔ گورے صاحب نے تمھارے بارے میں تمھیں جو کچھ بھی بتایا ہے وہ بالکل سچ ہے۔" بوڑھا حسن علی گردن جھکائے یہ مشکل بول رہا تھا۔ "تم ابراہیم سردار کے سگے بیٹے نہیں ہو۔"

حسن کی چیخ مار کر امیر ایک جھٹکے سے کھڑا ہوا اور حسن کی جانب سے مُنھ پھیر کر اپنی مُٹھیاں بھینچتے ہوئے بولا۔ "مجھے تمھاری کوئی بات نہیں سننا ہے۔ گورے صاحب کے آلہ کار بن کر تم اپنے مالک کی بُرائی کرنے یہاں آئے ہو؟"

رامُو نے بھی غصّے سے آنکھیں نکال کر حسن کی طرف دیکھا لیکن روپ سنگھ کی آنکھوں میں بوڑھے حسن علی کے لیے ہمدردی کے تاثرات اُبھرے ہوئے تھے۔ حسن نے دھیرے دھیرے آنکھیں جھکائیں اور امیر کی پیٹھ پر نظریں جما دیں۔ پھر چند لمحوں بعد وہ بولا۔ "چھوٹے میاں مالک کی بُرائی کرنے کا الزام عائد کر کے تم نے میرے سفید بالوں میں دھول ڈال دی ہے۔ میرے مُنھ سے ابھی تک ابراہیم سردار کے خلاف بُرائی کا ایک لفظ بھی نہیں نکلا ہے۔ اور ایسا کرنے سے پہلے میں زبان کو کچل کر مر جانا زیادہ پسند کروں گا۔"

"تو پھر گورے صاحب کے ہی الفاظ دہرانے کے لیے تم یہاں کیوں آئے ہو؟" امیر چنگھاڑتی آواز میں بولا۔ "مجھ سے یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ میں ابراہیم سردار کا سگا بیٹا نہیں ہوں؟"

"اِس کی وجہ یہ ہے کہ سچائی سے پردہ ہٹانا۔۔ برا نہ لگے۔۔" لیکن اتنا سنتے ہی امیر بپھرے ہوئے شیر کی طرح پلٹا اور حسن کی جانب غصّے سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "اس فرض کے بہانے تم گورے صاحب کی غرض کو پورا کرنا چاہتے ہو۔" اُس کا چہرہ غصّے سے سرخ ہو رہا تھا۔ "گرچہ میرے پاس رومال نہیں ہے لیکن ابھی میرے پنجوں میں اتنی طاقت ضرور ہے کہ میں تمھاری گردن دبوچ سکتا ہوں۔" اس کے ساتھ ہی اُس کے ہاتھ حسن علی کی گردن تک پہنچ گئے پھر اس کے پھیلے ہوئے پنجے کی پکڑ حسن علی کی گردن پر مضبوطی سے جم گئی۔ اُس کے دونوں انگوٹھے حلق کی ہڈی پر چپک کر رہ گئے اب صرف زور لگانے کی ہی ضرورت باقی رہ گئی تھی لیکن اس کے باوجود حسن علی نے کسی گھبراہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا۔ وہ بدستور اپنی آنکھیں کھلی رکھ کر امیر کے چہرے کو تک رہا تھا۔

مگر روپ سنگھ سے اب برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ اُس نے لپک کر امیر کا بازو تھام لیا اور بولا۔ "امیر ٹھہر جاؤ۔۔ اتنی جلد بازی اچھی نہیں ہے۔" اُس کی آواز میں ایک عجیب سا جوش تھا۔ "اِس کا گلا دبا کر تم سچائی کو دبا نہیں سکتے۔"

جاسوسی ڈائجسٹ کا مقبول سلسلہ

سرکش

محمود احمد مودی کے شہکار قلم سے

12 حصوں میں شائع ہو گیا ہے

قیمت فی حصہ =/50 روپے

مکمل سیٹ =/600 روپے

مکتبہ القریش

سرکلر روڈ اردو بازار لاہور

فون 7668958

امیر نے ایک جھٹکے سے گردن گھمائی اور اُس نے خونخوار نظروں سے رُوپ سنگھ کی طرف دیکھا لیکن بوڑھے روپ سنگھ کی راجپوتی آنکھوں میں تو خود اعتمادی کی چمک لہرا رہی تھی۔ اس نے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر امیر کی نظروں سے نظریں ملا رکھی تھیں۔ "ہاں میاں مجھے بھی اس بات کا علم ہے کہ تم ابراہیم سردار کے سگے بیٹے نہیں ہو۔"

"ہوں" یکایک امیر کا سارا جوش ٹھنڈا پڑ گیا اُس کے پنجوں کی انگلیاں اور انگوٹھوں کی گرفت اچانک ہی ڈھیلی ہو گئی پھر وہ بہ مشکل حسن علی کی گردن پر سے اپنا ہاتھ ہٹانے میں کامیاب ہو سکا۔ اب اُس کے چہرے پر آئی ہوئی سُرخی بھی غائب ہو چکی تھی۔ اُس کی جُھکی ہوئی کمر کو دیکھ کر یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ابھی لڑکھڑا کر زمین پر گر پڑے گا۔ چار قدم آگے بڑھ کر اُس نے کوٹھڑی کے دروازے کی سلاخیں تھام لیں۔ اُس وقت اُسے ایسی تھکن محسوس ہو رہی تھی جیسے چار میل سے دوڑتا ہوا آیا ہو۔ وہ بڑے زور زور سے ہانپ رہا تھا۔

بوڑھا حسن علی کسی مُجرم کی طرح آنکھیں جُھکائے بیٹھا تھا۔ رامو ابھی تک اُلجھن میں پڑا ہوا تھا۔ اور روپ سنگھ امیر کے پسینے سے بھیگی ہوئی پیٹھ کی طرف تک رہا تھا۔ اس کے دل میں ہمدردی کا جذبہ جاگا لیکن وہ اُٹھ کر اظہار ہمدردی کی ہمت نہیں کر سکا۔

امیر کو سنبھلنے میں تھوڑی دیر لگی۔ دل پر لگے ہوئے اس زبردست صدمے کو ہضم کرنے میں اسے خاصی محنت کرنا پڑ رہی تھی۔ پھر کافی دیر بعد اس نے گردن گھما کر ان تینوں کی طرف نگاہ ڈالی پھر دھیرے دھیرے اُس نے قدم آگے بڑھائے۔ اب وہ ہلکے ہلکے ان تینوں کے گرد کوٹھڑی کے اندر ٹہلنے لگا۔ پھر ہر چکر میں اس کی رفتار پہلے چکر سے زیادہ تیز ہوتی چلی گئی۔ دس پندرہ، اٹھارہ، بائیس، چھبیس، تیس، چالیس نہ جانے اُس نے کوٹھڑی کے کتنے ہی چکر لگا ڈالے پھر اچانک وہ ان تینوں کے درمیان آ کر اس طرح کھڑا ہو گیا جیسے ساری زندگی کا چکر پورا کر چکا ہو۔ تھوڑی دیر تک وہ اُنھیں کھڑا گھورتا رہا پھر بولا۔

"تو اب مجھے یہ بھی بتا دو کہ میں کس کا بیٹا ہوں؟" اُس کے مُنھ سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ سے درد کی جھلک نمایاں تھی۔ دھیرے دھیرے بوڑھے حسن علی نے اپنی آنکھیں اُٹھائیں۔ "میاں یہ جان کر اب فائدہ ہی کیا ہے؟" اس نے کہا۔

"تم سچائی ظاہر کرنے آئے ہو۔" امیر ذرا تیز لہجے میں بولا۔ "اور اتنی آدھی بات بتا کر پوچھ رہے ہو کہ اس سے فائدہ کیا ہے؟"

"اِس کے لیے تو اب مجھے بھی افسوس ہو رہا ہے۔" حسن علی گلوگیر آواز میں کہہ رہا تھا۔ "اتنی سی بات سن کر جب تمھاری یہ حالت ہوئی ہے تو آگے بتا کر میں تمھارے دل کو اور صدمہ پہنچانا نہیں چاہتا۔ حقیقت بہت کڑوی ہوتی ہے امیر میاں۔"

"اِسی لیے تم اب پوری بات نہ بتا کر مجھے اور پریشان کرنا چاہتے ہو؟" امیر کے لہجے میں تڑپ تھی "تو پھر مجھے اتنی سی بات بتانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"اِس لئے کہ اگر ابراہیم سردار ہوتے تو وہ بھی تمھیں اتنا ہی بتاتے۔ وہ ساری حقیقت تمھیں کبھی بھی نہ بتاتے۔" حسن علی نے کہا۔

"کس لیے؟"

"اِس لیے کہ جس کو سگی اولاد کی طرح پالا تھا وہ کہیں اُن سے نفرت کرنے نہ لگ جائے۔" بوڑھا حسن علی رُک رُک کر کہہ رہا تھا۔ "وہ نہ تو سچائی کو چُھپا سکے تھے اور نہ ہی اس کا اظہار کر سکے تھے۔"

"آہ" امیر نے اُلجھنوں کے بوجھ کو سر سے جھٹکنے کے لیے گردن کو زور سے جھٹکا دیا۔ "اُنھوں نے میرے بارے میں غلط اندازہ لگایا تھا۔ میں اُن سے نفرت کس طرح کر سکتا تھا؟ سچائی جان لینے کے بعد بھی میں تو اُن کو ہی اپنا باپ سمجھنے والا ہوں۔" اتنا کہہ کر اُس نے گلے سے تھوک اتارا اور پھر آگے بولا۔ "بس مجھے تو اتنا ہی پوچھنا ہے کہ میرے اصلی ماں باپ

کون تھے؟ اور کس طرح میں ابراہیم سردار کا بیٹا بن گیا؟"

لیکن بوڑھے حسن علی کی زبان نہیں کُھلی۔ اُسے ڈر لگ رہا تھا کہ امیر یہ ساری باتیں سن نہیں سکے گا اور اگر اس نے سن بھی لیا تو اس کی محبت نفرت میں بدل جائے گی۔

"حسن چاچا" یکایک امیر عاجزانہ لہجے میں بولا۔ "تمھاری خاموشی اب مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی ہے۔ اصلیت جاننے کی بے چینی اب لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی ہے۔ مہربانی کر کے جو سچ ہے وہ مجھے بتا دو۔" اس کے آخری الفاظ میں بے پناہ تڑپ تھی اور بوڑھا حسن علی یہ سوچ رہا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر قبل جو شخص اس کا گلا دبا دینے کی کوشش میں تھا وہ اس وقت اپنی اصلیت جاننے کے لیے اُس کے آگے گڑگڑا رہا ہے۔

"امیر اگر تم ضد کر رہے ہو تو پھر سُن لو۔" حسن علی کہتے کہتے پھر رُک گیا اور امیر بے تابی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ رامو اور روپ سنگھ بھی حسن علی کی بات سننے کی کوشش میں آگے سرک آئے تھے۔ "تم پٹھان ہو۔" لوکھڑاتی آواز میں بوڑھے حسن علی نے کہنا شروع کیا۔ "اس بات کو کہتے سال ہو چکے ہیں۔ اس کا تو مجھے علم نہیں ہے۔ لیکن اس وقت تم پانچ سال کے تھے اور تمھارے والدین اندور کے سفر پر جا رہے تھے اور تم ان کے ساتھ تھے۔ تمھارے ماں باپ نے اپنی حفاظت کے لیے دس بارہ آدمیوں کو بھی اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ ابراہیم سردار کے ساتھ میری زندگی کا بھی وہ پہلا ہی سفر تھا۔ ایک پڑاؤ پر ابراہیم سردار نے تمھیں ایک گلی میں کھیلتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ گلی کے دوسرے لڑکے تمھارے ساتھ جھگڑ رہے تھے۔ اس لیے ابراہیم سردار نے درمیان میں آ کر تمھیں ان سے بچا لیا۔ پھر اس نے تمھیں جلیبیاں خرید کر دیں۔ اس وقت تمھارے پٹھان والد اس گھر میں موجود نہیں تھے جہاں وہ عارضی طور پر ٹھہرے ہوئے تھے۔ لہٰذا تمھاری والدہ نے پردے کی اوٹ میں سے ابراہیم سردار کا شکریہ ادا کیا۔ اور انھیں دوبارہ آنے کے لیے کہا۔ اور اس طرح ابراہیم سردار نے اُس خاندان سے دوستی استوار کر لی۔" حسن علی سانس لینے کے لیے رُکا ہی تھا کہ امیر نے بے چینی سے پوچھا۔ "پھر کیا ہوا؟"

"پھر ابراہیم سردار نے کسی طرح تمھارے باپ کو اپنے ساتھ سفر کرنے پر رضامند کر لیا اور دوران سفر تھوڑے ہی دنوں میں اُس نے تمھارا پیار اور تمھارے والدین کا اعتبار حاصل کر لیا۔ اندور پہنچنے میں کچھ ہی منزلیں باقی رہ گئی تھیں۔ اور تب ابراہیم سردار نے تمھارے والد کو سمجھایا کہ وہ اپنے ساتھ آئے ہوئے ملازموں کو اب واپس بھجوا دیں۔ تمھارے والد کو چونکہ اب ابراہیم سردار پر بھروسہ بیٹھ چکا تھا اس لیے انھوں نے اپنے محافظوں کو واپس بھجوا دیا۔ اس طرح ابراہیم سردار نے ہوشیاری سے اپنے شکار کے منصوبے کو آسان بنا لیا تھا۔" یہ سُن کر امیر نے ایک گہرا سانس لیا اور حسن کی طرف دیکھنے لگا۔ حسن سر جُھکائے آگے کہہ رہا تھا۔ "محافظوں کے چلے جانے کے بعد وہ صرف آٹھ لوگ ہی باقی رہ گئے۔ ایک تو تمھاری امّی تھی اور دوسری ایک آیا۔ تم تمھارے والد اور ڈولی اٹھانے والے چار کہار تھے۔ تمھارے والد کے گھر گرہستی کے سامان کے علاوہ قیمتی زیورات قیمتی کپڑے اور اچھی خاصی نقد رقم بھی موجود تھی۔ سردار نے اس شکار سے بہت سی امیدیں باندھ رکھی تھیں۔ لیکن انھیں ایک ہی بات کی فکر تھی۔"

"کیا؟" امیر کی کرخت آواز سنائی دی۔ "کس بات کی فکر تھی؟"

"ابراہیم میاں کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ انھوں نے تمھیں دیکھتے ہی یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ تمھیں زندہ رکھیں گے اور اپنا بیٹا بنا لیں گے۔ یوں تو ان دنوں کسی میں ہمت نہیں تھی کہ اپنے سردار کے فیصلے کے آگے وہ کچھ کہہ سکے۔ مگر ایک اکھڑ مزاج ٹھگ کی طرف سے وہ فکر مند تھے۔"

"کون تھا وہ؟"

"گنیش۔" حسن چاچا اس کی نظروں سے نظریں ملا کر بولا تو امیر کے دماغ میں ایک دھماکہ ہوا۔ اُسے اس بات کا تو علم تھا کہ اس کے باپ سے گنیش کی پُرانی عداوت ہے۔ لیکن اس کی وجہ اُسے اب معلوم ہوئی تھی۔ "ہاں حسن چاچا پھر کیا ہوا؟"

"شکار لینے کے بعد اور کیا ہوتا ہے امیر؟" حسن اس واقعے کو یاد کر کے خود پریشان ہو رہا تھا۔ "بس تمھارے سوا ہر ایک کی گردن میں رومال کا پھندہ ڈال دیا گیا۔ مگر اس وقت اچانک ہی ایک واقعہ ہو گیا۔ یعنی اندھیرے میں دور سے تم نے اپنے ماں باپ کے قتل ہونے کا منظر دیکھ لیا۔ اور اس صدمے کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہو کر گھوڑے کی پیٹھ پر سے گر گئے۔ بس اس کے بعد کی کہانی سُنانے کے لائق نہیں ہے امیر!"

امیر دیر تک سوچ کے گہرے سمندر میں ڈوبا رہا لیکن اچانک اس کا چہرہ سُرخ ہوتا نظر آنے لگا۔ پسینے کے قطرے ماتھے اور چہرے پر پھیلتے ہوئے اس کی داڑھی میں جذب ہونے لگے۔ اس نے بھرّائی ہوئی آواز میں آگے کی کہانی سُننے کی ضد کی۔ "جو کچھ بھی ہوا ہے وہ سب کہہ دو حسن چاچا۔ میری طرف دیکھ میں تو عظیم صدمہ بھی برداشت کر چکا ہوں۔"

"لیکن امیر یہ تو آگ کو مُنھ میں رکھنے والی بات ہے۔" حسن اپنی خشک ہوتی ہوئی زبان کو ہونٹوں پر پھیرتے ہوئے بولا۔

مغیر اگر تمھاری ضد یہی ہے تو سن لو۔ جب شکار کی ہوئی لاشوں کو گڑھے میں ڈالا جا رہا تھا تو تم ہوش میں آ کر اس طرف دوڑے آئے تھے۔ اُس وقت آخری لاش کو گڑھے میں ڈالا جا رہا تھا۔ تم چیخ مار کر اس لاش سے لپٹ پڑے۔ کیوں کہ وہ تمھاری اتی کی ہی لاش تھی۔ گنیش تو تمھیں جان سے مار دینا چاہتا تھا اور تمھیں بھی تمھارے ماں باپ کے ساتھ گڑھے میں دفنا دینے پر تُلا ہوا تھا۔ وہ تمھیں اپنی ماں کی لاش سے لپٹا دیکھ کر اور زیادہ غصّے میں آ گیا۔ وہ تمھیں اُٹھا کر دور ہٹانے جا رہا تھا کہ اچانک تم نے اس کی گردن میں دانت گاڑ دیئے اور وہ بُری طرح تلملا گیا۔ اس نے طیش میں آ کر تمھیں سر سے اُونچا کر کے دور اُچھال دیا۔ اور تم ایک پتھر سے ٹکرا کر دوبارہ بے ہوش ہو گئے۔"

یہاں تک سُن کر امیر اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکا۔ اس کی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو اب آنکھوں سے باہر آنے کے لیے مچل رہے تھے۔ اُس نے اپنے دونوں گھٹنوں میں اپنا سر دبا لیا اور سسکنے لگا۔ یہ دیکھ کر بوڑھا حسن دھیرے دھیرے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنے لگا: "پھر جب تم ہوش میں آئے تو سر پر لگی ہوئی چوٹ کی وجہ سے اپنا ماضی بھول چکے تھے۔ اس کے باوجود بھی گنیش تمھیں سفر میں ساتھ رکھنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس نے ابراہیم سردار سے کہا تھا کہ یہ لڑکا بڑا ہو کر جب اصلیت سے آگاہ ہو جائے گا تو ہمارا سب سے بڑا دشمن بن جائے گا۔ لیکن ابراہیم سردار نے اس کی بات ماننے کی بجائے خود سفر پر نہ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اور دل میں یہ عہد کر لیا کہ وہ آئندہ کبھی گنیش کو اپنی ٹولی میں شامل نہیں کرے گا۔" بوڑھے حسن کے خاموش ہوتے ہی ایک وحشت ناک خاموشی کوٹھڑی میں چھا گئی۔ کوٹھڑی میں صرف ہانپتے ہوئے حسن کی سانسوں کی آواز اُبھر رہی تھی۔ رامو اور روپ سنگھ کی بھیگی آنکھیں امیر کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ کوئی ایک لفظ بھی نہیں بول رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وقت کی گردش تھم گئی ہو۔ تھوڑی دیر بعد یکایک امیر نے اپنا سر اوپر اُٹھایا اور حسن کی طرف دیکھتے ہوئے بولا: "تو کیا ماں باپ کے سوا دنیا میں میرا کوئی اور رشتہ دار نہیں تھا؟"

"تھا" بوڑھے حسن کے اس اچانک جواب سے امیر بوکھلا گیا مگر بوڑھا حسن گہرا سانس بھر کر کہہ رہا تھا: "تمھارے والد نے بتایا تھا کہ تمھاری چھوٹی بہن کو وہ حیدر آباد میں تمھارے چچا کے پاس چھوڑ آئے تھے۔ اور ہاں ایک دوسری بات بھی ... جب تمھارے والد کے ساتھ آئے ہوئے محافظ واپس حیدر آباد جانے لگے تو تم نے انھیں ایک سوراخ والا سکّہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ میری بہن چھوٹی کو دے دینا۔ یہ میری نشانی ہے۔" یہ سُنتے ہی امیر کی نگاہوں میں ایک سوراخ والا سکّہ گھومنے لگا۔ اور پھر اس کی آنکھوں کے سامنے اس لڑکی کا چہرہ گھومنے لگا جسے اس نے حیدر آباد میں زہرہ کے گھر کی کھڑکی میں سے دیکھا تھا اور وہ سوچنے لگا تو کیا وہی اس کی بہن تھی؟ اسے یاد آیا کہ زہرہ نے اُس وقت اُسے بتایا تھا کہ اس بے چاری کے ماں باپ ایک سفر کے دوران مارے گئے تھے۔ لیکن اسے یقین ہے کہ اس کا بھائی ابھی زندہ ہے اور وہ اس کی امید میں ابھی تک جی رہی ہے۔ سوچتے سوچتے اسے خیال آیا کہ سوراخ والا سکّہ تو اس نے دوسری بار بھی کہیں دیکھا ہے مگر کہاں؟

اسے لگا کہ اس کے سر پر کوئی ہتھوڑے مار رہا ہو۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر دبا لیا اور سوچنے لگا۔ اسے ابھی طرح یاد آ گیا کہ ایک سفر میں اس کی ملاقات ایک پٹھان سے ہوئی تھی جو اسے اپنے گھر لے گیا تھا جہاں ایک بزرگ شخص اس کا چہرہ دیکھ کر چونک پڑا تھا۔ اور اس کے ماں باپ کے بارے میں پوچھ کر اس نے کہا تھا: میری بہو کا بھائی بھی بالکل تمھاری ہی طرح تھا اور اتفاق سے اس کا نام بھی امیر تھا۔" یہ کہہ کر اس نے اندر سے ایک تعویذ منگوایا تھا اور اس تعویذ کے ساتھ ایک سوراخ والا سکّہ اسے دکھاتے ہوئے کہا تھا: "کیا اس سکّے کو دیکھ کر تمھیں کچھ یاد آ رہا ہے؟" اور تب اس سکّے پر اپنی انگلی پھیرتے ہوئے اس نے اپنے اندر ایک عجیب سی سنسناہٹ محسوس کی تھی۔ مگر اس وقت اس نے اپنے دل کی حالت پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ اس وقت تو اس پر اس تعویذ کو حاصل کرنے کی دُھن سوار تھی۔ اور اسی لیے اس نے اس نوجوان پٹھان اور اس کی بیوی کو سفر پر ساتھ لے جانے کی حامی بھر لی تھی۔

یا خدا... تو کیا اس نے اپنی سگی بہن کو بھی... اپنے ہاتھوں سے ہی... مار... ڈالا ہے؟

"نہیں نہیں" امیر یکایک پاگلوں کی طرح چیختا ہوا اپنی جگہ سے اٹھا اور اس طرح کوٹھڑی کے دروازے کی جانب لپکا جیسے وہ اسے توڑ کر باہر نکل جائے گا۔ لیکن وہ اپنے ہی زور پر دروازوں کی سلاخوں سے ٹکرا کر فرش پر گر پڑا۔ رامو اور روپ سنگھ نے دوڑ کر اسے سہارا دیا لیکن بوڑھا حسن ہانپتا کانپتا کوٹھڑی کے ایک کونے میں دبک گیا تھا۔

آپ نے بہت سے سفرنامے پڑھے ہوں گے۔۔۔۔۔۔۔
مگر ایسی لرزہ خیز کہانی آپ پہلی بار پڑھیں گے۔
جسے اردو کے صاحبِ طرز ادیب اور الفاظ کے جادوگر
قمر اجنالوی نے اپنے مخصوص انداز میں تحریر کیا۔۔۔۔۔

دھرتی کا سفر

انسانی تاریخ و آثار کے پس منظر میں ایک ہولناک سرگزشت

قیمت: حصہ اوّل/-300 حصہ دوم/-300

ناشر: مکتبہ القریش اُردو بازار۔ لاہور 2

امیر کی پیشانی میں سے خون نکل رہا تھا۔ پھر بھی وہ روپ سنگھ اور رامو کی گرفت میں سے نکلنے کے لیے زور لگاتے ہوئے بڑبڑا رہا تھا: "چھوڑ دو مجھے... میں انسان نہیں... شیطان ہوں۔ قاتل ہوں۔ دھوکے باز ہوں... کاٹ دو میرے ان ہاتھوں کو جن سے میں نے اپنی سگی بہن کا گلا گھونٹا ہے۔ پھوڑ دو میری ان ناپاک آنکھوں کو۔ کھود ڈالو میرے اس فریبی دماغ کو۔ مجھے پھانسی پر لٹکا دو... جاؤ گورے صاحب سے کہہ دو کہ وہ مجھے معاف نہ کرے۔ کبھی معاف نہ کرے۔" اس کی آہ و زاری اور چیخوں کی آواز سے کوٹھڑی کی دیواریں لرز گئیں اپنی اپنی کوٹھڑیوں کے دروازوں کی سلاخیں تھام کر کھڑے ہوئے پتھر دل قیدی بھی اس کی حالت دیکھ کر کانپ اٹھے دوڑ کر آنے والا سنتری بھی دور کھڑا رہ گیا تھا۔ دیوانے کی طرح سلاخوں سے سر ٹکراتے ہوئے امیر کو دیکھ کر سنتری کو یہ یقین ہو چکا تھا کہ یہ قیدی پاگل ہو گیا ہے۔ اور موت کے بالکل قریب پہنچ گیا ہے۔ اور جب جیل داروغہ کو اس بات کا پتہ چلا تو وہ ولیم سلومن کو اطلاع دینے کے لیے دوڑ گیا۔

●

ولیم سلومن، حسن علی، رامو اور روپ سنگھ نے تو کبھی یہ سوچا ہی نہ تھا کہ اپنی اصلیت جان لینے کے بعد امیر کی یہ حالت ہو جائے گی۔ کیونکہ وہ لوگ نہیں جانتے تھے کہ امیر کی سگی بہن بھی اس کے ہاتھوں ہلاک ہو چکی ہے۔ آدمی اپنے کیے ہوئے تمام گناہوں کو تو بھول سکتا ہے لیکن۔ لیکن اپنے ہی ہاتھوں اپنی ماں جائی بہن کے قتل کے جُرم کو وہ نہ تو کبھی فراموش کر سکتا ہے اور نہ ہی اس کا ضمیر اسے کبھی معاف کر سکتا ہے۔ اور امیر کی بہن تو ایک ایسی بہن تھی جو بچپن ہی سے ماں باپ کے سائے سے محروم تھی اور برسوں سے بچھڑے ہوئے بھائی سے ملنے کی آس میں جی رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن تو اُس کا بھائی اُسے ضرور ملے گا۔ اُس کی یہ خواہش تو پوری ہو گئی۔ سفر میں اُس کا بھائی اُسے مل گیا لیکن دونوں ہی ایک دوسرے کو پہچان نہیں سکے۔ اور اس طرح بھائی خود اپنی بہن کا قاتل بن گیا۔

بس اس ایک ہی ضرب نے امیر کے دل کو کچل کر رکھ دیا۔ اور اس کا دماغ جھنجھنا اٹھا۔ صدمے سے بے قابو ہو کر پہلے تو اُس نے خود کو لہولہان کر لیا اور پھر اپنی موت کے لیے خدا سے دعائیں کرنے لگا۔ پھر جب وہ خود کو پھانسی پر لٹکانے کے لیے کہنے لگا تو سب لوگوں کو یہی لگا کہ وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا ہے۔ مگر امیر تو پاگل پن کی اُس سرحد تک پہنچ کر اچانک ہی رُک گیا تھا۔ وہ یکایک ہی خاموش ہو کر خلاؤں میں گھورنے لگا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ پچھتاوے کی آگ میں اپنے دل کو جلا کر خاک کر دینا چاہتا ہو۔ وہ اندر ہی اندر تڑپتا رہا اور گھنٹوں کوٹھڑی کی دیوار سے ٹیک لگائے کھڑے کھڑے آنسو بہاتا رہا۔ کبھی کبھی وہ اچانک کچھ بُڑبُڑاتے ہوئے کوٹھڑی کے چکر لگانے لگ جاتا۔ کبھی کبھی تصور میں وہ مُرثانی گاؤں میں پہنچ جاتا جہاں اپنی مرتی ہوئی ماں کو تصور میں دیکھ کر وہ تڑپنے لگتا۔ پھر اس کا دل جالان کے اپنے شاندار محل میں پہنچ جاتا اور عظیمہ کا چہرہ دیکھ کر اس کا دل تڑپ جاتا۔ پھر اچانک اُسے بیٹی کا خیال آجاتا اور وہ تصور ہی تصور میں مولوی کے گھر کی دہلیز پر پہنچ جاتا جہاں پانی کا پیالہ تھامے ہوئے اپنی بچی کو کھڑے ہوئے دیکھ کر اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے۔ ان سب جگہاؤں سے اس کا دل روتے اور تڑپتے ہوئے واپس جیل کی اس تاریک کوٹھڑی میں آجاتا تھا۔ تین رات قبل جس زہرہ کی لاش اس کی بانہوں میں تھی اور کچھ ہی فاصلے پر اس کے بیٹے یوسف کی سرکٹی لاش پڑی تھی۔ اس واقعے کو تو وہ یاد کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ لیکن باوجود کوشش کے یہ بھیانک منظر اس کی آنکھوں سے دور ہوتا نظر نہیں آرہا تھا۔

"میں بھی کتنا منحوس ہوں!" وہ خود بہ خود بُڑبُڑانے لگتا "کہ میری زندگی میں جو بھی عورت آئی تھی اُسے سوائے دُکھ کے اور کچھ بھی تو نہ ملا۔ بچپن میں ہی میری سگی ماں ٹھگوں کا شکار بن گئی۔ اور مجھے پال پوس کر بڑا کرنے والی ابراہیم کی بیوی بھی تڑپ تڑپ کر مر گئی۔ بے چاری نے مجھے پیار کیا لیکن اُسے بھی موت ہی ملی۔ زہرہ نے میری بیوی بننے کی خواہش کی تو وہ کھو گئی۔ اور روشن تو مجھے اپنا محبوب سمجھ کر ترستی ہی رہی اور عظیمہ کو میری اصلیت کے صدمے نے بے موت مار دیا سگی بہن چھوٹی میرے اپنے ہی ہاتھوں موت کے گھاٹ اُتر گئی۔ ایک بیٹی ہے جو باپ کے ہوتے ہوئے بھی یتیم ہے۔" امیر کا دل ان تلخ یادوں میں بھٹکتا ہی رہا۔ کبھی کبھی اس کا دل تیس برس پیچھے کی زندگی میں چھلانگ لگا دیتا اور کبھی کبھی وہ تین پہلے کے واقعات میں اُلجھ جاتا۔

پچھتاوے کی آگ میں جلتے جلتے اس کی کیا حالت ہو گئی ہے اِس کا اُسے احساس تک نہیں تھا۔ دوسرے دن شام کو جب وہ گورے ولیم سلومن کے سامنے آکر کھڑا ہوا تو ولیم سلومن اسے دیکھ کر اس طرح چونک پڑا جیسے اس نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔ اس کی بھوری آنکھوں کی پتلیاں امیر کے چہرے کو دیکھ کر تھرتھرا رہی تھیں۔

"امیر! یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے؟" لیکن جب امیر کی خاموشی نہیں ٹوٹی تو اچانک ولیم سلومن کو ایک ترکیب سوجھ گئی۔ اس کا داہنا ہاتھ میز کی دراز میں رینگ گیا اور پھر ایک جھٹکے سے باہر آگیا۔ "لو دیکھو" وہ ایک چھوٹا سا گول شیشہ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔ "اس آئینے میں اپنی صورت دیکھو کہ تم نے اپنے ساتھ کیا سلوک کیا ہے؟"

امیر چند لمحوں تک ولیم سلومن کے بڑھے ہوئے ہاتھ کی طرف دیکھتا رہا پھر بہ مشکل اپنا ہاتھ بڑھا کر اس نے ولیم سلومن کے ہاتھ سے وہ آئینہ لے لیا۔ اور گھور گھور کر اپنا چہرہ اس میں دیکھنے لگا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے انگ انگ میں ایک تھرتھراہٹ سی دوڑنے لگی۔ آئینے میں نظر آنے والا امیر علی کا چہرہ تو ہرگز نہیں تھا۔ اس نے ایک جھٹکے سے اپنا دوسرا ہاتھ اپنی داڑھی اور سر کے بالوں پر پھیرا۔ یہ کیا ایک ہی رات میں اس کے سارے بال بالکل سفید ہو گئے؟ اسے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ آئینے میں وہ اپنی ہی شکل دیکھ رہا ہے۔ اُس نے اپنی آنکھوں کو غور سے دیکھا جو گہرے گڑھے میں اُتری ہوئی دکھائی دے رہی تھیں اس کا ہاتھ اس طرح کانپ رہا تھا جیسے اس سے آئینہ کا وزن بھی اٹھایا نہیں جا رہا ہو۔ ڈگمگاتے قدموں سے آگے بڑھ کر اس نے آئینے کو میز پر رکھ دیا۔ اور دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔ یکایک لوہے کی پٹریوں میں سے ہلکی ہلکی کھنک کی آواز آئی اور پھر ولیم سلومن کو امیر کی سسکیوں کی آواز سنائی دی لیکن پھر بھی وہ اپنی جگہ سے نہیں اُٹھا۔ اور آئینے کو میز پر سے اٹھا کر دراز میں ڈال دیا۔

میں نے تو خدا سے موت مانگی تھی لیکن اس نے تو یہ بڑھاپا ہی بخش دیا۔ امیر دل ہی دل میں سوچ رہا تھا۔ صبح اُٹھ کر رامو اور روپ سنگھ بھی اسے دیکھ کر چونک پڑے تھے لیکن انھوں نے مجھے یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ میری اتنی دردناک حالت ہو گئی ہے؟

یکایک اُسے خیال آیا کہ اِس وقت وہ گورے صاحب کے سامنے کھڑا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی اُس نے سوچا کہ اُسے گورے صاحب کے سامنے اس طرح رونے کی کیا ضرورت ہے؟ نہیں میں اپنے دکھ میں کسی کو شریک کرنا نہیں چاہتا۔ اپنے کیے کی سزا تو مجھ اکیلے کو ہی برداشت کرنی ہے۔ چند ہی لمحوں میں اس نے دُکھ درد کے تمام تاثرات اپنے چہرے پر سے ہٹا لیے اور دھیرے دھیرے گردن اونچی کر کے ولیم سلومن کی طرف دیکھنے لگا پھر بولا "آپ نے مجھے کیوں بلایا ہے؟"

"تمھاری یہ حالت دیکھنے کے بعد اب مجھے لگ رہا ہے کہ میں نے تمھیں نہ بلایا ہوتا تو بہتر تھا۔" ولیم سلومن ایک سرد آہ بھر کر بولا۔ "مجھے تم پر رحم آتا ہے۔"

یہ سنتے ہی امیر کے ہاتھ کا ایک بھاری پنجہ میز کی سطح سے ٹکرایا۔ "نہیں مجھ پر رحم کھانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" وہ غصّہ سے اونچی آواز میں کہہ رہا تھا۔ "اگر آپ کا یہ خیال ہے کہ اپنی اصلیت جان لینے کے بعد میں اپنا ارادہ بدل دوں گا تو یہ آپ کی بہت بڑی بھول ہے۔"

"امیر! بہتر یہ ہے کہ ہم کچھ دنوں بعد ملیں۔" ولیم سلومن کے لہجے میں ہمدردی تھی۔ "تمھیں اس وقت آرام کی ضرورت ہے۔"

"آ... را... م" امیر ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا۔ "اگر آپ کو واقعی مجھ ہمدردی ہے تو میں جو آپ سے مانگوں وہ آپ مجھے دیں گے؟"

"کیا؟" ولیم سلومن نے بے چینی سے پوچھ لیا لیکن پھر فوراً ہی سنبھل کر بولا۔ "آزادی کے سوا تمھاری کوئی اور خواہش ہو گی تو میں ضرور اس پر غور کروں گا۔"

"مجھے تو آزادی ہی مانگنا ہے۔" امیر جلدی سے بول گیا۔ "لیکن آپ کے اِس قید خانے سے نہیں بلکہ میں تو اس دنیا سے ہی آزاد ہو جانا چاہتا ہوں۔" امیر کی یہ بات سن کر ولیم سلومن کو بہت زیادہ حیرانی نہیں ہوئی۔ وہ اس بات سے واقف تھا کہ اپنی اصلیت سے آگاہ ہو جانے کے بعد امیر دیوانگی کی حالت میں مسلسل چیخ رہا تھا کہ مجھے پھانسی پر لٹکا دو۔ مجھے میری زندگی سے آزاد کر دو۔ یہ بات اُس کے کانوں تک پہنچ چکی تھی۔ ایک رات میں سفید ہو جانے والے اس کے سر کے بال اور اس کے چہرے کی ایک ایک شکن سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ پچھتاوے کی آگ میں جھلس رہا ہے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ جب قانون کسی مجرم کو سزا دیتا ہے تو وہ قانون کی دی ہوئی سزا کو برداشت کر لیتا ہے لیکن جب اس کا اپنا ضمیر اسے پچھتاوے کی سزا میں جھلساتا ہے تو وہ چیخ اٹھتا ہے اور اس سے یہ سزا برداشت نہیں ہوتی۔ ضمیر کی یہ سزا یا تو آدمی کو پاگل بنا دیتی ہے یا پھر وہ خودکشی کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

"امیر علی! پچھتاوے کے بھی دو روپ ہوتے ہیں۔" ولیم گمبھیر لہجے میں بولا۔ "پچھتاوا آگ کی طرح آدمی کو جلا کر بھسم کر سکتا ہے۔ دھیمی دھیمی آنچ میں وہ آدمی کے دل کو جلا کر خاک کر دیتا ہے۔ اور اِس وقت تمھاری جو حالت ہے وہ اِس پچھتاوے کی پہلی نشانی ہے۔" کہتے کہتے ولیم سلومن نے رُک کر امیر کی جھکی ہوئی آنکھوں کی جانب دیکھا۔ لیکن جب امیر نے اس سے دوسرے رُوپ کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا تو وہ خود ہی آگے بولا۔ "ضمیر کا پچھتاوا زہر بھی ہے اور تریاق بھی ہے۔ اکثر اس کی آگ آدمی کے دل کے زخموں کو اپنی تپش سے پگھلا بھی دیتی ہے جسم اس پچھتاوے سے ضرور ٹوٹ پڑتا ہے۔ لیکن دل کے سارے زخم دُھل جاتے ہیں۔"

"جو بات میری سمجھ سے باہر ہے ایسی باتیں مجھے سمجھانے کی کیا ضرورت ہے جناب!" امیر ولیم سلومن کی تقریر سُن کر خاموش نہ رہ سکا۔

"امیر! تم سب سمجھ رہے ہو۔" ولیم سلومن کے ہونٹوں پر ہلکی بار مُسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "مطلب یہ کہ تمھارے اندر کا چھپا ہوا انسان یہ ساری باتیں سمجھنا چاہتا ہے۔ لیکن اس پر چھایا ہوا شیطان اُسے ان سب باتوں کو سمجھنے سے روک رہا ہے۔"

"اور آپ کے اندر کا چالاک انگریز مجھے یہ سب سمجھانے کی کوشش کر رہا ہے کیوں؟" امیر نے زخمی بچھو کی طرح ڈنک مارنے والے لہجے میں کہا۔ لیکن ولیم سلومن نے اپنی ناراضگی کا اظہار نہیں کیا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح امیر کے اندر کا غبار باہر نکل جائے اسی لیے وہ انتہائی نرم لہجے میں بولا۔ "امیر کل میں نے تم سے کہا تھا کہ تم ٹھگ کے بیٹے نہیں ہو۔ تب بھی تم نے میری اس بات کو دھوکہ اور فریب سمجھا تھا۔ اور تمھیں اس میں میری چالبازی دکھائی دی تھی۔ لیکن اس کے باوجود سچائی جان کر تم اب پچھتا بھی رہے ہو۔"

"نہیں مجھے اپنے ٹھگی کے پیشے پر پچھتاوا نہیں ہے۔ یہ پچھتاوا تو اپنی سگی بہن کو اپنے ہاتھوں سے ہلاک کرنے کا پچھتاوا ہے۔" امیر تیز لہجے میں بولا۔ "میں تو زندگی کی آخری سانس تک بھی ٹھگ ہی رہوں گا۔"

"ٹھیک ہے جیسی تمھاری مرضی۔ لیکن امیر! ایک بات کا مجھے کھلے دل سے جواب دیدو۔" ولیم سلومن نے پُرسکون لہجے

میں پوچھا۔ مجھے صرف اتنا بتا دو کہ اب تک تمھارے ہاتھوں سے کتنے بے گناہ مسافر مارے جا چکے ہیں؟"

امیر سر ہلا کر انکار کرنے ہی جا رہا تھا کہ ولیم سلومن دوبارہ بول اٹھا۔ "گھبراؤ مت امیر! اس وقت تم جو بھی کہو گے اسے تمھارے بیان میں شامل نہیں کیا جائے گا۔ میں تمھیں یقین دلاتا ہوں۔ لیکن اس کے باوجود بھی تمھیں اعتبار نہ ہو تو میں قسم کھاتا ہوں اور تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ یہ بات میرے سینے میں ہی دفن رہے گی۔"

امیر کی نظریں تھوڑی دیر تک ولیم سلومن کے چہرے پر جمی رہیں جیسے وہ اس بات کا یقین کر لینا چاہتا ہو کہ اس وقت ولیم سلومن اس سے کوئی دھوکہ نہیں کر رہا ہے۔ اور اب اسے ولیم سلومن سے ڈرنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟

"جناب! کیا واقعی یہ راز آپ کو جاننا ہی ہے؟" اس کی آواز سن کر ولیم سلومن نے دھیرے سے گردن اثبات میں ہلا دی۔ چند لمحوں کی تاخیر کے بعد امیر نے کہنا شروع کیا۔ "اپنے اس آخری سفر پر روانہ ہوتے وقت میں نے بلا وجہ ہی اپنے کیے ہوئے گناہوں کا شمار کر لیا تھا۔ اس وقت گنتی آٹھ سو سے اوپر پہنچ چکی تھی۔ اور اگر خان کے آخری قتل کو بھی شامل کر لیا جائے تو کل لاشوں کی تعداد آٹھ سو اکسٹھ ہو جائے گی۔"

"آٹھ۔۔ سو۔۔ اکسٹھ۔۔؟" ولیم سلومن کا منھ حیرت سے کھل گیا۔ "یعنی تم آٹھ سو اور اکسٹھ آدمیوں کے قاتل ہو؟"

"لیکن یہ سب قتل میرے ہاتھوں ہی سے ہوئے ہیں یہ مت سمجھ لیجیے۔ بلکہ یہ سارے قتل میری سرداری میں میرے حکم سے ہوئے تھے۔"

"اور امیر تمھیں ان سب کی بجائے صرف ایک ہی قتل پر پچھتاوا کیوں ہو رہا ہے؟"

"کیونکہ وہ میری سگی بہن تھی۔" بولتے بولتے امیر کی آواز کانپ گئی۔

"تو کیا تمھیں اس بات کا افسوس نہیں ہوتا کہ تمھارے ماں باپ کا قتل بھی ٹھگوں کے ہاتھوں ہوا ہے؟"

امیر چونک پڑا۔ ولیم سلومن نے بہت ہی گہرا سوال پوچھ لیا تھا۔

"لیکن اس میں میں کیا کر سکتا ہوں؟" امیر بوکھلا گیا۔ "اپنے ماں باپ کو مارنے کا تصور میرا کہاں تھا؟"

"میں یہی تو کہنا چاہتا ہوں۔" ولیم سلومن اپنے مقصد کی طرف آتے ہوئے بولا۔ "جس ابراہیم سردار نے تمھارے باپ کو مار دیا اور جس گنیش نے بے دردی سے تمھاری سگی ماں کو ہلاک کیا ان سے تمھیں نفرت کیوں نہیں ہوتی؟"

امیر کی پلکیں تھرتھرانے لگیں۔ پھر وہ آنکھیں پھاڑ کر ولیم سلومن کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "صاحب! آپ مرحوم ابراہیم کے خلاف ایک لفظ بھی مت کہیں۔" وہ ایک پل کے لیے رکا پھر کچھ سوچتا ہوا بولا۔ "ہاں گنیش کی بات الگ ہے۔ اس مکار شخص کو تو میں فریب سے ہی پسند نہیں کرتا۔ میرے ٹھگ باپ ابراہیم کے ساتھ بھی اس کی عداوت تھی۔"

"پھر بھی تمھارے دل میں گنیش سے بدلہ لینے کا جذبہ نہیں پیدا ہوتا؟ ولیم سلومن کی یہ بات ابھی ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ امیر چیخ کر بول پڑا۔ "آپ آخر اپنی اصل بات پر آ ہی گئے۔" اتنا کہہ کر وہ طنزیہ ہنسی ہنستا ہوا آگے بولا۔ "میرے دل میں گنیش سے انتقام لینے کا جذبہ پیدا کر کے آپ اپنا مطلب نکالنا چاہتے ہیں۔ یہ بات آپ صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتے؟"

"امیر!" ولیم سلومن کی آواز تیز ہو گئی۔ "تم اس انداز میں بات کرنا چھوڑ دو۔" پھر اس سے پہلے کہ وہ آگے کچھ کہتا۔ اس کی سماعت سے ایک آواز ٹکرائی۔

"ایکس کیوزمی سر۔" ولیم سلومن نے پلٹ کر دیکھا۔ دروازے سے رستم خان اندر داخل ہو کر اس کی جانب بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ اس نے امیر کی طرف دیکھے بغیر انگریزی میں ولیم سلومن سے کچھ کہنا شروع کر دیا۔ امیر کو یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ گورے صاحب سے کیا کہہ رہا ہے۔ لیکن رستم خان کی زبان سے نکلا ہوا ایک لفظ اس کی سمجھ میں ضرور آ گیا تھا۔ اپنی باتوں میں رستم خان نے دو تین بار گنیش کا نام لیا تھا۔

ولیم سلومن کے چہرے پر دوڑتے ہوئے خوشی کے تاثرات کو دیکھ کر امیر کو یہ اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ رستم خان گنیش کے بارے میں کوئی اچھی خبر لے آیا ہے۔ رستم خان کی بات سننے کے بعد ولیم سلومن نے جلدی سے میز کی دراز میں سے ایک نقشہ نکالا اور اسے میز پر پھیلا کر دیکھنے لگا۔ پھر اس کی انگلی نقشے پر پھرتے پھرتے ایک ہی جگہ پر تھم گئی۔ یہ دیکھ کر امیر کو اپنے اندازے کے صحیح ہونے کا یقین ہو گیا۔ ولیم سلومن جب نقشے کو سمیٹنے لگا تو امیر پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔ "تو آخر آپ نے گنیش کا پتا چلا ہی لیا۔" اس کی یہ بات سن کر ولیم سلومن اور رستم خان دونوں ہی ایک ساتھ چونک پڑے۔ شائد انھیں کسی تیسرے شخص کی موجودگی کا اسی وقت احساس ہوا تھا۔

"ہاں امیر علی!" ولیم سلومن دھیرے سے ہنس کر بولا۔

"دو چار دنوں میں وہ بھی گرفتار کر لیا جائے گا۔" اتنا کہہ کر وہ اٹھا اور رستم خان کے ساتھ باہر جانے لگا تو امیر نے ایک بار پھر اسے چونکاتے ہوئے کہا۔ "لیکن جناب آپ جس گاؤں کا نام لے رہے تھے وہاں تو گنیش نہیں ہوگا۔"

"تو پھر تمھیں بتاؤ وہ کس گاؤں میں روپوش ہو سکتا ہے؟" ولیم سلومن نقشے کو میز پر رکھتا ہوا بولا۔ لیکن امیر نے نقشے کی جانب دیکھے بغیر ہنستے ہوئے کہا۔ "جناب! اس طرح تو آپ گنیش کو گرفتار نہیں کر سکیں گے۔"

"تو پھر کس طرح؟"

"آپ کو وہاں لے جانا پڑے گا۔" امیر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ لیکن اس کی یہ بات سن کر رستم خان کے چہرے پر خوف کے سائے دوڑنے لگے۔ لیکن ولیم سلومن کے ہونٹوں پر ایک پُرسکون مسکراہٹ ناچ رہی تھی جیسے وہ کہہ رہا ہو۔ امیر مجھ سے چالاکی کرنے کی کوشش مت کرو۔ تم اب میرے دست سے نکل نہیں سکتے۔ گنیش کی گرفتاری کی لالچ میں میں تمھیں لوٹنے کے تیار نہیں ہوں۔۔ دوسری طرف امیر بغور اس کے چہرے کی جانب دیکھ کر اس کے خیالات کو تاڑ گیا اور بولا۔ "تو کیا آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ امیر بھاگ نکلنے کے لیے یہ ترکیب آزما رہا ہے؟" اتنا کہہ کر وہ ہنس پڑا پھر بولا۔ "آپ کو کیا اپنے سپاہیوں پر بھی بھروسا نہیں ہے؟ ذرا یہ تو سوچیے میں اتنے سارے سپاہیوں کے درمیان سے اکیلا کس طرح بھاگ سکتا ہوں؟"

اس کی بات سن کر ولیم سلومن سوچ میں ڈوب گیا اسے خاموش دیکھ کر امیر نے آگے کہا۔ "ہاں ایک بار گنیش کو گرفتار کروانے کے بہانے میں نے بھاگ جانے کی ترکیب سوچی تھی۔۔ لیکن اب۔۔"

"اب کیا؟" ولیم سلومن نے چونک کر پوچھا۔

"اب زندگی میں کوئی دلچسپی نہیں رہی۔" اس کی آواز میں سچائی کی جھلک نمایاں نظر آ رہی تھی۔ "جس دنیا میں اپنا کوئی بھی نہ ہو اس دنیا میں واپس جانے کی خواہش ہی کیوں کروں؟ اب تو یہ زندگی ایک بوجھ بن چکی ہے۔ پچھتاوے کا یہ ایک ایک لمحہ مجھے دھیرے دھیرے زندگی سے دور لے جا رہا ہے۔" امیر کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے منھ سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ ولیم سلومن کے دل میں اترتا جا رہا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس نے جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کیا اور امیر کی طرف دیکھتے ہوئے انتہائی دھیمے لہجے میں بولا۔ "تو پھر سچ سچ بتا دو امیر کہ گنیش کی گرفتاری کے لیے تمھیں مجھ سے کیا چاہیے؟"

یہ سن کر امیر نے ایک گہرا سانس لیا۔ پھر اس کے ہونٹ دھیرے دھیرے کانپنے لگے۔ "جناب آپ جو چیز مجھے دینا چاہتے ہیں وہی مجھے چاہیے۔۔ یعنی موت۔"

"اور کچھ بھی نہیں؟" ولیم سلومن نے اس طرح پوچھا جیسے اسے یقین نہ آ رہا ہو۔ مگر امیر کو اس سوال پر اچانک ہی کوئی بات یاد آ گئی اور وہ بولا۔ "ہاں جناب! مجھے تو اور کچھ نہیں چاہیے۔ لیکن اگر آپ رحم کر سکتے ہوں تو میرے ساتھیوں کو موت کی سزا مت دیجیے گا۔"

"ٹھیک ہے میں کوشش کروں گا۔" ولیم سلومن نے کہا۔ "تو پھر کل صبح تم تیار رہنا۔ رستم خان بارہ گھوڑ سوار سپاہیوں کے ساتھ تمھیں اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ لیکن یہ یاد رکھنا کہ اگر تم نے چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو وہیں ڈھیر کر دیے جاؤ گے۔"

جواب میں امیر صرف ہنس کر رہ گیا۔ مگر ولیم سلومن بدستور کہہ رہا تھا۔ "تم اگر گنیش کا پتا ابھی سے نہ بتانا چاہتے ہو تو نہ سہی۔ لیکن تمھیں یہ تو ضرور ہی بتانا ہوگا کہ ہمیں کس

اے حمید کے ایڈونچر قلم سے

شیو سینا کے دہشت گرد

چار جلدوں میں مکمل سیٹ =/700 روپے

ناشر: مکتبہ القریش

اردو بازار لاہور

طرف جانا ہوگا۔ اور یہ سفر کتنے دنوں کا ہوگا۔"

امیر تھوڑی دیر تک سوچتا رہا پھر اُسے کہنا پڑا۔ "ہمیں شیوا پوری کی جانب روانہ ہونا ہے۔ گھوڑے پر آتے جاتے تقریباً دس روز تو لگ ہی جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" ولیم سلومن نے اسے رخصت کرنے کے انداز میں کہا۔ "کل صبح تم لوگ روانہ ہو جاؤ۔"

امیر نے کمرے سے باہر جانے کے لیے قدم اٹھائے تو بیڑیوں کے کھنکنے کی آواز سن کر وہ اچانک چونک کر رُک گیا۔ اور ولیم سلومن کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "صاحب داروغہ جی سے کہلوا دیجیے کہ میرے ہاتھ پاؤں کی بیڑیاں صبح تک کھول دے۔"

"یہ کس لیے؟" ولیم سلومن ایک جھٹکے سے بولا۔

"تو کیا میں یہ بیڑیاں پہن کر گنیش کی گرفتاری کے لیے اُس کے سامنے جاؤں گا؟" امیر مسکرا کر بولا۔ "اس حال میں مجھے دیکھ کر وہ چوکنا ہو جائے گا۔ اُسے اس بات کا علم ہی نہیں ہونا چاہیے کہ میں اُسے گرفتار کرانے آیا ہوں۔"

"نہیں امیر یہ کسی حالت میں بھی نہیں ہو سکتا۔" سلومن کو اب امیر پر کچھ شک سا ہونے لگا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ اُس کے ہاتھ اور پیروں سے بیڑیاں کھول لی گئیں تو یہ چالاک ٹھگ بڑی آسانی سے اُن سب کی آنکھوں میں دُھول جھونک کر فرار ہو جائے گا۔ "نہیں۔ نہیں وہ اس سلسلے میں کوئی رسک نہیں لے گا۔"

امیر نے ولیم سلومن کو سمجھانے کی بڑی کوشش کی لیکن ولیم سلومن کا دل اس کی بات ماننے کے لیے تیار ہی نہیں ہوا۔ آخر امیر کو تھک ہار کر کہنا پڑا۔ "تو پھر آپ مجھے میرا پُرانا لباس اور پگڑی پہننے کی اجازت دے دیں۔" اس نے ولیم سلومن کے انکار کرنے سے پیشتر ہی اُسے سمجھایا۔ گنیش بہت ہی چالاک اور ہوشیار آدمی ہے مجھے اپنے ہاتھ پاؤں میں بندھی ہوئی بیڑیوں کو اپنے لباس کے نیچے چھپا کر ہی اس کے سامنے جانا پڑے گا کیونکہ میرے جسم پر قیدیوں کے اس لباس کو دیکھ کر وہ یقیناً مشکوک نظروں سے مجھے دیکھے گا آپ یہ بات ضرور یاد رکھیے کہ مجھے ایک دھوکے باز ٹھگ سے دھوکے بازی کرنی ہے۔" امیر کی یہ دلیل وزن دار تھی جسے سُن کر ولیم سلومن یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ واقعی امیر کو قیدی کے لباس میں دیکھ کر گنیش چوکنا ہو جائے گا اور اس طرح بنی بنائی بازی بگڑ جائے گی۔ اِس خیال کے آتے ہی اس نے امیر سے کہا۔ "ٹھیک ہے میں تمھاری یہ شرط منظور کر لیتا ہوں۔ لیکن تمھیں بھی کافی ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ گنیش کا سامنا کرنے کے لیے میں تمھیں کوئی ہتھیار فراہم نہیں کروں گا۔"

"مجھے ہتھیار کی ضرورت نہیں ہے جناب! لیکن اُس کا وار روکنے کے لیے مجھے آپ ایک ڈھال تو دیں گے نا؟" امیر نے اس کی وجہ بتاتے ہوئے کہا۔ "گنیش خنجر کی نشانہ بازی کا ماہر ہے۔ وہ دس پندرہ گز کے فاصلے پر سے بھی اپنے مخالف کا سینہ چھید سکتا ہے۔ اور اس کا یہ نشانہ کبھی خطا نہیں ہوتا۔"

امیر کی یہ بات سن کر ولیم سلومن کو ہنسی آ گئی اور وہ بولا۔ "تم مجھ سے تو اپنے لیے موت مانگ رہے ہو مگر گنیش کے خنجر سے ڈرتے ہو؟" امیر کو ولیم سلومن کا یہ طنز پسند نہیں آیا۔ اِس لیے وہ غرّاہٹ بھری آواز میں بولا۔ "جناب موت موت میں بھی فرق ہوتا ہے۔ میں تو گنیش جیسے آدمی کے خنجر سے مرنے کی بجائے پھانسی پا کر مرنا زیادہ پسند کرتا ہوں۔" اتنا کہہ کر وہ واپسی کے لیے مُڑ گیا۔ اور پھر تیزی سے کمرے کے باہر نکل گیا۔ ولیم سلومن تھوڑی دیر تک اس کی بیڑیوں کی دور ہوتی ہوئی آواز کو سُنتا رہا پھر ہونٹوں ہی ہونٹوں میں بڑبڑانے لگا۔ "اگر یہ آدمی ٹھگوں کے ہتھے نہ چڑھا ہوتا تو یقیناً آج یہ فوج کا ایک بہادر سپہ سالار ہوتا۔"

◎

گنیش کی تلاش میں بارہ گھوڑ سوار سپاہیوں اور امیر علی کے ساتھ نکلے ہوئے رستم خان کو چار دنوں کے سفر میں ہی یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ امیر علی ٹھگ تو ایک شریف اور دوست پسند آدمی ہے۔ وہ امیر علی سے چار پانچ سال بڑا ہی تھا لیکن اس کے باوجود اسے امیر علی اپنے سے زیادہ دور اندیش اور تجربہ کار شخص لگ رہا تھا۔ شاندار لباس کے نیچے لوہے کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے قیدی ہونے کے باوجود امیر بڑے رُعب اور دبدبے سے اس کے ساتھ ساتھ اپنے گھوڑے کو دوڑا رہا تھا دورانِ سفر وہ اپنی کہانی سناتا، قہقہے لگاتا۔ خوشی خوشی صوبیدار رستم خان کا ساتھ دے رہا تھا۔ اُسے دیکھ کر کوئی یہ محسوس بھی نہیں کر سکتا تھا کہ یہ شخص سینکڑوں معصوم اور بے گناہ لوگوں کا قاتل ہو سکتا ہے۔ سفر پر روانہ ہونے سے قبل ولیم سلومن نے رستم خان کو تاکید کی تھی کہ امیر کو اپنی کڑی نگرانی میں رکھنا۔ کہیں یہ دھوکہ دے کر بھاگ نہ جائے۔ لیکن ان چار دنوں کے سفر میں امیر نے ایک بار بھی بھاگ جانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اور نہ ہی اس عرصے میں اس کے چہرے سے کسی ایسے ارادے کا اظہار ہوا تھا۔ بلکہ اس نے تو ایک بار رستم خان سے کہا تھا۔ "خان صاحب کل رات خیمے کے باہر آپ کے جو دو پہرے دار موجود تھے اُن میں سے ایک تو سو رہا تھا اور دوسرا اس قدر بے خبر تھا کہ اُس کے گلے میں آسانی سے رومال کا

پھندہ ڈالا جا سکتا تھا۔"

یہ سُن کر رستم خان نے گھور گھور کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ "تو پھر تم نے یہ کوشش کیوں نہیں کی؟"

اس سوال پر امیر مسکرایا۔ "کیا گورے صاحب کی طرح آپ بھی یہ ہی سمجھ رہے ہیں کہ میں اس قید و بند سے نکل بھاگنے کے لیے باہر آیا ہوں؟" جواب میں رستم خان کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

پھر جب گنیش کا گاؤں آ گیا تو امیر نے گاؤں سے باہر ہی انھیں رُکنے کا مشورہ دیا اور کہا۔ "یہاں بیٹھ کر ذرا دیر سستا لیں۔ اِس کے بعد ہمیں گنیش کو اُس کے گھر میں گھیر لینا چاہیے۔"

صوبیدار رستم خان نے اُس کا یہ مشورہ مان لیا تو امیر علی نے ایک اور مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ "اب میں وضو کر کے نماز پڑھ لوں۔ اُس کے بعد آپ اپنے دو سپاہیوں کو سادے لباس میں میرے ساتھ بھیج دیں تاکہ کسی کو معلوم نہ ہو کہ میرے ساتھ سپاہی آئے ہیں۔ گنیش کو تو دھوکے سے ہی گرفتار کرنا ہوگا۔"

رستم خان کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ اُس کا خیال تھا کہ امیر صرف دو سادہ لباس سپاہیوں کے ساتھ اگر گاؤں میں جاتا ہے تو یہ خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے وہ بھاگنے کی کوئی ترکیب سوچ چکا ہو۔

امیر رستم خان کی اس گمبھیر خاموشی کو تاڑ گیا کہ اُسے اُس پر شک ہو رہا ہے۔ یہ محسوس کر کے اسے پہلی بار رستم خان پر غصہ آ گیا اور وہ ذرا تیز لہجے میں بولا۔ "آپ لوگ مجھ پر بھروسہ نہیں کرتے تو نہ کریں مگر آپ لوگوں کو اپنے پر کیوں بھروسا نہیں ہے؟ میں زنجیروں میں جکڑا ہوا نہتا اکیلا آدمی ہوں۔ اِس حالت میں میں آپ کے دونوں سپاہیوں کے سامنے سے کس طرح بھاگ سکتا ہوں ذرا یہ تو سوچیں؟"

"نہیں! جائیں گے تو ہم سب ساتھ ہی جائیں گے۔" رستم خان نے فیصلہ کُن لہجے میں کہا۔ "تم ہمیں دور سے گنیش کا گھر دکھا دینا ہم لوگ جا کر اُسے گرفتار کر لیں گے۔"

"نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔" امیر اٹل لہجے میں بولا۔ "میں اکیلا ہی گھر میں جا کر گنیش کو باہر لے آؤں گا اور پھر اُسے آپ کے حوالے کر دوں گا۔ اس سے اپنا انتقام لینے کے لیے ہی تو میں نے آپ کا ساتھ دیا ہے۔" جیسے جیسے دیر ہوتی جا رہی تھی ویسے ویسے امیر کی ضد بڑھتی جا رہی تھی۔ "اگر سپاہیوں کی موجودگی کا علم گنیش کو ہو گیا تو وہ فرار ہو جائے گا۔"

کافی دیر تک جب کوئی فیصلہ نہیں ہوا تو خود امیر نے ہی ایک راستہ ڈھونڈ نکالا اور رستم خان سے بولا۔ "تو پھر ایسا کریں اپنے تمام ساتھیوں کے ساتھ آپ بھی میری طرح کے سادہ لباس پہن لیں تاکہ دیکھنے والوں کو یہ لگے کہ یہ مسافروں کا کوئی قافلہ ہے اور اگر کوئی میری جان پہچان والا مل گیا تو وہ بھی یہی سمجھے گا کہ میں اپنی ٹولی کے ساتھ سفر پر نکلا ہوں۔"

"بالکل ٹھیک۔" رستم خان چٹکی بجا کر بولا۔ "یہ سب سے اچھی ترکیب ہے۔" اتنا کہہ کر اس نے سپاہیوں کو حکم دے دیا کہ وہ اپنی وردی اتار کر سادہ لباس پہن لیں۔

"صرف سادہ لباس سے کام نہیں چلے گا صوبیدار صاحب!" امیر نے پُرمذاق لہجے میں کہا۔ "آپ لوگوں کو تو ٹھگ مسافروں کا روپ دھارنا ہوگا۔"

یہ سُن کر رستم خان امیر کی طرف دیکھ کر دھیرے دھیرے مسکرانے لگا۔

◎

وہ رہا گنیش کا گھر۔" کچھ اونچائی پر بنے ہوئے ایک تنہا مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امیر نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ اب آپ کو یہ سمجھ آ گئی ہوگی کہ اگر گنیش کو ذرا بھی شک ہو گیا تو وہ بڑی آسانی سے پیچھے کی ڈھلان میں اتر کر غائب ہو سکتا ہے۔"

رستم خان کو دشواریوں کا صحیح اندازہ گنیش کے مکان کو دیکھ کر ہی ہو گیا۔ سب سے پہلی بات تو یہ تھی کہ اس اونچے ٹیلے پر چڑھ کر مکان کی طرف جاتے وقت ہی مکان کے مکین کی نظر اُن پر پڑ سکتی تھی اور وہ آسانی سے یہ دیکھ سکتا تھا کہ کون آ رہا ہے؟ ممکن ہے کہ اس وقت بھی گنیش اپنے گھر کی کھلی ہوئی کھڑکی سے انھیں دیکھ رہا ہو

"کیا گھر میں وہ تنہا ہی ہوگا۔۔۔؟" گھوڑے کو ایک درخت کے تنے سے باندھتے وقت رستم خان نے دھیرے سے پوچھا۔ "رہنے کے لیے تو اس نے شاندار جگہ کا انتخاب کیا ہے۔"

"یہ اس کے چھپنے کی جگہ ہے۔" امیر نے دھیمی آواز میں سمجھایا۔ "جب اُسے کسی خطرے کا احساس ہوتا ہے تو وہ مہینوں اسی جگہ چھپا رہتا ہے۔ زیادہ تر وہ تنہا رہنا ہی زیادہ پسند کرتا ہے۔ اُسے اپنے سگے باپ پر بھی بھروسا نہیں ہے۔"

تھوڑی دیر بعد رستم خان نے گنیش کے گھر کے چاروں طرف اپنے سپاہیوں کو تعینات کر دیا۔ اس نے تین سپاہیوں کو مکان کے پچھلے ڈھلان کے نیچے چھپ کر چوکس رہنے کی تاکید کی تھی۔ تین سپاہیوں کو سامنے کے حصے میں رکھ کر بقیہ سپاہیوں کو دونوں طرف بھیج دیا تھا

"اب ہم صرف چار آدمی اُوپر جائیں گے۔" رستم خان نے اپنی بندوق کو اچھی طرح سے شانے پر لٹکا کر چادر میں چھپا لیا تھا۔ "گورے صاحب کی خواہش ہے اُسے زندہ گرفتار کیا جائے۔ یہ بات تم بھی یاد رکھنا امیر علی۔"

امیر نے اُس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اپنے ہاتھ پاؤں

میں پڑی ہوئی بیڑیوں کو اس نے اچھی طرح اپنے کپڑوں میں چھپا لیا۔ پھر بولا "چلیے گھر میں روشنی دکھائی دے رہی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہی ہے کہ وہ اس وقت گھر کے اندر موجود ہے۔"

تھوڑی دیر بعد امیر اور رستم خان اپنے دو سپاہیوں کے ساتھ بے آواز قدموں سے ٹیلے پر چڑھ رہے تھے۔ کبھی کبھی امیر کی بیڑیوں میں کھنک پیدا ہو جاتی تھی تو وہ سرگوشی کے انداز میں بول پڑتا تھا "آپ نے تھوڑی دیر کے لیے بھی مجھے بیڑیوں سے آزاد نہیں کیا اگر اس کی آواز نے پول کھول دیا تو ہماری ساری محنت برباد ہو جائے گی۔"

رستم خان چپ رہا۔ اوپر پہنچ کر انھوں نے تھوڑی دیر تک سانس لیا۔ پھر امیر نے کہا "اب آپ لوگ اس دیوار کی اوٹ میں چھپ جائیں میں آگے جا کر آپ کو آواز دیتا ہوں۔" امیر نے اپنے چہرے کا پسینا پونچھتے ہوئے کہا "ذرا بھی جلد بازی کرنے کی کوشش مت کیجیے گا۔ مجھے دیر ہو جائے تو یہ مت سمجھ لیجیے گا کہ میں بھاگ گیا ہوں۔"

یہ سن کر رستم خان چند لمحوں تک تو گھبرایا ہوا سا دکھائی دیا۔ اس کا دل امیر کو تنہا چھوڑنے پر آمادہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ لیکن حالات کے پیشِ نظر اب بحث کرنے کا وقت بھی نہیں تھا۔ اس لیے اُسے مجبوراً کہنا پڑا "ٹھیک ہے لیکن زیادہ دیر مت لگانا۔" اتنا کہہ کر وہ اپنے دونوں سپاہیوں کے ساتھ دیوار کی اوٹ میں سرک گیا۔

آگے بڑھنے سے قبل امیر نے آنکھیں مُوند کر چند لمحوں کے لیے خدا کو یاد کیا اور پھر بڑی احتیاط سے بیڑیوں کی آواز کو روکتا ہوا دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ گنیش کے مکان کے دروازے تک پہنچ گیا۔ "گنیش" اس کی آواز رات کے سناٹے کو توڑتی ہوئی گونجی۔ لیکن جب اُسے اندر سے کوئی جواب نہیں ملا تو اس نے دوبارہ پکارا۔

"کون ہے؟" گنیش کی کرخت آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تو وہ کانپ کر رہ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ گنیش اس کی آواز سن کر باہر نکل آئے گا لیکن اس کی بجائے گنیش نے دروازے کی جھریوں سے جھانکتے ہوئے پوچھا "کون ہو تم؟"

"میں امیر علی ہوں۔" امیر نے کسی گھبراہٹ کے بغیر جواب دیا پھر ٹھگوں کے مخصوص اشارے کا استعمال کرتے ہوئے کہا۔ "السلام علیکم خان بھائی۔"

لیکن گنیش اس اشارے کو سننے کے باوجود تھوڑی دیر تک خاموش رہا۔ امیر انتظار میں تھا کہ وہ دروازے کے زینے اُتر کر نیچے آ جائے گا لیکن وہ تو گھر کے اندر چلا گیا تھا۔ تو کیا اُسے شک ہو گیا ہے؟ امیر کی گھبراہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کے جی میں آیا کہ وہ پیٹھ کے پیچھے بندھی ہوئی ڈھال کو اپنے سینے پر رکھ لے لیکن اس قسم کی جلد بازی تو گنیش کو اور زیادہ شک میں ڈال سکتی ہے۔ وہ سانس روک کر تھوڑی دیر تک تو اُسی جگہ کھڑا رہا آخر گنیش پھر دروازے پر آ گیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں لالٹین تھا اور دوسرے ہاتھ میں خنجر۔ لالٹین اٹھا کر اس نے دور سے ہی اس کی روشنی میں امیر کو پہچاننے کی کوشش کی۔ امیر نے بھی اس کا چہرہ دیکھ لیا تھا۔ اور اب اُسے ہمت سے آگے بڑھنا تھا اور اتنی احتیاط بھی برتنی تھی کہ بیڑیوں کی ذرا سی بھی آواز پیدا نہ ہونے پائے اُس نے دھیرے دھیرے قدم اٹھائے مگر اس کی نظریں گنیش کے خنجر پر ہی جمی ہوئی تھیں۔

"اس طرح کیوں چل رہے ہو؟" گنیش کی آواز گونجی۔

"پاؤں بُری طرح سے زخمی ہو گیا ہے۔" امیر کو فوراً ہی جواب سُوجھ گیا۔ "گھر میں کوئی اور تو نہیں ہے نا؟" امیر نے بناوٹی گھبراہٹ کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

"میں اکیلا ہی ہوں۔ بے دھڑک اندر آ جاؤ۔" گنیش کمرے کے اندر جانے کے لیے مُڑ گیا اور بولا "مجھے توقع نہیں تھی کہ تم کو زندہ بھی دیکھ سکوں گا۔"

امیر کو جھٹکا تو لگا لیکن اُسے اس کو برداشت کرنا ہی پڑا اور سنبھل سنبھل کر زینے چڑھ گیا۔ اندر داخل ہو کر اس نے اطمینان کر لیا کہ گنیش کہیں کمرے کے دروازے کے پیچھے تو نہیں چھپ گیا ہے؟ لیکن گنیش سامنے ہی کھاٹ پر بیٹھا ہوا دکھائی دیا تو اُسے کچھ راحت سی محسوس ہوئی۔ لالٹین کو اس نے چھت سے بندھی ہوئی رسی میں لٹکا دیا تھا۔ لیکن اس کا خنجر ابھی تک اُس کے ہاتھ میں ہی تھا۔

کمرے کے دروازے میں داخل ہو کر امیر کھڑا رہ گیا۔ دونوں کی نظریں ایک دوسرے کی نظروں سے ٹکرا رہی تھیں۔ امیر نے فوراً ہی یہ اندازہ لگا لیا کہ گنیش کو اس کے آنے پر ذرا بھی خوشی نہیں ہوئی ہے۔ اس نے نہ تو امیر سے ہاتھ ملانے کی ضرورت محسوس کی تھی اور نہ اب تک اس نے اسے بیٹھنے کے لیے کہا تھا۔ امیر اس کی اس سرد مہری کو دیکھ کر چوکنا ہو گیا۔ اسے گنیش کے سامنے جا کر اس کے خنجر کا شکار بن جانا منظور نہیں تھا۔ وہ تو چاہتا تھا کہ گنیش کو کسی ترکیب سے کمرے کے باہر آنے پر مجبور کر دیا جائے۔

"گنیش تم نے مجھ سے غداری کی ہے۔" گنیش کے قریب نہ جانے کی ترکیب ذہن میں آتے ہی امیر بول پڑا "جب سپاہی پہنچ گئے تو تم چالاکی سے ہم سب کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔"

"اس کی وجہ تمھاری اپنی بے وقوفی ہے۔ تم تو اس پٹھان کی پیٹھ سے چپک کر ہی رہ گئے تھے۔" گنیش کی آنکھیں غصے میں سُرخ ہو رہی تھیں۔ "تمھاری اِسی بے وقوفی کی وجہ سے آدھی ٹولی گرفتار ہو گئی تھی۔"

امیر نے چپ رہ کر اپنے ہونٹ بھینچ لیے اور چاروں طرف دیکھتے ہوئے کمرے کا جائزہ لینے لگا لیکن اسے کہیں بھی کسی قسم کا کوئی ہتھیار نظر نہیں آیا۔ گنیش تھوڑی دیر تک تو اسے دیکھتا رہا پھر غرّاہٹ بھری آواز میں بولا: "کیا میرے گھر کی تلاشی لینے آئے ہو؟"

"نہیں گنیش میں اپنا حساب سمجھنے آیا ہوں۔"

"کیسا حساب؟" گنیش خنجر کی دھار پر انگلی پھیرتا ہوا بولا

"فرار ہوتے وقت تم اُس پٹھان خاندان کے زیورات بھی لے کر بھاگے تھے اس میں میرا بھی حصّہ ہے یا نہیں؟" امیر نے کہا۔

"کون سے زیورات؟" گنیش آنکھیں نکال کر بولا: "یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ میں پٹھان کے زیورات لے کر بھاگا تھا؟"

"گنیش اگر تمھیں حصّہ نہیں دینا ہے تو صاف انکار کر دو۔" امیر نے اُسے اور غصّہ دلانا جاری رکھا۔ "مگر مجھ سے یہ اداکاری کرنا چھوڑ دو۔"

"خاموش۔" گنیش ایک جھٹکے سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے خنجر والے ہاتھ کی نسیں امیر کو اُبھرتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ "اب اگر ایک لفظ بھی کہا تو میں یہ خنجر تمھارے سینے میں اُتار دوں گا۔"

امیر تھرتھرا گیا پھر اس نے واپس جانے کا دکھاوا کیا لیکن گنیش کو کمرے سے باہر لانے کی ترکیب اچانک ہی اس کی سمجھ میں آ گئی اور وہ پلٹ کر فوراً ہی بولا: "ٹھیک ہے گنیش زیورات کے بارے میں اب میں ایک لفظ بھی نہیں کہوں گا۔ لیکن میرا گھوڑا تو تم مجھے واپس دے دو۔"

یہ سن کر گنیش کے شکن آلود چہرے سے غصّہ غائب ہو گیا ٹھیک اُسی وقت اُس کا دھیان امیر کی سفید داڑھی پر چلا گیا اور وہ حیرت سے بولا: "مگر امیر تمھاری یہ حالت کیسے ہو گئی؟ تمھاری داڑھی کے سارے بال سفید کیوں ہو گئے؟"

"موت کے خوف نے مجھے بوڑھا بنا دیا ہے گنیش!" امیر بولا تو گنیش قہقہہ لگا کر ہنس پڑا پھر دھیرے دھیرے امیر کی جانب بڑھتے ہوئے وہ اچانک رُک گیا۔ اُس کی نظر امیر کے ایک پاؤں پر جمی ہوئی تھی۔ پاجامے کے پائنچے کے نیچے سے اُسے بیڑیوں کا ایک کڑا نظر آ گیا تھا۔ اور پھر اچانک ہی اس کا چہرہ کسی زخمی شیر کی طرح خوفناک ہو گیا اور وہ ایک جھٹکے سے دو چار قدم پیچھے ہٹ گیا۔ پھر کھلی ہوئی کھڑکی سے ایک نظر اُس نے باہر کی طرف دیکھا۔ امیر نے اس کی گھبراہٹ دیکھ کر یہ اندازہ لگا لیا کہ وہ اس کے ارادے کو سمجھ گیا ہے اور اب ڈھیل دینا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ اس خیال کے آتے ہی وہ چلّا کر بولا: "گنیش میرا گھوڑا کہاں ہے؟ چلو جلدی سے میرا گھوڑا میرے حوالے کر دو۔"

"غدّار۔" گنیش کا لہجہ بڑا ہی نفرت انگیز تھا۔ اُس نے خنجر کی نوک کو مضبوطی سے پکڑ کر امیر کے سینے پر نظریں جما دیں۔ اور امیر چونک کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا تو گنیش نے یہ سمجھ لیا کہ وہ بھاگنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اُس نے اپنا خنجر والا ہاتھ اُٹھایا اور پلک جھپکتے ہی اس کا خنجر بجلی کی طرح فضا میں لہراتا ہوا امیر کی جانب لپکا اور پھر فوراً ہی "کھچاک" کی ایک آواز سنائی دی۔ گنیش کا یہ حملہ اتنا اچانک ہوا تھا کہ امیر کو ہٹنے کا موقع بھی نہیں ملا لیکن اس سے پہلے کہ ہوا میں لہراتا ہوا خنجر اس کے سینہ میں پیوست ہو جاتا وہ بڑی پھرتی سے مڑ گیا اور خنجر اس کی پیٹھ سے ٹکرا گیا۔ امیر اس جھٹکے سے زمین پر بیٹھ گیا۔ تب تھوڑی دیر بعد گنیش کو خیال آیا کہ اس کا خنجر امیر کی پیٹھ میں نہیں بلکہ اس کی پیٹھ پر بندھی ہوئی ڈھال میں پیوست ہو گیا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ اور زیادہ غصّے میں آ گیا اور چنگھاڑتا ہوا بولا: "امیر کے بچے میں آج تجھے اپنے گھر سے زندہ نہیں جانے دوں گا۔" وہ امیر کی ڈھال میں پیوست خنجر کو نکال لینے کے لیے بڑی تیزی سے امیر کی طرف لپکا۔ لیکن اُسے اِس کا علم نہیں تھا کہ فرش پر دوہرا پڑا ہوا امیر اس کی طرف سے غافل نہیں ہے۔ امیر نے بڑی پھرتی سے اس کی ٹانگوں میں اپنا ہاتھ پھنسا دیا اور بے خیالی میں گنیش منھ کے بل فرش پر گر پڑا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ دوتین زینے سے لڑھک کر اٹھتا امیر نے پُشت کی جانب ہاتھ بڑھا کر ڈھال میں دھنسا ہوا خنجر کھینچ نکالا اور دہاڑ کر بولا: "بھاگنے کی کوشش مت کرنا۔" وہ پھر خنجر تان کر دانت پیستا ہوا آگے بولا: "بے وقوف تم میری جان لینا چاہتے تھے لیکن میں تمھیں زندہ رکھنا چاہتا ہوں۔"

اندھیرے میں گنیش نے ایک بار آس پاس نظر ڈالی۔ اس کا خیال تھا کہ امیر اکیلا نہیں آیا ہو گا بلکہ سپاہیوں کو ساتھ لے کر اس کی گرفتاری کے لیے آیا ہو گا۔ لیکن جب اُسے کوئی دوسرا دکھائی نہیں دیا تو اس نے اپنی چال بدل دی: "امیر تمھارے پاؤں میں پڑی ہوئی بیڑی دیکھ کر میں بدحواس ہو گیا تھا اور مجھے یوں لگا تھا کہ تم پولیس کو ساتھ لے کر آئے ہو۔"

"ہا۔ ہا۔ ہا۔" امیر قہقہہ لگا کر ہنس پڑا لیکن چند لمحوں کی اس غفلت میں گنیش اُس کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔ اس کا ارادہ امیر کے ہاتھ سے خنجر جھپٹ لینے کا تھا۔

"خبردار اگر تم نے کوئی چالاکی کی تو۔" امیر نے چیخ کر کہا تو گنیش ایک دم رُک گیا۔

"ہاں گنیش میں تمھیں گرفتار کرانے کے لیے ہی آیا ہوں۔" ہانپتے ہانپتے امیر نے صوبیدار رستم خان کو آواز دی۔ گنیش نے فوراً ہی پیچھے اور آس پاس پلٹ کر دیکھا لیکن جب اس بار بھی اسے کوئی دکھائی نہیں دیا تو اس نے یہی سمجھا کہ امیر اسے خوف زدہ کر کے اپنے قابو میں کرنا چاہتا ہے۔ شاید امیر اس سے ڈر رہا ہے۔ لیکن وہ اس کے ہاتھوں میں نہیں آئے گا۔ من ہی من میں یہ ارادہ کر لینے کے بعد وہ بولا: "امیر اب یہ مذاق چھوڑ دو۔ تم بھلا مجھے کیوں گرفتار کراؤ گے؟ ہم تو ایک دوسرے کے ساتھی ہیں۔ ہمارے درمیان کوئی دشمنی نہیں ہے۔"

امیر پھر قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ لیکن اِس بار اُس نے گنیش پر سے اپنی نظریں نہیں ہٹائیں۔ تھوڑی دیر تک ہنسنے کے بعد امیر نے کہا: "دنیا میں اگر کسی سے میری دشمنی ہے تو وہ صرف تم سے ہی ہے۔" امیر کے لہجے میں نفرت کی جھلک تھی: "اور وہ بھی بچپن کی دشمنی۔"

"بچپن کی دشمنی؟" گنیش نے ایک بار پھر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا: "امیر یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ ہماری جان پہچان کو تو صرف دس برس ہی ہوئے ہیں۔ بچپن میں تو میں نے تمھیں دیکھا بھی نہیں ہے۔"

"تم بھول رہے ہو گنیش۔" امیر نے پھر رستم خان کو پکارا اور آگے کہنے لگا: "گنیش میں ابراہیم سردار کا بیٹا ہوں۔ تمھیں تو اس بات کا بھی علم نہیں ہے۔ یاد کرو پانچ سال کے ایک بچے کی وجہ سے تم اِبراہیم سردار سے لڑ پڑے تھے۔ پٹھان کا وہ بچہ میں خود ہوں امیر علی۔"

یہ سنتے ہی گنیش کو ایک جھٹکا لگا اور اس کے چہرے کی شکنیں تھرتھرانے لگیں: "تم۔۔۔ تم۔۔۔ اُسی پٹھان کے بیٹے ہو؟"

"ہاں گنیش میں وہی ہوں۔ تمھیں یاد ہے نا کہ تم نے میری ماں کی لاش کی بھی بے حرمتی کرنے کی کوشش کی تھی؟ اور تمھیں شاید یہ بھی یاد ہو گا کہ تم نے مجھے اُچھال کر ایک پتھر پر پھینک دیا تھا۔ تمھیں یہ بھی یاد ہو گا کہ تم نے ابراہیم سردار سے کہا تھا کہ جسے تم بیٹا بنا کر اپنے گھر لے جانا چاہتے ہو وہ بڑا ہو کر ایک دن تمھارا ہی دشمن بن جائے گا۔ گنیش کو ایک ایک بات یاد آتی جا رہی تھی۔ اور امیر آگے کہتا رہا: "میں ابراہیم سردار کا دشمن تو نہ بن سکا لیکن تم سے اپنی دشمنی کا بدلہ لینے کے لیے ضرور زندہ رہا۔"

ایک ایسی عورت کی کہانی
جو مردوں کے معاشرے میں
ملکہ بن کر جینا چاہتی تھی

ناگ رانی

دو جلدوں میں
جلد اول =/145
جلد دوئم =/145

مکتبہ القریش سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
فون 7668958

"یہ سب باتیں تمھیں کس نے بتائی ہیں؟" گنیش نے حیرانی سے پوچھا لیکن امیر نے اس کے سوال کا جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔ اتنی دیر میں رستم خان اپنے دونوں سپاہیوں کے ساتھ گنیش کے پیچھے آ کر کھڑا ہو چکا تھا۔ گنیش کو اس کا احساس کافی دیر میں ہوا۔ صوبیدار رستم خان نے جب بندوق کی نال اس کی پیٹھ پر رکھ دی تو وہ چونک کر اُچھل پڑا۔ اور جب گردن گھما کر اس نے پیچھے دیکھا تو ساری بات اُس کی سمجھ میں آ گئی اور پھر دوسرے ہی لمحے اس کے دونوں ہاتھ اس کی پُشت پر جکڑ دیے گئے۔ امیر زینے اتر کر آہستہ آہستہ اس کے سامنے آ گیا۔ یکایک گنیش نے دانت پیستے ہوئے بڑی نفرت سے اس کے منھ پر تھوک دیا: "غدّار۔" امیر سے اپنی یہ بے عزتی برداشت نہیں ہوئی۔ اچانک اس کا خنجر والا ہاتھ اوپر اٹھا لیکن رستم خان نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے ایسا کوئی موقع ہی نہیں دیا کہ وہ گنیش کے سینے میں خنجر اتار سکتا۔ رستم خان نے امیر کو روکتے ہوئے کہا: "تم رہنے دو امیر! اِس کا جواب میں اسے دیتا ہوں۔" اس کے ساتھ ہی اس کے پٹھانی کا ہاتھ کا مضبوط گھونسہ گنیش کے جبڑے پر پڑا اور گنیش "آہ" کی آواز نکالتا ہوا پیچھے کی جانب جھول گیا اور اُس کے ہونٹوں سے خون کی لکیر نکل کر

اس کی داڑھی پر بہنے لگی۔

پھر کسی پر تھوکنے کی کوشش کی تو خون کی قے کرادوں گا۔"

رستم خان بولا تو تھوڑی دیر تک گنیش کی گردن جھکی ہی رہی۔ وہ صوبیدار رستم خان کی نظروں کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں پا رہا تھا۔

"لیجیے خان صاحب یہ خنجر۔" امیر نے گنیش کا خنجر رستم خاں کے حوالے کر دیا تو گنیش نے ایک جھٹکے سے گردن اٹھا کر اس کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔ مرنے سے پہلے اگر میں نے بدلہ نہ لیا تو میرا نام بھی گنیش نہیں۔

تھوڑی دیر بعد رات کے اندھیرے میں وہ پانچوں آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگے۔ اُن میں امیر سب سے آگے تھا۔

● واپسی کے سفر میں کہیں گنیش اور امیر میں جھڑپ نہ ہو جائے اس لیے رستم خان کو بہت ہوشیار رہنا پڑا تھا۔ اس نے گنیش کو چار سپاہیوں کی نگرانی میں آگے آگے رکھا ہوا تھا اور خود ان سے دس بارہ گز پیچھے امیر کے ساتھ ساتھ چلا آ رہا تھا لیکن اس کے باوجود بھی گنیش دن میں دس پندرہ بار پلٹ پلٹ کر امیر کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھ لیتا تھا۔ کبھی کبھی وہ امیر کی طرف دیکھ کر ہونٹوں ہی ہونٹوں میں بڑبڑاتا اور کبھی ہوا میں گھونسے لہرا لہرا کر اپنے غصّے کا اظہار کرتا رہتا تھا۔

"گنیش تم سے سخت ناراض لگتا ہے۔" رستم خان امیر سے کہتا۔ "جیل میں بھی مجھے اس کو تم سے بہت دور رکھنا پڑے گا۔"

"آپ میری فکر نہ کریں خان صاحب! اس کے غصّے کی وجہ میں سمجھتا ہوں۔" امیر دھیمی آواز میں بولا۔ "اِسے تو آج پتا چلا ہے کہ میں اِس کے دشمن ٹھگ سردار کا بیٹا ہوں اور پھر اِس کی گرفتاری بھی میرے ہاتھوں ہوئی ہے۔ اِسی لیے یہ غصّے میں پاگل ہوا جا رہا ہے۔ یہ بڑا ظالم، سخت گیر اور تیز مزاج آدمی ہے۔ اس جیسا خطرناک ٹھگ آپ کو شائد ہی کوئی دوسرا دکھائی دے گا اور ہاں اس کی ایک بہت بُری عادت کے بارے میں تو آپ کے گورے صاحب کو بھی علم نہیں ہوگا۔"

"ایسی کون سی عادت ہے؟"

"عورت کی لاش کے ساتھ۔۔۔"

"کیا؟" رستم خان کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"ہاں خان صاحب! یہ بہت ہی گناہ گار آدمی ہے۔"

"ایسے ظالم شیطان کو تو پھانسی پر چڑھا دینا چاہیے۔"

پھانسی کا لفظ سننے کے بعد امیر بقیہ سفر میں زیادہ دیر تک خاموش ہی رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ کھلا آسمان۔ یہ تپتا سورج یہ بہتے جھرنے۔ یہ چہچہاتی ہوائیں۔ یہ کھلے ہوئے پھول۔ یہ جھومتے ہوئے درخت۔ یہ اُڑتے ہوئے پرندے۔ یہ لہراتے ہوئے کھیت اور یہ اُڑتی ہوئی دھول۔ وہ اب کبھی بھی ان دلکش نظاروں کو نہیں دیکھ سکے گا۔ وہ قدرت کے ان حسین نظاروں کو جی بھر آخری بار دیکھ لینا چاہتا تھا۔ بیتے ہوئے دنوں کے سائے من میں اُبھرتے اور ڈوبتے رہے۔ اُس نے ہر ایک سے بھرپور محبت پائی تھی۔ لیکن اس کے بدلے میں اُس نے بہت کم پیار ان لوگوں کو دیا تھا۔ کیا وہ اپنی موت کو ہنستے ہنستے گلے لگا سکے گا؟ یا پھر دوسروں کی طرح آخری لمحے میں ٹوٹ کر بکھر جائے گا؟ نہیں نہیں ایسا تو میں کبھی بھی نہیں ہونے دوں گا۔۔۔" وہ بڑبڑایا۔

"کیا نہیں ہونے دو گے امیر؟" رستم خان نے اسے چونکایا تو اُسے خیال آیا کہ اُس کا سفر اب ختم ہو رہا ہے۔ شام ڈھل چکی تھی اور وہ لوگ گورے صاحب ولیم سلومن کے بنگلے میں داخل ہو رہے تھے۔ اپنے آس پاس ایک نظر ڈالنے کے بعد امیر نے رستم خان سے پوچھا۔ "خان صاحب گنیش کہاں ہے؟"

"ارے میاں! تمھیں اِس کی بھی خبر نہیں ہے؟" رستم خان حیرت سے بولا۔ "اُسے قید خانے میں ڈالنے کے بعد ہی ہم لوگ صاحب کے بنگلے پر آئے ہیں۔"

"لیکن صاحب کے بنگلے پر مجھے کیوں لایا۔۔۔ گیا ہے؟"

رستم خان نے اس کے اس سوال کا جواب نہیں دیا۔ اور گھوڑے کی پیٹھ پر سے اتر کر ولیم سلومن کے خوبصورت دیوان خانے میں داخل ہو گیا۔

"صاحب ابھی آ رہے ہیں۔" ملازم نے آ کر رستم خان کو بتایا تو امیر اپنی قمیض کی آستین سے اپنے چہرے کا پسینا پونچھنے لگا۔ پھر اس نے اپنے ہاتھ پاؤں میں پڑی ہوئی بیڑیوں کو اپنے کپڑوں میں چھپانے کی کوشش کی۔ شائد اسے ولیم سلومن کے گھر میں ایک قیدی کی حیثیت سے کھڑے رہنے میں شرم آ رہی تھی۔

ولیم سلومن زینے سے اتر کر نیچے آیا اور سب سے پہلے اس نے انگریزی میں صوبیدار رستم خان کو شاباشی دی پھر وہ امیر علی کی جانب بڑھ گیا اور اس سے بولا۔ "واقعی تم نے اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے امیر علی۔" وہ اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر آگے بولا۔ "تیرا تو خیال تھا کہ شائد صوبیدار کی آنکھوں میں دھول جھونک کر تم فرار ہو جاؤ گے۔"

"سر اِس نے تو ایک بار بھی ایسی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔" رستم خان امیر کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا۔ "شاید اس کی مدد کے بغیر ہم گنیش کو اتنی جلدی گرفتار نہیں کر پاتے۔" رستم خان سے پوری تفصیل سُن لینے کے بعد ولیم سلومن نے امیر کی پیٹھ تھپتھپائی اور بولا۔ "اب مجھے یقین ہو گیا کہ گنیش سے اپنا بدلہ لینے کے لیے ہی تم نے یہ خطرہ مول لیا تھا۔"

لیکن امیر خاموش ہی رہا مگر ولیم سلومن کی خواہش تھی کہ وہ کچھ بولے۔ اسی لیے اُس نے پوچھا۔ "امیر علی اس کام کے بدلے میں کیا تم مجھ سے کچھ بھی مانگنا نہیں چاہو گے؟" یہ سن کر امیر نے دھیرے دھیرے گردن اٹھائی اور ہونٹوں پر ایک پھیکی مسکراہٹ لاتے ہوئے بولا۔ "بس میں آپ سے یہ ہی پوچھنا چاہتا ہوں کہ جو چیز میں آپ سے مانگ چکا ہوں وہ مجھے کب ملے گی؟"

ولیم سلومن اس طرح اس کی طرف دیکھنے لگا جیسے اسے شدید جھٹکا لگا ہو۔ اُس کی آنکھوں میں ہمدردی کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ "کیا مرنے کی تمھیں بہت زیادہ جلدی ہے۔"

امیر نے اس سوال کا جواب اپنی گردن ہلا کر دیا اور واپس جانے کے لیے اِس طرح دروازے کی جانب مُڑ گیا جیسے کہنے سننے کے لیے اب اُس کے پاس کوئی بات ہی نہ ہو۔

"دو منٹ ٹھہرو۔" یکایک ولیم سلومن کی آواز اس کی پشت سے ٹکرائی۔ "میڈم تمھیں دیکھنا چاہتی ہیں۔ وہ ابھی آ رہی ہیں۔"

یہ سن کر امیر کے جسم میں ایک کپکپاہٹ سی دوڑتی محسوس ہوئی۔ پھر زینے پر کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی تو امیر کا سر اور بھی زیادہ جھک گیا۔

"میم صاحب آ گئی ہیں امیر۔" رستم خان نے امیر کو مُڑ کر سامنے دیکھنے کا اشارہ کیا۔ لیکن امیر سے ایسا نہ ہو سکا۔ وہ بدستور اُس جانب پُشت کیے کھڑا رہا۔

"سر لگتا ہے اِسے شرم آ رہی ہے۔" رستم خان نے ولیم سلومن کو سمجھایا۔ "ہاتھ پاؤں میں بیڑیاں پڑی ہوں تو ہمارے پٹھان مرد عورتوں کا سامنا کرنا پسند نہیں کرتے۔ آخر تو اِس کی رگوں میں پٹھانی خون ہی تو دوڑ رہا ہے۔"

"اوہ۔۔۔ آئی سی۔" امیر کی ہچکچاہٹ کی وجہ ولیم سلومن نے اپنی بیوی کو سمجھائی تو ایملی کو بھی سخت حیرت ہوئی اور وہ بولی "یہ بات تو میں نے پہلی بار سُنی ہے۔ خیر جیسی اس کی مرضی۔"

اس کے بعد رستم خان امیر کو لے جانے کے لیے آگے بڑھا۔ ابھی وہ دونوں دیوان خانے سے باہر نکلے ہی تھے کہ ان کی سماعت سے ایک شیریں آواز ٹکرائی۔ "ممی۔۔۔ ممی۔۔۔ لٹل ممی ہیم" ایک بچے کی آواز نے امیر کے دل پر کچھ اور ہی اثر کیا۔ اِس جھٹکے سے اس کے ہاتھ پاؤں میں پڑی ہوئی لوہے کی بیڑیاں بہت زور سے کھنک اٹھیں۔ ولیم سلومن۔ رستم خان اور ایملی سب بڑی حیرت سے امیر کی طرف دیکھ رہے تھے۔ گورے صاحب کا پانچ سالہ بچہ بھی بڑی تجسس بھری نظروں سے امیر کو تاک رہا تھا۔ ایملی کا خیال تھا کہ بچہ شائد امیر علی کو دیکھ کر ڈر گیا ہے۔ اس لیے اُس نے اُسے اپنی دونوں ٹانگوں کے درمیان چھپا لیا تھا۔ مگر نہیں اس وقت تو امیر کے چہرے پر ایسے کوئی تاثرات نہیں تھے کہ انھیں دیکھ کر کوئی ڈر جائے۔ اُس وقت تو اس کے ہونٹوں پر ایک محبت بھری مُسکراہٹ ناچ رہی تھی۔ اور آنکھوں میں پیار کا ایک طوفان مچل رہا تھا۔ اس نے ایک بار ولیم سلومن اور صوبیدار رستم خان کی طرف دیکھا۔ پھر اُس بچے پر نظریں جمائے ہوئے دھیرے دھیرے ایملی کی جانب بڑھنے لگا۔ اِس وقت نہ تو اُسے بیڑیوں کی پرواہ تھی اور نہ ہی اس کے چہرے پر شرمندگی اور گھبراہٹ کے کوئی آثار تھے۔ وہ کانپتے ہوئے اور مُسکراتے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ ایک ایک قدم آگے بڑھتا رہا۔

بچے سے دو قدم کے فاصلے پر آ کر وہ ٹھہر گیا اور اِس طرح نیچے بیٹھ گیا جیسے اِس کمرے میں اُس کے اور اُس بچے کے علاوہ اور کوئی موجود ہی نہ ہو۔ نیچے بیٹھ کر اُس نے ننھے جون کی طرف دیکھا اور مُسکرانے لگا۔ چند لمحوں تک وہ اِسی طرح مُسکراتا رہا پھر اچانک ہی ننھے جون کے ہونٹ تھرتھرائے۔ امیر کی مُسکراہٹ

جاسوسی ڈائجسٹ کا مقبول سلسلہ

سرکش

محمود احمد مودی کے شہکار قلم سے

12 حصوں میں شائع ہو گیا ہے

قیمت فی حصہ =/50 روپے

مکمل سیٹ =/600 روپے

مکتبہ القریش

سرکلر روڈ اردو بازار لاہور

فون 7668958

کے جواب میں اس کے ہونٹوں پر بھی مُسکراہٹ نمودار ہوگئی۔ ننھے بجون کی اس مُسکراہٹ نے امیر کے سارے غم بھلا دیئے اور ہچکچاہٹ کی دیوار کو توڑ کر وہ بقیہ فاصلہ ایک ہی جست میں طے کر گیا۔ اِس وقت ننھے بجون کی جگہ اُسے اپنی سات سالہ بچی کھڑی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ اُس نے ایک پاؤں کا گھٹنا زمین پر ٹیک کر پیار سے اپنا ہاتھ بجون کی تھوڑی پر رکھا۔ پھر اس کا ہاتھ تھراتا ہوا ہاتھ آپ ہی آپ اُس کے سر پر پھیلنے لگا۔ سب لوگ بڑی حیرت سے امیر علی کی حرکتوں کو دیکھ رہے تھے۔ ننھا بجون بھی بڑی عجیب سی نظروں سے امیر علی کو دیکھ رہا تھا۔ امیر کی آنکھوں میں آنسوؤں کو لہراتے دیکھ کر اُس کا معصوم چہرہ پھیکا پڑتا جا رہا تھا۔ کافی دیر تک امیر بھیگی آنکھوں سے بجون کو تکتا رہا۔ اُسے تو اس وقت ہوش آیا جب ولیم سلومن کا ہاتھ اُسے اپنے کندھے پر محسوس ہوا۔ اُس نے چونک کر اپنے آنسو پونچھے پھر گردن موڑ کر جلدی سے اٹھتے ہوئے بولا: "گستاخی معاف کیجئے گا۔"

اُس کی یہ درد بھری آواز ہر کسی کا دل دہلا گئی۔ ایلی کی آنکھوں میں تو آنسوؤں کی جھلک صاف دکھائی دے رہی تھی۔ امیر نے جلدی جلدی قدم بڑھا دیئے۔ اور جب تک وہ ولیم سلومن کے بنگلے سے باہر نہیں نکل آیا اُس وقت تک اس نے ایک بار بھی پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔ اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ جیل کی جانب بڑھتا ہوا اس کا ایک ایک قدم اُسے موت سے قریب لے جا رہا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اُسے یہ بھی محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی بیٹی آواز دے کر اُسے واپس آنے پر مجبور کر رہی ہے۔ چلتے چلتے اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے کان دبا لیے جیسے وہ اپنی بیٹی کی پُکار کو سننا ہی نہ چاہتا ہو۔ کیونکہ وہ تو موت کو ہنستے ہنستے گلے لگانا چاہتا تھا۔

❦

"پھر کیا امیر؟"

پچھلے چھ ماہ سے دن میں چھ سات بار یہ سوال اُس سے پوچھا جاتا تھا اور امیر علی کی زندگی کی کتاب کے اوراق اُلٹتے جاتے تھے۔ یہ سوال پوچھنے والا گورا صاحب ہی تھا لیکن یہ گورا صاحب ولیم سلومن نہیں بلکہ کرنل میڈاس ٹیلر تھا اور جواب دینے والا امیر علی جیل کی کچہری میں ہی بیٹھا ہوا تھا۔ اور یہ جیل ساگر کی نہیں بلکہ دہلی کی جیل تھی۔

کمرے کے وسط میں کرنل میڈاس ٹیلر ایک کرسی پر ہاتھ میں کاغذ قلم لیے بیٹھا تھا۔ نیچے بچھی ہوئی دری پر امیر علی بیٹھا کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ اچھی ہندوستانی اور واجبی سی انگریزی جاننے والا ایک ویسی مترجم ان دونوں کے سامنے دری پر بیٹھا ہوا تھا۔ کرنل ٹیلر نے سگار سُلگا کر دو چار کش لیے اور پھر کاغذ پر کچھ لکھنے لگا۔ اور پھر امیر کی طرف دیکھنے لگا۔ باون سال کے اس بوڑھے امیر علی کے چہرے پر اب بہت زیادہ جھریاں پڑ گئی تھیں۔ بارہ برس کی قید و بند نے اُسے پہلے سے بہت زیادہ کمزور کر دیا تھا۔ پھر بھی اُسکی یادداشت مضبوط تھی۔ اُس کی کہی ہوئی باتوں کو سُن کر یوں لگ رہا تھا جیسے یہ سارے واقعات ابھی چند روز قبل ہی رونما ہوئے ہوں۔ اپنے کسی جُرم کو چھپائے بغیر وہ اپنی داستان سُناتا جا رہا تھا۔

کرنل ٹیلر نے اُسے پہلی بار اس کمرے میں بلا کر اس سے کہا تھا کہ مجھے تمھاری زندگی کی کہانی لکھنی ہے تو اُس وقت امیر علی چونک پڑا تھا اور عجیب سی نظروں سے کرنل ٹیلر کو گھورنے لگا تھا۔ پھر اُس نے ہنس کر کرنل ٹیلر سے کہا تھا: جس کی زندگی قتل و غارت گری سے بھری پڑی ہو اُس شخص کی داستان لکھ کر آپ کیا کریں گے؟" پھر ہنستے ہی ہنستے اُس نے آگے کہا تھا: "جناب کیا آپ کو کوئی بہادر سپہ سالار، کوئی وطن کا سپاہی یا کوئی صوفی نہیں ملا تھا کہ مجھ جیسے بدنام زمانہ ٹھگ کی داستان لکھنے بیٹھ گئے؟"

اُس کی بات سن کر کرنل ٹیلر نے مُسکرا کر کہا تھا: "امیر علی مجھے کسی کی زندگی کی ڈائری نہیں لکھنی ہے بلکہ میں تو ایک کہانی لکھنا چاہتا ہوں۔ عظیم شخصیتوں کے بارے میں لکھنے والے تو بہت ہیں لیکن ایک ٹھگ کی کہانی تو شائد ہی کوئی لکھنے کی ہمت کرے گا۔"

امیر کو حیرت ہو رہی تھی۔ وہ اب بھی اس بات کو ایک مذاق سمجھ رہا تھا۔ اِس لیے اُس نے بھی مذاق کے ہی طور پر کہا: "شائد اسی لیے آپ ایک ٹھگ کی کہانی لکھ کر لوگوں کو یہ دھندہ سیکھانا چاہتے ہیں؟"

"ہا۔ ہا۔ ہا۔" کرنل ٹیلر بے اختیار اس بات کی سُن کر ہنس پڑا: "تم بھی کمال کے آدمی ہو۔ ایک انگریز نے اس دھرتی پر سے ٹھگوں کے وجود کو ختم کر دینے کے لیے اپنی جوانی گذار دی اور دوسرا انگریز اس دیش کے لوگوں کو ٹھگ بننے کی ترغیب دے رہا ہے۔ یہ تم نے کس طرح سوچ لیا؟"

"میری زندگی جُرم اور گناہ کی پرچھائیوں میں گھری ہوئی ہے۔ اِس سے لوگوں کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟"

"گناہوں کے ساتھ ساتھ پچھتاوا بھی ہے امیر علی۔"

میڈاس ٹیلر کے لہجے میں ہمدردی نمایاں تھی: "ادیب کا کام آدمی کے دل کی گہرائی میں اُترنا ہوتا ہے۔ تمھارے کسی عیارانہ کام کو میں تمھارے کارنامے نہیں بناؤں گا۔ پھر بھی تمھارے اندر جو انسان رہتا ہے اُسے میں پہچاننے کی کوشش ضرور کروں گا۔"

اس طرح کی تھوڑی بحث و تکرار کے بعد امیر نے اپنی داستان سنانے کی حامی بھر لی: "ٹھیک ہے جناب! اگر آپ کی یہی مرضی ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ بتائیے کب سے یہ کام شروع کرنا ہے؟"

"تم کہو تو آج اور ابھی سے ہی۔" کرنل ٹیلر خوش ہوتے ہوئے بولا: "ایسا کرتے ہیں ہم لوگ کل صبح سے بیٹھا جاتے ہیں دو گھنٹے صبح اور دو گھنٹے شام کو۔ اِس وقت تک تم یاد کرنے کی کوشش کرتے رہنا۔"

امیر دھیرے سے ہنسا: "جناب آپ مجھے یاد کرنے کے لیے کہہ رہے ہیں جب کہ میں پچھلے دس برس سے ان سب باتوں کو بھول جانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ لیکن اس کے باوجود بھی بھول نہیں پاتا۔ آپ بھی میری طویل داستان سُن کر تھک جائیں گے۔۔۔ یہ داستان دو چار دنوں میں ختم ہونے والی نہیں ہے۔"

"مگر میں تو دو چار مہینوں تک تمھاری داستان سننے کے لیے تیار ہوں امیر علی!" کرنل ٹیلر نے پرجوش لہجے میں کہا: "کل صبح تم یہاں آجانا۔ اِس کے لیے میں جیل کے داروغہ کو اجازت نامہ بھجوا دوں گا۔"

امیر کا خیال تھا کہ یہ گورا صاحب اُس کی داستان سُنتے سُنتے دو چار دنوں میں ہی تھک جائے گا۔ اُس کی داستان گورے صاحب کو دلچسپ محسوس نہیں ہوگی۔ ممکن ہے اس کی باتوں کو وہ جھوٹ سمجھنے لگے اور میرے اندر چھپے ہوئے انسان کو تلاش کرنے والا یہ صاحب میری شیطانیت جان کر مجھ سے نفرت کرنے لگے گا۔۔۔ لیکن امیر کا لگایا ہوا یہ اندازہ غلط ثابت ہوا۔ شروع شروع میں دونوں کو آپس میں باتیں کرنے میں تکلیف ہونے لگی۔ امیر کی ہندوستانی زبان ٹیلر صاحب کی سمجھ میں نہیں آتی تھی اور امیر انگریزی زبان سے ناواقف تھا۔ کبھی کبھی تو امیر جوش میں آکر اتنی جلدی جلدی بولنے لگتا تھا کہ صاحب کا قلم اُس کا ساتھ نہیں دے پاتا تھا: امیر ذرا آہستہ، کہہ کر وہ اُسے درمیان میں ہی روک دیتا۔ یہ دخل اندازی امیر کو گھبرا دیتی تھی اور اِس طرح ایک بات کو دو دو تین تین بار اُسے کہنا پڑتا تھا اور اِس طرح اسے کبھی کبھی بوریت سی ہونے لگتی تھی۔ تب ٹیلر صاحب نے محسوس کیا کہ اِس طرح کام نہیں چلے گا۔ پھر اُس نے

ایک بے بس نوجوان کی حیرت انگیز داستان
جسے اپنی موت کا وقت معلوم ہو گیا تھا
مظلوم
یعقوب جمیل کے ہوشربا قلم سے
جس کا قارئین کو برسوں سے انتظار تھا
مکتبہ القریش سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
فون 7668958

جیل کے اسٹاف میں سے ایک نوجوان ہندوستانی کلرک کا انتخاب کر لیا جو انگریزی بول اور سمجھ سکتا تھا۔ اُسے مترجم کی ذمے داری سونپ دی گئی اور پھر اس طرح اس کام میں تیزی آتی گئی۔ اس طرح چھ مہینے میں امیر کی داستان مکمل ہو گئی۔ بس اب صرف ایک دو دن کا کام ہی باقی رہ گیا تھا۔ اِس کے بعد امیر سے اس کی ملاقات ہونے کی امید معدوم ہوتی جا رہی تھی۔

"ہاں تو امیر علی پھر کیا ہوا؟"

کرنل ٹیلر نے یہ سوال دُہرا کر امیر کو پھر چونکا دیا۔ امیر نے گردن اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور بولا: "صاحب میں ذرا دوسری طرف نکل گیا تھا۔" یہ کہہ کر وہ سنبھل گیا: "ہاں تو ہم کہاں تک پہنچے ہیں؟"

گنیش کی گرفتاری تک۔" کرنل ٹیلر نے کہا اور پھر کاغذ پر کچھ لکھتے ہوئے آگے بولا: "ولیم سلومن کی شاباشی نے کہ تم جیل کی طرف جانے لگے تھے اور اس وقت موت کا خیال تمھارے دماغ میں گردش کر رہا تھا۔"

"ٹھیک ہے۔" امیر نے آگے کہنا شروع کیا: "موت کے خوف میں اِس آخری دن کو میں ہنستے ہنستے گذار دینے کی کوشش میں مصروف ہو گیا۔ پھر روزانہ رات کو سوتے وقت میں پھانسی کے پھندے کو اپنی نگاہوں کے سامنے لے آتا اور تب ایک منظر میری آنکھوں کے آگے ناچنے لگتا۔ میں دیکھتا ہوں کہ دو پہرے دار مجھے لینے آئے ہیں۔ وہ مجھے جیل کے پچھواڑے لے جاتے ہیں جہاں پھانسی کا تختہ بالکل تیار ہے۔ وہاں میرے ہاتھ پاؤں کی بیڑیاں اتار لی جاتی ہیں۔ اُسی جگہ ولیم سلومن صاحب، صوبیدار رستم خان

اور تین چار افسر بھی موجود ہیں۔ مشرق کی جانب سے سورج کی پہلی کرن جھانکنے کی تیاری کر رہی ہوتی ہے۔ گورے صاحب نے اپنی جیبی گھڑی نکال کر ہاتھ میں لے لی ہے۔ پھر وہ مجھ سے پوچھتے ہیں: "تیار ہو؟"

جواب میں میں سر ہلا کر "ہاں" کہتا ہوں تو وہ آہستہ آہستہ میرے قریب آجاتے ہیں اور مجھ سے پوچھتے ہیں: "کیا تم خدا کی عبادت کرنا چاہتے ہو؟" میں انکار میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیتا ہوں "نہیں میں نے تو ساری رات خدا کی عبادت کی ہے۔" وہ تھوڑی دیر خاموش رہتے ہیں پھر میری طرف دیکھتے ہیں۔ شائد انھیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ مجھے بولنے میں بہت زیادہ تکلیف ہو رہی ہے لیکن میں انھیں یہ محسوس نہیں ہونے دینا چاہتا کہ مجھے اپنی موت سے ڈر لگ رہا ہے۔ میں انھیں سلام کرنے کے لیے اپنا ہاتھ اٹھا کر کہتا ہوں: "صاحب! اب کس کا انتظار ہے؟" انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور اشارے سے سپاہی کو سمجھایا کہ مجھے تختے پر لے جایا جائے۔ میں پاؤں بڑھاتا ہوں تو اچانک مجھے کچھ یاد آجاتا ہے اور میں پلٹ کر صاحب سے کہتا ہوں: "صاحب آپ نے مجھ سے جس ہمدردی کا اظہار کیا ہے اُس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ اُس وقت میری آواز میں ذرا بھی لرزش نہیں ہوتی اور میں بڑے اعتماد سے پھانسی کے تختے پر آجاتا ہوں۔ جب میرے چہرے پر سیاہ نقاب ڈال دی جاتی ہے تو ولیم سلومن صاحب اس طرح میرے قریب آجاتے ہیں جیسے وہ کچھ کہنا چاہتے ہوں۔ میں ان کی آنکھوں میں آنسو ٹمٹماتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ ہو سکتا ہے یہ میرا وہم ہی ہو مگر ان کی آواز میں تو کپکپاہٹ اور ہمدردی کا جذبہ تو میں نے محسوس کیا ہی تھا۔ امیر علی تمھاری کوئی آخری خواہش ہے؟" اس سے زیادہ وہ کچھ نہ بول سکے اُن کے سوال پر مجھے میری بیٹی یاد آجاتی ہے اور دو چار گھڑی تک میں بالکل پتھر کی طرح ساکت ہو جاتا ہوں۔ پھر مجھے یوں لگنے لگتا ہے کہ میں ٹوٹ جاؤں گا اور میری آنکھیں آنسو بہانے لگیں گی۔ مجھے خیال آتا ہے کہ اگر میری یہی حالت رہی تو بیٹی کو یاد کرتے کرتے میں خوشی خوشی موت کو گلے نہیں لگا سکوں گا۔ مجھے اپنے آپ کو سنبھالنے میں ذرا تکلیف ہوتی ہے۔ پھر میں نقاب میں چھپا ہوا اپنا چہرہ ہلا کر کہتا ہوں: "نہیں جناب میری کوئی خواہش نہیں ہے۔ موت کے سوائے اب مجھے کچھ بھی نہیں چاہیے۔" میری بات سن کر صاحب نے اپنا ہاتھ اُٹھایا اور جلاد میرے پیروں کے نیچے کا تختہ ہٹانے کے لیے جھک جاتا ہے۔ ٹھیک اُسی وقت میں آخری بار ہنسنے کی کوشش کرتا ہوں۔ تختہ ہٹ گیا اور مجھے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگتا ہے۔ اور پھر مجھے لگتا ہے کہ میرا دم نکل چکا ہے۔ مجھے اپنی لاش پھانسی کے تختے پر لٹکتی نظر آتی ہے۔ اس طرح امیر علی ٹھگ کی زندگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔" کہتے کہتے امیر علی نے دونوں ہاتھوں سے اِس طرح اپنی گردن تھام لی جیسے اس کا دم سچ مچ ہی گھٹ رہا ہو۔ کرنل ٹیلر صاحب نے دیکھا کہ اس کا جسم پسینے میں شرابور ہو رہا ہے۔ "اسے پانی پلاؤ۔" اس نے مترجم کلرک سے کہہ کر اُسے پانی پلوایا پھر تھوڑی بعد امیر سے پوچھا: "امیر علی کیا روزانہ رات کو تم یہ منظر دیکھتے ہو؟"

"ہاں جناب!" امیر اپنی آستین سے اپنے چہرے کا پسینا پونچھتے ہوئے بولا: "میں ایک طویل عرصے سے روزانہ ہی پھانسی پر چڑھتا ہوں۔ اور روزانہ ہی مجھے دل کو مضبوط بنا کر اپنی بیٹی کو بھولنے کی کوشش کرنا پڑتی ہے۔"

"بہت عجیب بات ہے۔" کرنل ٹیلر صاحب نے کہا: "شائد تمھارے گناہ اتنے زیادہ ہیں کہ ایک بار کی پھانسی کی سزا کرنے پر تو"

"اور شائد اسی لیے سلومن صاحب نے مجھے ایک بار کی پھانسی کی سزا بھی نہیں ہونے دی۔" امیر نے ایک سرد آہ بھر کر کہا: "موت کی سزا سن کر میں ذرا بھی نہیں گھبرایا تھا۔ میں روزانہ داروغہ سے پوچھتا تھا کہ مجھے کب پھانسی دی جائے گی؟ آخر پھانسی کے پھندے کو کیوں میرے دماغ پر سوار کر رکھا ہے آپ لوگوں نے؟ میں پورے تین مہینے تک یہ سوالات پوچھتا رہا اور آخر ایک دن سلومن صاحب آہی پہنچے اور میرے لیے ایک بہت بڑی سزا فرما گئے۔"

"کیسی سزا؟"

"پھانسی سے معافی کی سزا" امیر کے لہجے میں افسوس کی جھلک تھی: "صاحب آپ کو یقین نہیں آتا ہوگا کہ آدمی موت کے لیے اس قدر بے چین کیوں ہو جاتا ہے؟ کیا میری کہانی سن لینے کے باوجود بھی آپ کو میری تکلیف کا احساس نہیں ہوتا؟"

"میں تمھاری تکلیف کو سمجھ رہا ہوں اور اچھی طرح سمجھ رہا ہوں امیر۔" ٹیلر صاحب نے انگلیوں میں قلم گھماتے ہوئے کہا: "لیکن پھر بھی ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ تم باتوں باتوں میں اکثر یہ بات کہہ گئے ہو اگر تمھیں قید خانے سے رہائی مل جائے تو تم دوبارہ بھی ٹھگ ہی بننا پسند کرو گے۔ ایک طرف تو تھلا پچھتاوا ہے اور دوسری طرف تمھاری یہ ضد۔"

"اس بات کو سمجھنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟" امیر نے پُرجوش لہجے میں کہا: "آپ کی سمجھ میں یہ بات کبھی نہیں آسکتی کیونکہ آپ نے توپ کے گولے نہیں کھائے ہیں۔ آپ نے کبھی بھوانی دیوی کے حکم پر عمل نہیں کیا ہے اور قاتل رومال کو آپ نے اپنے ہاتھ میں نہیں

لیا ہے۔ اس لیے یہ سب باتیں آپ کی سمجھ میں کیسے آسکتی ہیں؟"

"کمال ہے" کرنل ٹیلر نے ہنس کر کہا: "موت کو گلے لگانے کے لیے تو تم تیار تھے لیکن ٹھگ کے پیشے سے ہٹنے کے لیے تیار نہیں ہو۔"

"میں آپ کو کس طرح سمجھاؤں صاحب؟" امیر نے ہاتھ اُٹھا کر کہا: "موت کے بغیر ٹھگ کبھی مٹ نہیں سکتا۔ کوئی گناہ اور کوئی بھی پچھتاوا ہمارے اندر کے ٹھگ کو نہیں مار سکتا۔ اسی لیے تو اُسے خود مرنا پڑتا ہے۔"

یہ سن کر ٹیلر کی آنکھوں میں ایک چمک سی لہرا گئی: "شائد اسی لیے سلومن صاحب نے تمھیں پھانسی کی سزا نہ دلوا کر اُس سے بھی بڑی سزا دی ہے۔ امیر تم مرنا چاہتے تھے تاکہ موت کو گلے لگا کر تم یعنی امیر علی ٹھگ ختم ہو جائے۔ لیکن تمھاری یہ خواہش پوری نہیں ہوئی۔"

"یہ بات تو خود میری سمجھ میں بھی نہیں آتی۔" امیر نے اپنا ہاتھ ہوا میں لہراتے ہوئے کہا: "لیکن جب ولیم سلومن صاحب مجھے یہ خبر سنا کر جانے لگے تو میں نے اُن کا شکریہ ادا نہیں کیا تھا۔ اِس کا انھوں نے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ مجھے اِس خبر پر یقین نہیں آرہا ہے۔ اور مارے خوشی کے میں خاموش ہو گیا ہوں۔ پھر انھوں نے مجھے تفصیل بتانی شروع کی۔" امیر میں نے گورنر صاحب کو سمجھانے کی بہت کوشش کی۔ تمھارے گناہ اتنے بھیانک ہیں کہ انھیں کوئی بھی معاف کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ لیکن پھر بھی چونکہ تم نے ٹھگوں کو صفحہ ہستی سے مٹا دینے کے لیے جس طرح ہمارا ساتھ دیا ہے بس اُسی کے بدلے میں تمھیں معافی ملی ہے۔ لیکن کیا اس کے لیے تم میرا شکریہ بھی ادا نہیں کرو گے؟"

"اور تم نے کیا جواب دیا؟" کرنل ٹیلر نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"میرے دل میں جو تھا وہ میں نے کہہ دیا۔" امیر سنجیدہ لہجے میں بولا: "صاحب آپ مجھے زندہ رکھ کر زندگی بھر پچھتاوے کی آگ میں جلانا چاہتے ہیں۔ آپ شائد مجھے تڑپا تڑپا کر ہی ختم کرنا چاہتے ہیں۔"

"تم نے ان سے یہ کہا تھا؟" ٹیلر صاحب کو حیرانی ہوئی۔

"ہاں ٹیلر صاحب۔ میرا یہ جواب بہت اچھا جواب تو نہیں تھا لیکن میں کرتا بھی کیا؟ موت مجھے دھوکہ دے گئی تھی۔ یہ بات مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ آپ ہی بتائیں صاحب زندہ رہنے سے مجھے کیا ملا ہے؟ درد اور تڑپ کے سوا میں نے کیا پایا ہے؟ بارہ برس سے میں موت کے بوجھ کو سر پر اُٹھائے جی رہا ہوں آخر کیوں؟"

"شائد اس لیے کہ۔" کرنل ٹیلر تھوڑی دیر کے لیے رُکا لیکن

دیوتاؤں کے شہر نیپال میں بسنے والے

ایک درندے کی پراسرار داستان

درندہ

یعقوب جمیل کے ہوشربا قلم سے جس کا

قارئین کو برسوں سے انتظار تھا

مکتبہ القریش مرکز اردو بازار لاہور

فون 7668958

پھر اس نے کہہ دیا: "تمھارے زندہ رہنے سے ہی ہماری ملاقات ہوئی ہے اور تمھاری داستان قلمبند کرنے کا مجھے موقع مل گیا ہے۔"

"یہ تو ایک بہانہ ہے جناب!" امیر ایک پھیکی مسکراہٹ سے بولا: "اور یہ بہانہ بھی اب دو ایک روز کا ہے۔ اس کے بعد کیا ہوگا؟"

کرنل میڈاس ٹیلر کے پاس اُس کے اِس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اِس لیے اب اُسے صرف ایک ہی بات پوچھنا تھی جو اُس نے پوچھ لی: "فرض کرو کہ تمھاری کسی رشتہ دار سے ملاقات ہو جاتی ہے اور تمھیں تمھاری بیٹی کے بارے میں کچھ معلوم ہو جائے تو اِس صورت میں تمھارا بوجھ ہلکا ہو سکتا ہے یا نہیں؟"

یہ سن کر امیر اس طرح کانپ اٹھا جیسے کسی نے اس کی دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ اس کی آنکھوں میں درد کے گہرے سائے اُبھر آئے تھے۔ اس درد کو چھپانے کے لیے اُس نے اپنے نچلے ہونٹ کو دانتوں میں دبا کر اپنی آنکھیں جھکا لیں اور بے قراری سے اپنے سینے پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ کچھ کہنے سے پہلے ایک سرد سی آہ اس کے منہ سے نکلی اور پھر وہ دھیمی آواز میں بولا: "نہیں صاحب میں اس جھوٹی امید پر اپنے آپ کو کیوں بے چین کروں؟ اب میرے لیے اس دنیا میں کوئی رشتہ دار نہیں ہے۔ اور نہ ہی کوئی میرا اپنا ہے۔" چند لمحوں کی تاخیر کے بعد اُس نے آگے کہنے کے لیے ہونٹ کھولے ہی تھے کہ کرنل ٹیلر کے اردلی نے دروازے کے باہر سے اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ آواز دے کر کرنل ٹیلر نے اُسے اندر بلا لیا۔ اردلی نے سلام کرنے کے بعد ایک کاغذ ٹیلر صاحب کی طرف بڑھا دیا۔ کاغذ پر نظر ڈالنے کے بعد کرنل ٹیلر نے اُس سے کہا: "اُسے اندر بھیج دو۔"

یہ جان لینے کے بعد کہ کوئی اندر آرہا ہے امیر نے جلدی جلدی اپنی بھیگی ہوئی آنکھوں کو پونچھ لیا۔ کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی لیکن امیر نے اپنا سر نہیں اٹھایا۔ اس کا خیال تھا کہ آنے والا شخص ٹیلر صاحب سے دو باتیں کر کے چلا جائے گا۔ لیکن اس کی بجائے تو ٹیلر صاحب نے اس شخص کو بیٹھنے کے لیے کہہ کر اس سے کہا: "تم بالکل وقت پر آگئے ہو۔ اب جلدی سے اپنا کام شروع کر دو۔"

کون سا کام شروع کرنا تھا؟ امیر کا تجسس جاگا اور اس نے دھیرے دھیرے گردن اٹھائی اور آنے والے شخص کی طرف دیکھا۔ وہ نوجوان ایک بڑے سے سفید کاغذ کو ایک بڑی سی تختی پر لگا رہا تھا۔ وہ ایک بار امیر کی طرف دیکھ کر مسکرایا تو امیر کو بڑی حیرت سی ہوئی تھی کیونکہ اکثر لوگ قیدیوں کو دیکھ کر یا تو نفرت کا اظہار کرتے ہیں یا پھر ان کی آنکھوں میں افسوس اور ہمدردی کے جذبات دکھائی دیتے ہیں لیکن اس نوجوان کی مسکراہٹ میں یہ دونوں باتیں نہیں تھیں۔ امیر اس کے چہرے پر سے نظریں ہٹانے ہی والا تھا کہ اس نوجوان کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی: "نہیں جناب آپ اسی طرح میری طرف دیکھتے رہیں۔" اتنا کہہ کر اس نے کاغذ پر پنسل پھیرنی شروع کر دی۔ امیر کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے؟

"امیر میں نے اس شخص کو تمھاری تصویر بنوانے کے لیے بلایا ہے۔"

"تصویر؟" ٹیلر صاحب کی بات سن کر امیر چونک پڑا۔

"میری تصویر بنوا کر آپ کیا کریں گے؟"

نوجوان اپنے کام میں مصروف تھا۔ اس کا ہاتھ بڑی تیزی سے کاغذ پر دوڑ رہا تھا: "تمھاری داستان پڑھنے کے بعد لوگوں کو تمھاری تصویر دیکھنے کی خواہش بھی پیدا ہوگی۔ اس لیے میں تمھاری تصویر بھی اس کتاب میں چھاپنا چاہتا ہوں۔"

"کیا بات کر رہے ہیں صاحب؟" امیر نے حیرت کا ایک جھٹکا محسوس کرتے ہوئے کہا: "ایسا کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟"

"جناب" نوجوان مصور نے اپنا ہاتھ روک کر امیر سے کہا "آپ ہلے جلے بغیر باتیں کرتے رہیں تاکہ میرا کام آسانی سے ہو جائے۔" اتنا کہہ کر وہ پنسل چلاتے ہوئے آگے بولا: "مجھے کل تک یہ تصویر مکمل کر کے صاحب کو دے دینی ہے۔"

اس نوجوان کی آواز میں امیر کو ایک عجیب سی مٹھاس محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے بات کرنے کے انداز سے یہی لگ رہا تھا کہ وہ کسی اچھے خاندان کا چشم و چراغ ہے۔ لیکن امیر نے اس سے کچھ پوچھنے کی بجائے ٹیلر صاحب کو سمجھانا شروع کر دیا: "نہیں جناب ہاتھ پاؤں میں بیڑیاں پڑی ہوئیں میری اس تصویر کو کوئی دیکھے یہ بات مجھے پسند نہیں ہے۔" یہ کہہ کر امیر نے اپنا منھ پھیر لیا۔ پھر اس سے پہلے کہ ٹیلر صاحب اسے سمجھاتے نوجوان مصور بول اٹھا: "نہیں جناب اس تصویر میں آپ کا صرف چہرہ ہی نظر آئے گا۔" اس کی آواز میں حد درجہ مٹھاس تھی: "تصویر بن جائے تو آپ اسے سب سے پہلے دیکھ لیں۔ اگر آپ کو پسند نہ آئے تو آپ خود اسے پھاڑ کر پھینک دیں۔"

نوجوان مصور کی اس دلیل نے امیر کو لاجواب کر دیا۔

کرنل ٹیلر نے اسے خاموش دیکھ کر کہا: "امیر علی تمھیں معلوم نہیں ہے۔ یہ نوجوان برکت علی ایک بہت اچھا فن کار ہے۔ اس کے ہاتھ سے اپنی تصویر بنوانے کے لیے بڑے بڑے افسروں کو گھنٹوں اس کے سامنے بیٹھنا پڑتا ہے۔"

"اچھا" امیر نوجوان مصور کی جانب تاکتے ہوئے بولا۔

"کیا نام بتایا آپ نے برکت علی؟ ہاں یہ نام میں نے کہیں سنا ہے۔" امیر گہری سوچ میں غرق ہو کر ہونٹوں ہی ہونٹوں میں اس نام کو دہرانے لگا۔ لیکن جب اسے کچھ یاد نہیں آیا تو وہ پھر سے اس نوجوان کو گھورنے لگا۔ نوجوان مصور کا ہاتھ اب تیزی سے اپنے کام میں مصروف تھا اور امیر کی نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نوجوان کی ناک پر جو سیاہ تل تھا اس پر سے اس کی نظریں ہٹ نہیں رہی تھیں۔ پھر اٹھائیس سال کا یہ نوجوان آہستہ آہستہ اس کے تصور میں چھوٹا ہوتا چلا گیا۔

"امیر اب میں جا رہا ہوں۔" کرنل ٹیلر اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا: "اب کل دوپہر کو میں آؤں گا اور وہ ملاقات ہماری آخری ملاقات ہوگی۔" لیکن امیر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس نے کرنل ٹیلر کی بات سنی ہی نہ ہو۔ کرنل ٹیلر اب نوجوان مصور کی جانب دیکھ کر کہہ رہا تھا: "برکت کل تم تصویر مکمل کر کے لے آنا۔" اچانک امیر کے دماغ میں ایک خیال تیزی سے دوڑ گیا پھر اسے یہ بھی معلوم نہیں ہوا کہ کرنل ٹیلر اور جبل مترجم کب وہاں سے اٹھ کر جا چکے ہیں۔

"بر... ک... ت" امیر نے ایک ایک لفظ کو الگ الگ کر کے دو تین بار من ہی من میں اس نام کو دہرایا پھر مسرت کی ایک لہر اس کے جسم کو کپکپا گئی۔

"کیا ہوا جناب؟" نوجوان مصور نے چونک کر پوچھا: "لگتا ہے بیٹھے بیٹھے آپ کو کچھ تکلیف محسوس ہو رہی ہے۔ اگر ایسی بات ہے تو میں تھوڑی دیر ٹھہر جاتا ہوں۔"

لیکن امیر تو ماضی کے گہرے کنوئیں میں چھلانگ لگا چکا تھا۔

اس نوجوان کی جگہ پر اسے چار پانچ سال کا ایک بچہ کھڑا ہوا دکھائی دے رہا تھا جس کا نام برکت تھا۔ وہی ناک نقشہ۔ وہی ہنستا مسکراتا چہرہ۔ وہی ناک۔ وہی نام اور وہی ناک پر سیاہ تل...

"کیا میرے سامنے افلاطون کا بیٹا کھڑا ہے؟" وہ دل ہی دل میں بولا۔

"لیجیے اب دیکھ لیجیے۔" نوجوان نے امیر کے سامنے اس کی تصویر بڑھاتے ہوئے کہا: "یہ آپ کی تصویر کے ادھورے نقش ہیں۔" لیکن امیر تو کاغذ پر بنی ہوئی تصویر کو دیکھنے کی بجائے اس کے چہرے کو ہی گھور رہا تھا۔ یہ بات اس نوجوان مصور کو کچھ عجیب سی لگ رہی تھی۔

"جناب! آپ مجھے اس طرح گھور گھور کر کیوں دیکھ رہے ہیں؟" امیر اس کی آواز سن کر چونکا۔ لیکن ماضی کے کنوئیں سے باہر آنے میں اسے کچھ دیر لگی۔ وہ جلدی جلدی پلکیں جھپکاتے ہوئے بولا: "تمھارا نام برکت ہے اور تمھارے والد کا نام..." امیر اچانک ہی رک گیا۔ اس نے جان بوجھ کر افلاطون کا نام اپنی زبان پر نہیں آنے دیا تھا۔

"میرے والد کا نام تو بہت ہی خوبصورت ہے۔" نوجوان برکت علی نے ہنس کر کہہ دیا: "ان کا نام ہے افلاطون۔"

نام سنتے ہی امیر کا پورا جسم تھرتھرا گیا۔ اسے لگا کہ محبت کا جذبہ اس کے دل کا کونا توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ سامنے بیٹھے ہوئے اپنے جگری دوست کے نوجوان بیٹے کو سینے سے لگانے کے لیے اس کا دل مچل اٹھا۔ کہاں ہے افلاطون؟ کہاں ہے میرا یار جو مجھ سے روٹھ گیا ہے؟ لیکن اس نے دوسرے ہی پل دل کی اس پکار کو دل کے اندر ہی دفن کر دیا۔

نہیں۔ نہیں اسے ایسی نادانی نہیں کرنی چاہیے۔ اس نوجوان کو یہ جان کر بہت دکھ ہوگا کہ اس کا باپ ایک قاتل ٹھگ کا دوست تھا۔ یہ صدمہ اس نوجوان کے لیے بے حد تکلیف دہ ثابت ہو سکتا تھا۔

"جناب آپ کو میرے والد کا نام پوچھنے کی کیا ضرورت پیش آگئی؟" برکت علی کے اس سوال نے امیر کو ماضی کے خیالوں سے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ اور اس نے ایک گہرا سانس لے کر جواب دیا: "برکت علی تمھارے نام نے مجھے ایک شک میں ڈال دیا تھا۔ میرے ایک جگری دوست کے بیٹے کا نام بھی برکت تھا ہم دونوں کی دوستی بچپن سے لے کر جوانی تک قائم رہی تھی۔ لیکن پھر ہمارے درمیان غلط فہمی کی ایک دیوار کھڑی ہو گئی اور آج سے بیس بائیس سال قبل ہم دونوں جدا ہو گئے۔ اس کے بعد سے آج تک ہماری ملاقات نہیں ہوئی ہے۔" اتنا کہہ کر امیر نے دوسری بار گہرا سانس لیا۔ پھر دھیمی آواز میں آگے بولا: "لیکن میرے اس دوست کا نام افلاطون نہیں تھا بلکہ اس کا نام افضل تھا۔" امیر کی درد بھری آواز نے نوجوان برکت علی کے نرم دل کو جھنجھوڑ دیا اور وہ انتہائی دردمندانہ لہجے میں بولا: "جناب آپ کے کرب کو میں محسوس کر سکتا ہوں۔ قید خانے کی اس اندھیری دنیا میں آدمی کو قریبی دوست یا عزیز کی یاد ستاتی ہی رہتی ہے۔"

برکت علی کی ہمدردی نے امیر کو تھوڑی راحت بخشی۔ افلاطون کا بیٹا ایک رحم دل اور نیک نوجوان ہے۔ یہ جان کر امیر کے دل کو بڑی تسلی ہوئی اور وہ سوچنے لگا کہ یہ بہت ہی اچھا ہوا کہ افلاطون اس سے ناراض ہو کر اس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو گیا تھا۔ نہیں تو آج اس کا یہ بیٹا ایک بہترین مصور کی بجائے ایک خطرناک ٹھگ بن چکا ہوتا۔

پھر اس سے پہلے کہ امیر اپنے خیالوں میں گہرائی تک اتر جاتا برکت علی نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی: "جناب آپ نے تو ابھی تک اس ادھوری تصویر پر نظر تک نہیں ڈالی اگر اس میں کوئی خامی رہ گئی ہو تو مجھے ضرور بتائیں۔ رات کو گھر جا کر مجھے اسے مکمل کرنا ہے۔"

امیر نے کانپتے ہاتھ سے تصویر کے اس کاغذ کو اٹھا لیا۔ اور پنسل کی باریک لکیروں میں گھرے ہوئے اپنے چہرے کی جھریاں دیکھتا رہا اور برکت علی اس کے چہرے پر ابھرتے ہوئے تاثرات کا باریک بینی سے جائزہ لے رہا تھا۔

اتنی تھوڑی سی دیر میں تو تم نے اس کاغذ پر ہو بہو میرا چہرہ بنا دیا ہے۔" امیر اس کی تعریف کرنے کے بعد دھیرے سے مسکرایا پھر بولا۔ "لیکن میرے اس بوڑھے چہرے کو دیکھ کر کوئی یقین نہیں کرے گا کہ یہ ایک سفاک ٹھگ کی تصویر ہے۔ اس چہرے میں میری اصلیت کہاں ہے؟"

برکت کو اس کی بات سچی لگی۔ کرنل ٹیلر نے اس سے ایک بدنام ترین ٹھگ کی تصویر بنانے کے لیے کہا تھا۔ اس وقت اس کے تصور میں ایک بدصورت۔ خطرناک اور مکار شخص کا چہرہ ابھر آیا تھا۔ لیکن امیر جیسے بزرگ شخص کو سامنے دیکھ کر اس کے تصور کا شیشہ ٹوٹ گیا تھا۔ اور یہ بات اب اس کی زبان پر بھی آگئی۔

"جناب سچ پوچھیے تو آپ ٹھگ جیسے لگتے ہی نہیں ہیں۔ اور پھر ایک مصور تو محسوس کرتا ہے وہی کاغذ پر لکھ دیتا ہے۔ اسے

اگر آپ خامی سمجھیں تو خامی ہے اور خوبی سمجھیں تو خوبی ہے۔"

"اور ٹھگ کی خوبی یہی ہوتی ہے بیٹا کہ وہ ہوشیار سے ہوشیار نظر رکھنے والے کو بھی کسی طرح سے ٹھگ نظر نہ آئے۔"

امیر کے منھ سے نکلا ہوا لفظ "بیٹا" اور اُس کی مٹھاس نے برکت کے جذبات میں ایک طوفان سا برپا کر دیا تھا لیکن اُس نے اِس کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ ٹھیک اُسی وقت جیل کا گھنٹہ بج اٹھا اور سنتری امیر کو واپس لے جانے کے لیے کمرے میں داخل ہو گیا۔ برکت کو نظر بھر کر دیکھ لینے کے لیے امیر تھوڑی دیر تک رُکا رہا۔ اُس کا جی چاہ رہا تھا کہ جُدا ہونے سے قبل وہ برکت سے افلاطون کی خیر خیریت پوچھ لے۔ لیکن اس کی زبان نے اس کے دل کا ساتھ نہیں دیا۔ نہ پوچھنے کی ایک وجہ اور بھی تھی اور وہ یہ کہ شائد افلاطون حیات ہی نہ ہو تو؟ اس کی موت کا غم وہ اِس نوجوان سے پوشیدہ نہیں رکھ سکے گا۔ نہیں۔۔ نہیں برکت پر تو کسی قیمت پر یہ بات ظاہر نہیں ہونی چاہیئے کہ اُس کا باپ مجھ جیسے خطرناک ٹھگ کا دوست تھا۔ لیکن پھر بھی جاتے جاتے وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکا: "برکت کل تصویر دینے تم یہیں آؤ گے نا؟"

"ہاں" برکت علی نے مُسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "ٹیلر صاحب کے ساتھ ساتھ مجھے آپ سے بھی تو اجازت لینی چاہیئے نا۔"

امیر بیڑیوں کی کھنک کے ساتھ جیل کی جانب چل پڑا تو اُس کے اندر ایک کشمکش سی جاری تھی کہ کاش ایک بار افلاطون سے ملاقات ہو جاتی تو کتنا اچھا ہوتا؟ وہ اپنی بیٹی کی خبر اُس کی معرفت منگوا سکتا ہے اور اندر فون نو اُس کا خیال رکھنے کی تاکید بھی کر سکتا ہے۔ اگر ایسا ہو جائے تو زندگی کی کوئی خواہش باقی نہیں رہ جاتی اور موت کو گلے لگانے میں بھی کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوگی۔

●

کرنل میڈاس ٹیلر سے اپنی آخری ملاقات کے لیے امیر صبح ہی سے بہت زیادہ بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ یہ ایک ایسی عجیب سی بے چینی تھی جو اُس نے پچھلے چھ مہینے میں اِس سے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ اُس کی زندگی کی داستان اب پوری ہو چکی تھی۔ ٹیلر صاحب کو سنانے کے لیے اب اُس کے پاس کوئی نئی بات باقی نہیں تھی لیکن پھر بھی اِس بے چینی کی وجہ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

قدرت نے اُسے اپنے جگری دوست افلاطون کے بیٹے برکت سے ملنے کا ایک سنہرا موقعہ عطا کیا تھا۔ لیکن وہ اسے اپنے سینے سے نہیں لگا سکا تھا اور نہ ہی وہ افلاطون کی خیر خیریت ہی اُس سے پوچھ سکا تھا۔ یہ ایک عجیب سی مجبوری تھی کہ دل میں بھرا ہوا درد آنکھوں سے نکل بھی نہیں پا رہا تھا۔ اس وقت وہ اندر ہی اندر ایک عجیب سی کیفیت سے دوچار تھا۔ لیکن اِس کے باوجود وہ ایک بار پھر اُس سے ملنے کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔ دل ہی دل میں وہ یہ فیصلہ بھی کرتا جا رہا تھا کہ جو راز اُس کے سینے میں دفن ہے اُس راز سے وہ پردہ نہیں ہٹائے گا۔ مگر پھر بھی برکت سے ملنے کی بے چینی بڑھتی ہی جا رہی تھی اور یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ پچھلے بائیس گھنٹوں میں اُس نے تقریباً چالیس بار اپنے دل کو سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ افلاطون کا بیٹا بے حد سمجھدار ہے۔ وہ ایک ٹھگ کی تصویر بنا نے آیا تھا لیکن اُس نے اُس سے ذرا بھی نفرت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اُس نے بڑی عزت اور احترام سے اُس سے بات کی تھی۔ اور کسی لمحے بھی اُس نے اپنی گفتگو سے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ اُس کے سامنے ایک ٹھگ بیٹھا ہوا ہے۔ ایسی حالت میں اگر وہ برکت سے یہ کہہ دیتا کہ تمھارا باپ میرا جگری دوست تھا تو یہ صدمہ شائد وہ برداشت نہیں کر سکے گا۔ لیکن شائد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کی یہ بات سن کر وہ خوش ہو جائے اور اس کے سینے سے لگ کر یہ کہہ بیٹھے کہ امیر چچا یہ بات آپ نے کل مجھے کیوں نہیں بتائی تھی۔ میں ابھی جا کر ابا جان سے کہتا ہوں وہ آپ سے ملنے کے لیے فوراً ہی دوڑے آئیں گے۔

لیکن اگر افلاطون اب اِس دنیا میں موجود نہ ہوا تو؟ یہی ایک سوال ایسا تھا جو اُسے یہ بات کہنے سے روک رہا تھا اور وہ یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ اسے برکت کو یہ بتانا چاہیئے تھا یا نہیں کہ وہ اس کے باپ کا جگری دوست امیر علی ہے؟ ایک عجیب سی کشمکش تھی۔ وہ کبھی کبھی سوچتے سوچتے بڑبڑانے لگتا تھا "نہیں امیر علی اس بارہ سالہ قید کی زندگانی نے تم سے دنیا کی محبت چھین لی ہے۔ اب تم دوبارہ کیوں اس مایا جال میں پھنسنا چاہتے ہو؟ کس لیے اپنی بدنامی کے داغ کو دوسروں کی پیشانی پر لگانا چاہتے ہو؟ اپنی بیٹی اور اپنے دوست کی طرف سے اپنا دل اپنا دھیان اپنی محبت اور اپنی چاہت سب ہی واپس کھینچ لو۔ ان کے بارے میں انجان رہ کر ہی شائد تم آسانی اور اطمینان سے مر سکو گے۔ لیکن اگر ان کے بارے میں تم کچھ جان گئے تو تمھارا دل اُنھیں کی طرف لگا رہے گا۔ بے وقوف تمھارے دل کے دروازے پر جوتا لے لگ چکے ہیں انھیں اب دوبارہ کھولنے کی کوشش مت کرو۔"

ابھی وہ یہ سب باتیں سوچ ہی رہا تھا کہ سنتری نے آ کر اُس کی کوٹھڑی کا تالا کھول دیا اور بولا "ٹیلر صاحب آج جلدی آ گئے ہیں۔ لگتا ہے انھیں یہاں سے جانے کی بہت خوشی ہے۔"

کوٹھڑی سے باہر نکلنے سے پہلے امیر نے اپنے چہرے کا پسینا پونچھ لیا پھر اس کا جی چاہا کہ وہ سنتری سے پوچھ لے کہ وہ نوجوان مصور بھی آ گیا ہے یا نہیں؟ لیکن یہ سوال اس کے ہونٹوں پر سے ہی واپس آ گیا۔ پھر اُس نے کچہری کے کمرے میں آ کر دیکھا تو کرنل میڈاس ٹیلر وہاں تنہا ہی بیٹھا ہوا تھا۔ انھوں نے شائد آج مترجم کو نہیں بلایا تھا لیکن اس کا خیال تھا کہ برکت تو ضرور ہی آئے گا۔

"امیر علی" ٹیلر صاحب نے سگار سُلگاتے ہوئے کہا: "میں آج تمھارے لیے ایک خوش خبری لے کر آیا ہوں۔ بیٹھ جاؤ تم۔"

فرش پر بچھی ہوئی دری پر بیٹھتے وقت امیر کی آنکھوں میں ایک چمک سی لہرا گئی: "خوش خبری؟"

"ہاں۔ خوش خبری" سگار کا ایک کش لگا کر ٹیلر صاحب نے اپنی جیب سے ایک کاغذ نکالا اور بولا: "آؤ اب دیکھتے ہیں یہ کس کا خط ہے؟"

"خط؟" امیر اُلجھی اُلجھی نظروں سے ٹیلر کے ہاتھ میں دبے ہوئے لفافے کو دیکھتا رہا۔ ٹیلر صاحب کے سگار سے نکلتے ہوئے دھوئیں کو دیکھ کر اس کے دماغ میں ایک جھماکا سا ہوا کہ کہیں گورنر صاحب نے اُس کی رہائی کا حکم تو نہیں دیا ہے؟ اس رہائی کے سوا صاحب کے پاس اس کے لیے کوئی اور خوش خبری تو ہو ہی نہیں سکتی۔

"یہ تمھارے ولیم سلومن صاحب کا خط ہے۔" کرنل میڈاس ٹیلر نے لفافے میں سے خط نکالتے ہوئے کہا۔

"اوہ" امیر نے ایک گہرا سانس لیا۔ رہائی کی جو امید دل میں جاگی تھی وہ دوسرے ہی لمحے دم توڑ چکی تھی۔ وہ من ہی من میں اپنے آپ کو کوسنے لگا کہ بار بار موت بھی مانگتے ہو اور بار بار زندگی کی طرف مُڑ کر دیکھنے کی بھی کوشش کرتے ہو۔ لیکن پھر بھی اس کے دل میں اس خوش خبری کو سننے کا تجسس تو پیدا ہو ہی گیا تھا۔

"کیا لکھتے ہیں سلومن صاحب؟" اُس نے کرنل میڈاس سے پوچھا۔

"سنو" کرنل میڈاس نے کاغذ پر نظریں جماتے ہوئے کہا "چند روز قبل میں نے ولیم سلومن صاحب کو ایک پیغام بھیجا تھا اس میں میں نے لکھا تھا کہ امیر علی کی داستانِ حیات میں تقریباً

مکمل کر چکا ہوں۔ آخر میں میں نے تمھارے بارے میں بھی چند الفاظ تحریر کیے تھے۔ یعنی ان چھ مہینوں میں جو کچھ میں نے تم کو قریب سے دیکھ کر محسوس کیا تھا وہ ساری باتیں میں نے انھیں لکھ دی تھیں۔"

"مجھے دیکھ کر آپ نے کیا محسوس کیا ہے صاحب؟"

"امیر علی! میں سچی بات چھپانے کا قائل نہیں ہوں۔" ٹیلر صاحب نے بجھتے ہوئے سگار کے دو چار کش لگا لیے اور ہوا میں دھواں اڑاتے ہوئے کہا: "ولیم سلومن صاحب سے تم نے بار بار اپنے لیے پھانسی کا مطالبہ کیا تھا لیکن اس سزا سے تمھیں جب معافی مل گئی تو تمھیں اس کا بہت دکھ ہوا تھا۔ یہ بات تم نے کئی بار میرے سامنے بھی دہرائی ہے کہ تمھیں زندہ رہنے کی اب کوئی تمنا نہیں ہے لیکن پھر بھی۔۔۔"

"پھر بھی کیا؟" امیر علی نے چونک کر پوچھا۔

"میرا خیال ہے تم اندر ہی اندر زندہ رہنے کی خواہش رکھتے ہو۔ کیونکہ کوئی بھی موت کی تمنا کرنے والا شخص زندہ رہنے کی خواہش کو ٹال نہیں سکتا۔ اگر تم ہنستے مُسکراتے بھی پھانسی کے تختے پر چڑھ گئے ہوتے تو بھی زندہ رہنے کی خواہش کو چھوڑ نہیں سکتے تھے۔"

امیر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا: "تو کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ گنیش کو گرفتار کرانے اور ولیم سلومن صاحب کی مدد کرنے کے پیچھے میرا یہ مقصد پوشیدہ تھا کہ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں؟ میری یہ خواہش کہ میں مرنا چاہتا ہوں آپ کو جھوٹ اور بناوٹی بات نظر آتی ہے؟"

"نہیں امیر علی! یہ بات نہیں ہے۔ میں جس طرح تمھیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں تم اُس طرح میری بات سمجھنے کی

کوشش کرو۔" کرنل ٹیلر نے پرسکون لہجے میں کہا: "اصل میں تو تمھیں خود اپنے آپ کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ آدمی کے دل میں بعض اوقات ایک ساتھ دو تمنائیں انگڑائیاں لینے لگتی ہیں ایک تمنا کے نیچے دوسری تمنا دبی ہوتی ہے۔ موت کی خواہش کے پیچھے زندہ رہنے کی تمنا بھی ہنستی مسکراتی دکھائی دیتی ہے۔"

امیر چونک کر خاموش ہوگیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ شائد ٹیلر صاحب سچ ہی کہہ رہے ہیں۔ کیونکہ ابھی تھوڑی دیر قبل ہی اُس کے دل میں جیل سے رہا ہونے کی خواہش نے سر اُٹھایا تھا اور افلاطون سے ملنے کی تمنا زور کرنے لگی تھی بیٹی کے خیال نے بھی کبھی اُس کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ تو کیا اِن سب کے پیچھے زندہ رہنے کی خواہش ہی کارفرما ہے؟

"اب سنو میرے اُس خط کے جواب میں ولیم سلومن صاحب کیا لکھتے ہیں؟" یہ کہہ کر کرنل میڈاس ٹیلر نے ولیم سلومن کا خط پڑھنا شروع کیا: "امیر علی کے بارے میں آپ نے جو کچھ مجھے لکھا ہے اُس کے کچھ حصّے سے میں قطعی طور پر متفق ہوں۔ جب اُس نے اپنے لیے مجھ سے سزائے موت مانگی تھی تو اُس وقت میں نے اُس کے اندر ایک عجیب سا جوش محسوس کیا تھا لیکن اِس کے باوجود اُس کے پچھتاوے میں کبھی مجھے اداکاری یا بناوٹ کی جھلک نظر نہیں آئی۔ اُس کا یہ پچھتاوا اسنکڑوں انسانوں کی جان لینے کا پچھتاوا نہیں تھا۔ بلکہ اُس نے انجانے میں اپنی بہن کو ہلاک کر دیا تھا۔ اِس بات کا غم اُسے ہر وقت ڈسنے لگا تھا۔ اُسے زندہ رکھ کر میں یہی بات اُسے سمجھانا چاہتا تھا کہ وہ ٹھگ کو بھول کر ایک انسان بن جائے۔ بس یہی ایک خواہش میرے دل میں تھی۔" کرنل ٹیلر خط پڑھتے پڑھتے رُک گیا تو امیر نے اُس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا: "اور کیا لکھا ہے ولیم صاحب نے؟"

"آخر میں انھوں نے لکھا ہے کہ امیر علی سے کہنا کہ جس طرح اُس نے دس بارہ سال جیل میں گذار کر جیل کے تمام لوگوں پر اپنا گہرا اثر چھوڑا ہے اُسی طرح وہ اگر چار یا پانچ سال اور گذار دے تو اُسے ایک بار پھر نئی زندگی شروع کرنے کا موقع مل جائے گا۔ اور میری خواہش ہے کہ اس کی یہ نئی زندگی ایک اچھے انسان کی زندگی ثابت ہو۔"

خط پڑھنے کے بعد ٹیلر صاحب نے امیر پر اِس طرح نظر ڈالی جیسے وہ جاننا چاہتا ہو کہ امیر پر اِس خط کا کیا اثر ہوا ہے؟

لیکن نہیں۔ ٹیلر صاحب کو محسوس ہوا کہ امیر کو کوئی خواہش نہیں ہوئی ہے۔ اُس کے چہرے کی لکیریں گہری ضرور ہوگئی تھیں لیکن اُس کا چہرہ ہر قسم کے تاثرات سے عاری دکھائی دے رہا تھا۔ پھر چند لمحوں کے بعد اس نے بولنے کے لیے اپنے ہونٹ کھولے "صاحب مجھے اب اپنی نئی زندگی کی کوئی اُمید ہی نہیں ہے۔ ولیم سلومن صاحب نے تو پانچ سات برسوں کی بات کی ہے جبکہ میں تو پانچ چھ مہینے تک بھی ٹھہرنا نہیں چاہتا۔"

پھر اس نے ٹیلر صاحب کو لفافے میں خط واپس ڈالتے دیکھ کر پوچھ لیا: "کیا اِسی کو آپ میرے لیے خوش خبری کہہ رہے تھے۔"

"ہاں امیر علی۔" کرنل میڈاس ٹیلر نے بجھے ہوئے سگار کو دوبارہ سُلگاتے ہوئے جواب دیا: "انھوں نے جو دوسری بات لکھی ہے اُسے سُن کر تو شائد تم واقعی خوش نہیں ہوگے۔"

"اب مجھے خوش ہونے اور نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا صاحب۔" امیر نے فوراً کہہ دیا۔ "اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو سُنا دیں۔"

ٹیلر کو اِس کے لیے خط دوبارہ پڑھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اِسی لیے انھوں نے گمبھیر لہجے میں کہنا شروع کیا: "اس ملک کی دھرتی پر سے اب ٹھگوں کا تقریباً خاتمہ ہوتا جا رہا ہے۔ اُن کا وجود مٹایا جا رہا ہے۔ ولیم سلومن صاحب نے اپنی حکمتِ عملی سے چنبل کے ڈاکوؤں اور لٹیروں پر بھی پوری طرح قابو پالیا ہے اور اس کے صلے میں کمپنی ولیم صاحب کو نئی نئی ذمّے داریاں سونپتی جا رہی ہے جن سے گھبرا کر وہ چاہتے ہیں کہ اپنے وطن واپس لوٹ جائیں۔ لیکن اِس کے باوجود وہ اپنے خط میں لکھتے ہیں کہ اس ملک کے لوگوں کی بہتری اور بھلائی کے لیے جو کچھ بھی مجھ سے ہوسکے گا وہ ضرور کروں گا۔ کیونکہ مجھے یہاں کی رعایا سے بے پناہ محبت اور ہمدردی ہے۔"

"خدا انھیں ہر قدم پر کامیابی عطا کرے۔" امیر نے دھیمے لہجے میں اپنی نیک خواہشوں کا اظہار کیا اور کہا "صاحب میری طرف سے آپ اُنھیں یہ ضرور لکھ دیجیے گا کہ امیر آپ کے لیے ہمیشہ خدا سے دعا کرتا رہے گا۔ پروردگار نے چاہا تو اُن کے ہر عزائم پورے ہوں گے۔" اتنا کہہ کر وہ تھوڑی دیر کے لیے چُپ ہو کر کھو سا گیا۔ اِس وقت کرنل میڈاس ٹیلر

کو اس کا چہرہ بہت ہی پاک اور سندگی میں ڈوبا ہوا نظر آرہا تھا۔ تھوڑی دیر تک دونوں کو اس کی خبر بھی نہ ہوسکی کہ نوجوان مصوّر نہ جانے کب سے دروازے پر کھڑا اُن دونوں کی باتیں سُن رہا ہے۔

"چاچا لیجیے میں اپنے وعدے کے مطابق حاضر ہوگیا ہوں۔" کسی کی اِس میٹھی آواز نے امیر علی کو چونکا دیا اور اس نے گردن گھما کر دروازے کی طرف دیکھا۔ نوجوان مصوّر بڑی دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا اُس کی جانب بڑھا چلا آرہا تھا۔ یہ دیکھ کر امیر نے اپنے اندر ایک عجیب سی بے قراری محسوس کی اور اس کا جی چاہنے لگا کہ وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر برکت کو اپنے سینے میں دبوچ لے۔ اُس نے ابھی ابھی برکت کی زبان سے چاچا کا لفظ سُنا تھا۔ لیکن اب یہ اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا واقعی اسے برکت نے چاچا کہہ کر مخاطب کیا تھا یا یہ محض اس کا وہم تھا؟

نزدیک آنے کے بعد تھوڑی دیر تک برکت اُس کی طرف مُسکرا مُسکرا کر دیکھتا رہا۔ اُس کی اِس مُسکراہٹ میں امیر کو محبت اور ہمدردی کا ایک سمندر موجزن دکھائی دے رہا تھا اور اُس کی آنکھوں میں خوشیوں کی موجیں ٹھاٹھیں مارتی نظر آرہی تھیں۔ امیر اُس کی طرف دیکھ کر سوچ رہا تھا کیا یہ بھی اُس کا وہم ہوسکتا ہے؟

"برکت علی۔" یکایک کرنل میڈاس ٹیلر کی آواز نے اِن دونوں کو چونکا دیا: "اسکیچ مکمل ہوگیا؟"

اس آواز کو سنتے ہی برکت کو خیال آیا کہ اس نے ابھی تک کرنل صاحب کو سلام تک نہیں کیا ہے۔ اِس خیال کے آتے ہی اُس نے ذرا شرماتے ہوئے امیر علی کا اسکیچ اُس کے حوالے کر دیا۔

"بیٹھ جاؤ۔" کہہ کر ٹیلر نے اسکیچ پر ایک نظر ڈالی۔ لیکن اسکیچ پر نظر پڑتے ہی ان کی پلکیں تھرتھرانے لگیں اور ہاتھ اِس طرح کانپنے لگا جیسے اسکیچ کو چھوتے ہی اُسے کرنٹ کا جھٹکا لگا ہو۔ برکت اُس کی یہ حالت دیکھ کر مُسکرایا اور امیر تو برکت کا چہرہ ہی دیکھنے میں مشغول تھا۔

"نہیں نہیں۔" اچانک ٹیلر نے انکار میں گردن ہلاتے ہوئے کہا: "برکت علی مجھے ایسی کوئی بناوٹ نہیں چاہیے۔ میں نے تمھیں سامنے بیٹھے ہوئے امیر علی کی تصویر بنانے کے لیے کہا

نئے افق کا مقبول سلسلہ

سرفروش

نامور مصنف اظہر کلیم

کے ایڈونچرس قلم سے

دو حصوں میں مکمل سیٹ =/100

مکتبہ القریش سرکلر روڈ اردو بازار لاہور

فون 7668958

تھا۔ میں حقیقت پر یقین رکھتا ہوں۔ لیکن اس کی بجائے تم یہ بناوٹی تصویر کیوں بنا کر لائے ہو؟"

تب نوجوان برکت علی نے کرنل ٹیلر کے ہاتھ میں ایک دوسرا اسکیچ تھما دیا اور بولا: "شائد آپ کو یہ اسکیچ حقیقت سے قریب تر محسوس ہوگا۔"

"اوہ تو یہ بات ہے؛ تو تم ایک کی بجائے دو اسکیچ بنا کر لائے ہو۔" اُس کی داد دیتے ہوئے کرنل ٹیلر نے کہا۔ اور پھر اسکیچ نظر ڈالنے کے بعد اس نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے امیر کے چہرے کو بھی غور سے دیکھنا شروع کر دیا۔ دھیرے دھیرے کرنل صاحب کے ہونٹوں پر ایک مُسکراہٹ اُبھرتی دکھائی دینے لگی۔ "دیٹس کریکٹ پرفیکٹلی آل رائٹ۔" خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اُس نے وہ اسکیچ امیر کی طرف بڑھا دیا: "لو دیکھ لو اس تصویر میں تم بالکل ہو بہو نظر آرہے ہو۔"

امیر نے برکت پر سے نظر ہٹا کر اپنے اسکیچ کی طرف توجہ دی اور بڑی باریکی سے اپنی تصویر کو دیکھنے لگا۔ لیکن ساتھ ساتھ وہ برکت کو بھی دیکھ لیا کرتا تھا۔ اُس کے خیال میں نوجوان برکت نے ایک قابلِ تعریف کام کیا تھا مگر وہ شاباشی دینے کی بجائے ایک گہرا سانس لے کر کرنل سے بولا: "جناب! اِس تصویر کو دیکھ کر تو لوگوں کو امیر علی پر رحم آنے لگے گا۔ یہ تصویر ہو بہو امیر علی کی تصویر ہے۔ لیکن اس میں امیر علی کی

اصلیت کہاں ہے؟"

"چا چا" برکت علی نے پھر اُسے چا چا کہہ کر چونکا دیا: "اپنی اصلیت شائد آپ کو اس دوسری تصویر میں نظر آئے گی۔"

اتنا کہہ کر برکت علی نے عاجزانہ لہجے میں کہا: "صاحب ذرا یہ اسکیچ بھی انھیں دیکھ لینے دیں۔"

کرنل میڈاس ٹیلر نے برکت علی کی بات سن کر اپنے ناپسندیدہ اسکیچ کو بڑی بے دلی سے امیر کی جانب بڑھا دیا۔ اُس کا خیال تھا کہ امیر علی بھی اپنے اس اسکیچ کی بنائی تصویر کو دیکھ کر ہنس پڑے گا۔ لیکن اس کا یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ اس نے دیکھا کہ اسکیچ پر نظر پڑتے ہی امیر کے چہرے کے خدوخال اچانک ہی تبدیل ہونے لگے تھے۔ امیر ایک ٹک اپنی تصویر کو دیکھ رہا تھا اور اس کی پیشانی پر لکیریں بکھرتی جا رہی تھیں۔ ہونٹ دھیرے

دھیرے کانپنے لگے تھے۔ مگر اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک لہراتی نظر آرہی تھی۔ پھر یکایک اس کے منہ سے نکلا۔ "سبحان اللہ" پھر اچانک ہی وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ کر بولا: "وہی ناک وہی نقشہ وہی کاجل میں لپٹی ہوئی آنکھیں وہی مسکراتے ہوئے پتلے پتلے ہونٹ۔ سر پر مہارت سے بندھا ہوا ویسا ہی صافہ شرافت کے نقاب کے پیچھے چھپا ہوا وہی شیطان امیر علی ٹھگ۔ واہ.. واہ..." بولتے بولتے اچانک امیر اپنی جگہ سے اُٹھ کر کھڑا ہوگیا اور اپنے ہاتھ پاؤں میں پڑی ہوئی بیڑیوں کو زور زور سے ہلاتے ہوئے بولا: "ٹیلر صاحب یہی اصلی تصویر ہے اور یہی ہے اصلی امیر علی ٹھگ۔"

کرنل میڈاس ٹیلر اُس کی یہ بات سن کر کچھ گھبرا سا گیا لیکن نوجوان برکت علی امیر کی جانب دیکھتا ہوا دھیرے دھیرے مسکرا رہا تھا۔ وہ اس طرح خاموش بیٹھا امیر علی کو تک رہا تھا جیسے اس کے چہرے پر وہ کوئی خاص بات ڈھونڈ رہا ہو۔ یکایک امیر کا دھیان اُس کی طرف ہوا۔ پھر اُس کی آنکھیں اس طرح چمکنے لگیں جیسے اچانک ہی اُسے کوئی بات یاد آگئی ہو۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے اپنا اسکیچ برکت علی کی طرف بڑھاتے ہوئے لرزتی ہوئی آواز میں کہا: "بر.. کت.. مجھے سچ سچ بتا دو یہ تصویر کس نے بنائی ہے؟ جب میں اس عمر کا تھا تو اُس وقت تم پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ اس تصویر کو بنانے میں ضرور تم نے کوئی چالاکی دکھائی ہے۔"

"ہاں چاچا۔" برکت علی کی آواز میں اب بھی وہی سکون تھا "تصویر تو میں نے ہی بنائی ہے لیکن اس کا تصور کسی اور کا ہے۔"

"تصور کسی اور کا ہے؟" کرنل ٹیلر اور امیر دونوں ایک ساتھ چونک پڑے۔

"ہاں چاچا آپ راز پر سے پردہ ہٹانا نہیں چاہتے تھے کہ میں آپ کے جگری دوست کا بیٹا ہوں۔ آپ یہ بات جان گئے تھے لیکن اس کے باوجود آپ نے اس کا اظہار نہیں کیا۔" برکت کی آواز اب بہت جذباتی ہوتی جا رہی تھی۔ "مگر آپ نے مجھے غلط سمجھا۔ اپنے والد کو میں بہت چاہتا ہوں اور میرے والد صاحب اب بھی آپ کی دوستی پر فخر کرتے ہیں۔"

امیر کا سر ایک جھٹکے سے جھک گیا۔ اُس میں اب بھی شائد یہ ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ وہ برکت کو اپنے سینے سے لگا لے اُس نے اپنے دونوں ہاتھ پیٹھ کے پیچھے رکھ لیے۔ لیکن کرنل میڈاس ٹیلر کی آنکھوں میں تو حیرت کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا اور وہ تعجب بھری نظروں سے باری باری اُن دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"صاحب میں گھر جا کر جب اِن کی تصویر بنانے لگا تھا تو اچانک میرے والد کی نظر اس تصویر پر پڑ گئی۔ تب میں نے انھیں بتایا کہ مجھے آج ایک بہت ہی عجیب شخص کی تصویر بنانی ہے۔ پھر میری زبان سے امیر علی کا نام سنتے ہی ان کے رونگٹے کھڑے ہوگئے اور کسی ہچکچاہٹ کے بغیر انھوں نے اپنے بچپن کی دوستی کی کہانی مجھے سنا دی۔ پھر ساری رات میرے پاس بیٹھ کر انھوں نے امیر علی چاچا کی جوانی کی یہ تصویر مجھ سے بنوائی ہے۔"

"دس از ویری ٹیری فیک۔" ٹیلر ہونٹوں ہی ہونٹوں میں بڑبڑایا: "آئی کانٹ بلیف اٹ۔"

"صاحب! میری آپ سے ایک گذارش ہے۔" برکت علی نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر کرنل میڈاس ٹیلر سے عاجزانہ لہجے میں کہا: "امیر علی چاچا کی اصلی تصویر جن کے بغیر بن نہیں سکتی تھی، ان کو آپ ایک بار امیر علی چاچا سے ملنے کی اجازت دے دیں۔" بولتے بولتے نوجوان برکت علی کی آواز بھرّا گئی۔ اور وہ رُک رُک کر آگے بولا: "جناب میں اپنے والد کو ساتھ لے کر آیا ہوں۔" یہ سُننا تھا کہ امیر کے ہاتھوں میں پڑی ہوئی فولادی بیڑیاں ایک جھٹکے کے ساتھ جھنجھنا اٹھیں۔ "کیا افلاطون آیا ہے؟ یہاں.. وہ مجھ سے ملنے آیا ہے؟" امیر اپنی مسرت پر اب قابو نہیں رکھ سکا اور گڑگڑاتے ہوئے کرنل میڈاس ٹیلر سے بولا: "جناب میں آپ کے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ آپ کے پیروں پر اپنا سر رکھ رہا ہوں۔ بس ایک بار صرف ایک ہی بار..." بولتے بولتے امیر سچ مچ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور پھر ٹیلر صاحب کے قدموں پر جھک گیا۔ پھر اس کی تھرتھراتی ہوئی آواز میڈاس ٹیلر کی سماعت سے ٹکرائی: "صاحب! میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔"

لیکن امیر کو معلوم نہیں تھا کہ ٹیلر کے اشارے سے نوجوان برکت تو کب کا اس کمرے سے نکل کر باہر جا چکا تھا۔

"امیر۔" گھٹنوں کے بل جھکے ہوئے امیر کی پیٹھ سے کسی کی ہانپتی ہوئی آواز ٹکرائی: "کہاں ہے امیر علی۔ میرا دوست کہاں ہے؟" اس آواز کے سنتے ہی امیر ایک جھٹکے سے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ افلاطون کی آواز کو پہچان چکا تھا لیکن اُٹھ کر

کھڑے ہونے سے پیشتر اُس نے بڑی ہوشیاری سے اپنی بھیگی ہوئی آنکھوں کو اپنی آستین سے پونچھ لیا۔ پھر گردن گھمانے سے قبل اس نے اپنے ہونٹوں پر خوشی کی ایک بھرپور مسکراہٹ لانے کی کوشش کی۔ وہ شائد نہیں چاہتا تھا کہ برسوں کے بعد اُس سے ملنے کے لیے آنے والا اُس کا جگری دوست اُس کا روتا ہوا چہرہ دیکھ لے۔ لیکن اُسے اِس بات کا احساس ہی نہیں رہا کہ چہرے پر بکھری ہوئی بڑھاپے کی لکیروں کو مٹانا ممکن نہیں ہے۔ اس نے افلاطون کو دیکھنے کے لیے جیسے ہی اٹھ کر اپنی گردن گھمائی کہ اُس کی طرف ہاتھ پھیلا کر بڑھتے ہوئے افلاطون کے قدم اچانک ہی زمین سے چپک کر رہ گئے۔ افلاطون بڑی حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں اِس طرح پھٹی ہوئی تھیں جیسے کوئی بہت بڑا صدمہ اُسے لگا ہو۔ شائد اُسے یہ یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ جو شخص اس وقت اس کے سامنے کھڑا ہے وہی اس کا جگری دوست امیر علی ہے؟ سفید دودھ جیسے بال، پھیکا چہرہ، حلقوں کے اندر اتری ہوئی چھوٹی چھوٹی اداس آنکھیں، پچکے ہوئے گال اور کمزور و ناتواں جسم.. نہیں نہیں۔ یہ شخص ہرگز ہرگز امیر علی نہیں ہو سکتا؟ اُس کے اندر ایک عجیب سی کشمکش جاری تھی۔

امیر نے جب اُسے گلے سے لگانے کے لیے اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے تو افلاطون اپنے خیالوں سے چونک پڑا اور اُسے یاد آیا کہ اپنے جس جگری دوست سے ملنے کے لیے وہ تقریباً ایک گھنٹے سے باہر کھڑا تھا وہ دوست اب اُس سے صرف دو ہی قدم کے فاصلے پر کھڑا ہے۔

"میرے دوست! یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے؟" لفظوں کی تھرتھراہٹ کے ساتھ افلاطون امیر سے لپٹ گیا اور امیر اسے دونوں بانہوں میں جکڑ کر اتنے زور سے بھینچنے لگا جیسے برسوں کی جدائی کا بدلہ لے رہا ہو۔ "میرے دوست! مجھے چھوڑ کر جاتے وقت تم نے میرا کوئی خیال بھی نہیں کیا تھا۔" امیر کے اِس طنزیہ جُملے میں محبت کی تڑپ نمایاں تھی۔

"مجھے معاف کر دو امیر!" افلاطون نے اپنے آنسوؤں کو بہنے دیا۔ "غصے میں ہوش و حواس کھو کر میں بھاگ گیا تھا میں وعدہ فراموش نکلا۔ مجھے معاف کر دو میرے دوست! ہمیشہ ساتھ دینے کے وعدے کو بھلا کر میں تم سے دور چلا گیا تھا امیر۔" بولتے بولتے درمیان میں دونوں کی ہچکیاں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ برکت ایک جانب چُپ چاپ کھڑا تھا جبکہ کُرسی میں بیٹھا ہوا کرنل میڈاس ٹیلر دو بچھڑے ہوئے دوستوں کے اس ملن کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

"تم چلے گئے تھے یہ تو بہت ہی اچھا ہوا تھا افلاطون! نہیں تو میری طرح تمھاری زندگی بھی ایک بوجھ بن چکی ہوتی آج تم اپنے بیٹے کی طرف دیکھ کر فخر سے اپنی گردن اونچی کر سکتے ہو لیکن میں.. میں.. تو.."

امیر کے درد کی جلن افلاطون سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ اِس لیے اُس نے دھیرے دھیرے اپنی گرفت ڈھیلی کر دی پھر آنسو پونچھ کر اُس نے اپنا چہرہ امیر کے سامنے کر دیا اور جذباتی لہجے میں بولا: "تقدیر کے کھیل کی کسی کو خبر نہیں ہوتی۔ امیر ہمارا اس طرح یکایک مل جانا بھی تو تقدیر ہی کا کھیل ہے نا؟"

تھوڑی دیر تک خاموش رہ کر دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وقت ان دونوں کے لیے تھم گیا ہو۔ اچانک امیر نے افلاطون کے کندھوں پر اپنے دونوں ہاتھ اس طرح رکھے جیسے اسے یکایک ہی کوئی بات یاد آگئی ہو۔ "وقت بہت کم ہے دوست اور کہنے سننے کے لیے ابھی بہت کچھ باقی ہے۔" وہ دھیمی آواز میں بولا: "اب سب باتیں بعد میں ہونگی پہلے تمھیں میرا ایک کام کرنا ہوگا۔" امیر کہتے کہتے رُک گیا تو افلاطون نے بھی اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور امیر کے کہنے سے قبل ہی بول پڑا: "جلدی کہو دوست! مجھے کون سا کام کرنا ہے؟"

امیر کے ہونٹ کانپنے لگے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اُس کے ہونٹوں کے پیچھے چھپے ہوئے الفاظ آواز کا سہارا ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے ہیں: "میرے.. بیٹی" ٹوٹے ٹوٹے یہ دو لفظ اُس کے گلے میں پھنس کر رہ گئے۔ اور پھر اپنی ہچکیوں کو اُس نے بمشکل روکتے ہوئے آگے کہا: "افلاطون! میں جالان کے مولوی کو اپنی بیٹی سونپ آیا تھا اُس کے بعد سے مجھے اب تک اُس کی کوئی خبر نہیں ملی ہے۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ اُس کے ساتھ کیا ہوا ہے؟ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ اُس کی شادی ہوگئی ہے یا نہیں؟ مجھے اُس کی کچھ خبر نہیں ہے۔"

"فکر مت کرو امیر۔" افلاطون نے اسے تسلّی دیتے ہوئے کہا: "سب ٹھیک ہو جائے گا۔" اتنا کہنے کے بعد وہ پیچھے کی طرف مُڑ کر امیر سے بولا: "ذرا دیکھو تو سہی میرے ساتھ اور کون آیا ہے؟"

امیر کی نظر بے اختیار دروازے کی جانب اُٹھ گئی جہاں ایک پردہ نشین عورت نقاب میں مُنہ چھپائے کھڑی تھی جب اُس نے اُس عورت کی طرف دیکھا تو اس پردہ نشین عورت نے اپنی گردن جُھکالی۔ "اوہ" امیر کے منہ سے نکلا۔ "لگتا ہے تم نور کو بھی اپنے ساتھ لے آئے ہو۔"

"نہیں امیر نور تو برسوں پہلے خدا کو پیاری ہو چکی ہے۔" افلاطون نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔ پھر اِس سے پہلے کہ امیر اُس سے ہمدردی کا اظہار کرتا افلاطون نے جلدی سے آگے کہہ دیا۔ "یہ ہمارے برکت کی بیوی ہے۔ تمھاری دعا لینے کے لیے میں اِسے ساتھ لایا ہوں۔"

"میری دعا؟" امیر نے اپنی نظریں چُرالیں اور پھر بڑی درد بھری آواز میں وہ بولا۔ "میں تو خود دعاؤں کا بھوکا ہوں افلاطون۔ میرے پاس اب کسی کو دینے کے لیے کچھ بھی باقی نہیں ہے۔ تمھیں شائد یہ نہ معلوم ہو کہ میں نے اپنے ان ناپاک ہاتھوں سے اپنی سگی بہن کا گلا بھی گھونٹ ڈالا ہے۔ میں بہت ہی سنگدل اور بہت ہی ظالم شخص ہوں۔ میں انسان نہیں ہوں افلاطون میں تو شیطان ہوں جس نے اپنی سگی بہن کو بھی۔۔۔"

"سگی بہن؟" افلاطون اُس کی بات سُن کر چونک پڑا۔ "مگر امیر تمھاری تو کوئی سگی بہن۔۔۔"

"یہ بہت درد بھری کہانی ہے میرے دوست" امیر اُس کی بات کاٹ کر بولا۔ "میں ابراہیم میاں کا سگا بیٹا نہیں تھا میرے اصلی ماں باپ تو پٹھان تھے۔ وہ بے [illegible] ٹھگوں کے شکار بن گئے اور میں۔۔۔" امیر نے روتے روتے بات پوری کی۔ "اور میں ٹھگ کا بیٹا بن گیا۔"

اس درمیان وہ پردہ نشین عورت آہستہ آہستہ آگے بڑھتی ہوئی امیر کے قریب آچکی تھی۔ برکت اور کرنل میڈاس ٹیلر چُپ چاپ ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"بہو اِن کو تسلیم کرو۔" افلاطون نے برکت کی بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمھیں دعائیں دینے والی اگر کوئی شخصیت اس دنیا میں ہے تو وہ معتبر شخصیت میرے اس دوست کی ہی ہے۔"

پھر اِس سے قبل کہ امیر کچھ پس و پیش کرتا کالے بُرقعہ میں سے ایک گورا ہاتھ باہر نکل آیا اور بُرقعے میں چُھپا ہوا سر آہستہ سے جُھک گیا۔ ہاتھ اٹھا کر برکت کی بیوی نے اُسے سلام کیا۔ امیر کا کانپتا اور لرزتا ہوا ہاتھ دھیرے دھیرے اوپر اٹھا تو لوہے کی بیڑیاں جھنجھنا اُٹھیں۔ امیر نے کھنکار کر اپنا گلا صاف کیا اور اندر ہی اندر اپنے تمام غموں کو پی جانے کی کوشش کی اور برکت کی بیوی کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "میری بچّی! میری بہو! خدا نے تمھیں برکت جیسا شوہر عطا کیا ہے انشاءاللہ خدا تمھاری ہر خواہش ہر خوشی پوری کرے گا۔"

امیر اس سے زیادہ کچھ نہ بول سکا۔ اُس کا اُٹھا ہوا ہاتھ آہستہ آہستہ نیچے آنے لگا۔ پھر تھوڑی دیر تک ماحول پر خاموشی چھائی رہی لیکن اس کے باوجود بھی برکت کی بیوی نے اپنا جُھکا ہوا سر اوپر نہیں اٹھایا۔ یکایک بُرقعے کے اندر سے آتی ہوئی ہچکیوں کی آوازیں امیر کی سماعت سے ٹکرائیں تو امیر بُری طرح چونک پڑا اور جلدی سے بولا۔ "بہو میری اِس حالت پر افسوس مت کرو۔ خدا کے لیے اپنے آنسو میرے لیے نہ بہاؤ۔"

لیکن یہ سن کر بھی جب برکت کی بیوی کا رونا کم نہیں ہوا تو افلاطون نے کہا۔ "امیر ایک رسم تو بالکل ہی بھول گئے تم نے ابھی تک بہو کا چہرہ تو دیکھا ہی نہیں ہے۔"

"اوہ" امیر گھبرا کر بولا۔ بہو کے چہرے کو بے نقاب کرنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ اِسی لیے وہ بولا۔ "بیٹی تمھارا چہرہ دیکھ کر میری آنکھوں میں تو ٹھنڈک پڑ جائے گی لیکن اِس منحوس انسان کی شکل دیکھ کر تمھیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ تمھارا چہرہ دیکھ کر تمھیں دینے کے لیے میرے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔" امیر کی یہ بات جب تک پوری ہوئی اُس وقت تک برکت کی بیوی نے خود ہی اپنا نقاب الٹ دیا اور گردن اُٹھا کر بھیگی آنکھوں سے امیر کی طرف دیکھنے لگی تھی۔ یکایک امیر پاؤں سے لے کر سر تک لرز گیا۔ اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں برکت کی بیوی کو حیرت سے تک رہی تھیں۔ اچانک اُس نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے سینے پر رکھ لیے اور اس طرح اپنے سینے کو ملنے لگا جیسے دل کے اندر اٹھتے ہوئے طوفان کے زور کو روکنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے برکت کی بیوی کی جگہ خود عظیمہ اُس کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی ہو۔ ویسا ہی خوبصورت چہرہ وہی پیار چھلکاتی ہوئی آنکھیں۔ ویسے ہی گورے گورے گال اور ویسے ہی گالوں میں پڑے ہوئے دو چھوٹے چھوٹے گڑھے۔ برسوں قبل جب اس نے آخری بار عظیمہ کو دیکھا تھا تو وہ بالکل برکت کی بیوی کی

طرح ہی دکھائی دے رہی تھی۔۔

یکایک اُس کے دماغ کے تار جھنجھنا اٹھے پھر اُس کے ہونٹ دھیرے دھیرے کانپنے لگے۔ "معصومہ" کا لفظ بڑی آہستگی سے اُس کے ہونٹوں سے نکلا اور دل بے تاب ہوکر اُس کے حلق سے باہر آنے کے لیے تڑپنے لگا۔ مگر دوسرے ہی لمحے اُس نے دل پر قابو پالیا۔ نہیں نہیں۔۔ یہ ہرگز نہیں ہوسکتا۔ اللہ تعالیٰ نے معصومہ کو برکت کی بیوی بنا دیا ہے اور افلاطون کی بہو۔ اب اُسے معصومہ کو بیٹی کہہ کر نہیں پکارنا چاہیے اُسے اِس کا کوئی حق نہیں ہے کہ وہ اس کی خوش حال زندگی پر اپنی منحوسیت کے سائے ڈال کر اُسے خوشیوں سے محروم کردے یہ یقیناً معصومہ ہی ہے۔ لیکن وہ اسے شناخت نہیں کرے گا کافی دیر تک وہ اندر ہی اندر اپنے آپ سے لڑتا رہا پھر کسی فیصلے پر پہنچ کر یکایک اُس نے اپنا چہرہ دوسری طرف گھما لیا اور بھاری آواز میں برکت کو مخاطب کرتے ہوئے بولا "برکت بہو کو باہر لے جاؤ۔"

"بہو نہیں آپ مجھے بیٹی کہیں ابا جان" امیر کی پیٹھ سے ایک سریلی آواز ٹکرائی اور کرنل میڈاس ٹیلر اپنی کرسی پر پہلو بدلنے لگا۔ اُس کی آنکھوں میں حیرت کے آثار چمکتے دکھائی دے رہے تھے۔ برکت بھی اپنی بیوی کے یہ الفاظ سُن کر چونک پڑا تھا۔ افلاطون اپنی جگہ پر چُپ چاپ کھڑا تھا۔ تھوڑی دیر تک تو ان میں سے کوئی بھی ایک لفظ نہیں بول سکا۔ سب کی نظریں امیر پر جمی ہوئی تھیں۔

"میری کوئی بیٹی نہیں تھی۔" یکایک امیر کی دھیمی آواز کمرے کی خاموشی کو توڑتی ہوئی فضا میں گونجی۔ "افلاطون کو اس بات کا علم ہے کہ خدا نے مجھے کوئی اولاد نہیں بخشی تھی۔"

"ابا جان" برکت کی بیوی کی باریک آواز تھرتھرا رہی تھی "آپ سچائی کی جانب سے مُنھ موڑ کر کھڑے ہیں۔ لیکن ایسا کرنے سے یہ تو نہیں ہوگا کہ میں آپ کی بیٹی نہیں ہوں۔ حقیقت سے انکار ناممکن ہے ابا جان۔ ابھی تھوڑی دیر قبل ہی تو آپ نے میرے سُسر سے کہا تھا کہ آپ جالان کے مولوی کو اپنی بیٹی سونپ آئے ہیں جس کی خیریت جاننے کے لیے آپ بے چین ہیں اور اب جب کہ وہی بیٹی آپ کے پاس آکر آپ کی دعاؤں کی طلب گار ہے تو آپ اپنے آپ کو دھوکہ کیوں دے رہے ہیں؟" معصومہ کے مُنھ سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ تیر کی طرح امیر کے دل کو چھید رہا تھا۔ ایک خوفناک طوفان اُس کے اندر ہلچل سی پیدا کر رہا تھا اور اس کا ضمیر اس سے کہہ رہا تھا۔ امیر ضرورت کرو۔ اگر تم اپنی بیٹی کو ٹھکرا دو گے تو تمھیں کبھی بھی چین نہیں آئے گا تمھارا یہ جُرم تمھیں سکون سے مرنے بھی نہیں دے گا بہتر یہی ہے کہ اپنی بدنامی کے خوف کو بھول کر اپنی بیٹی کو گلے سے لگالو ورنہ اس کا دل ٹوٹ جائے گا۔

لیکن امیر سے یہ نہ ہوسکا۔ اُس نے نظر اُٹھا کر ایک بار برکت علی کی طرف دیکھا پھر ٹیلر صاحب پر ایک نظر ڈالنے کے بعد اُس نے انکار میں سر ہلایا۔ اُس کے اِس انکار نے کمرے کے سناٹے کو اور بھی زیادہ گہرا کر دیا تھا۔ چند لمحوں تک ایک گمبھیر خاموشی طاری رہی پھر اچانک معصومہ کی درد بھری آواز اِس خاموشی کو توڑتی ہوئی امیر کی پیٹھ سے ٹکرائی۔

"ٹھیک ہے ابا جان! میں آپ کی نظروں سے دور چلی جاتی ہوں لیکن جانے سے پہلے میں آپ کی وہ چیز آپ کو واپس کر دینا چاہتی ہوں۔ جسے آپ کی نشانی کے طور پر میں نے اب تک سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔"

یہ کہہ کر اُس نے برقعے کے اندر سے کپڑے کا ایک ٹکڑا نکالا اور ہاتھ بڑھا کر پیچھے سے امیر کے کندھے پر رکھ دیا۔ دھیرے دھیرے امیر کی گردن بائیں کاندھے کی جانب مڑنے لگی پھر جیسے ہی اس کی نظر پیلے رنگ کے رومال پر پڑی تو کندھے کے ساتھ ساتھ اس کا پورا وجود کانپ اٹھا۔ اُسے اپنے کندھے پر بہت زیادہ بوجھ ہونے کا احساس ہوا۔ اور یوں لگا جیسے کسی نے پورا آسمان اس کے کندھے پر رکھ دیا ہو۔

"آپ مولوی صاحب کے گھر ایک بار مجھے دیکھنے کے لیے آئے تھے۔" معصومہ نے آگے کہنا شروع کیا۔ "وہاں آپ نے میرے ہاتھ سے پانی پیا تھا۔ اُس وقت مُنھ پونچھتے وقت یہ رومال وہیں گر پڑا تھا اور اُسی وقت میں سمجھ گئی تھی کہ آپ ہی میرے باپ ہیں۔ لیکن اِس کے باوجود بھی میں نے آج تک اس حقیقت کو اپنے دل میں ہی چُھپا رکھا تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ میں نے تو اپنے خاوند کو بھی آج تک یہ نہیں بتایا کہ میرا اصلی باپ کون ہے۔" بولتے بولتے معصومہ ایک پل کے لیے رُکی اور برکت کو ایسی نظروں سے دیکھنے لگی جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے معافی مانگ رہی ہو۔ تھوڑی دیر بعد اس نے پھر بھرّائی ہوئی آواز میں اپنے باپ سے کہنا شروع کیا "ابا جان

جب جب آپ کی یاد میں میرا دل بے چین ہوجاتا تھا میں نماز پڑھ کر آپ کے لیے دعا کرنے لگتی تھی اور اس رومال کو دیکھ کر جی بھر کر رو لیا کرتی تھی۔ اس رومال کا ایک ایک سوت میرے آنسوؤں سے بھیگا ہوا ہے۔ لیکن آپ کو تو شائد یہ بھی نظر نہیں آئے گا۔" جذبات کے انتہائی گہرے سمندر میں ہچکولے کھاتی ہوئی معصومہ بولتے بولتے ہانپنے لگی۔ پھر وہ وہاں زیادہ دیر تک کھڑی نہ رہ سکی۔ وہ گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گئی اور سسک سسک کر رونے لگی۔

بیٹی کی یہ حالت امیر برداشت نہیں کرسکا۔ معصومہ کے آنسوؤں نے باپ کے مضبوط ارادے کو پاش پاش کر دیا۔ امیر نے کندھے پر پڑے ہوئے رومال کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ اُسے اب یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اُسکے گھناؤنے گناہوں کے رنگ میں رنگا ہوا یہ رومال اب اُس کی بیٹی کے آنسوؤں سے دُھل چکا ہے۔ اِس خیال نے اُس کے دل میں ایک عجیب سی راحت بھر دی۔ ایک پل کے لیے آنکھیں موند کر خدا کو یاد کیا اور دل ہی دل میں کہنے لگا "پروردگار میں نے تیری قسم کھا کر مولوی سے یہ وعدہ کیا تھا کہ میں آئندہ کبھی بھی اپنی بیٹی کو بیٹی نہیں کہوں گا۔ اور نہ ہی کبھی کسی کو یہ معلوم ہوگا کہ میں اس کا باپ ہوں لیکن اب تو مجھے معاف کر دینا میرے مالک۔۔ آج میں تیری اُس قسم کو توڑ رہا ہوں۔" اور یکایک امیر ایک جھٹکے سے مُڑا اور اپنے قدموں کے قریب بیٹھی ہوئی معصومہ پر جُھک کر اس کے دونوں کندھے پکڑ لیے "بیٹی۔۔ میری معصومہ۔۔ بیٹی۔"

اچانک یوں محسوس ہوا جیسے دل کی مسجد کے مینارے پر اذان کی آواز گونجی ہو۔ کمرے کی گمبھیر خاموشی یکایک ہی ٹوٹ گئی۔ امیر کی زبان سے نکلے ہوئے ان دو لفظوں نے وہاں موجود تمام لوگوں کے اندر ایک عجیب سی ہلچل پیدا کر دی تھی معصومہ کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو تھم گئے اور اس کا جُھکا ہوا سر ایک جھٹکے سے اوپر اٹھ گیا۔ اس کے اوپر کی طرف اٹھے ہوئے گورے چہرے پر باپ کے دو آنسو ٹپکے تو معصومہ پاگلوں کی طرح ایک دم سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی اور امیر سے بے اختیار لپٹ پڑی "ابا۔۔ جان۔"

باپ کے سینے میں مُنھ چھپا کر بیٹی سسک سسک کر روتی رہی اور اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتا ہوا باپ اپنی آنکھوں سے اس سمندر کو بہا رہا تھا جو پچھلے بائیس برس سے اس کی آنکھوں کی پتلیوں میں برف کی طرح جم چکا تھا۔

باپ اور بیٹی کے اس ملاپ کو افلاطون اور برکت تو دیکھ ہی رہے تھے لیکن کرنل میڈاس ٹیلر تو یہ جذباتی منظر دیکھ کر دم بخود رہ گیا تھا۔ اُس کی آنکھیں بھی اِس ملاپ کو دیکھ کر بھیگ چکی تھیں۔

"بیٹی" تھوڑی دیر بعد امیر کی درد بھری آواز نے اِس گمبھیر سناٹے کو توڑ دیا "ہماری اِس طویل جُدائی میں کوئی ایک دن بھی ایسا نہیں گیا جب میں نے تمھیں یاد نہ کیا ہو۔ مرنے سے پہلے میں ایک بار تمھیں دیکھ لینا چاہتا تھا۔ میرا دل تڑپ رہا تھا اور میں اس قدر بے چین تھا کہ جب تم سچ مچ میرے سامنے آگئیں تو مجھے تم پر سے نظریں ہٹا لینے پر مجبور ہوجانا پڑا۔ میری بیٹی! اگر ہوسکے تو میری اِس مجبوری کو بھی تم معاف کر دینا اور۔۔"

امیر ابھی اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ معصومہ نے اچانک اپنا ہاتھ اُس کے مُنھ پر رکھ دیا اور بولی "ابا جان میں سب سمجھ رہی ہوں۔ جب میں بہت چھوٹی سی تھی تب سے غموں کو سہنے کی عادی ہوچکی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ بیٹی بدنام نہ ہوجائے اس لیے دل پر پتھر رکھ کر آپ نے یہ فاتا توڑ لیا تھا۔ لیکن ابا جان! باپ چاہے کیسا ہی کیوں نہ ہو لیکن بیٹی کی نظروں میں تو وہ فرشتہ ہی تو ہوتا ہے۔"

آنسوؤں کا بہاؤ تھم چکا تھا۔ دونوں کے دل کا بوجھ کم ہوگیا تو افلاطون نے کہا "یار امیر! تمھاری بیٹی بھی تمھاری طرح بہکی ہوئی نکلی۔"

معصومہ افلاطون کی آواز سُن کر چونک پڑی اور فوراً ہی اپنے باپ سے الگ ہوگئی۔ مگر افلاطون ہنستے ہنستے آگے بول گیا "میں تو اتنے برسوں تک اِسی دھوکے میں تھا کہ معصومہ اس راز سے واقف ہی نہیں ہے۔ میں اس راز کو اس سے چُھپا رہا تھا اور یہ چالاک لڑکی سب کچھ جانتے ہوئے مجھ سے پوشیدہ رکھے ہوئے تھی۔ بارہ برسوں میں اِس نے مجھے ایک دن بھی یہ معلوم نہیں ہونے دیا کہ باپ کی جدائی میں وہ کتنی تڑپ رہی ہے۔"

"مگر افلاطون یہ بات تمھیں کیسے معلوم ہوگئی؟ تم تو کبھی جالان گئے ہی نہیں تھے؟" امیر نے افلاطون سے پوچھا۔

"تم سے جُدا ہونے کے بعد مجھ پر کیا گذری ہے یہ کہانی تو بہت ہی طویل ہے دوست" افلاطون نے ایک گہرا سانس لیا

"نور کی بے وقت موت کے بعد مجھے برکت کی شادی کے لیے بہت جلدی کرنا پڑی اور تب مجھے تمھاری بیٹی یاد آگئی اور میں برکت کا رشتہ لے کر تم سے ملنے جالان پہنچ گیا۔ لیکن وہاں جاکر تمھاری بربادی اور تباہی کے نشانات ہی دیکھنے کو ملے۔ وہیں مجھے یہ اطلاع بھی ملی کہ عظیمہ بہن اس دنیا میں نہیں ہے۔ اور تمھیں جالان کی جیل سے رہائی مل چکی ہے اور تمھیں سرحد پار بھیج دیا گیا ہے تاکہ تم کبھی جالان واپس نہ آسکو۔ یہ سب خبریں سن کر میرا دل بیٹھ گیا۔ تمھاری بیٹی کہاں ہے اور کس حال میں ہے یہ بات تو شائد لوگ بھول ہی چکے تھے۔ لیکن اچانک میری ملاقات تمھارے وفادار ملازم غلام سے ہوگئی اور اس نے مجھے مولوی صاحب کے بارے میں بتایا کہ تمھاری بیٹی معصومہ اس کے پاس ہے۔ اور تب میں تمھیں دیا ہوا وعدہ پورا کرسکا ہوں۔"

افلاطون حسبِ عادت پُرمذاق انداز میں ہنستے ہنستے کہہ رہا تھا لیکن امیر تو انتہائی سنجیدہ نظر آرہا تھا۔ اس نے اپنے دوست کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کا شکریہ ادا کرنے کی کوشش کی۔ "افلاطون ..."

لیکن افلاطون نے اس کی بات مکمل ہونے نہیں دی۔ وہ درمیان میں اس طرح بول پڑا جیسے وہ امیر کے ارادے سے واقف ہوگیا ہو۔ "امیر میاں اب تم مجھے افلاطون کہہ کر مخاطب مت کرو۔ اب میں تمھارا سمدھی ہوچکا ہوں۔ بیٹی کے باپ ہونے کے ناتے تمھیں میری عزت کرنی چاہیے۔"

افلاطون کی یہ بات سن کر برکت بھی مسکرا دیا۔ ماحول پر بہت دیر سے جو گمبھیرتا چھائی ہوئی تھی وہ کسی حد تک دور ہوچکی تھی۔

"مگر میں تو تمھیں افلاطون ہی کہوں گا۔" امیر نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ مارتے ہوئے پُرمذاق لہجے میں کہا۔ "بہت زیادہ ہوشیاری مت دکھاؤ۔ معصومہ جیسی بہو تم اگر چراغ لے کر بھی ڈھونڈتے تو بھی تمھیں نہیں ملتی سمجھے۔" اتنا کہہ کر وہ برکت کی جانب گھوم کر بولا۔ "ارے داماد جی تم چپ چاپ کیوں کھڑے ہو، ذرا اپنے سسرجی کو سلام ولام تو کرو۔" سب کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ لیکن ہنسی خوشی کے ان لمحوں کو جیل کے گھنٹے نے جلد ہی اداسی میں بدل دیا۔ ٹھیک طرح سے، بچھڑنے والے ملنے بھی نہ پائے تھے کہ پھر سے جدائی کا سیاہ ناگ انھیں ڈسنے لگا۔

اچانک امیر کو اس بات کا خیال آیا کہ وہ کرنل میڈاس ٹیلر صاحب کی موجودگی کو تو بالکل ہی بھول چکا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی اُس نے اپنی بیٹی معصومہ کا ہاتھ پکڑا اور اُسے ٹیلر صاحب کے سامنے لے گیا۔ اور انتہائی نرم لہجے میں بولا۔ "جناب ملاپ کی خوشی میں اگر میں تھوڑی دیر کے لیے آپ کو بھول گیا ہوں تو برائے مہربانی میری اس گستاخی کو معاف کردیں۔"

یہ سن کر ٹیلر صاحب نے مسکرا کر اس طرح اُس کی طرف دیکھا جیسے اس مسکراہٹ سے ہی اُس نے امیر کو معاف کر دیا ہو۔

امیر نے معصومہ سے کہا۔ "بیٹی صاحب کا شکریہ ادا کرو اگر یہ میری زندگی پر کتاب لکھنے نہ آئے ہوتے تو ہم سبھوں کا ملاپ کبھی بھی نہ ہو پاتا۔"

معصومہ نے جھک کر ٹیلر صاحب کو سلام کیا تو ٹیلر صاحب نے ایک عجیب سی گھبراہٹ محسوس کی۔ شائد اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ امیر علی کی بیٹی کو کیا کہہ کر مخاطب کرے؟ لیکن پھر فوراً ہی اُس کے مُنھ سے نکلا۔ "گاڈ بلاس یو۔"

ٹھیک اُسی وقت جیل کا سنتری امیر کو لے جانے کے لیے وہاں آکر کھڑا ہوگیا۔ سنتری کو دیکھ کر ایک بار پھر کمرے کے اندر گہری خاموشی چھا گئی۔

"اب مجھے جانا چاہیے۔" امیر نے ہر ایک پر ایک درد بھری نظر ڈالنے کے بعد کہا۔ "نماز کا وقت بھی ہوچکا ہے۔ خدا نے خوشی کا یہ دن بھی مجھے دکھا دیا ہے۔ اس لیے مجھے اس کا شکریہ ادا کرنے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔" اتنا کہہ کر کمرے سے باہر جانے سے قبل وہ باری باری افلاطون، برکت اور معصومہ کو سینے سے لگانے لگا۔ اُس نے ایسا کرتے وقت اس بات کا خیال رکھا تھا کہ اب اُس کی آنکھوں سے آنسو نہ بہنے پائیں۔

"اللہ نے چاہا تو پھر جلد ہی ملاقات ہوگی۔" افلاطون نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا تو امیر جواب میں صرف سر ہلا کر رہ گیا۔ پاؤں میں بڑی ہوئی بیڑیاں جھنجھنا اٹھیں اور دو چار قدم چل کر امیر رُک گیا۔ اُس نے ہاتھ کی مُٹھی میں دبے ہوئے اپنے پیلے رنگ کے رومال کو دیکھا پھر پیچھے مُڑ کر اس نے بیٹی کو اپنے پاس بلایا اور دھیرے سے بولا۔ "بیٹی میں تمھیں یہ رومال واپس کرنا بھول گیا تھا۔"

معصومہ کے پھیلے ہوئے ہاتھ میں رومال رکھنے کے لیے امیر نے اپنا ہاتھ بڑھایا لیکن اُس کا ہاتھ ایک بار پھر رک گیا۔ کمرے میں موجود ہر شخص بڑی بے چینی اور اضطراب سے اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔

امیر نے رومال کے ایک سرے پر بندھی ہوئی گانٹھ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پھر دونوں انگوٹھوں کی مدد سے اُس نے دھیرے دھیرے اس گانٹھ کو کھول دیا۔ اور گانٹھ کے اندر بندھے ہوئے چاندی کے سکّے کو تھوڑی دیر تک دیکھتا رہا پھر نظر اُٹھا کر اس نے بیٹی کی طرف دیکھا اور اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ میں پہلے چاندی کا سکّہ اور پھر اس کے اوپر اپنا رومال رکھ دیا پھر بولا۔ "بیٹی میرے باپ نے میرے رومال میں یہ گانٹھ باندھ کر مجھے ٹھگ بنایا تھا لیکن آج تمھارے سامنے یہ گانٹھ کھول کر میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ٹھگ کے نام کو اپنے نام کے آگے سے ہٹا رہا ہوں۔"

یہ دیکھ کر میڈاس ٹیلر حیرت بھری نظروں سے امیر کو دیکھتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا امیر کے قریب آکر اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ "چلو امیر میں تمھیں تمھاری کوٹھڑی تک چھوڑ آؤں۔"

تین روتے ہوئے دل اور چھ آنسو بہاتی آنکھوں کو اپنے پیچھے چھوڑ کر امیر جلدی سے کمرے کے باہر نکل گیا۔ نماز قضا نہ ہوجائے اس لیے اُس کی رفتار ذرا تیز ہوتی جارہی تھی۔ کوٹھڑی کے کھلے ہوئے دروازے کے قریب آکر امیر ایک لمحے کے لیے ٹھہر گیا۔ اُس کے پیچھے کرنل میڈاس ٹیلر اپنا ہاتھ بڑھائے کھڑا تھا۔ امیر نے بھی مصافحہ کے لیے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ "امیر علی" میڈاس ٹیلر نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ "ولیم سلومن صاحب نے جو بات لکھی ہے اُسے یاد رکھنا۔ پانچ سات برس آسانی سے نکل جائیں گے۔ اور اب تو زندہ رہنے کے لیے تمھارے پاس بیٹی کا ٹھوس بہانہ بھی موجود ہے۔"

لیکن امیر میڈاس ٹیلر کی یہ بات سن کر بھی نہیں ہنسا اور سنجیدہ لہجے میں بولا۔ "صاحب آپ بھی میری ایک بات کو یاد رکھیے گا۔" اُس کی آواز شدتِ جذبات سے بھاری ہو رہی تھی۔ "اپنی کتاب میں میری بیٹی اور میرے ملاپ کا تذکرہ مت کیجیے گا۔ یہ بات میں اپنی خاطر نہیں بلکہ اُس کی بھلائی کی خاطر کہہ رہا ہوں۔"

کرنل میڈاس ٹیلر کی آنکھوں میں ہمدردی کی چمک سی لہرا گئی۔ اُس نے امیر سے وعدہ کرتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے امیر آج کے واقعے کو میں اپنے دل کے اندر ہی دفن کردوں گا۔" اتنا کہہ کر اُس نے ایک بار پھر امیر سے ہاتھ ملایا اور بولا۔ "گڈ بائے اینڈ گڈ لک۔"

امیر کچھ دیر تک اُسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ جب میڈاس ٹیلر اُس کی نظروں سے اوجھل ہوگیا تو وہ آہستہ آہستہ اپنی کوٹھڑی میں داخل ہوگیا۔ اُس کے اندر جاتے ہی سنتری نے کوٹھڑی کے دروازے پر تالا لگا دیا اور وہاں سے چلا گیا۔ امیر نے کوٹھڑی کے کونے میں پڑے ہوئے دری کے ایک ٹکڑے کو اُٹھا کر فرش پر بچھا دیا اور پاؤں موڑ کر اُس پر بیٹھ کر اُس نے اپنی دونوں آنکھیں موند لیں۔

کافی دیر تک وہ آنکھیں موندے بیٹھا رہا۔ اُس کے ہونٹ دھیرے دھیرے ہل رہے تھے۔ پھر اُس کے ہاتھ دُعا کے لیے اُٹھ گئے۔ شام گہری ہوتی جارہی تھی۔ رب کی عبادت کرتے وقت امیر کا چہرہ بڑا پُرسکون نظر آرہا تھا لیکن اُسے اپنے اندر ایک عجیب سی بے چینی محسوس ہو رہی تھی۔ اُسے لگ رہا تھا جیسے اُس کا دم گھٹ رہا ہو۔ دُعا کے لیے اُٹھے ہوئے اُس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ یکایک اُس کے ہونٹ پھڑپھڑائے۔ "یا خدا" دل کی گہرائی سے نکلی ہوئی آواز کوٹھڑی کی دیواروں سے ٹکرائی۔ "پروردگار اگر میرے گھناؤنے گناہوں کی سزا پوری ہوچکی ہو اور اگر تو نے مجھے معاف کردیا ہو تو پروردگار تو مجھے یہاں سے اُٹھا لے۔ اس دنیا میں میرے لیے اب کچھ بھی نہیں ہے۔ میری کوئی خواہش ادھوری نہیں رہی۔ میرے رب تو نے مجھے دنیا کی ہر نعمتوں سے نوازا ہے۔ جو مانگا ہے وہ تو نے دیا ہے۔ اب تو میری آخری التجا بھی قبول کرلے میرے مالک مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔ پروردگار بس تو مجھے موت بخش دے۔" امیر کے اُٹھے ہوئے ہاتھ کافی دیر تک رب کریم کے فیصلے کے انتظار میں اُٹھے رہے۔ پھر اُس کا سر سجدے میں گر گیا۔ شائد کبھی نہ اُٹھنے کے لیے۔

تمام شد